تعمیر پاکستان

ایس ایم شاہد

پبلس اردو بازار لاہور

تعبیر پاکستان

ایس۔ایم۔شاہد
شعبہ تعلیم اساتذہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد

نیو بک پیلس اردو بازار لاہور
ملنے کا پتہ ہے فاروق سنز الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

انتساب

اُستادگرامی

"محمد آصف راجپوت"

کے نام ــــــ

مندرجات

باب۳ برصغیر میں اشاعت اسلام ۶۷

باب۴ برصغیر میں احیائے اسلام کی کوششیں ۸۵

باب ۶ دو قومی نظریہ

باب۱۱ مُسلم لیگ کا قیام — ۳۲۴

باب۱۲ اسلامی سیاست میں بحران (۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء) — ۳۳۲

باب۱۳ معاہدہ لکھنؤ — ۳۴۰

باب ۲۳ آئینی اصلاحات

باب ۲۴ تحریک پاکستان میں علماء کا کردار

باب ۳۷ جدوجہد پاکستان اور خواتین ۶۶۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اپنے رب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے ناچیز، گناہ گار بندے کو یہ ہمت دی کہ میں یہ کتاب مکمل کر کے قارئین کے سامنے پیش کر سکوں۔ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے بس دوسروں کے رشحات قلم سے خوشہ چینی کی سعادت ہے۔ اس سے زیادہ میرے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہ ہو، لیکن:-

اپنے افکار میں دُنیا کے ستم سہنے میں
زیست کا لطف رہے شعلہ بجاں رہنے میں
کبھی آواز کی لہروں میں ملے دل کو سرور
اور کبھی یوں ہی کسی بات پر اشکوں کا وفور
کیا خبر جب ہو میری عمر کی ڈھلتی ہوئی شام
عشق دے جائے تبسم کا چھلکتا ہوا جام

سرزمینِ پاک میں پھیلے گا اک دن میرا نام
ملک کی ساری زبانوں پر رواں ہو گا کلام
یاد رکھیں گے محبت سے کہ تھا اک نے نواز
جس نے اُکسایا شرافت کو، جگایا سوز و ساز
میں نے اس کلجگ میں کھل کر گائے آزادی کے گن
تھی مجھے مجبور انسانوں سے ہمدردی کی دُھن

سن میری جانِ سخن، فرمانِ یزداں سن سدا
داد کی تجھ کو تمنا ہو نہ ڈر بیداد کا

مت اُلجھ نادان سے نافہم کو مت کر قبول
نیک نامی کیا ہے، بدنامی ہے کیا، دونوں فضول

کتاب کی پروف ریڈنگ کے سلسلے میں محترمہ حلیمہ بٹ، ریحانہ لطیف، عابدہ یوسف، فرحت شاہین اور نازیہ ممتاز صاحبہ کا بے حد مشکور ہوں۔ خدا انھیں جزائے خیر دے۔

ایس۔ایم۔ شاہد
شعبۂ تعلیم اساتذہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد

یکم اگست ۱۹۹۰ء

باب ۱

اسلامک آئیڈیالوجی

فلسفہ کی زبان میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ (SEIENCE OF IDEAS) کو۔ یعنی علم کی وہ شاخ جس کا تعلق (IDEAS) سے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ (IDEA) کسے کہتے ہیں۔ تو ایک فنی مسئلہ ہے اور بڑی بڑی شکل اصطلاح جس کی تاریخ اور تشریح کے لیے طویل فرصت چاہیے۔ اس لیے فلسفیانہ موشگافیوں کو چھوڑ کر سیدھے سادے لفظوں میں:۔

"وہ بنیادی تصورات (CONCEPTS) جن پر کسی نظام (SYSTEM) کی عمارت استوار ہو، اُس نظام کی آئیڈیالوجی کہلاتے ہیں۔ لہٰذا اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہوں گے وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔"

اب اسلام کے ساتھ لفظ "نظام" کیوں آیا۔ نظام کے معنی ہوتے ہیں۔ سسٹم (SYSTEM) یا (ORDER) لہٰذا "اسلامی نظام" کے معنی ہوں گے۔ (ISLAMIE SYSTAM) یا (ISLAMIC ORDER) اسی کو اسلامی طریق زندگی (ISLAMIE WAY OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اسلام کے ساتھ لفظ نظام کیوں لایا جاتا ہے؟

اسلام مذہب نہیں، الدین ہے۔ قرآن کریم میں "مذہب" کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس نے اسلام کو "الدین" کہہ کر پکارا ہے۔ مذہب اور الدین میں فرق کیا ہے؟ اسے سمجھ لینے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے ساتھ لفظ "نظام" کیوں لایا گیا ہے۔

مذہب یا (RELIGION) کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا (یعنی کوئی ایسی ہستی جسے انسان اپنے ذہن میں خدا تصور کرے)، کائنات سے کہیں الگ بیٹھا ہے۔ اس کی کیفیت ایک بادشاہ کی سی ہے۔ جب بادشاہ کسی سے ناراض ہو جائے تو وہ شخص عتاب

میں آجاتا ہے۔ اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی خوشنودی حاصل کر لی جائے۔ اس کے لیے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے پڑھنے چاہئیں۔ اس کی خوشامد کرنی چاہیے اس کے حضور نذرانے پیش کرنے چاہئیں، جو اس کے مقرب ہوں۔ ان سے اس تک سفارشیں پہنچانی چاہئیں۔ جب اس طرح بادشاہ کو خوش کر لیا جائے تو پھر نہ صرف وہ مصیبتیں ٹل جاتی ہیں بلکہ انعام و اکرام بھی ملتا ہے، وہ جاگیریں بخش دیتا ہے۔ اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔ جاہ و مناصب عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا کا تصور "بادشاہ" کا سا ہوتا ہے۔ اس لیے "خدا کے پرستار" اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں۔ جو ایک بادشاہ کی رضا جوئی حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسے مذہبی مراسم یا پوجا پاٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ خدا کے اس تصور کے ماتحت کسی نظام کی ضرورت ہی لاحق نہیں رہتی۔ اس میں ایک فرد کا "اپنے خدا" کے ساتھ پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے۔ وہ فرد تنہائی میں بیٹھ کر، اپنی مصیبتوں کے ازالے اور بخشش کے حصول کے لیے خدا سے منت سماجت کرتا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر دنیا کے دھندوں میں لگ جاتا ہے۔

اسے مذہب یا (RELIGION) کہتے ہیں۔ یہ انسانوں کے اپنے ذہن کا پیدا کردہ تصور ہے اور اس قدیم زمانے کا پیدا کردہ جب انسان کائنات کی مہیب قوتوں (بجلی۔ بادل۔ سیلاب، آگ۔ امراض وغیرہ) کے اسباب سے واقف اور ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس زمانے میں اسے اپنے سے زیادہ طاقتور سے ڈرنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

لیکن خدا کا جو تصور حضرات انبیاء کرام کے ذریعے (وحی کی رو سے) ملا، وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی رو سے خدا اس ہستی کا نام ہے۔ جو کائنات کے عظیم سلسلے کو اپنے اٹل قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ ان قوانین کے مطابق ہر شے اپنی ابتدائی حالت سے ترقی کرتی اور نشوونما پاتی۔ اپنی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے (جس طرح بیج، نشوونما [illegible] آہستہ آہستہ درخت بن جاتا ہے)۔ خدا نے جس طرح کائنات کی باقی اشیاء کی نشوونما کے قوانین عطا کیے ہیں۔ اسی طرح اس نے انسانوں کی نشوونما کے لیے بھی قوانین [illegible]

جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ نشوونما پا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جو ان کے خلاف چلتے ہیں۔ وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ (جس طرح اس بیج کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ جسے قانونِ فطرت کے خلاف سخت زمین میں دبا دیا جائے)

خدا کے اس تصور کی رو سے جو اس نے وحی کی رو سے عطا کیا ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ خدا کا وہی تصور صحیح ہو سکتا ہے۔ جسے وہ خود انسانوں کو بتائے) انسان کا خدا سے تعلق درحقیقت اُن قوانین سے تعلق ہے جو اس نے انسانوں کی نشوونما کے لیے متعین کیے ہیں۔ خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت کو انسانی ذہن سمجھ نہیں سکتا۔ ہم صرف ان قوانین کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو خدا نے ہماری نشوونما کے لیے ہمیں دیے ہیں۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام قرآن کریم ہے۔ یہ انسانوں کی راہنمائی کے لیے آخری، مکمل اور واحد ضابطۂ قوانین ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد تنہا زندگی بسر کرے تو اسے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کی پابندی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے۔ جب انسان مل جُل کر رہیں۔ جنگل میں کوئی دائیں طرف چلے یا بائیں طرف، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن شہر کی سڑکوں پر اگر قاعدے اور قانون کے خلاف چلا جائے تو نتیجہ فوراً سامنے آ جاتا ہے۔ خدا نے انسانوں کی راہ نمائی کے لیے قوانین دیے ہی اس لیے ہیں کہ انسانوں نے مل جُل کر رہنا ہے۔ جب بہت سے انسان کسی قاعدے اور قانون کے مطابق مل جُل کر رہیں تو اسے نظام، سسٹم یا (DRDER) کہتے ہیں۔ اسے قرآن نے الدین سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں انسان اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ

۱۔ مذہب اور الدین میں فرق کیا ہے۔ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ جسے انسانوں کی اجتماعی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس، الدین اس نظام خداوندی کا نام ہے۔ جس کے مطابق اجتماعی زندگی بسر کی جائے۔

۲۔ اسلام مذہب نہیں۔ الدین ہے۔

۳۔ اسی کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔ یعنی وہ اجتماعی طریق جس میں زندگی، قوانین خداوندی کے مطابق بسر کی جائے اور

۴۔ اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہیں وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظام زندگی کی

عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے فلسفۂ زندگی، نصب العین حیات، منزل مقصود وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے "کلمہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (یعنی نظریۂ زندگی) اور اس کے ساتھ لفظ "طیب" کا اضافہ کر کے اسے درخت سے تشبیہہ دی ہے۔ "طیب" کے عام معنی تو خوشگوار کے ہیں لیکن یہ لفظ اس درخت کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو نہایت عمدہ پھل دے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

ترجمہ: "کلمہ طیبہ کی مثال ایک شجر طیب کی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم ہوں اور اس کی شاخیں آسمان (کی بلندیوں) میں پھیل رہی ہوں اور وہ قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں پھل دیتا چلا جائے۔" (۱۴/۲۴)

یہ ہے اسلامک آئیڈیالوجی۔ یعنی وہ تصورات حیات جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل ہوں اور جو نظام ان کی بنیادوں پر قائم کیا جائے وہ مکان (یعنی SPACE) کی حدود (LIMITATIONS) سے بے نیاز ہو کر ساری دُنیا کو محیط ہو اور اس کے انسانیت پرور نتائج، زمان (TIME) کی قیود سے بلند ہو کر، ہر زمانے میں تازہ بتازہ سامنے آتے رہیں۔

آئیڈیالوجی اور عمل

"درخت" کی مثال میں ایک اور نقطہ بھی قابل غور ہے۔ درخت کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا بیج عمدہ ہو۔ اس میں بڑھنے، پھولنے اور پھیلنے کی صلاحیت ہو۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ اُس بیج کی نشوونما کے لیے ایک پروگرام کے مطابق محنت کی جائے۔ اسی کے لیے زمین تیار کی جائے۔ کھاد ڈالی جائے، پانی دیا جائے۔ حرارت اور روشنی کا انتظام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اسے موسموں کی شدت سے بچایا جائے۔ جانوروں کی یورش سے محفوظ رکھا جائے۔ اس طرح کس انداز میں قرآن اس عظیم حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) خوشگوار نظریہ زندگی (آئیڈیالوجی) میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ "خدا کی طرف" بلند ہوتا چلا جائے۔ یعنی ان بلندیوں تک پہنچ جائے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کی ہیں۔ لیکن وہ از خود ایسا نہیں کر سکتا۔ انسان کا عمل صالح اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی اس کے اس عملی پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی مناسب نشوونما کر سکے۔ قرآن میں آئیڈیالوجی (ایمان) اور اسے کامیاب بنانے کے لیے عملی پروگرام کو

کہا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ کلمہ طیبہ یا آئیڈیالوجی۔ اسلامی نظام کا نصب العین ہوتا ہے اور اعمال صالحہ وہ پروگرام جو اس نظام پر چلنے والوں کو اس نصب العین تک لے جائے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھ کہ کلمہ طیبہ یا آئیڈیالوجی اسلامی مملکت کی قرارداد مقاصد (Objecti Resolution) ہوتی ہے اس کا آئین (CONSTITUTION) اس قرارداد کو سیاسی پیکر عطا کرتا ہے اور مملکت کے قوانین، کاروان اُمت کو اس منزل تک لے جانے کا پروگرام متعین کرتے ہیں۔

یہ ہے اسلامک آئیڈیالوجی کی تعریف (DEPINATION) یعنی وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظام زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یا وہ نصب العین جس تک پہنچنا اسلامی معاشرے کا مقصودِ حیات ہوتا ہے۔

مادی نظریۂ زندگی

زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان بھی (دیگر حیوانات کی طرح) صرف طبیعی جسم (PHYSICAL BODY) رکھتا ہے۔ اس کا جسم فطرت کے طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS OF NATURE) کے مطابق زندہ رہتا ہے اور کچھ وقت کے بعد انہی قوانین کے مطابق اس کی مشینری چلنے سے رُک جاتی ہے۔ اسے اس کی موت کہتے ہیں۔ جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کو میکانکی تصورِ حیات دیا (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ جو نظام اس نظریہ کے مطابق قائم ہوتا ہے اس کا نصب العین یا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس مملکت کی حدود میں رہنے والے افراد کی جسمانی پرورش کا انتظام کرے۔ اچھی مملکت وہ ہوتی ہے، جس میں افراد کی پرورش کا انتظام اچھا ہو۔ یعنی ہر ایک کو سامانِ زندگی فراوانی سے اور بسہولت ملتا جائے۔ قرآن کریم اس نظریے کو حیوانی سطح زندگی (ANIMAL LAVEL) قرار دیتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔

والذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم (۴۷/۱۲)

ترجمہ: "اور جو لوگ (نظریہ زندگی سے) انکار کرتے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔

(بالکل اس طرح) جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں۔ ان کا مقام جہنم کی آگ ہے (جس میں شرف انسانیت کی کھیتی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔")

قرآنی نظریۂ زندگی

دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس کے پاس جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو حیوانات کو نہیں ملی۔ صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔ اسے انسانی ذات (Human personality) یا نفس (SELF) کہتے ہیں۔ انسانی ذات نہ مادی ارتقاء (MATERIAL EVOLUTION) کی پیداوار ہے اور نہ طبیعاتی قوانین (PHYSICAL LAWS) کے تابع۔ یہ ہر انسانی بچے کو۔ خواہ وہ بادشاہ کے محل میں پیدا ہو یا فقیر کی جھونپڑی میں۔ برہمن کے گھر میں ہو یا شودر کے۔ اس کے ماں باپ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ خدا کی طرف سے پیدائش کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔ انسانی ذات نشوونما یافتہ شکل (DEVELOPED FORM) میں نہیں ملتی۔ بلکہ مضمر (POTENT) اور امکانی (REALISABLE PASSIBILITIES) کی صورت میں ملتی ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لیے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لیے خدا کی طرف سے (قرآن کریم میں) قوانین دیے گئے ہیں۔ اگر ان قوانین کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے تو اس میں حدود بشری کے اندر ان صفات کی نمود (MANIFESTATION) ہوتی جاتی ہے۔ جنھیں (لامحدود حیثیت سے) صفات خداوندی کہا جاتا ہے۔ نشوونما یافتہ ذات انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد ذات کی نشوونما ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو وہی پرانی کہانی ہے جسے ہم مذہب والوں (مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں) کی زبانی سنتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد" روحانی ترقی" ہے۔ یہ وہی بات نہیں اس سے بالکل مختلف بات ہے۔" مذہب والوں" کا عقیدہ یہ ہے کہ

۱۔ انسانی جسم (بلکہ پوری کی پوری مادی دنیا) روحانی ترقی کے راستے میں روک بن کر حائل ہے۔ جب تک اسے راستے سے نہ ہٹایا جائے روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا

۲۔ روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا ترک کرے۔ آرزوؤں کا خاتمہ کرے۔ مادی آسائشوں کو قابل مذمت قرار دے۔ ان سے نفرت کرے اور کنارہ کش ہو کر چلا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ

۴۔ انسان انفرادی زندگی بسر کرے۔ خلوت کدوں میں رہے اور اللہ سے لو لگاتے ہوئے انسانوں سے قطع تعلق کرتا جائے۔

لیکن قرآن کریم کی رو سے انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ

(الف) [illegible]سانی خارجی کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو، قوانین خداوندی کے مطابق، تمام نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے عام کرتا چلا جائے۔ یاد رہے کہ جس طرح اُس انڈے میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کا خول ثابت نہ رہے۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی زندگی مادی لحاظ سے محکم اور مضبوط نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ

(ب) انسان اجتماعی زندگی بسر کرے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی باسانی پوری ہوتی رہیں اور اسے اُس کی ذات کی نشوونما کے پورے پورے مواقع اور اسباب و ذرائع بھی میسّر ہوں۔ اس قسم کے معاشرے کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔

اسلامی مملکت کا فریضہ

اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے اور انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ضروری اسباب و ذرائع فراہم کرنے کی ذمہ دار ہو۔ "ذمہ دار" کا لفظ قابل غور ہے چونکہ "ذات کی نشوونما" میں قلب و دماغ کی تمام صلاحیتوں کی نشوونما آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر، خدا کی صفت علیم اور خبیر ہے۔ لہٰذا اس فرد کا جس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو، علیم و خبیر (صاحب علم اور باخبر) ہونا لازمی ہے۔ اس کے لیے ذہنی نشوونما ضروری ہے۔ دوسری طرف خدا کی صفت ربوبیت اور رزاقیت ہے۔ اس لیے جس فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا جذبہ اپنے اندر رکھے اور ان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔ اسے "قلب" کی نشوونما کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس میں قلب کا تصور (MIND) کے اُس تصور سے مختلف ہے جو آج کل مغرب میں رائج ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فرد مملکت کی ان صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور اُس طرح یہ معاشرہ صفات خداوندی کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائے۔

مملکت مقصود بالذات نہیں

قرآن کریم کی رو سے مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں "مقصود بالذات" کے معنی ہیں (END IN ITSELF) یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے افراد کی نشوونما جو اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے قیام بلکہ اس کی ہستی کا جواز یہ ہے کہ وہ افراد مملکت کی ذات کی نشوونما (جس میں جسمانی نشوونما سب سے پہلے آتی ہے) کی ذمہ دار ہے۔ جو مملکت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ وہ اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

فرد اور معاشرے کا تعلق

اس مقام پر لازماً یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآنی نظام میں ساری ذمہ داری مملکت کی قرار پاتی ہے سوال یہ ہے کہ اس میں افراد کو بھی کچھ کرنا پڑتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم انسان کی تمدنی زندگی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ انسان کے سامنے شروع سے آج تک مسئلہ ہی ایک رہا ہے، یعنی یہ کہ فرد اور معاشرہ (سوسائٹی۔ مملکت) کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسان نے جتنے نظام وضع کیے ہیں ان میں صورت یہ رہی ہے کہ جب سوسائٹی یا مملکت کو اہمیت دی گئی تو اس میں افراد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ختم ہو گئی اور جب افراد کی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تو ان کے اجتماعی نظام میں انتشار واقع ہوگیا۔ قرآن کریم نے ایک ایسا نظام دیا ہے جس میں افراد کی انفرادیت بھی دن بدن بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ان کا نظم اجتماعی بھی محکم سے محکم تر ہوتا جاتا ہے۔ اس نظام کا راز پوشیدہ ہے۔ فرد اور معاشرہ کے اس تعلق میں جسے قرآن کریم نے واضح طور پر متعین کیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اُس تعلق کی وضاحت کی جائے۔ دو ایک باتیں بطور تمہید بیان کرنی ضروری ہیں۔

اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے

قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی فرد معاشرہ یا مملکت کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔ اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ لیکن قوانین کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ہے یہ اجتماعی نظام اسلامی مملکت کہلاتا ہے، لہٰذا خدا کی اطاعت سے عملاً مفہوم ہے اس مملکت کی اطاعت جو قوانین خداوندی کو نافذ کرے۔

لیکن اس مملکت سے خدا یہ کہتا ہے کہ جب تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لیتے ہو تو میں نے انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ تمہیں ان کو پورا کرنا ہوگا۔ اگر تم خدائی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتے تو تمہیں اس کا حق حاصل نہیں کہ تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لو۔ اطاعت لینا اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا ساتھ ساتھ چلے گا لہٰذا قرآنی نظام میں فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ فرد مملکت کی وساطت سے قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا ہے اور مملکت ان تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے جو خدا نے افراد سے کر رکھے ہیں۔ فرد اور مملکت کا یہ تعلق ایک معاہدے کی رو سے قائم ہوتا ہے جسے قرآن نے سورۂ توبہ میں مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے ارشاد ہے: اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

"یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لیے ہیں تاکہ وہ انھیں جنت دے" (۹/۱۱۱)

ان تصریحات کی روشنی میں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ اس کا مفہوم واضح ہے۔ عملی دنیا میں افراد معاشرہ اپنی جانیں اور مال اُس اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جو نظام خداوندی کے قیام کی ضامن ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں یہ مملکت انھیں "جنت" عطا کر دیتی ہے۔ ایک جنت وہ ہے جو انسان کو مرنے کے بعد ملے گی۔ لیکن قرآن کریم اس دُنیا میں اسلامی معاشرے کو بھی جنت سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اس میں انسانی جسم کی پرورش اور ذات کی نشوونما کے لیے تمام سامان اور ذرائع فراوانی سے موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ صدر معاہدے کی رو سے فرد اپنی جان اور مال قوانین خداوندی کی اطاعت کے لیے اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتا ہے اور مملکت اس کی جملہ بنیادی ضروریات زندگی اور اس کی ذات کی نشوونما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار بن جاتی ہے۔ اس طرح فرد اپنی جان اور مال معاشرے کے حوالے کر دینے کے باوجود اپنی انفرادیت (ذات) قائم رکھتا ہے (بلکہ وہ نشوونما پا کر مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی جاتی ہے) اور مملکت کا نظام محکم بنیادوں پر استوار رہتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دے نہیں سکتی۔ جب تک رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ ویسے بھی جب افراد اپنی

جان اور مال (سب کچھ) مملکت کے سپرد کر دیں تو وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ افراد کی ضروریات کی ذمہ دار مملکت ہوتی ہے اور اس کے لیے وسائل پیداوار اس کی تحویل میں رہتے ہیں۔

اوپر لکھ چکا ہوں کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لیے (طبیعی) قوانین (Physical laws) مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لیے بھی قوانین متعین ہیں۔ ان قوانین کو قرآن کریم "کلمات اللہ" کہہ کر پکارتا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ غیر متبدل ہیں۔ یعنی ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور پھر قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کے لیے "کلمہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "کلمات" اس کی جمع ہے۔ لہٰذا کلمات اللہ وہ تصورات حیات ہیں جن کے مجموعہ کا نام اسلامک آئیڈیالوجی ہے۔ یہ تصورات غیر متبدل ہیں۔ سورہ انعام میں ہے:۔

ترجمہ:۔ "تیرے رب کی طرف سے عطا کردہ نظریۂ زندگی (یا تصور حیات) صداقت اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ ان تصورات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔" (۶/۱۱۶)

یعنی اسلامک آئیڈیالوجی (تصور حیات) مکمل بھی ہے اور ناقابل تغیر و تبدل بھی انہی تصورات کو غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔

جب اسلامی مملکت افراد کی ذات کی نشوونما کے لیے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے تو اس سے لامحالہ مطلب یہ ہے کہ اس مملکت کا سارا کاروبار (خدا کی طرف سے عطا کردہ) مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کے مطابق سرانجام پائے گا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب کسی فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو اس میں (حدود بشری کے اندر) ان صفات کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ (لا محدود انداز میں) صفات خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی ذات خداوندی میں یہ صفات لامحدود انداز میں ہوتی ہیں اور انسانی ذات میں ان صفات کی نمود محدود طور پر ہوتی ہے اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں۔ تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس میں وہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں جنھیں صفات خداوندی کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ایک فرد میں جو مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے، صفات خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے تو جو مملکت ان اقدار کے مطابق قائم ہو گی اور انہی کے مطابق چلے گی اس میں صفات خداوندی کی نمود

شدت اور عظمت کے ساتھ ہو گی۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی خصوصیت اور پہچان یہ ہے کہ وہ بشری معاشرے کی حدود کے اندر "صفات خداوندی" کی مظہر ہوتی ہے۔ اس بحث کو یکجا کرنے سے نتیجہ یہ نکلا کہ

۱۔ اسلامی مملکت کا نظم و نسق مستقل اقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ اور

۲۔ وہ مملکت صفات خداوندی کی مظہر (اور خدائی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کی ضامن) ہوتی ہے۔

قرآن نے مستقل اقدار اور صفات خداوندی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس لیے یہ معلوم کرنے کے لیے کوئی دقت نہیں ہو سکتی کہ فلاں مملکت اسلامی ہے یا نہیں۔ لہٰذا سمٹ سمٹا کر بات یوں سامنے آئی کہ

(الف) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کا نام ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت انہی اقدار کے عملی نفاذ کے لیے قائم ہوتی ہے۔

(ج) اس مملکت کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ وہ افراد مملکت کی جسمانی پرورش اور ذات کی نشوونما کے سامان و ذرائع فراہم کرے۔ اور

(د) اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ ان صفات خداوندی کی مظہر ہو جن کی تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جن سے اسلامک آئیڈیا لوجی ترتیب پاتی ہیں اور جن کی بنیادوں پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے کیونکہ جب تک یہ (مستقل) اقدار سامنے نہ آئیں، نہ اسلامک آئیڈیا لوجی سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسلامی مملکت کا صحیح تصور قائم ہو سکتا ہے لیکن یہ اقدار تو سارے قرآن کریم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انہیں ایک باب میں کس طرح سمویا جا سکتا ہے۔ ان اقدار میں سے چند ایک کا تمثیلاً ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی قدر — احترام آدمیت

ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے وہ شے (پیدائش کے ساتھ) ملتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلی

مستقل قدر یہ ہے کہ

ہر انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی جہت سے قابل عزت ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے
ترجمہ:۔ "یقیناً ہم نے ہر فرزند آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ (۱۷/۷۰)
اس میں کالے گورے، سید پٹھان، امیر غریب، مسلم غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر ابن آدم محض آدمی کا بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی مساوات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

دوسری قدر۔ تعاون

خود قرآن کریم بطور مستقل قدر اس کی تاکید کرتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ تعاونو علی البر والتقویٰ۔ (۵/۲) "زندگی کی کشاد کی راہوں میں اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرو"۔ اس میں تعاون کا حکم ہے اور تعاون کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا، مطلب اس کا یہ ہے کہ مقصد اجتماعی ہو جو سب کو نوع انسانی کی منفعت اور بھلائی کی طرف لے جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تمام افراد تقسیم کار کے اصول کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہ ہے۔" براور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون"۔ اگر اس کے برعکس ایک فرد اپنے ذاتی اور انفرادی مفاد کے حصول کے لیے دوسرے انسانوں کو اس طرح استعمال کرے۔ جس طرح مادی اسباب و ذرائع (مثلاً مشینوں کو) یا حیوانات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ تو وہ انسان نہیں رہتے، مشینوں یا حیوانوں کی سطح پر آجاتے ہیں۔ جن میں ذات نہیں ہوتی۔ یہ انسانی ذات کا انکار اور انسانیت کی تذلیل ہے۔ اس سے فرزند آدم واجب التکریم نہیں رہتا۔ ایسا کرنے میں ہم قرآن کریم کی ایک مستقل قدر کا انکار کرتے ہیں اور قرآن کریم کی کسی مستقل قدر کا انکار کفر ہے۔

ایک انسان حیوانوں کی طرح دوسرے انسانوں کے مفاد کے حصول کا ذریعہ کیوں بنتا ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح اور بیّن ہے۔ اسے احتیاج ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ [illegible] قلی گلیاں کھا کر بھی کام کیے جاتا ہے۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کر[illegible] تو وہ بھوکا مر جائے گا۔ یہ بھوک کا خوف (یا احتیاج) ہے جو ایک انسان کو دوسر[illegible] کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بننے پر مجبور کرتا ہے۔ غلط معاشرے میں ایسے حالات [illegible] جاتے (اور ان حالات کو مستقلاً قائم رکھا جاتا ہے) جن میں بعض افراد [illegible]

ضروریات زندگی) کے لیے دوسرے افراد کے دست نگر رہیں۔ اس سے وہ ان افراد کے مفاد کا ذریعہ بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسلامی معاشرے میں کوئی فرد اپنی ضروریات کے لیے کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔ معاشرہ تمام افراد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لیتا ہے اور اس طرح اس بنیادی علت کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے جو انسانی ذات کے علمی انکار کا موجب اور فرد کی تذلیل کا باعث بنتی ہے۔ یوں اس معاشرے میں اس مستقل قدر پر عمل ہوتا ہے کہ "ہر ابن آدم محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف انسانوں میں قابلیت اور صلاحیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے کمانے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص زیادہ کمانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسرا کم کمانے کی۔ اس طرح بعض افراد کو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ مختلف افراد میں کمانے کی استعداد میں فرق ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن قرآن کریم انسانی ذات کی مستقل قدر پر ایمان سے، ان مفاسد کا بھی صحیح صحیح علاج کر دیتا ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش اس سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے آپ پر صرف کرے۔ لیکن اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے۔ جسے وہ فرد دیگر افراد انسانیہ کی پرورش کے لیے عام کرے۔ لہٰذا جن افراد میں کمانے کی صلاحیت ہو، ان کا یہ بھی ایمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے جس قدر دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیں گے، اتنی ہی ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی اور چونکہ ذات کی نشوونما زندگی کا مقصود ہے۔ اس لیے وہ اپنی کمائی میں سے اپنے لیے صرف بقدر ضرورت رکھیں گے باقی سب کچھ دیگر افراد کی پرورش کے لیے کھلا رکھیں گے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ جو ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

انفاق۔ تیسری مستقل قدر

وہ کون لوگ ہیں جن کی نشوونما کے لیے "انفاق" کی ضرورت پڑتی ہے؟ ان میں سے ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو کسی حادثے کی وجہ سے (خواہ پیدائش ہو یا بعد میں واقع ہو گیا ہو) کمانے کی استعداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی پرورش (دنیا کے موجودہ غیر اسلامی معاشرے میں) امیروں کی خیرات سے ہوتی ہے لیکن خیرات سے انسانی ذات کی جس قدر ذلت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لیے ان کی پرورش کا یہ انتظام

قرآن کریم کے نزدیک ایک مستقل نظام کی حیثیت سے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے ہنگامی حالات میں تو برداشت کر سکتا ہے لیکن اسے معمول حیات نہیں بنا سکتا۔ جس بات سے انسانی ذات کی کسی طرح بھی تذلیل یا تحقیر ہو، قرآن اسے روا نہیں رکھتا۔ اس طبقہ کے متعلق (جو کمانے کی استعداد سے محروم ہو چکے ہوں) قرآن نے کہا ہے کہ وہ اپنے لیے سامان نشوونما بطور حق (AS OF RIGHT) طلب کر سکتے ہیں۔ (حق معلوم للسائل والمحروم۔ ۲۵/۷۰)
یہ بھی قرآن کریم کی ایک مستقل قدر ہے جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ ایک مزدور مہینہ بھر کی محنت شاقہ سے ہزار روپیہ کماتا ہے لیکن اس کے بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات دو ہزار روپے مہینے سے کم میں پوری نہیں ہوتیں۔ یہ مزدور بقایا روپے کہاں سے لائے۔ غیر اسلامی معاشرے کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے جس سے وہ جس طرح بھی چاہے نپٹے۔ وہ مرے، وہ جئے، اس سے کسی دوسرے کو سروکار نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے اس باب میں ایسی مستقل اقدار دی ہیں جو اس مسئلہ کا نہایت اطمینان بخش حل پیش کر دیتی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (۱۶/۹۰) اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

عدل واحسان۔ بطور مستقل اقدار

عدل کے معنی ہیں۔ برابر برابر کر دینا۔ جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ دے دینا۔ اس سے ظلم کی روک تھام ہو گی۔ (ظلم کے معنی ہیں کسی کے حقوق میں کمی کرنا) اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اس سے ان کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو۔ یہ دونوں (یعنی عدل اور احسان) مستقل اقدار ہیں۔ جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جن کا برقرار رکھنا اسلامی معاشرے یا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ قرآن کریم کس طرح "انفاق فی سبیل اللہ" کی مستقل قدر سے انسانی مساوات کو عملاً متشکل کرتا اور انسانی ذات کی صحیح تکریم کی [illegible] بہم پہنچاتا ہے۔ یعنی

(۱) جو لوگ اپنی ضروریات سے زیادہ کما سکیں ان کے لیے مستقل قدر یہ [illegible] کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو، وہ اسے دوسروں کی نشوونما کے لیے کھلا [illegible] (سورہ بقرہ

یں ہے :-

ترجمہ :- "تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لیے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب" (۲/۲۱۹)

(۲) جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں۔ وہ دوسروں کی فاصلہ دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے اور اسے بطور مستقل قدر پیش کرتا ہے۔

(۳) جو محنت کریں، ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دینا بھی مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے اور

(۴) جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو سکتی ہو، ان کی کمی کا پورا کرنا بھی مستقل قدر ہے۔

کوئی محکوم نہ ہو۔ مستقل قدر

اب ایک اور گوشے کو لیجیے جب انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ذاتی مقصد کے حصول کا آلۂ کار نہ بنے۔ تو انسانی ذات کی تکریم کا فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر حکومت نہ کر سکے۔ اس سے اپنا حکم نہ منوا سکے۔ قرآن کریم نے اس اصول کو بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ :-

ترجمہ :- "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین۔ حکومت اور نبوت (تک بھی) عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو" (۳/۷۸) اس ایک اصول نے کس طرح در محکومی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں۔؟

اب سوال یہ ہو گا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا حکم ہی نہ مانے تو معاشرے میں نظم و ضبط کس طرح قائم رہے گا؟ اس طرح تو فساد برپا ہو جائے گا۔ اس اعتراض کا جواب اس آیت کے باقی ماندہ حصے میں آ جاتا ہے۔ جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ وہ اُس کی محکومی اختیار کریں۔ وہ یہی کہے گا کہ وہ اُس کتاب (کی اطاعت) سے جسے وہ پڑھتے پڑھاتے ہیں ربانی بن جائیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم کی اس مستقل قدر کی رو سے اطاعت کسی انسان کی نہیں ہو گی بلکہ قوانین خداوندی کی ہو گی جو اس نے اپنی کتاب میں عطا کر دیے ہیں۔ کسی فرد کی

نہیں بلکہ قانون کی اطاعت۔ اور قانون بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو، بلکہ وہ جو خود خدا نے نوع انسانی کی راہنمائی کے لیے دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں اطاعت کسی انسان کے حکم کی نہیں ہوگی۔ صرف ان قوانین کی اطاعت ہوگی جو کتاب اللہ میں دیے گئے ہیں۔

مشاورت۔ مستقل قدر

اب وضاحت طلب یہ بات ہوگی کہ کتاب اللہ میں تو بیشتر مستقل اقدار یا غیر متبدل اصول ہی دیے گئے ہیں۔ لیکن معاشرے کا نظم و نسق تو اس صورت میں برقرار رہ سکتا ہے۔ جب چھوٹی بڑی تمام باتوں کے لیے احکام و ضوابط موجود ہوں۔

یہ احکام و ضوابط قرآن کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں خود مرتب کیے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے مرتب ہوں گے؟ اس کے لیے بھی قرآن کریم نے ایک مستقل قدر دی ہے جب کہا ہے کہ امرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)

"یہ چیزیں اُمت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت ایک ایسے مشاورتی نظام کا نام ہے۔ جس میں قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے ہر زمانے کے مسلمان، جزئی احکام و ضوابط اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورے سے خود مرتب کریں گے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں یہ صورت نہیں ہوگی کہ ارباب حکومت کا ایک طبقہ الگ ہو اور باقی اُمت ان کی محکوم، ہو بلکہ اس میں حاکم اور محکوم کا فرق ہی نہیں ہوگا۔ اسلامی حکومت اسی لیے وجود میں آتی ہے کہ وہ اسلامی اقدار کا نفاذ کرے اور غیر اسلامی مسالک و ضوابط کی ترویج کو روک دے۔ اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں" امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کہتے ہیں۔ قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو تمام امت کا مشترکہ فریضہ قرار دیا ہے نہ کہ کسی خاص طبقہ، پارٹی یا جماعت کا۔ اس نے پوری اُمت کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ

ترجمہ: "تم بہترین اُمت ہو جسے نوع انسانی کی بھلائی کے لیے تشکیل کیا گیا تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو" (۳/۱۰۹)

لہٰذا قرآن کریم کی اس مستقل قدر کی رُو سے نظم و نسق مملکت میں پوری کی پوری اُمت بلا لحاظ شریک ہوتی ہے اور اس میں حاکم اور محکوم کے الگ الگ

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جب پوری اُمت کے لیے ضابطہ قوانین دیا گیا ہے اور اس ضابطے کو نافذ کرنے کا فریضہ پوری کی پوری اُمت کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا ہے تو اُمت میں فرقوں یا پارٹیوں کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

ترجمہ:۔ "دیکھنا! کہیں تم نے مشرک نہ ہو جانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور گروہوں میں بٹ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہوگئی کہ ہر گروہ اپنے مسلک میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔" (۳۰/۳۱)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا منتہٰی وحدت قانون کی بنیاد پر تمام نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ

ترجمہ:۔ "تمام نوع انسانی ایک قوم ہے۔" (۲/۲۱۳)

اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے، سو جو نظام تمام انسانوں کو ایک برادری کے قالب میں ڈھالنے کا پروگرام اپنے سامنے رکھتا ہو، وہ خود اپنے اندر فرقوں اور پارٹیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس کے نزدیک انسانوں کی تقسیم کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی کفر اور ایمان۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی مستقل اقدار کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کریں وہ ایک قوم کے افراد۔ اور جو اس کے خلاف انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ وہ دوسری قوم کے افراد قومیت کا یہ معیار بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے اور قرآن کریم کے دوسرے اصولوں کی طرح غیر متبدل ہے۔ اور جب قرآن کریم کی رو سے تمام مسلمان ایک قوم کے فرد ہیں تو وہ اُمت میں فرقوں اور پارٹیوں کے وجود کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟ اسلامی نظام وحدت قانون اور وحدت اُمت کی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے۔

معیار قومیت۔ مستقل قدر

قرآن کریم کی رو سے معیار قومیت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی متعین کردہ مستقل اقدار کو اپنا نصب العین حیات قرار دے لیں وہ ایک قوم کے فرد۔ جو اس سے انکار کریں وہ دوسری قوم کے افراد۔ تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح آج ہر قوم اپنے اپنے مفاد کے تحفظ میں سرگرم تگ و تاز رہتی ہے۔ اور اسے نہ صرف یہ کہ دوسری اقوام کے مفاد کا کوئی خیال نہیں ہوتا بلکہ اگر

کسی دوسری قوم کا مفاد اُس کے مفاد سے ٹکرائے تو وہ اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کے نقصان کی قطعاً پروا نہیں کرتی۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں بھی ہو گا۔ قطعاً نہیں۔ اسلامی معاشرے میں تمام لوگ "فرزندان آدم" تسلیم کیے جائیں گے اور ان تمام حقوق و مراعات کے مستحق ہوں گے جو مستقل اقدار کی رو سے ہر فرد آدم کو (بطور استحقاق) ملتی ہیں۔ قرآن کریم اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ

ترجمہ:۔ "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز اسلامی طرز زندگی سے قریب ہے۔" (۵/۸)

عدل ہی نہیں بلکہ یہ لوگ اسلامی نظام کی تمام نفع بخشیوں میں حصہ دار ہوں گے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی ایک بنیادی مستقل قدر یہ بھی ہے کہ

ما ینفع النّاس فیمکثُ فی الارض (۱۳/۱۷)

"بقاء اور دوام اسی کے لیے ہے جو تمام عالم انسانیت کے لیے نفع بخش ہے۔"

"النّاس" میں اپنے اور پرائے۔ مومن و کافر سب شامل ہیں۔ قرآن کریم کا خدا رب العالمین ہے۔ اس کا رسولؐ رحمۃ اللعالمین اور خود قرآن ذکر اللعالمین۔ اس لیے اسلامی مملکت کی نفع بخشیاں تمام نوع انسانی کے لیے ہیں۔

یہ ہے اسلامی آئیڈیالوجی کا مختصر سا تعارف۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جو اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔

(۲) جب کوئی مملکت ان اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے لے تو اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں اور

(۳) جو دستاویز اس کے اس نصب العین کا اعلان کرے اور مملکت کی عمارت کو ان اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنے کا نقشہ مرتب کر کے دے اسے اسلامی آئین کہیں گے۔ اسلامی آئین کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ

(الف) انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کے جسم کی پرورش کے لیے طبیعی ضروریات کی ذمہ دار ہو اور ان کی ذات کے ارتقاء کے لیے ایسے سامان و ذرائع فراہم کرے۔ جس سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔

(ج) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ براٴ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں۔

(۴) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جو اسلامی تعلیمات میں محفوظ ہیں۔ اس لیے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

(۵) مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات میں صفات خداوندی کی (حدود بشریت کے مطابق) نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں افراد اور مملکت دونوں صفات خداوندی کے مظہر ہوتے ہیں۔

(۶) مستقل اقدار کی رو سے

(الف) ہر انسان بحیثیت انسان واجب التکریم ہے۔

(ب) کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اطاعت ہر ایک کو قوانین خداوندی کی کرنی ہوتی ہے جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔

(ج) ہر فرد پوری پوری محنت کرکے کمائی کرتا ہے لیکن اس میں سے اپنے لیے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتا ہے۔ باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

(د) ہر ایک سے عدل کیا جاتا ہے (حتیٰ کہ دشمن سے بھی) اور جن افراد میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائے۔ اس کمی کو پورا کر دیا جاتا ہے۔

(ر) تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری سمجھا جاتا ہے اور اسلامی مملکت کے نظام ربوبیت میں ہر انسان کا برابر کا حصہ ہوتا ہے۔

(س) اسلامی مملکت مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے

تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین ملت کی مشاورت سے خود مرتب کرتی ہے۔ ان جزئی قوانین میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن مستقل اقدار اپنی جگہ غیر متبدل رہتی ہیں۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے معاشرہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہیں اسلامک آئیڈیالوجی کے نمایاں خدوخال۔

باب ۲

برصغیر میں مُسلم مُعاشرے کا ارتقاء

برصغیر کی تاریخ کا سنہرا دور مُسلم دور ہے۔ جسے ہم برصغیر کے ایک جغرافیائی خطے سے ایک ملک بننے کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ محض واقعات کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ ہندوستانیوں کے ایک مرکز پر جمع ہونے، قومیت کا شعور اختیار کرنے اور ان کی تہذیب و ثقافت میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینا بھی ہے۔

اب اگرچہ ہم مسلمانوں کی آمد سے قبل کے سیاسی، جغرافیائی، معاشرتی اور ثقافتی حالات کا جائزہ لیں گے، لیکن اس سے یہ نتائج بھی اخذ کریں گے کہ:

۱۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر ایک ملک نہیں تھا بلکہ بہت سی جاگیروں اور ریاستوں کا علاقہ تھا۔

۲۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں کے لوگ قومیت کے شعور سے ناآشنا تھے۔ مسلمانوں نے انھیں ایک مرکز پر جمع کیا۔

۳۔ برصغیر قدرتی طور پر دو سے زائد جغرافیائی خطوں میں منقسم تھا۔

۴۔ شمالی ہندوستان جو اب پاکستان، نیپال اور بنگلہ دیش کہلاتا ہے۔ ہمیشہ جنوبی ہندوستان سے الگ حیثیت کا حامل رہا۔

۵۔ مسلمانوں کی آمد سے اس علاقے میں تہذیبی قدروں کی نشاۃ ثانیہ ہو سکی۔ یعنی وہ قدریں دوبارہ رونما ہوئیں۔

سیاسی حالات

شمالی ہندوستان میں برصغیر خصوصاً پاکستان کا موجودہ علاقہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ سرحد، پنجاب اور بلوچستان میں یعنی کابل اور قندھار سے ملتان تک بدھ مت کا دور دورہ تھا۔ سندھ میں برہمنوں کو طاقت اور فوقیت حاصل تھی لیکن ہندو ثقافت کا شان دار قدر

ختم ہوئے دو صدیاں گزر چکی تھیں۔ گپت خاندان کی شان و شوکت اور استحکام اشوک کا انصاف اب پرانے زمانے کی کہانیاں تھیں۔ ہندو حکمران ہرش کی وفات کے پانچ سال بعد تک برصغیر میں طوائف الملوکی یعنی خود مختار کے رجحانات کا دور رہا۔ کوئی ایک مرکزی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ مختلف جگہوں پر زمینداریاں اور جاگیریں تھیں۔ جس کا بس چلتا اپنی جاگیر میں توسیع کر لیتا اور دوسروں کی جاگیر چھین لیتا۔

پنجاب پر پانچویں صدی عیسوی سے راجپوت حکمران تھے۔ سندھ پر برہمنوں نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ بلوچستان میں کئی قبائلی سردار حکومت کر رہے تھے اور کشمیر بھی مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس دور میں صرف قنوج، اجمیر، بنگال اور دکن میں کچھ ہندو راجاؤں نے ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ برصغیر میں مرکزیت اور یہاں کے باشندوں میں ہندوستانی ہونے کا شعور بھی موجود نہیں تھا۔

برصغیر کی اس طوائف الملوکی کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان ایک جغرافیائی خطہ تو ہے لیکن یہ کبھی بھی ایک قوم کا مسکن نہ بن سکا۔ مقامی افراد میں جذبۂ قومیت سرے سے موجود نہ تھا اگر ایسا ہو بھی جاتا تو شمالی اور جنوبی ہندوستان پھر بھی اکٹھے نہ ہو سکتے تھے کیونکہ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دونوں خطوں کے درمیان قدرتی رکاوٹیں موجود تھیں۔ ان رکاوٹوں کو مسلمان حکمرانوں نے بھی محسوس کیا تھا۔ دریائے سندھ اور گنگا کے میدان ایک جغرافیائی وحدت تھے اسے شمالی ہندوستان کہا جاتا ہے۔ اس سے نیچے کا علاقہ الگ سے جزیرہ نظر آتا ہے۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان تہذیبی طور پر بھی دو الگ الگ خطے رہے ہیں۔ زبان، مذہب، فن تعمیر، آرٹ، لباس، خوراک۔ غرض کہ ہر شے میں اختلاف موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب (جو کابل سے دہلی تک تھا) کشمیر، بلوچستان اور سندھ کی حیثیت ہمیشہ باقی ہندوستان سے الگ رہی۔ بلکہ ہندوستان جانے والے قافلے اور فوجیں ان علاقوں کو محض گزر گاہ سمجھتی تھیں۔ قدیم زمانے میں ہندوستان کی حدیں دریائے سندھ کے مغرب کی طرف آتی ہی نہیں تھیں۔ سندھ اور بلوچستان تو دور دراز کے علاقے سمجھے جاتے تھے۔ گویا عملاً موجودہ پاکستان کا علاقہ ہندوستان سے الگ جغرافیائی اور تہذیبی حیثیت کا حامل تھا۔

دوسری طرف گونڈوانا، راجپوتانہ، نیپال اور آسام یا بنگال بھی کبھی ہندوستان میں شامل نہیں سمجھے گئے۔ اگرچہ مسلمان حکمرانوں نے اس سارے علاقے کو اپنے ماتحت کرنے کی کوشش۔ محمد تغلق

نے تو دارالحکومت بھی جنوبی ہند میں قائم کرنا چاہا۔ اورنگ زیب نے دکن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہندوستان نہ تو ایک ملک تھا اور نہ ایک مرکز کے تحت رہ سکتا تھا۔ فطری طور پر اسے بالآخر پاکستان، بھارت، نیپال، بنگلہ دیش اور آسام وغیرہ تقسیم ہونا تھا۔

شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد سے قبل جو طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں جابجا خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ انھیں شخصی جاگیریں کہنا زیادہ مناسب ہوگا ان میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ **گندھارا** ٹیکسلا اور اس کے اردگرد کے علاقے کو گندھارا کہا جاتا ہے۔ یہ قندھار سے سوات تک اور کابل سے جہلم تک کا علاقہ تھا۔ کبھی یہ ریاست راجہ اشوک کی عظیم الشان سلطنت اور بدھ مت کا بہت بڑا مرکز تھی۔ لیکن اب یہاں ایک کھشتری خاندان حکومت کرتا تھا۔ جو علم دشمنی میں مشہور تھا۔ نویں عیسوی میں اس کی جگہ ایک ہندو خاندان حکمران ہوا۔ اس خاندان کے راجہ پال کو پہلے سبکتگین اور پھر محمود غزنوی نے شکست دی۔ اس کا بیٹا آنند پال بھی شکست کھا کر سلطنت ہاتھ سے کھو بیٹھا۔

۲۔ **کشمیر** ہرش کے دور میں کشمیر ایک خود مختار ریاست تھی۔ تیرھویں صدی عیسوی تک یہاں مختلف خاندان حکمران رہے۔ رام چند کی بیٹی نے تبت کے رین چن سے شادی کر کے اسلام قبول کر لیا۔ رین چند نے رام چند کو شکست دی۔ اور کوئی پندرہ سال بعد چودھویں صدی میں کشمیر شاہ مرزا کے قبضے میں آیا۔ ۱۳۹۴ء میں سلطان سکندر بت شکن کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ بنا۔ اس کے دور میں برہمنوں کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔

۳۔ **بلوچستان** زمانہ قدیم میں بلوچستان ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھا۔ یہ علاقہ مرکز سے بہت دور تھا۔ قبائلی جنگیں عام تھیں۔ ۱۵۴۰ء میں جب ہمایوں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس نے بلوچوں کو یہاں سے نکال کر پنجاب میں آباد کر دیا۔ اسلام قبول کرنے میں بلوچستان سب سے آگے تھا۔ سندھ پر قبضے سے بہت پہلے ۳۸ھ میں حضرت علیؓ کے دور میں مسلمان بلوچستان آئے۔ اس وقت حکمران تک کا علاقہ سندھ کہلاتا تھا۔ پہلی صدی ہجری میں پہلا مسلمان حاکم راشد بن عمرو تھا جس نے کچھی سے خضدار اور ساحل مکران تک علاقے پر حکومت قائم کر رکھی تھی۔

۴۔ لاہور مسلمانوں کی آمد سے قبل لاہور پر ہندو راجاؤں کی حکومت تھی۔ شیخ اسماعیل پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ۱۰۰۵ء میں لاہور میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ غزنوی عہد میں داتا گنج بخش حضرت سید علی ہجویری لاہور تشریف لائے اور انھوں نے لاہور کے ہندو نائب رائے راجو کے علاوہ گوجروں، جاٹوں اور برہمنوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔

۵۔ سندھ سندھ ہمیشہ سے برصغیر کا ایک دُور دراز خود مختار علاقہ رہا ہے۔ یہ تو آباد تھا اور نہ زرخیز۔ سندھ کی یہ حالت تیرہویں صدی عیسوی تک رہی۔ ہندوستان کے شکست خوردہ حکمران ہمیشہ سندھ کی طرف پناہ ڈھونڈتے رہے۔ ہرش کے دَور کے بعد سے سندھ خود مختار ہوگیا۔ حتیٰ کہ جب مسلمانوں نے سندھ کو فتح کیا تو یہاں ایک برہمن حکمران چچ کی حکومت تھی۔ اس کی سلطنت دیبل سے ملتان تک تھی۔ راجہ داہر اس کا بیٹا تھا۔ محمد بن قاسم مکران سے پنجگور پہنچا تھا۔ اس نے دیبل فتح کیا اور اندرون سندھ، ملتان اور پنجاب میں دیپالپور تک چلا آیا۔ کچھ عرصہ بعد جنید بن عبدالرحمان سندھ کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے اجین، مارواڑ، ملہار اور گجرات تک اپنی فتوحات کا دائرہ بڑھا لیا۔

۶۔ دہلی اور اجمیر چھٹی سے بارہویں صدی تک اجمیر میں چوہان راجپوتوں کی حکومت قائم تھی۔ اس کا درجہ پرتھوی راج معروف تھے۔ ۱۱۸۲ء تک اس نے دہلی اور بندھیل کنڈ تک حکومت قائم کر لی تھی اس نے ۱۱۹۲ء میں محمد غوری کے ہاتھوں شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔

۷۔ دیگر ریاستیں شمالی ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں مالوہ اہم ہے۔ وہاں کے راج بھوج کے انتقال ۱۰۶۵ء کے بعد یہ ریاست زوال پذیر ہوئی اور ۱۳۰۵ء میں علاؤ الدین خلجی نے اسے اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔

دوسری ریاست گجرات تھی۔ جہاں گوجروں کی حکومت تھی۔ محمود غزنوی نے یہاں کے معروف مندر سومنات کے بُت توڑے تھے۔ علاؤ الدین خلجی نے اسے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ میواڑ کی سلطنت بڑی سخت جان ثابت ہوئی۔ اس کا رانا سانگا بالآخر بابر سے شکست کھا گیا۔ شمالی ہندوستان کی دُور دراز اور خود مختار ریاست بنگال تھی۔ وہاں سین اور پال خاندان حکمران رہے۔ غوری عہد میں بختیار خلجی نے ۱۲۰۲ء میں لکشمن سین کو شکست دے کر بنگال کو مسلم ریاست میں شامل کر لیا۔ ہمالیہ کے علاقے جغرافیائی محل وقوع کی بناء پر کبھی ہندو

کا حصہ نہ بن سکے۔ یہاں نیپال کی ریاست قائم تھی۔ مسلمانوں کی سندھ میں آمد کے وقت نیپال میں ایک گورکھا خاندان کی حکومت تھی۔ یہی حال آسام کا تھا۔ اسے بھی بختیار خلجی نے فتح کرلیا۔

جنوبی ہندوستان اپنے محل وقوع کے لحاظ سے ہمیشہ حملہ آوروں سے بچا رہا۔ مبلغین اسلام نے یہاں جانا گوارا نہیں کیا۔ محمد تغلق، علاؤالدین خلجی اور اورنگ زیب یہ تین حکمران ہیں۔ جو جنوبی ہندوستان یا دکن کو اپنے قبضے میں رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی سے نیچے کا علاقہ مجموعی طور پر مشرف بہ اسلام نہ ہو سکا۔ ان علاقوں میں آندھیرا، پلوا، چالوکیہ۔ راشٹر کوٹ، دیوگیریا، میسور، کرناٹک، وارنگل، پانڈیا، چیرا اور چولا کی ریاستیں اہم تھیں۔

معاشرتی صورت حال

مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر کا معاشرہ مختلف طبقوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ فرعون نے تو معاشرے کے دو گروہ بنائے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ لیکن برہمنوں نے برصغیر میں کئی ذاتوں کو طبقوں کی صورت دے رکھی تھی۔ تمام ہندو چار بڑی ذاتوں میں منقسم تھے اور غیر ہندوؤں کو کئی ملیچھ ذاتوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ ہر ذات نے خود کو دوسری ذات سے الگ کر رکھا تھا۔ یہ ذاتیں مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ **برہمن** یہ بلند ترین ذات تھی۔ برہمنوں کا خیال تھا کہ وہ برہما (خدا) کے سر سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے انھیں معاشرے میں اعلیٰ ترین اور امتیازی مقام حاصل ہے۔ سوچ بچار کرنا، علم حاصل کرنا اور حکومت کرنا ان کا کام تھا۔ معاشرے پر ان کی بالادستی قائم تھی۔

۲۔ **کھشتری** برہمن کے بعد طاقت ور ترین ذات کھشتری کی تھی۔ برہمنوں کا خیال تھا کہ کشتری برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کا کام لڑنا اور ملک کی حفاظت کرنا تھا۔ فوج، حکومت اور ایسے منصب ان کے لیے ہوتے تھے۔ شکست خوردہ کھشتری، اچھوت یا شودر بن کر جاتا تھا۔ معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہ تھا۔

۳۔ **ویش** یہ تیسری ذات تھی۔ اس کے بارے میں عقیدہ تھا کہ اس ذات کے لوگ برہما کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے تجارت، کھیتی باڑی، صنعت وحرفت ان کا کام تھا۔

۴۔ **شودر** برہمنوں کے نزدیک برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے تھے ان کا کام مندرجہ بالا تینوں ذاتوں کی خدمت کرنا تھا۔

۵۔ اچھوت، ملیچھ مندرجہ بالا چار ذاتوں کے علاوہ کئی اور ذاتیں بھی تھیں۔ جنھیں اچھوت، ملیچھ یعنی پلید کہا گیا۔ یہ غیر ہندو ذاتیں تھیں یا کم تر درجے کے شودر۔ ان میں پیشہ ور لوگوں، دھوبیوں، مچاروں، جولاہوں سے لے کر بدھا ڈوم تھی۔ حتیٰ کہ ان مذاہب کے ماننے والے بھی شامل تھے۔ جو ہندو مت میں شامل نہ ہو سکے۔ مثلاً چنڈال، عیسائی اور مسلمان ملیچھ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا، ہاتھ ملانا، بلکہ بات تک کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ برہمنوں کے علاوہ کسی کو وید سننے کی اجازت تک نہ تھی۔ ان ذاتوں کی تعداد ۳۶ تک بتائی جاتی ہے۔ تاہم اچھوتوں کی لاکھوں قسمیں تھیں۔

ذات پات کا یہ نظام اخلاقی کمزوریوں کا سبب بنا۔ ہر طبقہ دلی طور پر دوسرے سے نفرت کرتا تھا۔ انفاق، تعصب، نخوت، حسد اور بغض کے جذبات موجود تھے۔ معاشرتی بنیاد میں ظلم و ستم موجود تھا۔ مساوات نہ ہونے کے باعث باہمی نفرتیں اور دشمنی کے جذبات کا پیدا ہونا فطری تھا۔ مذہب نے بتایا تھا کہ کسی ذات میں پیدا ہونا ان کا مقدر ہے اور یہ پچھلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ جو انھیں بھگتنا ہے۔ اس سے ان میں ترقی کی اُمنگ اور زندگی کو بہتر بنانے کا جذبہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ غیر منصفانہ معاشرتی تقسیم بالآخر ایک ایسے نظام کو یہاں لانے کا سبب بنی جس میں مساوات اور رواداری موجود تھی۔ جیسے ہی مسلمانوں نے یہاں قدم رکھا، کچلے ہوئے لوگ ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے جمع ہو گئے۔

شادی معاشرے کی بنیادی رسم ہے۔ ہندو معاشرے میں بچپن کی شادی عام تھی۔ شادی صرف خاندان یا ذات کے اندر ہو سکتی ہے۔ برہمن کو چار شادیاں کرنے کی اجازت تھی اور درجہ بدرجہ شودر کو صرف ایک شادی کرنے کی اجازت تھی۔ البتہ راجہ پر شادیوں کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ شوہر مر جاتا تو بیوہ کو عمر بھر دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہ ملتی۔ بعض جگہ تو ستی کی رسم تھی۔ بیوہ آگ میں جل کر مر جاتی تھی، خودکشی کی عام اجازت تھی۔ بوڑھے، محتاج، اپاہج، مریض اور بیوہ خودکشی کر سکتے تھے۔ سود خوری اور قمار بازی عام تھی۔ شراب خوری کثیر آبادی کا شیوہ تھی۔

ہندو معاشرے میں عورت انتہائی کم تر اور ذلیل ترین مخلوق تھی۔ ہندو دھرم کے مطابق بچپن میں لڑکی کو باپ کی فرماں بردار ہونا چاہیے۔ جوانی میں شوہر کی خدمت کرنا چاہیے۔ بیوگی [illegible] بیٹوں کے زیر دست رہے یا ستی ہو جائے۔ مردوں پر اخلاقی پابندی نہیں تھی۔ لیکن عورت سے باکردار ہونے کی توقع کی جاتی تھی۔ عورت صرف ایک مرد کی تھی۔ شوہر اگر بچپن میں [illegible]

عام آدمی کے پاس مذہبی تعلیمات نہ ہونے کے برابر تھیں وہ جسے چاہتا، خدا بنا لیتا اور جسے چاہتا حقیر سمجھ لیتا۔ ایک بنیادی خیال یہ تھا کہ کائنات کو بہت سے دیوتا مل کر چلا رہے ہیں۔ ہر عمل کے لیے کوئی نہ کوئی دیوتا ذمہ دار ہے۔ اس لیے اسے خوش کرنے کے لیے اس کی پوجا ضروری ہے۔ اس پوجا میں قربانی اور نذریں دینا یا بھینٹ چڑھانا اہم عناصر تھے۔ بعض اوقات یہ نذر انسانی جان قربان کر کے بھی دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے عموماً شودر اور اچھوت استعمال میں لائے جاتے تھے۔ برہمن خود کو قربانی سے بالا تر قرار دیتے تھے۔

معاشی حالت

برصغیر میں تجارت ویش کے ہاتھ میں تھی جو نسل در نسل اپنے کام کے ماہر ہوتے گئے۔ روم، یونان، چین، مصر اور عرب تک ان کے تجارتی قافلے جاتے تھے۔ ملک کی کئی بندرگاہوں میں بحری جہاز تجارتی مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ مالا بار اور دیبل کی بندرگاہیں مسلمانوں کی آمد کے وقت قابل ذکر ہیں۔ اندرون ملک نیرن کوٹ، سیوستان، خضدار، اروڑ، منصورہ، ملتان، گجرات، مدراس اور بنگال تک تجارت تھی۔ مسلمانوں نے بھی اسے خوب ترقی دی۔ ملتانی اور گجراتی تاجر اسی وقت سے معروف چلے آرہے ہیں۔

ویش کو اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ برہمن کو پیش کرنا پڑتا تھا جو مندر میں بیٹھ کر اس کے لیے دعا کرتا تھا۔ اس طرح برہمن تجارت سے جونک کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت میں منافع کی شرح بہت بڑھ گئی اور مال میں ملاوٹ روز مرہ کا معمول بن گئی۔ صنعتی لحاظ سے برصغیر نے کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں کی تھی۔ اس دور میں کوئی قابل ذکر صنعت نہیں تھی۔

برصغیر بنیادی طور پر زرعی علاقہ ہے۔ چونکہ اس کا معاشرہ بھی زرعی معاشرہ تھا۔ دیہات قائم ہوئے، زمینداریاں وجود میں آئیں اور لوٹ کھسوٹ کا ایک طویل سلسلہ جاری ہوا۔ زراعت میں ترقی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دریاؤں کے اردگرد کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ یہ کام کسان کا تھا۔ زمیندار نئی زمینیں آباد کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، زرعی سہولتیں مہیا کرنا کسان ہی کا کام ہوتا تھا، جو بے حد غریب تھا۔ اس کے باوجود پنجاب کا علاقہ برصغیر کے لیے اناج مہیا کر رہا تھا۔ کسی حد تک زراعت دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر ہوتی تھی۔ بلوچستان کا علاقہ چٹیل اور سنگلاخ میدانوں پر مشتمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہندوستان کے بارے میں حکیم بن جبلہ سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"وہاں کا پانی میلا، پھل کسیلے اور کھٹے ہیں۔"

"زمین پتھریلی ہے اور شور یدہ ہے۔"

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آبادی کا کثیر حصہ زراعت میں مصروف تھا۔ دالیں، گندم، باجرہ، جو، مٹر، چاول، گنا اور کپاس مخصوص فصلیں تھیں۔ شراب عام طور پر گنے کے رس سے کشید کی جاتی تھی اگر فصل اچھی ہو جاتی تھی تو تجارت بھی عمدہ ہوتی۔

تجارت اور زراعت کا دارومدار روپے پر تھا، کسان اور عام تاجر کے پاس لگان، قحط اور لوٹ مار کے بعد روپیہ قرض لینا پڑتا، یہ ساہوکار سود پر روپیہ دیتے۔ اس سود کی شرح عموماً دس فی صد سالانہ سے دو سو فی صد سالانہ تک ہوتی۔ سود کی رقم پر بھی سود مرکب وصول کیا جاتا۔ قرضے کی رقم تو تھوڑی ہوتی تھی۔ سود مرکب اسے کئی گنا بنا دیتا۔ چنانچہ لوگ مشکل ہی سے سود ادا کر پاتے اور اصل قرض سے عمر بھر غلامی کا طوق پہنے رکھتے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد تک یہاں کا ہر باشندہ ساہوکاروں کے پنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی تک برصغیر میں عام معاشی حالت دگرگوں تھی۔ روپیہ، سونا، چاندی اور قیمتی جواہر راجاؤں، برہمنوں اور ساہوکاروں کے پاس ہوتے تھے۔ عوام ایک وقت کے بعد دوسرے وقت کی روٹی کی تلاش میں رہتے۔ غربت کے باعث عوام لباس نہ پہن سکتے۔ زیادہ سے زیادہ لنگوٹی ان کے پاس ہوتی۔ رفتہ رفتہ چادر سے جسم ڈھانپا جانے لگا۔ مسلمانوں نے یہاں کے لوگوں کو شلوار، قمیص اور پاجامے سے روشناس کرایا۔ چنانچہ، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں شلوار قمیض نے روشناس کرایا۔ چنانچہ، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں شلوار قمیض نے رواج حاصل کیا۔ لیکن اندرون پنجاب کے دیہات میں آج بھی چادر اور لنگوٹی ہی لوگوں کا لباس ہے۔

ساہوکاروں کے پنجوں میں جکڑے ہونے کے باعث چھوٹے زمینداروں اور تاجروں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکثر انھیں اپنی جائیدادوں سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ سود پر روپیہ دینا آسان کام تھا۔ اس سے روپے والوں کے ہاں دولت کے مزید انبار لگتے، جسے استعمال کرنے کے لیے بھی ایسے ہی راستے ڈھونڈے جاتے۔ چنانچہ جوا اور قمار بازی عام تھی۔ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنے کی سوچ سے بے ایمانی، ملاوٹ، رشوت، فریب، جوا، قتل وغیرہ جیسے اخلاقی جرائم پیدا ہو چکے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کا معاشرہ اخلاقی اور معاشرتی طور پر کئی خرابیوں کا شکار تھا۔

تو عورت تمام عمر بیوہ رہتی۔ اس کا سر منڈھ دیا جاتا، لباس صرف سفید رہتا، تقاریب میں جانا اس کے لیے ممنوع ہو جاتا۔ اور گھر میں نوکر کی طرح کرنا پڑتا یا پھر اس ذلت سے بچنے کے لیے اس پر لازم تھا کہ وہ شوہر کی چتا میں جل کر ستی ہو جائے۔ بعض عورتیں طوائف بھی بنتیں۔ لیکن ان کے لیے رہنے کی جگہ گھر کی بجائے مندر ہوتا تھا۔ یہ دیوداسیاں تھیں اور گانے بجانے اور عصمت فروشی سے مندر کی آمدنی میں اضافہ کرتیں۔ عصمت کی عزت صرف ماں کی صورت میں تھی۔

ہندوؤں کا رہنا سہنا غلاظت آمیز تھا۔ یہ اپنے جسم کے کسی حصے کے بال نہ تراشتے تھے۔ جسم زیادہ تر ننگا رہتا، ناخنوں کو بڑھاتے، جوؤں کی حفاظت کرتے، الگ الگ کھانا کھاتے اور بچا کھچا کھانا پھینک دیتے، گائے کا پیشاب پیتے۔ مصافحہ کرتے وقت دوسرے کے ہاتھ کو الٹی طرف سے پکڑتے گھر میں بلا اجازت داخل ہو جاتے۔ لیکن جانے کے لیے باقاعدہ اجازت طلب کرتے، ان کی عام خوراک اناج، گھی، دودھ اور تیل تھی۔ گوشت، مچھلی اور لہسن سے پرہیز کرتے تھے۔

ہندومت میں تعلیم حاصل کرنے کا حق صرف برہمنوں کو تھا۔ توشالی، پاٹلی پتر، ٹیکسلا اور سیالکوٹ کی درس گاہیں قائم تھیں لیکن یہاں بھی صرف اونچی ذات کے لوگ داخلہ لے سکتے تھے۔ علوم کے سلسلے میں بھی ہندوؤں کے ہاں تعصب کارفرما تھا۔ اس لیے یہ دیگر قوموں کے علوم سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ ویدوں کا سننا بھی صرف برہمنوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی شودر ان کا کوئی اشلوک سن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ سنسکرت ہندوؤں کی علمی زبان تھی۔ اس کی تدریس میں بھی برہمن بے حد بخیل تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر میں تعلیم نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اور سنسکرت مردہ زبان ٹھہری۔

برصغیر کو اگر دیہی معاشرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دیہات آج بھی یہاں کے سیاسی اور معاشرتی امور کی نگرانی کر رہا ہے۔ زمینداریاں اور دیہی برادریاں دیہات میں قائم ہیں۔ یہ صورت حال مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی موجود تھی۔ ہرش کی مستحکم حکومت کے خاتمے کے بعد ملکی کا تصور شہروں سے دوری تک محدود تھا۔ چنانچہ دیہات کے باشندے خود کو آزاد [illegible] تے۔ زمین ان کی ملکیت ہوتی۔ بے زمین دیہاتی مزدوروں کا ایک طبقہ بھی وجود میں آچکا [illegible] ن ادا کرکے زمین ٹھیکے پر لیتا ہے۔ لگان کی عدم ادائیگی یا خشک سالی اور قحط میں

اسے زمین سے بے دخل ہونا پڑتا ہے۔ کسان کا کام فصل اگانا اور زمیندار کا کام اسے اُٹھا لینا ہوتا تھا۔ کسان ہمیشہ زمیندار کے رحم و کرم پر رہتا تھا۔ یہی زمیندار اس کا راجہ بھی ٹھہرتا اور مذہبی، قانونی اور سیاسی امور بھی طے کرتا۔ سیاست ہمیشہ زمینداروں کے ہاتھ رہی۔ جو اپنی آزادی پر کوئی حرف نہ آنے دینا چاہتے تھے اسی لیے متحد نہ ہو سکے۔ سوائے اس کے کہ کسی اور طاقت ور یا حکمران نے انھیں باجگزار ہونے پر مجبور نہ کر دیا۔ پنجاب اور سندھ کا کسان بے حد مفلوک الحال اور ستم رسیدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حملہ آوروں کو یہاں سے اپنی فوجوں میں بھرتی کرنے کے لیے کثیر تعداد میں افرادی قوت مہیا ہوتی رہی۔ مسلمانوں کی آمد پر یہ ان کے لشکروں میں بھی شامل ہوتے اور مسلمان ہوتے رہے۔ اس وقت بلوچستان میں بلوچوں، گوجروں، راجپوتوں، اور جاٹوں کی زمینداریاں قائم تھیں۔ دیہات کی زمینداریاں سیاسی برادریوں میں تبدیل ہو چکی تھیں ان کی زندگی بے حد تنگ نظری پر بنی تھی اس لیے یہ ملک کی سیاسی زندگی کا سرمایہ نہ بن سکی۔ حملہ آوروں کی آمد کے وقت بعض واقعات میں یہ برادریاں متحد ہو کر اپنا دفاع تو کر لیتیں لیکن مرکز کے ساتھ ان کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راجہ عموماً مطلق العنان اور سخت گیر حاکم ہوتے تھے۔

مذہبی حالت

اسلام سے قبل برصغیر میں دین نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ ہر طرف جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت کا تصور موجود نہ تھا۔ کروڑوں دیوتاؤں کی پوجا ہوتی۔ لکڑی، پتھر، مٹی یا دھات سے ان دیوتاؤں کے بُت بنائے جاتے اور انسان خود اپنے بنائے ہوئے بُتوں کے آگے سجدہ ریز ہوتے۔

مذہب انسان کو نیکی کی راہ سکھانے کے لیے وجود میں آیا۔ لیکن برصغیر میں مذہب نے انسان کو انسان سے نفرت اور ذات پات میں مقید ہونے کا سبق دیا۔ شوالے اور مندر طوائفوں اور دیوداسیوں کا مرکز بن گئے۔ جو عصمت فروشی سے مندر کے اخراجات پورے کرتی تھیں۔

حکومت کے ہر شعبے پر مذہب کی گرفت تھی۔ مذہبی احکام کی خلاف ورزی ریاست سے بغاوت کہلاتی تھی۔ ان کے نزدیک راجا کو حکومت کرنے کا حق خدا کی طرف سے ملا تھا۔ اس لیے اس کی حیثیت ایک دیوتا کی ہوتی تھی۔ جس کی پُوجا ضروری تھی۔ اس کے آگے سجدہ کیا جاتا۔ وہ کسی کے مشورے کا پابند نہ تھا۔ سوائے مذہبی پیشوا یعنی برہمن کے۔

بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُسے محض ایک نائب کی حیثیت سے اس وقت تک حکمرانی کے
فرائض انجام دیتے ہیں۔ جب تک کہ عبدالرحمٰن عرب سے واپس نہ آجائے۔ عبدالرحمٰن کی مراجعت
کا انتظار مستقلاً کیا جاتا ہے۔ ٹراونکور کے مہاراجہ زمورین کے جانشین ہیں۔ اپنی تاج پوشی کے
موقع پر شمشیر امتناد کو قبول کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کرتے ہیں کہ وہ اس شمشیر کو اس وقت تک
رکھے رہیں گے جب تک عم محترم جو مکہ معظمہ گئے ہیں۔ واپس تشریف نہ لے آئیں۔" سب سے
پہلا باہمی تصادم جس کا علم ہو سکا ہے وہ پانڈے راجہ اور سید ابراہیم شہید جانشین نذولی کے
درمیان ہوا تھا۔ سید ابراہیم ۱۲۱۷ء میں شہید ہوئے۔ مسلم مقبوضات میں خود اُن کے اپنے مقرر
کردہ قاضی ہوا کرتے تھے جو ان کے مقدمات کا فیصلہ مسلمانوں کی اپنی فقہ کی رو سے کیا کرتے
تھے۔ ساتھ ہی ساتھ مفتی بھی موجود تھے جو دینی معاملات میں مستند فتویٰ صادر کیا کرتے تھے۔
یہ لوگ بالعموم علوم پر کامل دست گاہ رکھنے والے عالم فاضل متقی زاہد اور پاک طینت و نیک
سیرت ہوتے تھے۔

مغربی ساحل سے ہٹ کر مسلمان تجار اور ملاحوں نے ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی
بود و باش اختیار کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ شمال میں بھی بالخصوص کشمیر میں اسلام بہت پہلے داخل ہوا۔
ایک شخص مسمّی محمد العلفی سے جو عربی النسل تھا حجاج ناخوش ہو گیا۔ چنانچہ اس نے محمد بن قاسم کے
حملے سے قبل ہی داہر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بلوچستان اور مکران اسلامی پرچم تلے آ ہی چکے
تھے۔ قیاس غالب ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت کے قیام سے پہلے بنگال اور بندرگاہ چٹاگانگ
بھی مسلمانوں کے تجارتی اور دینی تبلیغی مراکز بن چکے تھے۔

ہندوستانی ساحل کے خلاف مسلمان عربوں کا وہ پہلا مسلح تصادم جو تاریخ کے صفحات پر
رقم کیا گیا ہے۔ ۶۳۶ء میں وقوع پذیر ہوا۔ جب کہ بحرین اور عمان کے عامل نے بمبئی کے قریب
تھانہ کے مقام پر ایک مسلح فوج کو مہم سر کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مہماتی افواج بروچ اور دیبل
پر بھی روانہ کی گئی تھیں مگر خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے مزید بحری مہمات کو روک دیا۔ ہندوستان
میں پہلی بار مسلم فتوحات کا آغاز ۷۱۲ء میں یا اس کے لگ بھگ ہوا۔ اموی دور حکومت میں سندھ
[illegible]وں کے پاس مقامی بحری قزاقوں کی مسلم جہازوں پر لوٹ مار کے خلاف احتجاج روانہ کیا
[illegible] مہمات اس وقت مرکز توجہ بنے جب قزاقوں نے ٹھٹھہ کے مقام پر اُن تحائف کو
[illegible] کے حکمران نے عراق کے عامل کی خدمت میں روانہ کیے تھے۔ مجرموں کے خلاف

کارروائی کے سلسلے میں سندھ کے حکمران کی ناکامی یا عدم استطاعت نے ایک مسلح تصادم کے لیے راہ ہموار کر دی۔ محمد بن قاسم نے جو ایک سترہ سالہ نوجوان لڑکا تھا اور جسے یہ مہم سپرد کی گئی تھی۔ کمال ہوشیاری اور مستعدی سے اس کو سر کیا اور سندھ کی تسخیر میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ اس علاقے میں مسلم حکومت کے قیام نے اسلامی تاریخ اور برصغیر کی تاریخ میں ایک نہایت اہم باب کھول دیا۔

۹۹۹ء اور ۱۰۲۵ء کے درمیانی عرصے میں سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کے علاقے پر کوئی سترہ حملے کیے اپنے ایک حملے میں اس نے سومنات کے اس مندر پر قبضہ جمالیا جو شیو سے منسوب تھا۔

۱۱۹۱ء میں محمد غوری نے راجپوتوں کے سردار پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کا ایک سپہ سالار قطب الدین ایبک بنا اس جا پہنچا۔ فاتحین بہار کو روندتے ہوئے بنگال میں جا گھسے اور اسے بھی اپنے زیرنگین کر لیا۔ محمد غوری پر کامیاب قاتلانہ حملہ کے بعد سلاطین دہلی کے نام سے بادشاہوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ حملوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ التمش کے دورِ حکومت میں جو شاہان غلامان میں سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت کا مالک تھا (شاہان غلامان کا لقب من گھڑت ہے)، چنگیز خاں کے منگول جتھے ہندوستان کی جانب بڑھے لیکن وہ دریائے سندھ سے آگے نہیں آئے۔ مشہور شاعر حضرت امیر خسرو ان منگول حملہ آوروں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "ان کی آنکھیں اس قدر چھوٹی اور چبھنے والی تھیں کہ وہ ایک پیتل کے برتن پر پڑ جائیں تو اس میں بھی سوراخ کر دیں۔ ان کی رنگت سے کہیں زیادہ وحشت ناک اور ہیبت ناک ان کی بُو تھی۔" چودھویں صدی کے اختتام سے کچھ پہلے تیمور لنگ دہلی پر نازل ہوا۔ چودھویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک سلطنت دہلی شمال کی جانب سے منگولوں اور راجپوتانہ اور مالوہ کی پھاروں سے ہندوؤں کے حملوں کا نخچیر بنی رہی۔ ۱۳۱۰ء کے لگ بھگ سلطان علاؤ الدین کی افواج کا ایک سپہ سالار ملک کافور جنوبی ہند میں داخل ہوا اور پیش قدمی کرتا ہوا تامل مملکتوں میں جا پہنچا۔

سلطنت مغلیہ ۱۵۲۰ء سے ۱۵۲۵ء کے درمیانی عرصے میں ظہیر الدین محمد نے جس کا لقب بابر (شیر) تھا۔ ہندوستان کے خلاف پانچ مہمات کی قیادت کی۔ ۱۵۲۶ء میں بالآخر اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد

منضبط و مرتب تاریخ سے قبل ہی عربوں اور ہندوستان کے مابین تجارتی روابط و تعلقات موجود تھے۔ مثال کے طور پر گھوڑوں کی بہت بڑی تجارت ہوا کرتی تھی۔ فارس سے مالا بار کو سالانہ دس ہزار گھوڑے برآمد ہوتے تھے۔ ان کی مجموعی قیمت ۲۲ لاکھ دینار تک جا پہنچی تھی جنوب مشرقی ایشیا کے مسالوں سے آئے ہوئے جزائر چین کے ریشم تیار کرنے والے مراکز اور ہندوستانی روئی اور لکڑی نے عربوں کو اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہندوستانی ساحلوں پر خوب اچھی طرح مسلح اور مضبوط مقبوضات حاصل کر لیں۔ جنوبی ہند کے ساحل پر کارومنڈل کا نام عربوں نے "مالا بار" رکھ دیا تھا۔ عربی میں اس لفظ کے معنی "پیوند یا مقام اتصال" کے ہیں۔ ہندوستان کے ایک کپڑے کا نام عربوں نے "کتان" رکھا۔ اسی لفظ کتان سے انگریزی کا لفظ کاٹن (COTTON) نکلا ہے چونکہ عربی مقبوضات ہندوستان میں موجود ہی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے چند ہی سال بعد اسلام برصغیر میں در آیا۔ دو مثالوں کے ذریعے اسلام اور ہندوستان کے مابین بالکل ابتدائی ایام میں تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب حضرت عائشہؓ جو پیغمبر اسلام کی بیوہ تھیں، علیل ہوئیں تو ان کا علاج ایک جاٹ حکیم نے کیا تھا۔ بعض جاٹ سپاہی حضرت علیؓ کے تحت کار پرداز تھے۔ تجارت اور لین دین کی ہمت افزائی کے لیے مسلمانوں کا نہ صرف خیر مقدم کیا گیا بلکہ انھیں مسجدیں تعمیر کرنے اور دین کی تبلیغ کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ انھوں نے سیاست اور سماج پر کافی تصرف اور رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ مارکو پولو، راجہ سندر پانڈے کے وزیر اور مشیر خصوصی کا نام تقی الدین بتاتا ہے۔ تقی الدین کے بعد اس کا بیٹا سراج الدین اور پھر اس کا پوتا نظام الدین اس کا جانشین ہوا اور ان دونوں کو بھی وہی حیثیت حاصل رہی جو اس کی تھی۔ (۱۲۸۶ء) قبلائی خان کے دربار میں پانڈے کا سفیر فخر الدین احمد تھا۔ عربوں اور تاملوں کے باہمی اختلاط سے مخلوط نسلوں کی لاتعداد برادریاں ظہور میں آئیں جس طرح روتان اور لبتے وغیرہ۔

نو آباد عربوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور نتیجہ میں ان کی جو اولاد پیدا ہوئی اس سے بھی غیر ملکی تجار جیسا ہی سلوک روا رکھا گیا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی اس بات کی ہمت افزائی کی جاتی تھی کہ وہ ہر سال چند مقامی بچوں کو دائرہ اسلام میں داخل

کر لیں اور انھیں مسلمانوں کی طرح پال پوس کر پروان چڑھائیں تاکہ وہ بچے بحری تربیت حاصل کر سکیں۔ اس لیے کہ ہندو ساحل چھوڑ کر جانے میں بہت پیش و پس کرتے تھے۔ عرب بالعموم اونچی ذات کی " نائر عورتوں سے نکاح کیا کرتے تھے۔ یہ بات جنوبی ہند کے عصری معاشرے اور سماج میں مسلم تجار کی اعلیٰ سماجی حیثیت کا بین ثبوت تھی۔ مالا بار کی مشہور و معروف مسلم برادری جسے موپلا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی ابتدار یہیں سے ہوتی ہے۔ موپلا ماپلا سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں " عظیم المرتبیت بچہ" دوسرے معنی " دولہا " کے بھی ہیں۔ مابعد الذکر اس استحقاق کے پیش نظر زیادہ موزوں اور قرین قیاس ہے۔ جو انھیں نائر عورتوں سے شادی کرنے کے سلسلے میں عطا کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو اعلیٰ ذات برہمن کے شانہ سے شانہ ملا کر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ یہ وہ استحقاق تھا جو ایک نائر کو بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے امام کو جنھیں " تھنگل " یا (ونگل) کہا جاتا تھا حکمران راجہ زمورین کی سواری کے ساتھ پالکی میں سوار ہو کر چلنے کی اجازت تھی۔ مالا بار کے حکمرانوں کو عرب " سماری " کہا کرتے تھے یہ لفظ " سماری " ہی دراصل " زمورین " کا ماخذ ہے۔ اسی دور میں مالا بار کے آخری بادشاہ چیرامن پیرومل کی تبدیلی مذہب والی داستان مشہور ہوئی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا جسے اس نے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت کے سامنے بیان کیا جو سیلون سے واپس جا رہی تھی۔ اس خواب کی تعبیر ان لوگوں نے بے حد اطمینان بخش دی۔ جس کی بنار پر حکمران نے اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ شاہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد ہندوؤں کی سرزمین پر حکومت کرنے میں بڑی دشواری محسوس کی اس لیے وہ ہجرت کر کے عرب چلا گیا۔ اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنے انتہائی معتمد سفیر اپنی مملکت کی جانب روانہ کیے تاکہ وہ اس کی اپنی مملکت کی حدود میں اس کے جانشینوں کو حکومت کے سلسلے میں اس کے مشورے پہنچا سکیں اور مسلمانوں کو شہری اور مذہبی مراعات کے سلسلہ میں اس کی سفارش اس تک پہنچا سکیں۔ اس کی خواہشات اور سفارشات کا اس کے جانشین بے حد احترام کرتے تھے۔ مالا بار میں بعض رسومات کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس ساری داستان میں کافی حد تک صداقت کا عنصر موجود ہے۔ جب بھی وہاں کوئی نیا زمورین تخت پر بٹھایا جاتا ہے، اُسے مسلمانوں کا لباس پہناتے ہیں اور اس کے سر پر کوئی مسلمان تاج رکھتا ہے۔ تاج پوشی کے بعد " زمورین " کو برادری سے خارج تصور کیا جاتا ہے۔

وفات کے بعد جہاندار شاہ کی اولاد میں سے ایک لڑکا عالمگیر ثانی کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا دہلی کو احمد شاہ ابدالی کی جارحانہ پیش قدمی اور حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا گیا اور شاہجہاں ثالث کو تخت نشین کیا گیا۔ ۱۷۶۱ء میں ابدالی دوبارہ آیا۔ اس نے پنجاب میں سکھوں کی خوب گوشمالی کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیر جمانے کا موقع حاصل ہو ہی چکا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں کلائیو نے جنگ پلاسی جیت لی تھی۔ سندھیا نے جو ایک مرہٹہ سردار تھا۔ دہلی پر تصرف و اختیار کر لیا اور شاہ عالم اس کا وظیفہ خوار بن گیا۔ لیکن اس کے باوجود شہنشاہ بلاشرکت غیرے صدر ریاست تھا اور سارے ہندوستان میں اعزاز و افتخار کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۷۹۴ء سندھیا فوت ہو گیا۔ اس کا جانشین اس کا اپنا چچا زاد بھائی ہوا۔ برطانوی افواج نے لیک کی سرکردگی میں سندھیا کی فوجوں کو شکست دی اور ۱۸۰۳ء میں دارالسلطنت میں داخل ہو گئیں۔

شاہ عالم نے دلجوئی سے اصولی طور پر اپنی اعلیٰ و برتر رسمی حیثیت کو تسلیم کرنے اور دربار میں کمپنی کے نمائندوں اور کارندوں کو شاہی روایتی آداب کو ملحوظ رکھنے کا تعین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کمپنی کے ملازمین نے بادشاہ کی عزت و توقیر اور تعظیم و تکریم کے سلسلے میں ان تمام معمولات کو ملحوظ رکھا جو بادشاہ کے اسلاف اپنی سلطنت کے عہد شباب میں روا رکھتے تھے اور جن پر وہ عمل درآمد کرایا کرتے تھے۔ جب کوئی گورنر جنرل شاہی دارالسلطنت میں سے گزرتا تو اس کا نمائندہ تخت شاہی کے سامنے ننگے پیر کھڑا ہو جاتا اور بے حد عجز و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے والد جاہ کی صحت و تندرستی کے بارے میں استفسار کیا کرتا۔ بعد ازاں حاکم دوران کی خدمت میں انتہائی تابعدارانہ طریقے پر نذر (تحائف) پیش کیا کرتا تھا۔ ایڈورڈس اپنی کتاب "بنگالی تہذیب کی یادیں" میں کہتا ہے کہ ہمیں شہنشاہ کے حضور میں حاضری دینے کے لیے ننگے پیر جانا ضروری تھا۔ یہ طریقہ ہندوستان میں ہر دور میں رائج رہا۔ یہ بالعموم ادنیٰ کا اپنے اعلیٰ کے قریب جاتے وقت تعظیم و تکریم کا مظاہرہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم جھک کر شہنشاہ کی تعظیم کیا کرتے تھے اور تخت شاہی کے قریب پہنچنے پر یکے بعد دیگرے سونے کی مہروں سے بھری ہوئی ایک بڑی تھیلی نذر کیا کرتے۔ پھر والد جاہ کی صحت و تندرستی کے بارے میں استفسار کر کے شہنشاہ کی ترقی و خوشحالی کی دعا مانگا کرتے تھے۔" بادشاہ اس کے جواب میں انھیں خلعت فاخرہ مرحمت کیا کرتا تھا۔ تخت دہلی سے ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی وابستگی اور تعلق کو عملاً کمپنی نے واقعات اور حادثات سے بھرپور ۴۷ سال تخت نشین رہنے کے بعد شاہ عالم

۱۸۰۶ء میں فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بقید حیات لڑکوں میں جو سب سے بڑا لڑکا تھا۔ وہ تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا لقب اکبر شاہ ثانی اختیار کیا۔ ۱۸۳۷ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو مرزا عبدالمظفر سراج الدین محمد اس کے جانشین کی حیثیت سے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ وہ ایک منفرد اور غیر معمولی قسم کا شاعر تھا۔ اس کی غزلیں بے حد پُر وقار، سنجیدہ، یاس انگیز اور پردرد ہونے کی وجہ سے بہت مقبول و معروف ہیں۔

بہادر شاہ آخری مغل تاج دار تھا۔ چنانچہ مغلیہ سلطنت ایک ظاہری اور نمائشی سلطنت کے روپ میں ۱۸۵۷ء تک چلتی رہی۔ ڈاکٹر قریشی بڑی خوش اسلوبی سے واضح الفاظ میں تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مد کے بعد جب سمندر میں جزر آتا ہے تو بعض نشیبی حصوں میں کچھ پانی رہ جاتا ہے۔ بعینہٖ جب سلطنت مغلیہ کا زوال ہوا تو کچھ عرصہ تک کے لیے مسلم اقتدار کے چند مراکز باقی رہے ان میں نمایاں اور اہمیت کی حامل بنگال، اودھ، میسور اور حیدر آباد کی ریاستیں تھیں۔ بنگال کی ریاست بہت پہلے مغلوب ہو کر ختم ہو گئی۔ ۱۷۹۹ء میں میسور ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے معدوم ہو گیا۔ اودھ نے پہلے تو جاگیر کی ہیئت اختیار کی اور پھر ۱۸۵۶ء میں اس کا انضمام عمل میں آگیا۔ حیدر آباد ایسٹ انڈیا کمپنی کی کفالت میں آگیا اور اسی پر تکیہ کرنے لگا۔ سلطنت مغلیہ کا پُرشکوہ ایوان اقتدار خاک کا تودہ بن گیا۔ اس راکھ میں دبی ہوئی چند چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں جو کچھ عرصہ تک سلگتی رہیں۔ لیکن پھر جیسا کہ قاعدہ ہے یہ بقیہ چنگاریاں بھی ایک ایک کر کے بجھتی چلی گئیں۔ پیشوا باجی راؤ نے سلطنت مغلیہ کے خلاف اپنی فوجی حکمت عملی کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ بڑی حد تک درست تھی کہ "شاخوں کی قطع برید سے کیا فائدہ؛ تنے پر وار کرو، شاخیں خود بخود نیچے آگریں گی"۔ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ پوری طرح بکھر گیا تھا۔ زوال پذیر دور میں روشنی کی کچھ کرنیں اگر نظر بھی آ رہی تھیں تو وہ محض شاہ ولی اللہ دہلوی، ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز، اور ان کے پوتے مولانا اسمٰعیل کی تحریکات "تطہیر" اور "اصلاح"، تھیں اور سید احمد بریلوی کا بہادرانہ اور سرفروشانہ مقابلہ تھا۔

اہل برطانیہ

"بارٹولو میو ڈیس کے "راس الامید" کا گشت لگانے کے گیارہ سال بعد مئی ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما تین چھوٹے چھوٹے جہازوں اور ایک سو آٹھ افراد پر مشتمل ایک پرتگالی بیڑے کو لے کر سلطنت دہلی کے دور میں کالی کٹ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ ستمبر ۱۴۹۹ء میں مصالحوں سے لدے ہوئے بحری جہازوں کے

شکست فاش دی۔ اس طرح منگولوں سلاطین کے دور کا ہندوستان میں آغاز ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں آخری مغل شہنشاہ کے زوال تک سلطنت مغلیہ برصغیر کی تاریخ کا ایک بہت اہم اور نمایاں باب بنی رہی۔ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو آگرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جہاں مہاراجہ گوالیار نے اس کے عمدہ اور نرم سلوک کو دیکھ کر مشہور و معروف ہیرا "کوہ نور" اس کو تحفۃً پیش کیا۔ ۱۵۳۰ء کے آخر میں ہمایوں بیمار ہوا اور اس کی حالت بے حد نازک ہوگئی۔ بابر نے ایک منت مانگی کہ اگر خداوند قدوس اس کے بیٹے کو بیماری سے نجات عطا کر دے تو وہ اس کے عوض اپنی زندگی خدا کے حضور میں نذر کر دے گا۔ چنانچہ ہمایوں کو صحت عطا ہوئی اور بابر بیماری میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہوگیا۔ ہمایوں اس کا جانشین ہوا۔ لیکن اسے اپنے تاج و تخت کی حفاظت میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُسے ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ ۱۵۵۶ء میں اس کا لڑکا اکبر جس کی عمر محض ۱۵ سال تھی تخت نشین ہوا۔ نصف صدی تک جنگ و جدال، الحاق و انضمام کے نتیجہ میں وہ بالآخر اس قابل ہوا کہ برصغیر کے سارے علاقے اور دکن کے متعدد رجواڑے اس کے مطیع ہوگئے۔ اس نے ایک نیا نظام حیات "دین الٰہی" کے نام سے متعارف کرانے کی کوشش کی۔ ۱۶۰۵ء میں اس کے لڑکے جہانگیر نے زمام سلطنت ہاتھ میں لی۔ ایک مینا بازار میں وہ ایک حسینہ مہرالنساء تھی جو نورجہاں (عالم کا حسن) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اکتوبر ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کا انتقال ہوا اور لاہور کے قریب راوی کے کنارے ایک خوبصورت مقبرے میں اسے دفن کر دیا گیا۔ ۱۶۲۸ء میں شاہجہاں کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا۔ وہ ایک عظیم المرتبت شہنشاہ تھا۔ جسے تعمیرات سے بے پناہ شغف تھا۔ اس کا شاہکار "تاج محل" ہے جو اس نے اپنی محبوب بیگم ممتاز محل کی یادگار کے طور پر سفید سنگ مرمر سے تعمیر کرایا تھا۔ تاج محل کے علاوہ اس کے دور حکومت میں لال قلعہ، جامع مسجد اور دہلی کی موتی مسجد بھی تعمیر ہوئی۔ ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب سر پر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے تقریباً ۵۰ سالہ دور حکومت میں سلطنت مغلیہ وسعت اور قوت کے بام عروج پر جا پہنچی تھی۔ اس کی حکمرانی کے دوران مرہٹہ تحریک نمودار ہوئی۔ اس تحریک کی نمایاں شخصیت شیواجی کی ذات تھی۔ جسے رابن ہڈ کی ہندوستانی نقل کہا جا سکتا ہے۔ پرتاپ گڑھ کے نیچے ایک وادی میں شیواجی نے ایک مسلمان سپہ سالار افضل خان کو اس بات پر آمادہ اور ہموار کیا کہ وہ مقابلہ کرنے والی فوجوں کے درمیانی فاصلہ پر ایک جگہ اس سے پُرامن انداز میں صلح و دوستی کی گفت و شنید کرے۔

پھر جونہی وہ اپنے مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے جھکا تو شیواجی نے افضل خان کے زیر ناف مشہور و معروف ہتھیار شیر پنجہ گھونپ دیا۔ شیر پنجہ ایک قسم کا تیز دھار والا اور نوکدار آہنی دستانہ ہوتا تھا۔ شیواجی ۱۶۸۰ء میں فوت ہوا۔ ۱۶۹۰ء میں وسطی اور جنوبی ہندوستان کو جب اورنگ زیب نے فتح کیا تو ہندوستان کی پوری تاریخ میں یہ برصغیر پہلی مرتبہ ایک اقتدار اعلیٰ کے ماتحت آگیا تھا۔ اورنگ زیب اپنی اسلامی تعلیمات، دینیات اور فقہ پر کامل دست گاہ رکھنے کے لیے مشہور ہے اورنگ زیب کا ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوا۔ اس نے تین بیٹے چھوڑے تھے معظم اعظم اور کام بخش۔ باپ کی جانشینی کے سلسلے میں وہ تینوں آپس میں خوب لڑے۔ شہزادہ معظم نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے شہنشاہ کی حیثیت سے اپنی تاج پوشی کر لی۔ شہزادہ اعظم نے اپنی بادشاہت کا دعویٰ کیا۔ دونوں بھائیوں کی افواج ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں جس کے نتیجہ میں اعظم ہلاک ہوگیا۔ ۱۷۱۲ء بہادر شاہ کا انتقال ہوا اس نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ جو باپ کے مرنے کے بعد جانشینی کے مسئلے کو حل کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ انجام کار جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا۔ لیکن ۱۷۱۳ء میں اس کے چچازاد بھائی فرخ سیر نے اس سے تاج و تخت چھین لیا۔ فرخ سیر کو سید برادران نے معزول کر دیا۔ اور رفیع الدرجات کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ انہی سید برادران نے ۱۷۱۹ء میں رفیع الدرجات کو ہٹا کر اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر لا بٹھایا۔ رفیع الدولہ کی وفات کے بعد بہادر شاہ کے ایک پوتے روشن اختر کو تخت نشین کیا گیا۔ جس نے اپنا لقب محمد شاہ اختیار کر لیا۔ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور اس کی ساری بنیادیں ہل چکی تھیں۔ چنانچہ عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو تخت دہلی پر تاج شاہی پہنے ایک ہستی بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری طرف مختلف صوبوں کے گورنروں (صوبہ دار) نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے اپنی علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم کر لیں۔ شاہی صوبہ داروں میں سے ایک ۱۷۲۴ء میں حیدر آباد کا نظام بن گیا۔ میسور حیدر علی اور اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے قبضہ و تصرف میں آگیا۔ بنگال اور اودھ، روہیلکھنڈ اور مرہٹہ ریاستیں آزاد اور خود مختار مملکتیں بن گئیں۔ شمال مغرب میں سکھ طاقت اپنا لوہا منوا رہی تھی جو دراصل گرونانک کی تعلیمات کی پیداوار تھی۔ ابھی ۱۷۴۰ء ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری ہوگیا۔ صرف ایک سال پہلے نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا اور دہلی کو لوٹ کر اپنے ساتھ شہرہ آفاق تخت طاؤس بھی لے گیا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ فوت ہوگیا۔

عطا کر دیا۔

۱۷۱۵ء میں شہنشاہ فرخ سیر علیل ہوا اور اس کا علاج انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے کیا ۱۷۱۷ء میں ایک فرمان بطور انعام جاری کیا گیا جس کی رو سے تمام سابقہ منظوریوں اور امداد کی توثیق کی گئی اور ان کے مال و اسباب پر محصول اور معائنہ کی پابندی کبھی ختم کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں کلکتہ کے گرد و نواح میں ۳۸ قصبے انھیں بخش دیے گئے۔ اہل برطانیہ تجارت سے رفتہ رفتہ تسخیر کی جانب راغب ہوئے۔ ۱۷۴۴ء سے ۱۷۶۰ء کے درمیان کرناٹک کی جنگیں لڑی گئیں۔ جن کے نتیجہ میں شمالی سرکار کے علاقوں پر تصرف حاصل ہوگیا۔ ۱۷۵۷ء میں یا اس کے قریب سراج الدولہ سے معرکہ آرائی ہوئی اور میر جعفر کی غداری، ہندوستان کی عدم وفاداری اور کلائیو کی مکارانہ سازشوں کی وجہ سے پلاسی کے میدان میں نواب کو شکست ہوئی۔ اسی سال میر جعفر نے کمپنی کو آٹھ سو بیاسی (۸۸۲) مربع میل کا ایک بڑا وسیع رقبہ جس کو چوبیس پرگنہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، بخش دیا۔ ۱۷۶۰ء میں میر قاسم نے کمپنی کو بردوان مدنا پور اور چٹاگام کے اضلاع بھی عطا کر دیے۔

یہ دور "دو عملی" اور کلایو کی "دوغلی" حکمت عملی کا دور تھا۔ بنگال ایک خوشحال اور مرفہ الحال منطقہ تھا۔ زرعی پیداوار اور ڈھاکہ کی ململ اور صنعت پارچہ بافی (ریشم) کی وجہ سے بے حد مالا مال کمپنی کے افسروں نے اُسے لوٹ کھسوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ۱۷۵۷ء اور ۱۷۶۴ء کے درمیان کمپنی کے افسروں نے غیر قانونی رشوت کے طور پر جو تحفے تحائف وصول کیے تھے ان کی قیمت ۵۰ لاکھ پاؤنڈ تک پہنچتی ہے۔ ۱۷۶۴ء میں شہنشاہ شاہ عالم سے جنگ بکسر لڑی گئی۔ جس کے نتیجے میں ایک معاہدہ طے کیا گیا کہ بنگال کی آمدنی میں سے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ شہنشاہ کو ادا کیا جائے گا۔

شہنشاہ کو کورا اور الہ آباد کے صوبے سپرد کر دیے گئے اور اس کے عوض کمپنی کو ایک دیوانی فرمان عطا ہوا جس کی رو سے بہار، بنگال اور اڑیسہ کے محاصل کی وصولی، انتظامی امور بشمول دیوانی مقدمات کے فیصلے وغیرہ کمپنی کا حق قرار دیے گئے۔ ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۵ء تک وارن ہیسٹنگز منظر پر چھایا رہا۔ یہ بالآخر بڑے بڑے جرائم اور غلط قسم کی حکمت عملی اور سیاست کو روا رکھنے کی پاداش میں معزول و ماخوذ ہوا۔ ۱۷۹۸ء اور ۱۸۰۵ء کے درمیان نپولین کے مصر میں پہنچنے کے بعد اور ہندوستان میں برطانیہ کے بعض مدمقابل افراد سے رابطہ قائم ہونے کے بعد لارڈ ولزلی نے میسور میں ٹیپو سلطان کی قوت کو تباہ کر دیا۔ ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۸ء کے

درمیان نیپال کے گورکھوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور اس وقت کے بعد سے یہ گورکھے برطانوی فوج میں شامل ہوکر برطانوی مفادات کے لیے لڑنے لگے۔ ۱۸۲۳ء تک مرہٹوں کا قلع قمع ہوگیا۔ ۱۸۴۰ء میں سکھوں کو زیر کر لیا گیا اور ان کے علاقوں پر لارڈ ڈلہوزی نے تصرف حاصل کر لیا۔ ۱۸۴۳ء میں فوجی کارروائیوں کے ذریعے سندھ کو میروں کے ہاتھوں سے چھین کر غضب کر لیا گیا۔ چارلس نیپر کے تار نے اس امر کی تصدیق کی کہ اس نے گناہ کیا تھا (یہاں انگریزی کا لفظ "SINNED" استعمال کیا گیا ہے۔ جو ذومعنی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے سندھ حاصل کر لیا جائے۔ "SIND" کے اس نے "SINNED" لکھا تھا۔ دوسرے لغوی معنی جو ہو سکتے ہیں وہ یہ کہ اس نے گناہ کیا ہے) ۱۸۵۲ء کی جنگ میں انگریزوں نے برما کے ایک معتدبہ حصے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۶ء تک یہ "سوداگر" یعنی (انگریز) عملاً بلا شرکت غیرے سارے ہندوستان کے آقا اور مالک بن چکے تھے۔ انھوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوستان کی تمام سلطنتوں کو معدوم کر دیا اور ان سلطنتوں کے حقیقی اور قانونی ورثاء اور جانشینوں کو ان کے ان مقامات سے جہاں انھیں قوت و اقتدار حاصل تھا۔ بہت دُور لے جا کر رکھا۔ پیشوا کو جو مرہٹوں کی وفاداریاں حاصل کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ شمالی ہندوستان کے ایک دور افتادہ گاؤں میں بھیج دیا گیا۔ ٹیپو کے ورثاء کو ویلور سے کلکتہ میں منتقل کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے کو برطانوی جزائر میں جگہ ملی۔ جہاں کسی قسم کے فتنہ و شر کی رسائی کا امکان نہ تھا۔ کٹھ پتلی شہنشاہ قلعہ شاہجہاں میں محفوظ و مامون تھا۔ بہرطور مئی ۱۸۵۷ء میں عام بغاوت و سرکشی کا آغاز ہوا۔ جسے سپاہیوں کے غدر کا فرضی لقب دیا جاتا ہے۔ کارتوسوں کی تیاری میں جو چکنائی استعمال کی جاتی تھی وہ گائے اور سؤر کی چربی تھی۔ جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہی اس آگ کا سبب بنی جو غدر کی صورت میں بھڑک اٹھی تھی۔ ہندوؤں کے لیے گائے ایک مقدس جانور ہے۔ اور سؤر کا گوشت اسلام میں حرام ہے۔ اس مبیّنہ چکنائی کے بارے میں یہ شبہ کیا گیا کہ اس کی آڑ میں تبدیلی مذہب کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چنگاری افواہوں، معاندانہ باتوں اور نام نہاد" سازشیوں" کے ہاتھوں" چپاتیوں" کی گشت کی وجہ سے ایک خوف ناک آگ کی طرح چہار سو پھیل گئی۔ شہزادہ فیروز بخت، سپہ سالار بخت خان، مولوی احمد اللہ، نانا صاحب اور لکشمی بائی (جھانسی کی رانی)، اس جنگ آزادی کے اہم اور اصل شرکا تھے۔ اس آگ پر برطانوی برگیڈوں نے قابو پا لیا۔

ہمراہ اس کے لزبن کی جانب واپسی نے ہندوستان سے یورپی ربط و ضبط کے دور کا آغاز کیا۔ ایک قلیل عرصے کے اندر ہی اندر پرتگالیوں نے گوا میں اپنی بود و باش کے لیے ایک مرکز قائم کر لیا۔ ۱۵۹۶ء اور ۱۶۰۲ء کے درمیان ولندیزی مہمات بھی روانہ کی گئیں اور ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی منظم کیا گیا۔ ۱۶۲۰ء سے قبل ولندیزی تجارتی منڈیاں۔ سورت سالی پٹم اور پلی کٹ کے مقامات پر کھول دی گئیں۔

سب سے پہلا انگریز جو ہندوستان آیا وہ پادری تھامس اسٹیونس ایک عیسائی فرقے جیوایٹ کا پیرو تھا اور پناہ گزین بھی تھا۔ وہ ۱۵۷۹ء میں سرزمین گوا پر آ کر اُترا۔ اکبر کے دورِ حکومت میں تین انگریز جان نیوبری، ولیم لیڈس اور رالف فچ ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان اور مشرق بعید سے انگریزوں کی تجارتی تعلقات قائم کرنے کی خواہش اُن مصالحوں کی خاطر تھی جو ان کی غذا کو لذیذ اور خوش ذائقہ بناتے تھے۔ ماقبل انگریز ان مصالحوں کو ولندیزیوں سے حاصل کر لیا کرتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ولندیزیوں نے انگریزوں سے ان مصالحوں کی بہت گراں قیمت وصول کرنی شروع کر دی۔ نتیجتہً ۲۲ ستمبر ۱۵۹۹ء کو لارڈ میر کی صدارت میں ایک جلسہ کے دوران یہ قرارداد پاس کی گئی کہ انگریزوں کی ایک انجمن کی تشکیل کی جائے جو ہندوستان سے براہ راست تجارت کرے۔ ۳۱ ستمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے ایک کمپنی کو جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا، شاہی پروانہ عطا کیا، چنانچہ سب سے پہلی بار کپتان ولیم ہاکنس ۱۶۰۹ء میں ایک جہاز کے ذریعے سورت کی بندرگاہ میں داخل ہوا اور ہندوستان میں آ پہنچا۔ آگرہ میں جہانگیر کے دربار تک شہنشاہ کی خدمت میں ایک انتہائی عاجزانہ معروضہ پیش کر کے رسائی حاصل کرنے کے بعد اس نے سورت میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت طلب کی جو نامنظور کر دی گئی۔ جس میں اوّل کے ایلچی کی حیثیت سے سر تھامس رو آیا تاکہ مراعات حاصل کر سکے۔ ۱۶۱۳ء میں ایک فرمان شاہی کے ذریعے انگریزوں کو سورت میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت عطا کر دی گئی۔ مغل حکام سے آگرہ، احمد آباد، بروچ اور سولی پٹم میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی گئی۔ ۱۶۳۳ء میں بلاسپور اور ہری ہارپور میں کارخانے قائم کیے گئے۔ ۱۶۳۹ء میں ایک شخص فرانس ڈے نے ساحل کورومنڈل پر چندراگری کے نائک سے زمین کا پٹہ حاصل کر لیا۔ کوم ندی کے قریب اس قطعہ زمین پر سینٹ جارج نامی ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اس کی وسعت و ترقی ہونے کے بعد بالآخر اسے جدید شہر مدراس بننا تھا۔

۱۶۴۴ء میں شہنشاہ شاہجہاں کی جس کا ان دنوں دور حکومت تھا۔ ایک بے حد عزیز اور منظور نظر لڑکی جہاں آرا رجل گئی۔ علاج کے لیے سارے ملک کے نامور اور حاذق اطباء کو طلب کیا گیا۔ جبریل بفٹن ایک انگریز ڈاکٹر بھی علاج کرنے کے لیے قصر شاہی میں پہنچا۔ فن طلب و جراحت کو مطلق کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایک غلام نے جس کا نام عارف تھا۔ ایک مرہم تیار کیا جس کے استعمال سے کامل صحت نصیب ہوئی۔ شہنشاہ نے ہر شخص کو خوب انعام و اکرام سے نوازا جب انگریز طبیب سے کہا گیا کہ وہ جو بخششیں طلب کرنا چاہے طلب کرے تو اس نے بنگال میں ایک کارخانہ قائم کرنے اور تجارتی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ایک فرمان شاہی کی درخواست کی۔ فرمان شاہی عطا کر دیا گیا۔ ۱۶۵۱ء میں شہزادہ شجاع کی ایک بیگم کی سخت علالت نے ایک اور موقع عطا کیا۔ بفٹن نے شاہی محل کی بیگم کا علاج کیا اور اپنی خدمت کے صلہ میں شہزادہ سے ہگلی میں کارخانے اور پٹنہ قاسم بازار ڈھاکہ اور بالاسور میں ایجنسیاں قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔

۱۶۶۰ء میں جب چارلس دوم برطانوی شہنشاہ کی شادی پرتگالی شہزادی کیتھرائن برگانزا سے ہوئی تو بمبئی اپنی پُر شکوہ اور عظیم بندرگاہ کے ساتھ بطور جہیز چارلس دوم کو مل گئی۔ ۱۶۶۸ء میں چارلس نے بمبئی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ ۱۶۷۲ء میں کمپنی نے بنگال کے مغل صوبیدار شائستہ خان سے محاصل کی ادائیگی سے معافی کا فرمان حاصل کر لیا۔ ۱۶۸۰ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے ایک فرمان جاری کیا۔ جس کی رو سے کمپنی کی تجارت اور انگریز قوم کے کاروبار میں کسی کو مزاحم ہونے کی اجازت نہیں دی گئی اور نہ کوئی ٹیکس عائد کیا گیا تھا بجز اس دو فی صدی ٹیکس کے جو رواجاً ان کے مال تجارت پر بطور چنگی وصول کیا جاتا تھا۔ کلکتہ کی جسے اس پایۂ میز کے تیسرے پیر کا درجہ دیا جاتا ہے جس پر انگلستان کے اقتدار اعلیٰ کا نقشہ مرتب کیا گیا تھا۔ کمپنی کے ایک افسر جاب چرنوک نے گنگا کے کنارے ایک دورافتادہ ویران مقام پر ۱۶۹۰ء میں بنیاد رکھی۔ فروری ۱۶۹۱ء میں شہنشاہ کی جانب سے ایک تازہ فرمان جاری ہوا جس کی رو سے کمپنی کو تین ہزار روپیہ سالانہ ادائیگی کے عوض چنگی و محصول کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ ۱۶۹۶ء سے ضلع بندرون کے ایک زمیندار سوبھا سنگھ کی لوٹ مار اور ہنگامہ آرائی کی وجہ سے میں انگریزوں کو ایک اور موقع ہاتھ لگا اور انہوں نے نئے کارخانے کو فوجی طور پر مضبوط اور مسلح بنانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۶۹۸ء میں مغل حکومت نے ستونتی، کالی کٹا (کلکتہ) اور گو بند پور کے قصبوں کا قطعی پٹہ سابقہ مالکان کو بارہ سو روپیہ کی ادائیگی کے عوض

۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ نے ہڈسن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ شہنشاہ کے ساتھ ایک گھٹیا مجرم جیسا سلوک کیا گیا۔ انھیں بڑی کسم پرسی کے عالم میں نہایت تکلیف دہ مقام پر رکھا گیا۔ چنانچہ ہر وہ انگریز مرد یا عورت جو دہلی سے گزرتا۔ جب بھی اس کا دل چاہتا۔ شہنشاہ کے تخلیہ میں مخل ہو کر اُن پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالنے کے لیے بغیر اجازت اور بلا کسی پس و پیش کے جا گھستا۔ گرفتھ جس نے شہنشاہ کو ۲۲ ستمبر کو دیکھا تھا، لکھتا ہے "ایک عام دیسی چار پائی پر ایک تکیہ کا سہارا لیے آلتی پالتی مارے جو شخص بیٹھا نظر آ رہا تھا وہ عظیم انسان سلطنت مغلیہ کا آخری نمائندہ تھا۔ میانہ قد اور ۸۰ سال سے زائد عمر کا وہ ضعیف شخص سفید لباس میں ملبوس تھا اور اسی کپڑے اور رنگ کا مخروطی شکل کا عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ اس کے لبوں کو مطلق جنبش نہیں ہوئی۔ نہایت خاموشی کے ساتھ وہ گُم سُم زمین کی جانب نظریں کیے رات دن بیٹھا رہتا تھا اور اس طرح جیسے وہ اس ماحول سے قطعی بے نیاز ہو، جس میں اُسے لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ شاہ سے کوئی تین فٹ کے فاصلے پر ایک دوسری چارپائی پر ایک محافظ (پہریدار افسر) بیٹھا ہوا تھا۔ حالانکہ دو بے حد چاق و چوبند یورپی سنتری سنگین لگائے ہوئے دونوں جانب کھڑے ہوئے تھے انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ کو نکال لے جانے کی کوئی کوشش کی جائے تو وہ اپنے ہاتھوں سے بادشاہ کو گولی مار دیں۔

۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو لال قلعہ دہلی میں برطانوی فوجی کمیشن کے سامنے بادشاہ پر نام نہاد "مقدمہ" کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ شہنشاہ کے خلاف چار الزامات عائد کیے گئے۔ تیسرے نمبر پر جو الزام تھا وہ انتہائی مضحکہ خیز اور دلچسپ تھا" اور اس لیے کہ ملزم نے (شہنشاہ) ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی رعیت میں ہوتے ہوئے اور اپنی وفاداری کے فرائض و شرائط کا خیال نہ رکھتے ہوئے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یا اس کے قریب کسی دن ایک غدار کی حیثیت سے بمقام دہلی اپنے حکمران ہونے اور ہندوستان کا مقتدر اعلیٰ ہونے کا اعلان کیا اور پھر غداری کر کے شہر دہلی پر غیر قانونی طور پر قبضہ کر لیا اور اپنا تصرف جما لیا" کس کو کس کا وفادار ہونا چاہیے تھا یا کون کس کی وفاداری کا استحقاق رکھتا تھا۔ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی بہت بڑی دستوری اہمیت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی الزام اس سے کہیں زیادہ شدو مد کے ساتھ ان پر لگایا جا سکتا تھا جو غیر قانونی طور پر مقدمہ چلانے کے ذمہ دار تھے۔ بہر نوع اس کے باوجود دیگر الزامات کی صحت کا کوئی ثبوت

موجود نہ تھا۔ چنانچہ مقدمہ چلانے والوں نے اس کا اعتراف کر لیا تھا کہ "یہ واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تحقیقات وتفتیش کے دائرہ کو کسی صورت سے اُن فنی نکات کو ملحوظ رکھنے کی حد تک محدود نہ ہونا چاہیے جو ایک اس سے کہیں زیادہ رسمی اور باقاعدہ مقدمے کے لیے ضروری ہے" مقدمہ کے وقت جج اور استغاثے کے وکلاء بادشاہ سے اس خوش خلقی تک سے پیش نہ آئے جو بالعموم عام آدمیوں تک سے برتی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود شہنشاہ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے اپنے مرغوب مشغلے میں منہمک ہو جایا کرتا تھا۔ کاغذ اور قلم کی عدم موجودگی میں وہ اپنی زندان کی دیوار پر تیلی سے لکھا کرتا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں ۹ مارچ کو مقدمہ کی کارروائی ختم ہوئی۔ ایک موقع پر یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ شہنشاہ کو سزا یافتہ مجرموں کے جزیرہ انڈومان میں بھیج دیا جائے۔ افریقہ کو بعض دفعہ اس کی جلاوطنی کے لیے مناسب وموزوں ملک سمجھا گیا۔ سیل بیڈن نے چینی ساحل کے شہر ہانگ کانگ بھیجنے کی رائے دی۔ مگر بالآخر شہنشاہ کو برما کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ ان دنوں کوئی انجمن اقوام متحدہ یا سلامتی کونسل نہیں تھی۔ جو اس معاملے میں دخل دے سکتی اور نہ کوئی بین الاقوامی عدالت انصاف کرنے کے لیے موجود تھی جس سے رجوع کیا جا سکتا۔

قانونی کثرت آراء کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ جائز اور قانونی مقتدر حکمران واجب التعظیم تھا اور یہ کہ مقدمہ کی کارروائی نے انصاف، عدل اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی خلاف ورزی کی تھی اور اصولوں کو توڑا تھا۔ اور وہ نام نہاد مقدمہ بذات خود ہی خارج از اختیار، دائرہ قانونی سے باہر اور ابتداء ہی سے غلط اور ناجائز تھا۔ آخری مغل حکمران کا جلاوطنی کے عالم میں رنگون میں ۱۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔

باب ۳

برصغیر میں اشاعت اسلام

ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بنی نوع انسان کے لیے محبت و شفقت اور عدل و مساوات کا ایسا لافانی پیغام تھا کہ جس نے اسے قبول کر لیا وہ اور اس کی آئندہ نسلیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ عربوں نے اس پیغام کو گوشۂ دل سے سُنا اور اپنے آقا و مولاؐ کے ارشاد کی تعمیل میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیل گئے خواہ وہ سرکشوں اور مفسدوں کو سزا دینے کے لیے شمشیر بدست ہو کر نکلے یا کسب معاش کی غرض سے تجارتی قافلوں کی صورت میں روانہ ہوئے۔ انھوں نے یہ فرض ہر حال میں ادا کیا اور یہ محبت آفریں پیغام ہر جگہ اور ہر رنگ میں پہنچایا، بلکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ توسیع اسلام کا عظیم کارنامہ، تاجروں، واعظوں اور مبلغوں ہی کی مساعی جمیلہ سے سرانجام پایا اور بیشتر لوگوں نے مسلم فاتحوں کی وجہ سے نہیں بلکہ مبلغین اور واعظین کے ذاتی کردار، حُسن اخلاق اور اس پاکیزہ تعلیم کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ خود برصغیر پاک و ہند میں جب کہ ابھی کسی فاتح کا قدم بھی نہ آیا تھا، اسلام اس سرزمین پر اپنے قدم جما چکا تھا۔

مشہور مستشرق اور علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب "دی پریچنگ آف اسلام" میں تسلیم کرتے ہیں کہ جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کا فریضہ کسی مسلمان فاتح نے نہیں بلکہ عرب تاجروں نے ادا کیا اور انھی کوششوں سے اس علاقے میں اسلام کی نشر و اشاعت ہوئی۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ :۔

> "جنوبی ہندوستان میں اسلامی تحریک کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے کہ جن مسلمان جن کو موپلا قوم اپنا بزرگ مانتی ہے۔ ملک عراق سے آئے اور اس ملک کے جنوبی حصے پر آباد ہو گئے۔ گرم مسالوں اور ہاتھی دانت اور جواہرات وغیرہ کی تجارت سینکڑوں برس سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان عربوں اور ایرانیوں کے توسل سے جاری تھی۔ اسی لیے اسلام کا اثر جنوبی ہند کے

مغربی ساحل پر برابر پہنچتا رہا۔ باہر کے مسلمانوں کی کثرتِ آمد و رفت سے مغربی ساحل ہند کے تجارتی شہروں کی آبادی خلط ملط ہوگئی اور اکثر لوگ آدھے ہندو، آدھے عرب اور آدھے ایرانی ہوگئے۔ یہ تحقیق ہے کہ مسلمان تاجروں اور ہندو راجاؤں میں آشتی پیدا ہو گئی تھی۔ والیان ملک نے تجارت کا بازار گرم رکھنے کے خیال سے اور ملک کی ترقی کو جو مسلمان سوداگروں کی بود و باش کا نتیجہ تھی۔ مدنظر رکھ کر اپنی حفاظت اور سرپرستی میں لیا۔"

چنانچہ تبلیغ اسلام میں اسی سرگرمی کا نتیجہ تھا کہ پہلی صدی ہجری میں ملیبار، کارومنڈل، گجرات اور بمبئی کے ساحلی علاقوں میں اسلام بہت تیزی سے پھیل گیا۔ حالانکہ اس وقت تک اس علاقے میں مسلمان فاتحین کے قدم نہیں آئے تھے۔ یہ سب عرب تاجروں اور ان کے ساتھ آنے والے مسلمان واعظوں اور مبلغوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں بت پرست کسی جبر یا لالچ کے بغیر صرف مسلمانوں کا اخلاق و کردار دیکھ کر اور اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر مشرب با اسلام ہوگئے چنانچہ "جب ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ہجری میں کھنبایت سے چین کا سفر کیا تو اس نے مالا بار کے ساحل پر جابجا مسلمانوں کی معقول آبادیاں دیکھیں۔ ضلع کاردار، صوبہ بمبئی کی قدیم بندرگاہ ہونادر میں سلطان جمال الدین ایک ہندو راجہ کی طرف سے حکمران تھے اور اس شہر میں مسلمان عالم اور اسلامی مدارس موجود تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار کے قریب تھی۔ کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا لیکن سوداگروں اور تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں انہیں بڑا دخل حاصل تھا۔"

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب میں اس مغالطے کا بھی ازالہ کر دیا ہے کہ ملیبار کے یہ مسلمان عرب یا عراق کے لوگوں پر مشتمل نہ تھے بلکہ اسی سرزمین کے رہنے والے تھے چنانچہ وہ لکھتے ہیں "سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں موبلا قوم کے نومسلم ملیبار کی کل آبادی کا پانچواں حصہ تھے۔ ان کی زبان وہی تھی جو ہندوؤں کی زبان ہے اور صرف لمبی داڑھی اور سر کے عجیب لباس سے ان کو اور لوگوں سے تمیز کیا جا سکتا ہے۔"

یہ تو جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے عوام الناس کا ذکر ہے تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی پاکیزہ تعلیم اور عرب تاجروں اور واعظوں کے حسن اخلاق سے ان علاقوں کے حکمران اور امراء بھی متاثر ہوئے۔ نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اسلام کی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھ پر فخر کیا۔ چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ کنانور کے راجہ کا وزیر اسلامی تعلیم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسلام

قبول کر لیا۔ اس نومسلم وزیر کا خلوص اللہ تعالیٰ کو نہایت پسند آیا اور اس کا قبول اسلام بارگاہ رب العزت میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے خاندان نے حیرت انگیز عروج حاصل کیا۔ رفتہ رفتہ یہ خاندان مسندِ حکومت پر متمکن ہو گیا اور زمانہ دراز تک اس کی عظمت وسطوت کا ڈنکا جنوبی ہند میں بجتا رہا۔

ظاہر ہے کہ اسلام قبول کرنے والے حکمران خاندانوں کے اثر سے ہزاروں ہزار مقامی غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ باہر سے آنے والے عرب تاجروں اور واعظوں کی دعوت وتلقین سے ان کے ایمانوں میں پختگی پیدا ہوئی۔ اور ان کی دینی تعلیم و تربیت مضبوط بنیادوں پر ہونے لگی۔

اسلامی دعوت کا حلقۂ اثر صرف ہندو وزراء و امراء تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے غیر مسلم حکمرانوں نے بھی اسلامی تعلیم کی صداقت کو محسوس کیا اور انھوں نے کسی مسلمان حکمران سے میدان جنگ میں مغلوب ہونے کے بعد نہیں بلکہ عرب تاجروں اور مبلغوں سے اسلام کی خوبیاں سُن کر اسلام قبول کیا۔

جنوبی ہند میں توسیع اسلام کی مہم کسی مادی طاقت یا جبر کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ اسلام کی تاثیر اور اس کی پاکیزہ تعلیم کی مرہون منت تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں جو مسلمان پائے جاتے ہیں۔ یہ سب قافلہ در قافلہ اور گروہ در گروہ عرب، ایران، ترکی یا افغانستان سے آکر یہاں آباد نہیں بلکہ ان کی بہت بڑی اکثریت مقامی باشندوں پر مشتمل تھی۔

سندھ میں ظہورِ اسلام

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے نے سندھ کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کیا اور فتح سندھ کے بعد ہی بہت سے اہل سندھ نے اپنے حاکم کا مذہب قبول کر لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ سندھ کے عوام پر محمد بن قاسم کی آمد کے بعد ہی اسلام کی حقانیت ظاہر ہوئی اور انھوں نے اس واقعہ کے بعد ہی اسلام قبول کرنا شروع کیا مگر اس تبدیلی مذہب میں محمد بن قاسم کے جبر کو دخل نہ تھا بلکہ یہ کرشمہ تھا۔ فاتحین کے حُسن اخلاق، بلندیٔ کردار، دانش مندی اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم کا کہ اہل سندھ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ورنہ جہاں تک محمد بن قاسم کا تعلق ہے۔ ہندو مورخین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے سندھ کے لوگوں پر مذہب کے معاملے میں تو کیا کسی معاملے میں سختی نہ کی بلکہ نہایت فراخدلی و فیاضی کا سلوک کیا۔ چنانچہ برصغیر کے مشہور ہندو مورخ ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب میں

لکھتے ہیں:۔

"اس فتح مند مسلمان نے مفتوحین کے ساتھ جو سلوک کیا وہ فیاضی اور دانش مندی پر مبنی تھا۔ اس نے مال گزاری کے اس نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی جو اس علاقے میں پہلے سے رائج تھا۔ علاوہ ازیں اس نے بہت سے پرانے اہل کاروں کو بھی ان کے عہدوں پر برقرار رکھا۔ پجاریوں اور برہمنوں کو آزادی تھی کہ وہ مندروں میں جا کر اپنے طریقے کے مطابق عبادت کریں۔ ہندو کاشت کاروں کو برہمنوں اور مندروں کو وہ ٹیکس دینے کی بھی اجازت تھی جو وہ قدیم سے دیتے چلے آ رہے تھے۔"

محمد بن قاسم کے اسی حسن سلوک اور مذہبی رواداری کا نتیجہ تھا کہ سندھ کے غیر مسلم برضا و رغبت اسلام قبول کرنے لگے۔ جن ہندوؤں نے اسلام قبول نہیں کیا وہ بھی محمد بن قاسم کے حسن و سلوک اور فیاضی سے بے حد متاثر تھے اور اسے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس نے سندھ فتح کرنے کے بعد یہاں کے لوگوں کو برہمنوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا دی تھی اور ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا تھا جس میں ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب محمد بن قاسم پر خلیفہ وقت کا عتاب نازل ہوا اور وہ قید خانے میں وفات پا گیا تو سندھ کے لوگوں نے اس کی موت کو بہت بڑا سانحہ قرار دیا، اس کا ماتم کیا اور اس کی یادگار کے طور پر کیرج میں اس کا مجسمہ نصب کیا۔

محمد بن قاسم کی وفات کے بعد سندھ کے حالات میں متعدد تغیر و تبدل رونما ہوئے بعض علاقوں سے عربوں کی حکومت ختم ہو گئی مگر اسلام کی تبلیغ کا کام جاری رہا اور عرب تاجر اور واعظ یہاں آ کر لوگوں کو اسلام کی خوبیاں بتاتے اور انھیں دائرہ اسلام میں داخل کرتے رہے ان میں سے بعض مبلغوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور ان کے ذریعے خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے۔

پنجاب میں تبلیغ اسلام

سندھ کے بعد برصغیر کی جس سرزمین کو مسلمانوں کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا، وہ پنجاب کی سرزمین تھی، یہ درست ہے کہ اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق اس سرزمین پر مسلمانوں نے فاتح کی حیثیت سے قدم رکھا اور مبلغین و واعظین ان کے بعد آئے لیکن تاریخ اس امر کی بھی شہادت دیتی ہے کہ یہاں کے لوگوں کی روحانی زندگی پر فاتحین نے نہیں واعظین نے اثر ڈالا کیونکہ مسلمانوں کے سب سے پہلے فاتح سلطان سبکتگین نے پنجاب پر حملہ ضرور کیا مگر یہاں کے سرکش راجہ کو جو

اسلامی سرحدوں پر حملے کرتا رہتا تھا، سزا دے کر یہ مسلمان فاتح واپس چلا گیا۔ اسی طرح محمود غزنوی نے بھی یہاں مستقل قیام کبھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی فاتح کی آمد یہاں کے لوگوں کی تبدیلی مذہب کا موجب نہیں ہوئی۔ اس سرزمین پر مذہبی انقلاب سب سے پہلے ایک بزرگ واعظ حضرت سید اسماعیل بخاری کے ہاتھوں رونما ہوا، جو ۳۹۵ھ میں لاہور تشریف لائے۔ ان دنوں لاہور کا حکمران ایک ہندو راجہ تھا جو سلطان محمود غزنوی کو خراج دیا کرتا تھا۔ حضرت اسماعیل بخاری نے لاہور آکر اس سرزمین پر سب سے پہلی مجلس وعظ منعقد کی آپ کا بیان اتنا پُرلطف اور زبان اتنی پُرتاثیر تھی کہ لوگ آپ کی تقریر سُننے کے لیے کھینچے چلے آتے تھے اور روزانہ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق صرف ایک دن میں آپ کے دست حق پرست پر ایک ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔

حضرت اسماعیل بخاری کے بعد دوسرے بُزرگ جنھوں نے لاہور میں سجادۂ رشد و ہدایت آراستہ کیا۔ حضرت شاہ حسین زنجانی ہیں۔ آپ لاہور میں پینتیس چھتیس سال مقیم رہے اور تبلیغ اسلام کے لیے مختلف صوبوں اور شہروں کے دورے بھی کیے۔ حضرت شاہ حسین نہایت متقی، نہایت صاحب علم اور نہایت بلند اخلاق کے بُزرگ تھے۔ آپ کے علم کے ساتھ ساتھ عمل نے بھی بڑا کام کیا اور ہزاروں افراد آپ کا اعلیٰ نمونہ دیکھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔

تیسرے بُزرگ جن کی مساعی جمیلہ سے سابق پنجاب میں اسلام کا نور پھیلا حضرت مخدوم سید علی ہجویری ہیں جو عوام میں داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ بلاشبہ برصغیر کی روحانی تاریخ میں آپ کا نہایت بلند مقام ہے۔ حضرت علی ہجویری کی تبلیغی کوششوں کے بہت دُوررس نتائج نکلے اور آپ کا فیض آپ کے بعد بھی جاری رہا۔ تاریخ کے مطالعے سے ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے زمانے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ ایک روایت کے مطابق آپ کی محفل میں دن کو طالب علموں کو تدریس اور رات کو طالبان حق کی تلقین ہوتی۔ ہزاروں جاہل ان کے ذریعے سے عالم، ہزاروں کافر مسلمان، ہزاروں گمراہ رو براہ، ہزاروں دیوانے صاحب عقل و ہوش، ہزاروں ناقص کامل اور ہزاروں فاسق نیکوکار بن گئے۔ تمام زمانے نے ان کی غلامی کو اپنا فخر تصور کیا۔ اس وقت لاہور مرجع علماء و فضلاء کا تھا۔ دور دور سے شیخ حضرت کی خدمت میں آکر بہرہ یاب ہوتے۔

آپ کی تبلیغ سے جو شخص سب سے پہلا مسلمان ہوا وہ پنجاب کا ہندو گورنر رائے راجو تھا، جو سلطان مودود والیٔ افغانستان کی طرف سے اس علاقے کا انتظام کرتا تھا، حضرت علی ہجویری نے

اس کا اسلامی نام شیخ ہندی تجویز کیا۔

حضرت علی ہجویری کے علاوہ اس خطے میں حضرت سید احمد توختہ ترمذی اور حضرت شیخ عزیز الدین مکی کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں کہ ان حضرات کی شبانہ روزہ کوششوں سے ہزاروں صنم پرست دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

لاہور کے علاوہ بہاول پور، جھنگ، ساہیوال اور ملتان میں بھی اسلام کی توسیع واشاعت کا فریضہ انھی درویشوں نے سرانجام دیا۔ جن کے پاس اپنے اعلیٰ کردار اور اوصاف حمیدہ کے علاوہ کوئی مادی طاقت نہ تھی۔ ان بزرگوں میں شیخ بہاالدین زکریا، سید جلال الدین منیر شاہ، حضرت موسیٰ نواب، حضرت مخدوم جہانیاں، حضرت بابا فریدالدین گنج شکر اور شیخ صدرالدین کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسلام کے اوّلین مبلغوں حضرت شاہ اسماعیل بخاری اور حضرت مخدوم سید علی ہجویری کے مشن کو جاری رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں ان بزرگوں نے بڑا حصہ لیا۔ ان کی شبانہ روز کوششوں سے صوبہ پنجاب میں اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچا اور ان میں سے بہت سے بزرگوں نے تو قبیلوں کے قبیلوں کو مسلمان کر لیا۔ مثلاً سید جلال الدین منیر شاہ کے ساتھ پر بہاول پور کے کئی قبیلوں نے اسلام قبول کیا۔ حضرت موسیٰ نواب کے ہاتھ پر "رچہ" میں دو قبیلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ کے بقول پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاؑ الحق اور بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی تعلیم و تلقین سے اسلام قبول کیا اور سولہ قومیں تو صرف بابا گنج شکر کی کوشش سے مسلمان ہوئیں۔ حضرت مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر مغربی پنجاب کے جن قبیلوں نے اسلام قبول کیا ان قبیلوں کی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے۔ ان میں راجپوتوں کا ایک بڑا قبیلہ کھرل بھی شامل ہے۔ اسی طرح صوبہ پنجاب کے دو معزز قبیلے سیال اور وٹو بھی حضرت مخدوم جہانیاںؒ اور حضرت مسعود گنج شکرؒ کی تبلیغ و تلقین سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ایک اور مشہور و ممتاز قبیلے نون کو بھی حضرت مخدوم جہانیاںؒ اور جوہیہ راجپوتوں کو حضرت شیخ رکن العالم کے ذریعے اسلام کی نعمت میسر آئی۔

کشمیر میں اشاعت اسلام

کشمیر میں اس کثرت سے صوفیاؒ اور مبلغین اسلام تشریف نہیں لے گئے جس کثرت سے سندھ، پنجاب اور جنوبی ہند میں آئے۔ مگر اس کے باوجود اس خطے میں اسلام نہایت سرعت سے پھیل گیا اور کثیر تعداد میں کشمیری مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کشمیر میں منظم طور پر تبلیغ اسلام کا آغاز ۱۳۲۴ء میں ہوتا ہے۔ جب

شرف الدین بُلبُل شاہ نامی ایک بزرگ نے اس سرزمین پر قدم رکھا۔ ان دنوں رنجن دیو نامی ایک راجہ کشمیر کا حاکم تھا۔ یہ مذہباً بدھ تھا۔ مہاراجہ رنجن دیو کے علاوہ اس کے دربار کے امراء و وزراء نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ حضرت بُلبل شاہ کی کوشش سے کشمیر کے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کی تعداد دس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ رنجن دیو نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا لقب صدرالدین اختیار کیا۔ کشمیر کے دوسرے قابل مبلغ سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا تھے۔ جو راجہ کشمیر سنگھ دیو کے دربار سے وابستہ تھے اور نہایت ذمہ دارانہ عہدوں پر وابستہ رہے۔ صدرالدین کی وفات کے بعد جب کشمیر میں سیاسی لحاظ سے ابتری پیدا ہوگئی تو اہل کشمیر نے انھی شاہ مرزا کو تخت سلطنت پر بٹھایا انھوں نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے عہد میں کشمیر کے سیاسی حالات رو بہ اصلاح ہوئے اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بھی نہایت منظم طریقے سے ادا کیا گیا۔

۱۳۸۸ء کے قریب سید علی ہمدانی کشمیر میں آئے اور ان کی وجہ سے اسلام کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ بزرگ جب تیمور کے معتوب ہوئے تو اپنے وطن ہمدان کو چھوڑ کر کشمیر میں چلے آئے۔ سات سو سید ان کے ہمراہ تھے جو کشمیر پہنچ کر مختلف مقامات میں عزت نشیں ہوئے اور اپنے اثر سے ہندوؤں کو مسلمان کرتے رہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی کوشش سے ۳۰ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا۔

وسطِ ہند میں تبلیغ اسلام برصغیر کے صوفیاً اور واعظین میں جس بزرگ کا دائرہ اثر سب سے زیادہ وسیع ہوا۔ وہ معین اسلام حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔ آپ مشرقی ایران کے علاقہ سجستان میں پیدا ہوئے، ایران سمرقند اور عراق میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد حج کرنے تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کو خواب میں ہندوستان جاکر تبلیغ اسلام کرنے کا حکم ملا۔ چُنانچہ غزنی کے راستے پہلے لاہور تشریف لائے، کچھ عرصہ قیام کرکے ملتان گئے اور وہاں سے اجمیر جاکر مستقل اقامت اختیار کرلی۔ اجمیر کے لوگوں پر آپ کی شخصیت کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ اور راجہ اجمیر کا گرو تو آپ کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ کلمہ توحید پڑھ کر داخل اسلام ہوگیا۔ گرو کے مسلمان ہونے کا اجمیر کے غیر مسلم عوام پر نہایت اچھا ردِ عمل ہوا اور وہ بھی گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

آپ کے ایک تذکرہ نگار شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ "اس علاقے کے بہت سے سربرآوردہ غیر مسلموں نے

آپ کی برکت سے دولت اسلام و ایمان حاصل کی اور بہت سے لوگ جو ایمان نہیں لائے وہ بھی آپ کے عقیدت مند ہوگئے اور آپ کی خدمت میں تحائف و ہدایہ پیش کرتے رہے۔"

ایک روایت کے مطابق جو پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ آپ نے دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے راستے میں سات سو ہندوؤں کو داخل اسلام کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے خلفاء کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا ہے جس نے وسط ہند، دہلی، یو پی اور پنجاب کے بہت سے علاقوں میں آپ کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ان بزرگوں میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ حمید الدین ناگوریؒ، اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور پھر ان سے جو سلسلہ چلا، اس میں حضرت مخدوم علاء الدین صابر، شیخ جمال ہانسویؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے بعض دفعہ نہایت ہی ناخوشگوار حالات میں فریضۂ تبلیغ جاری رکھا اور ہزاروں ہزار بُت پرست آپ کے دست حق پرست پر داخل اسلام ہوئے۔

بنگال میں اشاعتِ اسلام

بنگال میں تبلیغ اسلام کے سامان قدرت کی طرف سے پیدا ہوگئے۔ جب یہاں کے راجہ کنس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے جٹ مل نے اپنے ہندو امراء کی ایک مجلس منعقد کی اور اس میں اعلان کیا کہ وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ اگر اس کا قبول اسلام امورِ مملکت میں خرابی کا باعث ہو تو وہ تاج و تخت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔ (جٹ مل کو بنگال کے ایک مشہور بزرگ حضرت نور قطب عالمؒ نے اسلام کی تبلیغ اس خوش اسلوبی سے کی تھی کہ دینِ حق اس کے دل میں گھر کر گیا تھا اور وہ بادشاہت جیسی دولت چھوڑنے کو تیار ہو گیا تھا) مگر اس کے سرداروں نے یک زبان ہو کر کہا کہ آپ جو مذہب چاہیں اختیار کریں۔ ہم میں سے کوئی معترض نہ ہوگا۔ اس کے بعد جٹ مل نے مسلمانوں کی ایک مجلس طلب کی اور اس میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جٹ مل نے اپنا نام جلال الدین محمد شاہ رکھا اور پھر تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے عہد میں کثیر تعداد میں لوگ داخل اسلام ہوئے۔ بنگال میں افغانوں نے آکر بھی بڑے انہماک سے تبلیغ کی۔ انھوں نے بنگال کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو نسل چلی وہ آج تک بنگالی پٹھانوں کی صورت میں موجود ہے۔ چاٹگام کے علاقے میں عرب جہاز رانوں کی آمد غزنوی اور غوریوں کے حملے سے بہت قبل شروع ہو گئی تھی اور عربوں کی خاصی تعداد بھی اس علاقے میں مقیم تھی۔ یہ تاجر صرف کاروبار کی خاصی تعداد بھی اس

علاقے میں مقیم تھی۔ یہ تاجر صرف کاروبار ہی نہ کرتے تھے بلکہ جس علاقے میں جاتے وہاں اسلام کی تبلیغ کرتے اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار سے بنگال کے غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لے آتے۔ انھی کی کوششوں سے ان علاقوں میں متعدد مساجد قائم ہوئیں اور چاٹگام کے علاقے میں اسلام پھیلا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ عرب تاجروں اور مقامی مسلمانوں کے اشتراک سے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست بھی قائم ہوگئی۔

بنگال میں جو بزرگ تبلیغ اسلام کے لیے سب سے پہلے تشریف لائے ان کا اسم گرامی حضرت جلال الدین تبریزی تھا۔ آپ کے بعد حضرت عثمان رضی سراج اس علاقے میں وارد ہوئے۔ حضرت بدیع الزمان زندہ شاہ مدارؒ، حضرت سید جلال الدین بخاری، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت شرف الدین ابوتوامہؒ، حضرت شاہ جلال سلہٹیؒ، حضرت پیر بدر عالم زاہدیؒ، اور حضرت خواجہ جہاں علی مختلف زمانوں میں سرزمین بنگال پر وارد ہوئے اور دور دراز علاقوں میں جاکر مشرکوں کو اسلام کا پیغام دیا۔ ان بزرگوں کی دعوت و تبلیغ سے بنگال کے ہزاروں افراد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان بزرگوں نے جن علاقوں میں تبلیغ کرکے اہل بنگال کو مشرف بہ اسلام کیا ان علاقوں میں مساجد تعمیر کیں۔ رفاہ عامہ کے کارنامے سرانجام دیے۔ یعنی کنوئیں کھدوائے، تالاب بنوائے، سڑکیں تعمیر کرائیں اور مسافروں کے لیے لنگر قائم کیے اس طرح ان مبلغین کی آمد سے اہل بنگال صرف اسلام ہی کی نعمت سے متمتع نہیں ہوئے بلکہ انھیں معاشرتی لحاظ سے بھی بڑا فائدہ پہنچا۔

برصغیر کے معاشرے پر اشاعت اسلام کے اثرات

مُسلم فاتحین کے زیر اثر برصغیر میں مسلمانوں کی آمد، ان کے قیام اور بودوباش سے رفتہ رفتہ ایک مسلم معاشرے کا قیام ممکن ہو سکا۔ ان کی نیک عملی اور تبلیغی سرگرمیوں سے مقامی آبادی کی بڑی تعداد بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئی۔ اسلام کی تعلیم بہت سادہ اور دلنشین تھی۔ اس لیے صدیوں سے ذات پات کی تفریق میں رنجھی ہوئی اور برہمنیت کی کچلی ہوئی انسانیت نے اس تعلیم میں امن اور نجات کی صورت دیکھی، صفائی، طہارت، مساوات، انصاف اور علم کی روشنی اسلام کی ایسی خصوصیات تھیں جن سے یہ دین عوام و خواص کے لیے قابل قبول بن گیا۔

مثال کے طور پر محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں دیبل فتح کیا۔ یہاں چار ہزار عرب مسلمان آباد ہوئے اور مسجد تعمیر کی گئی۔ اس طرح دوسرے شہروں میں بھی مسجدیں اور درس گاہیں قائم ہوئیں۔ چنانچہ دوسرے

علاقوں میں بھی اسلامی تہذیب کے اثرات پھیلتے رہے اور سندھ کی جو اقوام نیم وحشی تھیں، تہذیب و ترقی کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ ان پر اسلامی تعلیم و تمدن کے اثرات غالب آگئے۔ اس طرح جو معاشرہ وجود میں آیا۔ وہ جھوٹ، فریب، دھوکے سے پاک تھا اور لوگ قول کے سچے تھے، ناپ تول میں کمی نہ کرتے تھے۔

اس طرح محمود غزنوی کی فتوحات کے نتیجے میں بہت سے ایرانی اور افغانی خاندان پنجاب میں آکر آباد ہوگئے۔ مسلمان فوجوں کے ہمراہ کئی مسلمان مبلغ بھی آئے اور یہاں آباد ہوگئے۔ ان کی تبلیغ اور روحانیت سے برصغیر میں اسلام کی خوب اشاعت ممکن ہوسکی۔ ایسے ہی محمد غوری کی پالیسی سے اسلامی سلطنت قائم ہوئی اور تبلیغ دین کو تقویت ملی۔

اس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جہاں عدل و انصاف تھا اور غیر مسلموں سے رواداری کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں وسطی ایشیا میں مسلمان حکومتیں منگولوں کے سیلاب کے ساتھ بہہ رہی تھیں لیکن برصغیر میں ایک نئی مضبوط ریاست کا قیام عمل میں آیا اس کے ساتھ ہی اسلامی ثقافت اور علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔

ثقافتی اثرات

مسلمانوں کی آمد سے خصوصاً محمود غزنوی کے حملوں کے بعد برصغیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ اسی طرح علم و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ فن تعمیر اور اسلامی تہذیب و تمدن کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں نہایت مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کے ملاپ سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی جو ہندوستانی کہلائی۔ سندھی رسم الخط، سندھی زبان اور پھر اردو زبان اسی تہذیب کی پیداوار تھی۔

معاشی اثرات

ہندو برہمنوں نے اپنے مندروں میں بے اندازہ دولت جمع کر رکھی تھی۔ محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں یہ دولت مسلمانوں کے قبضے میں آگئی اور عالم اسلام پر صرف ہونے لگی۔ محمود غزنوی نے اس دولت سے اپنی فوج کی تنظیم نو کی، اپنی سلطنت کو مستحکم کیا اور غزنی میں عالی شان عمارات سر اٹھانے لگیں۔

برصغیر میں فوری طور پر سونے چاندی کے ذخیرے کم ہوگئے چونکہ یہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور اس وقت یہاں لوٹ کھسوٹ کرنے والے برہمن اپنا اثر و رسوخ کھو چکے تھے، اس لیے چند ہی برسوں میں کسانوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوگیا، عربی نسل کے گھوڑوں اور اونٹوں کی افزائش

ہونے لگی اور کھجوروں کی بہتات ہوگئی، تجارت کو دیانت اور امانت کی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔

علمی اثرات اس دور میں علم و فنون کو بڑا فروغ حاصل ہوا، عباسی خلفائ نے ہندی کتابوں کے تراجم میں دلچسپی لی۔ چنانچہ فلکیات کی کتابیں سرہانت، آریہ بھٹ اور کھنڈا کھنڈیک سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ہندوستانی اعداد اور صفر لکھنے کا طریقہ مسلمانوں نے ترقی دے کر عربی ہندسوں کے نام سے روشناس کرایا۔ اسی سے گنتی لکھنا آسان ہوگئی۔ طب پر ہندو پنڈتوں کی کتابیں خصوصاً سسترت، چرک اور چانکیہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ سنسکرت کی کتاب پنچ تنتر کا فارسی ترجمہ کلیہ و دمنہ اور کئی دیگر علوم کی کتابوں کے فارسی اور عربی ترجمے ہوئے۔ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں قرآن مجید کا سندھی ترجمہ ہوا۔ اس سے سندھی زبان میں اسلام کی اشاعت کو فروغ حاصل ہوا۔

محمود غزنوی کے دور میں غزنی کا دربار علم و ادب کا مرکز بن گیا جو رفتہ رفتہ لاہور منتقل ہوگیا۔ اس کے دربار میں البیرونی، فارابی، بیہقی اور ناصحی جیسے ممتاز علمار موجود تھے۔ لاہور میں اس کے ساتھ البیرونی، مسعود سعد سلمان جیسے علمار اور اس کے دور میں داتا گنج بخش جیسے صوفیا تشریف لائے۔

اہم علمی اور ادبی شخصیات

(الف) البیرونی وہ ۹۷۳ء میں خوارزم کے قریب ایک گاؤں بیرون میں پیدا ہوا۔ ۱۰۱۷ء میں غزنی چلا آیا۔ یہاں وہ محمود غزنوی اور اس کے بیٹے مسعود سے منسلک رہا۔ اس نے ایک سو چودہ کتابیں تصنیف کیں اور ۷۸ برس کی عمر میں ۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔

البیرونی پہلا مسلمان سائنس دان تھا جس نے زندگی کا زیادہ عرصہ برصغیر کے باہر گزارہ لیکن برصغیر پر پہلی کتاب اسی کی "کتاب الہند" ہے۔ اس کتاب میں اس نے ہندوؤں کے مذہب، رسموں، رواجوں، علوم و فنون اور معاشرتی و معاشی حالات کا پہلی بار جامع تذکرہ کیا۔

وہ پہلا سائنس داں ہے جس نے زمین کا محیط ناپا۔ محیط ناپنے کا یہ تجربہ اس نے جہلم کے قریب قلعہ نندیا میں کیا۔ اس نے اپنے تمام تجربات کو کتاب "قانون مسعودی" میں درج کیا۔

البیرونی نے جواہر اور نباتات پر بھی کتابیں لکھیں۔ اس نے پہلی بار بتایا کہ پھول کی پتیوں میں عددی باقاعدگی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ طاق تعداد میں ہوتی ہیں یعنی تین، پانچ یا سات وغیرہ۔

البیرونی ریاضی، ہیئت، نجوم، کیمیا، جغرافیہ وغیرہ علوم کا ماہر تھا۔ اس نے بتایا کہ پنجاب

اور سندھ کے میدان دریاؤں کی پہاڑوں سے لائی ہوئی مٹی سے بنے ہیں۔

وہ فارسی، ترکی، عربی، عبرانی، یونانی زبانوں سے واقف تھا۔ اس نے عربی سے کئی کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کی تھیں۔

(ب) مسعود سعد سلمان برصغیر میں پہلا فارسی اور اُردو شاعر مسعود سعد سلمان کو تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۰۴۶ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کے والد خواجہ سعد سلمان، سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں لاہور آئے تھے۔

مسعود سعد سلمان پہلے سلطان ابراہیم، پھر اس کے بیٹے علاؤالدین مسعود کے دربار سے وابستہ رہا۔ شک کی بنا پر کچھ عرصہ قید رہا۔ قید کے دوران میں اس نے کئی فارسی قصیدے لکھے۔ رہائی کے بعد اسے شاہی کتب خانے کا نگران مقرر کیا گیا۔ اس کے عربی، فارسی اور ہندوی یا اردو کلام کے تین دیوان تھے۔ اس کا فارسی دیوان فارسی دیوان مشہور فارسی شاعر سنائی نے مرتب کیا تھا جو تہران سے شائع ہو چکا ہے، عربی اور اُردو دیوان نایاب ہیں۔

مُسلم فاتحین کے زیرِ اثر اہم علمی اور تہذیبی مراکز

بنھور کراچی سے گھارو جاتی ہوئی سڑک پر کراچی سے قریباً چالیس میل اور گھارو سے دو میل کے فاصلے پر بنھور کے کھنڈر چوتھائی میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کھنڈروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی یہ بڑا گنجان اور پُر رونق شہر تھا۔ یہاں کے آثار سے مسلمانوں، ہندوؤں، ساسانیوں اور پارتھیوں کی تہذیبوں کے نشانات ملتے ہیں۔

محمد بن قاسم کے عہد میں یہ ایک مشہور بندرگاہ تھی مسلمانوں نے یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس کے کتبے پر ۲۹۴ھ درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خلیفہ ولید اول کے دور کی مسجد ہے، مسجد کے ساتھ ہی ایک بڑی عمارت کے کھنڈر ملتے ہیں، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مکتب تھا۔

بعض مورخوں اور جغرافیہ دانوں کا اندازہ ہے کہ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں جس بندرگاہ دیبل کو فتح کیا تھا، وہ دراصل یہی بنھور ہی تھا۔

بنھور کی اہم دریافت اس کے سکے ہیں۔ ایک سکے پر ایک طرف ۲۱ یزدگردی سال (مطابق ۳۲ھ) اور دوسری طرف بسم اللہ لکھا ہوا ہے۔ یہاں سے اموی اور عباسی دونوں عہدوں کی

چیزیں نکلی ہیں۔ اموی دور کے برتن ملے ہیں جن پر خط کوفی میں عبارتیں لکھی ہیں اور عباسی دور کے سکے ملے ہیں۔ ان کے علاوہ سندھ میں ڈھلنے والے سکے بھی دریافت ہوئے ہیں۔

منصورہ

منصورہ شہر کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے نے رکھی تھی، وہ سندھ کا گورنر تھا۔ اور اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر اس نے ۷۲۷ء میں یہ شہر آباد کیا۔ اندازاً ۷۴۳ء تک سندھ کا دارالسلطنت اروڑا تھا۔ اس کے بعد منصورہ دارالسلطنت بنا اور قریباً تین سو سال تک سندھ کا دارالسلطنت رہا۔

یہ دریائے سندھ کے کنارے ایک جزیرے کی شکل میں آباد ہوا تھا۔ یہ ایک مربع میل رقبے کا پُر رونق شہر تھا اور ملتان سے بڑا شہر تھا۔ شہر کے چار دروازے تھے اور اردگرد باغ تھے۔ محل و وقوع کے اعتبار سے یہ شہر دریا کے کنارے اور سمندر سے قریب تھا۔ اس لحاظ سے عراق اور ملک عرب سے آمدورفت کے لیے مناسب تھا۔ اس کے دائرہ حکومت میں آنے والے دیہایت اور آبادیوں کا شمار تین لاکھ تھا۔

منصورہ میں عربوں کی خاصی آبادی مقیم ہوگئی تھی۔ عرب سیاح مقدسی لکھتا ہے کہ منصورہ میں قاضی ابو محمد منصوری جیسے بلند پایہ عالم اور مصنف موجود تھے۔ یہاں پر مقیم ایک عرب نوجوان نے قرآن مجید کا ترجمہ سندھی میں کیا تھا۔ منصورہ میں علم وفضل کی عام رونق تھی۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت دوسرے شہروں سے بڑھی ہوئی تھی۔ عربوں کے زمانے میں منصورہ علم وادب کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

یہ شہر ساتویں صدی ہجری کے وسط تک موجود تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے زمانے میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے، ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی صدی کے آخر میں زلزلے کی وجہ سے منصورہ اور برہمن آباد تباہ ہوگئے۔

اُچ

بہاول پور سے جنوب مغرب میں اڑتیس میل پر اُچ واقع ہے۔ اُچ کو اسلامی عہد میں بڑی ترقی اور وسعت حاصل ہوئی اور یہ ایک علمی، تہذیبی، تجارتی اور جنگی مرکز کے لحاظ سے اہمیت اختیار کر گیا۔ سیاحوں اور مؤرخوں نے اس کی خوبصورتی اور خوش حالی کا ذکر کیا ہے۔ اسے پہلے پہل محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں یہاں ایک اسلامی درس گاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اُسی عہد میں شیخ صفی الدین گازرونی یہاں تشریف لائے اور ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ اُچ کو سب سے زیادہ عروج سلطان ناصرالدین محمود کے عہد حکومت میں

حاصل ہوا۔

حضرت زکریا ملتانی نے اپنے مُرید سیّد جلال بخاری (۱۱۹۱-۱۲۹۱ء) کو لوگوں کی رہنمائی کے لیے اُچ روانہ کیا۔ وہ اُچ میں باقاعدگی سے وعظ کیا کرتے، جس سے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔

مُسلم سلاطین کے زمانے میں ملتان کی طرح اُچ بھی تصوف کا بڑا مرکز تھا۔ اُچ کی شہرت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی موجودگی سے ہوئی۔ مخدوم صاحب (۱۳۰۷ء-۱۳۸۴ء) علم ولایت اور سیادت کے جامع تھے۔ وہ کثرت سیاحت کی وجہ سے جہاں گشت کہلائے۔ انھوں نے چھتیس حج کیے تھے۔

سیّد محمد غوث گیلانیؒ ملتان، لاہور اور اُچ میں ہدایت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے رہے۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا مُرید تھا۔

اُچ میں شیخ صفی الدین کازرونی، سیّد جلال بخاری، مخدوم جہانیاں۔ جہاں گشت وغیرہ کے مزار بھی موجود ہیں۔

مُلتانی راجہ داہر کے زمانے میں ملتان ریاست سندھ کا ایک صوبہ ہوا کرتا تھا۔ ہر صوبے کا الگ صوبیدار ہوتا تھا جو ضرورت پڑنے پر راجہ کو سپاہی فراہم کرتا تھا۔

مُلتان میں ہندوؤں کا ایک مشہور بُت تھا۔ لوگ دور دور سے اس بُت کی زیارت کے لیے آتے تھے اور نذریں اور چڑھاوے لاتے تھے، اس ملتان ایک دولت مند شہر بن گیا۔ اس کی رونق اور خوش حالی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔

عربوں نے یہاں ساتویں صدی عیسوی میں قبضہ کیا۔ پھر محمود غزنوی کے عہد تک اس پر عربوں کا قبضہ رہا۔ پہلے تو یہ سندھ اور منصورہ کے حکمرانوں کے قبضے میں رہا۔ بعد ازاں ایک خود مختار ریاست بن گیا۔ اس ریاست میں ایک لاکھ سے زائد دیہات شامل تھے۔

ملتان شہر کے چاروں طرف ایک فصیل تھی۔ محمد بن قاسم نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔

ملتان میں ہندی اور عربی تہذیب و ثقافت کی آمیزش ہوئی۔ یہ شہر منصورہ سے چھوٹا تھا لیکن زیادہ آباد تھا۔ بلبن کے زمانے میں ملتان، پنجاب اور سندھ کا دارالسلطنت تھا اور اسلامی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز۔ ملتان نے علوم و فنون کے اعتبار سے بہت ترقی کی۔ یہاں عرصے تک اسماعیلیوں کی حکومت رہی۔ یہ شہر صوفیاؒ کا بھی بہت بڑا مرکز تھا۔ ہندوستان جانے والے اکثر صوفیاؒ پہلے ملتان

ہی میں قیام کرتے تھے۔ منگولوں کے حملوں کے بعد ملتان تجارت کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔
صوفیائے ملتان میں اولین تذکرہ شاہ یوسف گردیزی (۱۰۶۹ء — ۱۱۵۲ء) کا ملتا ہے جن کا خاندان آج تک ملتان میں آباد ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے دور کی سب سے پرانی عمارت بھی یوسف گردیزی کا مقبرہ ہے۔ یہ ۱۱۵۲ء میں تعمیر ہوا۔ پھر شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی (۱۱۸۲ء — ۱۲۶۲ء) کا نام نامی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہدایت اور خدمتِ خلق کا نہایت اعلیٰ معیار قائم کیا۔

سہون

اسلام کی آمد سے پہلے ہندو راجوں نے سندھ کو چار صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان میں ایک صوبہ سہون بھی تھا جو اس وقت سیوستان کہلاتا تھا۔
محمد بن قاسم دیبل اور نیرون کی فتح کے بعد سہون پہنچا۔ وہاں کا حاکم قلعہ بند ہوگیا۔ آبادی زیادہ تر بدھ مت سے تعلق رکھتی تھی اور جنگ نہیں چاہتی تھی۔ محمد بن قاسم نے قلعے کا محاصرہ اور چند دنوں میں وہاں کا حاکم نکلا۔ شہریوں نے اطاعت قبول کرلی۔ چنانچہ محمد بن قاسم وہاں چند روز مقیم رہا۔
سلطان ناصرالدین محمود نے سندھ کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک صوبے کا صدر مقام بھکر تھا۔ دوسرے کا سہون۔ ان کا الگ الگ گورنر ہوا کرتا تھا۔
سلاطین غلامان کے عہد میں سہون علوم کا ایک بڑا مرکز اور تعلیم کے لیے کئی اعلیٰ مدرسے قائم تھے۔
ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ میں نے سہون میں شیراز، بغداد اور مصر کے متعدد علماء سے ملاقات کی۔
عربوں سے پہلے یہ شہر بدھ مت کا بڑا مرکز تھا۔ عربوں کی آمد کے بعد یہ ایک تجارتی مرکز بن گیا۔
حضرت لال شہباز قلندر کی وجہ سے سہون کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔
سہون سے کچھ سکّے محمود غزنوی کے نام کے جاری کردہ دریافت ہوئے ہیں۔ محمد غوری کے تانبے کے سکّے بھی قلعہ سہون سے برآمد ہوئے ہیں۔ قطب الدین ایبک کے زمانے میں ناصرالدین قباچہ اُچ، ملتان اور سندھ کا حاکم تھا۔ اس کے نام کا تانبے کا ایک سکہ بھی سہون سے ملا ہے۔ اسی طرح ناصرالدین محمود، معزالدین کیقباد، جلال الدین خلجی اور علاؤالدین خلجی وغیرہ کے عہد کے سکّے بھی یہاں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکّے ان علاقوں میں رائج رہے ہیں۔

لاہور

لاہور کا ذکر عام طور پر ایک قدیم شہر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے پرانے قصّوں اور مذہبی روایتوں میں لاہور کا نام آتا ہے۔ کشمیر کی قدیم تاریخ راج ترنگنی میں بھی یہ ذکر آیا ہے کہ لاہور راجہ ملتار تیا کا دارالحکومت تھا۔

ساتویں اور دسویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے برصغیر پر حملے کیے تو اس وقت لاہور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا دارالحکومت تھا اور ایک بڑا شہر تھا۔

محمود غزنوی نے لاہور فتح کیا اور اس کے جانشینوں نے اسے بڑا عروج بخشا۔ محمود غزنوی نے یہاں کا انتظام اپنے عزیز غلام ایاز کے سپرد کیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق لاہور کا قلعہ اور شہر کی فصیل ایاز ہی نے بنوائی تھی۔ ان کا تو اب نام و نشان نہیں ملتا۔ البتہ ایاز کا مقبرہ اب بھی لاہور میں موجود ہے۔

ایک اندازے کے مطابق غزنوی خاندان کی حکومت کے اختتام تک لاہور دارالسلطنت بنا رہا۔

دوسرے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بھی لاہور کو مرکزی اہمیت حاصل رہی۔ چونکہ یہاں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس لیے دوسرے شہروں سے صوفیا، علماء اور شعراء یہاں آکر مقیم ہونے لگے۔ اس طرح لاہور کو ایک اہم دینی اور علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

مسلمان مبلغوں میں سب سے پہلے شیخ اسمٰعیل بخاریؒ ۱۰۰۵ء میں لاہور وارد ہوئے۔ وہ تفسیر و حدیث کے بلند مرتبہ عالم تھے۔ انھوں نے لاہور تفسیر کا درس شروع کیا۔ ان کی مجلسوں میں بے شمار غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ وہ اپنی آمد کے قریباً ترپن سال بعد لاہور ہی میں فوت ہوئے۔

غزنوی دور کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان لاہور ہی میں پیدا ہوا اور اس نے یہیں زندگی بسر کی۔

حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ گیارھویں صدی عیسوی کے قریباً وسط میں لاہور تشریف لائے اور یہاں تبلیغ و ہدایت کا فیض جاری کیا۔ ان کی کتاب "کشف المحجوب" سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت لاہور کو لہاور کہتے تھے اور یہ ملتان کے گرد و نواح کا شہر سمجھا جاتا تھا۔

برصغیر کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک لاہور میں مقیم رہا اور یہیں دفن ہوا۔

۱۲۴۱ء میں لاہور پر منگول فوج نے حملہ کیا، شہر کا محاصرہ کیا اور لوٹ مار سے اسے تباہ کر دیا۔ جب بلبن بادشاہ بنا تو وہ خود لاہور آیا اور شہر کی فصیل اور قلعے کی مرمت کرائی اور ویران شہر کو نئے سرے سے آباد کرنے کا سر و سامان کیا۔ لاہور کے کئی صوفیا اور عالموں کا ذکر ملتا ہے، جنھوں نے انسان دوستی خدمت خلق اور پرہیزگاری کی تعلیم دی۔ مثلاً محمد غوری کے عہد کے عالم اور واعظ سراج الدین ابن منہاج جو لشکر کے قاضی مقرر ہوئے تھے، اپنے مواعظ حسنہ اور تقریر کی فصاحت میں مشہور تھے۔

ابتدائی اسلامی دور کے اہم صوفیائے کرام

سیّد علی ہجویری داتا گنج بخش

سیّد علی ہجویری داتا گنج بخش کا تعلق غزنی سے تھا اور شجرۂ نسب حضرت امام حسینؓ تک پہنچتا ہے آپ کا سال پیدائش ۱۰۱۰ء کے لگ بھگ ہے۔ آپ کئی برس تک وسطی ایشیا کے کئی اسلامی ملکوں میں تعلیم اور سیاحت کی غرض سے مقیم رہے۔ آپ کا اپنی عمر کا آخری حصہ لاہور میں گزارا اور یہیں تقریباً ۱۰۷۲ء میں وفات پائی۔

داتا گنج بخش کی تصنیف "کشف المحجوب" تصوف کی مشہور و مقبول کتاب ہے۔ اس موضوع پر قدیم و جدید کتابوں میں سب سے جامع اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

داتا صاحب نے پنجاب میں اشاعت اسلام کا بڑا کام کیا۔ انھوں نے لاہور میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی تعلیم و تبلیغ سے لاتعداد لوگ مسلمان ہوگئے۔ ان میں لاہور کا راجہ رائے راجو بھی شامل تھا۔

بابا فرید گنج شکر

بابا فرید کے دادا کابل سے آئے تھے آپ ۱۱۷۳ء میں کھوتوال مضافاتِ ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملتان، ہانسی اور دہلی میں تعلیم پائی پھر عراق اور حجاز کا سفر کیا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ فریدالدین عطار سے فیض حاصل کیا۔ پہلے دہلی میں، پھر اجودھن میں قیام کیا جو اب پاک پتن کے نام سے پنجاب کا ایک قصبہ ہے۔ وہیں ۱۲۶۵ء میں وفات پائی۔

بابا فرید نے اردو اور پنجابی میں عارفانہ کلام پیش کیا، اس لحاظ سے وہ اردو کے پہلے صوفی شاعر ہیں۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی

برصغیر میں سہروردیہ سلسلے کے بانی کوٹ کروڑ میں ۱۱۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ خراسان اور بخارا میں تعلیم حاصل کی۔ حج کے بعد پانچ برس تک مدینہ منورہ میں روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مقیم رہے۔ پھر بغداد جاکر شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ اپنے مرشد کے حکم سے ملتان تشریف لائے۔ ان کی موجودگی سے ملتان علم اور تصوف کا مرکز بن گیا۔ ہزاروں لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر

اسلام قبول کیا۔

ملتان، سندھ اور بلوچستان کو آپ کی روحانی سلطنت سمجھا جاتا تھا۔ آپ کی خانقاہ میں ہزاروں من اناج موجود رہتا تھا اور خشک سالی کے زمانے میں ضرورت مندوں کو تقسیم کیا جاتا تھا۔

آپ کا سال وفات ۱۲۶۲ء ہے۔ آپ کو قلعۂ ملتان میں دفن کیا گیا تھا۔ آپ کا مزار ملتان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

لال شہباز قلندر

آپ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مشہور مرید ہیں آپ کا مزار سندھ میں سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔ آپ کا نام شیخ عثمان اور وطن تبریز کے قریب ایک گاؤں مرند تھا۔ اسی لیے شیخ عثمان مروندی لال شہباز قلندر کہلاتے ہیں۔ بابا فرید گنج شکر اور شیخ بہاؤالدین زکریا سے فیض یاب ہوئے۔ سلطان بلبن کا بیٹا خان شہید آپ کا معتقد تھا۔

آپ ۱۲۶۴ء کے قریب سندھ میں تشریف لائے اور سہون میں مقیم ہوئے۔ یہاں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لاتعداد لوگ ان کے مرید ہوئے۔

انھوں نے سہون ہی میں ۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔ فیروز تغلق کے زمانے میں سہون کے والی نے ان کا شان دار مقبرہ تعمیر کرایا۔

شاہ شمس سبزواری ملتانی

سید نورالدین نام تھا۔ ۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مقامی زبانوں ہندوی (اردو)، ملتانی، پنجابی اور سندھی میں تبلیغ کی۔ وہ اسماعیلی شیعہ صوفی تھے ان کا ملتانی کلام ملتا ہے جو سندھی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ ۱۲۷۶ء میں فوت ہوئے۔

باب ۴

برصغیر میں احیائے اسلام کی کوششیں

برصغیر میں مسلمان اپنے ساتھ مخصوص فلسفۂ حیات اور عادلانہ نظام حکومت لائے۔ اس سے یہاں کی قدیم طبقاتی تقسیم اور ذات پات کے نظام کو سخت زک پہنچی۔ اب ایک نیچ ذات کا ہندو، جس کا سایہ پڑنے سے اونچی ذات کے ہندوؤں کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا تھا، وہ اسلام قبول کر کے مُسلم معاشرے کا اتنا ہی اہم فرد بن جاتا، جتنا کوئی موروثی مسلمان ہوتا، وہ نیچ ذات کا ہندو، جسے مندر میں داخل ہونے اور مذہبی کتابوں کا درس سُننے کی قطعاً ممانعت تھی، کلمۂ توحید پڑھ کر، مسجد میں جاکر ایک حکمرانِ اعلیٰ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہوکر نماز ادا کرتا، اس کے لیے حصولِ علم کے دروازے کھل جاتے اور وہ معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر لیتا۔ اسلام برصغیر میں پس ماندہ اور انسانی حقوق سے محروم طبقوں کے لیے رحمت بن کر آیا اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ستائے ہوئے افراد اسلام کے دامنِ رحمت میں پناہ گزین ہوئے۔

مسلم معاشرے کے قیام میں جہاں غیاث الدین بلبن، علاؤالدین خلجی، محمد بن تغلق جیسے حکمرانوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں وہاں اس کے استحکام میں صوفیائے کرام کی کوششوں نے اثر دکھایا۔ صوفیاً کا عوام سے قریبی تعلق اور روزمرّہ کا برتاؤ تھا۔ ان کی خانقاہیں مسلم معاشرے کا اہم مرکز تھیں۔ مسافر دورانِ سفر خانقاہوں میں قیام کرتے۔ انھیں تین دن تک لنگر سے کھانا ملتا تھا اگر ان کے پاس زادِراہ کی کمی ہو جاتی تو اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے انھیں ضرورت کے مطابق نقدی یا جنس دی جاتی۔ بسا اوقات سواری کا بھی بندوبست ہو جاتا۔

مشہور مورخ برنی بیان کرتا ہے کہ علاؤالدین کے آخری عہدِ حکومت میں گناہ اور جرائم مفقود ہو گئے تھے۔ دوکانداروں نے کم تولنا اور کم ماپنا بند کر دیا تھا اور ملک میں سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کا نام و نشان تک مٹ گیا تھا لیکن ایک مدت بعد مسلمان حکومت میں سیاسی عدمِ استحکام کی بنیاد پڑ گئی۔ سلطان فیروز شاہ نے ۱۳۸۸ء میں وفات پائی اور اس کے نالائق جانشین کاروبار

حکومت نہ چلا سکے۔ اس سال کے عرصے میں آٹھ بادشاہ تخت نشین ہوئے اور بالآخر ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے تغلق خاندان کا خاتمہ ہی کر دیا۔ امیر تیمور کے حملے سے مرکزی مسلم معاشرے کو یہ نقصان پہنچا کہ دہلی میں جید علماء اور صوفیاً مثلاً شہاب الدین دولت آبادی، حضرت بندہ نواز گیسو دراز سید محمد الحسینیؒ اور شیخ احمد کھٹوؒ ترک سکونت کر گئے۔ یوں دہلی کا علمی اور روحانی مرکز علماء اور صوفیا سے خالی ہو گیا۔

امیر تیمور کے حملے سے مرکزی حکومت کے وقار کو بڑا دھچکا لگا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری نے مرکز گریز رجحانات کو فروغ دیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ صوبائی گورنروں سے خود مختار ریاستیں قائم کر لیں جن میں جونپور، گجرات اور دکن کی ریاستیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان ریاستوں کے حکمران خود بڑے علم دوست اور اہل فضل و کمال کے سرپرست تھے۔ انھوں نے جہاں علم و ادب کی سرپرستی کی، وہاں علاقائی روایات اور فن تعمیر کو بھی فروغ دیا۔ جونپور کی اٹالہ مسجد، احمد آباد کی جامع مسجد اور سرکھیج میں شیخ احمد کھٹوؒ کا مقبرہ اس زمانے کی بہترین یادگاریں ہیں۔ جونپور کے شرقی سلاطین کو موسیقی کا خاص شغف تھا۔ سلطان ابراہیم شرقی نے شرقی سنگیت کے عنوان سے فن موسیقی پر ایک بلند پایہ کتاب تصنیف کی اور اس کے پوتے سلطان حسین نے کئی راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ اس دور کی اہم پریشان کن باتیں یہ تھیں :۔

(الف) بھگتی تحریک

سیاسی عدم استحکام کے اس دور میں ملک کے مختلف گوشوں میں ایسے غیر مسلم مبلغین مصروف عمل تھے جنھوں نے اسلام اور ہندومت کے درمیان ایک نیا راستہ بنا لیا تھا۔ اسے بھگتی کا نام دیا گیا۔ بھگتی تحریک معاشرے کے پس ماندہ طبقوں میں بڑی کامیاب رہی اور نیچ ذاتوں کے لوگ بڑی تعداد میں اس تحریک میں شامل ہو گئے اس طرح اس تحریک کے راہنماؤں نے عوام کی ایک بڑی تعداد کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے روک لیا۔ ان کے اس اقدام سے برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد پر کافی زد پڑی۔ کبیر پنتھ اور سکھ مت اسی بھگتی تحریک کی پیداوار ہیں۔

(ب) ہندوؤں کی جارحانہ تحریکیں

لودھیوں کے عہد میں ہندوؤں میں پیدا ہونے والی جارحانہ تحریکوں سے بھی مسلم معاشرے کو سخت نقصان پہنچا۔ ہندوؤں نے دارالحکومت سے دور دراز علاقوں میں مسلمانوں کو شہید کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ بہار کے علاقے میں انھوں نے عثمانی النسل مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے

اسلام ترک کرنے سے انکار کیا انھیں موت کی نیند سلا دیا۔ اس تحریک کے دوران بھارت کے موجودہ اتر پردیش کے بعض اضلاع میں ہندوؤں کا عمل دخل اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ مسلمانوں کا اپنی بستیوں میں رہنا دشوار ہوگیا۔

(ج) **اندرونی کمزوریاں** سلطان سکندر لودھی کے عہد میں مُسلم معاشرے میں اندرونی انحطاط ہوگیا۔ علمار کرام اور متشرع صوفیار نے وحدت الوجود کے نظریے کو پھیلنے سے روکنے کے لیے جو بند باندھے تھے، وہ ٹوٹنے لگے، شیخ محی الدین اکبر ابن عربی کی فصوص الحکم کی متعدد شرحیں لکھی گئیں اور یوں وحدت الوجود کا نظریہ خواص کے حلقوں سے نکل کر عوام تک پہنچ گیا۔ وحدت الوجود کا نظریہ پھیلنے سے عوام میں بے عملی اور بے راہروی بڑھ گئی۔ اس بے عملی نے توہم پرستی کو جنم دیا۔

مغل دورِ عُروج کی اہم مذہبی تحریکیں

مغلوں کا دورِ عروج بابر کی فتح برصغیر سے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کا پہلا بادشاہ خود بابر ہے۔ جس میں یہ تاریخی شہادت ملتی ہے کہ ۱۵۲۷ء میں ہندوؤں سے جنگ کے وقت عین میدان جنگ میں اس نے شراب نوشی سے توبہ کی اور باقی زندگی ایک بہت اچھے مسلمان کی حیثیت سے گزاری جبکہ اورنگ زیب عالمگیر اس دورِ عروج کی آخری شخصیت ہے اس دور میں ہمایوں وقتی طور پر شیعی اثر کا شکار رہا۔ اکبر الحاد کی طرف مائل ہوا لیکن جہانگیر اور شاہجہان راسخ العقیدہ مسلمان تھے ان بادشاہوں کے دور کی مندرجہ ذیل اہم مذہبی تحریکیں قابل ذکر ہیں:۔

(الف) **مہدوی تحریک** مہدوی تحریک کا آغاز جون پور سے ہوا۔ اس کے بانی سید محمد جون پوری ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰۴ء میں فوت ہوگئے۔ ان کی تحریک ان کی زندگی ہی میں نہ صرف برصغیر بلکہ اس کی سرحدوں سے باہر خراسان اور افغانستان میں بھی پھیل چکی تھی۔

سید محمد نامور عالم اور علوم دین کے فاضل تھے۔ ان کے مخالفین بھی ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کا اعتراف کرتے تھے۔ ان کے زمانے کے علمار نے ان کی نوجوانی ہی میں انھیں "اسد العلما" (علما کا شیر) کا خطاب دے رکھا تھا لیکن جب انھوں نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تو سختی سے ان کی مخالفت کی گئی۔ سید محمد کا اپنا زمانہ تو دورِ مغلیہ سے پہلے کا تھا لیکن ان کی تحریک دیر تک جاری رہی اور

سولہویں صدی تک اس کے اثرات پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔ سید محمد کی ذاتی نیک نفسی اور مہدوی تحریک میں شامل ہونے والے افراد کی زندگیوں کے زاہدانہ رنگ کی وجہ سے اس تحریک کی حیثیت ایک اسلامی اصلاحی تحریک کی تھی۔ چنانچہ ابتدائی دور میں اس تحریک کے زیر اثر ملک میں شریعت کی پابندی اور زہد و توکل کی فضاء پیدا ہوگئی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس تحریک کے پیروکاروں میں شریعت کی پابندی کمزور پڑتی گئی اور دلائل سے اپنے دعوؤں کی صداقت ثابت کرنے کے چنگل میں پھنس گئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مہدوی تحریک کے اثرات ملک گیر تھے۔ سندھ کا علاقہ اس تحریک سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ خود مہدی تحریک کے بانی سید محمد جون پوری نے سندھ کے دارالحکومت ٹھٹھہ میں ایک سال قیام کیا تھا اور حاکم ٹھٹھہ کی مخالفت کے باوجود بہت سے با اثر افراد ان کے معتقد ہو گئے تھے جن میں قاضی سندھ بھی شامل تھے۔ کراچی میں آج تک مہدوی تحریک کے ماننے والے افراد موجود ہیں اور ان کی اپنی ایک تنظیم قائم ہے۔

(ب) شیعی تحریک

برصغیر جنوبی ایشیاء اور ایران کے تعلقات خاصے پرانے ہیں۔ برصغیر کے مسلم دورِ حکومت میں غزنویوں کے دربار میں ایرانی علماء اور شعراء بڑی تعداد میں موجود ہوتے تھے۔ سرکاری زبان بھی فارسی تھی لیکن مغل دور میں ایرانی اثرات زیادہ بڑھ گئے۔ مغل حکومت کے استحکام میں ایرانی ماہرین کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان اثرات کا آغاز ہمایوں سے ہوا تھا۔ ہمایوں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی نے ایران میں اس سے اچھا سلوک کیا اور شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد ۱۵۵۵ء میں جب ہمایوں نے واپس آکر ہندوستان کی حکومت دوبارہ حاصل کی تو حکومت حاصل کرنے میں ایرانی سپاہیوں کو واضح دخل تھا۔ جبکہ ہمایوں ایرانی علماء و امراء کو بھی بڑی تعداد میں اپنے ساتھ ہندوستان لایا تھا۔ یہ لوگ شیعہ تھے۔ اس کے بعد مغل دور میں شیعہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوگئے۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیر کے امراء میں بھی اکثریت شیعوں کی تھی۔

شیعوں کا معتدل مزاج فرقہ تفضیلیہ ہے۔ تفضیل کے لفظی معنی فضیلت دینے کے ہیں۔ تفضیل شیعوں کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰ باقی خلفائے راشدین یعنی ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں۔ ان کے نزدیک پچھلے تینوں خلفائے راشدین کی خلافت درست تھی ان کا عقیدہ ہے کہ افضل کی موجودگی میں کم فضیلت والے شخص کی امامت بھی جائز ہے۔ پاکستان میں

شیعہ اثرات کا سب سے نمایاں پہلو تفضیلت کے رجحان کا فروغ ہے اکثر سُنیوں میں بھی یہ رُجحان عام ہے۔

دورِ مُغلیہ میں وقتاً فوقتاً شیعہ چپقلش دیکھنے میں آتی رہی۔ کشمیر پر مُغل قبضے کا محرک ہی شیعہ سُنی فساد بنا تھا۔ صورتِ حال اس قدر سنگین ہو گئی تھی۔ کہ سینوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ ان پر حضرت مجدّد الف ثانی کے مرشد شیخ یعقوب بروئی کشمیری نے لاہور آکر اکبر سے مُلاقات کی اور کشمیری عوام کی طرف سے انھیں کشمیر آنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں اکبر نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر پر حملہ کرکے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سولہویں صدی میں ایک دفعہ پھر کشمیر میں زبردست شیعہ سُنی فساد برپا ہوا۔ والیٔ کشمیر نواب خان نے شیعوں کے خلاف کارروائی سے تامل کیا تو خواجہ خاوند محمود نقشبندی عُرف حضرت خواجہ ایشان اہل سُنت کو لے کر ہفت چُنار چلے گئے۔ اس احتجاج سے متاثر ہو کر والیٔ کشمیر وہاں گئے اور انھیں منا کر واپس کشمیر لے گئے اور شیعوں کے خلاف کارروائی بھی کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دربارِ شاہی کو بھی خواجہ حضرت ایشان کی شکایت لکھ بھیجی۔ اس پر حضرت ایشان کے متعلق فیصلہ کیا گیا وہ کشمیر چھوڑ کر شاہی لشکر کے ساتھ رہیں چُنانچہ اس کے بعد حضرت ایشان شاہی لشکر کے ساتھ ساتھ رہے اور آخر ۵۔ نومبر ۱۶۴۲ء کو وفات پاکر لاہور میں دفن ہوئے۔ ان کے کشمیر سے نکلنے کے بعد بھی شیعہ سُنی چپقلش مسلسل جاری رہی۔

(ج) **شطاری سلسلہ** تصوف کے مختلف سلسلوں میں سے ایک سلسلہ "شطاریہ" بھی ہے۔ یہ سلسلہ مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہے۔ شمالی ہند میں شیخ عبداللہ شطاری نے اسے جاری کیا اور ان کے خلفائے اسے خوب پھیلایا۔ اس سلسلے میں توحید پر بڑا زور دیا تھا لیکن اسلامی شریعت کی پابندی کا اہتمام کم اور موسیقی کے اشتغال سے رغبت کا رجحان عام تھا۔ ان کی عام زندگی میں ظاہری شان و شوکت کا اعزاز نمایاں تھا۔ جو عام لوگوں کے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔ شریعت امریہ کی پابندی میں نرمی کا انداز بھی عام لوگوں کے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔ چُنانچہ اس سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مُغل بادشاہوں پر بھی اس سلسلے کا گہرا اثر تھا۔ ہمایوں شیخ ابوالفتح سرمست شطاری اور شیخ محمد غوث گوالیاری کا بڑا معتقد تھا۔ شیخ ابوالفتح سرمست کو ہمایوں کے بھائی ہنوال مرزا نے ۱۵۳۸ء میں اس لیے مروا ڈالا تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں ہمایوں کے مشیر تھے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری نے ۱۵۶۲ء میں وفات پائی۔ شطاری سلسلے کی توسیع میں ان کا نام نمایاں ہے اور ان کے طریقوں میں ہندو یوگیوں اور

بیراگیوں کے اشتغال کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ گویا یہ سلسلہ روحانیت کے نام پر شرعی و اخلاقی ضابطوں کی خلاف ورزی کا قائل تھا۔ خطۂ پاکستان میں اس سلسلے کے براہ راست اثرات کی تو کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ بابر اور ہمایوں جیسے بادشاہ بھی شطاریوں کے معتقد تھے۔ تو اس سلسلے کے بالواسطہ اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(د) فرقہ روشنیہ اسی فرقے کے بانی میاں بایزید انصاری عرف پیر روشن ۱۵۲۵ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نامور عالم دین تھے۔ اور وزیرستان کے علاقے میں قاضی تھے۔ سات سال کی عمر میں بایزید اپنی والدہ کے ہمراہ اپنے والد کے پاس وزیرستان پہنچے لیکن وہاں کے ماحول اور اپنے والد اور سوتیلی ماں کے ناروا سلوک کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کر سکے۔ بلکہ ردعمل یہاں تک پہنچا کہ وہ ظاہری عبادت سے بیزار ہوگئے۔ انھوں نے ذاتی فکر و مراقبہ کی بنیاد پر جو تصورات لوگوں کے سامنے پیش کیے وہ اسلام کے مسلمہ عقائد سے جداگانہ تھے چنانچہ وزیرستان کے علماء اور امراء نے ان کی مخالفت کی اور مناظرے کیے۔ حکام کی سطح پر بھی ان سے وضاحت طلب کی گئی۔ انھوں نے وضاحت کی کہ وہ وحی کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ الہام ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے دعویٰ مہدویت کی بھی تردید کی اور وضاحت کی کہ وہ مہدی نہیں، ہادی ہیں۔

روشنیہ فرقے کے عقائد اور شریعت محمدی سے ان کی آزاد منشی کے علاوہ ان کا جارحانہ انداز بھی حکومت اور عوام کے لیے اعتراض کا سبب بنا۔ انھوں نے راہزنی اور لوٹ مار کا انداز اختیار کر لیا۔ یہ انداز ان کی آزادہ روی کا فطری نتیجہ تھا۔ کیونکہ جو شریعت کی پابندی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسے قانون کی پابندی کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔ بہرحال ان کا یہ طرز عمل حکومت وقت کے ساتھ تصادم کا باعث بن گیا۔ چنانچہ پیر روشن کے مریدوں اور مغل افواج میں جھڑپوں کا سلسلہ چل نکلا یہ کشمکش جاری تھی کہ ۱۵۷۲ء میں روشنیہ فرقہ کے بانی بایزید انصاری کا انتقال ہوگیا۔ لیکن ان کے جانشینوں اور مغلوں کی کشمکش جاری رہی حتیٰ کہ شاہجہان کے زمانے میں اس فرقے کے خلیفہ اور ان کے خاص رفقاء دربار شاہی سے وابستہ ہوگئے۔

روشنیہ فرقے میں اسلامی شریعت سے آزادی کا رجحان عام تھا۔ ہندو بھی اس فرقے سے منسلک ہوتے رہے اور ان کے بعض عقائد و رسوم بھی اس فرقے کا حصہ بن گئے تھے۔ اس فرقے کے لوگوں میں ننگے پھرنے کا رجحان بھی پیدا ہوگیا تھا۔ مردوں عورتوں کا کھلم کھلا میل ملاپ اور

ناچ گانا بھی ان کے اشغال کا حصہ بن گئے تھے۔ اسلام کے بنیادی ارکان تک میں تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔ اس لیے روشنیہ فرقے پر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ انھوں نے ایک نئی شریعت جاری کر دی ہے۔

روشنیہ فرقہ پاکستان ہی کے علاقے سے ابھرا اور یہیں سے اس کی خوب اشاعت ہوئی۔ اس کے بانی کو ادب اور موسیقی پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ اور اب تک پختون ادب و موسیقی پر اس کے گہرے اثرات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ لوگوں کے مذہبی جذبات کو متاثر کرنے کے لیے ان دونوں ذرائع کو بڑے مؤثر انداز میں استعمال کیا جا سکتا ہے اس کے باوجود اس علاقے میں روشنیہ فرقہ اب ناپید ہو چکا ہے۔

(س) **قادری سلسلہ** تصوف کا سلسلہ قادریہ شیخ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب ہے۔ برصغیر میں مخدوم عبدالقادر ثانی سے اس سلسلے کا آغاز ہوا۔ وہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے اور اُچ ضلع بہاولپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ موسیقی کے اس قدر شوقین تھے کہ سفر میں بھی آمدت موسیقی اپنے ہمراہ رکھتے لیکن جب موسیقی سے تائب ہوئے تو زاہد کامل ہو گئے۔ ۱۵۳۳ء میں فوت ہوئے۔

شیخ عبدالقادر ثانی کے بعد اُن کے پوتے سید حامد گنج بخش اور اُن کے بیٹے شیخ موسیٰ پاک شہید اور خلیفہ شیخ داؤد کرمانی موجودہ ضلع اوکاڑہ (پنجاب) کے ایک چھوٹے سے قصبے شیر گڑھ میں رہتے تھے لیکن ان کی شہرت پورے ملک میں تھی۔ پابند شرع تھے۔ حدیث نبویؐ کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتے۔ اکبر دور کے مورخ عبدالقادر بدایونی کی چشم دید شہادت کے مطابق "روزانہ سو پچاس ہندو مع اہل و عیال اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتے تھے"۔ وہ ۱۵۷۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے جانشین شیخ ابوالمعالی قادری جو ۱۶۱۵ء میں فوت ہو کر لاہور میں دفن ہوئے ان کے دور میں قادری سلسلے کے اثرات لاہور اور وسطی پنجاب میں عام ہوئے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کے حلقہ مریداں میں شامل تھے اور ان کے جمال و جلال دونوں کا احترام کرتے تھے۔

شاہجہان کے عہد میں حضرت شاہ بلاول سلسلہ قادریہ کی اہم شخصیات میں سے تھے۔ لاہور میں رہتے تھے انھوں نے ایک مسجد، خانقاہ، باغیچہ، عمدہ سیرگاہ اور ایک مدرسہ تعمیر کر کے درس و تدریس کا مشغلہ بنایا اور ساری عمر تبلیغ دین و ہدایت خلق میں معروف رہے۔ ان کی چند کرامات کا بھی ذکر ملتا ہے جن میں سب سے بڑی کرامت کتاب و سُنت کی پیروی تھی۔ انھوں نے ۱۶۳۶ء میں

وفات پائی۔

شاہجہان کے عہد میں لاہور میں قادری سلسلے کے ایک اور بزرگ حضرت میاں میر نے بڑی شہرت پائی۔ ان کا سن وفات بھی ۱۶۳۵ء ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاہ بلاول قادری کے ہمعصر تھے۔ شاہجہان نے ایک دفعہ دونوں کی خدمت میں حاضر ہو کر نذرانہ پیش کیا تھا۔ شاہ بلاول نے اسے قبول کریں لیکن میاں میر نے قبول نہیں کیا تھا۔ شاہجہان نے میاں میر کو شاہ بلاول قادری کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے تو نذرانہ قبول کر لیا لیکن آپ نے نذرانہ قبول نہیں کیا تو میاں میر نے شاہ بلاول کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ "اُن کی مثال دریا کی سی ہے اور میری مثال تالاب کی سی۔ دریا میں کوئی پلید چیز گر جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا لیکن تالاب میں کوئی پلید چیز گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ میاں میر ریاضت و عبادت اور ہدایت و تلقین میں بڑے مشہور تھے۔ تاہم ان پر وجودی فلسفے کا رنگ غالب تھا اور ان کے مسلک میں شریعت کی پابندی کا خاص اہتمام نہیں تھا۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصر قادری بزرگ شاہ بلاول قادری سے بہت مختلف تھے۔ داراشکوہ میاں میر کا بڑا معتقد تھا۔

میاں میر کے خلیفہ ملا شاہ قادری ان سے بھی چند قدم آگے تھے۔ گرمیوں میں کشمیر اور سردیوں میں لاہور ان کا مرکز ہوتا تھا ان کے متعلق ایک طرف تو روایت یہ ہے کہ کشمیر کے شیعہ سُنی اختلافات میں ان کے مناظرہ و تلقین کی وجہ سے ہزاروں مخالفین دائرہ اہل سُنت میں داخل ہو گئے۔

داراشکوہ لاہوری قادریوں کے وجودی اسلوب کا ایک نمائندہ نمونہ تھا۔ وہ میاں میر کا خاص معتقد تھا۔ لیکن جب اس نے باقاعدہ بیعت کا ارادہ کیا تو میاں میر وفات پا چکے تھے لہٰذا ۱۶۳۹ء میں وہ ملا شاہ قادری کا باقاعدہ مرید ہوا۔ داراشکوہ نے "صُلح کل" مشرب کے نام پر ہندومت اور اسلام دونوں کو تلاش حق کے دو طریقے قرار دیا تھا اور دونوں میں مطابقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(ص) **اکبری الحاد**

اکبر کے دور آغاز میں حکومت ابھی مستحکم نہ تھی۔ اکبر ہندو راجاؤں کے اثر و رسوخ سے بڑا خائف تھا۔ چنانچہ ایک سیاسی اور انتظامی تدبیر کے طور پر اس نے "صُلح کل" کا طریق کار اپنانے کا جو فیصلہ کیا وہ بڑا مناسب تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ مذہبی مسلک ایجاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس میں بُری طرح ناکام ہوا۔ اس سلسلے میں اکبر نے اپنی اہلیت کا غلط اندازہ لگایا تھا کہ عام انسان

ہوتے ہوئے اس نے مذہبی پیشوائی کا جنون پالیا۔ لوگوں کے مذہبی تعصبات کا اندازہ کرنے میں بھی اس سے غلطی سرزد ہوئی۔ چنانچہ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دو چار افراد کے سوا اس کے خاص مقربین میں بھی کسی ہندو یا مسلمان نے اس کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ مذہب کے خلاف بادشاہ کے رویے نے عام لوگوں کو بھی متاثر کیا اور ان میں مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مزید یہ ہوا کہ مذہب سے منحرف لوگوں اور سیاسی مفاد پرستوں کو اپنے مخالفین کے خلاف ایک ہتھیار مل گیا۔ وہ اکبری الحاد کی آڑ میں اپنے تعصبات اور مفادات کی تسکین کرتے رہتے تھے۔

اکبری الحاد محض اکبر کے ذہن کی کسی سوچ کا نتیجہ نہ تھا اس میں اس دور کے کمزور مذہبی حالات کا بھی دخل ہے۔ روحانی انتشار کی فضا عام تھی۔ مزید برآں شیعہ اثرات اور اہل سنت کے مفاد پرست علماء کی باہمی کش مکش نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ ان میں بعض ظاہر پرستوں کی زندگیوں کے اصل اسلوب کے متعلق انکشافات ہوئے، تو شریعت اسلامیہ کی پابندی محض ایک ڈھونگ نظر آنے لگی۔ یہ لوگ شریعت کے نام پر اپنے مخالفین کو سزائیں دلوانے میں تو بڑے تیز تھے۔ لیکن خود مختلف حیلوں بہانوں سے حج اور زکوٰۃ جیسے بنیادی ارکان اسلام سے بھی روگردانی کر جاتے تھے۔ اکبر کو یہ بھی شدید احساس تھا کہ یہ علماء شاہی اقتدار کے ذریعے اپنے فتوے نافذ کرا کے گویا شریعت اسلامیہ کے نام پر اس کی بادشاہت میں شریک ہو رہے ہیں۔ یوں ان کے اثر و رسوخ کو اپنی شاہانہ مطلق العنانی کی راہ میں ایک رکاوٹ سمجھتا تھا۔ تصوف کے بعض طریقوں میں ایسی گنجائش موجود تھی کہ آدمی ہر قسم کے شرک و بدعت کے باوجود اپنے ایمان کو "محفوظ" سمجھتا تھا۔ پھر جب شیخ تاج الدین اجودھنی جیسے عالم و صوفی نے اپنے ماہرانہ استدلال سے بادشاہ وقت کو انسان کامل اور سجدے کا مستحق قرار دیا تو اکبر جیسے غیر تربیت یافتہ آمر کو مسجود بننے سے کیا چیز روک سکتی تھی۔

اکبر کی الحادی روش کو ہم نے "مسلک" کا نام دیا ہے۔ بعض لوگ اسے دین الٰہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ نام کچھ بھی رکھا جائے۔ بہر حال اس قدر واضح ہے کہ اکبر کی مذہبی روش اسلامی شریعت کے منافی تھی۔ یہ مقولہ کہ "الناس علی دین" یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین (طور طریقے) اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ جہاں تک اکبر کے مخصوص "دین الٰہی" کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو شہادت یہی ہے کہ اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اکبر کی الحادی روش نے عام و خاص کے ذہنوں کو بڑی حد تک پراگندہ کر دیا تھا جس کے ازالے کے لیے بعد میں آنے والے بادشاہوں اور مصلحین کو سخت جدوجہد کرنا پڑی۔

اکبر کی الحادی روش اگرچہ ملک گیر تھی۔ لیکن خطۂ پاکستان براہ راست اس کی زد میں نہ تھا۔ اس کے باوجود پنجاب کے کئی علمائے حق اکبر کے عتاب کا شکار ہوئے۔ تاہم حاکم لاہور قلیج خان کی ذات اکبر کے الحادی طریق کے راستے میں ایک مؤثر رکاوٹ بنی رہی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پرتگیز کے عیسائیوں نے اپنے اثر و رسوخ اور اکبر کے دین سے منحرفانہ روش کی وجہ سے یہ شاہی فرمان جاری کروا لیا کہ اگر کوئی شخص اپنا دین چھوڑ کر عیسائی ہونا چاہیے تو اسے ایسا کرنے کی آزادی ہو گی لیکن قلیج خان نے اپنے علاقے میں پادریوں کی دال نہیں گلنے دی تھی۔

اکبر کی وفات کے بعد صحیح عقائد رکھنے والے امراء اور علماء نے مل کر اپنے اثر و رسوخ سے جہانگیر کے بیٹے خسرو خان کے مقابلے میں جہانگیر کی تخت نشینی کی حمایت کی تھی۔ انھوں نے جہانگیر سے باقاعدہ یہ شرط منوائی تھی کہ وہ قوانین اسلام کا احترام کرے گا۔ جہانگیر کی کوتاہیوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر اس نے اپنا عہد نبھایا۔ چنانچہ اس کے دور کے فرامین میں اسلامی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ اس میں حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسی بلند پایہ شخصیات کی کوشش کا واضح دخل تھا۔

اکبر الحاد کے ردعمل میں جو اصلاح کا دور شروع ہوا تو اس میں دو خامیاں تھیں۔ اول یہ کہ شریعت اسلامیہ کی ظاہری پابندی پر زور اس قدر بڑھا کہ "خدا سے تعلق" کے نام پر خلق خدا سے توجہی برتی جانے لگی۔ صوفیائے ریاضت پر زور دیا اور علمائے نے عبادت پر۔ خدمت خلق، علم کو عام کرنے اور رفاہ عامہ کی طرف توجہ کا رجحان کہیں نظر نہیں آتا دوسرے یہ کہ اکبری الحاد کی تہہ میں چونکہ فکری آزاد خیالی اور عقلی کجروی کا بڑا دخل تھا اس لیے اب اس کے ردعمل میں فکری آزادی اور عقلی دلیلوں سے قطعاً بیزاری کا رجحان نمودار ہوا اور علمی جمود کا دور دورہ ہو گیا۔ علم کے میدان میں راسخ العقیدہ علماء معقولات کے بالکل مخالف ہو گئے۔

(ض) مجددی سلسلہ

اکبر دور کے بعد سلسلہ مجددیہ نے مذہبی اصلاح و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سلسلہ مجددیہ سلسلہ نقشبندیہ کی ایک شاخ ہے جو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے منسوب ہے۔ دراصل اس سلسلے کو شیخ احمد کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں جاری کیا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ ۱۵۹۷ء میں لاہور وارد ہوئے اور تقریباً ایک سال تک یہیں قیام پذیر رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک اکبر نے لاہور کو دارالحکومت بنایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں لاہور میں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ اس قحط کے دوران میں حضرت خواجہ

اور حدیث کے امام اور علمائے حق کے سرداِ چکا تھا۔ اس دور میں شیخ جلال الدین
پنجاب اور سرحد میں مجددی سلسلے کا لیف ان کے خاص مشغلے تھے۔ انھوں نے
مجدد ہی کی زندگی میں، یہاں ایک زبردس ۳۰ ابواب پر مشتمل ہے اور تصوف کے
اور خلیفہ شیخ آدم بنوری کے ایک سو خلفا شیخ عبدالعزیز چشتی اور شیخ سلیم چشتی نے
ان کے ہمراہ ہوتے تھے جب وہ ۱۶۴۲ء میں
والوں نے شاہجہان کو بدگمان کیا کہ شیخ آدم مار مرشد کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں پر ہوتا
خائف ہو کر شیخ کو حج پر روانہ کر دیا۔ حج تمام نہیں۔ لیکن زندگی کو تبدیل کرنا بہت
۱۶۶۳ء کو ۷۴ سال کی عمر میں وفات پا کر یت درکار ہوتا ہے۔ چشتیوں نے ان امور
شیخ سعدی کوہاٹ کے حاجی عبداللہ کو ہائی اعداد انسانوں نے شریعت محمدیؐ کو اپنایا
سے مشہور ہوئے۔ ان کے ایک خلیفہ سید عبدل کر دیں۔
دونوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ بتے تھے۔ ارکان اسلام کی پابندی پر خاص زور
کشمیر نقشبندی سلسلے کے ایک اور بزرگ بغیر کوئی روحانی ترقی ممکن نہیں۔
زیادہ بارآور ہوں۔ خواجہ موصوف ۵، نومبر ۱۶۴۲ء تو مجددی تحریک بھی احیائے شریعت کی
ان کے ایک خلیفہ خواجہ کمال الدین نقشبندی ایک تھی لیکن اس کا انداز صوفیانہ تھا اور
کے ۳۰، دسمبر ۱۶۶۷ء کو انھیں ان کی خانقاہ میں روری ہے اور شیخ سلسلہ کی شخصیت کرامات

(ط) چشتی سلسلہ

مجددی سلسلے کی جوش و جذبہ کے زیر اثر شریعت کی
چشتی سلسلے ہی سے بڑھ کر اس کی شخصیت کے
ابو اسحاق شامی (متوفی ۳۲۹ / ۹۴۰) نے وگ عام ہے جہاں آکر طریقت کا یہ انداز شریعت
تھا۔ اسی لیے اس سلسلے کو چشتیہ کے نام سے، کا جذبہ رکھنے والی عوام نے مجددی سلسلے
معین الدین چشتی نے روشناس کرایا۔ پاکستان اس سلسلے میں بھی مذکورہ بالا خدشات کی
متعارف کرایا تھا۔ انھوں نے اجودھن موجودہ پاک میں آیا اور اس نے اسرار و رموز اور کشف و
نے تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کا کام اس خو ترویج پر زور دیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
پنجاب تک ہی محدود نہ رہے بلکہ شمالی علاقوں عمر عطا فرمائی تھی۔ ۲۹-۲۸، جون ۱۶۴۲ء
آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض پاتے۔ ان۔ انھوں نے اکبر اور جہانگیر کا پورا دور
حاصل ہوا۔

اکبر کی الحادی روش اگرچہ ملک گیر تھی۔ لیکن خطۂ پاکستان براہ راست اس کی زد میں نہ تھا۔ اس کے باوجود پنجاب کے کئی علمائے حق اکبر کے عتاب کا شکار ہوئے۔ تاہم حاکم لاہور قلیج خان کی ذات اکبر کے الحادی طریق کے راستے میں ایک مؤثر رکاوٹ بنی رہی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پرتگیز کے عیسائیوں نے اپنے اثر و رسوخ اور اکبر کے دین سے منحرفانہ روش کی وجہ سے یہ شاہی فرمان جاری کروالیا کہ اگر کوئی شخص اپنا دین چھوڑ کر عیسائی ہونا چاہیے تو اسے ایسا کرنے کی آزادی ہو گی لیکن قلیج خان نے اپنے علاقے میں پادریوں کی دال نہیں گلنے دی تھی۔

اکبر کی وفات کے بعد صحیح عقائد رکھنے والے امراء اور علماء نے مل کر اپنے اثر و رسوخ سے جہانگیر کے بیٹے خسرو خان کے مقابلے میں جہانگیر کی تخت نشینی کی حمایت کی تھی۔ انھوں نے جہانگیر سے باقاعدہ یہ شرط منوائی تھی کہ وہ قوانین اسلام کا احترام کرے گا۔ جہانگیر کی کوتاہیوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر اس نے اپنا عہد نبھایا۔ چنانچہ اس کے دور کے فرامین میں اسلامی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ اس میں حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسی بلند پایہ شخصیات کی کوشش کا واضح دخل تھا۔

اکبر الحاد کے رد عمل میں جو اصلاح کا دور شروع ہوا تو اس میں دو خامیاں تھیں۔ اول یہ کہ شریعت اسلامیہ کی ظاہری پابندی پر زور اس قدر بڑھا کہ "خدا سے تعلق" کے نام پر خلق خدا سے توجہی برتی جانے لگی۔ صوفیائے ریاضت پر زور دیا اور علمائے نے عبادت پر۔ خدمت خلق، علم کو عام کرنے اور رفاہ عامہ کی طرف توجہ کا رجحان کہیں نظر نہیں آتا دوسرے یہ کہ اکبری الحاد کی تہہ میں چونکہ فکری آزاد خیالی اور عقلی کجروی کا بڑا دخل تھا اس لیے اب اس کے رد عمل میں فکری آزادی اور عقلی دلیلوں سے قطعاً بیزاری کا رجحان نمودار ہوا اور علمی جمود کا دور دورہ ہو گیا۔ علم کے میدان میں راسخ العقیدہ علماء معقولات کے بالکل مخالف ہو گئے۔

(ض) **مجددی سلسلہ** اکبر دور کے بعد سلسلہ مجددیہ نے مذہبی اصلاح و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سلسلہ مجددیہ سلسلہ نقشبندیہ کی ایک شاخ ہے جو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے منسوب ہے۔ دراصل اس سلسلے کو شیخ احمد کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں جاری کیا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ ۱۵۹۷ء میں لاہور وارد ہوئے اور تقریباً ایک سال تک یہیں قیام پذیر رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک اکبر نے لاہور کو دارالحکومت بنایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں لاہور میں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ اس قحط کے دوران میں حضرت خواجہ

موصوف کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنا کھانا تک غریبوں میں تقسیم کرا دیتے تھے اس دوران میں حاکم لاہور قلیچ خان سے ان کا بڑا دوستانہ رہا۔ قلیچ خان اس قدر دینی حقیقت رکھنے والا تھا کہ اس نے شاہی فرامین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عیسائی پادریوں کو مراعات سے محروم رکھا۔ وہ خود مدرسے میں جا کر روزانہ تین گھنٹے تک تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیا کرتا تھا اس کے اس اہتمام کی وجہ سے لاہور میں علوم اسلامیہ کو قبولِ عام حاصل ہوا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی کو لاہور سے خاص تعلق رہا۔ اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کے اشارے پر آپ نے لاہور کو مرکز بنایا اور اپنے مرشد کے وصال (۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء) تک یہیں مقیم رہے۔

حضرت مجدد کا زمانہ جہانگیر کا زمانہ تھا۔ اس دور میں شاہی دربار تو الحاد کے تسلط سے باہر نکل آیا تھا۔ لیکن مجموعی فضا میں اسلام کے خلاف رجحانات عام تھے۔ جن میں ایک خطرناک رجحان یہ تھا کہ ہندو کو جارحانہ انداز میں از سرِ نو رائج کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

حضرت مجدد نے "صلحِ کل" مشرب سے ہٹ کر اسلامی حمیت کو بنیاد بنایا انھوں نے حق اور باطل کے مابین سمجھوتے کی شدت سے مخالفت کی۔ اس سلسلے میں اسلام کا واضح تصور" لکم دینکم ولی دین" (آپ کے لیے آپ کا دین اور میرے لیے میرا دین) کا ہے۔

چنانچہ حضرت مجدد نے رام اور رحیم کے ایک ہونے کے تصور کی سختی سے مخالفت کی اور واضح کیا کہ یہ دونوں ایک نہیں ہوسکتے کیونکہ رام مخلوق اور رحیم خالق ہے۔

حضرت مجدد کے سلسلہ تصوف میں سُنت رسولؐ کی پابندی اور اصحاب رسولؐ کی متعین کردہ حدود کے اتباع پر بہت زور رہے۔ وہ تمام غیر شرعی رسوم سے منع کرتے تھے۔ ہندوستان رسوم و رواج کے زیر اثر دین میں جو بدعات رائج ہوگئیں تھیں حضرت مجدد الف ثانی نے ان سے سختی کے ساتھ روکا اور اسلامی شریعت کی پابندی کو لازمی قرار دیا۔ چنانچہ شریعت و طریقت کے باہم ملاپ سے ایسا معاشرہ قائم ہوا۔ جو دین کا پابند اور اسلامی تعلیمات کا دلدادہ تھا۔ جس میں تصوف کا اپنا مقام تھا لیکن شریعت کی پابندی لازم تھی۔

حضرت مجدد نے احیائے اسلام کی جو تحریک چلائی۔ وہ جلد ہی پورے ملک میں پھیل گئی۔ آپ کے سینکڑوں خلفاء ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے۔ سندھ میں آپ کے پوتے شیخ سیف الدین کے ایک خلیفہ مخدوم ابوالقاسم کی کوشش سے اس سلسلے کی اتنی اشاعت ہوئی کہ کوئی اور سلسلہ اس کے برابر نہ رہا۔ مخدوم ابوالقاسم ۱۷۳۶ء میں فوت ہوئے۔ ان کے خاص مرید مخدوم محمد معین سندھی تفسیر

اور حدیث کے امام اور علمائے حق کے سردار مانے جاتے تھے۔

پنجاب اور سرحد میں مجددی سلسلے کو سندھ سے بھی کہیں زیادہ قبول عام حاصل ہوا تھا۔ حضرت مجدد ہی کی زندگی میں یہاں ایک زبردست مرکز قائم ہو گیا تھا۔ بعد میں آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم اور خلیفہ شیخ آدم بنوری کے ایک سو خلفا اور ایک لاکھ مرید تھے۔ وہ سفر پر جاتے تو ہزاروں پٹھان ان کے ہمراہ ہوتے تھے جب وہ ۱۶۴۳ء میں لاہور آئے تو ایک کثیر جماعت ان کے ہمراہ تھی۔ کان بھرنے والوں نے شاہجہان کو بدگمان کیا کہ شیخ آدم چاہے تو آپ کی سلطنت کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ اس نے خائف ہو کر شیخ کو حج پر روانہ کر دیا۔ حج کے بعد انھوں نے مدینہ منورہ ہی میں قیام کیا اور ۲۵، دسمبر ۱۶۶۳ء کو ۷۰ سال کی عمر میں وفات پا کر مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔ ان کے خلفاء میں لاہور کے شیخ سعدی کوہاٹ کے حاجی عبداللہ کوہائی اور پشاور میں شیخ نور محمد پشاوری ولد اخوند درویزہ خاص طور سے مشہور ہوئے۔ ان کے ایک خلیفہ سید عبداللہ اکبر آبادی بھی تھے جن سے شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا دونوں نے فیض حاصل کیا تھا۔

کشمیر نقشبندی سلسلے کے ایک اور بزرگ خاور محمود نقشبندی عرف حضرت خواجہ ایشاں کی کوششیں زیادہ بارآور ہوں۔ خواجہ موصوف ۵، نومبر ۱۶۴۲ء کو لاہور میں فوت ہو کر وہیں دفن ہوئے۔ بعدازاں ان کے ایک خلیفہ خواجہ کمال الدین نقشبندی نے بھی شیعیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اس مخالفت کے ۲۰، دسمبر ۱۷۶۶ء کو انھیں ان کی خانقاہ میں قتل کر دیا گیا۔

(ط) چشتی سلسلہ

مجددی سلسلے کی طرح ہندوستان میں دین کی ترویج و اشاعت کے لیے چشتی سلسلے نے اہم خدمات سرانجام دیں۔ اس سلسلے کا آغاز خواجہ ابو اسحاق شامی (متوفی ۳۲۹/ ۹۴۰) نے دیگر اہل علم کے ساتھ مل کر خراسان کے مقام چشت پر کیا تھا، اسی لیے اس سلسلے کو چشتیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ہندوستان میں اس سلسلے کو خواجہ معین الدین چشتی نے روشناس کرایا۔ پاکستان کے علاقوں میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے سلسلہ چشتیہ کو متعارف کرایا تھا۔ انھوں نے اجودھن موجودہ پاکپتن ضلع ساہیوال میں قیام کیا اور وہیں سے آپ نے تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کا کام اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کہ اس سلسلے کے اثرات پنجاب تک ہی محدود نہ رہے بلکہ شمالی علاقوں کے کونے کونے تک پھیل گئے۔ دور دور سے مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض پاتے۔ جبکہ ملتان اور اوچ میں اس سلسلے کو خاص فروغ حاصل ہوا۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں سلسلہ چشتیہ عام ہو چکا تھا۔ اس دور میں شیخ جلال الدین تھانوی کی خاص خدمات ہیں۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ان کے خاص مشغلے تھے۔ انھوں نے "ارشاد الطالبین" نامی تصوف کی کتاب بھی تحریر کی۔ جو ۳۷ ابواب پر مشتمل ہے اور تصوف کے مختلف موضوعات سے بحث کرتی ہے اور اس دور میں شیخ عبدالعزیز چشتی اور شیخ سلیم چشتی نے بھی اس سلسلے کی آبیاری کی۔

چشتیوں کے ہاں ہدایت و اصلاح کی کامیابی کا انحصار مرشد کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں پر ہوتا تھا۔ کسی شخص سے نصیحت کے چند جملے کہہ دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن زندگی کو تبدیل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ایسا کرنے کے لیے کردار کی پختگی اور عمل کی قوت درکار ہوتی ہے۔ چشتیوں نے ان امور پر خاص توجہ دی اور ان کی ایسی خوبیوں سے متاثر ہو کر لاتعداد انسانوں نے شریعت محمدیؐ کو اپنایا اور ان کی اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

وہ اپنی اصلاحی جدوجہد کا آغاز دینی تربیت سے کرتے تھے۔ ارکان اسلام کی پابندی پر خاص زور دیتے تھے۔ ان کا خاص عقیدہ تھا کہ ارکان اسلام کی پابندی کے بغیر کوئی روحانی ترقی ممکن نہیں۔

(ظ) شریعت کی بالادستی کی تحریک

یوں تو مجددی تحریک بھی احیائے شریعت کی تحریک تھی لیکن اس کا انداز صوفیانہ تھا اور تصوف کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں کچھ اسرار و رموز کا ہونا ضروری ہے اور شیخ سلسلہ کی شخصیت کرامات کے بغیر جچتی ہی نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر جب مرید اپنے جوش و جذبہ کے زیر اثر شریعت کی حدود سے زیادہ اسرار و رموز اور شیخ سلسلہ کے زہد و تقویٰ سے بڑھ کر اس کی شخصیت کے کراماتی پہلو ہی کو اصل حیثیت دے دیتے ہیں تو یہی وہ عام ہے جہاں آکر طریقت کا یہ انداز شریعت اسلامیہ سے متصادم ہو جاتا ہے۔ برصغیر میں احیائے شریعت کا جذبہ رکھنے والی عوام نے مجددی سلسلے کو بڑی امنگوں کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ انھیں اس سلسلے میں بھی مذکورہ بالا خدشات کی جھلک نظر [illegible] اس لیے علمائے دین کا ایک طبقہ خود حرکت میں آیا اور اس نے اسرار و رموز اور کشف و کرامات کا سہارا لیے [illegible] اسلامی تعلیمات کی اشاعت ان کی عملی ترویج پر زور دیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس طبقے کی ایک نمائندہ شخصیت ہے۔ اللہ نے انھیں بڑی لمبی عمر عطا فرمائی تھی۔ ۲۹-۲۸ رجون ۱۶۴۲ء کی درمیانی شب چورانوے سال [illegible] عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اکبر اور جہانگیر کا پورا دور دیکھا تھا اور شاہجہان کی تاجپوشی کے سولہویں سال ان کا [illegible]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی شریعت کی بالادستی کے علمبردار تھے لیکن اس ملک کی روایت یہ رہی ہے کہ یہاں شریعت کو طریقت کا دست نگر بن کر چلنا پڑتا رہا ہے۔ حالانکہ طریقت دراصل شریعت ہی کی مخلصانہ پابندی کا دوسرا نام ہے۔ علوم اسلامیہ کے احیاء میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا درجہ بہت بلند ہے ان کے اخلاص کی بھی واضح شہادتیں موجود ہیں لیکن ان کی حیثیت عرضی ثابت کرنے کے لیے ان کے تذکرہ نگار خاص اہتمام کے ساتھ ان کی صوفیانہ نسبت کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے علاوہ شیخ موسیٰ پاک شہید ملتانی، شیخ حسام الدین متقی کے مرید شیخ عبدالوہاب متقی اور لاہور کے شاہ ابوالمعالی قادری کے نام بھی خاص طور سے ذکر کیے جاتے ہیں۔ جن سے شیخ عبدالحق نے روحانی فیض حاصل کیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی اور ان کے مرشد شیخ علی متقی کا خاص امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے ابن عربی کے وجودی فلسفے کی خامیوں کی نشان دہی کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بھی یہ بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انھوں نے فلسفہ و تصوف کے میدان میں جو طرح طرح کی بدعتیں رونما ہو رہی تھیں، ان کے علاج کے لیے حدیث رسولؐ کی اشاعت اور اسوۂ رسولؐ کی عظمت کی وضاحت پر زور دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف دونوں کو ذریعہ بنایا۔ علوم اور احکام دونوں کی اصلاح ان کے پیش نظر تھی۔ ان کے رسالے "نورانیہ سلطانیہ" میں جہانگیر کے لیے آئین سلطنت اور قواعد حکمرانی مرتب کیے جاتے ہیں۔

شریعت کی بالادستی کی تحریک میں علمائے پنجاب میں سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا نام بڑا نمایاں ہے۔ دور شاہجہانی میں ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ بڑے اعلیٰ درجے کے محقق تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے انھوں نے دین کی بڑی خدمت کی۔ سترہویں صدی کے آغاز میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے استاد ملا کمال الدین کشمیری بھی اپنے علمی مرتبے کی وجہ سے ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانی اور نواب سعداللہ خاں جیسی شخصیات بھی شریعت کی بالادستی کی مہم میں شامل رہیں۔

شریعت کی بالادستی کی تحریک میں علمائے سندھ میں سے اکبری دور میں مخدوم میراں ٹھٹھوی، مخدوم مشنو ٹھٹھی، شیخ الاسلام میرک محمد سبزواری ٹھٹھوی، میرک محمد ٹھٹھوی اور قاضی محمود علامہ عباسی کے نام قابل ذکر ہیں۔ دور شاہجہان میں قاضی ابراہیم ٹھٹھوی اور ملا ربانی ٹھٹھوی نمایاں نظر آتے ہیں۔ عالمگیری عہد میں سید نظام الدین ٹھٹھوی اور مولانا محمد ابوالخیر علماء میں شامل آتے ہیں۔ عالمگیری عہد میں

سید نظام الدین ٹھٹھوی اور مولانا محمد ابوالخیر ان علماء میں شامل تھے۔ جنھوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں حصہ لیا۔

علمائے سرحد میں حضرت پیر بابا (متوفی ۱۵۸۲ء) اور ان کے مرید اخوند بابا درویزہ پشاوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اخوند بابا ظاہری و باطنی کمالات کے جامع تھے۔ شریعت کی بالادستی کے علمبردار تھے۔ وہ ان کی اولاد اور ان کے مرید روشنیہ فرقے کے گمراہ کن تصورات اور طور طریقوں کو موثر رد کرتے تھے اور انھوں نے واضح کیا کہ جو کوئی سنت کا اہتمام ان کا خاص موقف تھا۔ ان کی حمیت دینی کی ایک کھلی مثال یہ ہے کہ انھوں نے ہر چند احترام کے باوجود اپنے پیرو مرشد شیخ علی ترمذی چشتی کو قوالی سننے پر ٹوکا اور شیخ علی کے حکم کی بھی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے مرید کی بات کو تسلیم کیا اور اپنی عمر میں دوبارہ کبھی قوالی نہیں سنی۔ اخوند بابا نے ۱۶۳۸ء میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا عبدالکریم علمی و باطنی مراتب میں ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ اخوند کریمہ کے نام سے مشہور تھے اور محقق افغانستان کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ نفاذ شریعت کے سلسلے میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔ انھوں نے ۱۶۶۱-۶۲ء میں وفات پائی۔

اخوند بابا اور اخوند کریمہ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں شیخ پنجو پشاوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے بے شمار مرید تھے۔ ۱۶۶۳ء میں فوت ہوئے اور پشاور میں مدفون ہیں۔

شیخ احمد سرہندی کی تحریک اسلامی

اللہ تعالیٰ نے برصغیر کے لیے کچھ ایسا اہتمام فرمایا کہ اس خطۂ ارض میں مشعلِ اسلام ہمیشہ ہی منور رہی۔ محمد بن قاسم کے بعد برصغیر میں اصلاح احوال اور اشاعت اسلام کا سہرا صوفیائے کرام اور علمائے عظام کے سر ہے۔ ایسے ہی کاملین میں بطور خاص قابل ذکر شخصیت حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی کی ہے جو امام ربانی اور مجدد الف ثانی (دوسرے ہزار سال کا مجدد یا دین کو نئی زندگی بخشنے والا) کے القابات سے مشہور ہیں۔

ابوالبرکات حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو سرہند کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد شیخ عبدالاحد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید تھے۔

شیخ احمد سرہندی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے حضرت شاہ کمال کیتھلی

کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ ذہانت اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ لڑکپن ہی سے ضخیم کتب پر حواشی تحریر کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد سرہند سے باہر متعدد اولیاء کرام اور فضلاء و علماء سے کسب فیض کیا۔ مولانا یعقوب کشمیری سے حدیث اور قاضی بہلول بدخشانی سے تفسیر و حدیث کی تکمیل کی اور ۱۷ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر آگرہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں ابوالفضل اور فیضی سے کامیاب مباحثے بھی کیے۔ سولھویں صدی کے اواخر میں حج کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر جب دہلی پہنچے تو علم کی تشنگی انھیں کشاں کشاں حضرت خواجہ باقی باللہ کے دربار میں لے گئی۔ ان کی صحبت میں حضرت مجدد نے دو اڑھائی مہینہ گزارا اور اس قلیل عرصے میں عرفان و سلوک کی تمام منزلیں طے کر کے فنائے حقیقی کے مقام پر فائز ہو گئے۔ راہ و رسم کے ابتدائی ایام میں حضرت خواجہ باقی باللہ نے اپنے ایک محب کو حضرت مجدد کے بارے میں لکھا "حال ہی میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد آیا ہے، نہایت ذی علم ہے، بڑی عملی طاقت رکھتا ہے، چند روز فقیر کے ساتھ نشست و برخاست ہوئی ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر یہ ایک ایسا چراغ ہو گا جو دنیا کو روشن کرے گا۔" حضرت باقی باللہ کی یہ عظیم پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

حضرت مجدد الف ثانی نے ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

حضرت مجدد کے دور میں ملکی حالات

ساتویں صدی ہجری میں جس طرح خراسان و عراق و مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ عقائد کے تسلط نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی زندگی کو مفلوج کر دیا تھا۔ اسی طرح دسویں صدی ہجری کے ہندوستان میں بھی وہ تمام خرابیاں رونما ہو گئیں تھیں۔ شرک و بدعات، رقص، رہبانیت اور عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ عوام غلط رسوم کے اسیر بن گئے تھے اور خواص ہوس و نفس کے غلام ہو چکے تھے۔ علمائے حق خوف و رسوائی سے زاویہ نشین ہو گئے۔ دنیا پرست علما بادشاہ کی جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو سوانگ چاہتے رچاتے تھے اور جس راہ پر چاہتے عوام کو چلاتے تھے۔ ان علماء کی دنیاداری، نفس پرستی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سرگرمی کے باعث اور اکبر بادشاہ کے لادینی خرافات اور الحاد نوازی کے باعث شریعت اسلامی انتہائی کس مپرسی کے عالم میں تھی۔ بادشاہ نے مغل حکومت کو مستحکم بنانے اور برصغیر کی تمام آبادی کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مذہبی رواداری کو اپنا شعار بنا لیا۔ غیر مسلموں کو جزیہ اور یاترا محصول معاف کر دیے گئے۔ ہندوؤں کو اس قدر سرکاری ملازمتیں اور دیگر مراعات دی گئیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ خود اکبر کا اسلام سے انحراف اور دیگر مذاہب

التفات نقطہ عروج کی جانب گامزن تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ **مجوسیت** اکبر نے مجوسی مذہب (آتش پرستی) کے رہنما دستور ما ہیار جی رانا سے اس مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۵۸۰ء میں سورج اور آگ کی باقاعدہ پرستش شروع کر دی۔ دربار میں شمعیں روشن ہوتیں تو سب درباری تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔

۲۔ **عیسائیت** ۱۵۸۰ء میں بادشاہ نے گوا سے پرتگیزی پادری منگوا لیے۔ محل میں ایک گرجا بھی تعمیر کر دیا گیا۔ اکبر نے نہ صرف عیسائیت کی تعلیم حاصل کی بلکہ شہزادہ مراد کے لیے بھی عیسائی پادری اتالیق مقرر کر دیے۔ ملک میں عیسائیت کی تبلیغ کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

۳۔ **جین مت** ۱۵۸۲ء میں اکبر جین مت مذہب کی جانب راغب ہوا۔ جینی پیشوا ہیرا وجے کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس نے ملک میں جانوروں کے ذبیحہ کی قطعی ممانعت کر دی اور حکم عدولی پر سزائے موت مقرر کر دی گئی۔

۴۔ **ہندومت** ہندومت اکبر پر اس حد تک غالب آیا کہ اس نے برہمن پرشوتم سے مسئلہ تناسخ کی تعلیم حاصل کی۔ بادشاہ نے ہندوانیوں سے شادیاں کیں اور ماتھے پر تلک لگایا کرتا تھا۔ گاؤکشی کی قطعاً ممانعت کر دی گئی۔

حضرت مجدد الف ثانی کے ملی و اصلاحی کارنامے

حضرت مجدد الف ثانی نے اس وقت کے تمام حالات و واقعات کا وسعت نظر اور مومنانہ فراست سے جائزہ لیا اور ملحدانہ و جابرانہ نظام حکومت کی اصلاح و درستگی اور اسلام کے چشمہ صافی کو بدعات و ضلالت کی آمیزشوں سے پاک کرنے کا اہم ترین فرض سے عہدہ برآ ہونے کا بیڑا اٹھایا۔

اکبر کے دین الٰہی کا خاتمہ

شہنشاہ اکبر کی مذہبی بے راہ روی بالآخر تمام حدود عبور کر گئی۔ دنیا پرست علماء اور خوشامدی درباریوں خصوصاً فیضی اور ابوالفضل نے فکر و تحقیق کی نئی جولانیاں دکھائیں اور بادشاہ کو "ظل اللہ" قرار دے کر ایک نئے دین کی اختراع کی جو تمام مذاہب کا منصوبہ تھا۔ تاکہ بادشاہ کو برصغیر کے جملہ طبقات کی تائید و حمایت حاصل ہو سکے۔ اس خود ساختہ مذہب کو "دین الٰہی" یا "توحید الٰہی" کا نام دیا گیا۔ ابوالفضل کو اس مذہب کا خلیفہ اول مقرر کیا گیا۔

نام نہاد دین الٰہی کی رو سے بادشاہ کے سامنے حاضری کے وقت سجدہ کرنا دربار کے معمولات

میں شامل کیا گیا۔ تمام دینی عقائد قابل ترک بن گئے۔ نبوت، وحی، حشر و نشر، سزا و جزا، صوم وصلوٰۃ غرض کہ سب دینی اصطلاحیں غیر یقینی اور بے اصل قرار دے دی گئیں۔ قرآن کا الہامی ہونا مشتبہ اور نزول وحی کو عقل میں نہ آنے والی سمجھا جانے لگا۔ اکبر کے امام وقت ہونے کا محضر تیار کیا گیا اور تمام علماء سے اس پر دستخط لیے گئے۔

اس ابتلا و آزائش کے دور میں حضرت مجدّد الف ثانی اکبر کی لادینی خرافات کے سامنے چٹان بن کر ڈٹ گئے۔ جس کے نتیجہ میں خود ساختہ دین الہٰی کو دربار کے امراء کی پذیرائی بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ابوالفضل کے قتل کے بعد دین الہٰی پر بادشاہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اکبر کی موت کے ساتھ ہی یہ فتنہ قصہ پارینہ بن کر رہ گیا۔ اکبر کے آخری ایام میں شہزادہ خسرو کو اپنے باپ جہانگیر کی بجائے تخت نشین کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ اپنے دادا کے لادینی نظریات کو پروان چڑھا سکے مگر حضرت کی تعلیمات اور ان کے مرید امراء نے اس خوف ناک سازش کو مٹی میں ملا دیا۔

ابوالفضل اور فیضی کے زیر اثر افراد نے ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر دیا جو توحید کو ماننے کے لیے رسالت کے عقیدہ پر ایمان لانا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت مجدّد کا ایک عظیم کارنامہ ہے کہ آپ اس فتنہ کے تدارک کے لیے معرکۃ آمدلہ رسالہ "اثبات النبوۃ" تحریر کیا۔

فلسفہ وحدت الوجود کی نفی

تیسری صدی ہجری کے بعد دیگر مذاہب کے زیر اثر تصوف میں نت نئی توجیہات شامل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ خصوصاً یونانی علوم کی عربی میں مداخلت نے عمل کی جگہ فکر، کے طریقہ کار کو پروان چڑھایا۔ اس طرح فلسفہ نے دینی حقائق کو بھی شدید ضعف پہنچانا شروع کر دیا۔ اس دور میں یونانی فلسفہ، وحدت الوجود، نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر مہلک اثرات مرتب کیے۔

وحدت الوجود نظریے کا آغاز مشہور صوفی ابن عربی سے ہوا اس عقیدہ کی رو سے ساری کائنات خدا کی ذات ہی کی مظہر ہے اور ہر چیز میں اسی کی ذات جلوہ فرما ہے۔ اس لیے بندہ اور خُدا تعالیٰ ایک دوسرے سے جُدا نہیں۔ اللہ دریا ہے تو انسان قطرہ ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود میں ایک باطل توضیح یہ بھی پیش کی گئی کہ کائنات کے ذرے ذرے میں خدا موجود ہے اس لیے جن بے جان یا جاندار (آگ، ہوا، پانی، پتھر، درخت، چاند، سورج، سانپ، انسان وغیرہ) چیزوں کی بھی پرستش کی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی ہو گی۔ یہ تصور ہندو مبلغین کی بھگتی تحریک کا آئینہ دار تھا۔

حضرت مجدّد الف ثانی کا بنیادی کارنامہ وحدت الوجود فلسفے کو رد کر کے وحدت الشہود کا تصور

پیش کرنا ہے۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ خالق و مخلوق دونوں کا وجود الگ الگ ہے اور کائنات میں موجود تمام مخلوق، خالق کے حسنِ تخلیق کی شاہد ہے۔ انھوں نے "ہمہ اوست" کو "ہمہ از اوست" یعنی سب کچھ وہی ہے کی بجائے سب کچھ اس کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے بدل دیا۔ حضرت مجدّد نے صوفیوں کو "انا الحق" "انا عبدہٗ" کا نعرہ دیا اور ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وصل اور محبت کی بجائے جُدائی اور خوف و بندگی کا درس دیا۔ انھوں نے تصوف کے لیے شرح کی پابندی ناگزیر قرار دے دی جس سے برصغیر میں مُسلم فکر کے آئندہ ارتقاء کا رُخ بھی متعین ہو گیا۔

حضرت مجدّد کی اسیری

شیخ احمد سرہندی نے اپنے عہد کے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا اور ان کے اثرات شاہی دربار میں بھی محسوس کیے گئے۔ ان کے مریدوں میں اکبری عہد کے بعض بڑے بڑے امراء مثلاً عبدالرحیم خان خاناں، خان اعظم، مرزا عزیز کوکتاش، مفتی صدر جہاں اور جہانگیری دور کی عظیم شخصیات مثلاً خانخاناں، مہابت خان، خان جہاں لودھی، بخشی الملک شیخ فرید، قلیچ خاں اور اسکندر خاں وغیرہ شامل تھے، تاہم اس کے ساتھ دُنیا پرست علماء کی کمی بھی نہ تھی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی کی ایذا رسانی کے درپے تھے اور راعی و رعایا دونوں کو آپ کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے مگر آپ کے پائے استقامت میں کوئی جنبش نہ آئی۔ مخالفین نے یوں کام بنتے نہ دیکھا تو آپ کو ظل اللہ کا باغی قرار دے دیا۔ چُنانچہ جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب کر کے سجدہ کا حکم دیا۔ آپ نے یہ کہہ کر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی سجدہ جائز نہیں ہے۔ میں کسی انسان کو سجدہ کیونکر کروں؟ اس ایمان افروز جواب پر برافروختہ ہو کر بادشاہ نے حضرت مجدد کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا آپ نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی اصلاح و تجدید کے کام کو جاری رکھا جس کے نتیجے میں روزانہ سینکڑوں غیر مُسلم قیدی حلقۂ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ اسی اثناء میں جہانگیر کو اپنے عمل پر ندامت ہوئی تو اس نے حضرت مجدد کو عزت و تکریم کے ساتھ رہا کرنے کے علاوہ شاہی لشکر میں تبلیغ اسلام کی بھی اجازت دے دی۔

حضرت شیخ احمد سرہندی کی تعلیمات نے خود جہانگیر کے خیالات میں اس حد تک انقلاب برپا کر دیا کہ اس نے نہ صرف اپنے بیٹے خرم (شاہ جہاں) کو آپ کے حلقۂ بیعت میں داخل کر دیا۔ بلکہ ملک میں تمام غیر شرعی اقدامات کو بھی موقوف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشد و ہدایت کی روشنی دربار عظمت کدہ ہند میں پھیل گئی اور عوام و خواص اتباع شریعت کی جانب مائل ہونے لگے۔

دو قومی نظریہ

حضرت مجدد الف ثانی کا یہ عدیم المثال کارنامہ ہے کہ انھوں نے دو قومی نظریہ کے احیاء کے لیے سعی بلیغ کی انھوں نے جُداگانہ مُسلم قومیت کے تصور کو نہ صرف احساس دوام بخشا بلکہ اسے ٹھوس بنیادیں بھی فراہم کیں۔ حضرت مجدد کے ہیں جُداگانہ مُسلم قومیت کو جس ابتلا و آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ خود شہنشاہ اکبر کی مذہبی بے راہ روی اور ہندو گھرانوں میں شادیاں مسلمانوں کے جُداگانہ تشخص کے لیے تازیانہ ثابت ہو رہی تھیں۔ دوسری جانب وحدت الوجود فلسفہ کا ایک مفہوم یہ بھی اخذ کیا جا رہا تھا کہ چونکہ کائنات میں موجود تمام چیزوں کی حقیقت ایک ہے اس لیے تمام مذاہب کی حقیقت بھی ایک ہے۔ اس فلسفہ کی وجہ سے بھگت کبیر، رامانند، ایک ناتھ، گورونانک اور مسلمان صوفیاً سبھی ایک صف میں کھڑے نظر آنے لگے تھے۔ بالفاظ دیگر مُسلم قومی تشخص کے خاتمے اور متحدہ قومیت کے احیاً کی ہندو سازش نقطۂ عروج پر تھی ان نامساعد حالات میں حضرت مجدد نے اپنی تبلیغی وعلمی مساعی سے دو قومی نظریے کی تجدید کی اور کفر و اسلام کی حدود کو واضح انداز میں پیش کیا۔ شیخ مجدد کی دینی و اصلاحی خدمات کے اعتراف میں سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :۔

> "انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں جانے سے روکا اور اس فتنہ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا، جواب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا۔"

یہ کہنا بجا ہوگا کہ مسلمانان ہند ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جس اسلامی ریاست (پاکستان) کے حصول میں کامیاب و کامران ہوئے اس کی بنیادیں حضرت مجدد الف ثانی نے ہی رکھی تھیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ

اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایک طرف مُسلم اقتدار کا آفتاب غروب ہوا تو دوسری طرف اسلامی احیائ کی سحر پھوٹ نکلی۔ مسلمانوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک شاہ ولی اللہ کی عظیم شخصیت کی رہین منت ہے۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے ۴ سال پہلے ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو دہلی کے قریب موضع پھلت میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام قطب الدین تھا مگر اپنی نیک طینت کی بناء پر ولی اللہ کے نام سے معروف ہوئے۔ شاہ صاحب کا سلسلہ نسب

والد کی طرف سے حضرت فاروق اعظمؓ اور والدہ کی طرف سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے آپ کے دادا شیخ وجیہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں ممتاز سردار تھے۔ والد ماجد شیخ عبدالرحیم دہلی کے نہایت نامور عالم دین اور صاحب دل بزرگ تھے انھوں نے پرانی دہلی میں ایک دینی درس گاہ "مدرسہ رحیمیہ" قائم کر رکھی تھی۔ جہاں وہ دربار شاہی سے الگ تھلگ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ تاہم عالمگیر ان کی علم شناسی کا معتقد تھا اور اس نے انھیں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و ترتیب میں شامل کر لیا تھا۔

شاہ ولی اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب جانے لگے اور ۷ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا اس کے بعد فارسی اور عربی علوم کی تعلیم شروع کی۔ ۱۴ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ ۱۵ سال کے ہوئے تو آپ نے اس زمانہ کے مدارس میں رائج علوم میں اس قدر کمال حاصل کر لیا کہ اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ۱۵ سال کی عمر ہی میں والد محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آئندہ دو سالوں میں علم فقہ، منطق، کلام، سلوک و تصوف، علم الحقائق، طب، نحو، علم معانی اور ہیئت و حساب میں طاق ہو گئے۔ شاہ صاحب ۱۷ برس کے تھے کہ والد محترم انتقال کر گئے۔ جس کے بعد آپ ۱۲ برس تک مدرسہ رحیمیہ میں دینی کتب اور معقولات کی تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۷۳۰ء میں حج کا قصد کیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ میں قیام کے دوران شیخ ابو طاہر مدنی اور دیگر مشائخ حرمین سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۷۳۲ء میں وطن واپس آئے اور مدرسہ رحیمیہ میں صرف علم حدیث کا درس دینے لگے۔ شاہ ولی اللہ نے بعمر ۶۳ سال ۱۷۶۲ء میں بمقام دہلی رحلت فرمائی۔

شاہ ولی اللہ کے دور میں ملکی حالات

اورنگ زیب عالمگیر برصغیر میں وہ آخری مسلم حکمران ثابت ہوئے جن کے دل میں اسلام کی نگہبانی اور سربلندی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسلام کے اس سچے اور پکے شیدائی نے برصغیر میں دینی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے حتی المقدور کوششیں کیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے برصغیر میں احیائے اسلام کی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ جانشینی کے مسئلے پر اس کے نااہل، بے غیرت اور اسلامی شعار سے نابلد بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس میں کامیابی کے بعد بڑے بیٹے نے بہادر شاہ اول کے نام سے بادشاہت قائم کر لی۔ ۷ سال کے بعد جب بہادر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے بیٹوں میں بھی تخت نشینی کی کشمکش ہوئی جس میں معز الدین نے غلبہ پا لیا۔ لیکن وہ ابھی ایک سال ہی حکومت کر پایا تھا کہ فرخ سیر کے ہاتھوں مارا گیا۔ فرخ سیر بس نام کا بادشاہ بنا جبکہ اصل اقتدار سادات بارہہ کا تھا۔ اس دور سے سلطنت مغلیہ

میں امراء کی گردی شروع ہو گئی۔ بالآخر سادات بارہہ کے ہاتھوں فرخ سیر کا دردناک انجام ہوا۔ اس کے بعد تخت نشین ہونے والے دو شہزادے بھی چند سال سے زیادہ حکمرانی نہ کر سکے۔ ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس کے عہد میں نادر شاہ نے ہندوستان پر پے در پے حملے کر کے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بعد ازاں احمد شاہ ابدالی فرمانروائے افغانستان نے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ سلطنت کی اس کمزوری سے سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ پنجاب اور موجودہ اتر پردیش کے شمال مغربی اضلاع میں سکھوں نے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے رکھا۔ جبکہ جاٹ اور مرہٹوں نے دہلی کو تختہ مشق بنا رکھا تھا۔

عوام کی اخلاقی و مذہبی حالت نہایت درجہ پست ہو چکی تھی۔ فسق معصیت اور بدعقیدگی و بدعملی کے مظاہر عام ہو گئے تھے۔ کتاب و سنت سے رابطہ کٹ چکا تھا اور قرآن مجید کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ صوفیوں کی خانقاہیں روحانیت سے خالی اور مدرسے جمود و تعطل کا شکار تھے۔ صوفیائے اصلاح اخلاق اور طہارت نفس کے بجائے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفیانہ مباحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ شطحیات کی دلفریب تعبیریں کی جا رہی تھیں۔ علماء منطق اور فقہ کی فرسودہ اور لاحاصل بحثوں میں غرق تھے۔ اس ماحول میں شاہ ولی اللہ نے اسلام کے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کر کے مسلمانانِ ہند کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

شاہ صاحب کی تجدیدی و اصلاحی مساعی کے پیش نظر علامہ شبلی نعمانی نے بجا طور پر لکھا ہے:-

"ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا اس کے لحاظ سے یہ اُمید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہو گا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے۔"

(شبلی نعمانی: تاریخ الکلام ص۱۰۹)

علامہ اقبال نے شاہ ولی اللہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ان کی ذات پر گویا الٰہیات اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا۔"

(محمد اقبال: تشکیل جدید الٰہیات)

شاہ ولی اللہ کے ملی و اصلاحی کارنامے

برصغیر کے مسلمان صدیوں سے قرآن مجید کو بغیر سوجھ بوجھ کے محض یمن و برکت کے لیے پڑھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے سب سے اہم علمی کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ قرآن پاک کا سلیس فارسی میں ترجمہ کیا۔ تاکہ مسلمانوں کے اندر قرآن فہمی کا جذبہ پیدا ہو۔ یہ ایک نہایت ہی جرأت مندانہ قدم تھا۔ کیونکہ اس وقت اکثر علماء قرآن پاک کا ترجمہ جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب کے اس اقدام پر بعض مولویوں نے نہ صرف ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ بلکہ تلواریں بھی میانوں سے نکال لیں۔ شیخ اکرم نے اس مخالفت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

" جب علماء کو اس کا پتہ چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلام پاک کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنا دستورالعمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی۔ اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجمے کی راہ پیدا ہو گئی "

(رود کوثر صہ ۵۳ - ۵۵۲)

علم حدیث کی ترویج

شاہ جہانگیر کے عہد سے قبل شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کی اشاعت و ترویج کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ تاہم بعد میں فقہ کا دور دورہ ہو گیا اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تدریس کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ علم حدیث سے خصوصی مناسبت تھی۔ اس لیے آپ نے اپنے سفر حجاز میں اس پر خاص توجہ دی اور حرمین شریف میں اپنے چودہ ماہ کے قیام کے دوران بڑے بڑے ارباب طریقت کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے وہاں شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی سے سندِ حدیث لی۔

سفر حج کے بعد شاہ صاحب مدرسہ رحیمیہ میں خود صرف علم حدیث کی تعلیم دینے لگے۔

حضرت شاہ ولی اللہ امام مالک کے مرتب کردہ قدیم مجموعہ حدیث موطا کو صحیح بخاری پر ترجیح

دیتے تھے آپ نے موطا کی شرح عربی میں "المسوی" اور فارسی میں "المصفی" کے نام سے لکھی۔ عوام کے لیے احادیث کے چھوٹے چھوٹے رسالے مرتب کیے مثلاً چہل حدیث، النوادر من الحدیث، الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم وغیرہ۔

مذاہب فقہ اور تقلید و اجتہاد

حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں علمائے وقت یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو اور معانی کی بھول بھلیوں میں اُلجھے ہوئے تھے اور اسی کو علم سمجھ بیٹھے تھے۔ جبکہ قرآن و حدیث کی تعلیمات سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ فقہی مباحث عروج پر تھے۔ شاہ صاحب کی یہ دلی خواہش تھی کہ فقہا دین کے اصل منبع سے رجوع و استفادہ کریں۔ چنانچہ آپ نے فقہ کی صحیح حدود کے تعین کے لیے مختصر رسالہ "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" تحریر کیا۔ اس میں خلافت راشدہ سے لے کر پانچویں ہجری تک فقہ کی تدوین، جمع حدیث اور مختلف مذاہب فقہی کی ناقدانہ تاریخ لکھی اس کے علاوہ اس میں مذاہب اربعہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور اصول فقہ میں ان کے باہمی اختلافات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب فقہی امور میں اعتدال پسندی کے قائل تھے اور فقہی مسائل پر انتشار و نفاق کو قابلِ نفرت سمجھتے تھے ان کے نزدیک فقہ کے چاروں امام معتبر قرار پاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اجتہاد کو ہر زمانے میں فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ اس لیے وہ علماء پر تحقیق و اجتہاد کا باب بند نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے اپنی متعدد کتابوں میں بار بار ظاہر کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ ہر زمانے میں کھلا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی کھلا رہے گا۔ تاہم وہ اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں دیتے اور اس کے لیے انھوں نے اصول و قواعد اور حدود و شرائط معین کیے ہیں۔ ازالۃ الخفا، عقد الجید فی احکام الاجتہاد و تقلید، انصاف، بدور بازغہ، مصفیٰ وغیرہ ہر کتاب میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

معاشرتی اصلاح

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں ایک طرف سلطنت مغلیہ رو بہ زوال تھی تو دوسری طرف مسلم معاشرہ پستی و تنزل کی جانب مائل تھا۔ شاہ ولی اللہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک حساس اور درد مند دل رکھتے تھے اور ہندوستان میں مسلم سلطنت کے تحفظ اور غلبہ اسلام کے خواہاں تھے۔ حالات و واقعات اور دیگر عوامل کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کا فہم و تدبر اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان میں مسلم سلطنت کا تحفظ اور غلبہ اسلام صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اُمت مسلمہ کو صراط مستقیم پر گامزن کیا جائے۔ شاہ صاحب نے اس جاں گسل اور پُر کٹھن راہ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اپنی شہرہ آفاق عربی تصنیف تفہیمات الٰہیہ میں معاشرے کے جملہ طبقات

(پیرزادوں، علمائے وقت، واعظوں، امراء، سپاہیوں، اہل حرفہ، عام مسلمانوں، شرک کرنے والے مسلمانوں وغیرہ) سے جو خطاب فرمایا ہے وہ ان کے پُرخلوص جذبات کا آئینہ دار ہے اس سعی بلیغ نے ہندوستان میں مُسلم معاشرہ کی تشکیل کے سلسلہ میں نمایاں اثرات مرتب کیے۔ مسلمانوں کے عقائد و عمل کی کافی حد تک اصلاح ہوگئی۔ ہندوانہ رسومات اور بدعات کے اثرات چھٹنے لگے، بیواؤں کی پھر سے شادیاں ہونے لگیں۔ بھاری جہیز اور حق مہر کی شرائط متروک قرار پانے لگیں۔ پیدائش و اموات کی غیر شرعی رسومات کا قلع قمع ہوگیا۔

مُسلم سلطنت کے تحفظ کی سعی

نادر شاہ کے حملے کے بعد برصغیر کی سیاسی صورت حال ابتر ہو چکی تھی۔ شمالی ہند میں سکھوں کی طاقت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ دہلی کے گرد و نواح جاٹ قوم کی زد میں تھے۔ روہیلے بھی قوت پکڑ چکے تھے اور مرہٹے سب سے بڑھ کر سلطنت مغلیہ کے لیے وبال جان بنے ہوئے تھے، الغرض برصغیر مکمل طور پر علاقائی باغی قوتوں کی دسترس میں آچکا تھا۔ شاہ ولی اللہ اس صورت حال کو نہایت بے چینی سے دیکھ رہے تھے ان کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طور مسلمانوں کی عظمت رفتہ لوٹ آئے کیونکہ وہ اسلام کی برتری اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ایک ہی شئے تصور کرتے تھے ان مقاصد کے حصول کے لیے شاہ ولی اللہ نے بیرونی حکمرانوں کو برصغیر پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی تاکہ اسلام دشمن قوتوں کا قلع قمع ہو سکے۔

آصف جاہ کے نام مکتوب

حضرت شاہ ولی اللہ نے آصف جاہ کے نام مکتوب میں لکھا کہ :-

"بعد حمد و صلوۃ کے واضح ہو کہ اس فقیر کے دل پر یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ عالم ملکوت میں یہ بات مقرر شدہ ہے کہ مخالفین اسلام ذلیل و خوار ہوں گے۔ بعد ازاں باغی لوگ رسوا اور خانہ خراب ہوں گے اگر جناب عالی ان بدمعاشوں کے مقابلہ میں کر ہمت باندھ کر آجائیں تو یہ تمام کارنامے جناب کی طرف منسوب ہوں گے اور دُنیا آپ کی تابعدار ہو جائے گی اور ملت مرحومہ کے رواج اور مُسلم حکومت کی استقامت کا باعث جناب عالی کو قرار دیا جائے گا۔"

نجیب الدولہ کے نام مکتوب

نجیب الدولہ کو "امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"پردہ غیب میں مرہٹہ اور جٹ کا استیصال مقرر ہوگیا ہے بس وقت پر موقوف ہے جونہی کہ اللہ کے بندے کمر ہمت باندھیں گے۔ طلسم باطل ٹوٹ جائے گا ــــــ"

"دینی و دُنیاوی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جاٹ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکات غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں اس کے بعد نوبت سکھ ہے۔ اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہیے اور رحمت الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے۔"

احمد شاہ ابدالی کے نام مکتوب

شاہ ولی اللہ نے نجیب الدولہ کے توسط سے احمد شاہ ابدالی کو برصغیر کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ :۔

"المختصر دہلی و دکن کے خاص طور پر مرہٹوں کا تسلط ہے۔ قوم مرہٹہ کو شکست دینا آسان کام ہے۔ بشرطیکہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں حقیقت یہ ہے کہ قوم مرہٹہ قلیل ہیں لیکن ایک گروہ کثیر دن کے ساتھ ملا ہوا ہے اس گروہ میں سے اگر ایک صف کو بھی درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی۔ اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی۔

حاصل کلام یہ کہ ملک ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ کی نوعیت یہ ہے جو معرض بیان میں آئی اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے جو لکھا گیا ہے اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے کوئی اور موجود نہیں ہے۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے۔ ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرانا۔"

حضرت شاہ ولی اللہ کی اس سعی پیہم کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ نظام الملک آصف جاہ، نواب نجیب الدولہ، تاج محمد خاں بلوچ اور حافظ رحمت خاں نے اپنے اپنے دائرہ کار کے اندر مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی سرکوبی کر کے انھیں ملیا میٹ کر دیا۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک پر احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۰ء کے اواخر میں چھٹی مرتبہ ہند پر حملہ آور ہوا۔ پانی پت کے میدان میں افغان اور مرہٹہ افواج کئی روز تک رو برو صف آرا رہیں۔ ۱۶ ر جنوری ۱۷۶۱ء کو ایک زبردست معرکے کے بعد مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ مخالفین نامور سرداروں میں سے دو تین آدمیوں کے سوا کوئی بھی اپنی جان بچا کر نہ بھاگ سکا۔ اس عبرت ناک شکست نے اسلام دشمن قوتوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ تاہم سلطنت مغلیہ اس وقت اس قدر تنزل پذیر تھی کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد فتح کے اثرات کو برقرار نہ رکھ سکی۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک کے مقاصد و اثرات

شاہ ولی اللہ کی تحریک اس وقت شروع ہوئی جب برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کا سیاسی اور اخلاقی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ہندوستان میں یہ بات قریب قریب طے پا چکی تھی کہ اب یہاں مسلمانوں کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر مختلف غیر اسلامی طاقتوں کے عروج کو روک سکے اور ایک مستحکم اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لا سکے۔ غیر مسلموں کا تسلط اور بڑھتے ہوئے قدم مسلمانوں کے وجود ہی کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔ اس کے باوجود اس وقت قوم کے خودغرض عناصر اپنی مذموم سرگرمیوں سے باز نہ آئے۔ انھوں نے معاشرے کی اخلاقی حالت کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے کوئی اُمید، کوئی مستقبل اور کوئی علاج نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اس قسم کے انتشار اور زوال میں ایسے مفکرین پیدا ہو جاتے ہیں جو واقعات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور قوم پر طاری ہونے والے مرض کا علاج تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قوم کی اسی صورت حال نے شاہ ولی اللہ کو پیدا کیا۔

شاہ ولی اللہ کو قدرت نے حکیمانہ بصیرت اور ہمہ گیر ذہن عطا کیا تھا۔ انھوں نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہندوستانی مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کا جائزہ لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بہت جلد آ گئی کہ سلطنت کا زوال معاشرتی نظام کی خرابی کا نتیجہ ہے اور یہ خرابی اس معاشرے کی اخلاقی تباہی کا سبب ہے جو خودغرضانہ مزاج سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس لیے ان کے خیال میں اخلاقی بہتری کی غرض سے ایک تحریک کا اجرا اس وقت کی بنیادی ضرورت تھی۔ وقت کا یہی تقاضا تھا کہ اس نظام حکومت کی برتری کو ختم کر کے اس کی جگہ ایسے نظام کی تعمیر کی جائے جو صحیح نظریات کا حامل ہو۔ وہ ظلم و استحصال کے نظام کو ختم کر کے عادلانہ نظام قائم کرنا اور اس کے لیے ایک منظم جماعت تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے انقلابی نظریے کا مقصد ہر بوسیدہ نظام کا خاتمہ تھا۔ اس کے لیے آپ حسبِ ضرورت جہاد بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اپنی جدوجہد کی ابتدا میں انھوں نے بادشاہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہے۔ پھر انھوں نے امرا کو مخاطب کیا، لیکن امرا کسی سنجیدہ اور معقول مشورے کو سُننے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔

اس کے بعد انھوں نے مایوس ہو کر نظام الملک آصف جاہ کو متوجہ کیا جو ایک تجربہ کار مدبر اور منتظم تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ دہلی کا دربار اب اصلاح کے مرحلے سے گزر چکا ہے اور اسے اب کم سے کم

دکن ہی کو بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس پر شاہ صاحب کی پر درد استدعا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس صورت حال میں شاہ صاحب کے سامنے روہیلوں کی ابھرتی ہوئی طاقت ہی واحد ذریعہ تھی جو اس گرتی ہوئی حالت میں مسلمانوں کے لیے نجات کا سبب ہو سکتی تھی۔ شاہ صاحب نے مُسلم اقتدار کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے انھیں ذریعہ بنانا چاہا۔ ان کی نظریں روہیلہ سردار نجیب الدولہ پر پڑیں جو اپنی مدبرانہ اور دور اندیشانہ حکمت عملی کے سبب یکساں مقبول تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ واحد مُسلم قوت جو کچھ مدد دے سکتی تھی۔ وہ افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قائم کردہ نئی مملکت تھی۔ شاہ صاحب روہیلوں کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کے تعاون کی اُمید کر سکتے تھے۔ انھوں نے احمد شاہ ابدالی سے بھی خط وکتابت کی جس میں مسلمانوں کے مصائب بیان کیے اور غیر مُسلموں کے پنجے سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو فرائض اس پر ایک مسلمان فرماں روا کی حیثیت سے عائد ہوتے تھے ان کی طرف توجہ دلائی۔ آخر کار نجیب الدولہ اس قابل افغان فرماں روا کی قیادت میں شمالی ہند کی مسلم حکومتوں کا اتحاد، اس وقت کی غالب قوت مرہٹوں کے خلاف منظم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ پانی پت میں عظیم فتح حاصل ہوئی۔ اس طرح شاہ صاحب کی سیاسی جدوجہد غیر اسلامی عناصر کی غارت گری سے مسلمانوں کو نجات دلانے میں تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی کامیاب ہوئی۔

شاہ صاحب کی حقیقی اس بنا پر ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے زوال کے بنیادی اسباب پر غور کیا [illegible]ان کا علاج معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خیال میں برعظیم کے مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا سبب خود [illegible]سلام سے ان کی ناواقفیت ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن حکیم کے اصولوں پر عمل کرکے انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق اس وقت کا معاشرہ عدم توازن کا شکار تھا۔ انھوں نے کسانوں اور دستکاروں کی معاشی فلاح و بہبود پر زور دیا۔ کیونکہ اس زمانے میں صحت مند معاشیات کی بنیاد یہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اخلاقی اصولوں سے لاپرواہ ہو جائیں وہ لکھتے ہیں کہ آزادی، حکومت اور اچھی زندگی سب کا دارومدار انصاف اور اصول عدل پر ہے۔ شاہ صاحب کے مقاصد [illegible] سیاسی تدابیر کے علاوہ بعض فوری اصلاحات بھی تھیں جو خاص طور پر مسلمانوں کو ان غیر اسلامی رسوم سے نجات دلانے کے لیے تھیں جو ان کی اخلاقی اور قومی زندگی میں معاشرے اور اس کے عقائد سے روابط کی وجہ سے، رواج کے طور پر داخل ہوگئی تھیں وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان برعظیم کے عام ماحول کا جزو بن کر رہ جائیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ دُنیائے اسلام سے ان کے تعلقات برقرار رہیں۔ ان کی نظر میں ایک اچھے اور مفید معاشرے کا حصول اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں پر زور دیے بغیر

ممکن نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک قوم کی صحت کے لیے سیاسی اقتدار ضروری ہے۔ ان کی قوم کو سیاسی قوت کے زوال سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے وقت میں سیاسی زوال کو روک نہیں سکے۔ لیکن انھوں نے قوم کے اندر ایسی اُمنگیں پیدا کر دیں اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے عقائد کی پاکیزگی کو برقرار رکھ سکے اور اپنے عظیم ماضی سے بہتر مستقبل کی تعمیر کا عزم حاصل کر سکے۔

خاندان ولی اللہ کی جدوجہد

شاہ ولی اللہ کی تحریک نے برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ پر گہرے اور وسیع علمی، فکری تہذیبی اور سیاسی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اپنی تصانیف کے ذریعے انھوں نے اسلامی فکر اور جدوجہد کے بہت سے میدانوں میں نمایاں اثرات چھوڑے وہ جانتے تھے کہ اس امر کا بندوبست کرنا ضروری ہے کہ ان کے بعد برعظیم کے مسلمانوں کے اخلاقی و سیاسی احیاء کا لائحہ عمل جو انھوں نے ترتیب دیا تھا، جاری رہ سکے یہ کام اتنا وسیع تھا کہ وہ تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے صاحبزادوں اور ایسے علماء کی ایک جماعت ترتیب دی جو ان کے نظریات سے بخوبی واقف تھے اور ان کے بلند حوصلوں سے متاثر و فیض یاب تھے۔ انھوں نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو وسعت دی۔ اس کی متعدد صورتیں اختیار کی گئیں۔ شاہ صاحب کے پیرو کاروں نے ان کی تصانیف کے مطابق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اردو زبان میں لکھنا شروع کیا جو اس وقت کی عام فہم اور مقبول عام زبان بن چکی تھی۔ خود شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے اپنی تمام زندگی اپنے والد کے بلند اصولوں اور افکار و آراء کی نشر و اشاعت میں گزار دی۔ اس وقت کے عام پڑھے لکھے فرد کے لیے شاہ ولی اللہ نے قرآن حکیم کی جو پہلی فارسی تفسیر "فتح الرحمان" لکھی تھی۔ اسے مزید عام فہم بنانے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے "فتح العزیز" لکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو ان کے والد کے خیالات پر مبنی تھیں۔ لیکن ان کی زبان ایسی تھی کہ انھیں اوسط درجے کا تعلیم یافتہ شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ ان کے بیٹے اس سلسلے میں ان کی مدد کرتے۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن حکیم کا ترجمہ "موضح القرآن" بامحاورہ اُردو میں کیا تاکہ جو لوگ فارسی سے زیادہ واقف نہیں وہ اس کے معنی اُردو میں سمجھ سکیں۔ اور شاہ رفیع الدین نے قرآن حکیم کا ایک اور آسان لفظی ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ دو کتابیں "اسرار المجید" اور "تکمیل الاذہان" تصنیف کیں۔ جو دراصل شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی شرحیں تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی باریکیوں کے تفصیلی اور آسان تعارف کے لیے شاہ اسمٰعیل شہید نے

"عبقات"، نامی کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب "تقویۃ الایمان" شاہ ولی اللہ کے نظریات کی روشنی میں مسلمانوں کی ذہنی اصلاح کے لیے خاصی اہم اور معروف تصنیف ہے۔ تصنیف و تالیف کا کام اس وقت اس حد تک وسیع اور دور رس اثرات کا حامل تھا کہ اس کام کو خاصی اہمیت دی گئی اور اس خاندان کے دوسرے تربیت یافتہ علماء نے اس مقصد اور موضوع پر لاتعداد کتابیں اور رسالے لکھے اور اچھا خاصا ادب پیدا کر دیا۔ اس کام میں شاہ صاحب کے نامور فرزند شاہ عبدالعزیز اور دوسرے فرزندوں نے ان کی اس روایت کو برقرار رکھا کہ دین کی تعلیم میں قرآن حکیم کے درس کو مرکزی حیثیت دی جائے اور اصل مذہب میں ہر طرح کے الحاق اور اضافے اور مذہبی اعمال میں ہر قسم کی بدعتوں کو جو قرآنی تعلیم اور سُنت کے ساتھ ٹکراتی ہوں، رد کر دیا جائے۔

شاہ عبدالعزیز جو مسند درس پر شاہ ولی اللہ کے جانشین ہوئے، اپنے بے شمار شاگردوں کو دینی معاملات میں شدید احتیاط پسندی کی تعلیم دینے کے علاوہ ان معاشی اور سیاسی تصورات کی تبلیغ کرتے رہے جو شاہ ولی اللہ مطمع نظر تھیں۔ شاہ ولی اللہ کی زندگی میں سلطنت مُغلیہ چاہے کتنی کمزور ہو گئی ہو، کم سے کم شمالی ہند میں اس کا اقتدار برائے نام رہا اور وہی ان کی تنقید کا نشانہ تھی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد انگریزوں کا سیاسی اثر بنگال کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں بھی تیزی سے بڑھ گیا تھا اور برطانیہ برعظیم میں ایک بالادست قوت بن چکا تھا۔ کوئی ایسی ریاست یا حکمران نہ تھا جو اسے دعوت مقابلہ دے سکتا۔ مُسلم سلطنت اس طرح ختم ہو رہی تھی کہ اس کے سنبھلنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اس نئی مغربی طاقت نے سلطنت مُغلیہ کی جگہ لے لی اور مسلمان ریاست ایک باجگزار سے بہتر نہ تھی۔ اس لیے شاہ ولی اللہ کے جانشین اور پیروؤں کو اب سلطنت مُغلیہ سے نہیں بلکہ ایک غیر ملکی قوم کی حکومت سے مقابلہ کرنا تھا۔ چُنانچہ شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دیا کہ "برعظیم اب دارالاسلام، یعنی وہ ملک جہاں اسلام کو برسر اقتدار یا کم سے کم آزاد سمجھا جا سکے، نہیں رہا، اس واقع سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انگریزوں نے مخصوص اسلامی شعائر میں مداخلت نہیں کی ہے، مسلمان اب دارالحرب میں ہیں۔ یعنی ایک ایسے علاقے میں ہیں جس پر اقتدار سے انھیں محروم کر دیا گیا ہے اور انگریزوں کی حکومت میں مسلمان پُوری آزادی سے مذہبی فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے ان کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

چونکہ اس فتوے کے وقت مغل شہنشاہ بے بسی کی حالت میں انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی کوئی علیحدہ منظم تحریک نہ تھی۔ اس لیے اس فتوے کا کوئی فوری عملی نتیجہ نہیں نکلا تاہم

اس نے ایک انقلابی تحریک کو جنم دیا۔ جس کا مقصد حکومت الہیہ کا قیام تھا۔

تحریک مجاہدین

خاندان ولی اللہ نے اپنی دینی و علمی خدمات سے نہ صرف قوم میں نئی روح پھونک دی تھی بلکہ برصغیر میں دوبارہ احیائے اسلام کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک کی عملاً بنیاد بھی رکھی۔ جسے تحریک جہاد کا نام دیا گیا۔ سید احمد بریلوی کی یہ عظیم تحریک اسی خاندان کی برکات کا ثمر تھی جس نے مسلمانان ہند کی مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر دُور رس اثرات مرتب کیے۔

سید احمد ۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں ایک حسنی سید شاہ علم اللہ کے گھر پیدا ہوئے آپ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے۔ سید احمد ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے تاہم اس وقت کے دینی مدارس کا فرسودہ نظام تعلیم آپ کو اپنی جانب راغب نہ کر سکا۔ اس لیے ابتدائی دینی کتب اور قرآن مجید کے چند پارے پڑھنے کے بعد حصول تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر کچھ عرصہ تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ اسی اثنا میں طبیعت تحصیل علم کی جانب مائل ہوئی تو شاہ عبدالعزیز نے آپ کو شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولانا عبدالقادر کے پاس دہلی بھیج دیا۔ جہاں آپ نے صرف و نحو اور قرآن مجید کا اُردو ترجمہ بھی پڑھا۔ تحصیل علم کے بعد سید احمد نے شاہ عبدالعزیز کی بیعت کر لی۔

سید احمد کو مردانہ کھیلوں اور ورزشوں سے خاص شغف تھا۔ اس لیے ان کی طبیعت میں مہم جوئی کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لہٰذا سید احمد کو جب یہ معلوم ہوا کہ والئی ٹونک نواب امیر خاں انگریزوں کو سرزمین ہند سے نکالنے کے لیے برسرپیکار رہے تو انھوں نے ۱۸۱۰ء میں نواب کے لشکر میں بطور سوار ملازمت اختیار کر لی اور چھ سال تک فنون سپاہ گری کی تحصیل کی۔ اس عرصہ میں آپ نواب کے مشیر خاص کی حیثیت سے فوج کو انگریزوں کے خلاف تحریک دیتے رہے۔ تاہم ۱۸۱۶ء میں جب نواب اور انگریزوں میں مفاہمت ہو گئی تو آپ بھی دہلی واپس چلے آئے اور سلسلہ رشد و ہدایت شروع کر دیا۔ سید احمد کی باطنی پاکیزگی نے اس قدر روحانی مدارج طے کر لیے تھے۔ کہ جو شخص بھی آپ سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خاندان ولی اللہی کی نامور شخصیات شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحئی اور شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اس وقت برصغیر کے مسلمان جہالت کی تاریکی میں گُم تھے۔ ہندومت اور بُت مت اثرات مسلم معاشرے میں نفوذ کر گئے تھے چنانچہ سید احمد بریلوی نے اپنے رفقاء کار کے تعاون سے مُلک کے گوشے گوشے

میں اصلاح معاشرت کی کوششیں کیں جس سے بے شمار مسلمانوں نے مشرکانہ رسومات اور بدعات ترک کر دیں۔ شادی و غمی کی ہندوانہ رسوم متروک ہوگئیں اور بیواؤں کی شادیاں ہونے لگیں۔ ان تبلیغی دوروں میں ہی آپ نے پنجاب میں مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی داستانیں سُن کر ان کے خلاف جہاد کا ارادہ کر لیا مگر اس سے قبل آپ حج کرنا چاہتے تھے اس غرض سے ۱۸۲۰ء میں ۴۰۰ ساتھیوں کے ہمراہ کلکتہ روانہ ہوئے، راستے میں الہ آباد، بنارس، پٹنہ وغیرہ میں قیام کیا اور ہر جگہ تبلیغی کام جاری و ساری رہا۔ تین سال کی غیر حاضری کے بعد ۲۹، اپریل ۱۸۲۴ء کو واپس وطن تشریف لائے اور سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔

ملکی صورت حال

انیسویں صدی کے ربع اوّل میں برصغیر کے مشرق میں انگریز قابض ہو چکے تھے۔ جبکہ شمال مغرب میں پشاور سے کشمیر اور ملتان تک کے علاقوں پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا تسلط قائم ہو چکا تھا جس کے بعد پنجاب کے ان علاقوں میں سکھوں نے مسلمانوں پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے۔ ان کی مذہبی آزادی سلب ہو چکی تھی۔ مساجد گھوڑوں کے اصطبل بنائی جا چکی تھیں۔ باجماعت نماز تقریباً ممنوع تھی۔ کیونکہ اذان دینے پر پابندی تھی۔ گائے کے ذبیحہ کی مکمل طور پر ممانعت کر دی گئی تھی۔ سکھوں نے مسلمان عورتوں کو اغوا کر کے گھروں میں ڈال رکھا تھا۔ سید احمد نے شاہ اسمٰعیل کو ان زیادتیوں کا جائزہ لینے کے لیے خفیہ دورے پر بھیجا انھوں نے واپس آکر چشم دید حالات بیان کیے۔ چنانچہ سید احمد نے سکھوں کے خلاف جہاد کو قطعی شکل دینے کا مصمم ارادہ کیا۔

سفر جہاد

سید احمد کے جہاد فی سبیل اللہ کے اعلان کے بعد ابتداء میں مجاہدین کی فوج میں ۵۰۰ سپاہی بھرتی کیے گئے۔ چھ دن میں ہی یہ تعداد ہزاروں تک جا پہنچی تاہم اسے باقاعدہ فوج نہیں کہا جا سکتا کیونکہ سپاہی فنون حرب کے ماہر نہ تھے۔ اسلحہ بھی جدید نہ تھا اور نہ ہی وافر مقدار میں اخراجات کے لیے سرمایہ تھا۔ اس کے باوجود سید صاحب کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین تھا۔ پشاور کا علاقہ جہاد کے لیے موزوں ترین تھا۔ اس لیے وہیں سے جہاد کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۲۵ء میں سید احمد اپنے پانچ سات ہزار مجاہدین کے ہمراہ مالیر کوٹلہ، بہاولپور، حیدرآباد سندھ، درہ بولان اور قندھار سے ہوتے ہوئے کابل پہنچے اور وہاں سے براستہ خیبر، پشاور اور پھر نوشہرہ آئے۔

جہاد کا آغاز

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے سپہ سالار بدھ سنگھ کو لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ ۲۱، دسمبر ۱۸۲۶ء کو اکوڑہ کے مقام پر مجاہدین نے پہلے معرکے ہی میں سکھوں کو شکست سے دوچار کر دیا اس کے بعد خٹک، حضرو، شیدو اور نوشہرہ کی جنگوں میں بھی مجاہدین

کو پے در پے کامیابی حاصل ہوئی جس کے بعد ان علاقوں میں سید احمد کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ مجاہدین کی کامیابیوں سے خائف ہو کر رنجیت سنگھ نے پشاور کا شہر یار محمد اور سلطان محمد کے حوالے کر دیا اس سازش کا مقصد مسلمانوں میں خانہ جنگی کروانا تھا۔

رنجیت سنگھ کی چال رنگ لائی اب سید صاحب کو سکھ فوج ہی سے نہیں بلکہ حکمرانانِ پشاور کی فوج سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ آئندہ تین سال غیر فیصلہ کن حرب و ضرب میں گزرے۔ ۱۸۳۰ء میں مجاہدین نے پشاور بھی فتح کر لیا۔ جس کے بعد وہاں خلافت راشدہ کے مطابق حکومت قائم کر دی۔ نشہ آور اشیاء کے استعمال کی قطعی ممانعت کر دی گئی۔ فاحشہ عورتیں اپنا پیشہ چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ دختر فروشی کا سدِباب ہوا۔ غیر اسلامی رسومات اور بدعات کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ان اقدامات اور سلطان محمد کی سازش کے نتیجے میں قبائلی سردار کھلم کھلا سید صاحب کے خلاف ہو گئے۔ اس لیے سید صاحب نے مصلحتاً اپنا مرکز ضلع ہزارہ میں منتقل کر لیا۔ تاکہ اپنی قوت مجتمع کر کے کشمیر کی آزادی کی مہم شروع کر سکیں لیکن یہاں مقامی افغان سرداروں کی غداری سے مجاہدین بالاکوٹ کے مقام پر سکھ فوج کے نرغے میں آگئے۔ ۶ مئی ۱۸۳۶ء کو معرکہ حق و باطل برپا ہوا جس نے بدر و حنین کی یاد تازہ کر دی۔ اس معرکہ میں سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل نے داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ سکھ جرنیلوں مان سنگھ اور ہری سنگھ نے بالاکوٹ کے قصبہ کو آگ لگا کر فتح کا جشن منایا۔

تحریک مجاہدین سید احمد شہید کے بعد

سید احمد کی شہادت کے بعد آپ کے عقیدت مند مجاہدین ستھانہ کے مقام پر جمع ہو گئے۔ ستھانہ مجاہدین کا ایک ایسا مرکز بنا رہا۔ جہاں سے سکھ حکومت کے خاتمے کے بعد بھی انگریزوں کے خلاف مسلسل جہاد ہوتا رہا۔ ان مجاہدین نے جنگ افغانستان میں انگریزوں کے خلاف لڑائی کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہند میں مجاہدین نے صرف انگریز دشمن قوتوں کے ہاتھ مضبوط کیے بلکہ آئندہ سالوں میں انگریزی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا اور ان کے تین متواتر حملوں کو ناکام بنا دیا۔

سید احمد شہید نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے جس تحریک کا آغاز کیا۔ اس کے گہرے نقوش مٹنے نہ پائے اور توحید سنت کی تبلیغ کا سلسلہ لگاتار جاری رہا۔ آپ کی تحریک آزادی ہی کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھی اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں ایک اسلامی مملکت (پاکستان) کے حصول میں کامیاب و کامران رہے۔

تحریک کے مقاصد

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں نے اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کو اختیار کرنے کی تحریک چلائی وہاں انھیں ایک لحاظ سے حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت بھی کرنی پڑی۔ کیونکہ بالعموم حکمرانوں کو مصلحتہً یا ملکی ضروریات کے مطابق شریعت میں تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اس ضمن میں یہ خیال درست تھا۔ کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بدقسمتی رہی کہ مذہبی اصلاح، کافر فاتحوں کے خلاف نفرت وحقارت کے ساتھ لازم وملزوم ہوگئی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے علماء جس قسم کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے اور جس طرح کی سیاسی آزادی چاہتے تھے۔ اس کے لیے اب جبکہ ملک کے حالات بدل چکے تھے اور مغربی طاقت کے قدم شمالی ہند تک پہنچ گئے تھے۔ صرف اصلاحی تحریک کافی نہ تھی۔ بلکہ ایک انقلابی تحریک کی ضرورت تھی۔ شاہ ولی اللہ کے فکر اور ان کی تعلیمات نے بے شمار افراد کے ذہن وفکر میں اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ پھر شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ نے الگ ہلچل مچا دی تھی کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے اور انگریزوں سے جہاد مسلمانوں کے لیے فرض ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے ایک شاگرد سید احمد شہید نے شاہ ولی اللہ کے خیالات کو عملی جامعہ پہنانے اور ایک ایسا نظام جو اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو، قائم کرنے کے لیے ایک انقلابی تحریک شروع کی جس کا اصل مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔

اپنی تحریک کی ابتداء میں اولاً وہ ان تعلیمات کی تبلیغ کرتے رہے جو شاہ ولی اللہ کا مطمع نظر تھیں۔ اس میں وہ مسلمانوں کو احکام شریعت کی پابندی کرنے اور غیر اسلامی رسوم اور بدعتوں اور فرسودہ رواجوں کو ترک کرنے کی تلقین کرنے اور اس طرح دراصل جہاد کی دعوت کے لیے راہیں ہموار کرتے رہے۔ دعوت وتبلیغ کے لیے ایک مخصوص طریقہ شروع کیا گیا تھا۔ جو "محمدیہ" کہلایا۔ اس کی بنیاد ہی اسلام کی اولیت قرار دی گئی۔ جو نجد کے محمد بن عبدالوہاب اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ اور تیتو میر میں بھی مشترک تھی۔ اس بناء پر تمام مغربی مصنفین اور برطانوی حکومت ہندوستان کی ان تحریکوں کو بھی "وہابی تحریکیں" قرار دیتی رہی۔ ان تحریکوں میں چونکہ شدید احتیاط پسندی اور سیاست میں انقلاب پسندی مشترک تھی اور نجدی تحریک اور تحریک مجاہدین نے سیاسی جدوجہد کے میدان میں بھی کام کیا ہے۔ اس لیے سطحی نظر سے دیکھنے والے دھوکا کھاگئے کہ دونوں ایک ہی سلسلے کی تحریکیں ہیں۔ چونکہ ان تحریکوں کی مخالفت، دونوں ملکوں میں ایک کثیر طبقے نے کی، اس لیے انگریزوں نے اس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی ہر اصلاحی اور مذہبی نوعیت کی تحریک کو، جو انگریزوں کے مفاد کے

خلاف ہوسکتی تھی۔ بدنام اور غیر مقبول کرنے کے لیے اسے "وہابی تحریک" قرار دیا۔ تاکہ عوام نہ صرف اس سے دور رہیں بلکہ انگریزی مفاد کی صورتِ حال پیدا کریں۔ حالانکہ نجدی مجاہدین اور ہندوستانی مجاہدین کی تحریکوں کے فکر و عمل میں کئی لحاظ سے اس قدر فرق تھا کہ ان دونوں کو ایک نوعیت کی تحریک قرار دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً وہابی علماء صرف شریعت کے قائل تھے۔ اور انھوں نے طریقت یا تصوف کو غیر اسلامی سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ ان کے برعکس مجاہدین شریعت اور طریقت دونوں سے وابستگی رکھتے تھے۔ اور دونوں میں مناسب مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ان مجاہدین میں سر سید احمد کے ساتھی تھے۔ اکثر پُرجوش مصلحین بھی تھے۔ حقیقت میں جہاد کے لیے ان کا جوش و خروش ان کے مذہبی عقائد ہی کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے بعض ایسی اصلاحات کی تلقین کی تھی جو ہر ایک کی نظر میں قابلِ تعریف تھیں مثلاً بیواؤں کا نکاحِ ثانی، یا ایسی غیر اسلامی رسومات کو ترک کرانا جو مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر اختیار کر لی تھیں۔ یہ ان کی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس میں خاص طور پر صالح زندگی گزارنے اور اسلامی اصولوں پر شوق اور دلچسپی کے ساتھ عمل کرنے کی تعلیم و تلقین کی جاتی تھیں۔ اور جہاد، یعنی نیک مقصد کے لیے مسلح جدوجہد کے تصور پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کی دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کے لیے بے پناہ جاذبیت اور کشش تھی۔ چنانچہ ملک کے ہر گوشے سے انھیں افرادی تعاون حاصل ہونے لگا۔ مسلمانوں کی طرف سے انھیں دعوت نامے ملنے لگے اور ایک کثیر تعداد نے سید احمد کی قیادت کو قبول کر لیا۔ سید احمد نے ملک کے بہت سے حصوں کا سفر کیا۔ اور بیشتر مقامات پر قیام کیا۔ وہاں وہ بڑے بڑے مجموعوں کے سامنے۔ جو ان کی تقریر سننے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ وعظ و تلقین کرتے۔ بہت سے لوگ ان کے مریدوں کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ لوگوں کا یہی جوش و خروش تھا جو سید احمد کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اور جس نے جہاد کی تنظیم کو زیادہ مستحکم اور مؤثر بنا دیا۔ انھوں نے اپنے سفر سے واپسی کے بعد دہلی میں جہاد کے منصوبے کی نوک پلک درست کی اور اس مقصد کے لیے مستعد ہو گئے۔

سیاسی جدوجہد

سید احمد شہید نے اپنی جدوجہد کا منصوبہ دراصل اسی وقت بنا لیا تھا جب وہ ڈیڑھ سال عرب میں مقیم رہے۔ ایک اطلاع کے مطابق وہ قسطنطنیہ بھی گئے تھے۔ لیکن ترکوں کے حالات اس زمانے میں ایسے نہیں تھے۔ کہ وہ کسی قسم کی مدد کر سکتے۔ اور نہ کسی دوسری اسلامی حکومت کے حالات اس قسم کے تھے۔ چنانچہ خود سید احمد کو اپنے بل بوتے پر جہاد کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ ان کی سیاسی جدوجہد کا رُخ اولین مرحلے

پر پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف تھا۔ وہ علاقے ان کے خیال میں دارالحرب ہو چکا تھے۔ اور جہاں سکھوں کے مسلمانوں پر ظلم کرنے اور ان کی مذہبی آزادی میں خلل انداز ہونے کی خبریں عام تھیں۔ انگریزی حکومت نے مجاہدین کی مہم میں کسی قسم کی مزاحمت یا رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ حالانکہ جہاد کی تمام تیاریاں انگریزی علاقوں میں ہو رہی تھیں۔ انگریزوں کا رویہ بظاہر غیر جانبدارانہ رہا، لیکن در پردہ وہ خوش تھے۔ کیونکہ اس جنگ سے انھیں ہندوستان کی دو طاقتوں یا کم از کم ایک طاقت کے ختم ہو جانے یا کمزور ہو جانے کی توقع تھی جس کے بعد وہ فاتح اور مفتوح دونوں پر آسانی سے غلبہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن شاید وہ سید احمد کے حقیقی ارادوں سے باخبر نہیں تھے۔ کہ کسی طرح وہ چاہتے تھے کہ سکھوں کو شکست دے کر ان کے علاقے میں اپنی آزاد حکومت قائم کریں۔ تاکہ اسے بعد میں چھاؤنی بنا کر انگریزوں کے خلاف مزاحمت کریں اور جہاد کریں اور انھیں ہندوستان سے نکال دیں۔

پنجاب کی سکھ حکومت سے جنگ کا فیصلہ کافی غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ سکھوں کی حکومت ظالم تھی اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی درجہ عداوت رکھتی تھی۔ ان کی حکومت کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ بلکہ سکھ آئے دن اسی کوشش میں سرگرم تھے کہ اپنی حکومت کی سرحدوں کو پٹھانوں کے وطن تک وسیع کر دیں۔ مجاہدین کا خیال تھا کہ مُسلم اکثریت والے علاقے اور پٹھانوں کی مملکت کو آزاد کرا لیا جائے تو اپنی مزید سرگرمیوں کے لیے یہ علاقہ مرکز اور محفوظ پناہ گاہ بن جائے گا۔ اس حکمتِ عملی کے تحت مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ابتداء میں انھیں حوصلہ افزا کامیابی حاصل ہوئی لیکن جلد ہی رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ سکھوں نے قبائلی سرداروں میں سازشیں کیں اور پشاور کے سردار یار محمد کو مجاہدین سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یار محمد پہلے تو سید احمد کو زہر دلانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے بعد اس نے میدانِ جنگ میں اپنے اتحادیوں سے غداری کی۔ سید احمد کی جو زہر سے محفوظ رہے تھے۔ اپنی مداخلت کے لیے قبائلیوں سے جنگ لڑنی پڑی۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور پشاور سے سید احمد کی قیادت کو دوبارہ تسلیم کیا۔ سکھوں سے پھر ہو گر منگ اور مظفر آباد کے مقامات پر لڑائی ہوئی جس میں مقامی آبادی نے سید احمد کا ساتھ دیا مگر اس مہم کا خاتمہ قریب آ گیا۔ کسی مقامی شخص نے سکھوں کو بالاکوٹ کا جو ان دنوں مجاہدین کا صدر مقام تھا۔ ایک متروک اور خفیہ راستہ بنا دیا اور وہ اس راستے سے ان پر حملہ آور ہوئے۔ مجاہدین نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنا دفاع کیا مگر چونکہ سکھوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ خود اس حملہ کے لیے تیار نہیں تھے، پھر سکھوں کے پاس سامانِ جنگ بھی وافر تھا۔ چنانچہ چھ سو مجاہدین شہید ہوئے، جن میں سید احمد اور ان کے خاص

نائب اور رفیق شاہ اسمٰعیل بھی شامل تھے۔

یہ جہاد برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں بے مثال [illegible] یہ پہلی عوامی تحریک تھی جو سیاسی فرض شناسی اور اضطراب سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا مقصد کسی تخت کو واپس لینا یا کسی خاندان کو دوبارہ برسرِ اقتدار لانا نہیں تھا بلکہ اپنے ہم مذہبوں کو غلامی اور ظلم سے نجات دلانا اور پھر مغربی اقتدار کے بڑھتے ہوئے قوموں سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس کے پسِ پشت ذاتی اغراض اور مفادات موجود نہیں تھے۔ یہ تحریک ایک قوم اور عوام کے بل پر چل رہی تھی۔ کسی حکومت یا فرمانروا کے زور پر نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے شعور سے پیدا ہوئی تھی جس کو ایک مفکر عالم شاہ ولی اللہ نے اپنی تعلیمات سے عام کیا تھا۔ یہ تحریک اپنی زبردست مشکلات کی وجہ سے ناکام ہو گی۔ مجاہدین شمالی علاقوں کے دُور دراز پہاڑوں میں لڑ رہے تھے لیکن انھیں کمک بہار، کلکتہ اور جنوبی ہند جیسے دُور افتادہ علاقوں سے پہنچتی تھی۔ پھر جن مجاہدین نے جنگ کی وہ مصلح بھی تھے اور اپنے عقائد کے معاملے میں کڑ بھی۔ بعض مقامات پر اگر وہ چاہتے تو اپنے اتحادیوں کو خوش رکھنے کے لیے مصلحتہً عقائد کی سختی میں نرمی پیدا کر کے زیادہ یقینی کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن عقائد کے جوش میں انھوں نے اسے درست تسلیم نہیں کیا۔ پھر اس بات کا بھی امکان تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جائے تو انگریز ضرور مداخلت کرتے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی طاقت کے عروج کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے جو اسلامی اقتدار کے احیاء کا تہیہ کر چکی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناکامی ان کے لیے ناگزیر تھی۔ وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل نہیں کر سکے مگر اپنے نقشِ قدم پر چلنے کی ایک شدید اور دیرپا خواہش مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے۔

رفقاء کی طویل جدوجہد

سیّد احمد کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے دیگر رفقاء اور پیروؤں نے اس کو بیسویں صدی کے نصف اوّل تک جاری رکھا۔ انگریزوں نے ۱۸۴۵ء میں سکھوں کو جنگ میں شکست دی تو ان کے قدم پنجاب میں بھی جم گئے۔ انگریزی افواج لاہور میں مقیم ہو گئیں۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کو کشمیر کا حاکم بنا دیا۔ چنانچہ مجاہدین، جو حادثہ بالاکوٹ کے بعد سوات اور صوبہ سرحد کے دیگر مقامات پر بس گئے تھے۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستان آئے یا ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور بیشتر وہیں مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ انگریزوں کے اس نئے اقتدار کا نتیجہ تھا کہ اب مجاہدین کا تصادم براہِ راست انگریزوں سے ہو۔ ابتداء میں تو انگریز اس امر پر کچھ زیادہ فکر مند نہ ہوئے کہ رنجیت سنگھ مجاہدین کے ساتھ جنگ میں مشغول ہے۔ لیکن جب سکھوں کی جنگ ختم ہو گئی تو

اس قسم کی تحریک جاری رہتا کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان جھڑپوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ جھڑپیں ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک مستقل جاری رہیں۔ ان لڑائیوں کے لیے مجاہدین کے ہم خیال بہار، بنگال اور دور دراز علاقوں سے خفیہ طور پر سپاہی اور چندے بھیجتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پٹنہ میں محلہ صادق پور کو مسمار کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ تحریک کا مرکز تھا۔ پھر بھی مجاہدین کے لیے بھرتی جاری رہی اور چندے جمع ہوتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی مجاہدین نے سرگرم حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۷ء میں بھی مجاہدین پر انگریزوں کی لشکر کشی کا ذکر ملتا ہے۔ ان مہموں کو سر کرنے کے لیے انگریزوں نے علیحدہ علیحدہ سولہ باضابطہ فوجی مہمیں بھیجیں جن میں باقاعدہ فوج کی تعداد تئیس ہزار تھی۔ آخری شدید مراحل پر ان فوجی مہموں کی تعداد بیس تک اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ یہ آخری مہمیں تھیں۔ جن کی تفصیل ملتی ہیں۔ لیکن ان مہموں کے بعد انگریزی حکومت اور فوج مجاہدین کی تحریک کا خاتمہ نہ کر سکی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف اوّل تک مجاہدین نے انگریز حکومت کے خلاف گاہے بگاہے اپنی جرأت اور شدت کا اظہار کیا۔ اس دوران بہت سے مجاہدین انگریزوں کے خلاف بعض انقلابی تحریکوں میں شامل ہو کر بھی اپنے مقاصد پورے کرتے رہے۔

جہاد کی ان مہموں کا جو انجام ہوا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ غلط اندیشی پر مبنی تھی یا انھیں حمایت حاصل نہیں تھی۔ مگر یہ صحیح ہے کہ مجاہدین کی راہ میں بعض شدید مشکلات حائل تھیں۔ انھوں نے ان لوگوں سے جہاد کا عزم کیا تھا جو طاقت میں ان سے کئی گنا زیادہ اور فنونِ جنگ اور سامانِ حرب سے پوری طرح لیس تھے۔ پھر انھوں نے ان حالات پر غور نہیں کیا جو قبائلی علاقوں میں جاری و ساری تھے۔ مجاہدین کی آمد سے قبل یہ علاقے بدنظمی اور لاقانونیت کے میدان بن چکے تھے۔ وہ اس علاقے کے لیے مزید جنگ کی صورتِ حال کا سبب بنے۔ یہ واقعہ ہے کہ مجاہدین کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں لڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر بار کو ایک بلند مقصد کے ترک کیا تھا۔ یہ مقصد اس مسلم علاقے میں ایک اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ جہاں غیر مسلموں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ ایسا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ان علاقوں میں، جنھوں نے سید احمد کی قیادت کو تسلیم کر لیا ہے۔ قوانین شریعت پوری طرح نافذ نہ کیے جائیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ اکثر قبائلی جاہل ہیں۔ اور اکثر اپنے قدیم اخلاقی معیار اور رواجوں کو شریعتِ اسلامی سمجھتے ہیں۔ ان عادات کو ایک دو دن میں نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ جن لوگوں پر دوسرے رواجوں اور خیالات کا

غلبہ ہو۔ انھیں سچا مسلمان بنانے کے لیے پہلے ابتدائی کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض مشکلات اور بھی تھیں جو اس صورتِ حال میں بنیادی طور پر مؤثر تھیں۔ انتقام کی روایت قبائلیوں میں ایک طویل عرصے سے قائم ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے درمیان مسلسل خانہ جنگی اور عداوتیں جاری رہتی ہیں۔ کسی موقع پر بھی ان کے لیے یہ دشوار ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک مشترک دشمن کے خلاف متحد ہوں۔ سکھوں نے ان کے اس مزاج سے فائدہ اٹھایا اور مجاہدین کے لیے یہ سخت رکاوٹ ثابت ہوا۔ سکھوں کو قبائلیوں کے اتحاد ہی سے فتح کیا جا سکتا تھا، مگر وہاں صورت یہ تھی کہ اگر ایک قبیلہ سید احمد کا ساتھ دیتا تھا تو دوسرا قبیلہ محض اسی وجہ سے ان کا مخالف ہو جاتا تھا۔ پھر سکھ بھی کوئی کمزور دشمن نہیں تھے۔ وہ اپنی طاقت کے ایک ایسے نشے سے سرشار تھے۔ جس نے حال ہی میں اپنے ایک نئی ریاست قائم کی تھی۔ اور ساتھ ہی ان کی فوج جدید سامانِ جنگ سے لیس تھی۔ جسے مشتاق یورپی سپہ سالاروں نے تربیت دی تھی۔ اس کے برعکس مجاہدین کا انحصار خفیف آمدنی پر تھا جو انھیں عطیات کی صورت میں ہندوستان سے بھیجی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ لوگ ایک ایسے علاقے میں جنگ کر رہے تھے جو ان کے گھروں سے سینکڑوں میل دور تھا اور جو چندے جمع کیے جاتے تھے۔ ان کو میدانِ جنگ تک پہنچانے کی راہ میں ہر قسم کی دشواریاں درپیش تھیں۔ یہ ان کا محض انتہائی جوش اور جذبہ تھا جس نے انھیں دینی مدارس میں درس و تدریس اور خانقاہوں میں روحانی تربیت کے ماحول سے نکال کر نہایت طاقتور اور منظم فوج کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان عناصر نے ان کے جوش و خروش کو تاریخ کی ایک انتہائی المناک اور افسانوی مہم بنا دیا۔

فرائضی تحریک

"تحریک مجاہدین" کے انداز کی ایک اور تحریک جس نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں پر کاری ضرب لگائی۔ بنگال میں فرائضی تحریک تھی۔ یہ کئی اعتبار سے شاہ ولی اللہ اور مجاہدین کی تحریک سے مماثلت رکھتی تھی۔ اسے حاجی شریعت اللہ نے شروع کیا۔ اس کا اہم مقصد ان رسوم و عقائد کی اصلاح کرنا تھا۔ جنھیں مسلمانوں نے غیر مسلموں سے روابط کے باعث اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات کی جانب متوجہ کر دیا۔ فرائض کی پابندی اور بجا آوری پر زور دیا۔ ان تمام رسومات اور تقریبات جن کی سند قرآن اور حدیث سے نہ ملتی تھی۔ بدعت قرار دے کر ترک کرنے کی تلقین کی۔ بہت جلد اس تحریک نے بنگال کے ایک وسیع علاقے میں اپنے لاتعداد

پیروؤں کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار کر لی جو اسلام کے عائد کردہ فرائض کی تکمیل کو مقدم سمجھتے اور اس لیے وہ "فرائض" کہلاتے۔ اس تحریک کا نمایاں اثر یہ تھا کہ مسلمانوں میں ہندوؤں اور ان کے تسلط کے مقابلے میں انفرادیت، اعتماد اور برتری کا احساس پیدا ہوا۔ اور ان کی زندگی اور عمل میں سادگی، ایمانداری اور اسلامی شعائر سے قرب اور لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ تحریک اپنی نوعیت کے لحاظ سے اسلامی ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بہت مقبول ہو گی۔ اس کی مقبولیت اور وسعت کے بعد اس میں ضرورتاً ایسی خصوصیات بھی شامل ہوگئیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک کے مقاصد سیاسی بھی تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے یہ فتویٰ دیا تھا۔ کہ بنگال اب دارالسلام، یعنی وہ جگہ جہاں اسلام کو پورے طور پر عمل دخل حاصل ہو اور فرائض بہ آسانی ادا کیے جا سکیں۔ نہیں رہا۔ اس لیے عیدین اور جمعہ کی نماز اب مناسب طریقے پر باجماعت ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس فتوے سے حاجی شریعت اللہ کا مقصد اپنے پیروؤں اور عام مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اس تحریک کی قیادت ان کے فرزند محمد محسن دودو میاں کے سپرد ہو گی۔ انھوں نے اس تحریک کو باقاعدہ منظم سرگرم اور فعال سیاسی طاقت اور سماجی تبدیلیوں کی محرک و آئینہ دار بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ایک دوسری تحریک جس نے انیسویں صدی کے ابتدائی وسط میں بنگال کے مسلمانوں کو متحرک کیا۔ ان میں جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ اور انھیں انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف نبرد آزما کیا۔ تیتو میر کی تحریک تھی۔ یہ تحریک فرائضی تحریک کے دور میں شروع ہوئی اور ایک حد تک شمالی ہند کی عظیم تحریک مجاہدین سے تعلق رکھتی تھی۔ اس تحریک کا آغاز بھی فرائضی تحریک کی طرح مذہبی اصلاح کے مقصد سے ہوا۔ اور بعد میں اس نے عوامی اور سیاسی تحریک کی شکل اختیار کی۔ اس کو بھی بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس نے عام مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کر دی۔ جو انھیں اپنے مختلف حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرتی تھی۔ پھر ان کے خلاف انگریزوں اور ہندوؤں کی ناانصافیوں نے ان کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا تھا۔ تیتو میر نے انگریزی حکومت کے خاتمے اور دوبارہ اسلامی سلطنت کے قیام کا نعرہ بلند کیا تو اس سے بغاوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر تیتو میر نے باقاعدہ اپنی متبادل حکومت کے قیام کا اعلان بھی کر دیا۔ اور محصول خود وصول کرنے لگے۔ انگریز اس متبادل حکومت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ اور پھر جو خود ان کے لیے ایک سنگین خطرہ بن سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی فوجی طاقت کے مقابلے میں اس تحریک کا کیا انجام ہوتا۔ مسلمانوں کا ایک ہجوم، جن کے پاس

اسلحہ ناکافی تھا اور غیر تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک باقاعدہ منظم اور کثیر فوج کے سامنے کامیابی کا کوئی امکان نہیں رکھ سکتا تھا۔ تیتو میر کا جو انجام ہوا۔ اس نے ان کے پیروؤں کو اس سے باز نہیں رکھا کہ وُہ ان کی تعلیمات اور مقاصد کو بنگال مسلمانوں میں برابر پھیلاتے رہیں۔

یہ دونوں تحریکیں دین کی اصلاح سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ سیاسی بنتی گئیں۔ حالات نے ابتداءً مسلمانوں کو پہلے ہندوؤں اور پھر انگریزوں کے خلاف صف آراء کیا تھا۔ یہ پہلی تحریکیں تھیں جو ایک تو عوامی سطح پر شروع ہوئی تھیں۔ اور پھر ان کا رُخ اعلانیہ ایک غیر ملکی حکومت کی طرف تھا۔ انتہائی مجبوری کے باوجود مسلمانوں کا یہ بڑا ہی جرأت انگیز قدم تھا۔ جو انگریزوں کے خلاف اٹھایا گیا۔ ان کی اصلاحات ایسی تھیں کہ ان کی وجہ سے مسلمان اب عملاً ایک ایسی زندگی گزار رہے تھے جو اسلام کے معیار و مقصود سے قریب تر تھی۔ سیاسی سطح پر ان تحریکوں نے مسلمانوں کو اس طرح جھنجوڑا تھا کہ اب ان میں انگریزی عملداری کے خلاف شدید جذبہ اور آزادی کے لیے فعال تصور پیدا ہو گیا۔ چُنانچہ اس کے بعد وہ کبھی اپنی صورت حال پر مطمئن نہ رہے اور ان کا یہ جوش اور جذبہ، بعد میں شروع ہونے والی مزاحمتی تحریکوں کی صورت میں نمودار ہوتا رہا۔

جنگ پلاسی

محمد شاہ کے زمانے میں دہلی کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے صُوبوں نے اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ بنگال میں وہاں کے صُوبے دار علی وردی خان نے بھی اپنی آزاد حکومت کی بُنیاد ڈالی۔ اس کے عہد میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ہندوستان کی سیاست میں عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس کی موجودگی میں یورپی طاقتیں بنگال کو اپنی حکمتِ عملی کا شکار نہ بنا سکیں۔ لیکن اس پر بھی علی وردی خان ان کے عزائم سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے اپنے پوتے سراج الدولہ کو وصیّت کی تھی کہ انگریزوں کو اپنے علاقے میں فوج رکھنے یا قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ سراج الدولہ بھی، جو اس کے بعد بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ انگریزوں کے استعماری عزائم سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ انگریزوں کا رویّہ بھی سراج الدولہ سے بے حد مخالفانہ تھا اور وہ اس کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ انھوں نے کلکتہ کے قلعے کو سراج الدولہ کی مرضی کے بغیر مستحکم کرنا شروع کر دیا اور چند نئے قلعے اور مورچے تعمیر کیے، مخالفین کو اپنے ہاں پناہ دی اور عمالِ سلطنت کو بغاوت پر ابھارا تو ان کی ایسی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور فریب کاریوں سے مجبور ہو کر سراج الدولہ نے بنگال سے ان کو نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن وہ ہر طرح کے اشتعال کے باوجود پہلے اس کوشش میں رہا کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں۔ اس لیے انگریزوں کو مصالحت پر آمادہ

کرنے کی کوشش کی لیکن وہ خود سراج الدولہ کو اپنے راستے سے ہٹا دینے کے درپے تھے۔

سراج الدولہ کو انگریزوں کی درباری سازشوں کا علم تھا۔ ان حالات میں اس کا انگریزوں سے عناد رکھنا نقصان دہ ہوتا۔ چنانچہ اس مرحلے پر اس نے وقتی طور پر ان سے مصالحت کرلی۔ جس کی شرائط انگریزوں کی موافقت میں تھیں۔ چنانچہ انگریزوں کو مزید اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے سراج الدولہ کے خلاف سازشوں کا ایک جال بچھا دیا۔ جب ایک بھرپور اور مؤثر سازش مکمل ہوگئی۔ سراج الدولہ کے دربار کے تمام سازشیوں سے سراج الدولہ کو انگریزوں سے لڑنے کا مشورہ دلایا گیا۔ سراج الدولہ کو اپنے امیروں اور فوجی افسروں کی سازش کا پتہ چل چکا تھا اور اسے ان پر اعتماد نہ تھا۔ اس نے فرانسیسیوں سے مدد لینی چاہی لیکن ناکام رہا۔ اس نے مرہٹوں سے بھی مدد طلب کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دہلی کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔ لیکن وہاں سراج الدولہ کے لیے کیا رکھا تھا۔ اودھ نے بھی اس کی درخواست پر توجہ نہ دی۔ بیرونی امداد سے مایوس ہوکر اس نے اپنے سرداروں کو انگریزوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرنا چاہا، میر جعفر اور دوسرے سازشی سرداروں نے اس کے "وفادار" رہنے کی قسم کھائی۔ چنانچہ سراج الدولہ نے پلاسی کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ لیکن ناکامی اس کا مقدر تھی۔

پلاسی کی جنگ یقیناً دُنیا کی چند اہم اور فیصلہ کن جنگوں میں سے ہے۔ اس سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا خاتمہ اور عہد جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد انگلستان کے لیے ہندوستان میں سیاسی فتوحات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ پلاسی کی فتح ان کی پہلی اہم کامیابی تھی۔ جو دراصل بہتر اسلحہ یا بہتر طریقِ جنگ یا شجاعت و مردانگی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ انگریزوں کی مکاری، سازشوں اور عہد شکنیوں کی فتح تھی۔ اس کامیابی نے بنگال کو مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ حکومت کے ساتھ ساتھ تمام ذرائع آمدنی بھی ان کے قبضے میں چلے گئے۔ حکمران ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔ بنگال کی ہی مالی اور فوجی مدد کی بدولت انگریزوں نے ایک طرف جنوبی ہند میں فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے علاوہ ہندوستان کو شکستیں دیں اور دوسری طرف شمالی ہند کی جانب آگے بڑھے۔ اس جنگ کی کامیابی نے کمپنی کے خاص تجارتی دور کا خاتمہ کیا۔ اب تک ایک وسیع خطۂ ملک ہاتھ آجانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہوا۔

انگریزوں کے مقابلے میں یہ ہماری پہلی شکست تھی۔ اس شکست سے ہندوستان کا ایک بڑا محاذ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد کبھی حکمران میں انگریزوں کے خلاف خود اعتمادی نہ رہی۔ انگریزوں کو یقین ہوگیا کہ وہ سارے برعظیم پر قابض ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس مُلک پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے

کے لیے رفتہ رفتہ برطانیہ اور برعظیم کے درمیان تمام اڈوں اور ممالک میں اپنی سیاسی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور یوں مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک ان کے جوڑ توڑ اور سازشوں کا شکار ہو گئے۔ گویا پلاسی کی شکست دراصل تمام عالمِ اسلام کی ذلت اور غلامی کا سبب تھی۔ اس کے فوری بعد انگریزی مقبوضات میں گاہے گاہے معمولی سی بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن ان کے اثرات بڑے محدود رہے۔ ان مسلح بغاوتوں سے بھی انگریز خاصے پریشان رہے۔ لیکن ان کے بعد کی ایک اہم ترین مزاحمت اور جنگ جس کے اثرات پلاسی کی جنگ سے کچھ کم نہیں رہے۔ ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی تھی۔ جو دو دہائیوں تک انگریزوں کے لیے نہایت پریشان کن رہی۔

ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی

جنگِ آزادی میں کامیابی کے بعد انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کے سامنے تین بڑی رکاوٹیں تھیں۔ حیدر علی۔ نظام اور مرہٹے۔ نظام نے ابتداء ہی سے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ مراسم کر رکھے تھے۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست کے بعد متحدہ قوت کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ ان دونوں کے برعکس حیدر علی ایک تازہ دم قوت کی صورت میں ابھرا تھا۔ اور انگریزوں کی فتوحات کے راستے میں ایک سنگین رکاوٹ بن گیا تھا۔ انگریزوں نے اس نئی اُبھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لیے مرہٹوں اور نظام سے گٹھ جوڑ کیا اور حیدر علی کے خلاف بے وجہ اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ میسور اور انگریزوں کے درمیان لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ حیدر علی کی بے وقت موت کے بعد اس کے بیٹے ٹیپو نے اس کی جگہ لی۔ وہ ایک لائق منتظم اور جوان ہمت مجاہد ثابت ہوا۔ وہ اپنے باپ کی طرح برعظیم کی نجات اس میں سمجھتا تھا کہ انگریزوں کے قدم یہاں جمنے نہ پائیں۔ اس میں اس قدر پیش بینی تھی کہ اس نے پہلے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ برعظیم کے حکمرانوں اور سرداروں سے انگریز اقتدار چھین لیں گے۔ اس نے اپنی ساری جدوجہد سے ثابت کر دیا کہ وہ مغرب کی بڑھتی ہوئی طاقت کے حقیقی اسباب کا فہم و ادراک رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض نہایت مفید اور ضروری اصلاحات نافذ کیں۔ اس کی بری اور بحری فوجوں کا انتظام قابلِ داد تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ جانتا تھا کہ انگریز اپنی بحری قوت کی وجہ سے برعظم میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اس لیے اس نے بحری قوت کی طرف خاص توجہ دی۔ وہ ایک ایسا بحری بیڑہ رکھنا چاہتا تھا جو دکن کے ساحل کی پوری طرح حفاظت کر سکے۔ برعظیم کو [illegible] سے بچانے کے ٹیپو چاہتا تھا کہ بصرہ، نوشہرہ، عمان اور عدن میں ہندوستانی جہازوں

کے اڈے بنائے جائیں۔ ٹیپو نے انگریزوں کو برعظیم سے نکالنے کے لیے اپنے ہمسایوں کے ساتھ ایک محاذ بھی بنانا چاہا۔ لیکن اس کے ہمسایوں نے اسے ہمیشہ مایوس کیا۔ جب اس کو اس امر کا یقین ہوگیا کہ مرہٹے اور نظام انگریزوں کی چالوں کو نہیں سمجھتے اور وہ آئے دن اُن کے جنگل میں جکڑے جا رہے ہیں۔ تو اس نے اندرونی امداد سے مایوس ہو کر بیرونی روابط کی طرف توجہ دی۔ ٹیپو کو اس امر کا یقین تھا کہ ہندوستان پر انگریزی قبضہ برقرار رکھنے کے لیے برطانیہ کو مشرقِ قریب کے اسلامی ملکوں پر بھی ایک نہ ایک دن قابض ہونا تھا۔ اس نے اس قدر زبردست دشمن کو ختم کرنے کے لیے ابتداءً شاہ فرانس سے اور بعد میں نپولین سے خط و کتابت کی اور انھیں انگریزوں کے مقاصد بتاتے ہوئے ان سے فوجی امداد طلب کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے پہلے اپنی سفارشات لوئی ہفتم اور پھر دوسری مرتبہ مارشلیس بھیجی۔ ان سفارتوں کے نتیجے میں ٹیپو اور فرانس کے درمیان وسیع پیمانے پر فوجی معاہدہ کرنے کی تجویز زیرِ غور آئی۔ ٹیپو نے سلطانِ ترکی کی خدمت میں سفارت بھیجی۔ اس سفارت کا مقصد خلیفۃ المسلمین سے اپنی حکومت کے لیے شاہی سند حاصل کرنا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے انگریزوں کے اثر نے شاہ عالم سے ایسی سند ملنے نہیں دی تھی۔ یہ سند دراصل ایک آئینی منظوری تھی۔ جس کے تحت کوئی شخص قانوناً حکومت کر سکتا تھا۔ ورنہ دیندار مسلمان ایسے حکمران کے کامل وفادار نہ ہوتے تھے جس کے پاس یہ سند نہ ہو۔ ٹیپو کو خلیفۃ المسلمین سے ایسی سند مل گئی۔ سلطانِ ترکی کی خدمت میں سفارت بھیجنے کا دوسرا مقصد ٹیپو کا سلطنتِ عثمانیہ سے انگریزوں کے خلاف فوجی امداد بھی حاصل کرنا تھا۔ برطانیہ کی حکمتِ عملی اور سازش نے سلطان ترکی کو ٹیپو کی مدد کرنے نہیں دی۔ عثمانیوں سے مایوس ہو کر ٹیپو نے ایران میں سفارت بھیجی۔ لیکن یہاں بھی برطانیہ کے اثر نے کامیابی نہ ہونے دی۔ افغانستان کے حکمران شاہ زمان نے ٹیپو کی دعوت قبول کرلی اور اس کی مدد کے لیے لدھیانہ تک پہنچ گیا تھا کہ انگریزوں نے ایران کے ذریعہ افغانستان پر حملہ کرا دیا۔ جس کی وجہ سے واپس جانا پڑا۔ اس عرصے میں انگریزوں نے دربار میں ٹیپو کے خلاف ایک بہت مضبوط سازشی جال بچھا دیا جس کی وجہ سے سلطان داخلی اور خارجی معاملات میں گھر گیا۔ وہ سازشوں سے ایک حد تک واقف تھا لیکن وہ سازشیوں کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس طرح خانہ جنگی کا اندیشہ تھا۔ اس کے بعد کی ساری داستان غداریوں سے بھری ہوئی ہے جس کا انجام ٹیپو کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ٹیپو نے اپنے ہر عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ اسے مستقبل کا حقیقی فہم و ادراک ہے۔ چنانچہ اس نے ساری جدوجہد کو انگریزوں کے خلاف مزاحمت میں صرف کر دیا۔ لیکن اس کے مقدر میں کامیابی نہ تھی۔

کیونکہ اسے زبردست مشکلات کا سامنا تھا۔ کم از کم اسے یہ اطمینان ضرور ہو گا کہ اس نے اپنی کوشش میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی اور اپنے حدودِ مملکت کے دفاع میں لڑتے ہوئے جان دی۔ اس کے بعد برعظیم کے حکمران طبقے میں کوئی ایسا شخص نہ ہوا۔ جس نے اپنے مُلک کے تحفظ کے لیے اس قدر شدید مزاحمت کی ہو اور اس کی مزاحمت کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین بنا لیا ہو۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی غرض سے برصغیر پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حکومت تقریباً تمام برصغیر میں پھیل گئی۔ مغلوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ بن کر رہ گیا۔ اس کی عملداری صرف قلعہ دہلی تک محدود تھی اور وہ بھی صرف اس کی ذات تک، کیونکہ اسے باقاعدہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ اس کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا ہو گا۔ اور وہ اپنے نام کے ساتھ بادشاہ کا لفظ استعمال نہ کر سکے گی۔ لہٰذا برصغیر کے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ برصغیر سے ملکی حکومت کو ختم کر کے اسے براہ راست تاجدار برطانیہ کی غلامی میں دے دیا جائے گا۔ اس طرح سے لوگوں کے دلوں میں وطن پرستی اور حبِ قومی کے خیالات جوش مارنے لگے۔ انھوں نے برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ایک بار پھر کوشش کی۔ اس کوشش کو "جنگ آزادی" کا نام دیا گیا۔

جنگ آزادی کے اسباب

۱۔ سیاسی وجوہات ۲۔ معاشرتی وجوہات ۳۔ مذہبی وجوہات ۴۔ معاشی وجوہات۔
۵۔ فوجی وجوہات۔

۱۔ سیاسی وجوہات

۱۔ اصول الحاق لارڈ ڈلہوزی دیسی ریاستوں کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک پالیسی بنائی اور طے کر دیا۔ کہ جس مقامی حکمران کا وارث نہ ہو۔ اس کو متبنٰی بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ نیز جس علاقہ میں بدانتظامی ہو اس کو انگریزی حکومت میں مدغم کیا جا سکے گا۔ اس نئی پالیسی کو اصول الحاق کا نام دیا گیا۔ اس پالیسی کا اطلاق ریاست اودھ۔ جھانسی کی رانی، بہادر شاہ ظفر ہوا۔ اودھ کے نواب جس کو کمپنی بادشاہ تسلیم کر چکی تھی، معزول کر

دیا گیا۔ اور اودھ کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس کا اخلاقی و سیاسی اعتبار سے کوئی جواز نہ تھا۔ اس کی وجہ سے عوام میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے دھمودھر راؤ کو اپنا متبنیٰ بنایا۔ متبنیٰ بنانا ہندوؤں کے مذہبی فرائض میں شامل تھا۔ انگریزوں نے اس پر اعتراض کیا اور اس کی اجازت نہ دی لکشمی بائی انگریزوں کے خلاف ہو گئی۔ پیشوا باجی راؤ کے متبنیٰ نانا صاحب کی دس ہزار پونڈ سالانہ پنشن بھی بند کر دی گئی۔ اور بہانہ یہ بنایا کہ پیشوا اتنی بھاری جائیداد چھوڑ کر مرا ہے۔ کہ نانا صاحب کو مزید روپے کی ضرورت نہیں۔ نانا صاحب نے عظیم اللہ خان کو اپنا وکیل بنا کر انگلستان بھیجا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ بادشاہ شاہ ظفر کی خدمت میں انگریز نمائندہ نذرانہ پیش کیا کرتا تھا۔ وہ بھی اس قانون سے محفوظ نہ رہا۔ انگریزوں نے بادشاہ پر واضح کر دیا کہ آپ کے بعد شہنشاہی ختم ہو جائے گی اور بادشاہ کی اولاد کو قلعہ سے باہر سکونت اختیار کرنا پڑے گی۔ اس بات کا کوئی اخلاقی جواز نہ تھا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

ب۔ والیاں ریاست کی ناراضگی اصول الحاق کی پالیسی والیاں ریاست کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ چارلیس نیپر کے ہاتھوں سندھ کی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ حیدر آباد سے برار کا صوبہ چھین لیا گیا۔ منی کے راجہ کی ریاست میں ۱۵۸ دیہات تھے۔ جن میں سے ۱۱۶ کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ والیاں ریاست نے محسوس کیا کہ ان کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی۔

ج۔ جاگیروں کی ضبطی مغلیہ عہد میں اشراف جاگیریں دی جاتی تھیں۔ یہ جاگیریں ذریعہ آمدنی ہونے کے علاوہ وجہ عزت بھی ہوتی تھیں۔ انگریزوں نے ایسی ۲۰ جاگیریں ضبط کر لیں۔ یعنی ۲۰ ہزار معزز امراء اور ان کے متعلقین ان کے خلاف ہو گئے۔ انھوں نے بندوبست دوامی میں مالیہ اکٹھے کرنے والے ہندو ٹھیکیداروں کو اراضی کا مالک قرار دے کر رہی سہی جاگیروں کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ یہی جاگیردار جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے قائد تھے۔

۲۔ معاشرتی وجوہات

د۔ مقامی باشندوں سے توہین آمیز سلوک کمپنی کی حکومت نے ابتدا ہی سے نسلی امتیاز کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ ہر معاملے میں گورے کو کالے پر ترجیح دی جاتی تھی۔ سر سید احمد خاں اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے

اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں جیسی ایک چھوٹے یورپین کی ایک بڑے ڈیوک کے سامنے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ایک اشراف اہلکار کے سامنے شل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی سے دل میں روتا ہے۔ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔

ب۔ ثقافتی ورثے کی تضحیک ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے ماضی پر کیچڑ اچھالا گیا۔ ان کی تاریخ کو ظالمانہ قرار دیا گیا۔ اور ڈمیکالے نے لکھا کہ مشرقی علوم کے تمام ذخائر اتنی اہمیت بھی نہیں۔ جتنی مغربی علوم کی ایک کتاب کی۔ ان چیزوں کا ردعمل ناگزیر تھا۔ کیونکہ یہاں کے ہندو اور مسلمان سبھی اپنے اسلاف کی قدر کرتے تھے۔

ج۔ مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی انگریزوں نے برصغیر کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے وہ انھیں اپنا دشمن گردانتے تھے اور انھیں معاشی طور پر تباہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ عیسائی مشنریوں کو بھی مسلمانوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑھ رہا تھا اور اپنی عظمت ماضی کو بحال کرنے کے خواہش مند تھے۔

۳۔ مذہبی وجوہات

(الف) عیسائیت کی تبلیغ انگریزی حکومت نے اپنے ابتدائی دور میں عوام کے مذہبی جذبات کو مطمئن رکھنے کے لیے عیسائی مشنریوں کو برصغیر میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن ۱۸۱۳ء کے بعد یہ پالیسی بدل لی گئی۔ برصغیر میں عیسائی مشنری قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی اور ان کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوگئی۔ انگریز افسر خود عیسائی لٹریچر تقسیم کرتے تھے۔ تبدیلی مذہب کو سہل تر بنانے کے لیے حکومت نے قانون وراثت میں تبدیلی کر دی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس قانون کو منسوخ کر دیا جس کی رُو سے کوئی شخص تبدیلی مذہب کے بعد اپنے باپ کے ورثے کا حق دار نہیں رہتا۔ جب حکومت کے ہاتھ سے محکوم کا مذہب محفوظ نہ ہو تو بغاوت کے احکامات ابھر جاتے ہیں۔

ب۔ دینی تعلیم کا خاتمہ مسلمانوں کے عہد میں تعلیم و تعلم کی نگرانی علماء اور مذہبی سربراہوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس مقصد کے لیے ان کے نام بڑی بڑی جاگیریں،

تھیں۔ انگریز حکومت نے ان اوقاف پر قبضہ کر لیا۔ سرکاری مدرسوں میں نصاب کو یکسر بدل دیا۔ عربی اور فارسی کی قدر کم ہوگئی۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔

(ج) **مذہبی احکام کے خلاف قوانین** کمپنی کی حکومت نے ملک میں نافذ اسلام کے دیوانی اور فوجداری قوانین کو ختم کر ڈالا۔ زنا کو فوجداری مقدمہ کی بجائے دیوانی قرار دیا گیا۔ یعنی کسی شخص کو زنا کرنے پر جسمانی سزا نہ دی جا سکتی تھی۔ اس قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک دیوانی مقدمہ کا فیصلہ ہوتا تھا۔ عورت غاصب کے ہاں دو تین بچے جن چکتی تھی جیل خانوں میں تمام قیدیوں کو ایک ہی باورچی ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی دی جانے لگی یہ ہندوؤں کی چھوت چھات کے خلاف تھا۔ اسی طرح بیوہ عورتوں کی شادی کا قانون نافذ کیا گیا۔ یہ ہندوؤں کے خلاف تھا۔

(د) **اصلاحات کے متعلق غلط فہمی** انگریز حکومت برصغیر میں اصلاحات نافذ کر رہی تھی اور نئی نئی ایجادات ہو رہی تھیں۔ عوام کا ایک طبقہ ان کو اپنا رہا تھا۔ عوام نے ریلوے، تار، ڈاک خانہ وغیرہ غرض ہر نئی چیز کو عیسائیت کی اشاعت کی ایک چال قرار دی۔

(س) **تحریک جہاد** سید احمد شہید بریلوی کی تحریک جہاد ابھی تک زندہ تھی۔ اس کے حامی لوگوں کو حصول آزادی کے لیے آمادہ کر رہے تھے، وہ جہاد کا وعظ کرتے تھے اور لوگوں کو سرفروشی کے لیے تیار کرتے تھے۔ وہ لوگ جو اس تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش سے حصّہ لیا۔

۴۔ معاشی وجوہات

۱۔ **دیسی صنعت کی تباہی** انگلستان میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے سستا اور عمدہ مال تیار ہونے لگا۔ جو ہندوستان میں درآمد کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کی دیسی صنعت تباہ ہو گئی۔ اس صنعتی تنزل نے برصغیر کے عوام کی معاشی حالت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اور ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ انگریز برصغیر میں اپنا مال فروخت کر کے دولت انگلستان منتقل کر رہے ہیں۔

۲۔ **تجارت پر انگریزوں کا قبضہ** برصغیر کی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انگریز تاجر خوش حال تھے۔ جبکہ دیسی تاجر معاشی بدحالی کا

شکار تھے۔ انگریز ہر جائز طریقہ سے دولت حاصل کرنے میں مشغول تھے۔ وہ تجارتی ٹیکس بھی ادا نہ کرتے تھے۔ منہ مانگی قیمت وصول کرتے تھے اور کم قیمت پر مال خریدتے تھے اور ہندوستانی تاجر تباہ ہوتا چلا گیا۔

۳۔ دوامی بندوبست دوامی بندوبست کی وجہ سے حکومت کو ایک مستقل آمدنی کا یقین ہوگیا تھا۔ لیکن عوام کے حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ عوام کی معاشی حالت پر اس کے بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس بندوبست میں زمین کے ہر ٹکڑے پر ہر سال مالیہ لیا جاتا تھا۔ بنجر زمین پر بھی مالیہ دینا پڑتا تھا۔ مالیہ کی شرح بہت زیادہ تھی۔ ہندو ٹھیکیدار زمین کے مالک بن گئے اور مزارعین کی حالت خراب سے خراب ہوتی گئی۔

۴۔ بے روزگاری انگریز حکومت کا اثر یہ ہوا کہ کالا آدمی ناقابل اعتماد ہو گیا۔ اس کو کوئی ذمہ داری کا منصب نہ سونپا گیا۔ ہندوستانیوں کو صرف ادنیٰ قسم کی ملازمتیں دی گئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے روزگاری میں اضافہ ہوا اور اس بے روزگاری نے عوام کو ذہنی طور پر باغی اور انقلابی بنا دیا اور وہ انقلابی فوجوں میں بھرتی ہونے پر مجبور ہوگئے۔

۵۔ سٹمپ ایکٹ ۱۸۲۹ء میں حکومت نے سٹمپ ایکٹ نافذ کیا۔ اس کی رو سے عدالتی کاغذات پر سٹمپ لگانا ضروری تھا۔ یہ رعایا پر بے جا بوجھ تھا۔ قدیم زمانے میں برصغیر کے باشندوں کو مفت انصاف حاصل تھا۔ وہ کسی طرح بھی ایسی حکومت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو انھیں انصاف بھی قیمتاً مہیا کرے۔

۵۔ فوجی وجوہات

۱۔ ہندوستانی سپاہ کی حالت انگریزوں کے لیے برصغیر کی فتح خود برصغیر ہی سے بھرتی کی گئی فوجوں کا کارنامہ تھا۔ لیکن انگریزوں نے اس خدمت کا صلہ بے اعتمادی کی صورت میں دیا۔ فوج میں تمام عہدے یورپین لوگوں کے لیے وقف تھے۔ ایک ہندوستانی کے لیے ترقی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان کو بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔ گورے سپاہیوں کے مقابلے میں انھیں ہر وقت ذلت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ بکسر کی لڑائی کے فاتحین میں جب انعام تقسیم کیا گیا تو ہر گورے کو چالیس روپے اور ہر دیسی کو چھ روپے دیے گئے۔ دیسی سپاہیوں نے اس امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج کیا تو ۲۴ دیسی سپاہیوں کو توپ سے اُڑا دیا گیا۔

۲۔ اودھ کی برطرف شدہ فوج انگریزوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ جو ریاست قبضے میں لیتے تھے وہاں کی مقامی فوجوں کو برطرف کر دیتے تھے۔ اودھ پر قبضہ کرنے کے بعد بھی انھوں نے ایسا ہی کیا اور ۶۰ ہزار فوجی برطرف کر دیے گئے۔ جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو ان سپاہیوں نے جوشِ انتقام کی وجہ سے اس میں حصہ لیا۔

۳۔ مذہب کے خلاف احکامات انگریزوں نے دیسی سپاہیوں کو بعض ایسے احکام دیے جو ان کے مذہب کے خلاف تھے۔ مثلاً کسی سپاہی کو فوجی ملازمت کے دوران ماتھے پر تلک لگانے، کانوں میں بالیاں پہننے، داڑھی رکھنے اور پگڑی باندھنے کی اجازت نہ تھی۔ ان احکامات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ ہندو مذہب میں سمندر پار جانا گناہ خیال کیا جاتا تھا لیکن فوج کی ملازمت کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا اور اس پر ہندو سپاہی بہت سیخ پا ہوئے اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

۴۔ انگریز سپاہیوں کی قلّت بنگال اور بہار اور مرکزی ہندوستان میں گورے سپاہیوں کی تعداد کم تھی۔ کچھ فوج پنجاب میں تھی اور کچھ فوج یورپ میں مقیم تھی۔ اس لیے دیسی سپاہیوں نے حالات سازگار دیکھتے ہوئے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر ڈالی۔

۵۔ فوری وجوہات جنگ آزادی کی فوری وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۶ء کے آخر پر ایک نئی قسم کی بندوق کے استعمال کا حکم نافذ ہوا۔ جس میں ایسے کارتوس استعمال ہوتے تھے جن میں چربی لگی ہوئی تھی اور استعمال کرنے سے پہلے انھیں دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ سپاہیوں کا خیال یہ تھا کہ یہ چربی سُور اور گائے کی چربی ہے، سُور مسلمانوں کے لیے حرام ہے اور ہندو گائے کی چربی کو منہ لگانا حرام خیال کرتے تھے اس طرح برصغیر کی دونوں بڑی قوموں کے افراد کے لیے اس کارتوس کا استعمال پسندیدہ نہ تھا۔ لہٰذا فوجیوں نے اپنے مذہب کو بچانے کے لیے بغاوت کر دی۔

جنگِ آزادی کے واقعات

۱۔ ابتدائی بے چینی کارتوسوں کے استعمال پر سب سے پہلے دم دم کے زیر تربیت فوجیوں نے احتجاج کیا۔ اس کے بعد بارکپور میں رجمنٹ ۳۴ نے اعلان بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا، بہرام پور میں بھی اسی قسم کی صورت حال تھی۔

انگریز جنرل ہجل نے گورے سپاہیوں کی مدد سے اس بغاوت کو ناکام بنا دیا۔ ۲۹ مارچ کو رجمنٹ ۳۴ کے ایک سپاہی نے جس کا نام جنگی پانڈے تھا ایک انگریز سارجنٹ پر گولی چلا دی۔ اس کا مقدمہ فوجی عدالت میں پیش ہوا اور اس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس کے ایک ساتھی ایشوری پانڈے کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا، اس سے سپاہیوں کے جذبات بھڑک اُٹھے اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔

۲۔ میرٹھ — اپریل ۱۸۵۷ء کو جنرل سمائتھ نے میرٹھ کے سپاہیوں کو پریڈ کرنے کا حکم دیا اور نئے کارتوس استعمال کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ سپاہیوں کی تعداد ۸۵ تھی جن میں ۴۹ مسلمان اور ۳۶ ہندو تھے۔ فوجی عدالت نے ان سب کو دس دس سال قید سخت کی سزا دی۔ اس سے دیسی سپاہیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ بغاوت کے لیے مئی کا آخر مقرر کیا گیا۔ مگر سپاہیوں نے وقت سے پہلے ہی بغاوت کر دی۔ ۱۰ مئی کو جب انگریز افسر گرجا گئے ہوئے تھے۔ سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ جیل خانہ پر حملہ کر کے تمام قیدیوں کو آزاد کروا لیا اور اعلان جنگ کر کے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ میرٹھ میں ایک عنصر نے لوٹ مار کی اور بعض یورپین کو قتل بھی کیا۔

۳۔ دہلی — میرٹھ کے سپاہی جب دہلی پہنچے تو یہاں بھی انقلاب آ گیا۔ عوام پہلے ہی انگریزوں کے خلاف تھے۔ شہر پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ بنا کر ایک مرتبہ پھر مُغل حکومت کی یاد تازہ کر دی۔ بہادر شاہ بہت بوڑھا تھا۔ انقلابی تحریک کی قیادت اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے ایک بیٹے کو انقلابی فوج کا سربراہ بنا لیا گیا۔ لیکن اس میں انتظامی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ انقلابی فوج کے پاس رسل و رسائل نہ تھے۔ سپاہیوں کے لیے بُھنے ہوئے چنے تک میسر نہ تھے۔ شہنشاہ کے پاس خزانہ نہ تھا۔ فوج کو منظم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ بریلی سے جرنیل بخت خاں ۱۴ ہزار فوج لے کر دہلی پہنچا تو اس تحریک میں جان پڑی۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ اس بغاوت پر قابو پانا مشکل ہے مگر مولوی رجب علی اور حکیم احسان اللہ نے دہلی میں بارود خانہ میں آگ لگوا دی اور انقلابی فوج کو نقصان پہنچا۔ سکھوں نے انگریزوں کی مدد کی اور سکھوں کی مدد سے چھ دن کی گولہ باری کے بعد انگریزوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ بہادر شاہ ظفر اور اس کے خاندان کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر لیا گیا۔ بخت خاں اودھ کی طرف چلا گیا۔ شہزادوں کو جنرل ہڈسن نے گرفتار کر کے گولی مار دی۔ جنگ کے خاتمہ پر بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے رنگون جلاوطن کر دیا۔

۴۔ لکھنؤ جنگ آزادی کا تیسرا مرکز لکھنؤ تھا۔ یہ ایک بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں بھی لوگ انگریزوں کے خلاف تھے۔ یہاں زمینداروں سے زمینیں چھین لی گئیں تھیں۔ اب زمینداروں کے ملازمین نے انگریزوں پر حملہ کریں اور انگریز لکھنؤ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ہنری لارنس اور اس کے ساتھی مارے گئے۔ انقلابیوں نے سابق شاہی خاندان کے ایک دس سالہ شہزادہ برجیس قدر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ملکہ حضرت محل کو اس کا سرپرست مقرر کیا۔ اس دوران سرکاری فوج کے سپاہی بھی بغاوت کرکے ان سے آملے۔ لکھنؤ میں ایک شخص احمد اللہ اس جدوجہد میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کے مریدوں کی تعداد خاصی تھی، وہ بہت اچھا منظم تھا مگر حضرت محل سے اس کے اختلافات ہو گئے اور جب انگریزوں نے لکھنؤ پر حملہ کیا تو انقلابی شکست کھا گئے۔

۵۔ بریلی بریلی روہیل کھنڈ کا صدر مقام تھا۔ یہاں انقلابیوں نے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ خان بہادر خان کو تخت پر بٹھا دیا۔ بدایوں، شاہجہاں پور، بجنور اور بنوں میں بھی انقلابی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی شکست خوردہ فوج بھی ان سے آملی۔ احمد اللہ نے شاہجہاں پور میں آزادی کا پرچم لہرا دیا۔ انگریز، سکھوں اور رام پور کی متحدہ فوجوں نے بریلی کے انقلابیوں کو شکست دی۔

۶۔ کانپور کانپور کی انقلابی تحریک کی قیادت مرہٹہ سردار نانا صاحب کر رہا تھا۔ جب جنگ کے شعلے بھڑکے۔ تو اس نے پیشوائی کا اعلان کر دیا تھا اور کانپور پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب انگریز فوج نے کانپور کا رُخ کیا تو نانا صاحب نے دو سو کے قریب انگریز قیدی جو اس کے قبضہ میں تھے، قتل کروائے اور لاشوں کو ایک کنویں میں ڈال دیا۔ انگریزوں نے شہر پر قبضہ کرکے عوام پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔

۷۔ جھانسی جھانسی کی رانی لکشمی بائی بھی انگریزوں کے خلاف تھی کیونکہ اس کو متبنٰی بنانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ لکشمی بائی نے بیس ہزار فوج جمع کرکے جنگ کا آغاز کیا۔ دوسرے محاذوں کی شکست خوردہ فوج بھی اس سے مل گئی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ لکھنؤ کے انقلابیوں کے ساتھ مل کر جنگ کرے لیکن اس سلسلے میں اس کو کامیابی حاصل نہ ہوئی اور جون ۱۸۵۸ء میں جب انگریز فوج نے اس پر حملہ کیا تو وہ مردانہ وار لڑتی ہوئی ماری گئی۔

اس کے علاوہ چند دیگر مقامات پر بھی انقلابی سرگرمیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ مگر انگریزوں نے سب کو دبا دیا اور برصغیر انگریزوں کا غلام بن گیا۔

جنگِ آزادی کی ناکامی کے اسباب

۱۔ قائدین کا فقدان برصغیر میں باصلاحیت افراد کی کمی تھی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے جانشین نہایت نا اہل ہیں۔ بعد کے بادشاہوں کے زمانے میں عیاشی اور سازشی ماحول نے فوجی قائدوں کی جسمانی صلاحیتوں اور جذبہ کار ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ دہلی اور میرٹھ کے انقلابیوں کو منظم کرنے والا کوئی نہ تھا، لکھنؤ کی فوجوں کو بھی متحد نہ کیا جا سکا۔ اس طرح اچھے منتظمین اور قائدین کی کمی نے آزادی کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

۲۔ اتحاد کا فقدان برصغیر میں جنگ عجیب طریقے سے شروع ہوئی تھی۔ جنگ کا آغاز اچانک ہوا۔ مختلف جگہوں کے انقلابیوں میں آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس جنگ کی پشت پر کوئی جامع منصوبہ نہ تھا یہ ہی نہیں بلکہ ایک ہی شہر کے انقلابی بھی متحد نہ تھے۔ مثلاً دہلی میں مغل شہنشاہ اور بخت خاں کے درمیان ہم آہنگی نہ تھی۔ لکھنؤ میں ملکہ حضرت محل اور احمد اللہ میں اختلافات تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو باری باری تمام شہروں پر قبضہ کرنا آسان ہو گیا۔

۳۔ وسائل کی کمی انقلابیوں کی ناکامی کی بہت بڑی وجہ وسائل کی کمی تھی اس تحریک کی سب سے ممتاز شخصیت شہنشاہ مغل تھا جس کو انگریزوں سے پنشن ملتی تھی، اس کا خزانہ خالی تھا۔ دہلی کے رئیسوں نے قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ انقلابی فوج کو تنخواہ تو کیا ملتی، کھانے کے لیے بھنے ہوئے چنے بھی میسر نہ آئے تھے۔ اس بے سروسامانی میں اسلحہ کہاں سے حاصل ہوتا اور یہ فوج زیادہ دیر تک مستعدی سے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکی۔

۴۔ والیان ریاست کا عدم تعاون تمام والیان ریاست اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ ان کا مستقبل کمپنی کی حکومت میں محفوظ نہیں۔ اس کے باوجود وہ انقلابی تحریک میں شامل نہ ہوئے۔ وہ عملاً میدانِ جنگ میں آنے سے گھبراتے تھے۔ ان میں آزادی کی تڑپ ختم ہو چکی تھی۔ حیدرآباد، گوالیار، سندھ راجپوتانہ کی ریاستوں نے اس جدوجہد میں حصہ نہ لیا اور بوقت ضرورت انگریزوں کی امداد کی۔ اگر یہ دیسی ریاستیں انقلابیوں کے ساتھ تعاون کرتیں یا انگریزوں کی امداد نہ کرتیں تو حالات کچھ اور ہوتے۔

۵۔ پنجاب کی سکھ فوج پنجاب کا الحاق بھی غیر قانونی حرکت تھی۔ سکھوں کے خلاف کارروائی کا کوئی اخلاقی جواز تھا۔ سکھوں میں اس کے خلاف

ردِّ عمل پیدا ہونا ضروری تھا لیکن سکھوں کو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں سے دشمنی تھی۔ انگریزوں نے سکھ فوج کو دہلی فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اس فوج نے اسلام دشمنی کی وجہ سے دہلی میں بے پناہ مظالم ڈھائے اور انگریزوں کے اکھڑتے ہوئے پاؤں دوبارہ جم گئے۔ پنجاب میں بھی انقلابی تحریک کے اثرات پہنچے تھے۔ لیکن انگریزوں نے بروقت اقدامات کر کے ان پر قابو پا لیا تھا۔

۶۔ مفسد عنصر کی شمولیت

جنگ آزادی میں تنظیم کی کمی تھی۔ اس لیے انقلابی شہروں میں امن وسکون قائم نہ رکھا جا سکا اور غنڈہ عنصر میدان عمل میں آیا۔ لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ بہت سے لوگ قتل کر دیے گئے، بدامنی اور فساد کا دور دورہ ہو گیا۔ عوام کا ایک طبقہ تحریک آزادی سے بدظن ہو گیا اور انقلابی سرگرمیوں میں شامل نہ ہوا اس عنصر نے تحریک کو کافی نقصان پہنچایا۔

۷۔ افغانستان کی طرف سے امداد نہ ملنا

برصغیر کے مسلمان احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد سے اپنے دشمنوں کے خاتمہ کے لیے افغانستان سے امداد کی توقعات وابستہ کرتے تھے۔ افغانستان اور برطانیہ کی جنگ میں برصغیر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں افغانستان کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ بعض انقلابی یہ توقع رکھتے تھے کہ برصغیر کی اس جنگ آزادی میں انھیں افغانستان کی طرف سے امداد ملے گی اور حکومت افغانستان برصغیر میں انگریزوں کی نازک پوزیشن سے فائدہ اُٹھا کر افغان وار کا بدلہ لے گی لیکن حکومت افغانستان نے ایسا نہ کیا اور انقلابیوں کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔

۸۔ انگریزوں کے وفادار

ہندوستانیوں نے انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا پورا حق ادا کیا۔ ہندو زمیندار جو انگریزی حکومت کی وجہ سے زمین کے مالک بنے تھے، انگریزوں کے وفادار رہے۔ انھوں نے انگریزوں کو انقلابیوں کو اطلاعات پہنچائیں، سازشوں میں شریک ہوئے اور انقلابی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے تمام جائز و ناجائز طریقے استعمال کیے اور اس کام کے عوض عہدوں میں ترقی اور سرکاری خوشنودی حاصل کی مثلاً مولوی رجب علی، حکیم احسان اللہ، مرزا الٰہی بخش وغیرہ کو جاسوسی اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کروانے کے صلہ میں انگریزی دربار میں پہلی کرسی دی گئی۔

۹۔ شیخ الاسلام ترکی کا فتویٰ

ترکی یورپ کا مرد بیمار تھا وہ اپنے آپ کو روس کے ہاتھوں محفوظ رکھنے کے لیے برطانیہ کا محتاج تھا۔ ترکی کا

حکمران مسلمانوں کا خلیفہ اور وہاں کا قاضی القضاۃ عالم اسلام کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس لیے برطانوی حکومت نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے شیخ الاسلام ترکی سے فتویٰ لیا کہ انگریزوں کے خلاف لڑنا دینی مصلحت کے خلاف ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو وہابیوں کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔ اس فتویٰ کو مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر پھیلایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیدھے سادھے عوام میں ایک گروہ انقلابیوں کا ساتھ چھوڑ گیا۔

۱۰۔ یورپ سے فوجوں کی واپسی جنگ کریمیا میں شرکت کے لیے یورپین فوج یورپ گئی ہوئی تھی اور روس کے خلاف برسر پیکار تھی۔ جنگ کریمیا ۱۸۵۶ء میں ختم ہوئی۔ لیکن ابھی یہ فوج واپس نہ آئی تھی۔ برصغیر میں جنگ کی خبر سنتے ہی یہ فوجیں ہندوستان روانہ ہوگئیں اور جہاں جہاں یہ فوجیں پہنچیں مقامی فوجوں کو ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ کیونکہ یہ منظم اور اسلحہ سے لیس تھیں ان کے پاس وسائل کی کمی نہ تھی۔ اور انقلابی شکست کھا گئے۔

۱۱۔ جنوبی علاقوں میں جوش کی کمی جنوبی علاقوں کے لوگوں میں جوش کی کمی تھی۔ انھوں نے نے انقلابی جدوجہد میں اس جوش و خروش سے حصہ نہ لیا جس جوش کے ساتھ شمالی ہندوستان کے لوگوں نے لیا تھا۔ اگر بمبئی، مدارس، مہاراشٹر میں بھی شمالی ہند کے ساتھ ساتھ اس طرح جنگ شروع ہو جاتی تو ان صوبوں سے فوج شمالی ہندستان بھیجنا ناممکن ہو جاتا۔ جنرل نیل اور ہیولاک کلکتہ نہ پہنچ پاتے اور بنارس، الہ آباد، کانپور، لکھنؤ فتح کرنا ناممکن ہو جاتا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتائج

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ایک معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک بغاوت نہ تھی۔ بلکہ اس نے حکومت برطانیہ کو یہ احساس دلایا کہ اگر حکومت کمپنی ہی کے قبضہ میں رہی۔ تو برصغیر پر قبضہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس جنگ نے دور رس اثرات مرتب کیے جن میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ قتل و غارت تباہی جنگ آزادی میں مجموعی طور پر پانچ سات ہزار انگریز قتل ہوئے تھے لیکن کمپنی نے فتح پانے کے بعد پانچ چھ لاکھ ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک انگریز کے بدلے میں کم از کم ایک ہزار ہندوستانیوں کو ہلاک

کیا گیا۔ جنگ کا بڑا مرکز دہلی تھا۔ سب سے زیادہ انتقام اسی شہر سے لیا گیا۔ اہل شہر کو بے دریغ گولیاں مار مار کر اور پھانسیوں پر لٹکا کر ہلاک کیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر اور اس کے اہل خاندان کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا۔ جنرل ہڈسن نے بہادر شاہ کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گولیاں چلا کر مار ڈالا۔ پھر سینہ پر چڑھ کر سر کاٹ لیے اور ایک خوان میں رکھ کر بدنصیب باپ کو پیش کیے۔ مغل بادشاہ پر مقدمہ چلایا گیا اور رنگون میں جلاوطن کر دیا۔ جہاں اس نے اور اس کی بیوی نے سخت افلاس میں زندگی گزاری۔

۲۔ مسلمانوں سے انتقام

دہلی کی مسلم آبادی جو شہر چھوڑ کر بھاگی نہ تھی انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی۔ انھیں وسیع پیمانے پر پھانسیاں دی گئیں، ان کے گھروں کو لوٹا گیا۔ انگریز مسلمانوں کو اس واقعہ کا ذمہ دار خیال کرتے تھے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان سب سے بڑے مجرم تھے۔ مسلمانوں کو جنگ کا زیادہ ذمہ دار اس لیے بھی سمجھا گیا کہ انھوں نے بہت سی لڑائیوں میں سبز رنگ کا پرچم استعمال کیا۔ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا اور لکھنؤ میں شہزادے برجیس قدر کو بادشاہ بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ بریلی میں خان بہادر خان کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ ان اعلانات سے انگریزوں نے یہ تاثر لیا کہ اس جنگ کے ذمہ دار مسلمان تھے اور وہ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے۔ ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں، نوکریوں سے نکال دیا گیا، پھانسی دی گئی جیلوں میں ڈالا گیا، ان کے اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا، مسجدوں کو برباد کر دیا گیا۔

۳۔ تاج برطانیہ کی حکومت

اس جنگ کے نتیجہ میں کمپنی سے ہندوستان کی حکومت چھین لی گئی اور ملکہ برطانیہ نے خود حکومت سنبھالی اور کام چلانے کے لیے وائسرائے مقرر کیا اور حکومت ہند کے انتظامات چلانے کے لیے ایک وزیر سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا۔ اس کی امداد کے لیے ایک پندرہ آدمیوں کی انڈیا کونسل مقرر کی گئی۔ یہ ملک کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔ ان کو تنخواہ بھی ہندوستان کے خزانے سے ملتی تھی۔

۴۔ ریاستوں کا تحفظ

جنگ آزادی کے بعد چونکہ برطانوی حکومت خود تمام امور کی ذمہ دار بن گئی۔ اس لیے وعدہ خلافی اور بے وفائی کے واقعات پہلے سے کم ہونے لگے۔ اس سے پہلے کمپنی کی حکومت حیلے بہانے بنا کر ریاستوں کو ختم کرتی رہتی تھی لیکن تاج برطانیہ کی حکومت نے اپنا طرز عمل بدل ڈالا اور ان کے ساتھ کیے گئے معاہدات کے احترام کا

وعدہ کیا لاو لارا جاؤں کو متبنیٰ بنانے کی اجازت دے دی اس طرح ریاستوں کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔

۵۔ یورپین افواج میں اضافہ جنگ آزادی کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ یورپین فوجوں کی تعداد دیسی فوجوں کے مقابلہ میں کم تر تھی۔ تاج برطانیہ کی حکومت نے برصغیر پر کنٹرول رکھنے کے لیے ملد یورپین افواج کی تعداد میں اضافہ کیا۔ توپ خانہ کلی طور پر یورپین افواج کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

۶۔ نوکر شاہی کا قیام جنگ آزادی کی وجہ سے عوام کی وفاداری قابل اعتماد نہ رہی تھی۔ اس لیے برطانوی حکومت نے افسروں کے ذریعہ حکومت کرنے کے منصوبے پر عمل کیا۔ سرکاری افسروں کو وسیع اختیارات دے دیے گئے۔ ان کی معاشرتی پوزیشن اتنی بلند کی گئی کہ عوام ان سے خائف رہیں اور اس نئے طبقے کو ابھار کر باغی عناصر کو کچل دیا گیا۔ یہ نوکر شاہی ملک کی آزادی تک لوگوں پر مسلط رہی اور آج بھی مسلط ہے۔

۷۔ ہندو مسلم اختلافات برصغیر کی ہندو آبادی صدیوں سے اطاعت کی عادی چلی آتی تھی۔ اس کے لیے مسلمانوں کے بجائے انگریزوں کی اطاعت میں کوئی حرج نہ تھا۔ جنگ آزادی کے بعد وہ انگریزوں کے قریب چلے گئے اور ان کے وفادار بن بیٹھے۔ انگریزوں نے بھی ان کو اوپر چڑھایا اور مسلمانوں کو ختم کرنے میں ان کا تعاون حاصل کیا۔ مسلمانوں نے محسوس کر لیا کہ انگریز اور ہندو مل کر ان کو پائمال کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس لیے انھوں نے بھی دفاعی جنگ شروع کر دی۔ جنگ آزادی کے نتیجہ کے طور پر ہندو مسلم اختلافات میں اضافہ ہوا۔

۸۔ غلامی کا احساس جنگ آزادی سے پہلے برصغیر کے عوام شہنشاہ دہلی کو اپنا پیشوا سمجھتے تھے اور اسی کو ملک کا حکمران خیال کرتے تھے اور انگریزوں کو شہنشاہ دہلی کا کارندہ خیال کرتے تھے۔ اس جنگ میں ناکامی شہنشاہ کی معزولی اور تاج برطانیہ کی براہ راست حکومت نے عوام کو یہ احساس دلایا کہ اب وہ غلام ہو گئے ہیں اس احساس غلامی نے برصغیر کے مذہب، معاشرت، ثقافت وغیرہ کو بہت متاثر کیا۔

۹۔ عیسائی مبلغین کی حوصلہ افزائی جنگ آزادی کے بعد مسیحی پروپیگنڈے کو ختم کرنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ جنگ میں انگریزوں کی فتح کو پادریوں نے عیسائیت کی فتح قرار دیا۔ اسلام اور ہندومت پر حملے شروع کر دیے۔ رسول پاکؐ کی ذات پر کیچڑ اچھالا گیا۔ مسلمان علماء نے عیسائی مبلغوں کا مقابلہ کیا لیکن حکومت کی

سرپرستی ہونے کی وجہ سے وہ کھل کر ان کے مقابلے پر نہ آسکتے تھے۔

۱۰۔ **دستوری تحریک** جنگ آزادی سے قبل انگریزوں کو ایک مضبوط فوجی طاقت سمجھا جاتا تھا اور اس کے مقابلے کے لیے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے فوج کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جنگ میں ناکامی کے بعد جذبہ آزادی نے دستوری اصلاحات کی راہ اختیار کی اور اس طرح اس دستوری تحریک آغاز ہوا۔ جس کا آخری نتیجہ ہند و پاکستان کی آزادی کی شکل میں نکلا۔

کیا آپ اسے فوجی غدار قرار دیتے ہیں؟

جنگ آزادی کے خاتمہ پر، بہت سے لوگوں نے اسے غدار اور بغاوت کا نام دیا۔ ان میں انگریز سیاست دان اور ان کے ہندوستانی وفادار شامل تھے۔ وہ جنگ آزادی کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ بغاوت کے الزام میں انھوں نے جو ظلم و ستم کیا ہے۔ اس کا جواز پیش کیا جاسکے۔ لیکن جب بیسویں صدی کے آغاز میں جب اس جنگ آزادی کا جائزہ لیا گیا تو اس کو جنگ آزادی ہی قرار دیا گیا۔ اس کے حق میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں:۔

۱۔ جنگ آزادی کے قائدین میں چند ایسے ضرور تھے جن کو انگریزوں سے اختلاف تھا مثلاً نانا صاحب، جھانسی کی رانی وغیرہ۔ لیکن مولانا احمد اللہ شاہ، مولانا لیاقت علی، مولانا سرفراز علی اور دوسرے علماء نیز دیگر مسلمانوں کا کوئی ذاتی مفاد نہ تھا اور نہ ان کو انگریزوں سے کوئی عناد تھا۔ بلکہ وہ خاص جذبۂ آزادی کے تحت لڑ رہے تھے۔

۲۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ قائدین جنگ کے درمیان کوئی رابطہ نہ تھا۔ لکشمی بائی، نانا صاحب، حضرت محل، عظیم اللہ خاں وغیرہ میں خط و کتابت موجود تھی۔

۳۔ ولسن کی تحقیقات کے مطابق فوج کی مختلف رجمنٹوں کے درمیان بھی رابطہ موجود تھا اور ہر رجمنٹ میں سہ رکنی کمیٹی بنادی گئی تھی۔

انقلاب کی تاریخ ۳۱ مئی طے ہوئی تھی جو اتوار کا دن تھا۔ اور تمام گورے گرجاگھر میں جاتے تھے اور ان کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ۳۱، مئی تک تمام فوجی یونٹوں سے رابطہ قائم کیا جانا تھا۔ اس لیے یہ غدار نہیں تھا۔

۴۔ اس جنگ کو غدر قرار دینا اس لیے بھی غلط ہے کہ لکشمی بائی، حضرت محل، عظیم اللہ خاں،

ناناصاحب، مولانا لیاقت علی احمد اللہ شاہ انگریزوں کے نوکر نہ تھے کہ ان کو بغاوت غدر قرار پائے۔

۵۔ ساورکر جنگ آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ناناصاحب نے جنگ شروع ہونے سے کافی دیر پہلے پورے ہندوستان میں قاصد بھیجے جو سادھوؤں کے بھیس میں چکر لگاتے تھے۔ عظیم اللہ خاں نے روس، مصر، ترکی کی حکومتوں سے امداد کی درخواست کی۔ علمار کرام نے جنگ آزادی سے کافی پہلے سیاسی وعظ اور جہاد کی تلقین شروع کردی اور ان خفیہ تحریکات کا وجود اس جنگ کو جنگ آزادی قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

فاتحین کا انتقام

سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا اندازہ درست ثابت ہوا اور بغاوت ایک سال جاری رہنے کے بعد ناکامی پر منتج ہوئی۔ اس بغاوت کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا جو حشر ہوا۔ اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انگریزوں نے باغیوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگوں سے بھی ایسا خوف ناک اور ظالمانہ انتقام لیا کہ چنگیز اور ہلاکو کے مظالم بھی بے حقیقت نظر آنے لگے۔ سب سے پہلے اہل دہلی کی شامت آئی۔ انگریزوں کا شہر پر قبضہ ہوتے ہی اہل شہر خصوصاً مسلمانوں نے بھاگنا شروع کردیا۔ وہ شریف زادیاں جن کے دوپٹے کا پلو بھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔ کھلے منہ عزت و آبرو کے ڈر سے بھاگ رہی تھیں۔ بیمار اور بوڑھے جن سے قدم اٹھانا مشکل تھا۔ گھسٹ گھسٹ کر شہر سے نکل رہے تھے۔ اس عالم میں پشتوں سے جمع ہوا گھر کا اثاثہ تو کجا کپڑے اور زیور بھی لے جانا مشکل تھا۔ بے شمار لوگ شہر سے بھاگتے ہوئے انگریزی فوجوں کی سفاکی کا نشانہ بنے۔ جو اس دار وگیر سے بچے۔ انھیں اجڈ دیہاتیوں نے لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ جو لوگ شدید بیماری، ضعیف، بڑھاپے یا وطن کی محبت کی وجہ سے شہر نہ چھوڑ سکے انھیں اس جرم بے گناہی میں قتل کردیا گیا۔ ان مقتولوں میں سب سے زیادہ بلکہ ننانوے فی صد مسلمان تھے "سکھ فوجی جس گلی کوچے میں کسی مسلمان کو دیکھ پاتو منہ دیکھتے اسے اپنا شکار بنا کر دل کو ٹھنڈا کرتے۔ ان کے ہاتھ سے بہت سے معزز خاندانی مسلمان جو بدقسمتی سے شہر میں رہ گئے تھے مارے گئے۔ وہ بوڑھے باپوں کے سامنے جوان بیٹیوں کو مارتے اور باپ کو کہتے کہ چلا جا" انگریزی فوجی افسر اسیروں سے پوچھتے کہ ہندو ہو یا مسلمان؟ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتاتا، اسے گولی مار کر ختم کردیا جاتا یا پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ مسلمانوں کو برہنہ کرکے زمین پر لٹکایا گیا۔ ان کی مشکیں کسی گئیں اور پھر انھیں سر سے پاؤں تک گرم تانبے سے داغ دیا گیا۔ سکھوں اور انگریز فوجیوں نے مسلمان قیدیوں کو زندہ آگ میں جلا دیا

اور ان کے تڑپنے اور جلنے کا تماشہ دیکھتے رہے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں جلایا گیا۔ سینکڑوں مسلمانوں کو ایک چھوٹے سے بُرج میں ٹھونس دیا گیا اور جب انھیں قتل کرنے کے لیے باہر نکالا گیا تو ان میں سے ۴۵ آدمی گرمی کی شدت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کو اس جرم میں پھانسی دے دی گئی کہ انگریزی فوجوں کے مارچ کے وقت ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ ان پھانسی پانے والوں میں عوام الناس بھی تھے، اہل علم و فضل بھی تھے، سردار اور رئیس بھی تھے، شہزادے بھی تھے ۲۹ دلی کے پاس جتنے شہزادے ملے پکڑے گئے۔ ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیے گئے حتیٰ کہ مرزا محمود شاہ، اکبر شاہ بادشاہ کا پوتا وجع المفاصل میں مبتلا تھا اس کی لاش پھانسی پر گولا لاٹھی بنی ہوئی لٹکتی رہی۔"

انگریزی فوج کے رسوائے زمانہ افسر ہڈسن نے بادشاہ کے تین بیٹوں کو کپڑے اتروا کر اپنے ہاتھ سے گولی کا نشانہ بنایا اور ان کی لاشیں کوتوالی کے سامنے ڈال دی گئیں۔ جہاں ان کی بوٹیاں گدھ اور کتے نوچتے رہے۔ ہزاروں مسلمان اور شریف خاندان کی عورتیں عصمت دری کے ڈر اور کوچہ گردی کی رسوائی سے بچنے کے لیے کنوؤں میں گر کر مر گئیں۔ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ انھوں نے کوئی گھر نہ چھوڑا جس کا صفایا نہ کیا ہو۔ مکانوں کے صحن اور دیواریں کھود کھود کر دفینے نکال لیے۔ قیمتی سامانوں کے ساتھ ساتھ چھتوں کی کڑیاں، تختے اور کیواڑ تک اتار کر لے گئے۔ الفنسٹن کے بقول اس لوٹ کھسوٹ کی کارروائی نے نادر شاہ کے کارنامے بھی بھلا دیے۔ مساجد ویران ہو گئیں۔ ان کے قیمتی پتھر نکال لیے گئے۔ بعض سرے سے منہدم کر دی گئیں۔ شاہی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ سکھ فوجی اس میں گھوڑے باندھتے، شراب پیتے اور سور ذبح کر کے پکاتے اور انگریزوں کے ساتھ ان کے کتے مسجد میں پھرتے رہتے۔

یہ صرف ایک شہر دہلی کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی کی نامکمل تصویر ہے ورنہ اس شہر اور مسلمانوں پر جو قیامت گزر گئی اس کی تفصیلات کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی شہروں اور ان کے ساکنوں پر کیا بیتی ہو گی۔

تحریک آزادی کے کچلے جانے کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آزادی کی جدوجہد کے مجرموں کا انصاف کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ بظاہر اس کا کام مقدمے کی چھان بین کر کے انصاف کرنا تھا۔ مگر درحقیقت وہ صرف سزائے موت سُنانے کے لیے تھا۔ عدالتی کارروائی محض ایک ڈھونگ

ہوتی تھی، جتنے مجرم پیش ہوتے۔ وہ قصوروار ہوں یا نہ ہوں، انھیں سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک انگریز ورتھ سمتھ کی شہادت کافی ہوگی۔ اُس نے لکھا ہے کہ

"ایک دفعہ دس بارہ ملزم پیش ہوئے، اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا مگر کمیشن کی نظر میں وہ سب مجرم قرار پائے، کیونکہ صورت شکل سے وہ سپاہی معلوم ہوتے تھے اور اُن پر زندگی میں کبھی نہ کبھی ہتھیار اٹھانے کا شک کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اُن سب کو پھانسی دے دی گئی۔"

اس عرصے میں عام آبادی کے علاوہ جن لوگوں کو خاص طور پر چُن چُن کر پھانسی دی گئی وہ یہ تھے:۔ قلعہ کے تمام ملازمین، میگزین کے وہ سپاہی جنھوں نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، وہ تمام مجاہدین جو نہایت زخمی حالت میں مسجدوں وغیرہ میں چھپ گئے تھے، وہ تمام فوجی جنھوں نے بھاگتے ہوئے مٹکاف پر حملہ کیا تھا، میواتی اور گوجر۔

صرف چاندنی چوک میں تین پھانسی گھر قائم تھے۔

پھانسی پانے والوں کو قطار میں کھڑا کر دیا جاتا۔ وہ اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے۔ ان کے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کو پھانسی ہو جاتی اور وہ اپنی آنکھوں سے اُن کی لاشیں ہٹتی دیکھ لیتے تو اُن کی باری آتی تھی۔ یہ منظر انگریزوں کے لیے ایک دلچسپ تماشا تھا۔ وہ باقاعدگی سے وہاں جا کر بیٹھتے اور ہنستے بولتے ہوئے اس ڈرامے کو آخر تک دیکھتے رہتے تھے۔

معزز مسلمان شہریوں کے علاقے خاص طور پر انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ بالکل بے گناہ لوگوں کو مختلف بہانے تراش کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً کوچہ چیلان کے لوگوں نے اپنے قول یا فعل سے کسی انگریز کو گزند نہ پہنچایا تھا۔ اصولاً وہ علاقہ ہر طرح کی آفت سے محروم رہتا مگر ایک چھوٹے سے واقعہ کو بہانہ بنا کر بے شمار مردوں کو اُن کے گھروں میں گھس کر قتل کر دیا گیا۔ جو باقی بچے، انھیں جمنا کے کنارے لے جا کر شوٹ کر دیا گیا۔

یہ سلسلہ دو چار روز تک نہیں بلکہ پورے پانچ ماہ تک جاری رہا۔ فروری کے آخر میں جان لارنس دہلی آیا تو اُس نے کوشش کر کے ایسا نظام قائم کیا کہ ملزموں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع مل جائے مگر جوں ہی وہ دہلی سے گیا، پھر وہی کیفیت شروع ہو گئی۔

جو لوگ پھانسی پا کر یا کسی اور طرح قتل ہوئے۔ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ مشکل ہے تاہم محتاط مورخوں نے صرف پھانسی پانے والوں کی تعداد ستائیس ہزار بتائی ہے۔ ان سے کئی گنا زیادہ وہ لوگ

تھے جو قتل عام میں مارے گئے جلاوطنی، صحرانوردی اور فاقوں سے مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

پھر دہلی کے اردگرد کی ریاستیں بھی اس آگ کی لپیٹ سے نہ بچ سکیں۔ والی جھجر نواب عبدالرحمان خان کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ اس جواں مرد نے بڑے استقلال کے ساتھ موت کو خوش آمدید کہا۔ حالانکہ پھانسی پانے کے وقت اس کی والدہ بھی وہیں موجود تھیں۔

بلب گڑھ کی حدود میں ایک انگریز کا قتل ہوگیا تھا۔ وہاں کے راجہ نارسنگھ کو اسی جرم میں ۷، جنوری کو پھانسی دے دی گئی۔ وہ بڑا وجیہہ و شکیل اور حلیم الطبع جوان تھا۔

فرخ نگر کے رئیس احمد علی خاں کو بھی پھانسی دی گئی۔ رئیسوں کو بڑے کرّوفر سے پھانسی دی جاتی تھی۔ فوجی دستہ بینڈ بجاتا ہوا آتا۔ ملزم کو مشکیں کس کر لایا جاتا اور جب تماشہ دیکھنے والے انگریز مرد عورتیں جمع ہو جاتے تو اس خونیں ڈرامے کو آخری شکل دی جاتی تھی۔

ان کے علاوہ بہت سے معززین شہر بے گناہ ثابت ہونے کے باوجود قتل کر دیے گئے۔ امیر مرزا نماز کے بعد تسبیح پڑھتے ہوئے شہید ہوگئے۔ حکیم عبدالحق، نظام الدین خان، عبدالصمد خاں اور حسن عسکری وغیرہ کو جھوٹی تہمتیں رکھ کر قتل کر دیا گیا۔ مرزا مغل بیگ نے مقدمے کی کارروائی کے دوران میں اپنی بے گناہی کے تمام ثبوت دے دیے تھے، مگر چونکہ وہ بادشاہ کا ملازم تھا، اس لیے پھانسی دے دی گئی۔ کچھ لوگوں کی جان بچ گئی مگر جائیدادیں ضبط ہوئیں، قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں نواب امین الدین احمد خاں، نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب حامد علی خاں کے نام سرفہرست ہیں۔

حاجی مہرکن بستی نظام الدین میں جا چھپے تھے وہیں سے پکڑے ہوئے آئے تو مٹکاف نے جذبہ انتقام سے مغلوب ہو کر تلوار کا وار کیا اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ وہ کئی ماہ تک زیر علاج رہے پھر ترک وطن کر کے لاہور چلے گئے۔ کئی سال تک نام بدل کر وہیں رہتے رہے مگر ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہو کر آئے اور پھانسی پائی۔

مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر بھی بے باکی اور حق گوئی کے جرم میں شہید کر دیے گئے۔ ان کا جرم یہی تھا کہ انھوں نے جھوٹ بولنا گوارا نہ کیا تھا۔

نواب محمد حسن خان نے ایک انگریز عورت اور ناصرالدین نے چند عیسائی عورتوں کی جان بچائی تھی مگر ان دونوں کو بھی ختم کر دیا گیا۔

احمد مرزا اور اصغر یار خان دہلی میں مسافر کی حیثیت سے تھے۔ وہ بےگناہ قتل ہوئے۔ بے گناہ پھانسی پانے والوں میں اُستاد ذوق کے صاحبزادے خلیفہ اسمٰعیل بھی تھے۔

مُسلم تہذیب کی تباہی

جن لوگوں نے بیسویں صدی کے انگریز، اُس کے قانون اور اُس کے حُسن انتظام کو دیکھا ہے۔ وہ مشکل ہی سے یقین کریں گے کہ جو قوم خود کو مہذب کہلانے کے لیے اس قدر مصر ہے وہ انیسویں صدی میں کتنی بربریت کا مظاہرہ کر چکی ہے۔

اگر بعض انگریز مورخوں کے بیانات کی روشنی میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی افراتفری اور غدر چند "سرکش سپاہیوں" "مخبوط الحواس" "بوڑھے بادشاہ" "احمق" شہزادوں اور تھوڑے سے "سرپھرے" حریت پسندوں کی بغاوت تھی تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس جُرم کی سزا سارے ہندوستان کے عوام کو کیوں دی گئی بالخصوص اسلامی تہذیب و ثقافت کو جوش انتقام کا نشانہ کیوں بنایا گیا۔

دہلی اور اودھ میں تسخیر کے بعد جو کچھ کیا گیا، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سارے مُلک کے جُرم کی سزا صرف مسلم قوم کو دی گئی۔ نہ صرف مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا بلکہ اُن کی تہذیب، تمدن، تاریخ اور ثقافت کو کالعدم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اُن کا سامان اور جائیدادیں چھین کر انھیں اقتصادی طور پر اتنا تباہ کر دیا گیا کہ مدتوں سر نہ اُٹھا سکیں۔

یہ خانماں برباد اپنی دہلی کو پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح چھوڑ کر بھاگے تھے۔ مگر حالات ٹھیک ہونے کے بعد واپس آئے تو وہ ایک ایسے پودے کی طرح تھی جس پر ایک پتہ بھی نہ چھوڑا گیا تھا۔

۱۔ دہلی کی جامع مسجد سکھ فوجوں کی بیرک بن چکی تھی۔

۲۔ دوسری بڑی مسجد میں گورا پلٹن مقیم تھی۔

۳۔ اہل تشیع کی ایک مسجد میں جو نواب حامد علی خاں کی مسجد کہلاتی تھی۔ گدھے باندھے جاتے تھے۔

۴۔ ایک مسجد کو مہاراجہ جنید نے گوردوارے میں شامل کر لیا تھا۔

۵۔ چوک سعد اللہ، اردو بازار، خانم بازار، خاص بازار اور فیض بازار ڈھائے جا چکے تھے۔

۶۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار مسجدوں کے علاوہ اکبر آبادی مسجد اور اورنگ آبادی مسجد کو مسمار کر دیا گیا تھا۔

۷۔ پریشان حال، بدنصیب اور خائف عورتوں بچوں کو نکال کر عالی شان عمارتیں اور محلے منہدم کر دیے گئے تھے مثلاً بلاقی بیگم کا کوچہ، خان دوراں کی حویلی، انگوری باغ، دریا گنج کی گھاٹی،

بگوا باڑی، پنجابی کڑا، سعادت خاں کا کڑا، رام گنج، جرنیل کی بی بی کی حویلی وغیرہ۔

۸۔ جامع مسجد سے رام گھاٹ تک کی تمام عمارتیں مسمار کر دی گئی تھیں۔

۹۔ لال قلعہ اور جامع مسجد کے قریبی علاقے کا نقشہ بدل دیا گیا تھا۔ بیشتر مکانات ہاتھوں کے ذریعے منہدم کرا دیے گئے تھے۔ جو علاقہ اس زد سے بچ گیا۔ اُسے بارود سے اُڑا دیا گیا تھا۔ اس کارروائی میں مشہور اسلامی مدرسہ دار البقاء بھی منہدم ہو گیا۔ پورے علاقے کا ملبہ اور درخت نیلام کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ بنیادوں کے پتھر بھی فروخت کر دیے گئے تھے۔

۱۰۔ لال قلعے کے اندر کی عالی شان عمارتیں مثلاً امیروں اور شہزادوں کے محدث، دیوان عام کا کچھ حصہ، رنگ محل کے فوارے، حوض، موتی محل، باغ حیات بخش، مہتاب باغ، چھوٹی بیٹھک اور شاہی مطبع سب توڑ پھوڑ کر بدنما بیرکیں بنا دی گئی تھیں۔ تاکہ لال قلعے کی شان و شوکت جاتی رہے۔

یہ سب ایسی کارروائیاں تھیں جن پر انگریز عمل کر سکے۔ ان کے علاوہ افسروں نے ایسی تجویزیں بھی پیش کیں۔ جن پر اگرچہ کسی سبب سے عمل نہ ہو سکا۔ مگر وہ اُس دور کے انگریزوں کی ذہنیت اور آتش انتقام کی تپش کا دستاویزی ثبوت ہیں۔

بعض افسروں کا اصرار تھا کہ پورا شہر مسمار کر کے زمین ہموار کر دی جائے۔ بعض کہتے تھے کہ لال قلعہ اور جامع مسجد کو بالکل منہدم کر دیا جائے۔ بعض اعتدال پسند انگریزوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ صرف جامع مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر کے دہلی کا نام لارنس آباد رکھنے پر اکتفا کیا جائے۔

آزادی کی تحریک میں ہندوستان کی تمام قومیں شریک تھیں اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی، تو اُس کا فائدہ بھی سب کو یکساں پہنچتا۔ مگر ناکامی کی صورت میں جب نقصانات کی تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کو سب سے زیادہ حصّہ ملا۔ انگریزوں سے پہلے مسلمان ہی ہندوستان کے حاکم تھے لہٰذا کامیابی کے بعد فاتحوں نے صرف انھیں سرکشی اور بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ انھی کا قتل عام ہوا، انھی کے گھر لُٹے، انھی کی جاگیریں ضبط ہوئیں اور انھی کو اقتصادی طور پر تباہ کیا گیا۔

انگریزی دور میں مسلمانوں نے پرامیسری نوٹ خرید رکھے تھے جب انگریزی حکومت کا چراغ گل ہونے لگا تو انھوں نے گھبرا کر تمام پرامیسری نوٹ آدھی سے بھی کم قیمت پر ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ ہندو نقد سرمایہ گھر میں رکھتے گھبراتے تھے اس لیے وہ اس کاغذی دولت ہی سے مطمئن ہو گئے۔ اب اُسے ان کی کاروباری سوجھ بوجھ کہا جائے یا خوش نصیبی کہ انگریز واپس آ گئے

اور اہل ہندو کو دُگنا منافع ہوا۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے پرامیسری نوٹ بیچ کر جو رقم حاصل کی تھی، وہ لٹیروں کی نذر ہوگئی۔

مسلمانوں سے پہلے ہندوؤں کو شہر میں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ لہٰذا انھوں نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پرائز ایجنسی کا مال کوڑیوں کے مول خریدنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ لُوٹ کا مال سپاہیوں وغیرہ سے خریدنے کے لیے جگہ جگہ دکانیں کھول لیں۔ لُوٹنے والوں کی ناواقفیت کی وجہ سے بڑا قیمتی سامان انھیں سستے داموں مل گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد مسلمانوں کی ضبط شدہ جائیدادیں اور مکانات نیلام ہوئے تو یہی لوگ اس کے خریدار بنے۔ غرض انگریزوں کی جانبداری اور ہندوؤں کی تاجرانہ حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ایک طبقہ بالکل برباد ہوگیا وہاں دوسرے نے انگریزوں سے بچی ہوئی ساری دولت کھینچ لی۔

انگریزوں نے ہندوؤں کو شہر میں رہنے کی اجازت کے عوض لاکھوں روپیہ بطور جُرمانہ وصول کیا تھا۔ مگر ہندوؤں نے انھی سے لوٹ کا مال سستے داموں خرید کر اور اُن کی ضرورت کی چیزیں منہ مانگی قیمت پر فروخت کر کے جُرمانے کی رقم سے کئی گنا زیادہ وصول کر لیا۔

مسلمانوں کی درماندگی اور زبوں حالی کا یہ حال تھا کہ جان لارنس کے زمانے میں انھیں شہر میں آباد ہونے کی اجازت ملی۔ نیز ازراہ ہمدردی انھیں یہ رعایت بھی دی گئی کہ وہ ڈیڑھ روپے کے عوض دو چار پائیاں اور ایک چکّی خرید سکتے ہیں۔ گویا ان دو چیزوں سے دہلی کے مسلمانوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔

جنگ آزادی کے اثرات

اگرچہ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے لیکن سزا دینے کے معاملے میں انگریزوں نے امتیازی پالیسی اختیار کی۔ ہر شعبۂ زندگی میں ان سے متعلق سخت روّیہ اختیار کیا۔ اس امتیازی سلوک کے متعلق سر عبدالرحیم نے ۱۹۲۵ء میں مُسلم لیگ کے خطبہ صدارت میں کہا:

"مسلمانوں کی تباہی کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا۔ اس سے پہلے بھی تین مختلف احاطوں میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی تھی۔ اس بار دہلی کے قریب یہ غدر ہوا، جہاں ہندوستانی تاج و تخت کا اصل وارث موجود تھا۔ گو وہ برائے نام ہی تھا مگر اس کی ذات مرکز محور سمجھی گئی اس لیے بغاوت شہرت پکڑ گئی۔ فوج میں زیادہ حصّہ ہندوؤں کا تھا مگر مسلمان ہی سرغنہ اور ہندوؤں کے بہکانے والے تصوّر کیے گئے اور انھی سے شدید اور ہول ناک انتقام لیا گیا۔"

"ہندوؤں میں سے صرف وہ لوگ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا خدشہ تھا اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندوؤں کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقے میں گزرے اسے پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا نہ کوئی مالی خاندان کا فرد بچ سکا اور نہ کسی کو چھٹکارا نصیب ہوا۔

سرسید کو بھی اس بات کا اعتراف تھا۔ چنانچہ حکومت کو سمجھاتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں نہ ہوئی ہو۔ ان دنوں میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں۔ مگر مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔"

اس قتل و غارت گری میں ہندو بھی برابر انگریزوں کی مدد کرتے رہے۔ تاریخ انگلیشیہ کے مصنف ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کی ملکیت میں ایک مکان نہ تھا غدر کے بعد وہاں بعد سے ہندو مالک بن گئے۔ مسلمانوں نے اپنا زیور، بہت سستا ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کیا۔ بارہ آنے تولہ چاندی، چودہ روپے تولہ سونا۔ بہت سے ہندوؤں کے گھروں میں غدر کیا آیا لکشمی آئی، انھوں نے سپاہیوں سے لوٹ کا مال بہت ارزاں خرید لیا۔"

غرض کہ مسلمان تمام شعبہ ہائے زندگی میں بری طرح متاثر ہوئے۔ سیاسی تنزل، معاشی بدحالی، تعلیم سے محرومی معاشرتی پستی ان کا مقدر بن چکے تھے۔

سیاسی حالت

خاندان مغلیہ کا زوال اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ہمت نہ ہاری اور برابر جدوجہد کرتے رہے۔ جب بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ تو وہ مایوسی کا شکار ہو گئے لیکن پھر بھی وہ ہمت نہ ہارے۔ میسور کی جنگ میں سلطان ٹیپو نے جام شہادت نوش کیا تو مسلمانوں کی بھی امیدیں ختم ہو گئیں

اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تو سیاسی طور پر ان کی کوئی حیثیت نہ رہی۔

معاشی حالت

اس سے قبل ہی مسلمانوں کی معاشی حالت خراب تھی۔ لیکن جنگ آزادی کے بعد مصائب میں اور اضافہ ہوگیا۔ مسلمان امراء کی تمام جاگیریں اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ تجارت وصنعت و حرفت کی جملہ مراعات ختم کر دی گئیں۔ بنگال کے مسلم کاریگر جو ململ تیار کرنے میں دُنیا بھر میں شہرت رکھتے تھے ان کی انگلیاں بے رحمی سے کاٹ دی گئیں تاکہ وہ انگریزی کارخانوں کے تیار کردہ مال کا مقابلہ کر سکیں۔ ان پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے پہلے ہی سے مسلمانوں کی اکثریت ناخواندہ تھی۔ خوش قسمت افراد کو زیادہ سے زیادہ کلرکی نصیب ہوتی تھی۔ غرض اقتصادی طور پر وہ بُری طرح تباہ ہوگئے۔ عبدالوحید خاں مسلمانوں کی ملازمت کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپڑاسی اور دواتوں میں سیاہی ڈالنے والے یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔"

تعلیمی حالت

مسلمانوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کے لیے مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ممنوع قرار دی گئی۔ اب فارسی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ مسلمان اساتذہ کی تعداد کم کر دی گئی۔ مسلمان طلباء کو نماز جمعہ ادا کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور انھیں مذہب سے بیگانہ کرنے کے لیے عیسائیت کی تبلیغ کی گئی۔ لارڈ میکالے نے جو تعلیمی منصوبہ بنایا اسی کے متعلق اس نے دعویٰ کیا کہ اس نظام کے تحت تعلیم یافتہ افراد جسمانی طور پر ہندوستانی ہوں گے۔ لیکن ذہنی طور پر وہ انگریز بن جائیں گے۔ ان حالات کے تحت مسلمان علماء نے انگریزی تعلیم کے حصول کو کفر قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میدان میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ ہندو انگریزی تعلیم حاصل کر کے تمام اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہونے لگے۔ اپریل ۱۸۶۹ء میں ہر ۱۰ ہندوؤں کے مقابلے میں ایک مسلمان تھا۔ اس کے بعد بتدریج تناسب اور بھی کم ہوتا گیا۔

بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل ۱۸۷۱ء کے مطابق گزیٹڈ ملازمتوں میں ۲۱۱۱ میں سے صرف ۹۲ کے قریب مسلمان فائز تھے۔ ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۸ء تک ہائی کورٹ کے وکلاء کی فہرست کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل ۲۴۰ میں سے ۲۳۹ ہندو واحد صرف ایک مسلمان تھا۔

ولیم ہنٹر کے قول کے مطابق "الغرض مسلمان یہاں تک اب قعر مذلت میں گر چکے تھے کہ وہ سرکاری

ملازمتوں کے ہوں تب بھی ان کو سرکاری اعلانات کے ذریعے ملازمت سے باز رکھا جاتا تھا۔ ان قابلِ رحم حالت پر کوئی توجہ نہ کرتا۔ اعلیٰ حکام تو ان کی ہستی کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔"

مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں بمبئی مدارس اور کلکتہ کی یونیورسٹیوں کے کل ۵۲۵ گریجویٹوں میں صرف ۱۷ مسلمان تھے۔ اس طرح مسلمان طلباء کی تعداد برائے نام تھی۔

معاشرتی حالت

جب کسی قوم کی سیاسی اور معاشی حالت خراب ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا معاشرہ میں بھی کوئی مقام نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی سیاسی تنزلی اور معاشی بدحالی کے باعث معاشرتی حالت بھی پست ہو گئی۔ اب ہندوؤں کو معاشرے میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ اس لیے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ تھے۔

اب آخر میں مختصراً اس بات کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اس آزادی جنگ کے بعد برطانوی حکومت کی پالیسی میں کیا تبدیلی عمل میں آئی۔ انھیں اپنے طرز حکومت کے نقائص معلوم ہو گئے۔ جن کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ عمل میں لایا گیا اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ بورڈ آف کنٹرول کو منسوخ کر کے اس کی جگہ سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (وزیر ہند) مقرر کیا گیا۔ جو برطانوی کابینہ کا ایک معزز رکن ہوتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک مشاورتی کونسل تشکیل دی گئی۔ جسے انڈیا کونسل INDIA COUNCIL کہتے تھے۔

ہندوستان کے گورنر جنرل کو وائسرائے کا لقب دیا گیا۔ پہلا وائسرائے لارڈ کیننگ مقرر ہوا۔ برطانوی حکومت نے عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ رعایا کے تمام افراد کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا اور کلیدی عہدوں KEY POSTS پر فائز کرتے وقت رنگ، نسل، مذہب کی تخصیص نہ کی جائے گی۔ بلکہ ذاتی استعداد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ عملی طور پر اس سلسلے میں کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ اب بھی ہندوؤں کو مسلمانوں پر فوقیت دی جاتی۔

یہ بھی کہا گیا کہ آئندہ سے سرکار انگریزی کسی صورت میں کوئی دیسی ریاست انگریزی عمل داری میں شامل نہ کرے گی اور والیان ریاست کے تمام قدیم عہدناموں کی پابند رہے گی۔ والیان ریاست

کو متبنیٰ بنانے کا حق قانونی طور پر ہوگا۔ رعایا کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور ہندوستانیوں تجارتی اور صنعتی ترقی کے لیے کوشش کا وعدہ بھی کیا گیا۔ علاوہ ازیں ان تمام باغیوں کی عام معافی کا اعلان کیا گیا جس پر کسی انگریز کے قتل کا الزام تھا۔

باب ۵

تحریک علی گڑھ

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ اخلاقی، فکری اور فوجی زوال کے ساتھ ان کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار بھی جا چکا تھا۔ اپنے دور حکومت میں مسلمان اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں پر متمکن تھے۔ اس لیے وہ عام طور پر تجارت سے نابلد تھے۔ حکومت گئی تو سرکاری آسامیاں بھی گئیں۔ جاگیریں اور زمینداریاں ضبط ہوئیں۔ نئی انگریزی حکومت نے چونکہ مسلمانوں سے حکومت لی تھی اس لیے اس نے ان کا زور توڑنے کے لیے اور ان کے ذہنوں سے حکومت کی بُو نکالنے کے لیے انھیں چن چن کر نشانۂ ستم بنایا اور ذلیل کیا۔ مسلمانوں کے پاس نہ اختیار رہا، نہ دولت نہ عہدے۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے بالعموم اور عیسائی مشنریوں نے بالخصوص ان کے عقائد اور دین پر بھی حملے شروع کر دیے۔ ہندوؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ آگے بڑھ کر نئے حکمرانوں کا سواگت کیا۔ ان سے شیر و شکر ہوئے۔ ان کی زبان سیکھی۔ ان کی تعلیم حاصل کی، تجارت پہلے ہی ہندوؤں کے قبضے میں تھی، اب انگریزوں سے مل کر سرکاری عہدوں پر بھی وہی قابض ہو گئے یہی نہیں بلکہ انھوں نے انگریزوں کی مدد سے مسلمانوں کی جاگیروں اور زمینداریوں پر بھی قبضہ جما لیا۔

مسلمانوں کے پاس نہ حکومت رہی، نہ دولت اور نہ وقار، انگریزی حکومت، مغربی تہذیب، عیسائی مشنریوں اور ہندوؤں کے اس چو طرفہ حملے نے ان کے ذہنوں کو شل کر دیا۔ ان کی خود اعتمادی ختم ہونے لگی اور وہ مایوسی کا شکار ہو کر اپنے اندر سمٹ گئے اور ہر روز اقتصادی بدحالی، معاشرتی پستی اور مفلوج ذہنیت کی دلدل میں نیچے ہی نیچے دھنسنے لگے۔

ولیم ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مطبوعہ ۱۸۷۱ء میں لکھتے ہیں :-

بنگال کے مسلمان جو محلوں میں شاندار زندگی بسر کرتے تھے، وہ اب ٹوٹے ہوئے مکانوں میں بیکاری اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہندو قرض خواہ ان کے مکانات اور زمینیں قرق کرائے جا رہے ہیں۔"

"اگر کوئی برطانوی سیاست دان دارالعلوم میں استعجاب پیدا کرنا چاہتا ہو تو وہ کسی بنگالی مسلمان خاندان کے زوال کے حالات من و عن بیان کر دے۔"

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ وکالت کا پیشہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۸۵۱ء تک مسلمان وکلاء کی تعداد انگریزوں اور ہندوؤں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی لیکن ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک کلکتہ کے ۲۴۰ نئے وکیلوں میں سے ۲۳۹ ہندو تھے اور صرف ایک مسلمان۔"

کلکتہ یاد رہے کہ ان دنوں برطانوی حکومت کا دارالخلافہ تھا، میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ہوگا، جس میں کسی مسلمان کو دربان یا چپڑاسی سے زیادہ کوئی نوکری ملنے کی امید ہو۔"

"تمام ملازمتیں اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ، مسلمانوں سے چھینی جارہی ہیں اور دوسری قوموں بالخصوص ہندوؤں کو بخشی جارہی ہیں۔"

سرکاری گزٹ میں ملازمتوں کے اشتہار کے ساتھ صاف درج ہوتا ہے کہ یہ ملازمتیں ہندوؤں کے سوائے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔"

ان وجوہ کی بناء پر مسلمانوں کے دل انگریزوں کے خلاف سخت نفرت سے بھر گئے۔ وہ ان کے تمدن، علوم اور حکومت ہر شے سے بیزار ہو گئے۔ ان پر محرومی کے ساتھ ساتھ گہری مایوسی چھا گئی ان کی خود اعتمادی ختم ہونے لگی اور اس کی جگہ احساس کمتری چھانے لگا۔ مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ پہلے پہل سرسید بھی ان کے مستقبل سے مایوس تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے" میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ میری قوم پھر پنپ سکے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔" چنانچہ انھوں نے ہندوستان چھوڑ کر مصر میں آباد ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ پھر خیال آیا: "نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اسی تباہی کی حالت میں چھوڑ کر کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! ان کی اس مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور (قوم پر) جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔"

مسلمانوں کو اس چوطرفہ حملے سے بچانے، اس کی کھوئی ہوئی خود اعتمادی بحال کرانے، ان کا احساس کمتری دور کرنے اور انھیں جہاد زندگانی میں صحیح طور پر مردانہ وار شریک کرانے کے لیے کئی محاذوں پر جارحانہ اور مدافعانہ کارروائیوں کی ضرورت تھی۔ سرسید کی عظمت کا اندازہ کیجیے کہ انھوں نے مایوسی اور بے دلی کی اس گمبھیر فضاء میں تمام حالات کا صحیح صحیح اندازہ کیا اور پھر ہر محاذ پر تن تنہا مردانہ وار ڈٹ گئے۔

سرسید احمد خاں نے اپنے ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر مسلمانوں کے قومی تشخص کے تحفظ کے لیے سیاسی، مذہبی، تعلیمی اصلاح و ترقی کی جو ہمہ گیر تحریک (علی گڑھ) شروع کی۔ اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو بہت زیادہ

متاثر کیا اور اپنے حلقۂ اثر میں سے کر ان میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔

تحریک علی گڑھ کا پس منظر

تحریک علی گڑھ دراصل سرسید احمد خاں کی ان مسلسل اور بے لوث خدمات کا نام ہے جن کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ جس وقت ہندوستان میں جنگ آزادی ہوئی اس وقت سرسید احمد خان کی عمر صرف ۴۱ سال کی تھی اور اس جنگ آزادی کے بعد مزید چالیس سال تک زندہ رہے۔ حقیقت میں ابتدائی چالیس سال تو عالم تحیر میں گزرے اور یہ وہ زمانہ ہے جب اودھ تو کیا پورے ہندوستان پر انگریزی تسلط غالب آتا جا رہا تھا اور ۱۸۵۷ء میں تو انگریز کو اپنے پنجے زیادہ گہرائی سے گاڑنے کے مواقع مل گئے۔ بقول فرنگی بغاوت فرو ہو چکی تھی۔ غدر کا زور ٹوٹ گیا تھا اب انگریز اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان عناصر (حریت پسندوں) کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جس نے اس شعلے کو ہوا دی اور جو اس کی شدت کا باعث بنے۔

ہندو اپنی پوری مکاری سے انگریز کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ سارا ہنگامہ مسلمانوں نے کرایا تھا اور مسلمان ہی اس کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی قوت گم کردہ عظمت کی بازیابی کے لیے یہ شور برپا کیا تھا اور اپنی سازش کو کامیاب بنانے کے لیے ہندو کو اپنے ساتھ ملوث کر لیا تھا۔

اسے بدقسمتی کہیے یا خودداری مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا، جو اپنا نقطۂ نظر لوگوں کے علاوہ انگریز کو بھی اس انداز سے سمجھاتا جس سے مثبت انداز کی قوت فکر کی تحریک ہوتا ہو، چنانچہ مسلمانوں کو بے بس و بے پر کرنے کے لیے انگریز نے سب سے پہلے ان لوگوں سے جائدادیں چھین لیں، پھر ان کی نگرانی میں مختلف جاگیروں کو غصب کر لیا اور آخر میں اوقاف کی زمین اور اس سے ملحقہ تمام علاقہ بحق سرکار ضبط کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاست کی سب سے زیادہ مار پڑی۔ ایک اندازے کے مطابق بنگال میں تقریباً ایک چوتھائی زمین تعلیمی اوقاف سے متعلق تھی۔ جس سے ہزاروں مسلمان علماء و فضلاء پلتے تھے۔ سیکڑوں مدرسوں کو مالی امداد مل جاتی تھی اور اسلامی تعلیم کا بول بالا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں انگریز نے ایک قانون کے تحت ان اوقاف کی تمام جاگیروں کو ضبط کر لیا اور انھیں مختلف زمروں میں تقسیم کر دیا۔ ان زمروں میں مشینری کے اخراجات، ہندو کی حوصلہ افزائی اور دیگر مسلم کش مدیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انگریز نے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے متعدد سیاسی راہنماؤں کو عمر قید کر کے جزائر انڈیمان بھیج دیا۔ انگریز کی زد میں سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن کا زیادہ تر تعلق بہار اور اڑیسہ سے تھا کیونکہ ان علاقوں میں انگریز کو نہ صرف مسلمانوں کی قوت کا احساس ہوا تھا۔ بلکہ ان کی طرف سے زبردست مزاحمت بھی ہوئی تھی۔ انگریز نے ان علاقوں سے

تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو بے حد بے رحمی نے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مسلمان کاشتکاروں پر تعداد اور ناقابل برداشت ٹیکس نافذ کر دیے۔ ان ٹیکسوں کے نفاذ سے انگریز کا مقصد ان لوگوں کو اقتصادی طور پر بدحال کرنا تھا اور انھیں زیادہ سے زیادہ پس ماندگی کے گہرے کنوئیں میں دھکیلنا تھا۔

مسلمان انگریز کی بدنیتی کو بخوبی سمجھتے تھے لیکن قوت کے فقدان اور عدم رسائی کی بناء پر وہ کوئی ہاتھ پیر نہ مار سکتے تھے انگریز کے سامنے جب بھی کوئی مسلمان آتا، تو انگریز کے ذہن میں مسلمان ایک غاصب حق اور باغی اول کی حیثیت سے آتا۔ مسلمان کو پس ماندہ کرنے کے لیے تجاویز بھی ہندو نے انگریز کو پیش کیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ پورا پورا اتفاق کرتے ہوئے اور انھیں اپنی مسلم رعایا کے ہی ہم پلہ گردانتے ہوئے انھیں اس قدر زیادہ مراعات و حقوق سے نوازا ہوا تھا کہ کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ متعدد سرکاری محکموں میں ان کا پورا کنٹرول تھا اور بہت سی سرکاری پالیسیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں بالخصوص مالیات کا محکمہ تو مغلوں نے ہندوؤں کے لیے وقف کر رکھا تھا اور اس سلسلے میں یہ مغل بادشاہ ہندوؤں کے مشوروں کو ضرور زیر غور لاتے تھے مالیات کا محکمہ ایک ایسا ادارہ ہے۔ جس میں ہر متعلقہ فرد کو لازماً کچھ نہ کچھ علم کا علمبردار ہونا پڑتا ہے۔ تعلیمی و اقتصادی و معاشرتی حیثیت سے متعدد دیگر افراد کی نسبت زیادہ بہتر نوعیت و اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس کے علاوہ مغلوں نے ان لوگوں کی اس قدر حوصلہ افزائی کی ہوئی تھی کہ پولیس، فوج اور عدلیہ میں بھی ان کو بہت دخل تھا۔ اس طرح زندگی کے زیادہ اہم اور انتظامی حلقوں میں ان لوگوں کو مغلوں نے خود ہی مشتاق بنا دیا ہوا تھا مسلمانوں کے زوال پذیر ہوتے ہی ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی لامتناہی کوششیں شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز کے برسر اقتدار آتے ہی ان لوگوں نے خود کفالت محسوس کر لی اور جو حلقہ ہائے حیات میں کچھ پڑھا تھا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز کی پوری جدوجہد سے مدد کی۔

مسلمان ان دنوں میں ذہنی طور پر آزاد تھا، لیکن فکر معاش نے ان کی تمام تر صلاحیتوں کو سلب کر لیا تھا اس کے ذہن کی روشنی حالات کی تاریکی میں ڈوب کر رہ گئی۔ اس کا تمام تر عزم و لولہ مایوسی کے گڑھے میں جا گرا، اس کی پوری کی پوری انتظامی صلاحیت حالات کی بدانتظامی کا شکار ہو گئی تھی اور یہ حالات انگریز کے ہی بنائے ہوئے تھے اور اس کے لیے وہ باقاعدہ سازش کے تحت چل رہا تھا۔ اقتصادی، ذہنی اور تعلیمی طور پر بیدار مسلمان لیکن حالات سے بیزار بیچارہ اپنی ہی دل سوزی کے اور کیا کر سکتا تھا، تاہم اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور اس وقت کی تلاش میں سرگرداں ہوا، جب اس کے روز حیات میں کسی آفتاب کے طلوع ہونے کی کرن نظر آنے لگی۔ مسلمانوں نے تاریخی طور پر جو زیادہ مار کھائی، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ

تھی کہ اس کی لیڈر شپ میں فقدان تھا، اس کے برعکس ہندوؤں کی ترجمانی کرنے کے لیے اور انگریزوں کو گمراہ کرنے کے لیے بہت سے ہندو دست بستہ انگریز کے حضور میں ایستادہ رہنے کو تیار تھے۔

اس صورت حال کو سرسید احمد خاں نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ سرسید نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء زندگی کے اس حصے میں بنظر خود دیکھا جب انسان عقلی اور ذہنی طور پر پختگی کے دائرے میں داخل ہو گیا ہوتا ہے۔ حساس طبیعت ہونے کے سبب سرسید نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو حوصلے کی مہیز دے کر کھڑا کرنا چاہیے اور اس میں سیاسی طور پر چلنے پھرنے اور اپنے دشمن کا مؤثر مقابلہ کرنے کی پھر سے ہمت ہونی چاہیے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے قوم کو مختلف زاویوں سے تیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور اسی طرح ہندو کے تعصب کے زور کو توڑنے کے لیے مدلل تقریریں شروع کر دیں اور مسلمان کو گمراہی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے ادبی، معاشرتی، اقتصادی اور علمی زاویوں سے جدوجہد شروع کر دی اور ان کوششوں کے ذریعے انھوں نے انگریز کو اس امر کا احساس کامیابی سے دلا دیا کہ "غدر" کی تمام تر ذمہ داری صرف مسلمان کے سر ہی نہیں تھوپی جا سکتی۔ اس میں ہندو بھی برابر کا شریک تھا۔

تحریک علی گڑھ کے بنیادی مقاصد

سرسید احمد خاں مسلمانوں کی کمزوریوں اور صلاحیتوں دونوں سے مخاطب تھے۔ ان کی حکمت عملی اور ان کے سیاسی افعال اس خیال کے ماتحت رہے کہ انگریزی حکومت بہت زیادہ مضبوط ہے اور اسے مسلمانوں کی جدوجہد سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ابتدا میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مشترک ہیں کیونکہ وہ ایک ہی سرزمین کے باشندے ہیں، اس لیے آغاز کار میں ان کی حکمت عملی بعض مشترک مقاصد کے حصول کی حامل تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہتر تعلقات اور تعاون پر ان کا عقیدہ ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن جب ہندوؤں نے کھل کر ایسی حکمت عملی اختیار کی جو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کے بجائے منافرت کے جذبات پر مبنی تھی۔ جس کا ایک اظہار لسانی تنازعہ میں ہوا، تو ان کے خیالات میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ اور یہ تبدیلی ان کی زندگی کے آخر تک برقرار رہی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل، گنپتی کے تیوہار اور ذبیحہ گاؤ کے خلاف شورش نے انھیں نہ صرف دو قومی تصور کا شعور دیا بلکہ اسے تقویت بخشی، مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کانگریس کے مقاصد کو سمجھا تھا۔ کانگریس کے خلاف دیے گئے ان کے بیانات کو اس وقت مسلمانان برِ عظیم کے سیاسی مستقبل کے لیے ان کا نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے ان کے خیال پر کہ مسلمان انگریزی عہد سے جدید ہندوستان میں انگریزی زبان، مغربی علوم

اور جدید مغربی سیاسی نظریات سے واقفیت کے بعد ہی اپنے منفرد وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ سید احمد خاں کی شدید مخالفت ہوئی، لیکن اس امر کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں کی سطح تک پہنچا دیں۔ کسی وقت خود سر سید احمد خاں نے برِ عظیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے میکالے کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔ لیکن بعد کی صورت حال کے پیش نظر انھوں نے اپنی رائے کو قطعاً بدل دیا، انھوں نے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا اور پھر ان کے لیے بتدریج ایک حکمت عملی وضع کی جس میں تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو سنبھلنے اور ترقی کرنے کے لیے پہلے مغرب کے علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے "باشندگان ہند کی تعلیمی ترقی" کے متعلق باشندگان ہند پر زور دیا کہ مغربی علوم کو اردو تراجم کے ذریعے برِ عظیم کے باشندوں میں مقبول عام بنایا جائے۔ ان کی قائم کردہ "سائنٹیفک سوسائٹی" کا یہی مقصد تھا لیکن وہ تعلیمی میدان میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے یہ سوسائٹی محض اس کا ایک جزو تھا۔ انھوں نے ابتداً (۱۸۵۹ء میں) مراد آباد میں فارسی مدرسہ قائم کیا۔ پھر غازی پور میں ایک سکول شروع کیا جو علی گڑھ منتقل ہو کر کالج کے معیار تک پہنچ گیا۔ ان کا خواب دراصل یہ تھا کہ ایک ایسی جامعہ قائم کی جائے جو برِ عظیم کے مسلمانوں کے لیے مثالی اور مشعل راہ ثابت ہو، جو مغربی علوم اور اسلامی اقدار کا گراں بہا امتزاج پیدا کرے اور اس میں رہ کر طلبہ کردار کی ان خصوصیات کو ترقی دیں جنھوں نے سلطنتیں تعمیر کیں۔ ۱۸۶۹ء میں سید احمد خاں انگلستان گئے اور وہاں سے نئی تعلیم و تہذیب کی ترویج کا ایک نیا جوش اور ولولہ اور اصلاح و ترقی کا ایک نیا منصوبہ لے کر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے، دسمبر میں "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر غور کرنے کے لیے کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہند" بنائی۔ جس نے ایک اسلامی درس گاہ کا خاکہ مرتب کیا۔ مدرسۃ المسلمین کی تاسیس اور فراہمی زر کے لیے ایک کمیٹی "خزینۃ البضاعت" قائم کی۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں نئے مدرسے کا افتتاح ہوا جو اسلام کی تاریخ میں پہلی جدید درس گاہ تھی۔

یہاں کی تحریک کی جزوی منزلیں تھیں کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کا ایک ایسا تعلیمی مرکز قائم کرنے کی کوشش کی تھی، جس کے ذریعہ مسلمان اپنا علمی مقام حاصل کر سکیں۔ اس کالج نے مسلم ملت کی تشکیل میں ایسے وقت پر ایک اہم کردار ادا کیا جب وہ محکوم اور زوال پذیر تھی۔ اس نے ایسے مسلمانوں کی ایک نسل تیار کی جو اسلام کے ساتھ اپنی بنیادی وفاداری کو کم کیے بغیر دنیا کے جدید تقاضوں اور نظریات سے گریزپا نہیں تھی۔ اس نے برِ عظیم میں ایک سالم و متحد مسلم ملت کے خیال کو بیدار کیا۔ اس طرح یہ بیک وقت ایک تعلیمی ادارہ بھی تھا اور ایک تحریک بھی، جس نے قوم کو ایک نئی امید اور ایک نیا مقصد دیا۔

سید احمد خاں نے قومی تعلیم کی تحریک کو ہندوستان بھر میں پھیلانے اور مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے ۱۸۸۶ء میں ایک غیر سیاسی، تعلیمی و اصلاحی انجمن "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" قائم کی۔ جس نے بعد میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا نام اختیار کیا اور مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے ایک مؤثر مرکزی ادارے کی صورت اختیار کرلی۔ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں کئی لحاظ سے ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کالج سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے سیاسی و نیم سیاسی امور میں کانفرنس ہی قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ سید احمد خاں جس "ورنیکلر یونیورسٹی" کو قائم کرنا چاہتے تھے، اسی کانفرنس نے ہی اس کام کو آگے بڑھایا۔ اس کے طفیل مسلمانوں نے جدید تعلیم کے مغربی نظریات سے واقفیت حاصل کی۔ سیاست میں بھی انھوں نے جدید رجحانات کو قبول کیا اور ان کے زیر اثر برعظیم کی سیاسی زندگی میں اپنی حیثیت و اہمیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر سرگرمیاں دکھائیں۔ بعد میں پیدا ہونے والی تحریک آزادی میں ایک نمایاں اور امتیازی حصہ لیا اور نہ صرف انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی بلکہ ہندوؤں کے مقابلے میں بھی خود کو فعال رکھا۔ سید احمد خاں کی حکمت عملی اپنے نتائج کے لحاظ سے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف مغربی تعلیم کے نئے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی ایک تحریک بھی تھی۔

دراصل سید احمد خاں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے منصوبوں سے مستفید کرنے اور انھیں اپنے ساتھ تعاون کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے مطمع نظر میں انقلاب برپا کر دیں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے اپنا رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تھا اور اس کے ذریعے یہ کوشش کی تھی کہ ایک وسیع محاذ پر ایک اصلاحی لائحہ عمل کو بروئے کار لائیں۔ ان کے جوش و خروش سے کوئی پہلو نہیں بچا۔ ان کی اصلاحات میں بہت کم اصلاحات ایسی ہیں جن کی اصل محققین اسلام کی تصانیف میں موجود نہ ہوں۔ البتہ سابقہ محققین کی اصلاحات اسی حد تک محدود رہیں، جہاں تک کہ اس زمانے کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ سید احمد خاں عام معنی میں مذہبی مفکر نہیں تھے نہ انھوں نے کوئی نیا فلسفہ تشکیل دیا، نہ کسی نئے مذہبی نظام فکر کی ابتدا کی۔ زندگی کے متعلق جس نقطۂ نظر کو وہ غلط سمجھتے تھے۔ اس سے کہ اسلام کے بارے میں خود اپنے فہم و ادراک تک جو کچھ تھا۔ سب کو انھوں نے قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی تحریروں کی تہ میں ایک عمیق مقصد پوشیدہ تھا۔ وہ اس حقیقت کو اپنی قوم کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ جدید سائنسی تحقیق اسلام کی تخریب نہیں کرتی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جو مذہب وحی کے ذریعے آتا ہے وہ حقیقتاً خدا کا قول ہوتا ہے اس لیے قوانین فطرت کی، جو خدا کی تخلیق ہیں۔ خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔ یہی وہ اصول ہے جسے اسلام کے متعلق ان کی تصانیف کی روح کہا جاسکتا ہے۔ ان

کے مذہبی شعور کی بنیاد سائنسی عقلیت، اسلامی فکر کی حرکیت اور اس کی ارتقا پذیری ہے وہ تجدید اور اجتہاد کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے۔ تاکہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے ارتقاء کی نئی نئی راہیں کشادہ تر ہوں۔ فی الحقیقت انھوں نے مسلمانوں کے ذہن کو ان تفاسیر سے ہٹانے کے لیے جو یونانی فلسفے کے زیر اثر لکھی گئی تھیں۔ سب سے پہلے رہنمائی کی اور قیاسی فکر کی جگہ فطری علوم کے عینی مشاہدے کی مدد سے قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کی فکر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک انسان تھے اس لیے سہو و خطا سے بچ نہیں سکتے تھے اس بنا پر ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں مگر ان کی تفسیر کے بنیادی تصورات نامعقول اور غیر اہم نہیں ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی راہ دکھائی جس پر چلنے سے برِ عظیم کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کو نئی راہیں ملیں۔

علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقاصد کی تکمیل مذہبی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ سید احمد خاں کے مذہبی معتقدات کو اگر بغور دیکھا جائے تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو صداقتیں علمائے اسلام کی تصانیف میں فرداً فرداً ضبط تحریر میں آئی تھیں۔ ان سب کو انھوں نے یکجا کر کے بیان کر دیا ہے کیونکہ جو مزید تیں اس وقت بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہو سکتی تھیں۔ اپنے اعتقادات کے اعتبار سے سرسید احمد خاں نے جہاں اختلاف کیا ہے وہاں وہ تنہا نہیں بلکہ ہر مسئلے میں کم یا زیادہ اکابر علمائے اسلام سید احمد خاں کے ساتھ متفق الرائے ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، شیخ اکبر، شاہ ولی اللہ وغیرہ۔

ملت اسلامیہ میں ترقی کا خیال اور ماضی کے مقابلے میں مستقبل کی اہمیت کا احساس بھی سید احمد خاں کے اثرات کا ثمر ہے۔ انھوں نے اپنی زبان اور ادب کو سربلند کرنے اور سنجیدہ علمی اور عملی کاموں کی طرف توجہ دلانے میں بھی مثالی کردار ادا کیا۔ علی گڑھ تحریک سے قبل اردو شاعری و ادب میں اجتہاد کی نئی تحریک "انجمن پنجاب" کے ذریعے شروع ہو چکی تھی۔ جس نے سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ یہ فی الحقیقت ادب کو مقصدیت کی طرف لے جانے کی ابتدا کی لیکن مؤثر کوشش ہے اس طرح ادب حیات و کائنات کے مسائل کی بھرپور ترجمانی کے قابل ہو سکا۔ شاعری کے موضوعات میں حب الوطنی، محبت و مروّت، محنت و کاوش، امن و انصاف اور اخلاق و معاشرت شامل ہوئے۔ زندگی کے برحق ہونے کا یقین، عمل اور ترقی کی اہمیت، انسان اور معاشرے کا تمدنی اور معاشی رابطہ اور ان سب سے زیادہ عقل و دانش کی برتری وغیرہ سرسید احمد خاں کے نظریۂ ادب و فن کے چند اصولی عقائد تھے۔ وہ ادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے ان کی تحریروں اور "تہذیب الاخلاق" کے مجموعی اثر نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے

کی سیاست اور معاشرت سے مربوط کرکے اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل تجویز کرنا شروع کیا۔

سید احمد خاں کی تحریک نے جو ادب پیدا کیا وہ کئی لحاظ سے اس ادب سے مختلف ہے جو اس سے پہلے موجود تھا۔ اس دور سے قبل کی شاعری اس منظم اجتماعی معاشرتی احساس کی حامل نہیں جو مثلاً حالی اور شبلی کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ سید احمد خاں سے متاثر افراد کی شاعری میں اجتماعی طور پر محسوس کیے ہوئے جذبات اور سوچے سمجھے ہوئے افکار پائے جاتے ہیں اور مسائل قومی کا بیان اور ان کا عقلی حل پایا جاتا ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے سلسلے میں ادب کی عمرانی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگاکر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت قائم کی۔ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا یہ رویہ اور مصنفین میں معاشرتی ذمہ داری کا احساس علی گڑھ تحریک کے بعد اردو ادب کی ہر صنف میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

سید احمد خاں ہندوؤں کے طرز عمل کے سبب آئندہ کے لیے دونوں قوموں کے تعلقات میں کسی بہتری کی امید نہیں رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلم قوم کو دم لینے کی کچھ مہلت مل جائے تاکہ وہ مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی کوتاہیوں اور ذہنی قابلیتوں کی نمایاں کمی کو پورا کر سکے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہتر تعلقات اور تعاون پر ان کا عقیدہ مدت العمر تک رہا لیکن جب ہندوؤں نے کھل کر ایسی حکمت عملی اختیار کی جو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کے جذبات پر مبنی نہیں تھی۔ تو سید احمد خاں کی سیاسی حکمت عملی نے تبدیلی اختیار کی۔ اردو ہندی کے تنازعے میں ہندوؤں کے رویے نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ انھیں ہندوؤں پر اعتبار نہیں رہا۔ اب وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس خالصتاً ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کی شمولیت کا نگریس کی مخالفت کی۔ ہندوؤں کی فرقہ پرستانہ ... کوششوں کو دیکھ کر سید احمد خاں کا یقین راسخ ہوتا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں ان کا مذہب، تمدن اور نظریۂ حیات جدا جدا ہے۔ اس لیے یہ دونوں قومیں مل کر زیادہ دیر تک متحد نہیں رہ سکتیں۔ ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں :۔

"ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے۔ تو مسلمان کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو... نقصان میں رہیں گے۔"

اب انگریزوں کے بارے میں بھی وہ دبے دبے لفظوں میں تلخی کا اظہار کر لیتے تھے لیکن ہندوؤں کے مقابلے میں اور ہندوستان کے ایک ملک ہونے کے بارے میں ان خیالات میں خاصی شدت پیدا ہو گئی تھی۔

"ہندوستان براعظم ہے ۔۔۔۔ اس میں مختلف آبادیاں ہیں، جن کے تمدنی اور اخلاقی اور سوشل اور پولیٹیکل اور مذہبی اور طبعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔"

سید احمد خاں نے علیحدگی کا کوئی باقاعدہ خاکہ پیش نہیں کیا، لیکن اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہے کہ وہ ایک ایسی مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی اصل بنیاد مذہب پر ہو گی۔

"دوستو ہماری پوری تعلیم اس وقت ہو گی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو گا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج سر پر۔"

مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کانگریس کے حقیقی مقاصد کو سمجھا تھا۔ کانگریس کے خلاف دیے گئے اُن کے بیانات کو اس وقت برّعظیم کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے پھر ان کے یہ تصورات کہ :-

۱۔ ہندوستان ایک ملک نہیں، برّاعظم ہے۔

۲۔ ہندو اور مسلمان ایک نہیں، دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔

۳۔ علیحدگی بہر حال لازمی ہے۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ جدید دنیائے اسلام کے دیگر مفکرین میں مقاصد اور تحریک کے لحاظ سے سید احمد خاں کو کئی امتیاز حاصل ہیں۔ وہابی، سنوسی اور ولی اللہی تحریکیں اصلاحی اور سیاسی تھیں۔ جمال الدین افغانی کی ساری عمر ہنگامہ آفرینی اور سفر میں گزر گئی۔ ویسے ان تمام مصلحین میں جمال الدین افغانی کے علاوہ کسی نے بھی جدید مغربی علوم اور فلسفہ کے ان گہرے اثرات کا اندازہ نہیں لگایا تھا جو اہل مغرب کے سیاسی تسلط کے ساتھ مسلمانوں کے قلب و نظر میں اضطراب و ہیجان پیدا کر رہے تھے اور جن کی وجہ سے وہ اپنی تہذیبی و فکری میراث اور روایتی قدروں کا از سر نو تنقیدی جائزہ لینے پر مجبور ہو رہے تھے۔ سید احمد خاں نے اس صورت حال میں خود کو اس دوراہے پر کھڑا ہوا پایا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانانِ ہند جدید علوم کی طرف رجوع کریں اور تقلید سے گریز کریں۔

مقاصد اور فکر و عمل کے تعلق سے اقبال اور سید احمد خاں دونوں میں بڑی حد تک مشابہت تھی اقبال

سید احمد خاں کے بعد پہلے مفکر ہیں جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے صدیوں سے تقلید اور جمود اور فرسودات میں جکڑے ہوئے ذہن کو آزاد کرنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کی کوششوں کی۔ دونوں نے اپنے اپنے انداز میں سمجھایا کہ اسلام عقیدہ عمل کے ایسے اصولوں پر مشتمل ہے جو ہر عہد کے مسائل میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی حقیقت اور ماہیت کو اچھی طرح سمجھ کر اور زمانے کے حالات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر انھیں زندگی پر منطبق کیا جائے۔ یہی عمل کو اسلامی شریعت کی اصطلاح میں اجتہاد ہے جس کی ضرورت پر سید احمد خاں اور اقبال دونوں نے زور دیا۔

ان باتوں سے بہر صورت سرسید کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں ایک ایسی تحریک پیدا کی جائے جس سے یہ لوگ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے میں ایسے خطوط حاصل کر سکیں جن پر چل کر وہ منزل تک آسانی سے پہنچ جائیں، وہ مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے ایک نہج معتبر کرنا چاہتے تھے۔ جو انھیں آزادی کی طرف لے جائے۔ اس تحریک کو انھوں نے علی گڑھ سے شروع کیا، اور علی گڑھ ہی میں اس کو پروان چڑھایا۔ اس لیے اس تحریک کو تحریک علی گڑھ کا نام دیا گیا۔ ذیل کی سطور میں ہم تحریک علی گڑھ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں گے، جن سے ظاہر ہوگا کہ سرسید نے وہ کون سے انداز اختیار کیے جن کے ذریعے انھوں نے انگریزوں کی نظر میں مسلمانوں کے وقار کو ایک بار پھر بلند کیا۔

سرسید احمد خاں اور تحریک علی گڑھ

ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں تیرہویں صدی (۱۹ ویں عیسوی) کا نصف اوّل سید احمد شہید بریلوی کی تحریک جہاد سے چمک اٹھا تھا۔ نصف آخر اسی نام کے دہلوی بزرگ کے کارناموں سے تابندہ ہے۔ عمر کے سرے پر انھیں سرکار انگریزی نے سر کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہ ان کے نام کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا کہ عام طور سے سرسید کہلاتے ہیں۔ دربار دہلی کا موروثی خطاب "جوادالدولہ" بہ اضافہ "عارف جنگ" ابوظفر بہادر شاہ نے ۱۸۴۲ء میں عنایت کیا تھا۔

سرسید دہلی کے ایک معزز گھرانے میں بتاریخ ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ (۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء) پیدا ہوئے۔ درویش مزاج باپ، حضرت غلام علی شاہ صاحب (مجددی) کے خاص مرید تھے۔ ماں نہایت زیرک، نیک نہاد خاتون تھیں۔ بچپن انھی کے سلیقہ مند ہاتھوں نے سنوارا۔ نانا، دبیر الملک خواجہ فرید، لال قلعے میں وزارت اور کمپنی کی سرکار میں سفارت کے عہدوں پر فائز ہوئے تھے۔ رتبہ عالی کے ساتھ بڑے ذی علم، فقیر دوست شخص گزرے ہیں۔ ہیئات و ریاضی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ سید صاحب کی تعلیم و تربیت ننھیال ہی میں ہوئی۔ وہ خاندان شاہ عبدالعزیز سے عقیدت و خصوصیت رکھتا تھا۔ مجددی طریقے کے اگلے صوفیوں میں میرزا

کہلاتے ہیں۔ انھی دو نوں نسبتوں سے سید صاحب اپنے آپ کو کٹر وایم چوڑھا وہابی کہا کرتے تھے۔ ان کی نوجوانی عیش و فراغت بلکہ کسی قدر عیاشی میں گزری جوان دنوں مسلمان امیرزادوں کا شعار ہو گئی تھی۔ تعلیم کے لیے بہت اچھے استاد موجود تھے مگر فارسی کی معمولی درسیات کے بعد سید صاحب نے صرف متوسط درجے کی عربی پڑھی قدیم ریاضیات اور علم ریاضی میں خاصا ادراک حاصل کیا۔ کچھ مدت تک طب پڑھتے رہے۔ ادبیات فارسی کا ذوق آزردہ، غالب و صہبائی جیسے اہل کمال کے راستوں سے مجلی ہوا۔

والد کے انتقال اور قلعے کی یافتیں موقوف ہونے کے بعد سید صاحب دہلی کی انگریزی کچہریوں میں نوکری کرتے رہے۔ پھر منصفی کا امتحان دے کر کئی سال تک یہیں منصف رہے۔ ۱۸۴۶ء میں بڑے بھائی کی وفات کا سخت صدمہ اٹھایا۔ دنیا سے دل سرد ہو گیا۔ مہینوں زاہد مرتاض رہے۔ حدیث و فقہ کی چند کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ عہد رفتہ کے مطالعے سے شغف ہوا دہلی کے نئے پرانے کھنڈر دیکھتے پھرے۔ کتاب "آثار الصنادید" لکھنی شروع کی۔

۱۸۵۵ء میں سید صاحب ترقی پا کر بجنور کے صدر امین (سب جج) بنائے گئے۔ وطن چھوڑنا پسند نہ تھا۔ مگر بعض بالادست انگریز ان کے قدردان اور بہت مہربان ہو گئے تھے۔ انھی کے اصرار سے یہ عہدہ قبول کیا۔ بجنور میں بھی علمی مشغلہ جاری رہا۔ سرکاری طور پر اس ضلع کی مفصل تاریخ تالیف کی تھی۔ جو ۱۸۵۷ء کی آندھیوں میں اڑ گئی۔ انھی دو سال کا ایک اور مفید تحقیقی کام "آئین اکبری" کی تصحیح و تحشیہ تھا۔ جس کی اہل علم نے بڑی قدر کی۔ ۱۵ برس بعد بلوخ مین کا انگریزی ترجمہ سید صاحب کے باتصویر نسخے سے مستفید ہوا۔ اس وقت تک انھوں نے اور کئی رسالے ہندسی، تاریخی، قانونی اور مذہبی موضوعات پر تحریر کیے۔ ان کی تفصیل حیات جاوید میں درج ہے۔ فقط فہرست پڑھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ قلم کی روانی اور ذہانت کی فراوانی کے ساتھ خدا نے سید احمد خاں کو کس قدر مستعدی اور جفاکشی عنایت کی تھی کہ اہم سرکاری فرائض کشید ذاتی اور خاندانی مشاغل کے باوجود اتنے وسیع مطالعے اور تحقیق و تالیف کے کام سرانجام دے لیتے تھے۔ یہ وصف مرتے دم تک ان کا مابہ الامتیاز رہا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے عمیق تاثرات

۱۸۵۷ء کے خونین گرداب نے ضلع بجنور کو لپیٹ لیا۔ اس وقت وہاں انگریز مع انگریز مرد و عورت کی تعداد بیس تھی۔ بلوائی انھیں مارنے کے درپے ہوئے۔ سرسید کی جانثاری، جوانمردی اور ہوش مندی سے ان کی جان بچی۔ خیریت سے رڑکی پہنچا دیے گئے۔ امن پسند ہندوا ور مسلمان دونوں کی درخواست پر ضلع کا انتظام سید صاحب کے سپرد ہوا تھا مگر باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کے ریلوں میں

قائم نہ رہ سکا۔ ان کا اور ساتھ کے مسلمان عمّال مال اسباب تک لٹ گیا۔ مشکل سے جان بچی۔ افتاں وخیزاں پھٹے کپڑوں میں میرٹھ پہنچے اور بیمار پڑے رہے۔ اس عرصے میں دہلی کو انگریزوں نے چھین لیا اور وہاں کے مسلمان شرفا، پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ سید صاحب کے خاندان کے کچھ مرد مارے گئے، باقی شہر سے نکل گئے۔ صرف ان کی والدہ اور خالہ خدا کے بھروسے سے نوکروں کے بیوت میں بیٹھی رہیں۔ انھیں خود جا کر میرٹھ لائے مگر فاقہ کشی اور صعوبتوں نے ماں کو نیم جان کر دیا تھا۔ چند ہفتے بعد ان کا میرٹھ ہی میں انتقال ہوگیا۔

اسی آمد ورفت میں سید صاحب نے دہلی کے مسلمانوں کی تباہی دیکھی۔ وہ جو کسی دوست آشنا کی مصیبت سے بے چین، کسی ایک ہی عزیز کی رحلت سے بے قرار ہو جاتے تھے۔ تقدیر نے پورے شہر کی جان کنی اور موت انھیں آنکھوں سے دکھا دی۔

سید صاحب کو خدماتِ غدر کے صلے میں خلعت، نقد انعام دو سو روپے ماہانہ کا ایک وظیفہ اور ترقی دے کر مراد آباد کا صدر الصدور (یعنی حاکم عدالت ضلع) بنایا گیا تھا۔ وہیں انھوں نے رسالہ "اسباب بغاوت" تصنیف کیا جس میں نہایت خوبی اور دلیری سے لوگوں کی ناگواری کا سبب انگریزوں کے حاکمانہ عزور و خود رائی کو ٹھہرایا اور کشت وخون کی ذمہ داری دیسی فوجوں تک محدود کرنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں کی تباہی اور انگریزوں کی منتقمانہ کارروائی اچھی طرح سمجھنے اور خاطر نشین کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ آخر عمر تک یہی خلش ان کے افکار کے تاروں کو جنبش دیتی رہی اور جو سیاسی یا ملّی مسلک انھوں نے اختیار کیا اس کا قومی محرک اسی تاثر کا آفریدہ تھا۔ حقیقت یہ کہ دیسی فوج میں انگریزوں سے بگڑنے کی ابتدا، ہندوؤں کے مذہبی تعصبات نے کی تھی۔ مگر جب مسلمان مقابلے میں کود پڑے تو دونوں قسم کے مجاہدوں نے خوب سر کٹوائے، جان پر کھیل گئے۔ اسی کے ساتھ ان مسلمانوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی جو انگریزوں کی خیر خواہی میں ثابت قدم رہے اور خود جوکھوں میں پڑ کر فرنگیوں کی جانیں بچائیں۔ وفاداری کے صلے میں سرکار انگریزی نے انھیں انعام دینے سے دریغ نہیں کیا۔ مگر من حیث القوم انگریزوں کے غیظ و غضب کا سب سے زیادہ شکار ہوئے۔ انھی نے جان ومال، سابقہ جاہ وجلال کا بے حساب نقصان اٹھایا۔ غیر مسلم ہمسایوں نے اس موقع سے جا بہ جا نفع کمایا۔ جھوٹی سچی مخبری سے انگریزوں کی بدظنی بڑھاتے رہے۔ مسلمانوں کی خانہ بربادی پر اپنے رسوخ کی عمارتیں تعمیر کیں۔ یہ واقعات سید صاحب کے پھوڑوں پر نشتر چلاتے تھے۔ سفاک فاتحین کا ہاتھ پکڑنے کی طاقت نہ تھی۔ بجنور و مراد آباد کے محدود حلقۂ اثر میں جہاں تک ہو سکا۔ بے گناہ مسلمانوں کو دیو انتقام کا لقمہ بننے سے بچایا۔ ۱۸۶۰ء میں ایک ضخیم تذکرہ تیار کرنے کی تجویز کی جس میں مسلمان وفاداروں کے حالات اور غدر کی خدمات اردو اور انگریزی میں لکھ کر شائع کی جائیں۔ مگر بہت کم افراد نے

فراہم کیے۔ سید صاحب کے پاس اتنا روپیہ اور وسائل نہ تھے کہ شہر شہر آدمی بھیج کر ان کی روداد اور سرکاری خوشنودی کی اسناد جمع کراتے، کتاب کے صرف تین سپارے چھپ کر رہ گئے۔

غرض جہاں تک ان سے بن پڑا، وہ کوشش کرتے رہے کہ قابو یاب فرنگیوں کی مسلم آزادی، مسلم کشی کا جوش فرو ہو۔ سچی دردمندی اور دلیری کی دلیل یہ ہے کہ ایک زمانے تک کوئی دیسی یا انگریز، سید صاحب کی تائید میں لب کشائی کی جرأت نہ کرتا تھا۔ وہ تنہا جدوجہد کیے جاتے تھے۔ حال آں کہ مخالف سمت سے مسلمانوں پر الزام واتہام کی آندھی چل رہی تھی۔ اکثر انگریزی اخبارات ورسائل کی توپوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے آخری "گرداب" ولیم ہنٹر کی نیم سرکاری کتاب "اور انڈین مسلمانز" تھی جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ فرنگیوں پر جہاد کرنا مسلمان مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ خصوصاً وہابی فرقے کے لوگ کبھی انگریزی حکومت کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ ان دشمنی کے نقادوں میں اکیلے سید صاحب کی فریاد وفغاں کی کچھ شنوائی نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن دس بارہ سال کے دور میں مصلحت کا پہیہ پھر گیا۔ ہندوؤں کی روک تھام کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کو تھپکنا شروع کیا۔ بہ ایں ہمہ ۱۸۵۷ء کے عواقب نے سید صاحب کو جو عاقبت اندیشی سکھائی تھی۔ وہ سبق ان کی لوح دماغ سے نہیں مٹا۔ مسلمانوں کے بے محابا جوش وتہور سے اور ان کی نسبت انگریزوں کی بدگمانی سے وہ برابر اندیشہ مند رہے۔ ان کی سیاسی روش کی بحث میں آئندہ ہم اسی اندیشے کی جھانچ سنیں گے۔ سردست ان کاموں پر ایک نظر ڈالنی ہے جو نصاریٰ سے مصالحت اور مسلمانوں کی اندرونی اصلاح کے لیے سید صاحب نے انجام دیے۔

تعلیمی خدمات۔ تحریک علی گڑھ کا نقطۂ انتہا

سید احمد خاں نے اپنے دور کے مسلمانوں کی تمام سماجی، سیاسی اور معاشی خرابیوں کا علاج تعلیم میں پایا۔ انھیں یقین تھا کہ اگر مسلمان تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو مسلمان مٹ جائیں گے۔ دراصل تعلیمی پسماندگی کا ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں میں پیچیدہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں نے زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تھا وہ اپنے قدیم طرز فکر اور طور طریقوں کو اپنائے ہوئے تھے۔ ہندوؤں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تحریک راجہ رام موہن رائے اور کیشب چندر سین نے پہلے ہی سے شروع کر رکھی تھی اور ابتدائی دشواریاں ختم ہو چکی تھیں اور مناسب فضا پیدا ہو چکی تھی۔

سید احمد کی تعلیم سے دلچسپی ۱۸۵۷ء کے فوراً ہی بعد شروع ہوئی لیکن ان کے خیالات آہستہ آہستہ پروان چڑھے اور کئی برس بعد ان کے تعلیمی افکار نے تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کی۔

مراد آباد میں مدرسہ

۱۸۵۹ء میں سید احمد نے مراد آباد میں ایک فارسی ذریعہ تعلیم کے مدرسے کی بنیاد ڈالی اور تعلیم کی قدر و قیمت پر اردو اور انگریزی میں ایک مختصر رسالہ لکھا۔ اس رسالہ میں انھوں نے حکومت کے قائم کیے ہوئے مشرقی زبانوں کے مدرسوں پر تنقید کی اور کہا کہ یہ مدرسے وقت کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ انھوں نے حکومت کو رائے دی کہ تعلیم انگریزی زبان میں دینا مناسب ہے تاکہ ہندوستانی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ گو کہ انھوں نے یہ اصول تسلیم کر لیا تھا کہ بچے کی ذہنی ترقی اور تربیت کے لیے مادری زبان زیادہ مفید ہوتی ہے لیکن انھیں اسی میں شبہ تھا کہ آیا ہندوستانی زبانیں ذریعہ تعلیم بن سکتی ہیں یا نہیں۔ انھوں نے حکومت کی اس پالیسی پر سخت تنقید کی کہ ہندوستانیوں کو صرف اتنی تعلیم دی جائے کہ وہ گزر اوقات کر سکیں۔ سید احمد خاں کے نزدیک تعلیم کا مقصد ذہن کی بیداری اور سیرت کی تعمیر تھا۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام

غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام سید احمد کی تعلیمی تحریک کا ایک دوسرا سنگ میل ہے۔ ۱۸۶۲ء میں انھوں نے ملک کے تمام لوگوں کے لیے ایک اپیل شائع کروائی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک ایسی انجمن کا قیام ہونا چاہیے جو انگریزی کی معیاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرے تاکہ مغربی خیالات سے لوگ واقف ہوں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ ڈیوک آف آرگل نے جو اس زمانے میں ہندوستان کے سیکرٹری آف اسٹیٹ تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے سرپرست ہوئے اور پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر میکلوڈ اور شمالی مغربی صوبوں کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر ڈرمنڈ اس سوسائٹی کے نائب سرپرست ہوئے۔ سید احمد اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس سوسائٹی میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی پبلسٹی کے لیے سید احمد کلکتہ گئے اور بیچ میں مختلف جگہوں پر انھوں نے سوسائٹی کے مقاصد کے بارے میں لوگوں کو خطاب کیا

غازی پور میں اسکول کا قیام

سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے دو ماہ بعد ۱۸۶۴ء میں سید احمد نے غازی پور میں ایک اسکول قائم کیا۔ اس کا سنگ بنیاد راجہ دیو نرائن سنگھ اور مولانا محمد فصیح نے رکھا۔ یہ اس بات کا بھی واضح ثبوت ہے کہ سید احمد اپنی تعلیمی تحریک میں ہندوؤں کی شرکت چاہتے تھے اس اسکول کی عمارت اور اس کے قیام کے لیے اسی ہزار روپے کا تخمینہ ہوا تھا لیکن جب چندہ کی رقم سترہ ہزار ہوئی اسی وقت اسکول نے کام شروع کر دیا۔ مادھو

دیونرائن سنگھ اسکول کے سرپرست اور وزیٹر قرار دیے گئے۔ سید احمد نے اس موقع پر ایک مبسوط اور پرزور تقریر کی اور کہا کہ اس اسکول کے قیام کا مقصد "بنیاد ڈالنا ہے علم کی روشنی کا اپنے ہم وطنوں میں اور دور کرنا ہے جہالت کی تاریکی کا اپنے ملک اور اپنے بھائی بندوں سے یہ کام جس کے لیے تم جمع ہوئے ہو صرف تمہارے لیے یا تمہارے زمانے کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش نہیں ہے بلکہ تم ایسی چیز کی بنیاد ڈالتے ہو جو آئندہ نسلوں کے لیے اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی بندوں کی اولاد اور تمہارے ہم وطنوں کی اولاد کے لیے ہمیشہ نہایت ہی فائدہ بخش ہے پس تم کو اس مبارک کام کی جتنی مبارکباد دی جائے وہ تھوڑی ہے۔ زیادہ تر خوشی اور مبارک اس بات کی تم کو دینی ہے کہ اس نیک کام کی تحریک بغیر کسی دوسرے محرک کے خود تمہارے دل میں اٹھی ہے اور خود تم نے اپنے دل کی خواہش سے اور بغیر کسی کی مدد کے آپس کے چندہ سے اس کام کو انجام دینا چاہا ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کا علی گڑھ منتقل ہونا

۱۸۶۴ء میں سید احمد کا تبادلہ علی گڑھ ہوا۔ چونکہ اس سوسائٹی کے روح رواں سید احمد تھے اس لیے وہ ان کی غیر موجودگی میں خوش اسلوبی سے کام نہیں کرسکتی تھی لہٰذا اسے علی گڑھ لایا گیا۔ علی گڑھ کے جج ڈبلو، جے، برعیلی اس کے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے سوسائٹی کے کاموں میں بڑی دلچسپی کی اور اس کی سرگرمیوں میں شریک ہوئے۔ تقریباً تیس ہزار کی مالیت سے سوسائٹی کے لیے ایک الگ عمارت تعمیر کی گئی۔ شمالی مغربی اضلاع کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر ڈرسمنڈ نے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور خود سید احمد نے عمارت کی تعمیر کی نگرانی کی۔ ۱۲/ فروری ۱۸۶۶ کو میرٹھ کے کمشنر مسٹر ویلیمز نے عمارت کی افتتاحیہ رسم ادا کی اور سید احمد کی ان سنجیدہ کوششوں کی جو انھوں نے جدید تعلیم اور خیالات کو عام کرنے میں کی تھی، بہت تعریف کی۔

سائنٹفک سوسائٹی بہت فعال تنظیم تھی۔ مہینے میں کئی بار اس کے جلسے ہوتے تھے اور عام دلچسپی کے موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر کلکلی ہر ماہ علم طبیعات کے کسی نہ کسی پہلو پر تقریر کرتے تھے اور سامعین کے سامنے عملی تجربات کرکے دکھاتے تھے۔ سوسائٹی کا ماہانہ خرچ پانچ سو روپے تھا جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ سید احمد خاں کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی انگریزی کی قابل قدر تصانیف کی اردو زبان میں ترجمہ ہوا۔ سید احمد نے جن مضامین پر زور دیا وہ مکینکس، برق، نیومٹکس، نیچرل فلاسفی اور جدید زراعت ہے۔ صرف ریاضی پر انھوں نے سترہ کتابیں مولوی ذکاء اللہ کو ترجمہ کرنے کے لیے دیں۔ تاریخ سے انھیں خاص مناسبت تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے بڑا مسئلہ جو ان کے سامنے تھا وہ قوموں کے عروج و زوال کا تھا۔ اس زمانے کا ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں یہ سوال نہ

چھوڑا گیا ہو۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو قوم دوسری اقوام کی تہذیب و تمدن سے فائدہ نہیں اٹھاتی وہ تنزل پذیر ہو جاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا کی تاریخ کا علم بحران سے بچا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تاریخ کو انسانیت کے عروج و زوال کا ایک جیتا جاگتا بیان سمجھا جو موجودہ زندگی کے نقائص کو دور کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ وہ تاریخ جس میں ترتیب وار صرف بادشاہوں اور ان کی لڑائیوں کا ذکر ہو بے معنی اور فضول ہے۔ سید احمد خاں کو رولن کی تصنیف کردہ قدیم اقوام کی تاریخ بہت پسند آئی کیونکہ قوموں کے ذہنی اور معاشرتی کارناموں کی تہوں تک رہنمائی کرتی ہے۔ انھوں نے الفنسٹن کی ہسٹری آف انڈیا، مالکم کی ہسٹری آف پرشیا اور رولن کی ہسٹری آف این شنٹ ایجپسٹ کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ انھوں نے ان ترجموں کی نگرانی خود کی نیز مترجموں سے حواشی بھی لکھوائے اور زبان و بیان کی اصلاح کے علاوہ بعض ضروری مثالوں اور تصاویر خود بھی اضافہ کیا۔

۱۸۶۶ء میں سوسائٹی کے ذریعہ خریدے گئے اخباروں اور رسالوں کی تعداد ۴۴ تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں ۱۸ اخبار و رسائل انگریزی زبان کے تھے اور بقیہ اردو، فارسی اور سنسکرت کے۔

زرعی اور صنعتی تعلیم

سوسائٹی کا کام صرف ترجمہ کرنے تک ہی محدود نہیں تھا۔ سید احمد نے جے۔ ایچ۔ پرنسپ کو علی گڑھ کے کلکٹر تھے۔ لکھا کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ "ہندوستان میں کھیتی کے مروجہ طریقوں میں تبدیلی کی جائے تا کہ ایک طرف معاشی حالت بہتر ہو اور دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو"۔ اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے رابرٹ۔ ایس برن اور سی۔ ٹونسن کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ " علم میکینکس ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے ہندوستانیوں کو یورپ کے جدید زرعی تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

۱۳ دسمبر ۱۸۶۵ء کو سید احمد نے صوبہ شمال و مغرب کو سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے ایک یادداشت بھیجی جس میں اس بات کی خواہش کی گئی تھی کہ زراعت پر جو کتابیں سوسائٹی سے شائع ہوں، اس میں حکومت مدد کرے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایسی کتابوں کے لیے حکومت کچھ سالانہ امداد کا وعدہ کرے تو یہ کتابیں لے دے دی جائیں گی۔ اگست ۱۸۶۶ء میں حکومت نے سوسائٹی سے پانچ سو کتابیں خریدنے کی منظوری دی لیکن یہ کتابیں بر وقت تیار نہ ہو سکیں کیونکہ سید احمد کو اس کے علاوہ وقت کے دوسرے تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہونا تھا۔ بہرحال انھوں نے ایک مختصر رسالہ "قدیم نظام دیہی ہندوستان" کے عنوان سے زراعت کے موضوع پر لکھا۔ یہ رسالہ آج کل انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔

سید احمد نے سوسائٹی کے کاموں میں گہری دلچسپی لی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنا قیمتی وقت سوسائٹی

کو دیا بلکہ اپنی آمدنی سے کثیر رقم بھی سوسائٹی کے کاموں پر خرچ کی۔ انھوں نے اپنا ذاتی پریس جو تقریباً آٹھ ہزار سے زائد کی مالیت کا تھا سوسائٹی کو دے دیا۔ ان کی تعلیمی خدمات کے اعتراف کے طور پر بیگم بھوپال نے انھیں ایک انگوٹھی بھیجی جس کی قیمت تقریباً ایک ہزار روپیہ تھی۔ سید احمد نے یہ انگوٹھی بھی سوسائٹی کے نذر کر دی۔ سید احمد کو سوسائٹی کی مالی حالت کے بہتر بنانے کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ انھوں نے علی گڑھ کے مختاروں کو قانون پر لیکچر دینا شروع کیا اور ان لیکچروں سے جو آمدنی ہوئی اسے بھی سوسائٹی کو دے دیا۔

۱۸۶۶ء میں سید احمد نے علی گڑھ کے زمینداروں کو راضی کیا کہ وہ حکومت کو ایک یاداشت بھیجیں جس میں یہ درخواست کریں کہ ٹیکس کے علاوہ جبکہ ان سے ایک روپیہ سالانہ ان کی تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے لیا جاتا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیمی کاموں میں ان سے مشورہ لیا جائے اور ہر ضلع میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کی جائیں جن میں وہاں کے مقامی لوگ اور محکمہ تعلیم کے افسر ہوں اور مقامی زمیندار ان کی دیکھ بھال کریں۔ لیفٹننٹ گورنر نے یہ مشورہ پسند کیا۔ چنانچہ علی گڑھ اور ایٹہ میں تجربہ کے طور پر ایسی کمیٹیاں قائم کی گئیں اور بعد میں صوبے کے دوسرے ضلعوں میں بھی اس طرح کی کمیٹیاں بنائی گئیں لیکن ان کمیٹیوں نے اپنی کارکردگی کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں کیا۔ سید احمد نے جب یہ دیکھا کہ ان تعلیمی کمیٹیوں کے ہندوستانی ممبران نے کوئی کام نہیں کیا اور نہ ہی دلچسپی لی۔ تو انھیں اس کا بہت افسوس ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں انھوں نے کہا کہ "ہندوستانی ممبران ان کمیٹیوں میں اسی طرح بیٹھے رہے جیسے میڈم ٹساڈ کی گیلری میں موم کی پتلیاں ہوں"

۱۸۷۷ء میں ان کمیٹیوں کے دستور میں تبدیلی کی گئی لیکن اس کے باوجود بنیادی کیفیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا کیونکہ ہندوستانی ممبران نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ۱۸۸۲ء میں ان کمیٹیوں کے غیر مفید ہونے کا اظہار انھوں نے تعلیمی کمیشن کے سامنے کیا۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

۱۸۶۶ء میں سید احمد نے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار کا اجراء کیا جو "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ ابتداء میں یہ ہفتہ وار اخبار تھا لیکن بعد میں سہ روزہ ہو گیا۔ سید احمد خاں نے اس کی ادارت اور انتظام کی ذمہ داریاں خود سنبھالیں۔ یہ استثنائے چند اخبار کے سارے اداریے سید احمد کے قلم سے لکھے گئے۔ ۱۵؍ اگست ۱۸۶۷ء کو سید احمد کا تبادلہ بنارس ہو گیا۔ انھوں نے سوسائٹی کی ذمہ داریاں راجہ جے کشن داس کو جو علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر تھے سونپ دیں۔

راجہ جے کشن داس نے سوسائٹی کے کاموں میں بہت دلچسپی لی۔ سوسائٹی کی عمارت کو مکمل کرایا اور اخبار کی اشاعت میں تاخیر نہ ہونے دی۔ خود سید احمد اخبار کے لیے بنارس سے اور بعد میں انگلینڈ

سے مضامین بھیجتے رہے۔ سید احمد کا خیال تھا کہ سوسائٹی اور اس کا اخبار دونوں بہر طور آزاد رہیں اور کسی بھی حالت میں حکومت پر انحصار نہ کریں۔ انھوں نے راجہ جے کشن داس کو لندن سے لکھا۔

"مجھ کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ حضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے آپ کی سوسائٹی کی بڑی دستگیری کی ہے اور صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بہادر اضلاع شمال و مغرب نے بھی بہت بڑی اعانت اور پرورش فرمائی ہے، نہایت خوشی ہوئی۔ اور خدا کا بہت بہت شکر ہے کہ۔ مگر اے مائی ڈیئر راجہ اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت دینا۔"

دیسی زبانوں میں تعلیم کی اسکیم

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو سید احمد نے وائسرائے کو ایک یادداشت دی جس میں انھوں نے خاص طور پر مندرجہ ذیل باتوں کی طرف توجہ دلائی۔

۱۔ دیسی زبانوں میں مختلف فنون اور علوم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ امتحانات بھی دیسی زبانوں میں ہوں۔

۳۔ اب انگریزی زبان کے طالبعلموں کو علم کی مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے پر جو سندیں عطا ہوتی ہیں وہی سندیں ان طالبعلموں کو عطا ہوا کریں جو انھیں مضامین کو اردو زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوتے ہیں۔

۴۔ خواہ کلکتہ یونیورسٹی میں ایک الگ اردو فیکلٹی قائم کی جائے یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونیورسٹی دیسی زبانوں کی علیحدہ قائم کی جائے۔

دیسی زبانوں کی یونیورسٹی اور دیسی زبانوں کی اسکیم پیش کرتے ہوئے سید احمد نے انگریزی زبانوں کا اردو ترجمہ کرنے کے لیے سوسائٹی کی خدمات پیش کیں۔ گورنمنٹ نے مذکورہ بالا اسکیم سے ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ بہت سے فاضلوں نے مثلاً ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکاءاللہ اور پنڈت دھرم نرائن وغیرہ نے ترجمے کے کام کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن بوجوہ یہ اسکیم روبہ عمل نہ آسکی۔

اردو ہندی جھگڑے کا ردعمل

۱۸۶۷ء میں بنارس کے چند ممتاز ہندوؤں نے اردو اور فارسی کو عدالت سے خارج کرنے اور ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں عدالتی زبان بنانے کے لیے تحریک چلائی سید احمد کے قول کے مطابق غالباً یہ پہلا موقع تھا جبکہ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے کا وقت آگیا ہے ایک دن جب وہ بنارس کے کلکٹر مسٹر شیکسپیر سے تعلیمی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے تو مسٹر شیکسپیر کو سید احمد کی باتوں

سے حیرانی ہوئی انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا اتفاق ہے کہ میں آپ سے صرف مسلمانوں ہی کی ترقی کے بارے میں باتیں سن رہا ہوں اس سے پہلے آپ کو تمام ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کی فکر تھی۔ سید احمد نے جواب دیا کہ زبان کے مسئلے نے بڑی ناخوشگوار فضا پیدا کر دی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتراک و تعاون بڑے خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد الہ آباد کو ہندی کے حقائق پروپیگنڈہ کا مرکز بنایا گیا اور زبان کے سلسلے میں بہت سے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سید احمد نے ان جھگڑوں کا گہرا اثر لیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جھگڑے سید احمد کے ابتدائی دور کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیں گے۔ انھوں نے اخبارات کے ذریعے ان مسائل کے حل پیش کیے جو اس سلسلے میں اٹھائے گئے تھے۔ جیسے جیسے جھگڑے بڑھتے گئے سید احمد نے اپنے طرز فکر میں آہستہ آہستہ لیکن یقیناً علیحدگی پسند ہوتے گئے۔

تہذیب الاخلاق کا اجراء اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند

سید احمد کا انگلینڈ (۱۸۶۹ء۔۱۸۷۰ء) کا سفر ان کے تعلیمی پروگرام کی تشکیل کے لیے بڑا اہم ثابت ہوا۔ وہاں انھوں نے بہت سے تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا۔ ان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھا، بہت سے عالموں سے ملاقات کی اور ہر طرح کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سید احمد کی مغربی تعلیم کے بارے میں گہری نظر پیدا ہوئی اور انھیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ ہندوستانی نظام تعلیم میں ابھی اس پیمانے پر کام شروع نہیں ہوا ہے۔

ہندوستان میں مغربی تعلیم کے پھیلنے میں جو چیز سب سے زیادہ رکاوٹ بنی ہوئی تھی وہ مسلمانوں میں پھیلی ہوئی مذہبی توہم پسندی اور انگریزی تعلیم سے نفرت تھی۔ اس مزاحمت کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان واپس آنے کے بعد "تہذیب الاخلاق" نام کا ایک رسالہ جاری کیا۔ جس نے مسلمانوں کو تنگ نظری کے غار سے نکال کر وقت کی رفتار کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ایک کمیٹی کی بنیاد ڈالی جس کا نام "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند" تھا۔ اس کمیٹی کا سیکرٹری سید احمد خاں کو بنایا گیا۔ اس کمیٹی کا مقصد ان اسباب کا پتہ لگانا تھا کہ

(الف) مسلمان طلباء کی تعداد سرکاری مدارس میں جتنی ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہے۔

(ب) مسلمانوں کے علوم قدیمہ کیوں روبہ زوال ہیں۔ اور

(ج) مسلمان جدید علوم حاصل کیوں نہیں کرتے۔

اس کمیٹی کا پہلا جلسہ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں منعقد ہوا۔ نواب محسن الملک جو سید احمد کے سماجی اور تعلیمی کاموں میں شریک رہتے تھے۔ جلسہ شروع کی تاریخ سے ایک دن پہلے بنارس پہنچے

سید احمد خاں نے رات میں ان کا پلنگ اپنے کمرے میں بچھوایا رات کے گیارہ بجے تک سید احمد خاں ان سے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد محسن الملک جا کر سو گئے۔ دو بجے کے قریب جب ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے سید احمد خاں کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ ان کو دیکھنے جب وہ کمرے سے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ سید احمد برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ انھوں نے گھبرا کر پوچھا کہ خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے۔ یہ سن کر وہ اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ دیکھیے کل کے جلسے میں ان کی بھلائی کی کوئی صورت نکلتی ہے۔ اپنی قوم کی تعلیم کے سلسلے میں سید احمد کی یہی گہری دلچسپی تھی جس کے باعث انھوں نے تعلیم کا ایک لائحہ عمل تیار کیا۔

ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کا قیام

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم میں جو رکاوٹیں ہیں۔ ان کے تنقیدی جائزے کے لیے ایک انعام کا اعلان کمیٹی کی جانب سے کیا گیا۔ اس سلسلے میں ۳۲ مضامین موصول ہوئے۔ پہلا انعام بنارس کالج کے طالب علم سید اشرف علی ایم۔ اے کو ملا۔ ان مضامین کی بنا پر سید احمد نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو

TRANSLATION OF THE REPORT OF THE MEMBER,S OF THE SELECT COMMITTEE FOR THE BETTER DIFFUSION AND ADVANCEMENT OF LEARNING AMONG THE MUHAMMADANS OF INDIA.

کے نام سے ۱۸۷۲ء میں بنارس سے شائع ہوئی۔ اس کمیٹی کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ اگر مسلمان اپنے علوم قدیمہ کو محفوظ رکھنے کے ساتھ جدید علوم سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تعلیم کا انتظام خود کریں۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے ایک کالج اور طریقہ تعلیم کا بھی خاکہ تھا۔ اس رپورٹ کا ایک ایک نسخہ حکومت ہند اور تمام صوبہ جاتی حکومتوں کو بھیجا گیا۔ ۹ اگست ۱۸۷۲ء کو سیکرٹری حکومت ہند نے ایک خط میں ان تجاویز کی تعریف کی اور اس سلسلے میں حکومت کی جانب سے امداد کا وعدہ کیا۔

مجوزہ کالج کے قیام کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کام کمیٹی "خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" کے سپرد ہوا۔ جس کے لائف سیکرٹری سید احمد خاں منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی نے تمام برصغیر میں چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ جولائی ۱۸۷۲ء میں سید احمد خاں نے ایک اشتہار جاری کیا جس میں لوگوں سے یہ رائے مانگی گئی تھی کہ مدرسۃ العلوم کو کس مقام پر قائم کیا جائے۔ اکثریت کی رائے

علی گڑھ کے حق میں تھی۔ شاید لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ ملازمت سے پنشن لینے کے بعد سید احمد خاں علی گڑھ میں سکونت اختیار کریں گے۔ جنوری ۱۸۷۳ء میں علی گڑھ میں مدرستہ العلوم کی جگہ کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس میں راجہ جے کشن داس، کلکٹر علی گڑھ مسٹر لارنس، سول سرجن علی گڑھ ڈاکٹر جیکسن، اگزیکیٹو انجینئر مسٹر ہنٹ، محمد عنایت اللہ خاں اور مولوی محمد یوسف شامل تھے۔ فروری ۱۸۷۳ء میں سید احمد خاں کے لڑکے سید محمود نے مجوزہ مدرستہ العلوم کی تنظیم و تشکیل کے لیے ایک تفصیلی اسکیم سید احمد کی نگرانی میں تیار کی اور کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ رپورٹ کے ابتدائی حصے میں سید محمود نے کہا۔ "میں سوچتا ہوں کہ جو کچھ ہم لوگ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ کالج نہیں ہے بلکہ یونیورسٹی ہے اور مجھے امید ہے کہ اراکین اس سے اتفاق کریں گے کہ میری تجویز کے مطابق لفظ کالج کو لفظ یونیورسٹی سے بدل دیا جائے۔" جن چھ بنیادی نکات پر ادارے کی بنیاد رکھی گئی ان میں سے مندرجہ ذیل تین اہم نکات ہیں۔

(۱) اس ادارے کا نظم و نسق مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول سے آزاد رہے گا۔

(۲) یہ کہ یونیورسٹی خود کفیل ہوگی اور کسی بھی خارجی امداد کو قبول نہ کرے گی۔ نیز اپنی سالانہ آمدنی خود پیدا کرے گی۔

(۳) یہ کہ یونیورسٹی کی قامتی زندگی اور اس کے ضابطوں کی پابندی بھی اتنی ہی ضروری ہوگی جتنی کہ حصول تعلیم کی۔

یہ تین اساسی نکات ایسے ہیں جن سے سید احمد خاں کے اس یونیورسٹی کو قائم کرنے کی غرض و غایت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ اس کو حکومت کے اثر اور دباؤ سے بالکل آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے بنیادی اقامتی کردار کی بھی وضاحت کر دی گئی۔

جیسے ہی یہ اسکیم منظر عام پر آئی۔ مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ کانپور کے ڈپٹی کلکٹر مولوی امداد العلی پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد دھڑا دھڑ مخالفتیں ہونا شروع ہوئیں۔ سید احمد کے مذہبی نظریات سے لے کر کالج کے نصاب اور اس کی عمارتیں تک ہدف ملامت بنیں۔ ان حالات کو دیکھ کر سید احمد کے رفقاء اور معاونین مایوس ہونے لگے لیکن سید احمد کا عزم و استقلال برقرار رہا اور انھوں نے اپنے رفقاء کو مشورہ دیا کہ مخالفت کے طوفان کا اسی جوش و جذبے کے ساتھ مقابلہ ضروری ہے چنانچہ انھوں نے چندہ جمع کرنے کے لیے وفد بھیجے گئے۔

سید احمد نے مجوزہ کالج کی تعمیر کے لیے ہر ممکن اور مناسب طریقے سے روپیہ اکٹھا کیا۔ جس میں عطیات، لاٹری، تصاویر اور کتابوں کی فروخت شامل ہے۔ انھوں نے لوگوں سے مختلف گھریلو تقریبات کے موقع پر بھی

کالج کے لیے عطیات لیے اور علی گڑھ کی نمائش میں انھوں نے خود ایک کتابوں کی دکان رکھی اور کتابیں فروخت کیں۔ ایک موقع پر انھوں نے ایک ڈرامہ بھی پیش کیا اور اس میں خود نظم پڑھی۔ سید احمد خاں کے روپیہ اکٹھا کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا، کیونکہ ان کا سابقہ ایسے لوگوں سے تھا۔ جو سید احمد کے نقطۂ نظر سے ذرا بھی اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ بہر حال انھوں نے ہر طرح کی پریشانیوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور لوگوں کو مجوزہ کالج کی تعمیر کی طرف متوجہ کیا۔ ان کے سامنے کشکول گدائی لیے پھرے۔ کھیل تماشہ سے لوگوں کو خوش کیا اور در در سوال کرتے رہے تاکہ لوگ کالج کے لیے چندہ دیں۔

اپنی صحت سے بالکل بے پرواہ ہو کر سید احمد نے عطیات کی فراہمی کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کیا وہ اپنی جیب سے سفر خرچ برداشت کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ چندے کی بھیک مانگتے ہوئے گئے اور لوگوں کو یاد دلایا کہ وقت کا یہی اہم تقاضہ ہے۔ بعض لوگ جو ان کے اعزاز میں دعوتیں کرنا چاہتے تھے ان سے دعوت کا روپیہ لے کر چندے میں شامل کر لیتے تھے۔ جب وہ علی گڑھ واپس ہوئے تو ان کے گیارہ دوستوں نے بیس روپیہ فی کس کے حساب سے چندہ لے کر ان کے اعزاز میں دعوت کرنی چاہی انھوں نے دوستوں سے دو بیس روپیہ لے لیا اور اس میں اپنا بیس روپیہ شامل کر کے کل رقم کالج فنڈ میں دے دی۔ یہ ان کی عادت ہو گئی کہ وہ جو روپیہ گھریلو تقریبات میں خرچ کرنے والے ہوتے وہ کالج فنڈ میں جمع کر دیتے تھے۔ سید محمود کی شادی کے موقع پر انھوں نے دعوت ولیمہ نہیں دی اور پانچ سو روپیہ جو اس تقریب پر خرچ ہوتے وہ کالج کے چندہ میں جمع کر دیے۔ اپنے پوتے سید راس محمود کی تقریب بسم اللہ کے موقع پر بھی انھوں نے یہی کیا۔ لندن سے واپس آنے کے بعد اٹھائیس سال تک ان کی یہی خلش رہی کہ وہ قوم کے نوجوانوں کے کالج کے لیے عطیات اکٹھا کریں۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا۔ سو اس لکھے کی بدلاتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔"

مسلم اینگلو اورنٹیل کالج ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں قائم کر دیا گیا اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ لیگ نے اپنی کتاب محمڈنزم میں صحیح لکھا ہے کہ یہ "اسلام میں پہلی جدید تنظیم تھی۔" کالج کو شروع ہوئے ایک سال ہو چکا تو سید احمد خاں کو ضروری معلوم ہوا کہ ان کا علی گڑھ میں مستقل قیام ہے۔ انھوں نے پنشن کے لیے درخواست دی اور جولائی ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ آ گئے اور کالج کے کاموں میں تندہی سے مصروف ہو گئے، کالج پر انھوں نے اپنا سب کچھ اپنا وقت روپیہ اور توانائی

قربان کردی۔

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ سید احمد نے اپنے ایڈریس میں کہا۔ "جس کالج کی حضور آپ بنیاد رکھنے کو ہے وہ اکثر امور عظیم میں ان تمام مدرسوں میں مختلف ہے جو اس ملک میں قائم ہو چکے ہیں۔ سابق میں ایسے مدرسے اور کالج ہو چکے ہیں جن کو خاص خاص لوگوں نے قائم کیا تھا اور بعض مدرسے ایسے ہو چکے ہیں جن کو بادشاہوں نے بنایا تھا۔ اور جن کی امداد سلطنت کے محاصل میں سے کی جاتی تھی مگر ہندوستان کے مسلمانوں کی تواریخ میں یہ اول ہی موقع ہے کہ ایک کالج نہ کسی خاص شخص کی فیاضی یا علمی شوق سے اور نہ کسی بادشاہ کی شاہانہ سرپرستی سے بنا ہے بلکہ کل قوم کی مختلف خواہشوں اور مجتمع کوششوں سے قائم ہوا ہے اس کالج کی بناء ان اسباب پر ہے جو سابق میں اس ملک کو پہلے کبھی دیکھنے نصیب نہیں ہوئے۔ یہ کالج بے تعصبی اور ترقی کے اصول پر مبنی ہے۔ جس کی نظیر مشرق کی تواریخ میں نہیں پائی جاتی ہے۔

سید احمد خاں کا اس کالج کو قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کالج جدید و قدیم خیالات اور مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام دے۔ چنانچہ جب انھوں نے مغربی علوم کو سیکھنا ضروری قرار دیا تو اسی کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کے حاصل کرنے پر بھی زور دیا۔

دوسرے مضامین کے علاوہ سید احمد مشرقی علوم کا احیاء بھی چاہتے تھے وہ مذہبی تعلیم دینے کے خواہاں بھی تھے۔ انھوں نے کالج میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا اور اس کے لیے ایک فاضل پنڈت کیدار ناتھ کو مقرر کیا۔ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ انھوں نے سالار جنگ کو ایک خط میں لکھا۔

"آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نمونہ پر کمیٹی کی خاص طور پر توجہ اور کوشش ہو گی کہ وہ مدرسۃ العلوم کے طلباء میں بھی وہی معیار تعلیم قائم کرے۔ جو ان انگریزی یونیورسٹیوں میں ہے اگر کوئی نمایاں فرق ہو تو صرف اتنا کہ جہاں انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائی عقائد کی تعلیم ہوتی ہے وہاں مدرسۃ العلوم میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جائے۔"

مجموعی طور پر مدرسۃ العلوم کے متعلق سید احمد خاں کی پالیسی کے تین اصول تھے جہاں وہ یہ چاہتے تھے کہ حکومت برطانیہ ان کے تعلیمی پروگرام میں معاون ہو وہاں وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مدرسۃ العلوم کے تعلیمی امور میں حکومت مداخلت کرے۔ انھوں نے بار بار یہ بات زور دے کر کہی کہ تعلیم کو حکومت کی مداخلت سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا خیال آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر ایک یونیورسٹی قائم کرنے

کا تھا۔ انھوں نے طلباء کی شخصیت اور کردار کی تربیت کے لیے اقامتی زندگی کے مسائل پر غور کرنے کے لیے خاصا وقت صرف کیا۔ تیسرے یہ کہ اگرچہ اس کالج کا نام مدرستہ العلوم مسلمانان رکھا گیا تھا اور خاص طور پر مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بنایا گیا تھا لیکن سید احمد نے اس کا دروازہ سارے ہندوستان کے لیے کھول دیا۔ انھوں نے اس ادارہ کو کسی ایک فرقہ کا ادارہ نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کالج کے لیے چندہ وصول کیا جانے لگا تو بہت کثیر تعداد میں ہندوؤں نے بھی چندہ میں شرکت کی۔ بنارس، وزیانگرم اور پٹیالہ کے ہندو راجاؤں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ مدرستہ العلوم کے پچاس کمروں میں سے تقریباً نو کمرے ہندوؤں کے عطیے سے بنے جن میں چودھری شیر سنگھ، راجہ دیو نرائن سنگھ اور لالہ پھول چند شامل ہیں۔ اسٹریچی ہال میں عطیہ دہندگان کی جو تختیاں دیواروں پر لگی ہیں ان میں دس نام ہندوؤں کے کندہ ہیں جنھوں نے عمارت کی تعمیر کے لیے عطیہ دیا۔ ۱۸۹۸ء میں جب سید احمد خاں کا انتقال ہوا تو اس وقت کالج میں دو سو پچاسی مسلمان اور چونسٹھ ہندو طلبہ تعلیم پا رہے تھے۔ بورڈنگ میں بھی ہندو طلبہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ جنھیں ہر طرح کی ضروری آسانیاں فراہم کی جاتی تھیں۔ مدرستہ العلوم مسلمانان کے اساتذہ کے سات ہندوستانی افراد میں دو ہندو افراد بھی شامل تھے۔ مدرستہ العلوم کے تعلیمی زندگی میں ریاضی کے پروفیسر جے۔ سی۔ چکرورتی اور سنسکرت کے پروفیسر پنڈت شیو شنکر شرما کو اہم مقام حاصل تھا۔ علی گڑھ میں شمالی مغربی صوبوں کی تعلیمی کمشن کے پہلے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مسٹر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے مدرستہ العلوم کے بارے میں کہا "اے صاحبو! آپ لوگ جنھوں نے یہ کالج بنایا ہے آئندہ نسل کے واسطے ایک نہایت عالی شان یادگار چھوڑیں گے۔ آپ اپنے پیچھے نا اتفاقی کی نہیں بلکہ قوموں کے میل میلاپ کی ایک اعلیٰ یادگار چھوڑیں گے۔ حضرات! علی گڑھ کا یہ کالج نہ صرف شمالی مغربی صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرے گا بلکہ سارے ہندوستان کے لیے ایک مثالی ہوگا۔ یہ مسلمانوں کا ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہوگا جس میں تعلیم کے سیکولر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مذہبی پہلوؤں کی موثر ہم آہنگی ہوگی ۲۷؎"

ہنٹر کے مندرجہ بالا خیالات سید احمد کے اس جذبے کے عین مطابق تھے جس کے تحت انھوں نے اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔

سید احمد کو تعلیمی کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا لیکن انھوں نے بوجوہ ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے تعلیمی کمیشن کے سامنے تعلیمی امور کے سلسلے میں تفصیلی بیان دیا جس سے ان کی بالغ نظری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکولوں کی تعداد بڑھانے سے بہتر یہ ہے کہ تعلیم کا معیار بہتر بنایا جائے ان کی نظر میں تعداد کے بجائے معیار کی زیادہ اہمیت تھی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ حکومت پر تعلیم کی کہاں

تک ذمہ داری ہے تو انھوں نے کہا کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خود اہتمام کرنا چاہیے اور یہ ملک کے لیے نہایت مفید ہوگا اگر حکومت تعلیم کا سارا انتظام ملک والوں پر چھوڑ دے اور اس میں مداخلت سے گریز کرے۔ سید احمد کی تعلیمی پالیسی کے یہ چند بنیادی اصول تھے جن کا پرچار انھوں نے عوام وخواص دونوں میں کیا۔ انھوں نے بار بار اس کی وضاحت کی کہ تعلیمی معاملات میں حکومت کی دخل اندازی مضر اثرات پیدا کرے گی۔ تعلیمی کمیشن نے جب ان سے سوال کیا کہ کیا صرف مذہبی تعصب نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے روکا ہے یا ان کی معاشرتی روایات ایسی ہیں جن کے باعث وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے تو اس کا جواب سید احمد نے اس طرح دیا "مسلمانوں کے انگریزی تعلیم حاصل نہ کرنے کی چار وجوہ سمجھ میں آتی ہیں۔ ان میں ان کی سیاسی روایات، رسوم ورواج، مذہبی اعتقادات اور معاشی بدحالی شامل ہے۔ وہ اپنے تہذیبی اور سیاسی برتری پر مغرور تھے وہ ہرگز یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ بہت سے مفید علوم عربی و فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں انھوں نے اخلاقیات کو ایک خاص اہمیت دے رکھی تھی جس کی بنیاد مذہبی اصولوں پر تھی جسے وہ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں بدلا نہیں جاسکتا اور اسی باعث یورپین علوم حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ مجھے اب بھی وہ دن یاد ہیں جب کہ اعلیٰ خاندان کے لوگ انگریزی حکومت کی نوکری کرنا پسند نہ کرتے تھے اور اسے باعث ذلت سمجھا جاتا تھا" جب سید احمد سے عورتوں کی تعلیم کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے اس بات کو باطل قرار دیا کہ معزز خاندانوں کی مسلم خواتین علم سے بے بہرہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "مسلم خواتین میں گھریلو تعلیم رائج ہے اور وہ مذہبی و اخلاقی تعلیم اور فارسی اور کسی حد تک عربی کی کتابوں سے حاصل کرتی ہیں" اس مسئلے پر اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج کل مسلمانوں کے سماجی اور معاشی حالات کے پیش نظر عورتوں کی تعلیم قابل اطمینان ہے انھوں نے کہا کہ مسلم خواتین میں تعلیم رائج کرنے کی حکومت کی کوئی بھی کوشش موجودہ حالات میں بالکل ناکامیاب ثابت ہوگی۔ ذریعہ تعلیم کے سوال پر انھوں نے کہا کہ پرائمری اسکولوں میں یہ بہتر ہوگا کہ ذریعہ تعلیم دیسی زبان میں ہوں۔ لیکن انگریزی اسکولوں میں جو کہ یورپ کے علوم حاصل کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا یہ پرانا خیال غلط تھا کہ تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعے ہو۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے اس سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں وہ ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ ان کا خیال تھا کہ ذہنی ترقی ترجمے کے ذریعے ممکن نہیں اور مجھ کو ایک مشہور لبرل اسٹیٹسمین کے قول کو تسلیم کرنا پڑا جس نے کہا تھا کہ "جو کچھ ہمارے زمانے کے ہندوستانیوں کو درکار ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان وہ یہ ہے کہ وہ اس علم و حکمت پر نظر ڈالیں جو ان کے زمانے کی اور اسی قوی قوم کی جان ہے اور جو اس کے نزدیک تمام علوم اور تمام طاقت کا مخزن ہے"۔ میں لارڈ ولیم بینٹنگ کی اس

پالیسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ رہا ہوں۔ ہندوستان کی قوموں میں یورپ کے علم و حکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا اعلیٰ مقصد ہونا چاہیے۔

۱۸۸۳ء میں سید احمد نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔ انھوں نے سوچا کہ اگر پانچ سو مسلمان بھی دو روپیہ ماہانہ اس انجمن کو دیں تو اس کی آمدنی ایک ہزار ماہانہ ہوگی اور اس رقم سے مسلمان طالبعلموں کو انگلستان میں سول سروس کے امتحان دینے کے لیے امداد دی جاسکتی ہے یا کسی بھی پیشہ کی یا یونیورسٹی ڈگری حاصل کرنے میں مدد پہنچائی جاسکتی ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

۱۸۸۶ء میں سید احمد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی انھوں نے سوچا کہ صرف ایک کالج کا قیام عمل میں آجانے سے ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کی تعلیمی ضروریات رفع نہیں ہوسکتیں لہٰذا انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ایک تعلیمی انجمن قائم کی جائے تاکہ تعلیمی سرگرمیوں کے لیے لوگوں کو ہموار کیا جاسکے۔ اس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب ذیل قرار دیے گئے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجے تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔

(۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدد سے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تابمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

(۳) علوم شرقی اور دینیات کی تعلیم کو تقویت دینا۔

(۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزلی ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔

دس برس سے بھی زیادہ سید احمد خاں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جسم و جان بنے رہے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کانفرنس کو ایک ایسا فعال ذریعہ بنایا جائے جس سے مسلمان بے خبری کی غار سے نکل کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں اور اپنے تعلیمی نظام کو بہترین طریقے سے چلاسکیں۔ یہ کانفرنس مسلمانوں کے ذہین طبقے کے لیے ایک پلیٹ فارم بن گئی جہاں لوگ قوم کے تعلیمی و مذہبی مسائل پر بات چیت کرتے تھے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرتے تھے۔ سید احمد کے زمانے ہی میں یہ کانفرنس مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے لیے شہ رگ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

معاشرتی خدمات

معاشرتی اصلاحات کے میدان میں سید احمد کی خدمات دو طرفہ ہیں۔ اوّل یہ کہ انھیں لوگوں کو اس بات کی طرف مائل کرنا

پڑا کہ وہ ان عادتوں کو ترک کر دیں جو معاشرتی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں لوگوں کو اس بات کی طرف مائل کرنا پڑا کہ وہ معاملات میں سائنسی نقطۂ نظر اختیار کریں۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ :۔

(۱) خیالات میں آزادی اور وسعت پیدا کریں اور قدیم رسم و روایات کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے کہا کہ "جب تک رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آئے گی۔"

(۲) ان مذہبی اعتقادات سے چھٹکارا حاصل کریں جن کی بنیاد مذہبی اصولوں پر نہیں ہے اور جو تہذیب کی ترقی کے لیے روڑا بنے ہوئے ہیں۔

(۳) تمام مذہبی اور دوسرے توہمات سے کنارہ کشی اختیار کریں۔

(۴) بچوں کو تعلیم کے زیور سے سنوارا جائے کیونکہ بغیر علم کے کسی طرح کی ترقی ممکن نہیں۔

(۵) عورتوں کو تعلیم دی جائے اور انھیں گھریلو دستکاری وغیرہ سکھائی جائے۔

(۶) تعلیمی سہولتوں کو مہیا کرنے کے لیے اجتماعی طور پر کوشش کی جائے۔

(۷) مختلف قسم کے فنون اور صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں ایک جمود سا یہ پیدا ہوگیا تھا جھوٹا غرور، زندگی کے حقائق سے انحراف، خواب غفلت میں پڑے رہنا اور ان سارے خیالات نے جو زندگی کے بعد موت کے غلط تصور سے پیدا ہوگئے تھے۔ پورے معاشرتی ڈھانچے کو کمزور کر دیا تھا۔ سید احمد خاں نے ہر انفرادی اور اجتماعی مرض کی تشخیص کی جو ہندوستانی معاشرے میں موجود تھا۔ میتھو آرنلڈ نے گوئٹے کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا اطلاق سید احمد خاں پر بھی ہوتا ہے۔

"اس نے بیمار انسانی نسل کی دیکھ بھال کا بیڑا اٹھایا اس کے تمام زخموں کو دیکھا اس کی ہر کمزوری پر نظر رکھی اور ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔ تمہیں یہیں اور یہیں تکلیف ہے۔"

سید احمد نے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کا بھی اجرا کیا جسے "محمڈن سوشل ریفارمر" بھی کہتے ہیں۔ اس رسالے کے اجرا سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ نیز ان تمام خرابیوں کو دور کیا جائے جو سماج کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ یہ رسالہ گوناگوں خصوصیات کا حامل تھا۔ یہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو جاری ہوا اور ۱۸۷۶ء کے بعد بند ہوگیا دوسری بار یہ رسالہ ۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء سے نکلنا شروع ہوا اور ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ تیسری بار یہ رسالہ ۷ اپریل ۱۸۹۴ء سے پھر چھپنا شروع ہوا اور ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو بند ہوگیا۔ اس میں شائع ہونے والے ۵۹۴ مضامین میں سے ۲۰۸ مضامین خود سید احمد کے لکھے ہوئے تھے ان مضامین سے

معاشرتی اصلاح کے میدان میں سید احمد کی سرگرمیوں اور ان کے طریق کار کا پتہ چلتا ہے۔ سیاسی موضوعات سے زیادہ سماجی اور تعلیمی موضوعات پر سید احمد کے مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین کے عنوانات ہی دیکھنے سے ان کی اصلاحی تحریک کی وسعت اور ان کے خیالات کی عظمت کا پتہ چلتا ہے مثلاً تہذیب العلم، کھانے کا طریقہ، رسم ورواج، اپنی مدد آپ، قومی یکجہتی، رائے اور خیالات کی آزادی، ریاکاری، تعصب، عورتوں کے حقوق، غلامی وغیرہ شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو جو سید احمد کے قلم سے چھوٹ گیا ہو۔

سید احمد کے یہ خیالات جب مسلمانوں کے قدامت پسند گروہ تک پہنچے تو ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اخبار "اودھ پنچ" نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ اس کے ہر شمارے میں سید احمد کے خیالات پر پھبتیاں اڑائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ مولانا جمال الدین افغانی جیسے عالم نے بھی سید احمد کے خیالات کی سخت مخالفت کی۔ کچھ علماء حج کے لیے حجاز گئے تو وہاں سے ان کے خلاف فتویٰ لائے۔ بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں سید احمد کے مذہبی اور اخلاقی رجحانات کی سخت تنقید کی گئی۔ انھیں برا بھلا کہا گیا۔ نیچری، ملحد، اور مرتد کے خطابات دیے گئے۔ لیکن یہ سارے تیر ہائے ملامت بھی سید احمد کے عزم کو متزلزل نہ کر سکے۔ وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے خاموشی اور لگن کے ساتھ کام کرتے رہے وہ کہا کرتے تھے کہ جتنی میری مخالفت بڑھے گی اس سے زیادہ شدت سے میرے کام کرنے کا حوصلہ بڑھے گا۔

اس زمانے میں جاگیردارانہ سماج کی سب سے بڑی خرابی مجہول انداز نظر تھا۔ جس نے لوگوں میں جمود اور مجہولیت کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ سید احمد خاں نے عمل اور صلاحیت کی ضرورت پر بار بار زور دیا اور اسے انسانی نسل کی بقا کے لیے ضروری بتایا انھوں نے کہا کہ دماغ کا جمود جسم کی مجہولیت سے زیادہ خطرناک ہے۔ حرکت اور جد و جہد انسانی فلاح اور خوشحالی کی ضامن ہیں۔

سید احمد خاں کا ایقان تھا کہ کوئی چیز اس سے زیادہ انسانی ترقی کی رفتار کو سست نہیں کر سکتی۔ جتنا یہ خیال کہ اس نے کمال کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ترقی کی رفتار ہمیشہ جاری رہتی ہے یہ جد و جہد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس کے ذریعے ہر طرح سے اور ہر چیز کے معیار کو بلند کیا جا سکتا ہے لہٰذا ہمیں دوسروں کی اچھی چیزوں کو لینے اور قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے کیونکہ انسانی سماج میں لین دین کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اگر کوئی اس کا منکر ہے تو اسے اس کی نادانی پر محمول کیا جائے گا۔ اس لیے فکر و عمل کے میدان میں دوسرے لوگوں نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان سے استفادہ ضروری ہے۔

سید احمد کے کچھ بہترین مضامین تہذیب و تمدن کے موضوع پر ہیں جن میں انھوں نے تہذیب و تمدن

کے فرق کو واضح کیا ہے اور ان نکات پر توجہ دلائی ہے جن کے ذریعے تہذیبی ارتقاء ممکن ہے وہ اس سلسلے میں ایچ۔ ٹی بکل کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اس کا مذہب اور حکومت کے رول کا جو نظریہ ہے اس سے اتفاق نہیں کرتے ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ ایشیا اور خاص طور سے ہندوستان میں انحطاط اور زوال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی فلاح کے سارے کام گورنمنٹ کرے۔ حکومت پر اس بے پناہ انحصار کے سبب لوگوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ ختم ہو گیا ہے اور اس حد تک جھول بنا دیا ہے کہ انھیں اپنے مسائل کی بھی خبر نہیں ہے۔ ان کا قول تھا کہ جب تک ہم غور و فکر کی عادت نہیں ڈالتے اور یہ نہیں سوچتے کہ ہمیں کیا کرنا ہے اس وقت تک ہندوستانی مسلمانوں کو نہ تو دولت حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ عزت نہ وقار اور نہ متمدن اور مہذب زندگی۔ مذہب کے رول پر بھی انھیں ایچ ٹی بکل سے کچھ اختلاف تھا۔ سید احمد خاں کہتے تھے کہ جو مذہب غلط ہوتا ہے وہ بلاشبہ متمدن زندگی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے لیکن جو مذہب سچا ہوتا ہے وہ انسانی ترقی کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ ان کی نظر میں مذہب کا تصور انسان کی محنت اور انسان کی خدمت سے عبارت تھا۔ کیونکہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کرنے سے بڑھ کر کوئی اور چیز قابل قدر اور زندۂ جاوید نہیں ہو سکتی۔ رسول بھی اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے اور یہی وہ سب سے عمدہ اور عظیم کارنامہ ہے۔ جو ایک فرد کو انجام دینا چاہیے۔

سید احمد ان تمام معاشرتی برائیوں کے سخت ترین ناقد تھے جو ان کی رائے میں لوگوں کے انحطاط اور بدحالی کا سبب تھیں۔ انھوں نے خود غرضی، عزت اور غیرت کی کمی، وقت برباد کرنے کی عادت، فضول گوئی، علم حفظان صحت اور اصول صحت سے بے پروائی ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج اور تقریبات میں دولت کی بربادی جیسی چیزوں کو معاشرے کی پستی اور زوال کا سبب بتایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جس معاشرے کے افراد خود غرض ہو گئے ہوں وہ تباہی سے نہیں بچ سکتے۔ عزت نفس کا ایک گہرا اور سچا جذبہ بہت سے ناموزوں کام کرنے سے روکتا ہے انھوں نے کثرت ازدواج کو بھی ناپسند کیا۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ان برائیوں کی تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ جو سماجی پسماندگی کی ذمہ دار تھیں۔ سید احمد خاں نے زراعت اور تجارت کی خاص طور سے تعریف کی۔ ان کے خیال کے مطابق لوگ زراعت اور تجارت کو فروغ دے کر ہی اصلی ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

سید احمد خاں نے لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ وہ ان قوموں کی ہمسری کرنے کی کوشش کریں جو تہذیبی طور پر ترقی یافتہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اندھی تقلید سے بھی منع کیا۔ ان کا مشورہ تھا کہ ان کی ناپسندیدہ عادات و اطوار کو قبول نہ کرو۔ لیکن ان کی زندگی اور تہذیب میں جو قابل قدر عناصر

ہیں ان کو حاصل کرنے اور جذب کرنے میں دیر نہ کرو۔ انھوں نے جہالت کو سماجی اور تہذیبی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ تعلیم سے کورا انسان کھردری چٹان کی مانند ہے۔ تعلیم ہی اس کھردری چٹان کو تراش کر درست کرتی ہے۔ انھوں نے دنیا کے اعلیٰ ادب کے مطالعے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس توسط سے طالبعلم اس ذہن و مزاج کو سمجھے گا جس کے ذریعہ اعلیٰ ذہن کے لوگوں نے انسانوں کے بڑے مسائل پر غور کیا ہے وہ اس سے یہ سیکھے گا کہ حقیقت بوقلموں ہوتی ہے۔ سچائی صرف اپنی ذاتی رائے کے ذریعے ہی نہیں پرکھی جاتی یہ دنیا اپنی جماعت اور معاشرے سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بھی بنیاد رکھی تھی۔

انھوں نے اپنے ایک مضمون "وحشیانہ نیکی" میں کہا ہے کہ اچھائی اگر کسی غیر مہذب انسان میں پائی جاتی ہے تو اس کا انجام غیر مستحسن ہوتا ہے یہ تہذیب ہی ہے جو اچھائی کی قدر و قیمت کو بڑھاتی ہے۔ "یہی مجھ کو اس بات پر برانگیختہ کرتے ہیں کہ میں اپنی قوم کو مہذب قوم سے ملنے اور شائستہ ملک میں جانے کی ترغیب کرتا ہوں اور اس خیال سے ہمیشہ رنج میں رہتا ہوں کہ ہماری قوم میں جس قدر نیکیاں ہیں وہ بھی نامہذب ہیں۔ دنیاوی برتاؤ میں آپس کا ملاپ دوستوں کی دوستی، زمینداروں کی زمینداری، امیروں کی امیری نہایت ناشائستہ اور نامہذب طور سے واقع ہوئی ہے۔ اگر وہ عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاوے تو انسان کے لیے اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں دونوں میں نہایت ہی مفید ہو۔"

جب سید احمد نے لوگوں کو مغرب کے طرز فکر اور رسم و رواج کو اپنانے کے لیے کہا تو ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ انگریزوں کو نجس سمجھ کر انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ سید احمد نے سب سے پہلے اس کی شروعات کی اور ان کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" بھی لکھا کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے میں تامل نہ کریں۔ کچھ لوگوں نے سید احمد سے راہ و رسم ختم کرنے کی مہم شروع کی لیکن انھوں نے اپنے راستے سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا اور مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے رسم و رواج کی اندھی تقلید کو سماجی اصلاح کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بتایا انھوں نے لوگوں کو بار بار اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ لوگ رسم و رواج کی اندھی تقلید ترک کریں کیونکہ یہ افادیت کی حامل نہیں۔ رسم و رواج کی بغیر سوچے سمجھے تقلید ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے اور اس سے حقیقت پسندی کا مادہ ختم ہو جاتا ہے اس لیے رسم و رواج اور انسانی آئین کو عقل و فہم کی کسوٹی پر جانچا جانا چاہیے۔ اگر یہ انسانی معاشرے کو بہتر بنانے میں مفید ہو سکتا ہے تو اسے برقرار رکھنا چاہیے اور دوسری صورت میں اس کا ترک کرنا لازم ہے۔ سائنسی

نقطۂ نظر کو عام کرنا سید احمد کی تحریک کا خاص مقصد تھا اور اس مقصد کی تبلیغ انھوں نے نہایت لگن اور محنت سے تمام عمر کی۔

سید احمد کے سماجی اور اخلاقی افکار کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ "اپنی مدد آپ" کے اصول پر زور دیتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک وہ اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل نہ کرے۔ ہسٹن سیریز میں سید احمد کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ "وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے اپنی مدد آپ کے اصول سکھائے۔ جب ان کی پیغمبرانہ بصیرت نے اپنی قوم کی ضروریات سے آگاہی حاصل کر لی تو پھر انھوں نے قسمت پر بھروسہ یا گورنمنٹ سے امداد کی درخواست نہیں کی۔ وہ جانتے تھے جن اصلاحات کو جاری کرنا ان کا مقصد ہے وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ خود قوم اس کے لیے تیار ہو۔"

سید احمد نے ان خوبیوں کی ضرورت پر زور دے کر جو معاشرے میں اتفاق و اتحاد پیدا کرتی ہیں اور اس کی ترقی میں معاون ہوتی ہیں سماجی طرز فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ سید احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ ان کی غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے۔" سید احمد کی نظر میں مذہب، محبت اور اخوت سے عبارت ہے۔ لڑائی جھگڑے سے نہیں۔ وہ اتفاق و اتحاد سے عبارت ہے۔ نا اتفاقی اور علیحدگی سے نہیں۔ مدرستہ العلوم مسلمانان کے دینیات کے معلم کی خصوصیات بتاتے ہوئے انھوں نے واضح طور پر کہا کہ وہ طلبہ میں انسانیت، وسیع النظری، عفو و درگزر، خلوص و ہمدردی اور اخلاقی و روحانی قدروں کا احترام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تعصب اور علیحدگی پسندی کو نہایت گہری بیماری سمجھتے ہیں کیونکہ ایک تنگ اور محدود دماغ تمام صحت مند اثرات سے محروم رہتا ہے اور اس لیے معاشرتی پسماندگی کے آخری درجے پر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ نیکی اور خیر کے تصور کے باعث ہم تعصب کو اچھا سمجھنے لگے ہیں۔ چنانچہ جو مذہبی امور میں تعصب برتتا ہے اور دوسرے مذہب والوں کو حقیر سمجھتا ہے اور ان کے علوم و فنون کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے وہی لائق تعریف اور مذہبی آدمی سمجھا جاتا ہے لیکن سوچنے کا یہ طریقہ غلط ہے درا صل اس طرح کے افکار نے مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔"

سچی معاشرتی زندگی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ معاشرے کا ہر فرد اپنے ضمیر کی آواز کو نہ دبائے اور اگر افراد اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرنے لگیں تو ایک صحت مند معاشرتی فضا بن سکتی ہے۔ دوسری صورت میں ریاکاری، چاپلوسی، خوشامد، اکڑپن اور دشمنی، معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ جائے گی وہ

لوگ جو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل پیرا رہے وہ اچھے کردار کے مالک تھے وہ اپنے فکر و عمل میں جری تھے۔ معاشرے کی ترقی ان لوگوں کی مرہون منت ہے۔

اپنا احتساب اور دوسروں کی عزت سماجی فلاح و بہبود کے لیے بہت ضروری ہے۔ رائے کے اختلاف سے آپس میں کشیدگی یا نا اتفاقی نہ پیدا ہونی چاہیے۔ جب کسی مخالف شخص کی رائے کی تردید کی جائے تو اس میں بہت زیادہ شدت نہ ہونی چاہیے۔ بحث و مباحثے میں حد سے آگے نہ بڑھنا مہذب ذہن کی علامت ہے اور معاشرے کی صحت مند ترقی کا ضامن ہے۔

سید احمد کا یہ یقین تھا کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام نے عورتوں کو معاشرے میں بہتر اور مناسب رتبہ دیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں خود مسلمان اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں۔ سید احمد کہتے ہیں کہ ایک خوشحال گھرانہ جس میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ برابر کے حقوق دیے گئے ہوں معاشرے کی ترقی کا ضامن ہے لیکن وہ کسی صورت میں مسلمان خواتین کو انگریز بن جانے کے حق میں نہیں تھے وہ اپنے زمانے میں مسلم خواتین میں پردے کے رواج کے قائل تھے۔

ادبی خدمات

اپنی مختلف النوع سرگرمیوں اور ملازمت کی مصروفیات کے باوجود سید احمد اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے وقت نکال لیتے تھے ان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، سیاسیات، آثار قدیمہ، صحافت ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ اس میں شامل تھیں۔ لیکن جس موضوع کو انھوں نے لیا۔ اس کا نہ صرف یہ کہ حق ادا کر دیا۔ بلکہ سرگرم کارکنوں کی جماعت بھی تیار کر دی۔ جنھوں نے ایک طرز فکر اور ایک دبستان کی طرح ڈالی۔ اگرچہ سید احمد کی ادبی خدمات کچھ کم اہم نہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ گزشتہ سو برس میں مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں نے سید احمد خاں کے افکار سے روشنی اور گرمی حاصل کر لی ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں "تاریخ فیروز شاہی" اور "آئین اکبری اور تزک جہانگیری نے ازمنہ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کی تحقیق کے لیے مواد فراہم کیا۔ ان کی معرکۃ الآرا کتاب آثار الصنادید نے برصغیر میں آثار قدیمہ کے مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ ان کی کتاب تبیین الکلام، برصغیر میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی پہلی کوشش تھی۔ ان کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ان کی تفسیر القرآن جو اپنے طرز کا واحد نمونہ تھی اور جس نے نہ صرف مسلمان علماء کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ بلکہ انھیں قرآن کی ایک جدید تفسیر کے لیے راستہ دکھایا۔

تاریخی تصانیف

سید احمد کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ اس مضمون میں ان کی دلچسپی اس پر درد احساس سے پیدا ہوئی تھی کہ پرانی قدریں زوال پذیر

ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ماضی کی صالح قدروں کی حفاظت کی جائے۔ گبن کی طرح جس کی تاریخ سے دلچسپی روم کے کھنڈرات کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ سید احمد بھی آگرہ اور دہلی کے قدیم کھنڈرات کو دیکھ کر تاریخ کے مطالعے کی طرف راغب ہوئے چنانچہ برصغیر کا تہذیبی ورثہ محفوظ رکھنے کے خیال سے سید احمد نے آثار الصنادید جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ اس کے بعد انھوں نے دو بڑے مسلم مؤرخین کی تصانیف کی ترتیب و تدوین کی۔ سید احمد پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے آثار قدیمہ کے موضوع پر علمی اور محققانہ انداز پر کتاب لکھی اور وہ پہلے ہندوستانی محقق تھے۔ جنھوں نے تحقیق کے سلسلے میں انگلستان کا سفر کیا۔

تاریخی موضوع پر ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

۱۔ جام جم

۲۔ آثار الصنادید

۳۔ سلسلۃ الملوک

۴۔ تاریخ بجنور

۵۔ آئین اکبری کی ترتیب و تدوین

۶۔ تاریخ فیروز شاہی کی ترتیب و تدوین

۷۔ تزک جہانگیری کی ترتیب و تدوین

جام جم اور سلسلۃ الملوک، گو صرف تالیفات میں شمار کی جائیں گی لیکن ان کی ترتیب میں انھیں کافی محنت صرف کرنی پڑی۔ جام جم میں تیموری سلسلے کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں جبکہ سلسلۃ الملوک میں دہلی کے ان سارے بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔ جن کا تاریخ میں تذکرہ ہے۔ اگرچہ ان کتابوں کی تالیف میں سید احمد کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مصنف کے زمرے میں نہ آسکے۔ یہ اعزاز انھیں آثار الصنادید کی تصنیف کے بعد ملا۔ مغلوں کی دہلی آخری سانس لے رہی تھی یہ دیکھ کر انھوں نے آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں دہلی کے قدیم کھنڈروں میں بھٹکتے پھرے عمارتوں کے کتبوں کا چربہ اتارا۔ ان کے بارے میں مفصل معلومات بہم پہنچائی۔ قطب مینار کے بعض کتبے زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی اور مینار پر لکھے ہوئے کتبوں کو بہت قریب سے پڑھا اس کے لیے وہ ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر کتبے کے محاذی پر بندھواتے اور خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتے تھے۔ سید احمد کے عزیز دوست متبحر عالم مولانا صہبائی جنھیں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے بے دردی سے قتل کر دیا اس تفتیش و جستجو میں

ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ صہبائی کا فرطِ محبت کے سبب رنگ بدل جاتا تھا لیکن سید احمد اپنے کام میں اسی جذبہ اور لگن سے لگے رہتے تھے اور کسی طرح کے خطرے کی پرواہ نہ کرتے۔

آثار الصنادید میں چار باب ہیں۔ تین باب میں دہلی کی عمارتوں کی تفصیل دی گئی ہے اور آخری باب میں دہلی کے ۱۲۰ مشاہیر جن میں علما، صوفیا، اطبا، خوش نویسوں، موسیقی دانوں اور دوسرے فنکاروں کا مختصر لیکن جامع تذکرہ شامل ہے۔ ان کے ہم عصروں نے کتاب کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ریڈورڈ ٹامسن نے جو سکول کے علم کے ماہر تھے سید احمد کے جذبۂ تحقیق کو سراہا اور اس کتاب کو "دہلی کے آثار کی بہترین تاریخی کتاب" تسلیم کیا۔ رپورٹ نے بھی کہا ہے کہ "مجھے سید کے قلم سے جو نکل گیا اس پر انگلی رکھنے کی جرأت نہیں"۔ ایم گارساں دتاسی نے اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ ۱۸۶۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے سید احمد کو ہندوستانی آثار کی تحقیق کے اعتراف کے طور پر فیلو منتخب کیا۔

آثار الصنادید کے بعد تاریخ کے میدان میں سید احمد کا زبردست کارنامہ "تاریخ فیروز شاہی" آئین اکبری اور تزک جہانگیری کی تدوین ہے۔ انھوں نے آئین اکبری کا ایک ایڈیشن نہایت اہتمام سے نکالا جس میں مغل زیورات کی تصویریں، خیمہ گاہ بادشاہی اور تمام پھل دار پھول دار درختوں کی تصویریں شامل تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سید احمد کا خاندان عرصہ تک مغل دربار سے وابستہ تھا۔ اس لیے مغلوں کی طرز معاشرت عادات اطوار سے پوری طرح واقف تھا۔ اگرچہ اس وقت مغل سلطنت چراغِ سحری ہو رہی تھی لیکن سید احمد کو ان سب چیزوں کے بارے میں اچھی واقفیت تھی۔ ان کے شامل کیے ہوئے مرقعوں کے کتاب کی قدر و قیمت میں اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ بلاخ مین نے آئین اکبری کے انگریزی ترجمہ میں ان ہی تصویروں کی نقل لی ہے جو سید احمد نے فارسی آئین اکبری میں شامل کی تھیں۔ سید احمد نے اردو کے ممتاز شاعر مرزا غالب سے آئین اکبری کی تقریظ لکھنے کے لیے کہا تھا۔ چنانچہ اپنی تقریظ میں مرزا غالب نے کہا کہ اکبر کی خدمات اور آئین اکبری کی قدر و قیمت کے بارے میں باتیں کرنا فضول ہے لیکن مرزا غالب کے یہ خیالات سید احمد کو پسند نہ آئے اس لیے انھوں نے کتاب میں یہ تقریظ شامل نہ کی۔

تزک فیروز شاہی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے زیر اہتمام ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی اس کی اشاعت کے بعد اب تک ازمنہ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے سینکڑوں محققین نے اس ایڈیشن سے استفادہ کیا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار کی پہلی جلد میں انھوں نے برنی کے حالات زندگی کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ تزک فیروز شاہی کی تدوین کے بعد سید احمد نے تزک جہانگیری کی بھی تدوین کی اور ۱۸۶۴ء میں اسے خود اپنے پریس میں چھاپا اور اپنی نگرانی میں شائع کیا۔

قیامِ بجنور کے دوران سید احمد نے ضلع بجنور کی تاریخ لکھنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ضلع کے کلکٹر نے محکمہ بندوبست میں یہ حکم بھیج دیا کہ ضلع کے تمام سرکاری کاغذات حسبِ ضرورت سید احمد کے پاس بھیج دیے جائیں۔ سید احمد نے نہایت تحقیق و کاوش سے ضلع کی تاریخ کے لیے مواد فراہم کیا اور مغل بادشاہوں کے بہت سے فرامین کا مطالعہ کیا۔ لیکن اس تصنیف کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی کہ ۱۸۵۷ء میں آگرہ میں سرکاری دفتر کی املاک کے ساتھ وہ کتاب بھی تلف ہوگئی۔

تاریخِ ہند کی تصنیف میں سرہنری ایلیٹ نے (جسے بعد میں پروفیسر ڈاوسن نے مدون کیا) سید احمد سے مدد لی۔ لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا۔ سید احمد کا ایک خط جو ۷ ستمبر ۱۸۴۹ء کو سرہنری کو لکھا گیا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایلیٹ کے لیے ازمنۂ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخوں کے سلسلے میں سید احمد بہت کوشاں تھے۔ یہ خط برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔

سیاسی موضوع پر تصانیف

سید احمد نے ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد دو کتابیں "اسباب بغاوت ہند" اور "تاریخ سرکشی بجنور" لکھیں۔ یہ دونوں کتابیں اس دور کے سیاسی حالات کو سمجھنے کے لیے بہترین مواد فراہم کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کتابوں سے سید احمد کی تاریخی حقائق پر نظر اور سیاسی مسائل کی پرکھ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ پہلی کتاب میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کے اسباب صاف بیانی سے لکھے گئے ہیں۔ اور اس جدوجہد میں نواب محمود خاں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو زبان و ادب کی خدمت

سید احمد نے اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے اردو ادب پر نمایاں اثرات ڈالے۔ دراصل انھوں نے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئی صبح کا آغاز کیا۔ انھوں نے اردو نثر کو مقفیٰ اور مسجع الفاظ سے پاک کیا اور سادہ الفاظ استعمال کرنے اور خیالات کو وضاحت سے بیان کرنے پر زور دیا اور اردو زبان کو علمی اور سنجیدہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس طرح اردو ادب کے میدان کو وسیع کیا۔ انھوں نے اردو کے ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی استفادہ کریں۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ کسی شخص نے مغربی ادب اور مغربی خیالات کا حوالہ دیا۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا۔ بہت سے انگریزی کے ادیبوں اور انشا پردازوں کا تذکرہ کیا ہے۔

اردو نثر کی طرح اردو شاعری کی ہیئت اور طرز پر بھی سید احمد کے اثرات پڑے انھوں نے اردو شاعری کو نیچرل شاعری اور انگریزی شعراء کے خیالات کی طرف بھی متوجہ کیا۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری

سیداحمد کے خیالات کی بازگشت ہے۔ سید کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری میں اخلاقی اور سماجی بلکہ سیاسی موضوعات پر بھی شعر کہنے کا رجحان پیدا ہوا۔ جسے ہم آج قومی شاعری کہتے ہیں وہ علی گڑھ کے اسی پیر مغاں کے زیراثر پروان چڑھی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں شرکت کرنے والے شعراء سے انھوں نے کہا کہ وہ ایسی نظمیں لکھیں جس سے قوم میں بیداری کی ایک نئی روح پیدا ہو جائے۔ چنانچہ شبلی، نذیراحمد، حالی اور دوسرے شعراء نے سیداحمد کی سمجھائی ہوئی راہ پر عمل کیا۔ حالی کا مسدس جو اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیداحمد کے کہنے پر لکھا گیا۔

شعروادب کے ساتھ ساتھ اردو صحافت بھی سیداحمد کے احسانات سے زیر بار ہے۔ دراصل تہذیب الاخلاق ہی وہ رسالہ ہے جس نے اردو میں صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ سیداحمد صحافت کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان تھے۔ انھوں نے اردو صحافیوں کو بتایا کہ سچائی، سلامت روی اور سنجیدگی ایک صحافی کا اسوۂ زندگی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اظہار خیال کی آزادی پر بھی بہت زور دیا۔ وہ صحافت کو سچائی اور رائے عامہ کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔

سیداحمد خاں پہلے ادیب ہیں۔ جنھوں نے لیتھو کی طباعت کے بجائے اردو ٹائپ کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اردو ٹائپ کو اردو زبان اور صحافت کی ترقی کے لیے ناگزیر بتایا۔ انھیں فن طباعت سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کے پاس اپنا ایک پریس تھا۔

سیداحمد نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا بھی خیال ظاہر کیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر ذریعہ تعلیم مادری زبان ہوگی تو بچّے کی دماغی نشوونما بہتر طور پر ہو سکے گی یہ جانتے ہوئے کہ بعض زبانوں کے مقابلے میں اردو کی نمایاں حیثیت نہیں ہے۔ انھوں نے زبان کے خزانہ کو وسیع کرنے کے لیے کثیر تعداد میں انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرانے کی کوشش کی لیکن بعد میں ان کی رائے تبدیل ہو گئی اور انھوں نے کہا کہ ہندوستانی مغربی علوم کا مطالعہ اپنے کو محض ترجموں تک محدود کر کے نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ سے اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ مغرب میں ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ پریس سے ایک کتاب کو نکلے ہوئے دیر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے نظریات پرانے ہو جاتے ہیں اور اس کی جگہ دوسری کتاب آجاتی ہے۔ ان حالات کو محسوس کر کے سیداحمد نے کہا کہ اگر ہم صرف ترجموں پر انحصار کریں گے اور براہ راست اصل کتابوں سے استفادہ نہ کریں گے تو دوسرے کے مقلد ہو کر رہ جائیں گے۔

سیداحمد اردو ادب کی ایک ایسی مفصل تاریخ بھی ترتیب دینا چاہتے تھے جس میں شروع سے لے کر اس وقت تک کی ساری اردو کتابوں کا حوالہ موجود ہو لیکن اپنے زمانے کے بعض تقاضوں کے پیش نظر وہ مذکورہ تاریخ کو مرتب نہ کر سکے اس کے علاوہ ان کا خیال ایک اردو لغت بھی مرتب کرنے کا تھا۔ چنانچہ جا نشک

سوسائٹی کے اخبار میں اس کے کچھ ابتدائی حصے شائع بھی ہوئے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو نہایت وسیع پیمانے پر کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۱ء میں ایک اردو قواعد بھی ترتیب دی تھی۔ سید احمد اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو میں علامات قرأت کے مسئلے پر اظہار خیال کیا اور اس کے اصول مرتب کیے۔

سید احمد کے بہت سے منصوبے ان کی زندگی میں بروئے کار نہ آسکے لیکن بعد کی نسلوں نے ان کے منصوبوں کی افادیت کو محسوس کیا اور ایک ایک کر کے ان کو بروئے کار لائی۔ چنانچہ علامات قرأت کے اصولوں کی ضرورت بعد کے ادیبوں نے محسوس کی اور جو کچھ سید احمد نے انیسویں کے آخری ربع صدی میں ضروری محسوس کیا۔ آج اسے اشد ضروری سمجھا جا رہا ہے۔

دراصل سید احمد نے ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی جسے ہم دبستان علی گڑھ کے نام سے یاد کرسکتے ہیں۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے تقریباً تمام اہم اردو ادیب اور شاعر جیسے شبلی، حالی، نذیر احمد، ذکاءاللہ، وحید الدین سلیم، عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور محمد علی وغیرہ اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے ان روایات کو آگے بڑھایا۔ جنھیں سید احمد نے اردو ادب میں داخل کیا تھا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً نئے تجربات بھی ہوتے رہے۔

مذہبی طرز کی تصانیف

ایک اور میدان جس میں سید احمد خاں کی خدمات گراں قدر ہیں مذہب ہے۔ وہ مذہب کے باب میں جامد، روایتی اور غیر عقلی نظریات کے حامل نہ تھے۔ ان کے نزدیک مذہب حیات بخش قوت کا نام ہے۔ جو وقت کی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے اور عقلی طور پر سمجھا جاتا ہے اور ذہنی طور پر جسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر روایتی ڈگر سے ہٹ کر لکھی جس میں زمانے کی ضروریات کا بھی لحاظ رکھا۔

سید احمد مذاہب کے تقابلی مطالعے کو ضروری سمجھتے تھے کیونکہ اس سے ذہن و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے انجیل کی تفسیر بھی لکھی۔

سید احمد کی ادبی تصانیف کا ایک بڑا حصہ مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے۔ ذیل کی تصانیف اسی اسی زمرہ میں آتی ہیں۔

۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب :

یہ رسالہ ۱۸۴۲ء میں مرتب ہوا۔ اس رسالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کا بیان ہے اس کا بیشتر مواد شاہ ولی اللہ کی تصنیف سرور المحزون اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب مدارج النبوت سے ماخوذ ہے۔ مولانا محمد نور الحسن نے اس

کی نظر ثانی اور تصحیح کی ہے۔

۲۔ **تحفۂ حسن** یہ رسالہ شاہ عبدالعزیز کی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ، باب دہم دوازدہم کا ترجمہ ہے۔ رسالہ کی تکمیل ۱۸۴۴ء میں ہوئی۔

۳۔ **کلمۃ الحق** یہ رسالہ پیری مریدی کے دو مروجہ طریقے کے رد میں لکھا گیا ہے اس کی تکمیل ۱۸۴۹ء میں ہوئی۔

۴۔ **راہ سنت در رد بدعت** یہ رسالہ ۱۸۵۹ء میں لکھا گیا۔ یہ رسالہ اہل بدعت کے رد اور متبعین سنت کی تائید میں ہے۔

۵۔ **نمیقہ دربیان مسئلہ تصور شیخ** یہ رسالہ ۱۸۵۳ء میں مکمل ہوا جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلہ محبت خدا اور رسول بتایا ہے۔

۶۔ امام غزالی کی کتاب کیمیائے سعادت کے ابتدائی صفحات کا اردو ترجمہ ہے۔ جو ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوا۔

۷۔ **تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام** یہ کتاب ۱۸۶۱ء میں لکھی گئی۔ یہ قرآن و انجیل کا تقابلی مطالعہ ہے سید احمد خاں کا خیال تھا کہ بہت سے مسائل میں قرآن و انجیل میں مماثلت ہے چنانچہ اس کتاب میں مماثل چیزوں پر روشنی ڈالی گئی۔ انھوں نے ایک یہودی سالم نام کے آدمی کو نوکر رکھا اور اس سے عبرانی سیکھی۔ مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی کی موجودگی سے بھی جو عربی اور عبرانی کے بڑے عالم تھے سید احمد کے کام کو بڑی تقویت ملی۔ ایک یورپین فاضل جو سو روپیہ پر ملازم رکھا گیا تھا کتاب کا انگریزی ترجمہ کرتا جاتا تھا۔

۸۔ **طعام اہل کتاب** ۱۸۶۶ء میں سید احمد کے پاس ایک استفسار آیا جس میں سوال کیا گیا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا جائز ہے۔ سید احمد نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور اپنے نظریات کی مزید تشریح کے لیے یہ رسالہ تحریر کیا۔

۹۔ **خطبات احمدیہ** دراصل یہ کتاب سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کے جواب میں لکھی گئی۔ ولیم میور نے پیغمبر اسلام پر جو الزامات لگائے تھے اس سے سید احمد کو شدید تکلیف پہنچی تھی۔ انھوں نے ان الزامات کی تردید کے لیے اپنے سارے وسائل استعمال کیے اس مقصد کے لیے وہ انگلینڈ گئے اور وہاں انھوں نے برٹش میوزیم اور دوسری لائبریریوں سے استفادہ کیا اور ولیم میور کے الزامات کا جواب دیا یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔

قرآن مجید کی تفسیر مختلف حصوں میں ۱۸۷۱ء سے ۱۸۹۱ء تک شائع ہوئی

۱۰۔ **تفسیر القرآن** سید احمد کی یہ تصنیف نہایت اہم اور بحث طلب ہے۔ روایتی خیالات کے علماء کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے بھی سید احمد کی اس تفسیر کی مخالفت کی جو دوسرے معاملات میں ان کے رفیق تھے۔

۱۱۔ **النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی** یہ کتابچہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں امام غزالی کے رسائے مضنون بہ علی غیر اہلہ اور المنقذ من الضلال اور الاقتصاد فی الاعتقاد اور التفرقہ بین الاسلام والزندقہ کے بعض مسائل پر بحث کی ہے۔ جس میں کہیں امام غزالی سے اتفاق کیا ہے اور کہیں اختلاف ہے۔

۱۲۔ **ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم** یہ بھی قرآن مجید کے اس حصے کی تفسیر ہے اس جس میں اصحاب کہف کے قصہ کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۳۔ **ازالۃ الغین عن ذکر القرنین** یہ بھی قرآن مجید کے ایک حصہ کی تفسیر ہے اس کی اشاعت ۱۸۸۹ء میں ہوئی۔

۱۴۔ **رسالہ ابطال غلامی** یہ رسالہ غلامی کے مسئلے پر بحث سے عبارت ہے۔ یہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ **الدعا والاستجابہ** اس رسالہ میں اجابت دعا کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔

۱۶۔ **تحریر فی اصول التفسیر** اس رسالے میں وہ تمام اصول بیان کیے گئے ہیں جنھیں تفسیر القرآن میں سید احمد نے ملحوظ رکھا۔ یہ رسالہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔

۱۷۔ **تفسیر السموات** یہ رسالہ پہلے تہذیب الاخلاق میں بطور مضمون کے شائع ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں اسے بطور ایک رسالے کے شائع کیا گیا۔ اس میں قرآن کی ان آیات کی تفسیر جو بظاہر نظام بطلیموسی کے موافق معلوم ہوتی ہیں۔ موجودہ تحقیقات کے مطابق کی ہے۔

سید احمد کو مذہبی افکار کی تاریخ سے بھی بہت دلچسپی تھی اور اکثر وہ اس موضوع پر نئے اور دلچسپ مضامین کے ترجمے بھی شائع کرتے تھے۔ انھوں نے کالا پانی اور قوم نوح کے بارے میں بھی لکھا اور ذوالقرنین کے واقعہ کو تاریخی اہمیت کا حامل بتایا۔ اس کے علاوہ عربوں کی بت پرستی کی تاریخ کے بارے میں تحقیق کی۔ یہ تمام مضامین نہایت تحقیق کاوش اور اعداد و شمار کے علاوہ نقطہ نظر کی تازگی کے بھی حامل ہیں۔ سید احمد مہدی موعود کے عقیدے کو بے بنیاد سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اس مسئلے کے تاریخی اور دوسرے پہلوؤں کا بھی

مطالعہ کیا۔

سائنسی موضوعات پر تصانیف

سید احمد کو متداولہ سائنسی مضامین سے دلچسپی اپنے نانا سے ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے بعض تکنیکی مسائل پر بھی مضامین لکھے۔ تسہیل فی جرالثقیل ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ ابوعلی کی تصنیف رسالہ معیار العقول کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ان چیزوں کے بارے میں ہے مثلاً سخت چیزوں کے چیرنے اور بھاری چیزوں کے اٹھانے کے لیے رسالہ فوائد الافکار فی عمال الفرجار ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا یہ رسالہ فارسی مسودوں پر مشتمل ہے۔ جو انھیں اپنے نانا سے دستیاب ہوئے تھے۔ اس کا اردو ترجمہ اور اس میں مثالیں سید احمد نے اپنی طرف سے اضافہ کر دی ہیں۔ رسالہ قول متین در ابطال حرکت زمین ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں زمین کی حرکت قدیم خیالات کے موافق غلط ثابت کی ہے۔ بعد میں سید احمد نے اپنی تحریروں میں جا بجا زمین کی حرکت کو تسلیم کیا ہے۔

قانون کے بارے میں تصانیف

سید احمد کی چند تصانیف قانون کے موضوع پر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چند دفعات کا اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ ذیل کی کتابیں قانون کے موضوع پر ہیں۔

۱۔ انتخاب الاخوین: یہ کتاب ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ اردو ترجمہ ان سارے فیصل جات کا جو ۱۸۱۰ء سے ۱۸۲۷ء تک ہوئے۔ تین جلدوں میں شائع ہوئے۔

۳۔ دفعات ۱۰، ۱۴ اور ۱۶

ان کتابوں اور رسالوں کے علاوہ سید احمد نے مختلف بے شمار مضامین مثلاً سیاسی، قانونی، عمرانی، ادبی موضوعات پر لکھے۔ ان تمام مضامین کا مجموعہ کئی جلدوں میں آ سکتا ہے۔

اپنے ان کارناموں کے علاوہ سید احمد نے دوسروں کو بھی مذہبی، تاریخی اور سیاسی عنوانات پر مضامین لکھنے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے السیریز کے عنوان سے ایک نئی سیریز شروع کی۔ چنانچہ الفاروق، المامون، البرامکہ، الغزالی، الجزیہ وغیرہ دراصل اسی سیریز کا جزو ہیں۔

سیاسی افکار اور سرگرمیاں

سید احمد کے سیاسی افکار ان کے سیاسی تجربات کا عکس تھے اس کی بنیاد مسلمانوں کی زندگی کے اصلی اور صحیح جائزے پر تھی۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو صدیوں سے مغلیہ دربار سے منسلک تھا لیکن انھوں نے مغلیہ دربار سے اپنا سلسلہ ملازمت منقطع کر ناطے کیا۔ کیونکہ بادشاہ کی معاشی حالت

اتنی خراب ہوچکی تھی کہ وہ اپنے ملازمین کی تنخواہیں بھی وقت پر نہ دے سکتا تھا۔ اسی خیال کے تحت سید احمد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت پسند کی لیکن اس فیصلے کا پس منظر سیاسی نہیں صرف معاشی تھا۔ بعد میں جب ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ان کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تو انھوں نے انقلاب اور اس کے اسباب پر غور کیا اور باغیوں کے انجام کو دیکھا اپنی تصنیف اسباب بغاوت ہند میں انھوں نے اس مسئلے پر سیاسی، مذہبی، انتظامی، معاشی اور عسکری نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔" ان کا یہ رسالہ سیاسی طرز کا پہلا رسالہ ہی نہیں۔ بلکہ یہ پہلا سیاسی رسالہ ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھا ہے۔"

سید احمد کے سیاسی افکار کی تشکیل میں مندرجہ ذیل عوامل کی اہمیت ہے۔

۱۔ دوبارہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے سید احمد شہید کی تحریک کی ناکامی (۱۸۳۱ء) سید احمد کے لیے کھلا ہوا چیلنج تھی کہ بغیر جدید سائنسی ترقی کے جس نے انسانی فکر اور زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے کوئی سیاسی بیداری پیدا نہیں کی جاسکتی ہے۔

۲۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد مسلمانوں کی ابتر حالت کو دیکھ کر سید احمد نے یہ اندازہ لگایا کہ جب تک مسلمان وقت کے دھارے کے ساتھ نہیں چلتے اور مغربی علم و ادب کو حاصل نہیں کرتے اس وقت تک وہ پسماندگی، جہالت اور افلاس کے گڑھے سے نہیں نکل سکتے۔

۳۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس نہ تو وسائل تھے، نہ تنظیم تھی اور نہ استحکام ایسی صورت میں اقتدار حاصل کرنا محال تھا۔ لہٰذا سید احمد نے سیاسی اقتدار اور کھوئی ہوئی عزت حاصل کرنے کی غرض سے قوم کے لیے پہلے اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنا ضروری سمجھا۔

۴۔ سید احمد کا خیال تھا کہ اس وقت تک سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری حصول تعلیم ہے۔ بغیر تعلیم کے اگر سیاسی آزادی حاصل بھی کرلی جائے تو وہ قائم نہیں رکھی جاسکتی۔ لیکن تعلیم کے ذریعے کھویا ہوا سیاسی اقتدار اور عزو شرف حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہی وہ تجربات تھے جنھوں نے آنے والے دنوں میں سید احمد کے سیاسی رول کو متعین کیا۔ ان کے سیاسی افکار میں بعد میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ان کے تجربات کا نتیجہ تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے حکومت برطانیہ سے کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ لیکن ۱۸۶۰ء کی انسداد قحط کی کمیٹی میں، ۱۸۶۶ء کی ضلع تعلیمی کمیٹی میں، وائسرائے کی کونسل اور تعلیمی کمیشن وغیرہ میں رہنے کے بعد ان پر یہ تلخ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ جب تک مسلمانوں کو معقول اور مناسب تعلیم نہ دی جائے گی اس وقت تک کونسل میں یا دوسری جگہوں پر ان کی نمائندگی غیر مؤثر ہوگی۔ ایک موقع پر انھوں نے تلخی سے کہا کہ کمیٹیوں میں ہندوستانی نمائندے اسی طرح

بیٹھے رہتے ہیں جیسے میڈم تُساؤ کی گیلری میں موم کے پتلے رہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے لیے سنگین تھا۔ برطانوی حکومت صحیح معنوں میں مسلمانوں کو باغی تصور کرتی تھی اور اس لیے ان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ روا رکھا گیا اور ان کو سیاسی اور معاشی طور پر بالکل مجہول بنا دینا چاہتی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ برطانیہ کی مخاصمت کو صرف برصغیر کے محدود دائرے میں نہیں دیکھا بلکہ پوری دنیائے اسلام کی تاریخ کے پس منظر میں دیکھا۔ جہاں عیسائیوں اور مسلمانوں میں ابتداء سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ سید احمد نے نہایت ہوشیاری سے اس بات کو محسوس کر لیا کہ ان حالات کے تحت مسلمانوں کی طرف سے ذرا بھی مخالفت مسلمانوں کے لیے جو پہلے ہی سے ان پڑھ فاقہ کشی اور غیر منظم ہیں۔ بربادی کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اس سیاسی سوجھ بوجھ نے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے رویے کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ بتانے کے لیے کہ برصغیر کے مسلمان بنیادی طور پر برطانوی حکومت کے مفادار ہیں۔ انھوں نے "دی لائل محمڈنز آف انڈیا" کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء کیا۔ جس میں ان مسلمانوں کے حالات درج ہوتے تھے۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں حکومت برطانیہ کی حمایت کی تھی۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو عناد تھا اسے دور کرنے کے لیے انھوں نے عیسائی مذہب اور اسلام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کا سلسلہ پیغمبر اسلامؐ کے اس دور سے قائم کیا۔ جب کہ کچھ مسلمانوں نے عربوں کی ظلم و زیادتی کی وجہ سے حبش کے بادشاہ کے یہاں پناہ حاصل کی تھی "اسلام سے زیادہ کوئی مذہب اس زمین پر ایسا نہیں جو عیسائی مذہب کا اس سے زیادہ طرف دار ہو۔" انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اس سوال کا جواب دیا کہ کیا مذہب اسلام عموماً انسانی برادری کے لیے اور خاص طور پر یہودی اور عیسائی مذہب کے لیے مضر ہے یا مفید۔ تبیین الکلام میں انھوں نے قرآن کریم اور انجیل مقدس میں، جو باتیں مشترک ہیں ان کی نشاندہی کی ہے۔ یہ کام بڑا انوکھا تھا انھوں نے ایک ایسے کام کی ابتداء کی تھی جو مذہبی جہاد کے باعث ایک عرصے سے لاینحل تھا۔ خود ان کے زمانے میں بھی عیسائیوں اور ترکوں میں تنازعہ برقرار تھا۔

انگریزوں کو بھگانے کے قابل دوسرا مسئلہ مسلمانوں کا نظریہ جہاد تھا۔ اس کی وجہ سے انیسویں صدی کی ابتداء ہی سے ساری سیاسی فضاء مکدر تھی۔ پشاور کے قریب بالاکوٹ سے لے کر بنگال کے بہادر پور تک جہاد کا مذہبی جذبہ لوگوں کے ذہن و دماغ پر طاری تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ اور سید احمد شہید کے مریدوں کی سرگرمیاں (جسے انگریز مصنفین وہابی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں) انگریزوں کے دماغ میں مسلمانوں کی جانب سے شک و شبہ قائم ہوئے تھے۔ سید احمد خاں نے اپنی خداداد ذہانت اور مسلم فقہ سے واقفیت کی بناء پر لوگوں کے دلوں سے اس خیال سے دور کرنے کی کوشش کی کہ برصغیر میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا مذہبی

فریضہ ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں وہابیوں پر عائد کیے گئے الزامات کی بھی تردید کی۔ انھوں نے یہ دلیل دی کہ جب ۱۸۵۷ء میں بخت خاں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے جواز کے لیے فتویٰ مانگا تو علماء نے اس سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ سچی وہابیت حکومت برطانیہ کی مخالف نہیں۔ باوجود اس کے کہ سید احمد انگریزوں کی حمایت کرتے تھے یہ ان کی سیاسی مصلحت تھی جس کے زیر اثر انھوں نے دہلی کے علماء کی جماعت کو وہابی جماعت کا نام دیا۔ سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل اور دوسرے بزرگوں سے سید احمد کی ارادت مندی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن سے بھی ظاہر ہے۔ جس میں انھوں نے ان بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ سید احمد نے شاہ اسمٰعیل شہید کے واعظ سنے تھے اور جیسا کہ ان کی ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے وہ ان کے زیر اثر بھی رہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو حکومت برطانیہ کے خلاف ابھارنا خود مسلمانوں کے حق میں اچھا نہیں۔ وہابیوں کے عقائد کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ایک وہابی خالص عبادت گزار ہوتا ہے وہ اسلام کا پیورٹن ہوتا ہے اور شرح محمدی کا سچا پیروکار ہوتا ہے ان لوگوں کا یہ کہنا کہ وہ حکمران طبقے کے مخالف ہیں، خفیہ سازشیں کرتے ہیں اور لوگوں کو بغاوت کے لیے آمادہ کرتے ہیں، کھلا ہوا اتہام ہے۔ سید احمد نے وہابیت کو ایک خاص مذہبی تحریک سے تعبیر کیا۔ جس کا سیاسی نظریات سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جو تاریخی بے اعتدالیوں سے پاک نہیں تھا لیکن پھر بھی انھوں نے بہت کامیابی اپنے مؤقف کی حمایت اپنے مضامین اور تبصروں کے ذریعے کی۔

حکومت برطانیہ کی حمایت کرنے اور اس سے اشتراک و تعاون رکھنے کے باوجود سید احمد خاں ترقی پسندانہ سیاسی نظریات کے حامل تھے۔ دراصل وہ کئی لحاظ سے برصغیر میں ترقی پسندانہ سیاسی نظریات کے پیش رو ہیں۔ ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" ان کی سیاسی طور پر بیدار مغزی کی آئینہ دار ہے۔ جب انھوں نے ہفتہ وار اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء کیا تو اس کے سرنامے پر یہ عبارت ہوتی تھی۔ "جائز رکھنا چھاپے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔"

اسباب بغاوت ہند میں سید احمد نے انقلاب کے اصولوں کی نہایت ہوش مندانہ تشریح کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"عام سرکشی کا باعث یا کوئی ایسی عام بات ہو سکتی ہے کہ جو سب کی طبیعتوں کے مخالف ہو یا متعدد باتیں ہوں کہ کسی نے کسی گروہ کی طبیعتوں کو پھیر دیا ہو اور رفتہ رفتہ عام سرکشی ہو گئی ہو۔" سید احمد نے اس کی تشریح کی کہ برصغیر میں اس ناخوش گوار واقعہ کا سبب مقامی لوگوں کی قانون ساز کونسل میں داخلے پر پابندی ہے۔ انھوں نے لکھا۔ "واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائیداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات سے۔ حکام کو بھلائی یا برائی تدبیر کی صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے۔ بیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو۔" ان الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں لالہ لاجپت رائے نے کہا۔ "یہ شیریں الفاظ

تھے۔ جو شریفانہ لب و لہجہ میں کہے گئے، جن میں سچائی اور آزادی کی روح تھی"۔ انھوں نے کہا "لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستان کے شریک نہ ہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین و ضوابط کی جو جاری ہوئے بخوبی معلوم نہیں ہو سکے اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کو واجبات سے تھا ملحوظ نہیں رہے اور رعایا کو اس مضرت کو رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی۔ بلکہ بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشاء اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کو بہ سبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور ہم اس تجویز سے واقف نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے اور وہ بعض باتیں جو درحقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس کے کہ وہ فی نفسہ اچھی تھیں یا بری زیادہ تر ان کے غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچ گئی کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس غلط خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔

"ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا جو نہایت جاہل ہیں اور بے ترتیب، لیجس لیٹو کونسل ہونا شریک ہونا کس طرح ہوتا اور کیا قاعدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا اور اگر رعایا نے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ کے لیجس لیٹو کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ ان کے انتخاب کا کیا ہوتا اور اس میں بہت سی مشکلیں پیش آتیں کیونکہ اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے لیے بہت اچھی اور مفید ضرور ہے اور اسی کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے"۔

پھر سید احمد نے گورنمنٹ کو لوگوں کے ساتھ بہتر تعلقات پیدا کرنے کی تلقین کی اور ان کے حقوق کی طرف متوجہ کیا۔ "یہ بھی ایک عام قاعدہ محبت، کا جبلت انسانی بلکہ حیوانی میں بھی قدرتی پیدا کیا گیا ہے کہ اعلیٰ کی طرف سے ادنیٰ کی طرف محبت چلتی ہے۔ باپ کی محبت اپنے بیٹے کی طرف پہلے اس سے شروع ہوتی ہے کہ بیٹے کو باپ سے.... اسی بنا پر یہ بات ہے کہ ادنیٰ جو اعلیٰ سے محبت شروع کرے وہ خوش آمد گنی جاتی"۔ محبت اٹھا کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری گورنمنٹ کو اول چاہیے تھا کہ رعایا کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے کہ جیسے ابری کا پتھر کہ باوجود دو رنگ کے ایک ہوتا ہے۔ سفید رنگ میں سیاہ خال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور سیاہی سفیدی عجیب بہار دکھلاتی ہے"۔

جب سید احمد نے گورنمنٹ کی توجہ لوگوں کے جذبات کا احترام کرنے کی طرف مبذول کرائی جاتی تو انھوں نے عوام کو ان کے فرائض بھی بتائے۔ انھوں نے عوام سے کہا کہ وہ جرأت کے ساتھ اپنی شکایات گورنمنٹ تک پہنچائے۔ ۱۰ مئی ۱۸۷۶ء کی علی گڑھ کی ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ "کیا آپ یہ امید کرتے ہیں کہ برٹش پارلیمنٹ کے ممبران آپ کے مسائل میں دلچسپی لیں گے اس وقت تک جب تک کہ آپ اپنے مسائل میں دلچسپی کا اظہار نہ کریں ۔۔۔۔ مجھ پر اعتماد کیجیے کہ آپ کے اندر جو بزدلی کا جذبہ کارفرما ہے وہ غلط ہے کیا آپ اس بات سے باخبر ہیں۔ کہ آپ اپنے گھروں میں اور خاندان کے افراد کے ساتھ بیٹھ کر گورنمنٹ کے بہت سے کاموں کی مذمت کرتے ہیں لیکن جب آپ انگریز حکام سے ملتے ہیں تو ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا آپ ان کے کاموں میں بالکل مطمئن ہیں۔ اسی طرح کی حرکات ہمارے ملک کے مفاد کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان کے لیے یہ بہت زیادہ بہتر ہوگا اگر یہاں کے لوگ گورنمنٹ کی سرگرمیوں کی بابت صاف گوئی اور ایمان داری سے کام لیں"

اس زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح کے خیالات ترقی پسندانہ ہی نہیں بلکہ انقلابی بھی ہیں۔

گورنر جنرل کے بڑھتے ہوئے اختیارات کی مخالفت

۱۸۶۹ء میں جب گورنر جنرل آف انڈیا کے اختیارات کی توسیع کے لیے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے بل پیش کیا گیا تو سید احمد نے محسن الملک کو لندن سے لکھا۔ "حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے لیے ہے۔ اگر انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا تو کل رعیت اس کی منسوخی کی درخواست کرتی"

وائسرائے کی کونسل کی ممبری

۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے سید احمد کو وائسرائے کی لیجس لیٹو کونسل کا دو سال کے لیے ممبر مقرر کیا پھر لارڈ رپن نے مزید دو سال کے لیے ان کو ممبر کونسل کے لیے منتخب کیا۔ اس مدت میں سید احمد کونسل کے سرگرم ممبر رہے اور انھوں نے عوامی فلاح و بہبود کے امور میں بہت دلچسپی لی۔ مسودہ قانون مزارعان دکن اور مسودہ قانون ٹیکہ چیچک پر ان کی جو تقریریں ہیں وہ صاف گوئی، راست بازی اور مدلل بیان کی اپنی مثال آپ ہیں۔ قانون تقرر قاضیاں کو پاس کرانے میں ان کی کوششیں شامل تھیں۔ جبری قانون ٹیکہ چیچک کا مسودہ تو خود انھیں کا تیار کیا ہوا تھا اس کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "مائی لارڈ ٹیکہ کے لازمی کرنے کے بل کی کونسل میں پیشی کی اجازت چاہنے کے وقت مجھ کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ میں ایک ایسے قانون کی تحریک کر رہا ہوں جو انسانیت کے اصول کے مطابق ہے۔ میں منجملہ ان لوگوں کے ہوں جو کل جبریہ قانونی تجویز کو صرف بحالت اشد ضرورت کے قابل جواز خیال کرتے ہیں۔ رعایا کا ادنیٰ ایک حق منجملہ ان عزیز ترین حقوق کے ہے۔ جو اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرح میں بھی ان حقوق کی

خواہش کرتا ہوں ۔"

آخری جملے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے کس خوش اسلوبی سے اپنے کاموں کو انجام دیا۔ قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسط جب کونسل میں پیش ہوا تو سید احمد نے الکشن کے قاعدوں کی مخالفت کی۔ اس کے بارے میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا۔ " لارڈ رپن کے زمانے میں میں بھی کونسل کا ممبر تھا لارڈ رپن نہایت نیک دل اور نیک مزاج اور بلحہ صفت موصوف گورنر جنرل تھے لیکن افسوس ان کا ہاتھ کمزور تھا ان کے خیالات ریڈیکل لوگوں کے سے تھے اس وقت لوکل بورڈ اور میونسپل کا قانون پیش تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سب لوگ الیکشن سے ممبر مقرر ہوں۔ اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں، بہت بڑا لبرل ہوں۔ لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقل مند کا کام نہیں ہے جو شخص کہ اس طرح کے الیکشن کے برخلاف تھا وہ میں تھا اگر میں شیخی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ رپن، کی رائے صرف میری ہی اسپیچ کے زور سے پھری کہ ایک ثلث کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ثلث انتخاب الکشن سے ۔"

کونسل کے ممبر کی حیثیت سے سید احمد نے جو کام کیے ان میں سارے برصغیر کی فلاح و بہبود کی سچی لگن پائی جاتی ہے اس سلسلے میں انھوں نے مذہب ذات پات کی کوئی تفریق روا نہ رکھی جب ۱۸۸۴ء میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کی جانب سے دیال سنگھ صدر انجمن ہذا نے ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا تو اس میں کہا " ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اس کی نسبت یہاں صرف سرسری طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے اور آپ جو اس زمانے میں جب کہ آپ مجلس مذکورہ میں کام کرتے تھے۔ بے طرفدارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبود کی فکر رکھتے تھے۔ اور قومی خیالات کو دلیری اور راست بازی کے ساتھ اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال کرتے تھے اس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہم وطنوں کی طرف سے دلی احسان مندی کے مستحق ہیں۔"

سپاسنامہ کے جواب میں سید احمد نے کہا۔ " آپ نے اپنے ایڈریس میں میری ان خدمتوں کا بھی ذکر کیا ہے جو میں نے اس زمانے میں انجام دیں تھیں جبکہ مجھ کو قانونی کونسل کے ممبر ہونے کی عزت حاصل تھی۔ میں اس بات کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ مجھ کو پورا یقین ہے کہ مجھ سا شخص ہندوستان کی قانونی کونسل کی ممبری اور جو بڑی جوابدہی اس ممبری سے متعلق ہے اس کو اپنے ذمہ لینے کے لائق نہ تھا میں خود ان مشکلات سے واقف تھا جو میرے راستے میں حائل تھیں مگر باوجود اس کے میری یہ تمنا تھی کہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی وفاداری کے ساتھ خدمت کروں۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے یہی وہ معنی ہیں جس میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیوں کہ ہم اس

کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہے۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں جن کی بناء پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ہندو یعنی ہندوستان کا رہنے والی قوم۔ جس زمانے میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔"

پبلک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن نے انھیں سول سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا۔ یہاں انھوں نے سول سروس کے قانون کو اس شکل میں باقی رکھنے پر زور دیا جس سے ہندوستانی سول سروس کمیشن، انگلینڈ کے تقرر کے بغیر اونچے عہدے حاصل کر سکیں۔

پان اسلامزم تحریک کی مخالفت

سید احمد کے سیاسی نظریات کا اندازہ پان اسلامزم کی تحریک اور نیشنل کانگریس کی تحریک کی طرف ان کے رویے سے ہوتا ہے۔ پان اسلامزم کی تحریک مولانا جمال الدین افغانی نے مسلم ممالک میں شروع کی تھی۔ اول الذکر تحریک نے دنیائے اسلام کی سیاست میں مسلمانوں کو حصہ لینے کی دعوت دی اور دوسری نے ہندوستانی سیاسی تحریکات کے بارے میں مسلمانوں کے رویے کے استحکام کا مطالبہ کیا۔

جمال الدین افغانی نے مسلم ممالک میں اپنی تحریک شروع کی تھی، ان ممالک سے برصغیر کی حالت مختلف تھی اس لیے سید احمد نے ہندوستانی مسلم سیاست کو بین الاقوامی بنانے کے نظریے کی مکمل تردید کی۔ انھوں نے اس طرح رجحانات کو خام خیالی اور سیاست سے ناواقفیت پر محمول کیا۔ انھوں نے ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی کو برصغیر کے مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں اس زمانے میں بین الاقوامی سیاست میں حصہ لینا برصغیر کی برطانوی حکومت سے براہ راست کش مکش کے مترادف تھا۔ پان اسلامزم کی تحریک سے سید احمد نے جو سرد مہری کا اظہار کیا اس کی بناء پر جمال الدین افغانی نے انھیں ہدف طعن و ملامت بنایا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت

انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں رکھی گئی۔ شروع شروع میں حکومت برطانیہ کا رویہ اس کے ساتھ نہایت شفقت آمیز اور ناز برداری کا تھا۔ لارڈ ڈفرن نے خود ایک موقع پر کہا کہ "وفادار حزب مخالف کا وجود جو بیجا دخل کے لیے کام کرے بہت ضروری ہے" ابتداء میں تو سید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس کے بارے میں کسی طرح کے خیال کا اظہار نہ کیا کریں لیکن بعد میں وہ اس تحریک کے ناقد بن کر آئے۔ لکھنؤ کے مشہور اور تاریخی لیکچر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء میں انھوں نے کہا۔

"میری کبھی عادت پولیٹیکل امور پر لیکچر دینے کی نہیں ہے اور نہ مجھے یاد ہے کہ میں نے کبھی پولیٹیکل امور میں کوئی لیکچر دیا ہو۔ میری توجہ ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں کی تعلیم کی طرف مائل رہی ہے اور اسی کو میں ہندوستان کے لیے، قوم کے لیے گورنمنٹ کے لیے بہت مفید سمجھتا ہوں لیکن اس زمانے میں بعض حالات ایسے درپیش آئے جن کے سبب سے ضرور ہوا کہ اپنی رائے سے اپنے بھائیوں کو جس کے ان کے حق میں میں مفید سمجھتا ہوں اطلاع دوں"

گو کہ سب سے پہلے سید احمد نے ہندوستانیوں کی کونسل میں نمائندگی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لیے بہت سے لوگوں کو سید احمد کے اس رویے پر بڑا تعجب ہوا کہ انھوں نے کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سلسلے میں کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس خیال کی حمایت کی۔ دوسرے بہت سے لوگوں نے اس کی صریحاً مخالفت کی۔ مولوی شرف الحق نے رسالہ کلام مفید الانام لکھا اور اس میں سید احمد کی لکھنؤ کی تقریر پر جو انھوں نے کانگریس کے سلسلے میں کی تھی۔ شدید تنقید کی۔ اپنے کھلے خطوط میں لالہ لاجپت رائے نے سید احمد کے بدلے ہوئے رویے پر اپنے دکھ بھرے جذبات اور تعجب کا اظہار کیا۔ اس خط کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں

"بچپن ہی سے مجھے یہ بات سکھائی گئی کہ میں علی گڑھ کے مرد بزرگ کی تعلیمات پر عمل کروں۔ آپ کا تہذیب الاخلاق میرے اور میرے والد کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ میرے والد آپ کو انیسویں صدی کے ایک پیغمبر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ علی گڑھ گزٹ میں آپ کی تحریریں، کونسل میں اور عوامی جلسوں میں آپ کی تقریریں بہت غور سے سنی گئیں اور میرے والد محترم نے انھیں عقیدت کے ساتھ محفوظ رکھا لیکن نیشنل کانگریس کے بارے میں آپ کی تقریر اور تحریر سے حیرت ہوتی ہے۔ کیا یہ منظر افسوس ناک نہیں ہے کہ ایک پیر جہاندیدہ اپنے ان پودوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے جو کبھی اس نے خود اپنے ہاتھوں لگائے تھے"

یہ حقیقت ہے اور ساتھ ہی تعجب خیز بھی کہ جس بات کی حمایت سید احمد خاں گزشتہ تین دہائیوں میں کرتے چلے آرہے تھے اس کی انھوں نے ۱۸۸۸ء سے مخالفت شروع کر دی۔ اپنے خیالات کی تبدیلی کی انھوں نے مندرجہ ذیل وجوہات بیان کیں۔

۱۔ جمہوری طریقہ کار کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ملک کے سبھی لوگوں کی علمی سطح برابر ہو۔ ہندوستان میں ایسی علمی سطح کا فقدان ہے لہذا جمہوریت کے فوائد چند لوگوں کے درمیان محدود ہو کر رہ جائیں گے۔

۲۔ مقابلے کے امتحانات ہندوستان میں ہونے کا مطلب (جیسا کہ انڈین نیشنل کانگریس کا مطالبہ ہے) یہ ہوگا کہ ہندوستان کی پسماندہ قومیں یہاں کی ترقی یافتہ قوموں کی مطیع بن کر رہ جائیں گی۔

سید احمد کا خیال تھا کہ فی الحال ملک میں جمہوری حقوق کا مطالبہ قبل از وقت ہے اس مطالبے سے

مختلف قوموں میں کش مکش اور تناؤ پیدا ہوگا۔ چونکہ یہاں بنگالی ہی تعلیمی میدان میں آگے تھے۔ اس لیے تمام سیاسی اختیارات کے وہ بلاشرکت غیرے مالک ہوں گے اور تمام ہندو۔۔۔۔ بہادر راجپوت جوشیلے مرہٹے اور دوسری جنگجو قومیں گورنمنٹ سے ناراض ہو جائیں گی۔ تشدد راہ پا جائے گا اور ملک کا امن غارت ہو جائے گا" مسلمانوں کو ان کا مشورہ یہی تھا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر اپنی ساری صلاحیت تعلیم حاصل کرنے پر صرف کر دیں۔ اور تعلیم اور سائنسی لیاقت میں دوسری قوموں کے برابر ہو جائیں اور اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔

بہت سے ایسے ہندو راہنما تھے جنھوں نے سید احمد کے خیالات کی حمایت کی اور کانگریس کی مخالفت کی۔ کچھ لوگوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس مخالف تحریک کی رہنمائی کریں۔ راجہ بھنگا (اودے پرتاب سنگھ) نے تو کانگریس کے خلاف انگلینڈ میں اپنے کتابچے کی تقسیم کے سلسلے میں ان کی امداد چاہی۔ بریلی کے کنور مصر ہرچرن لکھتے ہیں۔ "میرے خیال میں اس بات سے باخبر ہوں گے کہ کانگریس کے آدمی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ میرے وکیل پی۔ این۔ برجی پچاس پچاس روپے کے دو ٹکٹ میرے پاس لائے اور یہ کہہ کر مجھ سے خریدنے کے لیے کہا کہ آپ کو اس تحریک کی امداد کرنی چاہیے تاکہ تمام ملک کا فائدہ ہو۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور ان کو بتایا کہ کانگریس کے نتائج مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ضد کی اور کہا کہ وہ اس شہر کے دوسرے رئیسوں سے چندہ اکٹھا کر چکے ہیں اور ہر شخص اس کے حق میں ہے لیکن حکومت کے افسروں سے بچ کر ہی یہ کام ہو رہا ہے"

جوگندر ناتھ داس، کنور درگا پرشاد، کنور نرپند بہادر، راجہ بنارس اور دوسرے ہندوؤں نے سید احمد کے خیالات کی حمایت کی۔ مسلمانوں کی اکثریت نے سید احمد کی اس سمت میں رہنمائی قبول کی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی سال تک لوگ اور خاص طور پر ایس۔ این برجی نے اس کی کوشش کی کہ سید احمد کانگریس کی تحریک میں شامل ہو جائیں۔ ۲۵ نومبر ۱۸۸۷ء کو ایس۔ این برجی نے سید احمد کو لکھا۔ "سول سروس کے مسئلے پر جس گہری دلچسپی کا اظہار آپ نے کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے" انھوں نے سید احمد سے سول سروس کے بارے میں ایک یادداشت پر دستخط کرنے کی درخواست کی تھی جسے ہاؤس آف کامنس کے سامنے پیش کرنا تھا۔ ۴ مئی ۱۸۸۵ء کو جب ایس۔ این برجی وائسرائے سے ملنے کے لیے ایک وفد کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ تو انھوں نے سید احمد سے بھی امداد کے لیے درخواست کی اور لکھا "اگر آپ اجازت دیں تو ہم علی گڑھ میں آپ سے مل لیں" ۵ دسمبر ۱۸۸۵ء کے ایک دوسرے خط میں انھوں نے سید احمد سے کلکتہ میں ہونے والی ایک نیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے درخواست کی اور لکھا۔ "قومی ڈیلیگیٹوں کا کوئی اجتماع بھی مکمل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ آپ کی شرکت نہ ہو۔ وہاں آپ جو نظریات پیش کریں گے۔ اس کا خیرمقدم کریں گے" انھوں نے مزید لکھا۔ "اگلے سال شاید پارلیمنٹری انکوائری بھی ہونے والی ہے

ہمیں اپنا ایوان خود بنانا چاہیے اور آپس کے تبادلہ خیال سے ایک پروگرام کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔" لیکن سید احمد کا خیال تو یہ تھا کہ ابھی سیاسی مظاہروں کا وقت نہیں آیا ہے اور یہ تمام ہندوستانیوں کے لیے لازم ہے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں کہ وہ اپنی پوری طاقت اور انتھک محنت سے عام تعلیمی بیداری پیدا کریں۔

سید احمد کی کانگریس کی مخالفت ان کے حالات کے مشاہدے پر مبنی تھی۔

سارے ہندوستانیوں کی بہبود کا خیال

فرقہ واریت سے اس کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ اور وہ سارے ہندوستانیوں کی بھلائی چاہتے تھے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں لیکچر دیتے ہوئے انھوں نے کہا: "اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے اپنے دیس سے پردیس ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا ہوتے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ پس اگر ہم اس حصے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے۔ قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے۔ اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں اتفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔"

۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو گورداس پور میں ایک تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک گھر دوسرے سے ملا ہے ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا کے شریک ہیں اور ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے ملے بغیر چارہ نہیں۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے۔ نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور برباد ہو جاویں گی۔ پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیال اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔

گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو ان میں بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ یا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے؟ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔"

دی یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

۱۸۸۸ء میں سید احمد نے یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد انگریزی میں رسالے شائع کرنا تھا اور برٹش پارلیمنٹ کے ممبروں کو ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریات سے واقف کرانا تھا جو کانگریس کی پالیسیوں سے متفق نہیں تھے۔ مدرسۃ العلوم کے پرنسپل تھیوڈر .... بک اس ایسوسی ایشن کے ناظم خصوصی تھے۔ انھوں نے گراہم کو لکھا۔ "میں نے اپنے سر نام نہاد کانگریس کے خلاف ایک بڑی ذمہ داری لے لی ہے اور ایک ایسوسی ایشن قائم کی ہے"۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ تنظیم تھی اور اس کے قائم کرنے کا سہرا تھیوڈر بک کے سر ہے۔ ۱۸۹۳ء میں تھیوڈر بک نے ایک اور ایسوسی ایشن قائم کی جس کا نام "محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" رکھا۔ خود اس ایسوسی ایشن کے سیکرٹری بنے۔ اس خیال سے کہ یہ ایسوسی ایشن مخالفین کے اظہار خیال کا مرکز نہ بن جائے۔ اس کی شاخیں قائم کرنے اور اس کی پبلک میٹنگ کرنے پر پابندی لگا دی۔ اس طرح یہ ایسوسی ایشن بک کے خواہش کے مطابق انگریزوں اور ان کے ہوا خواہوں کے پروپیگنڈے کا مرکز بن گئی اور ہندو اور مسلمانوں کے ایک دوسرے سے قریب آنے میں رکاوٹ ثابت ہوئی۔

مسٹر بریڈلا کی انڈین کونسل بل کی مخالفت

انڈین کونسل بل کا مسودہ پارلیمنٹ میں مسٹر بریڈلا نے پیش کیا۔ برصغیر کی سیاسی زندگی کی تاریخ میں یہ بل اہمیت کا حامل تھا۔ تھیوڈر بک اس بل کے مخالف تھے۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کے طلبہ کو ورغلایا کہ وہ اس مجوزہ بل کے خلاف مسلمانوں سے دستخط حاصل کریں۔ یہ بھی علم ہوا کہ اس زمانے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اہتمام مسٹر بک کے ہاتھ میں تھا گو اخبار میں ایڈیٹر سے ان کا نام کبھی شائع نہ ہوا۔ بہرحال مسٹر بک نے کانگریس اور بنگالیوں کے خلاف ایک اچھا

خاصا محاذ قائم کر لیا تھا۔

طفیل احمد کا خیال ہے کہ ۱۸۸۴ء کے بعد سر سید احمد خاں کے سیاسی خیالات پر مسٹر بک چھائے ہوئے تھے لیکن سید احمد کے مسٹر بک کے اثرات کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بک اس زمانے میں سیاسی امور میں حصہ لینے میں بہت سرگرم رہے اور انھوں نے سید احمد کو بھی اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہا گو کہ کانگریس کی مخالفت اور نمائندہ اداروں کا مطالبہ وغیرہ سید احمد کے اس زمانے کے حالات کے جائزے پر مبنی تھی۔ بک پر سر سالار رہنما نے جو اعتماد کیا تھا اس کا مسٹر بک نے غلط فائدہ اٹھانا چاہا۔ انھوں نے اپنی مرضی سے جو رنگ اور رخ دیا یقیناً اسے سر سید کبھی پسند نہ کرتے۔

سید احمد کی سب سے زیادہ توجہ تعلیم کی طرف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ لہٰذا ان کو سیاسی امور میں دخل نہ دینا چاہیے۔ ۱۸۸۸ء میں سید امیر علی نے سید احمد سے کلکتہ میں ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ محمڈن نیشنل کانفرنس میں شریک ہو جائیں لیکن سید احمد نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا کسی سیاسی ایجی ٹیشن میں حصہ لینا مضر ہو گا۔

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

سید صاحب ۱۸۸۲ء میں لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے۔ چنانچہ تعلیم کے معاملے میں ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن نے لی تھی۔ ان کا طویل اظہار خیال "علی گڑھ گزٹ" کی کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس بیان سے آپ کا ممتاز ماہر تعلیم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اس کمیشن میں شہادت دینے کے لیے سید صاحب مستعفی ہوئے اور ان کے صاحبزادے سید محمود کو ان کی جگہ ممبر مقرر کیا گیا۔

سید محمود نے اپنی ممبری کے دور میں اٹھارہ رزولیشن کمیشن میں ایسے پاس کرائے تھے جو مسلمان کی ترقی تعلیم اور فلاح و بہبود سے تعلق رکھتے تھے۔

اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

ہم نے گزشتہ صفحات میں بھی اس مسئلے کو چھیڑا تھا لیکن یہاں پر صرف سیاسی نقطہ نگاہ سے بیان مقصود ہے۔ اردو زبان اور فارسی زبان و رسم الخط کو رواج مغلیہ عہد میں ہوا تھا لیکن ان کی ترقی و اشاعت میں ہندوستان کی تمام اقوام نے بلا اختلاف مذہب و مسلک حصہ لیا تھا۔ اس زبان میں صرف عربی اور فارسی الفاظ ہی شامل نہ تھے۔ بلکہ بھاشا و سنسکرت و ہندی زبانوں کے الفاظ بھی موقع بہ موقع پہلو بہ پہلو شامل ہوتے گئے۔ اس سے ماننا پڑتا ہے کہ تمام اقوام ہند کا اردو زبان کو فارسی رسم الخط کو ترجیح دینے

میں مغلیہ عہد میں مساوی حصہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی جہاں مسلم قوم کے لیے بہت سے مصائب و آلام لائی۔ وہاں ان کے عہد میں ترویج پانے والی زبان اور رسم الخط بھی نشانہ ہدف بن گئے حالانکہ ہندو قوم کا یہ محض تجاہل عارفانہ تھا یہ وہی زبان تھی کہ جس میں ہندو شعراء اور نثر نگاروں نے اپنی نثری و شعری مجموعے چھوڑے جس سے ہندو قوم آج بھی انکار نہیں کر سکتی۔

۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں میں سے سربرآوردہ لوگوں نے یہ اسکیم بنائی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کو ختم کر دیا جائے اور ان ہردو کی جگہ بھاشا زبان کو جاری کروایا جائے اور دیوناگری خط کی ترویج ہو۔

مولانا الطاف حسین حالی "حیات جاوید" میں رقم طراز ہیں۔

"سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

اس موقع پر مسلمان عمائدین اور ہندو قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں اچھی خاصی بحث و تمحیص چل نکلی اور اچھا خاصا کھچاؤ پیدا ہو گیا۔

۱۸۸۲ء میں سید صاحب جبکہ وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔

ایجوکیشن کمیٹی میں ہندوؤں کی شقاوت قلبی نے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف ایک دفعہ پھر پہلے کی نسبت زیادہ زور و شور سے طوفان بے تمیزی اٹھا دیا۔ اس دفعہ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندو اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ہندوؤں کی بے شمار انجمنوں اور سبھاؤں نے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف بڑی بڑی یادداشتیں کمیشن کو بھیجیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر سید صاحب کے مسلمان دوستوں نے پنجاب میں "انجمن حمایت اردو" قائم کی۔ مسلم قوم کے سربرآوردہ لوگوں اور انجمنوں نے بھی اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی حمایت میں ایجوکیشن کمیشن کو یادداشتیں اور محضر بھیجے۔

لیکن حالات کی نزاکت کے پیش نظر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے ایک باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کی مصالح ملکی وابستہ ہیں یہ اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

چنانچہ اگر ہم غور کریں تو اسی اردو ہندی جھگڑے نے دو قومی نظریے کی طرف سرسید کو متوجہ کیا اور سید صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق واقعی یہ قومی مسئلہ بن گیا تھا جس کی نوعیت سیاسی تھی۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں سر اینٹونی میکڈانل لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کے پاس ہر دھوبلی کے بڑے بڑے معزز اور سر برآوردہ ہندوؤں نے ایک بار پھر اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف یادداشتیں پیش کیں۔ ان دنوں سید صاحب صاحب فراش تھے اور بعض حالات کی بناء پر پہلے ہی رنج و الم کی تصویر تھے۔ اس واقعہ کو سن کر سناٹے میں آگئے اور پھر بستر مرگ پر ہی اس موضوع پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سید صاحب کی وفات سے نو دن پہلے چھپا۔

محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

سید صاحب نے ۱۸۸۳ء میں "محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن" قائم کی اس سے قبل آپ کو ۱۸۶۷ء میں جبکہ "سائنٹفک سوسائٹی" کو قائم کیے ہوئے ابھی چند سال گزرے تھے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندو ہوں یا مسلم تعلیم کی غرض سے یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لیے ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔ اور اس کے ممبر دو روپیہ ماہوار چندہ دیا کریں۔ جو یورپ کے سفر کے لیے فنڈ کے طور پر جمع ہوتا رہے۔ مگر آپ کا یہ خیال کامیاب ثابت نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو اس وقت یورپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے برخلاف جانتے تھے۔ اور مسلمان بھی اسی قسم کے توہمات رکھتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں یورپ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس وقت سول سروس کے قاعدے کے مطابق انیس برس کی عمر میں ولایت جا کر سول سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا لیکن انیس برس کی عمر تک ہندوستان میں ابھی بچہ سمجھا جاتا تھا۔

اسی مقصد کے لیے سید صاحب نے "محمڈن سول سروس ایسوسی ایشن" خاص مسلمانوں کے لیے قائم کی۔ کہ اگر کم از کم پانچ سو مسلمان ممبر دو دو روپیہ ماہوار دینے لگ جائیں تو اسی طرح ہر سال بارہ ہزار روپیہ اس فنڈ میں مستقل طور پر اکٹھا ہو سکتا ہے تاکہ جن مسلمانوں کے لڑکے ولایت میں اپنی تعلیم کا خرچ اپنے پاس سے پورا نہ کر سکیں اس فنڈ سے ان کی امداد کی جائے۔

اس کے علاوہ سید صاحب نے "مدرسۃ العلوم علی گڑھ" میں ایک خاص کلاس کا اجراء کیا کہ جس کی تعلیم کا طریقہ اس طور پر مقرر کیا گیا تھا کہ جس سے اس کلاس کے طالبعلموں کو ولایت پہنچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اسی کلاس کا نام "سول سروس کلاس" رکھا گیا تھا مگر حقیقت میں اس کلاس کے طالب علم اس

مقصد کے لیے تیار کیے جاتے تھے کہ وہ انگلستان پہنچ کر مندرجہ ذیل کورسز میں سے کوئی ایک اختیار کریں۔

(i) سول سروس کا امتحان مقابلہ

(ii) کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کریں۔

(iii) کسی پیشے کا ڈپلوما مثلاً، بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجنیئری حاصل کریں۔

اس مقصد کے لیے سید صاحب نے مختلف علاقوں میں کمیٹیاں قائم کیں۔ کچھ روپیہ بھی جمع ہوا مگر حسب امید کام نہ چل سکا اور اس طرح یہ اسکیم ختم ہو گئی۔

دو قومی نظریہ

یاد رہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمان قوم زندگی کے ہر مرحلے پر سمٹ کر رہ گئی۔ مسلم قوم پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا بڑے بڑے مصلح اور ریفارمر شکستہ دل ہو کر حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ ایسے وقت میں سرسید احمد خاں ہی ایک ایسے شخص تھے جو آگے بڑھے۔ قوم کے زوال کے اسباب کی تشخیص کی۔ سرسید جانتے تھے کہ اب طویل عرصے تک انگریز اس ملک کے اقتدار کو نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے مسلمان قوم کو اپنے ملی تشخص، اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت و کلچر کے تحفظ کے لیے سب سے پہلے خواب غفلت سے بیدار ہونا ہو گا اور سب سے پہلے وقتی تقاضوں کے تحت حکمران قوم کے نزدیک ہونا پڑے گا جس کے لیے اوّل مرحلہ حکمران قوم کی زبان اور اس کے علم و ادب سے واقفیت کا تھا اسی مقصد کے لیے سرسید احمد خاں نے مختلف شہروں میں ملازمت کے دوران علمی سوسائٹیاں اور تعلیمی ادارے قائم کیے جن کی تفصیل ہم نے گزشتہ اوراق میں دی ہے۔

ابتدائی دور میں سید احمد خاں کے پیش نظر ہندو مسلم دونوں اقوام کی فلاح و بہبود تھی اور مذہب و فرقہ واریت سے سید صاحب کو کوئی اس قسم کی دلچسپی نہ تھی کہ اختلافات کو ہوا دے کر ہر دو اقوام کو ٹکرا دیتے۔ چنانچہ سید صاحب نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ ہندو اور مسلم ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں میں سے سربرآوردہ لوگوں نے یہ اسکیم بنائی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے۔ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو ختم کرا دیا جائے اور ان ہر دو کی جگہ بھاشا زبان اور دیوناگری رسم الخط کو ترویج کروائی جائے۔

مولانا الطاف حسین حالی اپنی کتاب "حیات جاوید" میں رقم طراز ہیں:

"سرسید کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید احمد خاں وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں

نے ایک بار پھر لیکن پہلے کی نسبت زیادہ زور و شور سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی مخالفت کی۔
اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے سید صاحب کے مسلمان رفقاء نے پنجاب میں "انجمن حمایت اردو"
قائم کی اور اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے لیے ایجوکیشن کمیشن کو یادداشتیں اور پھر محضر بھیجے لیکن حالات کی نزاکت
کے پیش نظر ایجوکیشن کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہ دی۔
کہا جاتا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ
تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کی مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس
کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔
اس طرح مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیس تاریخ کو سید صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے سر انیٹونی
میکڈانل لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کے پاس ہر دو صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربر آوردہ
ہندوؤں نے ایک بار پھر اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف یادداشتیں پیش کیں۔ ان دنوں سید صاحب
صاحب فراش تھے اور بعض حالات کی بناء پر پہلے ہی رنج و الم کی تصویر تھے۔ اس واقعہ کو سن کر سناٹے میں آگئے
اور پھر بستر مرگ پر ہی اس موضوع پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹ر مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سید صاحب کی وفات
سے نو دن پہلے چھپا۔
مسلم ہند کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے اس قدر طویل دور حکومت کے باوجود ہندو قوم نے کبھی مسلم
قوم اور مسلم حکمرانوں کے ساتھ وفا نہ کی۔ مثال کے طور پر عظیم مغل فرماں روا اکبر اعظم کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس
نے ہندو قوم و مذہب، تہذیب و تمدن اور ثقافت و کلچر کے ساتھ کیسی رواداری کا سلوک کیا مگر اس کی موت کے بعد
ہندو قوم ہی کے سپوتوں نے سکندرہ میں اس کے مقبرے میں سے اس کی ہڈیاں نکال کر جلا دیں پھر بعد میں مسلمانوں
کی سلطنت کو مٹانے کے لیے غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ ہندو قوم نے جو ساز باز کی۔ صفحات تاریخ پر قیامت
تک کے لیے محفوظ ہے۔
۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل مسٹر اے او ہیوم نے جو کہ ایک انگریز آفیسر تھے۔ ہندوستان
اور انگلستان کے ذمہ دار انگریز عہدے داروں اور سیاست دانوں سے مشورہ کرنے کے بعد کی۔ مسٹر اے او ہیوم
خود سول سروس میں سیکرٹری رہ چکے تھے۔
"انڈین نیشنل کانگریس" کی بنیاد بظاہر اقوام ہند کے جائز مطالبات کو انگریز گورنمنٹ کے سامنے پیش
کرنے نیز انگریز گورنمنٹ کے ساتھ خیر سگالی کے تعلقات پیدا کرنے کے لیے رکھی گئی تھی لیکن آہستہ آہستہ انگریز
اور ہندو کی ملی بھگت سے اس پر ہندو نے قبضہ کر لیا۔ کچھ مسلمان ممبر بھی اس میں شامل تھے جس کی بناء پر

کانگریس کے ہندو لیڈروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کانگریس ہندو اور مسلم قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔
کانگریس کے ذریعے ہندو لیڈروں کا دعویٰ ایک کھلا دھوکہ تھا جو کہ آئندہ چل کر ہندو اکثریت کے
مقابلے میں مسلم اقلیت کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوتا۔ اس سے قبل سید صاحب نے ہندو قوم کی مخالفت
نہ کی تھی اور نہ ہی کانگریس کے خلاف بیان دیا تھا۔ حالانکہ وہ کانگریس کے پچھلے عزائم سے واقف تھے۔
۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب "محمڈن ایجوکیشن کانفرنس" کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ سید صاحب
نے مسلمانوں کے جلسہ عام میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے خلاف کھل کر ایک مفصل اور پر مغز تقریر کی۔
مولانا الطاف حسین حالی "حیات جاوید" میں سید صاحب کے لکھنؤ کے لیکچر کے بارے میں رقم طراز ہیں:
"سر سید کا یہ لیکچر اردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہو گیا اور نیز
انگلستان کے اکثر نامور اخباروں نے اس سے نوٹس اور اس پر عمدہ ریمارکس کیے۔"
اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو بمقام میرٹھ انھوں نے دوسرا لیکچر جو کہ لکھنؤ کے لیکچر کی طرح مفصل
اور پر مغز تھا جلسہ عام میں دیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:-
"اس لیکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ کانگریس والوں جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعے
سے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگریس میں شریک ہیں یہ بالکل غلط ہے اور معدودے چند مسلمان
جو اس میں شریک ہوئے ہیں۔ انھوں نے غلطی کی ہے اور ان کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں
آتا کہ مسلمان من حیث القوم کانگریس میں شریک ہیں۔ یہ لیکچر بھی نہایت پر زور اور مؤثر تھا۔ ان دونوں
لیکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پرانے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سر سید کی ہر رائے اور ہر ایک تجویز
کی مخالفت یا اس سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ انھوں نے بالاتفاق ان کی رائے کو تسلیم کر لیا اور
باستثنائے معدودے چند تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اس پر پورا پورا عمل کیا۔ نیز پرانے خیالات کے
اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام اس سے کہ
ہندوؤں یا مسلمان ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔"
کانگریس کی سازش کو مسلم قوم پر فاش کرنے کے لیے سید صاحب نے اگست ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ
میں "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کی۔ اس ایسوسی ایشن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جو رئیس اور تعلقہ دار کانگریس
میں شریک نہیں ہیں۔ ان کی آراء اور خیالات اور رجحانات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً
چھپوا کر انگلستان کی عوام اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے ولایت بھیجی جائے۔ نیز اخبارات و جرائد کے ذریعے
سے ہندوستان اور انگلستان میں عمومی طور پر شائع کی جائے۔

چنانچہ اس ایسوسی ایشن کے قیام کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بنگال، بہار، مدارس، بمبئی، ممالک متوسط، اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے خلاف اجلاس کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس کے علاوہ ریاست اودھ کے تمام تعلقہ داران، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق رائے کیا گیا اور جس قدر ملک میں کانگریس کے خلاف کارروائیاں ہوئیں۔ ان کی تمام روئیدادیں ایسوسی ایشن کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً چھپ کر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

سید صاحب کے اس اقدام پر بنگال کے ہندو اخبارات نے سید صاحب پر سخت نقطہ چینی کی مگر سید صاحب نے کچھ پرواہ نہ کی۔

مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور ان کے تحفظ کے لیے یہ تمام کارروائیاں سید صاحب نے انجام دیں۔ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی سید صاحب کے پیش نظر یہی مقصد تھا۔ چنانچہ ہم یہاں سید صاحب کی جالندھر میں ۱۸۹۴ء میں کی گئی تقریر کا اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے تعلیم کے موضوع پر گفتگو کی تھی۔ اس تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب کو مذہب کے ساتھ کس قدر محبت اور شفیتگی تھی۔

"اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے آزاد ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو! میں خود بھی انہیں میں سے ہوں کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی نے "ایل ایل ڈی" کی ڈگری دی ہے ہم آدمی تبھی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

چنانچہ آخری دور کی تقاریر میں سید صاحب کے دو قومی نظریہ کی جھلک صاف دکھتی ہے۔ جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب رقم طراز ہیں۔

"لیکن سر سید احمد خاں کو پاکستان کے تصور کا خالق محض اس لیے نہیں کہا جاتا کہ وہ مشہور و معروف علی گڑھ تحریک کے بانی مبانی ہیں۔ وہ پہلے مدبر اور سیاست دان تھے جنھوں نے اعلانیہ طور پر کھلم کھلا ہندو تسلط اور غلبہ کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے ابتدائی ایام میں یہ بات کہی تھی کہ ہندوستان ایک ایسی حور شمائل دلہن کی صورت ہے جس کی

ہندو اور مسلمان دو آنکھیں ہیں اور اس کی ساری رعنائی اور خوبصورتی کا انحصار اس کی ان دونوں آنکھوں کی مساویانہ چمک دمک پر ہے" لیکن اس بیان کی حد تک بھی کے ایم پانیکر اپنی تصنیف SURVEY OF INDIAN HISTORY میں یہی فرماتے ہیں کہ اس وقت دو قومی نظریے کی وکالت کی گئی تھی۔ جب سر سید نے یہ کہا تھا کہ ہندو اور مسلم ہندوستان کی دو آنکھیں ہیں"۔

چنانچہ آگے رقم طراز ہیں۔

سر سید کی عظیم اور قابل احترام سیاسی بصیرت ان خیالات سے مترشح ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو مسلم تعلیمی کانفرنس (محمڈن ایجوکیشن کانفرنس) ۶۲ء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر لکھنؤ میں ایک اور تاریخی تقریر کے دوران ظاہر کیے تھے۔

"وہ برطانوی دارالامراء اور دارالعلوم کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ اب آئیے ذرا ہم اس وائسرائے کونسل کا تصور کریں جو اسی انداز میں تشکیل دی گئی ہو اور یہ بھی فرض کر لیجیے کہ تمام مسلم ووٹرز ایک مسلم رکن کے لیے ووٹ دیں گے اور ہندوؤں کو کتنے یہ بات یقینی ہے کہ ہندو اراکین چار گنا زیادہ ووٹ حاصل کریں گے اس لیے کہ ان کی آبادی چار گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم علم ریاضی سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ہندو کے لیے چار ووٹ ہوں گے اور مسلمان کے لیے صرف ایک ووٹ تو پھر آخر کس طرح مسلمان اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں؟ اس کی مثال بالکل پانسے کے کھیل کی طرح ہو گی۔ اس میں ایک آدمی کے پاس تو چار پانسے ہوں گے اور اس کے پاس صرف ایک پانسہ"۔

ایک موقع پر سر سید نے مسلمان کانگریسی لیڈر طیب جی کو مندرجہ ذیل دندان شکن جواب دیا۔

"میں نیشنل کانگریس" کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں اور مذاہب کے افراد رہتے بستے ہیں، ایک قوم کے افراد ہیں۔ یا یہ کہ ایک قوم بن سکتے ہیں؟ اور ان کے مقاصد اور اغراض دینی اور ملی بھی یکساں اور ایک ہی ہو سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگریس جیسی بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نہ یہ ساری قوموں کے لیے یکساں طور پر سود مند ہو سکتی ہے۔ آپ غلط نام یافتہ نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں کو ہندوستان کے لیے سود مند تصور کرتے ہیں لیکن میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان سرگرمیوں کو میں نہ صرف اپنے ہم مذہبوں کے لیے مہلک اور ضرر رساں سمجھتا ہوں بلکہ ہندوستان کے لیے بھی من حیث المجموعہ باعث زیاں ہی خیال کرتا ہوں۔ میں ہر اس کانگریس کا مخالف اور معترض ہوں خواہ وہ کسی ہیئت اور وضع کی ہو جو ہندوستان کو ایک قوم واحد قرار دیتی ہو"

جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب رقم طراز ہیں ۔

"چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ سرسید پہلے آدمی تھے ۔ جنھوں نے کانگریس کے کھیل کو سمجھ لیا تھا اور اس کے اس دعوے کو کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نیابت کرتی ہے انھوں نے مسترد کر دیا تھا۔ سب سے پہلی بار تحریک پاکستان کے قریباً قریباً سارے بنیادی تصورات انھی کی تقریر میں پائے جاتے ہیں مثلاً

۱۔ ہندوستان ایک ملک نہیں، بلکہ ایک برصغیر ہے ۔

۲۔ ہندو اور مسلم ایک نہیں، دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں ۔

۳۔ علیحدگی بہر حال لازمی ہے ۔

دی میکنگ آف پاکستان میں سمنڈز سرسید کے بارے میں لکھتا ہے (۶۵)

سیاست کے میدان میں انھوں نے کہا تھا کہ مسلمان ایک قوم ہیں جو ایک اکثریتی ووٹ سے قائم کردہ نظام حکومت میں نہ مدغم ہو سکتے ہیں اور نہ انھیں کہا جانا چاہیے ۔ اہل پاکستان ان کے بارے میں یہ بالکل جائز دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کے بانیوں اور خانقاہوں میں سے ایک ہیں ۔"

مسٹر ولفریڈن سکاون بلنٹ جو کہ انگلستان کا ایک مشہور ادیب تھا اس نے ہند کے وائسرائے کے دور میں ہندوستان کا دورہ کیا اور مختلف لوگوں سے ملا۔ وہ ہندوستان کے سیاسی ماحول اور مسلمانوں کے حالات پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کا گڑھ شمال مغرب ہے اور وہاں اسلام نہ بے یار و مددگار ہے اور نہ اسے وہاں سے معدوم کیا جا سکتا ہے۔ وادی گنگا کے بالائی علاقے کے رہنے والے مسلمان جو بہ اعتبار ذہانت و قطانیت اپنے ہندو پڑوسیوں اور ہم جیسوں سے کم تر نہیں ہیں بلکہ کردار اور اخلاق کے اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ بلند اور ارفع ہیں یہ نہیں بھولے ہیں کہ ابھی کچھ عرصہ پیشتر تک ہندوستان کا سارا نظم و نسق انھی کے اپنے ہاتھوں میں تھا اور اپنے روبہ تنزل مقدرات اور انحطاط پذیر رسوخ کو نہ تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس کے مستحق تھے اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ناقابل علاج ہیں ۔"

دسمبر ۱۸۸۳ء میں بلنٹ نے کلکتہ میں یہ تجویز پیش کی کہ اس کے خیال میں شمالی ہند کے تمام صوبوں کو ہندو حکومت کے تحت اس منصوبے میں بہرحال برطانوی حکومت کو ایک نگران طاقت کی حیثیت سے برقرار رہنا تھا انگریزی افواج کو ہر صوبے میں مقیم رہنا تھا تاکہ ان صوبوں کو برطانوی حمایت بھی حاصل رہ سکتی ۔ لیکن سارے دیوانی نظم و نسق، قانون سازی اور مالیات کو ملکی ہاتھوں میں

دے دینا ضروری تھی۔"

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انگریز دو قومی نقطۂ نظر کو بہت عرصہ پیشتر سمجھتے تھے اور ملکی تقسیم کو مانتے تھے اور یہی نقطۂ نظر سید احمد خاں صاحب کا بھی تھا۔ اس لیے سید صاحب کو بجا طور پر نظریہ پاکستان کا خالق تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسی نقطۂ نگاہ سے چوہدری رحمت علی نے علیحدہ مسلم سٹیٹ پر اپنی قیمتی آراء پیش کیں اور پھر بعد ازاں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ الہ آباد میں تصور پاکستان اور دو قومی نظریہ جامع ترین شکل میں پیش کیا جس کو آگے چل کر قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کی عملی شکل عطا کی۔

آخری ایام اور وفات

سر سید احمد خاں کی زندگی کا آخری دور ایک جانب تو ان کے کارناموں اور حسن خدمات سے عبارت تھا اور دوسری طرف رنج والم کی فراوانی اور صبر و سکون کے فقدان کا دور تھا۔ ایک طرف تو وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ جس تحریک کی ابتداء انھوں نے کی تھی وہ اب برگ و بار لا رہی ہے اور دوسری طرف انھیں دو ایسے پیچیدہ مسائل کا سامنا تھا جس نے انھیں اندھے کی طرح بٹھا دیا تھا ان میں پہلا مسئلہ تو ٹرسٹی بل کا تھا جس کی مخالفت ان کے قریبی دوست کر رہے تھے اور دوسرا مسئلہ کالج کے روپیہ میں غبن تھا۔

۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو جب کہ سید احمد کی عمر اڑسٹھ سال تھی انھوں نے پنجاب کے دورے کا قصد کیا۔ پنجاب کا یہ دورہ ان کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس دورہ میں ان کی خدمات کا اعتراف عوامی سطح پر ہوا۔ پنجاب کے عوام نے جس میں غریب بھی تھے اور امیر بھی، ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، مرد بھی تھے، عورتیں بھی، نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ سب نے نہایت جوش و خروش اور محبت کے جذبات کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ جس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں ناپید ہے۔ اس عوامی اعتراف نے بوڑھے رہنما پر یہ ثابت کر دیا کہ اس نے برصغیر کی فلاح و بہبود کے لیے شب و روز جو محنت کی تھی وہ رائیگاں نہ گئی اور اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ ان کی آواز نے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا تھا اور لوگ ترقی کی راہوں پر چلنے کے لیے بے قرار تھے۔ بوڑھے سید کو اس سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز تسلی نہ دے سکتی تھی۔

انھوں نے لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، گورداس پور، لاہور اور پٹیالہ کا دورہ کیا۔ ہر جگہ عوام اور ان کی انجمنوں نے جن میں ہندو مسلم سبھی شامل تھے۔ انھیں سپاسنامے پیش کیے۔ سید احمد کے لیے عوام کی محبت اور عقیدت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لوگ جوش میں ان کی سواری کھینچنے کے لیے بہ ضد تھے۔ لیکن سید احمد نے اس کی اجازت نہیں دی۔ عوام کے اس خلوص اور اظہار محبت سے سید احمد بہت متاثر ہوئے جب ان کی

رشن کرتار پور پہنچی جو ان کے دورہ میں شامل نہیں تھا تو وہاں کے ایک آدمی رام چندر نے آٹھ روپیہ نو آنے چندہ میں پیش کیے جو اس نے گاؤں کے ایک اسکول سے جمع کیا تھا۔ گو کہ رقم بظاہر بہت معمولی تھی لیکن جس محبت اور خلوص جذبات کے ساتھ وہ پیش کی گئی تھی اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے اس عطیے سے اندازہ ہوا کہ ان کی خدمات کا اعتراف دیہات میں بھی عام ہے۔ انھوں نے رام چندر کے اس عطیے کو شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ قبول کیا۔ ایسی شکر گزاری جس کا اظہار انھوں نے ہزاروں روپیہ عطیہ دینے والوں سے بھی نہیں کیا تھا۔ انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے سید احمد کی خدمات کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا "آپ کے خیالات کی وسعت اور آپ کا فیاضانہ برتاؤ جو آپ نے اپنے خاص ہم مذہبوں کے علاوہ اور فرقوں کے ساتھ کیا ہے آپ کے عام طریقہ کارروائی کی کچھ کم مشہور و معروف صفت نہیں ہے۔ آپ کا برتاؤ ابتداء سے انتہا تک تعصب یا خودرائی کے دھبے سے بالکل مبرا رہا ہے جو تعلیمی انسٹی ٹیوشن آپ نے علی گڑھ میں قائم کیا ہے اس کے فائدوں سے ہندو اور مسلمان دونوں برابر مستفیض ہو سکتے ہیں ہمارے بدقسمت ملک میں معمولی مذہبی اور قومی خصومتوں کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ اور اس کو زمانہ گزشتہ میں قومی اور مذہبی تنازعات کے باعث سے اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ آپ جیسے کشادہ دل اور فیاضانہ خیالات رکھنے والے شخص کا یہاں تشریف لانا اس پر ایک خاص مبارک بادی کا باعث ہے خدا کرے کہ عرصہ دراز تک آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر تلقین علم کر سکیں اور ان کے دلوں سے تعصب اور خودرائی کو بیخ و بنیاد سے دور کر کے برادرانہ اتحاد کے مستحکم رشتوں میں ان کو باہم ملا سکیں۔"

سید احمد نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس کا یہ ایک سچا اور پرخلوص خراج تحسین تھا۔

۱۸۸۸ء میں سید احمد کو نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلیٰ ستارۂ سند (کے۔ سی۔ ایس۔ آئی) کے اعزاز سے ممتاز کیا گیا۔ ۱۴ رمئی کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک خاص تقریب منعقد ہوئی جس میں مجسٹریٹ نے ملکہ کا فرمان پڑھ کر سنایا۔ اس موقع پر علی گڑھ کے عوام نے سید احمد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دینا چاہا۔ لیکن سید احمد نے یہ کہہ کر تقریب میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ عوام کی ابتر معاشی حالت ایسے فضول اخراجات کی اجازت نہیں دیتی۔

۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے سید احمد کو ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دی۔ اس سند کو انھوں نے قابل قدر سمجھا کیونکہ یہ مغرب کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دی گئی تھی۔

۱۸۸۳ء میں سید احمد سخت بیمار ہوئے۔ انھیں جیسے ہی صحت یابی ہوئی، انھوں نے ٹرسٹی بل کی تیاری ضروری سمجھی تاکہ مدرستہ العلوم کی جائیداد کا انتظام ٹرسٹیز (متولیوں) کے سپرد کر دیا جائے اور ان کی وفات کے بعد کسی قسم کے جھگڑے کا خدشہ باقی نہ رہے۔ ۱۸۸۹ء میں انھوں نے ایک مسودہ تیار کیا اور اسے مدرستہ العلوم کے ممبران کے پاس بھیجا تاکہ ان کے خیالات معلوم ہو سکیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں نے جو ان کے گہرے دوست اور قوت بازو سمجھے جاتے تھے اس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا۔ خاص طور پر اس دفعہ سے جس کی رو سے سید محمود کو جائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اس اختلاف میں انھوں نے علی گڑھ کے بعض زمینداروں کو بھی شامل کر لیا۔ مسودہ کثرت رائے سے پاس ہو گیا لیکن مولوی سمیع اللہ کی کارکردگی میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو بل کی مخالفت کرتا رہا۔ اس مخالفت سے سید احمد کو زندگی کے آخری ایام میں جانکاہ صدمہ پہنچا۔

۱۸۹۵ء میں سید احمد کو ایک ایسا دھچکا لگا کہ جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہ ہوا۔ مدرستہ العلوم کے ایک ہیڈ کلرک نے سید احمد اور ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے مختلف موقعوں پر بینک سے مبلغ ۱۰۵۵۷ روپے نکال لیے۔ وہ اس ناخوشگوار واقعہ سے بہت دل شکستہ ہو گئے۔ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔ "اس کا جس قدر مجھ کو رنج و صدمہ ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ چند روز تک تو میری حالت ایسی خراب تھی کہ مجھے کسی بیماری شدید سے لاحق ہونے کا اندیشہ رہا۔ تین روز تک مطلق کھانا کھایا نہیں گیا۔ اور طبیعت کی عجیب کیفیت تھی۔" اس زمانے میں انھوں نے لوگوں کو جو خطوط لکھے ہیں اس سے سید احمد کے صدمے کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسرا المیہ جس نے ان کے سکون کو غارت کر دیا وہ ان کے اکلوتے لڑکے سید محمود کی علالت تھی۔ سید محمود نہایت ذہین شخص تھے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔ اس کی وجہ سے سید احمد پر جو تلخ اور ناگوار کیفیت طاری ہوئی۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ انھیں اس زمانے میں ہر طرح کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مرنے سے دو ماہ قبل ان کو چپ لگ گئی تھی اور گھنٹوں خاموشی کے عالم میں بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن سید زین العابدین نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا۔ "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔"

لیکن صدمات و پریشانیوں کے اس عالم میں بھی قومی خدمت کی دھن کبھی ان کے دل سے فراموش نہ ہوتی تھی۔ اپنے انتقال سے صرف آٹھ روز قبل انھوں نے زبان کے جھگڑے کے بارے میں جو خاصا بڑھ گیا تھا اپنی رائے کا اظہار کیا اور اپنی رائے اس کمیٹی کو بھیجی جو الہ آباد میں اردو زبان کی حمایت کے لیے بنی تھی۔ اس زمانے میں ایک رسالہ شائع ہوا جس میں پیغمبر اسلامؐ اور ان کی ازواج مطہرات پر نہایت دریدہ دہنی کے اعتراضات تھے۔ یہ رسالہ ایک عیسائی مشنری نے شائع کیا تھا۔ سید احمد چند دنوں کے مہمان تھے لیکن اس

حالت میں بھی انھوں نے اس رسالہ کا جواب لکھوانا شروع کیا۔ یہ جواب ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو ان پر شدید حملہ ہوا۔ علی گڑھ کے سول سرجن اور میرٹھ کے مشہور ڈاکٹر موپارٹی نے ان کا معائنہ کیا۔ ان لوگوں نے سید احمد کو بچانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ لیکن ان کا قوی ہیکل جسم جو تقریباً نصف صدی تک ملک و قوم کی خدمت میں لگا رہا تھا اب اس بار گراں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ صحت یابی کی ساری امیدیں موہوم ثابت ہوئیں۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کا دن سید احمد کی زندگی کا آخری دن تھا جبکہ انھوں نے حاجی اسمٰعیل خاں کے مکان پر جہاں وہ مرنے سے دس روز قبل سید محمود کی کوٹھی سے منتقل ہو گئے تھے۔ آخری سانس لی۔ دوسرے دن ان کے جسد خاکی کو کالج کی مسجد میں دفن کر دیا گیا۔

تحریک علی گڑھ اور دیگر علاقے

تحریک علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیمی تحریکوں میں سب سے زیادہ کامیاب، موثر اور دوررس نتائج کی حامل تحریک ثابت ہوئی۔ اس تحریک نے مسلمانان برصغیر کو جدید علوم سے آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مجموعی طور پر علی گڑھ تحریک کا یہ مقصد تھا کہ مسلمان طلباء میں ذہنی شعور اور بیدار مغزی پیدا ہو تا کہ وہ ملکی کاموں پر زیادہ سے زیادہ دخیل ہو سکیں اور مختلف پیشوں اور سرکاری ملازمتوں میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ خود سرسید کے الفاظ میں ان کی تعلیمی حکمت عملی کا مقصد یہ تھا کہ

"ہمارے دائیں ہاتھ میں سائنس ہوگی، بائیں ہاتھ میں فلسفہ اور ہمارے سر پہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج ہوگا۔"

سرسید کے تمام اندازے اور پیش گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں۔ ان کی جاری کردہ تحریک علی گڑھ نے اپنے بنیادی مقصد اشاعت تعلیم کے علاوہ مذہبی دنیا میں جدید علم الکلام اور اصلاح رسوم اور ادبی دنیا میں جدید اردو ادبیات کا آغاز کر دیا تھا۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی جداگانہ قومی تشکیل میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ جس نے بعد میں تحریک پاکستان کا روپ دھار لیا۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء نے قومی اتحاد اور قومی ترقی کا سبق ملک کے گوشے گوشے میں پھیلایا۔ نتیجۃً مسلمان من حیث القوم متحد ہو گئے اور قومی تنظیم کی مستحکم بنیاد رکھی گئی۔ سید احتشام حسین رقم طراز ہیں۔

"علی گڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا، وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی کے چنگل سے نکلنا سکھایا تھا۔ اس کے اصلاحی مشن نے طرز کہن پر اڑنے اور تعلیم نو سے ڈرنے سے بچایا تھا۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ ہندوستان کے تاریخی اور سماجی ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

روشنی کے جس سفر کا آغاز علی گڑھ سے ہوا تھا۔ آخر کار اس کی کرنوں نے پورے برصغیر کو منور کر دیا گئیے اس کی ایک جھلک کا نظارہ کریں۔

۱۔ بنگال

انگریزوں نے سب سے پہلے بنگال پر قبضہ کیا تھا۔ ان کی حکومت کا بنگال کی مجلسی اور ثقافتی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ ملک میں سب سے پہلے اصلاحی تحریک (برہمو سماج) جو مغربی افکار و خیالات کی پیدا شدہ تھی۔ تا جرام موہن رائے کی قیادت میں بنگال ہی سے اٹھی۔ مسلم عہد اقتدار میں مسلمان تعلیم یافتہ بنگالیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کے اسی ہزار مدرسے قائم تھے اور تعلیمی اوقاف کی کثرت تھی لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۸ء میں یہ تمام اوقاف ضبط کر لیے اور مسلمانوں کی تعلیم کا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ ایک مخیر مسلمان تاجر حاجی محمد حسین نے ۱۸۰۶ء میں مسلمان طلباء کی تعلیم کے لیے محسن ٹرسٹ کے نام سے اپنی پوری جائیداد وقف کر دی تھی۔ جس کی آمدنی اس زمانے میں بھی ۵۴ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ ٹرسٹ کے بانی کی وفات ۱۸۱۲ء کے بعد کمپنی کے کارپردازوں نے مسلمانوں کو اس ٹرسٹ کے انتظام سے الگ کر کے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی آمدنی سے ہگلی میں کالج قائم کیا جہاں انگریزی زبان میں جدید علوم پڑھائے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو اس وقت جدید تعلیم سے رغبت نہ تھی۔ چنانچہ ہگلی کالج میں صرف تین مسلمان طالب علم زیر تعلیم تھے۔

بنگال کے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا شوق پیدا کرنے میں نواب عبداللطیف خاں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ۱۸۲۸ء میں ضلع فرید پور میں پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد پروفیسر اور پھر پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ بنگال کی لیجسلیٹو کونسل کے پہلے مسلمان ممبر تھے۔ انھوں نے سرسید کی مثال کی تقلید کرتے ہوئے بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی حالت کو سدھارنے کی ان تھک کوشش کی۔ انھوں نے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے نمونہ پر کلکتہ میں ۱۸۶۳ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون کے لیے دلچسپی پیدا کرنا مسلمانوں کے تعلیمی اور قانونی مسائل کی حکومت کو اطلاع دینا اور مغربی اقوام کی طرح مسلمانوں کو ترقی سے آشنا کرنا تھا۔ سوسائٹی کی کوششوں سے مغربی تعلیم کے بارے میں بنگالی مسلمانوں کی غلط فہمیاں بہت حد تک دور ہو گئیں اور انھوں نے اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے مزین کرنا شروع کیا۔ نواب عبداللطیف خاں کا ایک اور بڑا کارنامہ محسن ٹرسٹ کو ۱۸۷۳ء میں بحال کرانا تھا۔ اس کی آمدنی سے ڈھاکہ، چٹاگانگ اور راجشاہی میں سکول کھولے گئے اور بنگال کے تمام مسلمان طلباء کے دو تہائی تعلیمی اخراجات اس کے فنڈ سے پورے ہونے لگے۔ نواب عبداللطیف کی تحریک کا بنگال کے مسلمانوں پر گہرا اثر ہوا اور ان کے افکار و احساسات کا رخ متعین ہوا۔ نواب موصوف کی کوششوں سے بنگالی مسلمانوں میں اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ نیز انھوں نے مسلمان طلباء کے لیے مسلمان اساتذہ

کے تقرر کی کامیاب جدوجہد کی۔ کلکتہ مدرسہ جو غیر مسلموں کی تعلیم کے لیے وقف ہو کر رہ گیا تھا، محسن ٹرسٹ کی بحالی کے بعد دوبارہ مسلمانوں کا عظیم تعلیمی مرکز بن گیا۔

نواب عبداللطیف کے بعد جن شخصیتوں نے بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ ان میں نواب علی چودھری، سرشمس الہدیٰ، مولوی اے کے فضل الحق، عبدالرحیم، اور خواجہ ناظم الدین کے نام قابل ذکر ہیں نواب علی چودھری نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لی۔ وہ ایک مشہور ماہر تعلیم اور بنگالی زبان کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی نگرانی میں بنگال میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں قابل قدر کام ہوا۔ سرشمس الہدیٰ نے تعلیم، قانون اور صحافت میں بھرپور دلچسپی لی۔ کلکتہ میں مسلمان طلبہ کے قیام و طعام کے لیے ایک شاندار ہوسٹل تعمیر کرایا۔ کلکتہ میں مسلمانوں کے لیے ایک گورنمنٹ کالج کے قیام کے لیے حکومت سے نو لاکھ روپیہ کی رقم منظور کرائی۔ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دلانے کے لیے صوبائی سطح پر اسسٹنٹ ڈائریکٹر فار مسلم ایجوکیشن اور ضلعی سطح پر اسسٹنٹ انسپکٹر فار مسلم ایجوکیشن کے عہدے قائم کرائے۔ مولوی اے کے فضل الحق نے جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۳ء تک متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بڑا کام کیا۔ ان کی کوششوں سے کلکتہ میں گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج قائم ہوئے نیز مسلمانوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ ڈائریکٹوریٹ قائم ہوئی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کی دو منزلہ عمارت کے لیے رقوم فراہم ہوئیں۔ وہیں مسلمان طلباء کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مسلم ایجوکیشنل فنڈ قائم کیا گیا۔ اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران انھوں نے کلکتہ میں دو گرلز کالج ایک مسلم ہوسٹل اور باریسال میں ایک گورنمنٹ کالج قائم کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کو جو ہندوؤں کا گڑھ بن چکی تھی۔ اپنی نگرانی میں لے کر وہاں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا۔

سرعبدالرحیم جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۰ء تک الہ آباد ہائی کورٹ کے جج رہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے میں کوشاں رہے۔ وہ قانون اور تعلیم کے بہت بڑے ماہر تھے انھیں دوبارہ محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۶ء کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ انھوں نے اردو کی حمایت میں تحریک چلانے پر زور دیا۔

خواجہ ناظم الدین ۱۹۲۹ء میں بنگال کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور ۱۹۳۴ء تک اس عہدہ پر فائز رہے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں دیہاتی علاقوں میں پرائمری تعلیم کا بل صوبائی اسمبلی سے پاس کرایا جس کی نگرانی کے لیے ایک صوبائی بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۲۔ پنجاب

پنجاب مغل دور میں علم و ثقافت کا گہوارہ تھا اور اس نے بڑے بڑے یگانۂ روزگار عالم پیدا کیے ہیں۔ لیکن جہاں سکھوں نے اپنے دور میں مسلمانوں کے تہذیبی

اور ثقافتی آثار مٹانے میں سرگرمی دکھائی وہاں انگریزوں نے اپنے عہد میں غیر مسلموں کی پشت پناہی کر کے مسلمانوں کو جاہل اور پسماندہ رکھنے کی کوشش کی۔ سناتن دھرمی، آریہ سماجی، دیو سماجی اور برہمو سماجی ہندوؤں کے علاوہ سکھوں نے بھی پنجاب میں اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ ان کے علاوہ جگہ جگہ مشنری عیسائیوں کے ادارے تعلیم و تبلیغ کے دوہرا کام انجام دے رہے تھے ان حالات میں پنجاب کے مسلمان تعلیم سے کب تک غافل رہ سکتے تھے چنانچہ جب سرسید احمد خاں نے برصغیر کے مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے تحریک چلائی تو اہل پنجاب ہی نے ان کی سب سے زیادہ عملی اور اخلاقی حمایت کی۔ اسی بناء پر سید احمد خاں یہاں کے مسلمانوں کو زندہ دلان پنجاب کہا کرتے تھے۔

پنجاب میں خان بہادر برکت علی، سردار محمد حیات (سر سکندر حیات کے والد) اور ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین نے خصوصیت سے سرسید کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ ان حضرات نے پنجاب کے مسلمانوں کی حالت سدھارنے اور انھیں تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے خصوصی توجہ مبذول کی۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی کوششوں سے انجمن اسلامیہ پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن نے سب سے پہلے شاہی مسجد لاہور کو واگزار کرایا۔ جو سکھوں کے عہد میں اصطبل اور بارود کے گودام میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس عظیم الشان مسجد کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام اسی انجمن کی نگرانی میں رہا۔ ۱۸۸۸ء میں اس انجمن کے زیر اہتمام لاہور میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا انجمن اسلامیہ پنجاب نے سب سے پہلے امرتسر میں ایم اے او ہائی سکول قائم کیا جو بعد ازاں کالج بن گیا۔ اس تعلیمی ادارہ میں مغربی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی انتظام تھا اس انجمن پر دولت مند لوگ قابض تھے۔

تحریک علی گڑھ کے بعد مسلمانان برصغیر کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کی تحریک لاہور میں ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو انجمن حمایت اسلام کی شکل میں نمودار ہوئی۔

انجمن حمایت اسلام کو بہت جلد عوامی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ شروع میں چندہ کے طور پر ہر مسلمان گھرانے سے ایک مٹھی آٹا روزانہ کے حساب سے برتنوں میں فراہم کیا جاتا اور اسے بیچ کر اخراجات پورے کیے جاتے۔ اس کے ابتدائی ایام میں سالانہ آمدنی ۵۷۰ روپے اور خرچ صرف ۴۴ روپے تھا۔ اس انجمن نے متعدد اسکول کھولے اور ۱۸۹۲ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کی بنیاد رکھی۔ اس طرح مسلمان بچوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا۔ دینی اقدار کا تحفظ کرنا مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی ترقی کی کوشش کرنا اور اسلام کے خلاف عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں کے حملوں کا سدباب کر کے اسلام کی حقانیت کی اشاعت کرنا انجمن کے بڑے بڑے مقاصد تھے اس کے مرتب کردہ نصابی کتب میں اسلام کے مختلف پہلوؤں

پر معلومات فراہم کی گئیں۔ ملک کے متعدد اسکولوں میں یہ کتب پڑھائی جاتی تھیں۔ مسلمان یتیم بچوں کو عیسائی پادریوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے بچانے کے لیے انجمن نے دو یتیم خانے اور دارالاطفال اور بے سہارا مسلم خواتین کے لیے دارالامان قائم کیے۔ اس کے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں دو مردانہ ڈگری کالج، ایک زنانہ ڈگری کالج کوپر روڈ، ایک طبیہ کالج بایک لاء کالج، چھ ہائی سکول، لڑکوں کے لیے اور ایک سکول لڑکیوں کے لیے، تعلیم بالغاں کے دو مراکز، تین جونیئر ماڈل سکول شامل تھے۔ انجمن کی ملکیت میں اس وقت بھی ایک پریس، ہفت روزہ رسالہ، کتب خانہ، یتیم خانے اور دارالامان ہیں۔ اس انجمن نے دینی اور تعلیمی معاملات میں رہنمائی کرنے کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس کے سالانہ جلسوں میں سرسید، حالی، محسن الملک، سر عبدالقادر، سر محمد شفیع اور حکیم الامت علامہ اقبال جیسے سربرآوردہ افراد نے خطاب فرمایا اور مسلم عوام کے دلوں کو گرمایا۔ اس کے تعلیمی اداروں بالخصوص اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے طلباء نے تحریک پاکستان میں جوش و خروش سے حصہ لیا اور گھر گھر قائد اعظم کا پیغام پہنچایا۔

پنجاب میں محکمہ تعلیم کا قیام ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ ۱۸۶۰ء میں طبیہ کالج لاہور اور ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم ہوئے۔ ابتداء میں طالبعلموں کو وظیفے دیے جاتے تھے۔ علوم شرقیہ کی تجدید، علاقائی زبانوں کی ترقی اور ثقافتی، سیاسی اور سائنسی دلچسپی کے امور پر بحث کے لیے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے صدر گورنمنٹ کالج کے پہلے پرنسپل اور مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر تھے۔ اس انجمن نے کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانوں کے بارے میں اجارہ داری کے خلاف تحریک چلائی۔ چنانچہ اس کی کوششوں سے جنوری ۱۸۷۰ء میں پنجاب میں یونیورسٹی کالج قائم ہوا۔ جو ۱۸۸۲ء میں مکمل یونیورسٹی بن گیا۔ ڈاکٹر لیٹنر اس کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے پنجاب کے تمام تعلیمی اداروں کا اس سے الحاق عمل میں آیا۔ اس کے اپنے اہتمام میں لاء کالج، کامرس کالج اور اورنٹیل کالج قائم ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کو پاکستان کی قدیم ترین اور اہم ترین دانش گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

۳۔ **سندھ** لارڈ ایلن برا کے عہد میں سندھ کی آزادی کا خاتمہ کر کے اس کی انفرادی حیثیت مٹانے کی غرض سے اسے صوبہ بمبئی میں مدغم کر دیا گیا۔ صوبہ بمبئی کی ہندو اکثریت کسی طور پر بھی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی روادار نہ تھی لیکن علی گڑھ کا پیغام سرزمین سندھ تک پہنچ چکا تھا۔ خان بہادر حسن علی آفندی نے جو سید امیر علی کی قائم کردہ محمڈن ایسوسی ایشن کراچی برانچ کے صدر تھے اور سرسید کی تعلیمی کوششوں کے بہت مداح تھے۔ کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام قائم کیا جس کا آغاز بولٹن مارکیٹ کی ایک قدیم عمارت کے حصول سے ہوا لیکن بہت جلد اس میں توسیع عمل میں آئی اور مسجد، ہوسٹل اور کھیل کے میدان

تعمیر کیے گئے اس مدرسہ کی ترقی کے لیے خیرپور کے نواب نے بھاری رقوم عطا کیں۔ اس کے پہلے دو انگریز پرنسپل پرسی نائیڈز اور پروفیسر وارڈ جن کا انتخاب علی گڑھ کی وساطت سے ہوا تھا وہ اس ادارہ کی ترقی کے بہت حد تک ذمہ دار تھے۔ ۱۸۹۶ء میں حسن علی آفندی کی وفات پر ان کے صاحبزادے ولی محمد نے انتظامی اختیارات سنبھال لیے اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ اس کے دور سے اس مدرسہ کی سرکاری سرپرستی کا آغاز ہوا۔ سندھ کے ریونیو کمشنر اس کی انتظامیہ کے صدر اور کراچی کے کلکٹر جنرل سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں حسن علی عبدالرحمٰن نے سیکرٹری شپ کے اختیارات سنبھال کر اس مدرسہ پر سرکاری دباؤ ختم کر دیا۔ اس کے اساتذہ میں شمس العلماء عمر بن محمد داؤد پوتا جیسے افراد شامل تھے۔ جن افراد نے اس مدرسہ میں تعلیم پائی۔ ان میں بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ سر غلام ہدایت اللہ قابل ذکر ہیں۔ سندھ مدرسۃ الاسلام بعد میں سندھ کالج بن گیا۔ قائداعظم نے اپنی وصیت میں اپنی جائیداد کا بہت بڑا حصہ اس ادارہ کے نام چھوڑا۔

پنجاب کی طرح صوبہ سرحد بھی سکھوں اور انگریزوں کا رقم خوردہ تھا۔ جنھوں نے یہاں

۴۔ سرحد کے غیور عوام کو پسماندگی اور جہالت کا شکار رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ مسلمان سرسید کی تعلیمی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ لیکن مالی مشکلات اور سرکاری حکمت عملی ان کی راہ میں حائل تھی ادھر عیسائی مشنریوں کو سرکاری سرپرستی میں جگہ جگہ اپنے مراکز قائم کرنے کی کھلی چھٹی تھی اور وہ فرزندان توحید کو عیسائیت کی آغوش میں دینے کی کوشش میں سرگرم تھے۔ جدید تعلیم کو صوبہ سرحد میں پھیلانے کے عیسائی مشنری ہی ذمہ دار تھے۔ اور تعلیم کے لیے مخصوص کی جانے والی ساری گرانٹ انھیں دے دی جاتی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں کلارک نامی ایک پادری نے پشاور میں مشن ہائی سکول قائم کیا۔ بعد میں ایڈورڈ کالج قائم ہوا۔ ۱۸۸۸ء میں میونسپل ہائی سکول پشاور کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول بن گیا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کے پرنسپل علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی تھے۔ جو بہت بڑے فاضل اور مشہور عسکری تنظیم خاکسار تحریک کے بانی تھے۔ مسلمانوں میں دینی تعلیم اور جدید علوم کے ساتھ ساتھ تعلیم کی ترقی کی غرض سے بابو غلام حیدر اور میاں عبدالکریم جیسے دردمند افراد نے پشاور میں انجمن حمایت اسلام کی بنیاد رکھی۔ جس نے ۱۸۹۰ء میں پرائمری سکول قائم کیا۔ جو ۱۹۰۲ء میں اسلامیہ ہائی سکول بن گیا۔ اس کا ایک ہوسٹل بھی تعمیر کیا گیا جس کے ساتھ اسلامیہ کلب، کتب خانہ، دارالمطالعہ اور وسیع ہال بھی بنایا گیا۔

صوبہ سرحد میں جدید تعلیم کے فروغ کے سلسلہ میں سرحد کے سرسید صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی کوششیں سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں پشاور سے پانچ میل کے فاصلے پر دارالعلوم اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ ابتداً یہ ہائی سکول تھا۔ جسے ۱۹۱۴ء میں کالج کا درجہ دیا گیا۔ اس کی عمارت بڑی خوبصورت

اور شان دار تھی۔ یہ بانی کا خلوص تھا۔ جس نے سرحد جیسے پسماندہ علاقے کے عوام میں تعلیمی لگن پیدا کر دی اور ملک کے دور دراز حصوں سے طالبعلم کشاں کشاں چلے آئے اور اسلامیہ کالج پشاور تعلیم کا بہت بڑا مرکز بن گیا طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر منتظمین نے سرکاری سرپرستی کی درخواست کی لیکن سرکاری امداد کے باوجود اس کے انتظامی معاملات بہت حد تک صاحبزادہ عبدالقیوم کے ہاتھ میں تھے۔ جو اس کے لائف سیکرٹری تھے۔ ان کے حسن انتظام اور فہم و فراست کی بدولت اس ادارہ نے بہت ترقی کی۔ تعلیمی خدمات کی وجہ سے وہ ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اسلامیہ کالج پشاور نے پٹھانوں کی تعلیمی اور سیاسی بیداری میں نمایاں کردار انجام دیا ہے جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔

تحریک علی گڑھ کے اثرات

تعلیمی پہلو تحریک علی گڑھ کے سلسلے میں تعلیمی پہلو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے سرسید کو پتہ چل گیا تھا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کا باعث انگریزی تعلیم کا فقدان ہے۔ ہندو نے بلا تامل انگریزی کو اپنایا اور بہت جلد سرکاری ملازمتوں میں شامل ہو کر وہ تمام مراعات حاصل کر لیں جو مسلمانوں کے زمانے میں انہیں اکثر آسامیوں میں حاصل تھیں۔ تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے انھوں نے دو اہم کام یہ کیے کہ ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں فارسی کا ایک مدرسہ جاری کیا اور پھر پانچ سال بعد یعنی ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے مقام پر ایک انگریزی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ غازی پور والے انگریزی مدرسے کے قیام سے بیشتر ۱۸۶۳ء میں سرسید نے ایک جدید سائنٹفک سوسائٹی کا افتتاح کیا۔ اس سوسائٹی کا مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا اور مسلمان کو اس کے حصول کی ترغیب دینا تھا۔ اس سوسائٹی کو زیادہ باوقار بنانے کے لیے سرسید نے بڑے بڑے انگریزوں کو اس کی سرپرستی کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ وزیر ہند مسٹر ڈیوک آف آرگائل کو اس کا سرپرست اعلیٰ چنا گیا۔ جس نے اپنے ساتھ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اور ممالک شمال مغربی کو بھی بحثیت سرپرست ملا لیا۔ اس سوسائٹی نے ایک دو سال غازی پور میں کام کیا۔ لیکن جونہی سرسید علی گڑھ منتقل ہوئے۔ اسی وقت انھوں نے اس سوسائٹی کو بھی اپنے ہمراہ علی گڑھ لے جانا مناسب ترین جانا۔ چنانچہ علی گڑھ میں اس سوسائٹی کو چار چاند لگے، اس سوسائٹی کے تحت سرسید نے اپنی علمی سرگرمیوں کو نہایت عاقلانہ انداز میں جاری رکھا۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام مختلف اوقات پر سائنسی اور علمی سرگرمیوں پر مذاکرے کرائے گئے۔ انگریزی اور اردو میں کئی ایک کتابیں شائع کرائی گئیں۔ ایک اخبار بھی جاری کرایا۔ جس کو بیک وقت دو زبانوں میں شائع کیا۔ یعنی ایک ہی روز میں اور ایک ہی اخبار میں ایک کالم اردو میں اور ایک

انگریزی میں ہوتا تھا۔ جس سے انگریز اور مسلمان کی باہمی دوستی کی آئینہ داری کی گئی۔ اس اخبار میں شائع ہونے والے اکثر و بیشتر مضامین معاشرتی اصلاح اور سیاسی حالات کے جائزے پر مبنی ہوتے تھے ۱۸۶۷ء میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں علی گڑھ سے تبدیل ہو کر جب بنارس چلے گئے تو راجہ جے داس نے تمام کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا، راجہ جے داس کی شمولیت اس امر کی آئینہ دار تھی۔ کہ سرسید نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی تعصب سے کام نہیں لیا۔ سرسید کی علمی کوششوں کا چرچا تو تقریباً تمام ہندوستان میں ہو چکا تھا اور سرسید کی روز افزوں شہرت ہندوؤں کے لیے باعث تشویش تھی۔ ادھر سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس پہنچے، ادھر بنارس والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ شایداں کی ہندی خطرے میں پڑ گئی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر انھوں نے پہلے ہی سے ایک اسکیم تیار کر لی، جس کے تحت "اردو" کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک شروع ہو گئی، کیونکہ منافق ہندو دیکھ رہا تھا۔ کہ مسلمانوں کا تعلیمی انداز تھوڑے عرصے میں مسلمانوں کو اس قدر بیدار کر گیا تھا کہ وہ اب تعلیمی اعتبار سے تحفظ محسوس کرنے لگے ہیں اور کس حد تک مطمئن ہیں۔ ہندو کو مسلمان کی تسکین ایک آنکھ بھی نہیں بھا سکتی۔ چنانچہ بنارس کے چند ایک شر انگیز افراد کی وساطت سے اردو کے خلاف ایک تحریک چلا دی، جس نے اردو کے بارے میں بہت زہر اگلا۔ اس واقعہ سے پیشتر سرسید کا خیال تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی اشتراک کے ساتھ کسی خاص منزل تک بآسانی اور جلدی سے جا سکیں گے۔ لیکن ان کا یہ خیال بالکل مایوسی میں تبدیل ہو گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی زندگی صرف مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ وہ خود اردو میں سارا کاروبار کریں گے اور صرف مسلمان ہی کی تقویت کے لیے کوشاں رہیں گے۔ حالانکہ علی گڑھ کے قیام کے دوران سرسید نے ہندوؤں اور عیسائیوں کے اتحاد کے پیش نظر ایک انجمن "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے تشکیل دی، لیکن اردو ہندی چپقلش کے بعد سرسید کو صاف پتہ چل گیا۔ کہ ہندو مسلمان کو زیر کرنے میں ہی خوش ہے اور وہ مسلمان کی کسی ایسی جماعت کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا۔ جس کی وساطت سے مسلمان سماجی اور عملی ترقی کر سکیں۔

سرسید یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کے دورے پر نکلے اور تقریباً ڈیڑھ سال وہاں قیام کرنے کے بعد ہندوستان واپس لوٹے۔ اس سفر نے سرسید کے خیالات کو مزید نہ صرف جلا بخشی بلکہ ان کے عزائم میں مزید پختگی اور خواہشات میں اور ترقی پیدا ہو گئی۔ انگلستان کے سفر نے انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا کیونکہ انگلستان میں وہ زمانہ اس کے عروج کا زمانہ تھا اور لندن کا شہر دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور بارونق تھا اس کے علاوہ وہاں کون سی ایسی چیز تھی جو چاہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں پائی جاتی ہو، وہاں موجود نہ ہو، صرف جہالت اور فلاکت کا وہاں نام تک نہ دیکھا۔ اس چیز نے سرسید کو اور زیادہ چونکا دیا اکتوبر ۱۸۷۰ء

میں جب وہ انگلستان سے واپس وطن پہنچے تو ترقی کی راہیں تیزی سے طے کرنے کے لیے ایک خاص کمیٹی تشکیل دی۔ جس کا نام "خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند" رکھا۔ اسی کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ وہ معلوم کرے کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے بنیادی اسباب کیا ہیں اور ان کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ بقول ہدایت اللہ چوہدری مصنف "تاریخ پاکستان ہنر" اس کمیٹی کی درخواست پر اس سلسلے میں مختلف موضوعات پر مقالے لکھے گئے جن سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے گئے۔

۱۔ بیشتر مسلمان علماء انگریزی تعلیم کو اسلام کے منافی گردانتے ہیں۔
۲۔ مسلمان طلباء کی تعداد مدارس میں بہت کم ہے۔
۳۔ مسلمان نظام تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لیے بچوں کو گورنمنٹ سکولوں میں نہیں بھیجتے۔
۴۔ جدید مدارس میں عربی اور مذہبی تعلیم کا فقدان ہے۔ لامذہبیت کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔
۵۔ انگریزی مدارس میں مسلمانوں کا عدم احترام۔
۶۔ حکومت ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے مسلمان افلاس میں مبتلا ہیں اور متوازی تعلیمی ادارے کھولنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔
۷۔ مشنری سکولوں اور کالجوں کے عزائم خطرناک ہیں۔

چنانچہ کمیٹی نے ان وجوہات کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ :۔

۱۔ مسلمان قوم خود ہی اپنے تعلیمی اخراجات برداشت کرے۔
۲۔ مسلمانوں کو ترقی کرنے کے لیے لازم ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی ضرور تحصیل کریں۔
۳۔ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کھولا جائے۔

کمیٹی کا جائزہ اور فیصلہ جب دوسرے اکابرین ملین نے دیکھا، تو اسے پسند کیا۔ اور نقص کم نکالے۔ مانا یہ کہ درست ہے کہ جدید تعلیم کے حصول کے بغیر مسلمان نہ تو زندگی کی دوڑ میں ہمگام رہ سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی اعتبار سے اس کو کوئی وقعت حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک کالج قائم کیا جائے اس کا نام "محمڈن کالج" رکھا جائے اس کالج کے لیے جن مبلغات کی ضرورت پڑے وہ ایک فنڈ کے قیام سے پوری کی جائے۔ چنانچہ سرسید کی ہمت سے ہی محمڈن کالج فنڈ کمیٹی کا قیام ہوا۔ حکومت ہند کو جب اس کمیٹی کی تشکیل کی اطلاع ملی تو یہ خبر ان کے لیے خوشی کا باعث ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان کے "وائسرائے لارڈ" "نارتھ بروک" نے اسی وقت اس کالج کے قیام کے فنڈ میں اپنی جیب سے دس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے انگریز افسروں نے بھی وافر مالی امداد دینے

کا وعدہ کیا۔ جو بعد میں ایفا بھی کیا گیا۔

محمڈن کالج کے قیام کے لیے اگرچہ چندہ بڑی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ لیکن سرسید چاہتے تھے کہ ان کی تعلیمی سرگرمیاں جلد از جلد آغاز پذیر ہوں۔ چنانچہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو انھوں نے ایک ہائی سکول کا باقاعدہ افتتاح سر ولیم میور کے ہاتھ سے کرایا۔ اس کے بعد ملک کے گوشے گوشے سے محمڈن کالج کے لیے عطیات اور چندہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں اس کالج کا افتتاح ہوا۔ اس کالج کا قیام سرسید احمد خاں کی بے لوث حب الوطنی اور حب ملی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ چنانچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی تعلیم کی بنیاد ڈال گئے۔ جس کو حاصل کر کے مولانا محمد علی جوہر جیسی عظیم شخصیتیں وجود میں آئیں۔ اس کالج کو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کا نام دے کر نہ صرف وقار کے لحاظ سے بلکہ عظمت و احترام کے لحاظ سے ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں نامور بنا دیا۔

۱۸۸۶ء میں جبکہ انڈین نیشنل کانگریس کو تشکیل پذیر ہوئے ایک سال ہوا تھا۔ سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ یہ ایجوکیشنل کانفرنس علمی و ادبی اعتبار کے لحاظ کے علاوہ پروپیگنڈے کے لحاظ سے بہت زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوئی۔ اس کانفرنس نے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے اور بیٹھے ہوئے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا موقع دیا۔ جب کبھی اس کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے۔ ملک کے دور دراز حصوں سے بڑے بڑے ادیب اور مفکر حضرات اس میں حصہ لینے کے لیے آتے اور اپنا کلام سناتے۔ ان عظیم شخصیتوں میں شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد، نواب محسن الملک اور خواجہ الشقلین قابل ذکر ہیں۔

معاشرتی پہلو

ہر معاشرے کی ترقی اور قدر اس میں اپنے ہی لوگوں کی نفاست پر مبنی ہے۔ مسلمان اگرچہ تمدن کے لحاظ سے پاکیزہ ترین اور اخلاقی بلندیوں کی مالک قوم ہے۔ لیکن مفلسی اور بدحالی انسان سے بعض اوقات قیمتی سے قیمتی سرمایہ بھی چھین لیتی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ سرمائے کا زیاں کرنے والا شخص بد ذات خود ناقص ہے یا اس کو نسل و قومیت میں ملاوٹ پائی جاتی ہے بلکہ وہ وقتی طور پر حالات کے شکنجے میں جکڑے رہنے کی وجہ سے اس کیفیت سے دوچار ہے جو ایک بلند مرتبت شخص میں نہیں ہونی چاہیے۔ سرسید نے جب بنظر غائر دیکھا تو ملت اسلامیہ بالخصوص اسی بدحالی و مفلسی کا بری طرح شکار تھی۔ سرسید نے علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اجتماعات کا انعقاد شروع کر دیا۔ جس سے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلے پھر سے بندھ گئے اور انھوں کو یہ احساس ہو گیا کہ ابھی ان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت باقی ہے۔ یہ سکت اس وقت

قوت میں بدلی۔ جب مسلمانوں کو سرسید نے ہندوؤں سے علیحدہ معاشرتی وقار سے روشناس کرایا اور جدید ترین تقاضوں سے نمٹنے کے لیے انھیں سائنس کی دنیا سے آگاہ کیا۔ انگریز کی حمایت جیت کر اس کے پہلو میں بیٹھ کر کرپا کرنے والے ہندو کی اس سازش کو جلد ہی بے نقاب کر دیا گیا۔ جس کے تحت یہ بدطینت قوم منہ سے انکساری کی انتہا کرتی ہوئی قریب ترین پہنچ کر کاری وار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

مذہبی پہلو

سرسید احمد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں اس قدر آزاد خیال یا روشن خیال ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کی مذہبی ماہیت کو فراموش کر گئے تھے ان کے بارے میں یہ خیال اگرچہ غلط بھی نہیں ہے لیکن جہاں تک قیاس کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے عقائد پر مندرجہ ذیل باتوں نے بہت زیادہ اثر کیا۔ حالانکہ بنیادی طور پر اور خاندانی طور پر وہ ایک سچے مسلمان تھے اور اسلام کے پرستار اور مبلغ تھے۔ جہاں تک ان کے رفقاء بالخصوص الطاف حسین حالی، محسن الملک، نذیر احمد کا تعلق ہے۔ ان کے نظریاتی اختلاف کی بناء وہ کٹرپن تھا۔ جو قدیم الفکر اصحاب میں پایا ہی جاتا ہے۔ سرسید کا اصل مقصد قوم کو ڈھارس دینا تھا اور اس کے لیے انھیں ہر قسم کا لٹریچر پڑھایا پڑھنا پڑا۔ جب مغربی ادب پر سے ان کی نظر گزری تو ان کے عقائد ایمان بالغیب کی نسبت فطرت کی طرف زیادہ راغب ہوئے، جس کی وضاحت انھوں نے اپنے مختلف لیکچروں اور تقریروں میں کی۔ تاہم مذہب کے لحاظ سے وہ کسی مسلمان کو عقیدہ تبدیل کرنے کی تلقین نہ کرتے تھے ایک لمحہ کے لیے اگر سوچ لیا جائے کہ انھوں نے اسلام کو من وعن تسلیم کرنے سے گریز کیا اور اس میں مختلف بدعات کے بارے میں ایک زبردست یورش کی، تو اس سے اسلام تو خطرے میں نہیں پڑا تھا۔ وہ اگر معجزات کو نہیں مانتے تھے یا مافوق الفطرت باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ تو یہ کوئی بنیادی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ سطحی نوعیت کا ہے۔ سرسید نے اپنے مذہب کی ٹکر دوغیر مسلم قوتوں سے لی تھی اور وہ نہایت خیرسگالی کے جذبات سے سرشار ہو کر دوسری قوموں کے نمائندوں سے بات کرنا چاہتے تھے۔ غیر مسلم کو اپنی طرف وہ خوبیاں بیان کی گئیں جن کے بارے میں ماوٹی امثال بھی موجود تھیں۔

سرسید کا خیال تھا کہ مذہب کے نام پر کسی بھی چیز پر کورا ایمان لے آنا کوئی بڑی صفت نہیں، دل کی تسکین اشد ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے خیال کے مطابق مختلف قدیم روایتی رسوم سوائے زیاں اوقات اور کچھ بھی نہیں۔ ان کے خیال میں یہ نذریں، نیازیں، منتیں، پیر پرستی، عرس، قبر پرستی اور اسی قسم کے دوسرے اوہام سوائے خود فریبی کے اور کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے اور قوم کی تعمیر میں چنداں ممد ثابت نہیں ہو سکتے سرسید کے دور میں ہر ایسے قدم کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی جس سے کوئی تعمیری فائدہ ہو۔ نہ کہ صرف روحانی روحانیت کی قدر سید صاحب کے خیال میں تبھی ہے۔ جب سماجی قدر پیدا ہو گی فطرت کے قانون کو نہ ماننا

بھی ایک زبردستی ہے۔ اس لیے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اور فضولیات سے بچنے کے لیے از بس ضروری ہے کہ مذہب کے معاملات میں صرف اس حد تک الجھا جائے۔ جس سے ایمان کی تکفیر نہ ہونے پائے، فرائض مسلمہ کی ادائیگی اور فرائض منصبی کی شناسائی ہر اہل ایمان کی صفت ہے۔

سرسید نے انگریز کی حقیقت کو جاننے کے لیے تلقین کی کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے کیونکہ انگریز کے بھید تو اردو زبان میں نہیں آسکتے اور نہ ہی وہ عربی و فارسی زبان میں کسی بھی نوعیت کی سائنس کی ترویج کر سکتا ہے۔

اگر دنیا کا رجحان سود پسندی ہے تو اس کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ بلکہ ہر دم کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایمان کو اپنی سب سے قیمتی چیز جان کر محض دنیاوی باتوں میں آلودہ نہ کر دینا چاہیے۔ انگریزی تعلیم کے حصول اور مغربی سائنسی علوم سے شناسائی کی تلقین بعض مسلم اکابرین کے لیے کفر کا مصداق بنی۔ حالانکہ ان حضرات کی سوچ میں فرق تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے نہایت بے باکی سے اپنے ضمیر کی ترجمانی کر دی لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس ترجمانی سے اسلام کے کسی بنیادی اصول کو تو نقصان نہیں پہنچا۔ اگر ان کی ترجمانی بے ضرر ثابت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں آسودگی کا باعث بنتی ہے تو اس پر کافر کہہ دینا زیادتی ہے۔ تاہم سرسید کا ایمان ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل پر ہر مسلمان کا فرض اور اس میں ہر وہ بات آجاتی ہے۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں ملتا ہے۔ سرسید احمد خاں کی ضمیر کو قرآن پاک اور تعلیمات الٰہیات نے روشن کیا۔ یہ سب کلام پاک کی برکت تھی کہ ان کو معاشرے میں ایک ایسا مقام ملا۔ جو بڑے بڑے سیاسی لیڈر کو عمر صرف کر کے بھی نہیں ملتا۔ سرسید کے ایمان کی پختگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر کی سات جلدیں تحریر کی ہیں۔ بعض مسلمان بزرگوں کو اس تفسیر پر بھی بہت اعتراض ہے تاہم سرسید کا نظریہ مذہب بھی ایک طرح سے تعمیری نوعیت کا ہے۔

سرسید احمد خاں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا تھا اور ان سب میں اچھے اچھے نکات سے متاثر ہو کر ایک مخصوص رائے قائم کرلی تھی۔ جن مذہبی اصلاحات کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ قدیم ذہن کے مالک کے لیے لازماً دخل فی الدین کے مترادف ہے۔ لیکن یہ بات بھی تو مدنظر رکھنی ہوتی ہے۔ کہ سرسید کی ترجمانی کا مقصد آخر کیا تھا۔ اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام "موج کوثر" میں فرماتے ہیں کہ سرسید کی مذہبی تصنیفات کا مقصد مشنریوں کے مقابلے سے زیادہ ان اعتراضات کی تردید تھا۔ جو سر ولیم میور و مغربی مصنف اور خود مشنری اسلام پر کیا کرتے تھے، دوسرے لفظوں میں سرسید کا براہ راست ذہنی مقابلہ عیسائیوں اور ہندوؤں سے اس مقابلے میں سرسید یقیناً سرخرو ہوتے ہیں۔

ادبی پہلو تحریک علی گڑھ نے جدید اردو ادب کا آغاز کیا ہے۔ سرسید نے قدیم طرز تحریر کو ترک

کر کے ایک آسان طرزِ تحریر کو اپنایا۔ ترجمے کے کام کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ عمدہ انگریزی کتب کو اردو زبان میں ڈھالا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں جس سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، اس کا اہتمام ہفت روزہ اخبار کی اشاعت سے انتظام سے کیا گیا۔ یہ اخبار "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے ایک عرصہ دراز تک جاری رہا۔ یہ اس تحریک کا اثر تھا کہ مولانا الطاف حسین حالی جو ایک قدامت پسند مشہور شاعر کے عزیز تھے نے شاعری کی قدیم فرسودگیوں اور نقائص گن کر علیحدہ علیحدہ بتا دیے، جدید شاعری کے اصول مرتب کیے اور انھیں اس انداز سے مرتب کیا کہ شاعرانہ تنقید کی تاریخ میں ایسی تنقید کا مقابلہ نہیں۔

سیاسی پہلو

اس تحریک کا سب سے اہم پہلو سیاسی نوعیت کا ہے، سرسید کو انگریز سے نہ توجیت تھی اور نہ ہی وہ انگریزی کلچر کے دلدادہ تھے، وہ اگر فرنگی کی زبان اور ثقافت کی حمایت کرتے تھے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز کے تمدّن سے براہ راست واقف ہو کر اس کی کمزوریوں سے آگاہ ہو کر ہی ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جب تک انگریز اصلیت ہمارے سامنے حقیقی انداز میں نہیں آتی اس وقت تک اس رنگین صورت گھس کر بیٹھے والے کو ہند سے نکالنا آسان نہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے دشمن کو نکالنے کے لیے لازمی تھا کہ اس کے مضمرات کو تلاش کر لیا جائے۔ کیونکہ وہی مضمرات اس کی کمزوریوں کے مترادف ہوں گے۔ اس طرح سرسید انگریز کی حکومت کو ہندوستان سے ختم کرنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ ہمیں انگریز کی زبان و تہذیب سے مزین ہو کر ایک کاری حملہ کر دینا چاہیے تاکہ انگریز ہمیشہ کے لیے اس ملک کو ترک کر کے چلا جائے اور ایک غیر ملکی آہنی پنجے سے نجات حاصل ہو جائے یا اپنی عزت و احترام کا تحفظ مکمل طور پر حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے سرسید نے مسلمانوں کے ایک ایک گھر میں جا کر عظمت اسلامیہ کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔

انگریز تو ہمارا دشمن تھا ہی اس سلسلے میں ہندو نے بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اس نے مسلمانوں کو پس پشت ڈالنے کے لیے خود انگریزی کی تعلیم کو اپنایا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس نے حکومت کے سامنے سرِ تسلیم اس لیے خم کیا تاکہ بہت جلد اس خم کو بلندی سے بدل دے۔ ادھر مسلمان نے آٹھ، نو سو سالہ حکومت کے بعد اس قدر پستی محسوس کی کہ اس کے تصور سے ہی ان کے کلیجے پگھلتے تھے۔ چہ جائیکہ ذاتی طور پر ان پر کیفیات گزرے۔ ہندو نے خود کو انگریز سے بھی زیادہ خطرناک دشمن ثابت کیا۔ تحریک علی گڑھ میں اس احساس کو مؤثر انداز میں بھڑکایا گیا اور انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف تن دہی سے برزہ آزمائی شروع کی انھوں نے واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ اب اس امر کا یقین ہو گیا ہے کہ ہندو مسلمان سیاسی معاملات میں ایک دوسرے کے ہم رکاب نہیں ہو سکتے۔ سرسید کی نظر دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب ہندو حکومت سنبھالنے کے لیے کوشاں ہوگا۔ اس صورت میں مسلمان ہندو کے سامنے نہیں اد[illegible]

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چند ہی سالوں بعد مسلمانوں نے واضح طور پر ہندو کی مخالفت میں سیاسی محاذ قائم کر لیا۔ ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس جو بظاہر ہندوستان کی جماعت تھی اور حقیقت میں ہندوؤں کی سیاسی جماعت تھی۔ کے مقابلے میں ایک نئی سیاسی جماعت مسلم لیگ نے جنم لیا۔

سرسید احمد خاں ۱۸۷۶ء میں سرکاری ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد ملک کی سیاست میں ایک رہنما کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی مجلس قانون ساز کے ممبر بنے اور نو سال تک مسلسل اس ممبرشپ پر فائز رہے۔ اسمبلی کی رکنیت کے دوران انھوں نے بار بار اس امر پر زور دیا کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں میں مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی حاصل ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں انھوں نے پرزور انداز میں لبا اوقات تقاریر بھی کیں۔ ایک دفعہ تو انھوں نے اس موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے واضح الفاظ میں بیان کر دیا کہ "انتخابات کے ذریعے نمائندگی کے معنی یہ ہیں کہ آبادی کی کثرت کو اپنے مفادات کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ ایک ایسا ملک جس میں ذات پات کی تفریق نمایاں ہو، جہاں ابھی تک نسلیں ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو چکی ہوں، جہاں جدید تعلیم سے آبادی کے سارے طبقات مساوی طور پر بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ وہاں سادہ جمہوری طریق انتخاب بہت سی برائیوں اور فتنوں کا موجب ثابت ہوگا۔ جب تک ہندوستان میں امتیاز مذہب و نسل اور ذات پات کی غیر معاشی و سیاسی نظام میں ایک جزو کی حیثیت ختم نہیں ہو جاتی، جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اکثریت اقلیت کے معاشی اور معاشرتی اساس کو پامال کر دے گی۔ ان حالات میں جمہوری اقدام اختلافات کو اور ہوا دے گا اور اس کے لیے عوام حکومت کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ سرسید کی یہ تقریر ان کے سیاسی خیالات کی تمام تر ترجمانی کا موجب ہے اور اسی تقریر کی بناء پر تحریک علی گڑھ کو سیاسی نوعیت کی عظمت حاصل ہوئی۔

مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ کے بعد اس بات کا اندازہ نہایت آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو غدر کے بعد اگر کسی چیز نے کوئی ڈھارس دی تو وہ تحریک علی گڑھ تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ تحریک علی گڑھ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو فنا و مایوسی کی وادی کی طرف تیزی سے دوڑ رہے تھے، جو پسماندگی کے عمیق گڑھے میں گر چکے تھے جن کے حوصلے پست ہو چکے تھے، ایک بار پھر اس قابل کر دیا کہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اس تحریک کے دوران مسلمانان ہندوستان کو واضح طور پر پتہ چل گیا کہ ان کے خطۂ زمین میں ایک کی بجائے دو دشمن قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ جن کے ساتھ مقابلے کی گراں قدر صلاحیت مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک علی گڑھ مسلمانوں کے لیے تحریک احیاء سے کم تر نہیں تھی۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرسید احمد خاں کے مخالفین ان کی زندگی میں ان کے بارے میں اپنا ناپسندیدگی

کا اظہار اس لیے کرتے رہے کہ وہ انگریز کی حمایت میں بات کرتے تھے۔ وہ انگریز جنھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھین لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید احمد خاں جرأت سے کام لے کر اپنی قوم میں مغربی علوم کی ترویج نہ کرتے تو ملت اسلامیہ اس پسماندگی کے گڑھے سے کبھی بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ سرسید کا انگریز سے تعاون محض قومی بہبود کی بناء پر تھا انہیں کوئی ذاتی منفعت نہ تھی۔ ان کا کردار اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ انھوں نے زندگی بھر جو قدم اٹھایا، اس میں بے لوث قومی محبت کے زبردست جذبات پائے جاتے ہیں۔ جس طرح وہ تبلیغ احوال کے لیے جگہ جگہ پھرے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے خلاف نہایت مدلل انداز میں اس تعصب کو دور کیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی پھوٹ پڑ جانے کا اندیشہ تھا تاہم حالات نے بتا دیا کہ انگریزی تعلیم نے ہی پھر مسلمانوں کو جاہ و منصب حاصل کرنے کے قابل بنا دیا۔

چنانچہ سرسید احمد خاں کی ذات انیسویں صدی میں ہندوستان کی سرزمین پر ایک نعمت سے کم نہیں تھی اور تحریک علی گڑھ سیاسی و معاشی کامیابی کی دلیل ہونے کے کسی صورت بھی کم نہ تھی۔ تحریک کامیاب ہوئی اور سرسید احمد خاں جاوداں ہوئے۔

تحریک علی گڑھ اور شخصیات

سید احمد خاں کا اصل کارنامہ تحریک علی گڑھ کی بنیاد رکھنا ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مسلمانوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ دراصل ان کا پروگرام مسلمانوں کے لیے ایک کالج قائم کرنا تھا اس کے لیے انھوں نے انگلستان سے واپس آتے ہی "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی جس کی نگرانی میں کالج قائم کرنے کے لیے "محمڈن کالج فنڈ کمیٹی" تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی نے اپنی کوششوں سے کالج قائم کرنے کے لیے فنڈ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ سید احمد خاں جولائی ۱۸۷۶ء میں پنشن پا کر علی گڑھ آ گئے اور کچھ ماہ بعد ۸ جنوری ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج قائم کر دیا گیا۔

چنانچہ اس ارادے کی بنیاد پر اس کالج کو قائم کیا گیا۔ سید احمد نے نہایت عقل مندی اور دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے کالج کے لیے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا۔ مغربی علوم پڑھانے کے لیے یورپین پروفیسر مقرر کیے گئے اور علوم اسلامی و مشرقی کے لیے اس وقت کے قابل اساتذہ کو مقرر کیا گیا۔ کالج کی مالی حالت بہتر کرنے کے لیے سید احمد خاں نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا دورہ بھی کیا اور پنجاب کے مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ مسلمانوں کے کالج کے لیے روپیہ فراہم کیا۔

اس کالج میں صرف کتابی علوم ہی نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ زندگی گزارنے کا ایک مکمل نمونہ پیش کیا جاتا تھا۔ طلباء کو نماز روزے کی پابندی کے ساتھ ساتھ کھیل کود، بحث و مباحثہ، میل جول کے آداب اور اسی

قم کے روزمرہ زندگی کے کئی پہلوؤں سے روشناس کرایا جاتا تھا ان میں یگانگت اور یکجہتی پیدا کرنے کے لیے سید احمد خاں نے ایک قومی لباس بھی تجویز کیا جو کہ اس وقت ترکی کے مسلمان پہنتے تھے۔

اگرچہ اس وقت مسلمان بحیثیت قوم نہ تو متمدن تھے اور نہ ہی ان میں قوم کا درد اس قدر تھا کہ وہ اپنا سب کچھ قوم کے لیے وقف کر دیتے تاہم ایسے مشکل وقت میں سر سید احمد خاں کو ان کے چند ساتھیوں نے جس جذبے اور ہمت سے اپنا تعاون پیش کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے ان میں مولوی مہدی علی خاں جو محسن الملک کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی اور وقار الملک مولوی مشتاق حسین قابل ذکر ہیں۔

محسن الملک مولوی مہدی علی خاں

کالج کا کاروبار چلانے کے لیے سید احمد خاں نے ایک ٹرسٹی بورڈ قائم کیا تھا سید جب تک زندہ رہے خود ہی کالج کا نظام چلاتے رہے لیکن جب ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انھوں نے انتقال کیا تو کالج کا نظام خاصا درہم برہم تھا ایسے وقت میں جس شخص نے کالج میں ایک نئی روح پھونکی وہ ان کے دوست مہدی علی خاں تھے۔

سید مہدی علی ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دوسرے مسلمانوں کی طرح قدیم طرز کے اسلامی مدرسوں میں پائی اور اپنی نجی زندگی کا آغاز ایک کلرک کی حیثیت سے کیا۔ دیانت داری اور محنت سے کام کرتے تھے۔ خدا نے قابلیت بھی عطا کی تھی۔ اس لیے ۱۸۶۷ء میں ڈپٹی کلکٹر کے امتحان میں اول آئے اور ان کا تقرر یو پی میں ہو گیا۔ چار سال بعد ریاست حیدر آباد میں ملازمت اختیار کر لی اور وہاں ریونیو کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں انگلستان بھی گئے وہاں کی ظاہری نمود و نمائش سے متاثر نہیں ہوئے۔ تاہم سید احمد کی طرح وہاں کے نظام تعلیم کو انھوں نے پسند کیا۔ ان کی خدمات کے عوض ریاست حیدر آباد کی طرف سے انھیں نواب محسن الملک کا خطاب عطا کیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں ریاست کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آ گئے اور سید احمد خاں کے ساتھ مل کر قوم کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ سید احمد خاں کی انھوں نے ہر لحاظ سے معاونت کی۔ چونکہ طبیعت کے لحاظ سے نرم اور صلح جو تھے اس لیے وہ لوگ جو سید احمد خاں کو ان کی بے باک حق گوئی کے باعث اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مہدی علی خان کے ساتھ کام کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے۔

علی گڑھ کالج کے لیے خدمات

چنانچہ سید احمد خاں کی وفات کے بعد سید مہدی علی خان کو ٹرسٹی بورڈ نے کالج کا سیکرٹری مقرر کیا مہدی علی خاں کی کوششوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کالج کی سالانہ آمدنی جو ۱۸۹۸ء میں

۶۱ ہزار روپیہ تھی۔ نو سال میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ تک جا پہنچی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کے لیے بھی کوششیں شروع کیں اور جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ سید احمد خاں کی مخالفت میں کئی مسلمان علماء پیش پیش تھے اور اسی وجہ سے ان میں سے بعض مسلمانوں کو علی گڑھ کالج سے بدظن کرتے رہتے تھے۔ سید مہدی علی نے اس سلسلے میں قوم کی جو سب سے بڑی خدمت کی وہ ان علماء کو اپنی طرف لانا تھا اور آہستہ آہستہ علماء نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنسوں میں بھی شریک ہونا شروع کر دیا اور کالج کی مخالفت چھوڑ دی۔

سید احمد خاں کی طرح سید مہدی علی نے بھی مسلمانوں کی توجہ علوم کی طرف مبذول کرائی۔ ان کو سمجھایا کہ مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کا راز ان کی علمی فضیلت میں تھا۔ اس وقت مسلمان علوم و فنون میں تمام دنیا سے آگے تھے اور اسی وجہ سے ممتاز تھے۔ ان کی دنیا عزت کرتی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ اگر وہ دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں جہالت اور فرسودہ خیالات کو ترک کرنا چاہیے۔ نئے نئے علوم و فنون سیکھنے چاہئیں اور اسلام کی روح کو سمجھنا چاہیے جو انسان کو جہالت، توہم پرستی اور تقدیر پرستی کی بجائے انسانی عظمت اور بلندی فکر کی طرف لے جاتی ہے۔

(ii) اردو زبان کی حمایت

جس طرح سید احمد خاں کے زمانے میں اردو زبان کی مخالفت ہوئی تھی اسی طرح مہدی علی کے وقت بھی اس کی مخالفت کی گئی بلکہ اب حالات پہلے سے بھی بدتر تھے۔ ہوا یوں کہ ان دونوں صوبوں کا گورنر وہی متعصب اور ہندو نواز انگریز تھا جو پہلے صوبہ بہار میں اردو زبان کی بجائے ہندی کو رائج کر چکا تھا۔ اس کا نام سر انتھونی میکڈانل تھا۔ اس نے نہ صرف اردو زبان کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی تھی بلکہ جو سرکردہ شخص اردو کے حق میں بولتا تھا، اس کی زبان بندی کرتا تھا چنانچہ مہدی علی خان کو اس کی حرکتوں سے بہت نقصان پہنچا۔

(iii) مسلمانوں کو علیحدہ حلقہ انتخاب دلانا

سید مہدی علی کا وہ کارنامہ جس کی وجہ سے مسلم سیاست کو ایک نیا رخ ملا۔ وہ ان کے لیے علیحدہ انتخابی حلقوں کا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ سید احمد خاں نے کہا تھا کہ اگر مغربی طرز کی جمہوریت رائج کی گئی تو ہندو ہمیشہ مسلمانوں پر غالب رہیں گے کیونکہ ان کی تعداد چار گنا سے زیادہ ہے جب ۱۹۰۶ء میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان میں اصلاحات نافذ کرنا چاہتی ہے۔ جن کی رو سے انتخابات ہوا کریں گے تو مہدی علی خاں نے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو کے پاس ایک وفد بھیجنے کا اہتمام کیا۔ اس کے لیے انھوں نے مسلمانوں میں سے ۳۵ سربرآوردہ اراکین کو چنا اور سر آغا خان کی قیادت میں ان کو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ بھیجا اور آخر ان کی کوششوں سے مسلمانوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دیے گئے۔

(۱۷) مسلم لیگ کے قیام میں مدد سید احمد خاں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی سیاسی جماعت کانگریس میں شمولیت سے روکا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے سیاسی مسائل کو حل کرانے کے لیے کوئی نمائندہ جماعت نہیں تھی۔ سید مہدی علی نے اس مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور آخر کار ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کے رہنماؤں کا اجلاس ڈھاکہ میں بلایا گیا اور "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کی گئی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ تھا۔ سید مہدی علی اور مشتاق حسین اس جماعت کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

مسلمانوں کی خدمت میں سرشار یہ عظیم انسان ابھی بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مہلت نہ دی اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

مولانا الطاف حسین حالی

سید احمد کے رفقاء میں سے جس شخص نے قوم کی روحانی، اخلاقی اور ادبی اصلاح میں سب سے زیادہ حصہ لیا، وہ الطاف حسین حالی ہیں۔ حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی میں حاصل کی اور ۱۸۵۲ء میں مزید مذہبی تعلیم کے لیے دہلی چلے گئے۔ یہیں ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی۔ جس کی ذہنی اور ادبی صلاحیتوں سے حالی بے حد متاثر ہوئے۔ ۱۸۷۱ء میں حالی نے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کر لی۔ جس میں ان کے ذمہ انگریزی سے اردو ترجمے کی تصیح کرنا تھا۔ انگریزی ادب سے حالی بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو شاعری بھی انگریزی شاعری کی طرح حقیقت پسندانہ ہونی چاہیے۔ ۱۸۷۵ء میں ان کا تبادلہ دہلی میں ہو گیا اور یہیں یہ سید احمد خاں کے حلقہ اثر میں چلے گئے۔

مالی مشکلات نے گھیرا تو نظام حیدرآباد نے وظیفہ مقرر کر دیا اور حالی دل و جان سے قوم کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ حالی نے یوں تو اردو شاعری اور مسلمان قوم کی ہر لحاظ سے خدمت کی لیکن ان کے کارناموں میں سرفہرست ان کی طویل نظم "مدو جزر اسلام" ہے جو مسدس حالی کے نام سے مشہور رہے۔

مسدس حالی حالی نے یہ نظم ۱۸۷۹ء میں سرسید احمد خاں کے ایما پر لکھی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں۔

"بیس سال تک میں صحرا میں گھومتا رہا کہ سایہ مل جائے اور تیل کے کولہو کے بیل کی طرح اسی جگہ چکر کاٹتا رہا۔ میں بہت زیادہ مایوس اور تھک گیا تھا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ساتھیوں کے طعنوں اور اپنے مقصد کے حصول میں حائل مشکلات کے باوجود اس بات کا عزم کیے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں

اپنی صلاحیتوں کو قوم کے مصرف میں لاؤں اور اس قوم کو جو اپنا سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔ وہ وقت یاد دلاؤں جب اس کے پاس سب کچھ تھا اور اس کو اس خواب غفلت سے جگاؤں جس نے اس کو جہالت اور تاریکی کے گڑھوں میں دھکیل دیا ہے۔"

مسدس حالی کا آغاز ظہور اسلام سے پہلے عرب کی حالت زار سے ہوتا ہے اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ جس طرح پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربوں کو عزت نفس، خدا کے احکام کی پابندی، انسانی بھلائی اور ایک دوسرے سے ہمدردی اور یگانگت کا سبق دیا اور اس عرب قوم کو جو جہالت کے گڑھے میں گری ہوئی تھی آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا اس کے بعد حالی مسلمانوں کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے دنیا کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچایا اور اسلامی علوم و فنون کو رائج کیا۔ اس کے بعد وہ برصغیر کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ مسلمان قوم کے لیے باعث ذلت بن گئے ہیں ان کی روحانی دولت جو انھوں نے محنت اور صبر سے حاصل کی تھی۔ تقلید پرستی کی نذر ہو گئی حالی نے بتایا کہ ان کے علماء و صوفیا اپنے بزرگوں کے نام پر دھبہ ہیں جو مذہبی اور روحانی سرمایہ سے تہی دامن ہیں۔ ان کے پاس نہ علم ہے نہ عقل ہے اور نہ ہی دنیاوی دولت ہے۔

مسلمانوں کی بیداری میں مسدس حالی کا حصہ

مسدس بہت آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی تھی اس لیے اس کا اثر ہمہ گیر تھا۔ مسلمان خواہ عملی اور ذہنی طور پر اسلام سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہو جائیں ان کے دلوں میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی جو محبت ہے اس میں کمی نہیں آتی۔ مسدس نے مسلمانوں کے دل میں اسلام کی محبت کو اجاگر کیا۔ ذہین طبقے کو سوچ بچار کی طرف مائل کیا قوم نے جب اپنے حال کا اپنے ماضی سے مقابلہ کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے مقام سے کتنا دور جا چکی ہے۔ اس نظم کے بند اسکولوں، بازاروں، محفلوں غرض کہ ہر جگہ پڑھے جاتے تھے۔ بعض لوگوں نے ڈراموں کے ذریعے مسلمانوں کی کشتی کو ڈوبتے دکھایا اور حالی کا اشعار گا کر اس منظر کو زیادہ مؤثر بنایا سید احمد اس نظم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے کہا:۔

" بے شک میں اس محرک کا ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا میں کہوں گا کہ میں حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔"

مسدس حالی نے مسلمانوں کی بیداری میں جتنا اہم کردار ادا کیا تھا شاید ہی کسی نظم نے کسی قوم کی بیداری میں ادا کیا ہو۔ جو لوگ تعلیم یافتہ تھے وہ اسے خود پڑھتے تھے جو پڑھنا نہیں جانتے تھے وہ دوسروں سے سنتے تھے اور دیہات میں اس نظم کے بند گویئے اور شہروں میں تھیٹروں والے گایا کرتے تھے۔ لہٰذا اپنے اثر کے اعتبار سے ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو مسدس حالی کی رسائی سے باہر ہو اور یہ وہ کام تھا جسے کسی طرح بھی معجزہ سے کم

نہیں کہا جا سکتا۔

حالی نے مسدس کے علاوہ نثر و نظم کی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں انھوں نے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کا بے حد مؤثر انداز میں اظہار کیا۔ ان میں حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو شاعروں کو پرانی شاعری کے نقائص بتائے۔ اور ان کو جدید شاعری کے اصول و ضوابط سمجھائے۔ یہ انتھک مجاہد تمام زندگی قوم کی اصلاح اور فلاح و بہبود میں مصروف رہا اور آخر کار ۱۹۱۴ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

وقار الملک مولوی مشتاق حسین

علی گڑھ تحریک کے تیسرے بڑے ستون مولوی مشتاق حسین تھے اگرچہ بعض باتوں میں ان میں اور سید احمد خاں میں خاصے اختلافات موجود تھے مگر چونکہ دونوں قوم کی بھلائی اور بہتری کے لیے کام کرتے تھے اس لیے یہ اختلافات کبھی بھی ذاتی رنجش یا ناراضگی کا سبب نہیں بنے اور مولوی مشتاق حسین نے خلوص دل سے علی گڑھ تحریک کو چلایا۔

مشتاق حسین ۱۸۴۱ء میں ضلع مرادآباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے دس روپے ماہوار پر اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ سید احمد خاں جب علی گڑھ میں سب جج تھے تو مشتاق حسین ان کے ریڈر بن گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے لیے بھی تراجم کیے۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۹۲ء تک ریاست حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ واپس آ گئے اور کالج کی سرگرمیوں میں دل و جان سے حصہ لیا۔ اردو زبان کی حمایت میں بھی پیش پیش رہے۔

(ا) علی گڑھ کالج کے سیکرٹری کی حیثیت سے

مولوی مشتاق حسین سید مہدی علی کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک اس عہدہ پر قائم رہے۔ مشتاق حسین کی تقرری سے وہ معتدل فضا جو سید مہدی علی کی ذات کی وجہ سے قائم تھی کسی حد تک متاثر ہوئی۔ اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے دل کے صاف، زبان کے کھرے اور ارادے کے مضبوط تھے۔ سید احمد خاں اور سید مہدی علی کے زمانے میں حالات کے تقاضے کے مطابق دونوں بزرگ انگریزوں اور مسلمانوں میں میل جول بڑھانا چاہتے تھے۔ تاکہ انگریزوں کو مسلمانوں سے جو [illegible]ت تھی اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا اس میں کمی آ جائے لیکن جب مشتاق حسین [illegible]ری ہوئی تو حالات کا رخ تبدیل ہو چکا تھا اور انگریز کھل کر مسلمانوں کی مخالفت کرتے تھے۔

(ب) مسلم سیاست میں نئے دور کا آغاز

جب ۱۹۱۱ء میں انگریزی حکومت نے ہندوؤں کا

کی روز افزوں شورش سے تنگ آ کر تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا تو مشتاق حسین نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے کہا:۔

"یہ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدے میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے لاحاصل مشورہ ہے اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیے وہ ہماری قوت بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے"

اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو سید احمد خاں کی بات یاد دلائی کہ وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں یہ اس لیے کہ مسلمان دشمنی میں ہندو اور انگریز دونوں میں اتحاد مقاصد موجود ہے۔ مشتاق حسین کا یہ مشورہ آگے چل کر مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا اور مسلمانوں نے بالآخر صحیح قیادت اور مسلسل جدوجہد کی بنا پر اپنے لیے ایک نیا وطن حاصل کر لیا مسلمانوں کا یہ پروقار رہنما ۱۹۱۷ء میں پا گیا۔

باب ۶

دو قومی نظریہ

پاکستان کا قیام چند دنوں یا برسوں کی تحریک کا رہین منت نہیں ہے بلکہ جہد آزادی کا یہ پرخار سفر صدیوں پر محیط ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اس مملکت کا وجود دو قومی نظریہ کی محکم بنیادوں پر استوار ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مخالفین نے مسئلہ قومیت کو خوب وجہ نزاع بنائے رکھا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ حصول پاکستان کی جنگ میں سب سے بڑا محاذ مسئلہ قومیت تھا۔ بالفاظ دیگر برصغیر میں پاکستان کا ظہور دو قومی نظریہ کی فتح و نصرت ہے۔

دو قومی نظریہ کی بنیاد اسی روز رکھ دی گئی تھی جب دربار خداوندی میں شیطان نے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کرتے ہوئے نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے کی قسم بھی کھائی اس واقعہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

"اور ہم نے حکم دیا کہ تم سب اس (جنت) سے نیچے اتر جاؤ پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو تم میں سے جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ غم۔ اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے سو وہی جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔"

(سورۃ البقرہ آیات ۳۹ - ۴۰)

اس طرح قرآن پاک نے بھی بنی نوع انسان کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے، ایک جماعت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرتی ہے اور کاروبار حیات چلانے میں اس کی رشد و ہدایت کی تابع ہے جب کہ دوسری جماعت وہ ہے جو مخلوق کی فرمانروا ہے اور خالق کی نافرمان ہے۔ اول الذکر جماعت کو امت مسلمہ، امت وسطیٰ جیسے ناموں سے پکارا گیا ہے اور ثانی الذکر جماعت کو اصحاب الشیطین، کفر جیسے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہی اسلام کا تصور ملت ہے اور یہی دو قومی نظریہ بھی۔ مسلم قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے اسلام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اشتراک دین کے سوا کوئی

بھی معیار قومیت اسلام کے خلاف ہے اس لیے کرہ ارض پر آباد ہر وہ فرد جو اس عقیدہ یعنی اسلام پر ایمان لے آیا بلا امتیاز رنگ نسل، زبان، وطن اور سیاسی و اقتصادی اغراض مسلم قومیت کا حصہ بن گیا۔

برصغیر میں دو قومی نظریہ کا ارتقاء

برصغیر پاک و ہند میں دو قومی نظریہ (جو نظریہ پاکستان کی اساس ہے) اسی روز وجود پذیر ہوگیا تھا، جب ہندوستان کا پہلا غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ اس طرح ایک مسلمان فرد نے برصغیر میں ایک نئے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور تمدنی شعور کو پروان چڑھایا، جس کے بعد ایک کے بجائے دو مختلف تمدنی دھارے بہنے لگے۔ مسلمانان ہند نے اقلیت میں ہونے کے باوجود نہ صرف اپنے جداگانہ قومی تشخص کو ہمیشہ برقرار رکھا بلکہ اسلام کے ازلی و ابدی زریں اصولوں کے باعث ہندو اکثریت کے دلوں پر حکمرانی بھی کرتے رہے۔ اس دوران ہندو اپنی ہزاروں سالہ پرانی تاریخ اور بھگتی تحریک جیسے عوامل کے ذریعے مسلمانوں کے وجود اور روایات کو متحدہ قومیت (ہندوازم) میں تحلیل کرنے کے درپے رہے۔ تاہم مردان حق نے آڑے وقت میں ہمیشہ مسلمانوں کی مسیحائی کی۔ کبھی حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ مسلم اقلیت کے تحفظ کے لیے ڈھال بنے تو کبھی سلطان ٹیپو، نواب سراج دولہ، تیتو میر شہید، سید احمد شہید وغیرہ نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر جداگانہ مسلم قومیت کے تصور کو اور نکھارا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمان ناکام کیا ہوئے۔ ہندوؤں نے انگریزوں کے تعاون سے مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ محکومی کا بدلہ لینے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب یہ واضح ہونے لگا کہ انگریز بالآخر ہندوستان کو آزاد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے تو ہندوؤں نے جدید جمہوریت کی آڑ میں عددی اکثریت کے بل بوتے پر انتقال اقتدار کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس ناپاک سازش کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے تھے۔

اول:۔ مسلمان ہندوؤں کی عددی اکثریت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے محکومانہ زندگی قبول کر لیتے۔

دوئم:۔ وہ ایسے وطن (دارالکفر) کو ترک کر کسی ایسی جگہ (دارالسلام) جا بسیں جہاں ان کی جانوں سے زیادہ ان کے ایمان محفوظ ہوں کیونکہ اسلام کے پیروکاروں کا کسی غلام ملک میں رہتے رہنا اسلام کی روح کے منافی تھا۔

لیسے ہیں مرد دانا سرسید احمد خاں نے واشگاف الفاظ میں ہندوؤں اور انگریزوں پر یہ واضح کر دیا کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں نہیں بلکہ ایک جداگانہ قوم ہیں، جن کا ایک ساتھ رہنا محال ہے۔ چنانچہ مستقبل میں تحریک پاکستان کی قیادت نے یہ بات ثابت کر دی کہ مسلمانوں کی سیاست، معاشرت، معیشت، تہذیب، طریق عبادات غرض کہ انفرادی و اجتماعی طور پر زندگی کا پورا رویہ ہی اپنے دوسرے ہم وطنوں سے مختلف ہے۔ لہٰذا ان کا اسلوب زندگی ان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنا الگ ملک تشکیل دیں، جہاں وہ اسلامی نظریہ حیات کے تحت اپنا نظام زندگی نافذ کر سکیں اس سلسلے میں قائداعظم نے فرمایا :-

" پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے ہم نے صرف اپنی حکومت ہی حاصل نہیں کرنی ہمیں اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں "

(تقاریر، جلد ۲، صفحہ ۳۶۳)

قائداعظم کے اس فرمان کی روشنی میں نظریہ پاکستان کا عام مفہوم یہ ہے کہ

" پاکستان کو ایک ایسے ملک کے طور پر وجود میں لایا جا رہا ہے جہاں حاکمیت اور فرمانروائی صرف اللہ تعالیٰ کو ہوگی اور نظام حکومت، نظام سیاست، نظام معیشت، نظام معاشرت غرض کہ ہر شعبہ زندگی کا نظام چلانے کے لیے قرآن حکیم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل ہی کی طرف دیکھا جائے گا "

ڈاکٹر سید عبداللہ، نظریہ پاکستان کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ :

" نظریہ پاکستان عبارت ہے،

اول : اس عقیدے سے کہ پاکستان دو قومی نظریہ کا نتیجہ ہے یعنی یہ کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔

دوئم : یہ کہ مسلمانوں کی قومیت فقط اسلام ہے، یعنی نسل رنگ اور زبان عقیدہ اسلام ہے لہٰذا پاکستان کی قومیت اسلام ہے۔

سوئم : مسلمان چونکہ ایک منفرد قوم ہے اس لیے ان کی معاشرت، تہذیب اور اخلاقیات بھی منفرد ہے اور پاکستان میں اس کی وسیع تر نمائندہ ترجمان زبان اردو ہے۔

چہارم: اس قوم کو ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ نے ایک تاریخی شعور دیا ہے چنانچہ اس کے جملہ احوال کی تعبیر اس تاریخی شعور کے حوالے سے ہونی چاہیے اور اس کی ایک منطقی اور عملی تعبیر ظہور پاکستان ہے۔"

دو قومی نظریہ اور سرسید احمد خان

ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود بحیثیت فاتح کی حیثیت سے ہوا اور وہ ایک ہزار سال تک اس ملک میں چھائے رہے۔ ان کی حکمرانی کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ انھوں نے اپنی قومی انفرادیت کو ہمیشہ قائم و دائم رکھا۔ پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ انگریزوں نے پورے ہندوستان پر اپنا تسلط جما لیا اور مسلمان اپنے ہی مفتوحہ ملک میں محکومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں کو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت سے کھلی عداوت تھی۔ وہ وطن کو قومیت کی اساس سمجھتے تھے اور اپنے ہی وطن کی جمہوریت کو ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہندوؤں نے بھی اس طرز جمہوریت کی بھرپور حمایت کی کیونکہ اس کے نتیجہ میں مسلمان ایک ایسی اقلیت بن جاتے تھے جس کے مستقبل کا فیصلہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہوتا اور یہ دائمی غلامی کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس سازش کا مقصد مسلمانوں کو ہندو معاشرے میں جذب کرنا تھا۔

سرسید احمد خاں کی دور اندیشی نے ان خطرات کو بھانپ لیا تھا چنانچہ آپ نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور انفرادیت پر فکر انگیز مقالات تحریر کیے اور مسلم قومیت کے خصائص اور خدوخال کو مؤثر انداز میں پیش کیا۔ آپ بلا لحاظ قوم و مذہب سارے ہندوستان کی ترقی و خوشحالی کے متمنی تھے مگر ایسی خوشحالی کے روادار نہ تھے جس کے حصول کی خاطر مسلمان خود کو اکثریت میں ضم کر دیں۔ ان کے خیال میں مصنوعی قومیت کا جزو بننے سے مسلمانوں کے حصے میں تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہ آئے گا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوؤں کی عیاری و مکاری کا پول کھولتے ہوئے بدرالدین طیب کو لکھتے ہیں:

> "غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کے خاتمہ کے لیے منظم کوششیں شروع ہوئیں اور یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ ہندوستان صرف "ایک قومی نظریے" کا مرہون منت ہے جبکہ ہندو مسلمان

سکھ، عیسائی اس کی شاخیں ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ہندو اپنی فطرت اور جبلت کی تکمیل کیے جا رہا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں یو۔پی کے ہندوؤں نے عدالتوں، سرکاری دفاتر اور مدارس میں اردو کی بجائے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط رائج کرنے کے حق میں شدید تحریک چلائی جس کا مقصد ہندوستان سے مسلم تہذیب کا نام ونشان مٹانا تھا۔ اس عظیم سانحہ پر سرسید احمد خان نے اپنے ذہنی اور روحانی صدمہ کا یوں تذکرہ کیا:

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں دل سے کسی کام میں شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا دیکھ لے گا۔"

ہندوؤں کی روایتی مکاری نے ان کے "دو قومی نظریہ" کے خیالات کو اس حد تک راسخ بنا دیا تھا کہ جب آل انڈیا کانگریس قائم کی گئی تو آپ نے مسلمانوں کو اس میں شمولیت کی ممانعت کر دی اور اس کی دعوت کے جواب میں کانگریس کے صدر مسٹر بدرالدین طیب جی کو تحریر کیا:

"میں نیشنل کانگریس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں، فرقے اور مذاہب کے افراد رہتے ہیں، بستے ہیں۔ ایک قوم کے افراد ہیں یا یہ کہ ایک قوم بن سکتے ہیں؟ اور ان کے اغراض و مقاصد دینی و ملی بھی یکساں اور ایک ہو سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز بالکل ناممکنات میں سے ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگریس بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور نہ ساری قوموں کے لیے یکساں طور پر سود مند ہو سکتی ہے۔"

سرسید احمد خاں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ہندو اکثریت کی اس جماعت سے مسلمانوں کو مساویانہ حقوق ملنا محال ہے چنانچہ آپ نے "مسلم قومیت" کو تسلیم کروانے کے لیے جُداگانہ انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ ۱۶ جنوری ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا:

"وائسرائے کی کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد متعین ہونی چاہیے۔ ہندو ممبروں کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان ممبروں کو مسلمان۔"

سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں "دو قومی نظریہ" کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کر دیا تھا جو وہ چاہتے تھے۔ بالآخر مسلمانان ہند نے وہی کر دکھایا ان کے انتقال کے ۴۲ برس بعد لاہور میں "قرارداد پاکستان" پیش کر کے مسلمانوں نے سرسید احمد خاں کی فکر و سوچ کی تکمیل کر دی۔ جس؟

نتیجہ میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔

دو قومی نظریہ فکر اقبال کی روشنی میں

اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور آزادی کی تحریک کے تعلق سے جن عظیم شخصیتوں کا نام لیا جاتا ہے، ان میں علامہ اقبال کی شخصیت سرفہرست ہے۔ وہ کئی اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ اقبال صرف ایک فلسفی شاعر، ادیب اور سیاست دان ہی نہیں تھے بلکہ انقلابی تحریک کے داعی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی انقلابی نظموں اور اشعار سے ایک طرف مسلمانوں میں اسلام کا شعور پیدا کیا تو دوسری طرف ان کے دلوں میں آزادی اور حرّیت کا جذبہ بیدار کیا۔ اقبال نے محض شاعرانہ تخیلات کی فضا ہی میں پرواز نہیں کی اور اپنی انقلابی نظموں سے مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد پر ہی نہیں اکسایا بلکہ انھیں اس کا عملی راستہ بھی دکھایا۔

علامہ اقبال اوّلین مفکر ہیں جنھوں نے برصغیر میں علیحدہ مسلم ریاست کا تصور مثبت اور نظریاتی بنیادوں پر پیش کیا۔ انھیں نے مسلمانوں کو اور ان کی سیاسی قیادت کو یہ تصور دیا کہ مسلمان ایک الگ نظام حیات اور ایک دوسری تہذیب کے حامل ہیں۔ جس کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے۔ اور وہ نہ انگریز کے غلام رہ سکتے ہیں اور نہ کسی ہم وطنی قومیت کے تحت ہندو اکثریت کے دست نگر بن کر رہ سکتے ہیں۔ یوں علامہ اقبال نے ایک قومیت کے تصور کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو بھرپور و موثر انداز میں اجاگر کیا۔ اسلامی قومیت کا نظریہ علامہ اقبال نے ایسے وقت میں دیا جب دنیا میں رنگ ونسل، زبان اور وطن وغیرہ کے اتحاد پر پروان چڑھنے والا نظریہ قومیت اپنے نقطہ عروج کی جانب گامزن تھا۔ ان دنوں برصغیر پاک و ہند میں کانگریس بھی ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے اہل ہند کو تصور وطنیت کے پالنے میں تھپک تھپک کر سلانے کی جستجو وسعی کر رہی تھی۔ وطنی قومیت، کا یہ دریا کچھ اس تیزی سے چڑھ رہا تھا کہ بعض مسلمان علماء بھی اس کے دھارے میں خس وخاشاک کی طرح بہہ نکلے مگر یورپ میں قیام کے دوران، مغرب کی تاریخ کے تجزیہ اور قرآن پاک کے بغور مطالعہ نے علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت کو ایک نئی جلا بخشی تھی۔ ان کا فہم وتدبر مغربی طرز کے وطنیت کے حسین و دلنشیں تصور کی تہہ میں نہاں مضمرات سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا ان کی فکروسوچ اس واضح نتیجہ پر پہنچ چکی تھی کہ قومیت کا تصور جس کی بنیاد رنگ، نسل، زبان اور وطن پر ہو۔ بالعموم امن عالم اور بالخصوص عالم اسلام کے لیے سم قاتل ثابت ہوگا۔ انھوں نے قومیت کے اس تصور کے خطرناک و ہولناک نتائج

ملت اسلامیہ کو بارہا آگاہ کیا۔آپ نے فرمایا:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

علامہ اقبال نے ترانہ ہندی، میں ہندوستان کو اپنا وطن کہا ہے۔ یہ انسان کے فطری لگاؤ کی نسبت ہے وہ وطن کے مخالف نہیں، تصور وطنیت کے مخالف ہیں اور عہد حاضر میں اس کے جو معنی اخذ کیے جا رہے ہیں، اسے مسترد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ ایک بت ہے۔ اسے تہذیب حاضر میں ابدی حقائق حیات اور اقدار انسانیت کے الہامی تصور سے متصادم قرار دیتے ہیں فرماتے ہیں:

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

۱۹۱۹ء میں پروفیسر نکلسن کے نام مکتوب میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائنات میں انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔"

"ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں علامہ اقبال نے خیالات کو ایک مربوط فکر کی شکل میں یوں پیش کیا ہے:

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور

دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔"

دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے خطبہ صدارت میں علیحدہ مسلم مملکت کے بارے میں جواز پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا:

"ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، الگ ہیں ان کے اعمال وافعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر مسلمان ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔"

علامہ اقبال نے ایک قومیت کے تصور کے بت کو پاش پاش کر دیا تو تصور پاکستان کا خاکہ اور نمایاں ہو کر سامنے آ گیا جس کے لیے علاقائی حد بندی کا تعین یوں ہوا:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے۔ خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم آزاد اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔"

(خطبہ الہ آباد)

ہندوستان کے اندر ایک علیحدہ مسلم مملکت کا قیام ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہی مفاد میں ہے اس حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا:

"میں صرف ہندوستان میں اسلام کی فلاح و بہبود کے لیے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔" (خطبہ الہ آباد)

پھر علامہ اقبال نے سعی و عمل کے اس راستے کا تعین بھی فرما دیا جس پر عمل پیرا ہو کر ہی علیحدہ مسلم ریاست کا قیام ممکن تھا:

"میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لیے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرزِ عمل کے لیے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہے جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو۔ اور اس کے عزائم و ارادے ایک سطح پر مرکوز ہوں۔"
(خطبہ الہ آباد)

۱۹۳۲ء میں ایک اور خطبہ میں مزید فرمایا:

"نہ ہندوؤں کے وعدوں پر جاؤ اور نہ برطانیہ پر اعتماد کرو بلکہ جو کچھ لینا ہے زورِ بازو سے لو۔ پہلے لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرو اور اپنی متفقہ قوت پر بھروسہ کرو۔"

الہ آباد کے "تاریخ ساز اجلاس میں علامہ اقبال نے جس مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا وہ لوگوں کو محض ایک شاعر کا خواب دکھائی دیا مگر علامہ اقبال اسے اٹل حقیقت سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس موقف پر ثابت قدمی سے جمے رہے۔ اپنی وفات سے چند ماہ بیشتر قائداعظم کے نام تحریر فرماتے ہیں:

"شریعت اسلامیہ کا طویل اور عمیق مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی قانون کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر شخص کے زندہ رہنے کا سامان میسر آ سکتا ہے لیکن اس ملک میں اس وقت تک شریعت کا نفاذ ناممکن ہے جب تک کہ یہاں ایک یا ایک سے زائد آزاد اور خود مختار

اسلامی مملکتیں قائم نہ ہو جائیں ۔"

علامہ اقبال صرف اور صرف اسلام کو بنی نوع انسان کے تمام مسائل اور دکھوں کا مداوا سمجھتے ہیں اور اس کی روشنی میں وہ اپنی مطلوبہ اسلامی ریاست کے خدوخال یوں بیان فرماتے ہیں :

" جس مذہب کی آپ نمائندگی کرتے ہیں وہ اپنے ہاں فرد واحد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت میں دے ڈالے ۔ اس کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوتے ہیں وہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں اس کا معاشرتی درجہ اس کی ذات ، رنگ اور اس کے کمائے ہوئے مال و دولت کی مقدار سے معین نہ ہو بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جائے جیسے وہ بسر کرتا ہے جہاں غربا مال داروں پر ٹیکس لگاتے ہیں ، جہاں انسانی سوسائٹی سروں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو ، جہاں ایک غریب ایک خلیفہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہو ، جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی شکل رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اجازت اس طرح نہ دی جائے کہ وہ اصل دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کر لے ۔"

(آل انڈیا مسلم کانفرنس اجلاس لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء)

"میرے نزدیک فاشزم ، کمیونزم اور زمانہ حال کے دوسرے ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نکتہ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے ۔"

پاکستان علامہ اقبال کی فکری و نظری سوچوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے انھوں نے مسلمانان ہند کو جس جداگانہ تشخص کا احساس دلایا اور دو قومی نظریہ کو جو فلسفیانہ بنیاد عطا کی ان کا اعتراف بالآخر ان کے نظریاتی حریفوں نے بھی کیا ۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا :

" اقبال اس سرزمین پر مسلمانوں کی نئی نسل کے ملی شعور کی طاقت ور آواز تھے ۔ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی سوانح عمری کا مواد جمع کیا ۔ . . . . اقبال نے بعض مباحث سے قطع نظر مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو غایت درجہ متاثر کیا . . . . . اقبال نقد و نظر کا نہیں غور و فکر کا شاعر ہے ۔ پاکستان بن گیا ہے تو اب اس کے تصوراتی خطوط پر

ہی قائم رہ سکتا ہے۔" (اقبالی مجرم از شورش کاشمیری ص ۶)

دو قومی نظریہ ارشادات قائداعظم کی روشنی میں

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے سفر سیاست کا آغاز آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے کیا اور ایک عرصہ تک ہندو مسلم کے پیامبر بنے رہے، یہاں تک کہ مُسلم دشمن" نہرو رپورٹ" کے باوجود بھی آپ نے اس مشن کو جاری و ساری رکھا یہ وہی جناح تھے جن کی خدمات اور جرأت وعظمت کے اعتراف کے طور پر کانگریس نے بمبئی میں" جناح میموریل ہال" تعمیر کروایا اور ایک کانگریسی اخبار نے انہیں" ہندو مُسلم اتحاد کا سفیر" قرار دیتے ہوئے لکھا۔" ایک چیز سے مسٹر جناح کبھی مایوس نہیں ہوئے وہ ہے ہندو مسلم اتحاد" لیکن قائداعظم کا ہندو مُسلم اتحاد کا یہ خواب بکھر کر رہ گیا جب" نہرو رپورٹ" کے ضمن میں کانگریس نے مُسلم رہنماؤں کے دست تعاون کو جھٹکتے ہوئے کہا۔" ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس اور دوسری حکمران انگریز۔" قائداعظم نے اس بات کا جواب اسی وقت چکا دیا" نہیں! یہاں ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ ہے مسلمان۔ جن کی نمائندگی مُسلم لیگ کرتی ہے۔" یوں قائداعظم نے مسلمانوں کی جُداگانہ حیثیت کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا۔ دوسرے لفظوں میں دو قومی نظریہ اپنی ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں مُسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کو پیغام بیداری دیتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

> " ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کو خائف ہونے کی ضرورت نہیں ان کی تقدیریں ان کے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ ایک متحد، ٹھوس اور منظم طاقت کی حیثیت سے ہر خطرے اور مزاحمت کا متحدہ محاذ کے ذریعہ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمہارے اپنے ہاتھوں میں ساحرانہ قوت موجود ہے۔ اب تمہیں اپنے اہم فیصلوں پر ڈٹ جانا چاہیئے۔"

آپ نے اسی اجلاس میں مزید فرمایا:

> " اکثریت کے رویے سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ وہ ہندوستان کو ہندوؤں کی جاگیر سمجھتے ہیں...... کانگریس کی موجودہ پالیسی سے فرقہ وارانہ کشیدگی اور نفرت بڑھ جائے گی اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں جنگ چھڑ جائے گی۔"

۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو پنڈت نہرو کے خط کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

"آپ کے الفاظ اور انداز بیان سے تحکم اور جنگ جوئی کی بو آتی ہے۔ اور آپ کا خط پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس ہندوستان کی فرمان روا بن چکی ہے ..... جب تک کانگریس، مسلم لیگ کو برابری کا درجہ نہیں دیتی اور ہندو مسلم مصالحت کے لیے اس سے گفت و شنید کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس وقت تک ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انتظار کریں اور اپنی اس "قوت بازو" پر بھروسہ کریں جس کے مطابق بالآخر مسلم لیگ کو اہمیت حاصل ہو گی۔ آپ کی ذہنیت کو دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں اپنی بات آپ کو سنبھالنے کی مزید کوشش کروں۔"

۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ وزارتوں کی تشکیل کے ساتھ ہی کانگریسی اکابرین کی مکاری و عیاری عروج تک جا پہنچی جس کا مقصد مسلمانان ہند کی ہمدردیاں حاصل کر کے متحدہ قومیت کے تصور کو پروان چڑھانا تھا۔ قائداعظم نے اس مکارانہ عزائم کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا:

"کانگریس سراسر ہندو جماعت ہے۔ مسلمانوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کانگریس کو یہ جتا دیا ہے کہ ان کی آئندہ تقدیر اور قسمت کا دارو مدار حکومت اور ملک کے انتظام، ان کے سیاسی حقوق کے حصول اور قومی زندگی میں واجب حصہ حاصل ہونے پر ہے اور اس کے لیے وہ اس وقت تک برسر پیکار رہیں گے جب تک ہندو راج کا خواب و خیال کانگریس کے دل و دماغ سے بالکل مفقود نہ ہو جائے گا جب تک مسلمانوں کے قالب میں روح رہے گی، کانگریس کا غلام بننا ہرگز ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔"

(اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء)

۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو مرکزی اسمبلی میں قائداعظم نے انگریز اور ہندو دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"تمہاری تعداد سب سے زیادہ ہوا کرے تم ترقی یافتہ اور تمہاری اقتصادیات مستحکم سہی اور تم سمجھا کرو کہ سروں کی گنتی ہی آخری فیصلہ ہے! لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں تم دونوں کو، کہ تم تنہا یا یہ ادارہ تنہا ..... یا تم دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے، تم اس تہذیب کو مٹا نہ سکو گے، اس

اسلامی تہذیب کو جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے ہمارا نور ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے، زندہ رہے گا۔ تم ہمیں مغلوب کرو، ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک روا رکھو، ہم ایک نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ سنگین فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر مرنا ہی ہے تو لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔"

انگریزوں اور ہندوؤں سے اظہار بیزاری کے ذریعہ قائداعظم نے مسلمانوں کی ترجمانی کر دی کہ وہ جُداگانہ حیثیت کے مالک ہیں اور بالآخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں قرارداد لاہور منظور کی گئی جس میں قائداعظم نے کانگریس کے متحدہ قومیت کے خواب کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ آپ نے فرمایا :۔

"اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مختلف اور جُداگانہ معاشرتی نظام ہیں۔ یہ محض ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بُنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے۔ جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ حقائق اکثر ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہتے ہیں انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی ترقی کی تمناؤں کے لیے مختلف تاریخ سے نسبت رکھتے ہیں ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں ان کی رزمیہ نظمیں، ان کی سربرآوردہ شخصیات اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کی گاڑی کے دو بیل بنانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی۔ خاص کر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اقلیت ہو اور دوسری کو اکثریت حاصل ہو ایسی ریاست کا آئینی عمل خاک میں مل جائے گا۔"

یوں "دو قومی نظریہ" نہایت ہی حکیمانہ انداز میں دُنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا قائداعظم نے

مطالبہ پاکستان کے جواز کو مزید اجاگر کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل، ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔ آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا، مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے اور نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔"

(علی گڑھ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء)

پاکستان کیوں کر حاصل کیا جائے گا؟ اس کا لائحہ عمل قوم کے سامنے رکھتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان ملت کی عمارت استوار ہے وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان اور لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے، مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول، ایک امت، یہی ہمارا نعرہ ہے۔" (اجلاس مسلم لیگ کراچی ۱۹۴۳ء)

اغیار نے ظلم و ستم اور جبر و استبداد روا رکھا، خون کی ندیاں بہتی رہیں اور قافلہ آزادی کٹھن و پرخار راہوں پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خوشی و مسرت کا وہ دن آن پہنچا جس کا مسلمانوں کو برسوں سے انتظار تھا۔ ۱۴ اگست کا دن مسلمانان ہند کے لیے آزادی کا پیامبر بن کر آیا۔ بانی پاکستان نے اپنے پیغام تہنیت میں فرمایا:

"ہندوستان کے مسلمانوں نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ وہ ایک متحد قوم ہیں، ان کے مطالبے اور مقاصد حق و انصاف پر مبنی ہیں جنھیں ہرگز رد نہیں کیا جا سکتا۔ آئیے! ہم آج کے دن اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کا شکر بجا لائیں اور دعا کریں کہ وہ ہمیں اس کا اہل ثابت ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آج ہماری قومی تاریخ کی تلخیوں سے بھرپور دور کا اختتام ہوتا ہے اور آج ہی کے دن سے ہمارے نئے شان دار اور پُروقار عہد کا

آغاز بھی ہونا چاہیے۔" (پیغام تہنیت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء)

پاکستان کے مستقبل کے لیے لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے بانی پاکستان نے فرمایا:

"پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ جائیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پاسکیں اور اسلام کے عدل انسانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لاسکیں۔" (بحوالہ تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص ۲۲)

"اسلام محض رسوم، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ نہیں ہے اسلام ہر مسلمان کے لیے ضابطہ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی زندگی، اپنے افعال و اعمال اور حتیٰ کہ سیاست اور معاشیات اور دوسرے شعبوں میں بھی عمل پیرا ہوتا ہے۔"
(کراچی جنوری ۱۹۴۸ء)

"ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔" (سبی۔ بلوچستان فروری ۱۹۴۷ء)

"جب آپ جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ہم نے جمہوریت تیرہ سو سال پہلے سیکھ لی تھی۔"
(پریس کانفرنس ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء)

حصول آزادی کے بعد قوم کو احساس ذمہ داری سے آگاہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"ہم میں سے ہر شخص جب تک بھی میرے پیغام پہنچے۔ نہ صرف پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا عہد کرے بلکہ اس عزم کا بھی اظہار کرے کہ ہمیں پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانا ہے اور ایسی قوموں کی صف میں کھڑا کرنا ہے جن کا مقصد ملک کے اندر ہی اندر نہیں بلکہ ہر جگہ امن ہو۔" (لاہور اکتوبر ۱۹۴۷ء)

باب ۷

ہندوؤں کی مذہبی و سیاسی تحریکیں

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے ورود سے ہندوؤں کو پہلی مرتبہ ایک ایسی مذہبی تحریک کا مقابلہ کرنا پڑا جس نے سابقہ روایات کے برعکس ہندو سوسائٹی میں ضم ہونے سے انکار کر دیا۔ اسلام نے مساوات کا نعرہ لگایا تو چھوت چھات اور ذات پات نے جن لوگوں کو ذلیل بنا کر رکھا ہوا تھا وہ اسلام قبول کرنے لگے۔ مسلمان صوفیا نے سادھوؤں کے انداز اختیار کر کے اسلام کی طاقت کو ہندوؤں کے دلوں میں اتارنا شروع کر دیا تھا۔ اسلام نے توحید کے عقیدے کو اس قدر وضاحت اور قوت کے ساتھ پیش کیا کہ ہندو فلسفیوں کے لیے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ انھوں نے کروڑوں دیوتاؤں کے مذہب میں ترمیم ضروری سمجھی اور پھر ہندوؤں سے کہا کہ توحید کوئی مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے۔ ہندوؤں کے قدیم دھرم میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے اور ہندوؤں ہی نے اس کو بھلا رکھا ہے۔ چنانچہ اس ردعمل کے طور پر ہندوؤں نے "بھگتی تحریک" کا آغاز کیا اور اسلامی ترقی کو روکنے کے لیے پرچار کیا کہ اللہ رام، ہری اور پرماتما ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں۔ انھوں نے ذات پات کو گمراہ کن قرار دیا اور کہا کہ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ہر انسان کو خلوص کا پیکر ہونا چاہیے۔ بھگتی تحریک نے اسلام کے چیدہ چیدہ اصولوں کو تسلیم کر کے ہندو مت کی اصلاح کی تھی۔ لیکن یہ سب ہندوؤں کو اسلام میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں یورپی اقوام کی آمد اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے ہندو مت کو ایک دوسری مذہبی تحریک سے پالا پڑا۔ جو ہندو تہذیب میں ختم ہونے کی بجائے اپنی منفرد حیثیت کو برقرار رکھنے پر مصر تھی۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے برطانوی حکومت نے پادریوں کو برصغیر میں آنے اور یہاں آباد ہونے کی اجازت دے کر عیسائیت کی تبلیغ میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ یہ مشنری پادری بہت تنگ نظر اور متعصب واقع ہوئے تھے انھوں نے عیسائیت کی تعلیم پر مشتمل کتابچے لکھ کر تقسیم کرنے، مختلف تقریبات میں کھلم کھلا عیسائیت کا پرچار کرنے اور دیگر مذاہب پر ناروا تنقید کرنی شروع کر دی۔ ان تبلیغی

سرگرمیوں میں انھیں باقاعدہ حکومت کے کارندوں کی امداد وحمایت حاصل تھی۔

حکومت برطانیہ کی سرپرستی سے عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا حوصلہ افزا نتیجہ برآمد ہوا اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس کے علاوہ ۱۸۳۰ء میں براہ راست تبلیغ کے طریقے کو ترک کر کے تعلیمی اداروں کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح مشنری اداروں کے فارغ التحصیل مقامی طلباء لادینیت اور گمراہی کا شکار ہو کر اپنے روحانی اور مذہبی ورثے سے بیگانے ہو گئے۔

ان حالات میں ہندوؤں کو اپنے مذہب کی بقاء کے لیے سوچنا پڑا۔ چنانچہ اس مرحلے پر ہندو تہذیب مختلف مکاتب فکر میں منقسم ہو گئی ایک مکتب فکر مشرق و مغرب میں ہم آہنگی کا خواہاں تھا۔

دوسرا مکتب فکر جدید مذہبی و سائنسی قدروں کا ساتھ دینے کی بجائے اپنی قدیم روایات کا پرستار رہ کر مغربی افکار کی مذمت کا حامی تھا۔

تاہم ایک اور طبقہ جو کہ اعتدال پسند تھا وہ مغرب کے جدید علوم و فنون سے متاثر تو تھا لیکن اپنی قدیم مذہبی روایات و نظریات کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جدید دور کے اثرات اور نظریات کے تحت ہندو معاشرے میں متعدد مذہبی اور سیاسی تحریکیں ابھریں جن کا رخ عیسائیت کے خلاف کم اور اسلام کے خلاف زیادہ تھا۔

برہمو سماج کی تحریک

ہندوؤں میں جدید مغربی اثرات کے تحت جن تحریکوں نے جنم لیا۔ ان میں برہمو سماج سب سے نمایاں ہے۔ برہمو سماج کو برہما سبھا بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں۔ ایسے لوگوں کی مجلس جنھوں نے بت پرستی کو ترک کر کے خدا کی واحدنیت پر یقین کیا اس تحریک کا بانی راجہ رام موہن رائے ایک بنگالی ہندو تھا۔ راجہ رام موہن ۱۷۷۲ء میں رادھا نگر میں پیدا ہوا عربی فارسی زبان پر مہارت کی وجہ سے وہ "مولوی رام موہن رام" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

راجہ رام اسلامی توحید سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اسلام کا مطالعہ کیا اور بت پرستی کے خلاف "تحفتہ المعواحدین" کے نام سے فارسی زبان میں ایک رسالہ لکھا۔ جس کا دیباچہ عربی میں تھا۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے ہندومت کی کتب کی مدد سے ثابت کیا کہ بت پرستی ہندومت کی اصل تعلیم نہ تھی۔ اس سے ہندوؤں کو سخت تکلیف ہوئی۔

برہمو سماج کی تحریک کا آغاز ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء کو ہوا اس تحریک کے حامیوں میں بنگال کے مالدار ہندو شامل تھے جن میں ایک دبندرا ناتھ ٹیگور تھا۔ جو اس کے بعد برہمو سماج کے سربراہ تھے۔

برہمو سماج کے اصول

(۱) خدا ایک ہے اس کا وجود موجود ہے وہ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہے اس لیے اس کی پرستش کرنی

چاہیے اسی سے حاجات مانگنی چاہئیں، اور بت پرستی نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ انسان کی روح غیر فانی ہے اور خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

۳۔ نجات حاصل کرنے کے لیے کسی دریا میں نہانا تیرتھ یا حج کرنا، چلہ کاٹنا یا کسی بزرگ کی سفارش کا سہارا غلط ہے نجات کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ نیک اعمال ہیں۔

۴۔ جنت اور دوزخ کا تصور عام لوگوں کو نیک کاموں کی ترغیب اور برائی سے روکنے کے لیے دیا گیا ہے۔ روح کی پاکیزگی جنت اور روح کی ناپاکی جہنم ہے۔

۵۔ ذات پات کا نظام غلط ہے خدا سب کا باپ ہے اور سب آپس میں بھائی ہیں۔ اس لیے چھوت چھات اور اونچی نیچی ذات کے تصورات غلط ہیں۔

۶۔ اگرچہ بائبل غلطیوں سے مبرا نہیں ہے تاہم انسان اور خدا کے حقوق کا شعور پیدا کرنے کے لیے مفید ہے۔

۷۔ "ستی" اور ایک سے زیادہ شادیاں کرنا منع قرار دیا گیا۔

۸۔ عبادت ہفتے کے دن کی جائے گی۔

راجہ رام موہن رائے کے بعد دیبندرناتھ ٹیگور کے زمانے میں برہمو سماج کے اصولوں میں مندرجہ ذیل اضافہ ہوا۔

۱۔ ویدوں سے بھی غلطی کا امکان ہے اور وید کا صرف وہ حصہ قبول کیا جائے گا جو مسلک توحید سے متصادم نہ ہو۔

۲۔ توبہ کے لیے ندامت اور آئندہ کے لیے گناہ سے اجتناب ضروری ہے۔ اسی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

برہمو سماج درحقیقت عیسائیت کے اثرات کی پیداوار تھی اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندو معاشرہ اپنی برائیوں سے آگاہ ہو گیا اور اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کافی تعلیم یافتہ ہندو عیسائی ہو گئے۔ برہمو سماج کی تحریک نے بنگال کی سماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس نے عیسائیت کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کو کم کیا چنانچہ بڑی تعداد میں ہندوؤں نے عیسائیت کو قبول کر لیا۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق برہمو سماج کی تعداد صرف چار ہزار تھی۔

پرارتھنا سماج

انیسویں صدی کے وسط میں بمبئی مہاراشٹر میں برہمو سماج کے خطوط پر ایک اور ہندو تحریک پرارتھنا کے نام سے عالم وجود میں آئی۔ اس کی تعلیمات اور اصول برہمو سماج سے ملتے جلتے تھے۔ اس سماج کا بانی ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ ہندو تھا جو ایک پروٹسٹنٹ مشنری ڈاکٹر ولسن کا دوست تھا۔ پرارتھنا سماج نے بھی ہندو معاشرے کی اصلاح میں

نمایاں کردار ادا کیا۔ تعلیم بالغاں اور تعلیم نسواں کا اہتمام کیا۔ یتیم خانے قائم کیے اور بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی اس سماج نے ذات پات کی اتنی شدت سے مخالفت نہیں کی اس کی وجہ سے یہ ہندو مت کے زیادہ قریب تھا۔ تاہم یہ سماج عیسائیت سے بھی بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کے پیروکار عبادت میں مرہٹہ بھگتوں تو کارام، اور رام دیو کی مناجات استعمال کرتے تھے اور مرہٹی اور گجراتی زبانوں میں دعائیں پڑھتے تھے اور اتوار کے دن عبادت کرتے تھے۔

دیو سماج

۱۸۸۷ء میں لاہور کے مقام پر دیو سماج نامی ایک اور ہندو تحریک کی بنیاد پڑی جس کا بانی سیتا نند اگنی ہوتری تھا۔ جو برہمو سماجیوں ہی کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ لوگ خدا کے وجود کے منکر اور سائنس کے مداح تھے یہ ہندو مذہب کی اخلاقی اقدار کو مانتے تھے لیکن مابعد الطبعیات کے سلسلے میں مذہبی عقائد کو کوئی وزن نہ دیتے تھے۔ اس حد تک مذہب سے دور ہونے کے باوجود یہ گروہ گوشت کھانے کے خلاف تھا۔ دیو سماج کے حامی مادی ترقی پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے تعلیم کی اشاعت کے ذریعے ہندو قوم کو مادی طور پر اوپر اٹھایا۔ اس سماج نے آریہ سماج پر بھرپور تنقید کی۔

آریہ سماج

ہندو مت میں جو تحریکیں انیسویں صدی عیسوی کے دوران رونما ہوئیں۔ ان میں آریہ سماج سب سے زیادہ اہم ہے اس کا بانی سوامی دیانند سرسوتی تھا۔ جو گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک برہمن خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ دیانند نے تقریباً بیس سال تک مختلف مقامات پر تعلیم حاصل کی اسی دوران ڈنڈی کے مقام پر سرسوتی سلسلے کے ایک ویدی سوامی درجانند سے اس کی ملاقات ہوئی جس نے اسے جدید علوم کی بجائے ویدوں کے علم کو پھیلانے کا حکم دیا۔ اس نے بہت جلد درویشانہ لباس اور عوامی زبان کو اپنایا اور اس کی تحریک ہندوؤں میں جڑ پکڑنے لگی ۱۸۷۴ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب "ستھیارتھ پرکاش" مکمل کی اور اگلے سال ۱۸۷۵ء میں بمبئی کے مقام پر آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔ جس نے بعد میں جلد ہی نیم سیاسی حیثیت اختیار کر لی۔ دیانند بعد میں لاہور منتقل ہو گیا جو اس کی تحریک کا مرکز قرار پایا۔

ہندو مت کی اصلاح

آریہ سماج بنیادی طور پر ہندو مت کے احیاء کی تحریک تھی تاہم اس میں اصلاح کے پہلو بھی تھے۔ مثلاً آریہ سماج بت پرستی، بچپن کی شادی، "ستی" عورتوں کے لیے ویدک تعلیم کے حصول پر پابندی وغیرہ کے سخت مخالف تھے۔

آریہ سماج کے مطابق خدا ایک ہے۔ جس کی عبادت بتوں کے ذریعے نہیں بلکہ براہ راست کرنی چاہیے۔
آریہ سماج کے مطابق انسان اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے کے لیے دوسرے جنم میں آتا ہے، گناہ و معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گناہ دور کرنے کے لیے کسی نہ کسی جنم میں پیدا ہو کر سزا بھگتنی لازمی ہے آریہ سماج گنگا کے اشنان یا کسی خاص مندر کی زیارت کو گناہوں کی معافی کا ذریعہ بھی نہیں مانتا۔

گئو رکھشا سبھا آریہ سماج عیسائیت اور اسلام کے خلاف دفاعی اقدامات کی بجائے جارحانہ اقدامات کا قائل تھا۔ چنانچہ آریہ سماج نے گئو رکھشا کے لیے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام گئو رکھشا سبھا رکھا۔ اس تنظیم نے گاؤکشی اور گائے کا گوشت کھانے والے (مسلمانوں اور عیسائیوں) کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔

شدھی دیانند سرسوتی نے جن نظریوں پر اپنی تنظیم کی عمارت کھڑی کی ان میں "ویدوں کی طرف مراجعت"، "ہندوستان صرف ہندوؤں کے لیے" نعرے زیادہ مقبول ہوئے۔ انھوں نے نعرہ لگایا کہ اسلام اور عیسائیت دونوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔ عیسائیت کو اس لیے نقصان نہ پہنچا سکے کیونکہ حکومت کی بیک تھی چنانچہ انھوں نے سارا زور مسلمانوں پر لگاتے ہوئے "شدھی" کی بنیاد رکھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کمزور یقین رکھنے والے مسلمانوں کو ہندو بنایا جائے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ کسی بھی کمزور مسلمان کو پنچ رتن کھلا کر دوبارہ ہندو بنایا جا سکتا تھا۔

وید کی تفسیر وید کے متعلق دیانند سرسوتی کا مسلک تھا کہ وہ الہامی کتب ہیں۔ اور ان میں تمام جدید و سائنسی ایجادات کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ ویدوں کو دنیا کے تمام مذاہب کے ماخذ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔

ستیارتھ پرکاش • دیانند سرسوتی کی مشہور کتاب "ستیارتھ پرکاش" جو کہ ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اسلام کے خلاف لکھا گیا۔ خاص کر اس کتاب کا چودھواں باب اسلام کی مخالفت میں لکھا گیا تھا اس کتاب کا آخری باب انتہا متعصبانہ جارحانہ اور اشتعال انگیز نوعیت کا تھا۔ اس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ تعصب اور تنگ نظری آریہ سماجیوں کی روایت بن گئی۔ چنانچہ انھوں نے مناظروں کا آغاز کیا جس سے ہندو مسلم تعلقات میں بے حد کشیدگی پیدا ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ براہمو سماج اور دیو سماج کی تحریکوں کی نسبت آریہ سماج کی تحریک کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کے انتہا پسند ذہن کو اعتدال پسند اور صلح کن

تحریکیں اچھی نہیں لگتی تھیں ۔ آریہ سماج کے مشنری دورے کے دوران ۱۸۸۳ء میں دیانند اجمیر کے مقام پر انتقال کر گیا اس کے بعد یہ تحریک دو مکاتیب فکر میں منقسم ہو گئی ۔ ایک گروہ انگریزی تعلیم کی اہمیت کے علاوہ آزادانہ خیالات کا داعی تھا ۔ جس کا علمبردار لالہ ہنس راج تھا ۔ جس کی زیر نگرانی تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے لاہور میں دیانند اینگلو ویدک کالج قائم کیا گیا ۔ دوسرا مکتب فکر جس کی بنیاد ۱۹۰۲ء میں رکھی گئی کا سربراہ سردوار کے گوروکل تھا جو کہ جدید دور میں ویدک نظریات کے احیاء کا منبع تھا ۔

انیسویں صدی ہی میں ایک اور مذہبی اور ہندو تحریک کی بنیاد رکھی گئی جس

رام کرشن مشن کا بانی رام کرشن پرمہا تھا جو کہ کلکتہ کے ایک نواحی مندر کا ایک غریب پروہت تھا ۔ اس مشن کا بنیادی مقصد مذہبی اور سماجی اصلاح تھا ۔ نیز یہ مشن خالص ویدک نظریات کا داعی تھی اور مسلک کے تمام عوام کو ہندو مت میں واپس لانا چاہتا تھا اور بت پرستی سمیت ہندو مت کے تمام عقائد کے تحفظ کا خواہاں تھا ۔ یہ مشن تمام مذاہب کی صداقت پر یقین رکھتا تھا ۔ اس مشن کا دعویٰ تھا کہ اللہ ، ہری ، مسیح اور کرشن ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں ۔ جس کی ہم پرستش کرتے ہیں ۔

اس مشن کا مشہور پیروکار جس نے اپنی زندگی اپنے گورو کے لیے وقف کر دی ۔ کلکتہ یونیورسٹی کا نریندرا ناتھ دت نامی ایک گریجویٹ تھا ۔ جو بعد میں سوامی ویکانندا کے نام سے مشہور ہوا ۔ اس کی تعلیم کی عقیدت اور حیرت انگیز شخصیت کی وجہ سے بہت سے لوگ اس مشن کے پیرو بن گئے ۔ جن میں شہزادے مزدور اور کسان بھی شامل تھے ۔ اس مشن کے پیروکار مشن کے کام کی ترقی کے لیے اپنی عمریں وقف کر دیتے تھے ۔ بعض پیرو ایسے بھی تھے ۔ جو شادی نہیں کرتے تھے بعض دنیا دار کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ لیکن ان کی بود و باش مشن کے اصولوں کے عین مطابق ہوتی تھی ۔ اس مشن کا اہم ترین کارنامہ ہندو سکولوں ، ڈسپنسریوں اور یتیم خانوں کا وسیع پیمانے پر قیام تھا ۔

رام کرشن مشن نے ہندو مت کی ہر چیز کا دفاع کیا کہ یہاں تک کہ بت پرستی کی بھی حمایت کی اور اس کو روحانی فیض کے حصول کا ذریعہ بنایا اس نے مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے مقابلے پر ہندوستان کو روحانیت کا علمبردار قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ مستقبل قریب میں ہندو مت دنیا بھر کے انسانوں کو روحانیت سے ہم کنار کر دے گا ۔ یہ مشن بالکل عیسائی مشنریوں کی طرز پر ہندو مت کے احیاء کا علمبردار تھا ۔

اس سوسائٹی کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں امریکہ میں

تھیوسوفیکل سوسائٹی یا سماج رکھی گئی اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ انسان خدا تک " وجدان " کے ذریعے پہنچ سکتا ہے ۔ ۱۸۷۹ء میں اس کے بانی مادام بلیوسکی (ایک روسی عورت)

اور کرنل اسکاٹ برصغیر آئے اور انھوں نے ۱۸۸۲ء میں مدارس کے قریب ادیار کے مقام پر اپنا مرکز قائم کیا۔ ۱۸۸۹ء میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ترقی و کامیابی کے لیے مسز اینی بیسنت اس میں شامل ہوگئیں۔ اس نے چھیالیس سال کی عمر میں اس سوسائٹی کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

یہ سوسائٹی بنیادی طور پر ہندومت کے احیاء کی تحریک تھی۔ مسز اینی بیسنت کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان کے موجودہ مسائل کا واحد حل اس کے قدیم عقائد اور نظریات کے احیاء میں مضمر ہے اس نے مختلف مقامات پر سوسائٹی کی سینکڑوں شاخیں کیں۔ ۱۸۹۳ء مسز اینی بیسنت نے اپنی سوانح حیات میں لکھا کہ "ہندوستان میں ہماری سوسائٹی کا نصب العین یہ ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان کے قدیم مذاہب کا احیاء اور ان کو سربلند کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی خود داری، اپنے ماضی پر فخر اور مستقبل پر اعتماد اپنے ساتھ لائی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر حب الوطنی کی زندگی میں ایک بڑے انقلاب اور ایک قوم کی تعمیر نو کا آغاز ہوگا" برصغیر میں اس تحریک نے ہر اس کوشش کی حمایت کی جو اسلام کے اخراج کی متمنی تھی۔ مسز بیسنت نے دوسرے مذاہب کو ہندومت کے ساتھ اس لیے جوڑا کہ اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے۔ گویا برہمو سماج کے برعکس یہ ہندومت کے احیاء کی تحریک تھی۔

ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کے اثرات

انیسویں صدی میں ہندومت کے احیاء کے لیے جو ابھریں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود مقصد کے اعتبار سے ایک تھیں۔ ان تحریکوں کے اثرات کے جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر تحریک نے اپنے ماحول اور زمانے کے اعتبار سے بہت سے مقامات پر عیسائیت اور اسلام سے مصالحت کے باوجود ہندومت کی بقاء کے لیے کام کیا۔ اور بالآخر ہندوؤں میں جارحانہ جذبۂ قومیت کو ابھارا۔

ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کے مندرجہ ذیل اثرات نمودار ہوئے۔

۱۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل اور تیسرے ربع میں انگریزی حکومت اور عیسائی مشنری اس ملک میں عیسائیت کو پھیلانے کے بارے میں جو کوششیں کر رہے تھے۔ راجہ رام موہن رائے نے بظاہر ان کے ساتھ تعاون کیا لیکن اپنے ہندومت کو ترک کر کے انھوں نے ہندوؤں کے لیے نئی راہ کھول دی کہ ہندو رہتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے حکمرانوں کے ساتھ مصالحت کر لی جائے۔

۲۔ ان تمام ہندو تحریکوں نے انگریزوں کے ساتھ اتحاد و مصالحت اور انگریزی تعلیم کے حصول پر زور دیا۔ اس طرح ہندوؤں کی مادی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ اور صدیوں سے غلام قوم کو اپنے پاؤں پر

کھڑا کیا۔

۳۔ ہندومت کی احیاء کی تمام تحریکیں ایک طرف تو اسلام اور عیسائیت کے فکری حملوں سے بچاؤ کی خاطر تھیں۔ تو دوسری طرف نوجوان ہندوؤں کو ترک مذہب سے روکنے کے لیے ناگزیر تھیں۔ چنانچہ ابتدائی دور میں جس رفتار کے ساتھ ہندو عیسائی بننے لگے بعد میں وہ رفتار برقرار نہ رہ سکی۔

۴۔ ان تحریکوں نے برصغیر کے پرانے کلچر کے تحفظ کے نام پر ہندومت کی بحالی پر زور دیا اور اس کو برصغیر کا اصل مذہب قرار دے کر باقی مذاہب کو دیس سے نکال دینے کی کوشش کی۔

۵۔ مختلف ہندو تحریکوں نے جو مختلف طریقے اپنائے ان کی وجہ سے ہندوان تحریکوں سے متاثر ہوئے کسی کو گرو جی کی پوجا کے رنگ میں کسی کو گائے کے تحفظ کے نام پر اور کسی کو ہندومت کے تحفظ کے نام پر متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔

۶۔ ہندو عوام میں آریہ سماجی تصورات کی مقبولیت نے کانگریس اور دیگر جماعتوں کا اعتدال پسند کردار ختم کر دیا۔

۷۔ جوں جوں ہندو قوم اپنی بقا کے بارے میں اعتماد محسوس کرتی گئی ان کی جارحیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ پہلے دور کی تحریکیں مدافعانہ رنگ کی تھیں لیکن آخری دور کی تحریکیں جارحیت پسند تھیں۔ "ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لیے" کا نعرہ جس کا صحیح مفہوم یہ تھا کہ ہندومت کے علاوہ باقی مذاہب کو ہندوستان سے نکال دیا جائے اس سلسلے میں تلک ہندو مہا سبھا، بنکم ناتھ چیٹرجی وغیرہ کی تحاریک اس سلسلے کی کڑی ہیں۔

۸۔ اس دور میں چلنے والی اکثر تحریکوں کا رخ اسلام کے خلاف تھا۔ ہندوؤں لیڈروں نے کوشش کی کہ انگریز حکمران کی مدد سے پرانے آقاؤں سے انتقام لیا جائے اور ان کو اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو قومیت میں ضم ہونے پر مجبور کیا جائے۔

۹۔ جب یہ تحریکیں اپنے عروج پر پہنچیں تو ہر اہم موقع پر کسی نہ کسی بہانے ہندو مسلم فسادات شروع کر دیے جاتے۔ مسلمانوں کے محلے اور شہر غیر محفوظ ہونے لگے اور " دھرتی کو ملیچھ لوگوں سے پاک کرنے کا عظیم منصوبہ" ظاہر ہونے لگا اس طرح تحریکوں نے ہندو مسلم ہندو مسلم تصادم کی راہ ہموار کی۔

۱۰۔ ہندو تحریکوں نے ہندو مسلم فساد کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر پاک و ہند میں دونوں قومیں بے انتہا فسادات و خون ریزیوں کے دو الگ الگ ملک بنانے پر مجبور ہو گئیں۔

مسلمانوں کا ان تحریکوں پر ردعمل

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی طرف سے کئی مذہبی تحریکیں شروع کی گئیں ان تحریکوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات برقرار رکھے۔ مساجد آباد کیں۔ نماز روزے کا اہتمام کیا جدید طبقات بھی کم از کم شادی بیاہ اور موت وحیات کے معاملات میں اسلامی شعائر کے پابند رہے اگر علماء کی یہ تحریکیں اس دور میں نہ چلتیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ برائے نام مسلمان بھی باقی نہ رہتے۔

انیسویں صدی ہی میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کئی تحریکیں شروع کی گئیں ان کے جواب میں آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے خلاف مناظروں میں علماء اسلام نے جو عقلی برتری حاصل کی اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں خود اعتمادی۔ قومی تشخص کا احساس اور مدافعت کا جذبہ پیدا ہوا اور اس کے علاوہ ہندوؤں اور عیسائیوں کے جارحانہ عزائم کے خلاف انھی دفاعی جذبات نے مسلم لیگ کی تشکیل کی۔

ہندوؤں کی تحریکوں کا جواب دینے کے لیے مناظروں کے اہتمام کی وجہ سے مسلمان جو فقہی اور فروعی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے اکٹھے ہوئے اور انھوں نے متحد ہو کر ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کا مقابلہ کیا۔

ہندو تحریکوں نے جب برصغیر پاک وہند سے اسلام کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کیے تو مسلمانوں کی مذہبی تحریکوں کے زیر اثر مسلمانوں نے اس چیلنج کا جواب دیا اور ہر میدان میں ہندو اکثریت کا مقابلہ کیا۔

ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کے خلاف مسلمانوں نے اپنی مذہبی تحریکوں میں اسلامی تعلیمات کو کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے ذہن میں تازہ رکھا۔ چنانچہ مسلمان اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم سمجھنے لگے اور جب ہندوؤں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا تو اگرچہ علماء میں سے ایک کثیر تعداد انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے کانگریس کی ہم نوا بن گئی تھی، عام مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ ایک قوم میں ضم ہونا کبھی گوارا نہ کیا اور یہی وہ جذبات تھے جو کبھی مسلم لیگ کی مقبولیت کی صورت میں اور کبھی دو قومی نظریہ اور قرارداد پاکستان کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔

اس طرح مسلمانوں نے ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ان کی تحریکوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس کی وجہ انیسویں صدی میں علماء کی طرف سے مذہبی تحریکوں کا شروع ہونا تھا۔

برصغیر میں سیاسی تحریک کا آغاز

انیسویں صدی کے وسط میں برصغیر پاک وہند میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔ جس کے نتیجے میں سیاسی

تحریکیں عالم موجود میں آئیں اور عوام نے اپنے حقوق منوانے کی خاطر سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سیاسی بیداری میں کئی ایک عوامل کارفرما تھے جنھوں نے ملک میں سیاسی شعور کو فروغ دیا۔ ذیل میں ان عوامل کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ سیاسی وحدت

برطانوی حکومت کے قیام سے سارے برصغیر پاک و ہند کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی۔ کشمیر سے راس کماری اور پشاور سے چاٹگام تک سارا برصغیر ایک مرکزی حکومت کے ماتحت آگیا اس سے بڑھ کر یہ کہ سارے ملک میں انتظامی یک جہتی کا دور دورہ ہوا۔ سارے ملک میں ایک قسم کے ضوابط نافذ ہوئے پورے ملک کی عدالتوں میں ایک ہی تعزیرات کا نفاذ ہوا۔ ان حالات میں برصغیر کے مختلف النسل باشندوں میں پہلی مرتبہ قومی وحدت کا احساس و شعور پیدا ہوا اور جذبۂ قومیت نے جنم لیا۔ اس کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ برصغیر میں سیاسی بیداری کی فضا پیدا ہوئی۔

۲۔ مغربی تعلیم

مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ نے برصغیر کے لوگوں پر غور و فکر کے نئے دروازے کھول دیے۔ مغرب کے فلسفہ اور سیاسی نظریات کے مطالعہ نے تعلیم یافتہ طبقے میں آزادی، مساوات، قومیت، جمہوریت اور خود مختاری کے تصورات واضح کر دیے۔ ہندوؤں نے مغربی تعلیم کو مسلمانوں کی نسبت جلد قبول کریں۔ چنانچہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ علاوہ ازیں عیسائی مشنریوں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تشریح اور ترویج کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ راجہ رام موہن رائے، دیویندر ناتھ ٹیگور، سوامی دیانند، جسٹس مہادیو گووند رانڈے، گوپال کرشن گوکھلے، پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر اور بالاباری ایسے مشہور ہندو دانشوروں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ چنانچہ ان میں جذبۂ قومیت اور حب الوطنی کا احساس ابھرنے لگا۔ مغربی تعلیم کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کی ایک مشترکہ زبان بن گئی۔ اس سے مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان تبادلہ خیال آسان ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کے مسائل کو آسانی سے سمجھنے لگے۔ اس سے باہمی مفاہمت اور اپنے مطالبات کے حصول کے لیے متفقہ لائحہ عمل مرتب کرنے کی فضاء پیدا ہو گئی۔

۳۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی

برطانوی حکومت کے قیام سے برصغیر میں رسل و رسائل اور آمد و رفت میں خوب ترقی ہوئی، سارے ملک میں سڑکوں اور ریلوں کا جال بچھا دیا گیا۔ ڈاک اور ٹیلیفون و تار کے محکمے قائم ہوئے۔ اس سے ملک کے دور دراز علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ چنانچہ ان میں باہمی مفاہمت پیدا ہوئی اور جذبۂ قومیت نے فروغ پایا۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تعلیم اور ہندوؤں کی مختلف مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کا اثر یہ ہوا کہ ہندوؤں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو مغربی تعلیم سے بہرہ ور تھا اور مغرب کے جذبہ فلسفہ سے آگاہ تھا۔ یہ لوگ ملازمتوں کے خواہاں تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں قوم کی زبوں حالی کا بھی احساس تھا۔ مغرب کی جمہوری، مساوات اور آزادی کے تصور کی بنیاد پر وہ حکومت کی کارگزاریوں کا بغور مطالعہ کرنا اور رائے دینا اپنا حق سمجھتے تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے مساوی ہندوستانیوں کے لیے بھی یکساں حقوق کا مطالبہ کیا۔ ان کے پروپیگنڈے اور احتجاج سے بھی برصغیر میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔

۵۔ معاشی بدحالی صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کے باوجود برصغیر کے لوگ معاشی بدحالی کا شکار تھے، برطانوی حکومت عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے دفاع پر زیادہ خرچ کرتی تھی۔ معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ دیگر ناگہانی آفات نے بھی عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ برصغیر کے تعلیم یافتہ طبقہ کو حکومت کی بے حسی اور عدم دلچسپی کا شدید احساس تھا۔ وہ اکثر و بیشتر حکومت پر سخت تنقید کرتے رہتے تھے لیکن برصغیر میں کوئی واضح سیاسی تنظیم موجود نہ تھی۔ اس سے ایک طرف تو عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوا اور دوسری طرف تعلیم یافتہ طبقے کو یہ احساس ہوا کہ ملک میں ایک ایسی سیاسی تنظیم ہونی چاہیے جس کے ذریعے وہ ملکی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور اپنے مطالبات حکومت کے سامنے پیش کر سکیں۔

۶۔ انیسویں صدی کی تحریکیں برصغیر میں برطانوی اقتدار کے ساتھ انگریزوں نے عیسائیت کی تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ ان کا کہنا تھا، "ہندوستان انگریزوں کو خدا نے اس لیے عطا کیا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کے جھنڈے ہندوستان کے گوشے گوشے میں لہرا دیں۔" اس ضمن میں مشنری پادری بعض اوقات تشدد کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے چنانچہ ان کے اس رویے کے ردعمل میں برصغیر میں کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تمام تر توجہ علی گڑھ تحریک کی طرف مبذول کرائی اور ہندو معاشرہ میں برہمو سماج، پرارتھنا سماج، دیو سماج، آریہ سماج، رام کرشن مشن اور تھیوسوفیکل سوسائٹی ایسی تحریکوں نے جنم لیا۔ جنھوں نے جہاں ایک طرف ہندو مت کی اصلاح اور اس کی عظمت کو سربلند کرنے کی کوشش کی وہاں ہندوؤں میں سیاسی بیداری بھی پیدا کر دی۔

۷۔ پریس کا فروغ برطانوی حکومت میں علاقائی زبانوں میں اخبار شائع کرنے کی ابتدا انگریز پادریوں نے کی تھی، جن کا مقصد درحقیقت اپنے نظریات کی اشاعت کرنا تھا۔ لیکن ان کی دیکھا دیکھی مقامی لوگوں نے بھی اخبار نکالنے شروع کر دیے۔ مقامی پریس کے عالم وجود میں آنے سے برصغیر کے عوام میں سیاسی فہم و شعور کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ مقامی پریس پر حکومت کی گوناگوں پابندیاں

کے باوجود اخباروں اور رسالوں کی اشاعت سے ایک ایسا ذریعہ میسر آگیا جس کی وساطت سے عوام نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے بلکہ حکومت کی توجہ نہایت اہم امور کی طرف بھی مبذول کرا سکتے تھے۔ اس طرح پریس نہ صرف عوام کے خیالات کا ترجمان بن گیا۔ بلکہ اس نے برصغیر کے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

۸۔ انگلستان اور برصغیر کے درمیان مسافت کی کمی

انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں انگریزوں اور اہل پاک و ہند میں باہمی میل جول نہایت محدود تھا لیکن اس کے باوجود افسر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لیتے، مقامی زبانیں سیکھتے اور لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر نہر سویز نے برصغیر اور انگلستان کے درمیان مسافت کو کم کر دیا۔ فاصلے کا کم کیا ہونا تھا کہ انگریز افسروں کی ذہنیت ہی بدل گئی۔ اب ان کا جسم برصغیر میں اور ذہن ولائیت میں رہنے لگا۔ وہ حتی الامکان مقامی لوگوں سے الگ تھلگ رہنے لگے عوام کے ساتھ ان کا سلوک حاکمانہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی وجہ سے بھی عوام سیاسی طور پر بیدار ہو گئے۔

۹۔ امتیازی قوانین کا اجراء

وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے دور اقتدار میں ایسے متعدد امتیازی قوانین منظور کیے گئے جن سے برصغیر کے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ لارڈ لٹن نے سب سے پہلے سول سروس کے امتحان کی زیادہ سے زیادہ عمر اکیس سال سے گھٹا کر انیس سال کر دی۔ چونکہ یہ امتحان صرف لندن میں ہوتا تھا اس لیے انیس سال کی عمر میں ولایت جا کر امتحان میں حصہ لینا برصغیر کے نوجوانوں کے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ علاوہ ازیں ورنیکلر پریس ایکٹ منظور کر کے علاقائی زبانوں میں شائع ہونے والے تمام اخبارات پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ جب کہ انگریزی اخبارات پابندیوں سے مستثنیٰ رہے اسی طرح قانون اسلحہ کی رو سے اہل برصغیر کے لیے بغیر لائسنس اسلحہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا حالانکہ یورپین ان پابندیوں سے یکسر آزاد تھے ان امتیازی قوانین کے نفاذ سے عوام میں بے چینی کا سوال پیدا ہونا لازمی تھا۔

سول سروس کے امتحان کی عمر انیس سال مقرر کرنے کے فیصلے پر برصغیر میں شدید غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور اس نے فیصلے کی مخالفت کے لیے ۱۸۷۶ء میں انڈین ایسوسی ایشن (تنظیم) قائم کی گئی۔ جس کی زیر سرپرستی ملک میں پہلا منظم سیاسی احتجاج کیا گیا جس کے روح رواں راجندر ناتھ بینرجی اور آنند موہن تھے۔ اس ایسوسی ایشن کو عام طور پر انڈین نیشنل کانگریس کا پیش رو کہا جاتا ہے۔

۱۰۔ نسلی امتیاز

وائسرائے لارڈ رپن کے زمانے میں ۱۸۸۳ء میں البرٹ بل پاس ہوا۔ جس کی رو سے ہندوستانی مجسٹریٹ یورپینوں کے مقدمات سننے کے اہل قرار دیے گئے قبل ازیں کسی یورپین ملزم کا مقدمہ کسی دیسی مجسٹریٹ کی عدالت میں سماعت کے لیے پیش نہیں ہو سکتا تھا گو اس وقت کسی ہندوستانی

مجسٹریٹ ایسے بھی تھے جو ملازمت کے لحاظ سے بہت سینئر تھے مگر وہ یورپیوں کے مقدمات سننے کے اہل نہ تھے اس کے برعکس جونیئر ترین انگریز مجسٹریٹ اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ لارڈ رپن نے اس نسلی امتیاز کو ختم کر دینا چاہا چنانچہ اس کی کونسل کے ایک لاء ممبر مسٹر البرٹ نے نسلی امتیاز کو ختم کرنے کا بل پیش کیا جو البرٹ بل کہلایا۔ اس بل سے یورپین بالخصوص انگریز بہت سیخ پا ہوئے اور انھوں نے اس بل کی شدید مخالفت کی۔ بالآخر لارڈ رپن کو یہ بل منسوخ کرنا پڑا۔ اس سے ہندوستانیوں میں شدید ردّ عمل پیدا ہوا۔

انڈین نیشنل کانگریس

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کو اس بات کا احساس فرو رہو گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔ انھوں نے تمام ہندی باشندوں پر یہ تاثر ڈالنا چاہا کہ انگریز کا حکم ناقابل تسخیر ہے لیکن حقیقت میں وہ عوام کے جذبات وخیالات سے خائف ہونے لگے تھے اس خوف کے پیش نظر انگریز نے ایک ایکٹ پاس کیا جس کا نام البرٹ ایکٹ رکھا گیا۔ یہ ایکٹ ۱۸۸۳ء میں نافذ کیا گیا اور اس ایکٹ کی رو سے ملک میں جاری ہونے والے تمام اخبارات کو پریس آزادی سے محروم کر دیا گیا اور کسی بھی ہندوستانی باشندے کو بغیر وجہ بتائے گرفتار کیا جا سکتا تھا اور بغیر مقدمہ چلائے ملک بدر کیا جا سکتا تھا۔

۱۸۸۲ء میں یعنی اس سے ایک سال پیشتر مارکوئیس آف رپن وائسرائے ہند کے زمانے میں لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ پاس ہوا۔ جس کے تحت میونسپل کونسلیں اور ضلع کونسلیں قائم ہوئیں۔ لیکن جو طریقہ کار ان کونسلوں میں حصہ لینے کا مقرر کیا گیا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہندوؤں کو پہنچا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے انگریز نے ایک خاص قسم کی ملی بھگت کر کے مسلمانوں کے خلاف انتقامی نوعیت کی سازش کی تھی۔ اس دوران میں ہندوؤں نے انگریزوں سے شیر وشکر ہو کر اس کے کان اس قدر بھرے کہ انگریز کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن مسلمان ہی ہے اس لیے اگر وہ عوامی سطح پر مسلمانوں کو کوئی قانونی رعایت دینا بھی چاہتا تھا تو وہ محض ہندوؤں کی وساطت سے ہی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو انفرادی لحاظ سے بحیثیت الجماعت انگریز ایک لمحہ بھی برداشت نہ کرنا چاہتا تھا۔ انگریز کو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی سخت گیری کی وجہ سے مسلمانوں کو اس طرح ذہنی طور پر ضربیں لگی ہیں کہ ان میں اب سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔ ہندو کو چونکہ انگریز کی طرف سے موافقانہ رویہ نصیب ہوا تھا اس لیے اس کو سیاسی اعتبار سے قدرے زیادہ مراعات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ہندو نے کچھ طرح مکارانہ انداز میں انگریز کے سامنے ہاتھ باندھ کر مسلمانوں کو بدنام کیا تھا اور خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں کی نو سو سالہ پرانی حکمرانی کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس لیے اس کو موقع مل گیا کہ انگریز

کی سرپرستی میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سماجی نوعیت کی مختلف انجمنیں محدود طریقے پر تشکیل کرے چنانچہ انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی ایسوسی ایشن، ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن، مہاجن سبھا (مدارس) اور سروجنک سبھا (پونہ) وغیرہ یہ تمام ایسی انجمنیں تھیں جو سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی جھلک بھی رکھتی تھیں۔ اس صورت حال میں انگریز چاہتا تھا کہ ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے کچھ نہ کچھ مقام حاصل ہو ہی جانا چاہیے۔ ان کی آواز کو موثر انداز میں ایک مرکز سے سننے کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو برطانیہ میں حزب فی لفظ کی نوعیت کی جماعت ہو، کیونکہ ہندوستان میں رہنے والی کوئی سیاسی جماعت انگریز کے لیے تعمیری پروگرام تو پیش کر ہی نہیں سکتی تھی بلکہ اس جماعت کے ذریعے ہندوستانیوں کو پہنچنے والے دکھوں کی آوازیں ضرور حکومت انگلینڈ کے کانوں تک پہنچ جائیں گی۔

مسٹر ایلن آکٹارسین ہیوم (ALLAN OCTARSIAN HUME) جو ایک اعلیٰ درجے کے برطانوی سرکاری عہدے دار تھے نے معلوم کیا کہ ملک میں سیاسی بے چینی پھر بڑھنے لگی ہے اور خفیہ سازشوں کا انتظام ہونے لگا ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی گورو اور چیلے مسلمانوں سے آزاد ہونے کے بعد اب اس کوشش میں ہیں کہ سا ہوکاروں کو لوٹ لیا جائے اور ملک میں بدامنی و بدانتظامی کا دور دورہ کیا جائے اور پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے۔ چنانچہ دکن میں اس سلسلے میں کچھ بلوے بھی ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر ہیوم فی الفور شملہ گئے اور وائسرائے لارڈ ڈفرن (LORD DUFFERIN) نے اس سے اس صورت حال پر تفصیل سے بات کی اور ساتھ ہی اس نے تجویز پیش کی کہ آل انڈیا سطح پر ایک ایسی سیاسی جماعت بنانے کے لیے اہل ہند کو اجازت دے دی جائے جس طرح ہر میجسٹی ملکہ وکٹوریہ کی اپنی حزب مخالف موجود ہے اس حزب مخالف کے پاس اگرچہ کوئی عملی اختیارات نہیں ہوتے لیکن اس کی وساطت سے وگرگوں نوعیت کے معاملات کا پتہ چلتا رہتا ہے اور مخالفین کی دل سوزی، اعتراضات اور مطالبات بن کر سامنے آتے رہتے ہیں اور ہر حکومت کو ہر قسم کے حالات سے آگہی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنی منظوری اور کچھ تجاویز کے ساتھ لارڈ ہیوم کو اس وقت انگلستان روانہ کیا تاکہ وہ اکابرین سلطنت یعنی لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ، مرجان برائٹ، مسٹر ریڈ اور مسٹر سلیگ وغیرہ سے مل کر صلاح مشورہ کر کے ہندوستان ایک سیاسی جماعت کانگریس کی تشکیل کی جائے۔ اس صلاح مشورے میں ہیوم کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور وہ ۱۸۸۵ء کے وسط میں واپس ہندوستان لوٹ آیا۔ اب اس کے پاس ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کے لیے ایک اچھا ڈھانچہ موجود تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کا اعلان

مسٹر ہیوم ہندوستان کی بالکل نئی اور اولین سیاسی جماعت کی تشکیل کا

ڈھانچہ اپنے آقاؤں سے منظور کرا کے جب واپس لوٹا، تو اس نے فی الفور اس کی باقاعدہ تشکیل کا اعلان کر دینا مناسب سمجھا۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو ٹھیک بارہ بجے دوپہر گوگل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی کے ہال میں ایک بنگالی عیسائی مسٹر بینرجی (MR. BANNERTJI) کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین کی تعداد ۷۲ رہی۔ ان میں بیشتر قانون دان اور معلم حضرات تھے۔ ان میں مسلمان صرف دو تھے۔ مسٹر ڈبلیو سی۔ بینرجی (W-C. BANNERTJI) نے اپنے خطبۂ صدارت میں سب سے پہلے انگریزی راج کی برکتیں گنوائیں۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کے فروغ اور عمدہ حکمرانی جس کو اس نے (ORDERLY GOVERMENT) پرستائش کیا اور انگریزی حکومت کو یقین دلایا کہ وہ اور ان کی جماعت ہمیشہ انگریزوں کی وفادار رہے گی۔ اس اجلاس میں کانگریس کی طرف سے جن اغراض و مقاصد کا اعلان کیا گیا۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر اور اہم نوعیت کے تھے۔

۱۔ ہندوستانی نمائندے کو حکومت میں نمائندگی دی جائے گی۔

۲۔ قومی وحدت کے لیے سعی کی جائے گی۔

۳۔ انگریز سے وفاداری کی جائے گی۔

۴۔ انفرادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

۵۔ مجلس قانون ساز بنائی جائے گی جس میں ہندوستانی عوام کے نمائندوں کو شریک ہونے کی اجازت ہوگی۔

۶۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی باشندوں کو شریک کیا جائے گا۔

۷۔ ملک میں ایک آئینی حکومت قائم کی جائے گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل خود انگریز کے دماغ کی اختراع ہے اس لیے اس کے ابتدائی صدر خود انگریز رہے۔ ان صدروں میں مسٹر جارج لیوٗل (MR. GEORGE YOLE) اور مسٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو ویڈربرن (MR. W.W WEDERBURN) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ابتدائی کانگریس کے ایک بہت ہی سرگرم رکن مسٹر بریڈلا (MR- BRADLANGH) کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

کانگریس کے قیام کا مقصد

کانگریسی ہندوؤں کی طرف سے انگریز کی خوشامد

دراصل یہ تھا کہ اسی جماعت

کے ذریعے ہندوستان کے باشندے اپنے دلی جذبات واحساسات کو حکومت تک اس مقصد کے لیے پہنچا سکیں کہ ان کو درپیش مسائل کا آسانی سے حل تلاش کیا جاسکے لیکن ہندو کی موقع پرستی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس وقت کانگریس کی تشکیل ہوگئی اور انگریز نے بڑی مہربانی سے اس کے قیام کی تصدیق کر دی تو ہندو ارکان پر کانگریس میں، بجائے جذبہ بے باکی پیدا ہونے کے جذبہ خوشامد ان کے ذہنوں پر چھا گیا اور ایک عرصہ دراز تک اس کے ساتھ خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہوتا رہا۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں کانگریس کے صدر مسٹر بینرجی نے ۲۸، دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا، "برطانوی گورنمنٹ کا پورا پورا اور مستقل خیر خواہ مجھ سے زیادہ اور میرے ان دوستوں سے زیادہ جو میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں ہے۔"

۱۸۸۶ء میں کانگریس کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی۔ "ہمیں مردوں کی طرح بولنا اور اعلان کرنا چاہیے۔ کہ ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک انگریز کے وفادار ہیں۔ ہم ان فوائد کو سمجھتے ہیں جو انگریزی حکومت نے ہم کو عنایت کیے ہیں۔ ہم اس تعلیم کی دل سے قدر کرتے ہیں جو ہم کو دی گئی ہے۔ اور اس نئی روشنی کی جو ہم پر ڈالی گئی ہے۔ ہمارے اندھیرے کو اس نے اجالا کر دیا" اس جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے دادا بھائی نوروجی نے سابقہ حکومتوں پر بالواسطہ نکتہ چینی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ انگریز کی آمد سے ہم کو یہ نیا سبق ملا کہ "بادشاہ رعایا کے لیے بنائے گئے ہیں لیکن رعایا بادشاہوں کے لیے نہیں ہوتی۔" اس فقرے کا واضح مطلب یہ ہے کہ سابقہ حکمرانوں نے رعایا کو بھی ذاتی ملکیت سمجھ کر استعمال کیا تھا۔

۱۸۹۰ء میں ایک سرگرم کانگریس رکن سر فیروز شاہ مہتا نے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری وفاداری کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے ہوگیا ہے ایک بعد ایک وائسرائے نے ہمارے وفادارانہ پر امن مقاصد اور کوششوں کی پرزور شہادت دی۔" ہسٹری آف کانگریس" کے مصنف مسٹر شیارامیا اپنی کتاب کی جلد اول بیان کرتے ہیں۔

"ابتدائی زمانے میں کانگریس کو اپنی وفاداری کے مظاہرے کرنے کا شوق تھا۔ جب ۱۹۱۴ء میں لارڈ پینٹ لینڈ گورنر مدارس، کانگریس کے پنڈال میں آئے تو صرف یہی نہیں کہ ایوان کے تمام آدمی ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے اور انھوں نے تالیاں بجائیں۔ بلکہ مسٹر اے۔ پی پیڈر و کو جو مہم پر جانے والی ہندوستانی فوج کے بھیجنے پر تقریر کر رہے تھے۔ روک کر سر سریندر ناتھ بینرجی سے کہا گیا کہ تاج کے ساتھ وفاداری کے ریزولیشن کی تحریک کریں اور انھوں نے بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا۔

انگریز اس خوشامد سے پوری طرح آگاہ تھا اور اس نے اس سیاسی جماعت کی توجہ سیاسی طور پر تعمیری کام کی طرف لگانے کی بجائے اپنی ہی مہربانیوں کی طرف لگائے رکھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کانگریس ہندوستان کے باشندوں کی سیاسی جماعت نہیں بلکہ انگلش کانگریس تھی۔ انگریز چیئرمین کی وساطت سے اس کانگریس کو دس ہزار سے پچاس ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ مل جاتی تھی۔ اجلاس کی صدارت کے لیے بالعموم برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کئی سال تک گلیڈسٹون جو برطانوی وزیراعظم تھا کی سالگرہ مناتی رہی۔ اس سے بڑھ کر خوشامد اور کیا ہوگی کہ ایک سیاسی جماعت اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے ان کے وزیراعظم کی انفرادی حیثیت سے بھی تعظیم و تکریم کرتی رہی۔

انڈین نیشنل کانگریس کی آقا پرستی صرف ابتدائی سالوں ہی میں جاری نہ رہی تھی بلکہ ایک طویل مدت تک ہندوؤں نے انگریز کے تحکم کو تمام باشندوں پر اس طرح مسلط ہونے دیا جیسے ان کو ایک ناپسندیدہ حاکم سے نجات مل گئی اور ایک قابل قبول فرمانروا کی اطاعت میں لذت محسوس ہو رہی ہو اور آزادی کی سانس لینے کے لیے انگریز کی فرماں برداری میں عین مصلحت جانی اور کوئی اپنی برتری پیدا کرنے کی بجائے فرنگیوں کی برتری کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ ہندو کی اس سست روی سے مسلمانوں کے مشتعل جذبات میں کمی پیدا ہونی شروع ہوگی اور آخر کار ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں کی عظمت کو مستقل طور پر نیچا دکھانے کے لیے انگریز کے خفیہ پروگراموں میں شریک ہونا شروع کر دیا۔ انگریز نے بھی سیاسی میدان میں ہندوؤں ہی کی زیادہ حوصلہ افزائی کی تاہم اس اس نے اپنے وقار میں فرق نہ آنے دیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد میں بالعموم لفظ "ہندوستانی" استعمال کیا گیا۔ اس لفظ سے اس کا بظاہر مطلب یہ تھا کہ وہ ہر شخص جو ہندوستان کا باشندہ ہو، اس میں مسلمان یا ہندو یا عیسائی کا کوئی امتیاز نہیں۔ چنانچہ اس طرح کی فضا بحال رکھنے کے لیے چند ایک بارسوخ ہندوؤں نے چند ایسے مسلمان برگزیدہ شخصیات سے ناطے جوڑنے شروع کر دیے جن کی معاشرے میں کچھ آواز تھی لیکن حقیقت بر مبنی مسلمان کا وقتی طور پر ظاہری ملاپ ہندوؤں کی اس چال کا ایک حصہ تھا جس کے ذریعے اس نے انگریز کو سیاسی آزادی کے لیے ہموار کرنے کی راہ نکالنا تھی۔ اصل میں ہندو جانتا تھا کہ اگرچہ اس نے انگریز کی رائے کو سیاسی آزادی کے لیے ہموار کر بھی لیا یا سیاسی مراعات حاصل کرنے کی طرف مائل کر ہی لیا تو انگریز کو آئینی طور پر سب سے بڑا اعتراض یہ مل جائے گا کہ ہندوستان کی دوسری اکثریتی جماعت میں مسلمان کی کیا پوزیشن ہوگی۔ راہ ہموار رکھنے کے پیش نظر ہندو نے مسلمان کو اپنانے کی تکالیف برداشت کیں ورنہ جب کبھی بھی کسی ہندو لیڈر کے منہ سے لفظ ہندوستانی نکلتا ہے۔ اس کا مقصد کشور ہندوستان کا

ہندو باشندہ ہوتا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمان سیاسی انحطاط کے بعد بحیثیت قوم اس قدر گہرے گڑھے میں گر گئے تھے کہ انھیں اپنا سر اٹھا کر بھی دیکھنے کی قوت حاصل نہ تھی جو لوگ ان میں ذی مرتبت تھے وہ ذلیل و خوار ہو رہے تھے جو دانش ور تھے ان کی دانشوری نظام تعلیم بدل جانے کی وجہ سے تحیر و تغیر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ تاہم اس دور میں مسلمانوں میں ایک مرد جواں ہمت سر سید احمد خاں نے انگریز کا نہایت عمیق انداز سے مطالعہ کیا۔ اس کی نفسیات و سیاسیات کی گہرائی میں گئے اور ہندوؤں کی چال بازی کی باریکیوں کو سمجھ کر اپنے مسلمان کو ببانگ و دہل مطلع کرنے لگے زمانہ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ پرانی قدریں اور پرانے اصول و روایات بیکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ قدیم خیالات و تصورات متروک ہوتے جا رہے تھے اور خود ہندو اپنے آپ کو اس قدر تیزی سے انگریزی ماحول میں ڈھالتا جا رہا تھا کہ مسلمان اس کے مقابلے میں بے حد پیچھے رہ گئے تھے۔ ہندو نے انگریز کی قربت اس لیے جلد ڈھونڈنا شروع کی تاکہ وہ جلد از جلد انگریزی مضمرات سے واقف ہو کر ان کی زد میں مواد جمع کر سکیں۔ لیکن شروع کا شروع میں اس ہندو نے خود کو انگریز کا بہت بڑا حامی سمجھ کر انگریز سے بہت زیادہ ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ہندو نے اپنی مسکین مزاجی اور چرب زبانی سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن مسلمان اپنی پرانی اقدار اور پرانے انداز فکر ہی پر نازاں رہتا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہندو "ہزار پا" کی مانند اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ گہرے گاڑتا جا رہا تھا اور جہاں کہیں کسی مفید نتیجے کا تعلق ہوتا تھا۔ انگریز کو اس کے لیے کسی ہندو سے مناسب شخص نہ ملتا تھا۔ کیونکہ انگریزی پڑھنے اور سمجھنے میں یہ لوگ مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو انگریزی تعلیم کے میدان میں بہت آگے رہتا تھا تاکہ پڑھ لکھ کر کسی انگریزی دفتر میں ملازم ہو جائے اور سرکاری رازوں کو نہایت خوش اسلوبی سے رازداری کے صیغوں سے نکال کر منظر عام پر لایا جائے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں باقاعدہ ایک جماعت کی شکل میں متعدد افراد اس بات کی شاکی تھی کہ انھیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہا ہی کیوں جاتا ہے لیکن ان مخلص مسلمانوں نے یہ نہ سوچا کہ چند ایک سال میں اگر مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ہندو کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے تو یہ پھر کبھی نہیں ان کے ہمراہ ہو سکتے اور اس مسلمان کی تعلیمی کمزوری سے ہندو کو بہت تقویت پہنچے گی چنانچہ اس خیال کے پیش نظر سر سید احمد خاں نے اعلان کیا کہ تمام مسلمان مل کر انگریزی تعلیم حاصل کریں اور انگریزی معاشرے کو سمجھنے کے لیے خود کو اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں۔ تاکہ وہ انگریز کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہو جائیں اور ہندو کو اپنی برتری قائم کرنے کا موقع نہ مل جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس ہندوؤں کے صرف ایسے مقاصد کی پرورش کے لیے وجود میں [illegible]۔ جس سے صرف ہندو طبقے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ چنانچہ ہندو نے نہایت چاپلوسی سے انگریز

کو یہ بات سمجھا دی کہ انڈین نیشنل کانگریس میں لفظ ہندوستانی سے مراد صرف مسلم، سکھ، عیسائی نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف ہندو باشندہ ہے۔ چنانچہ اس ہندو نے سیاسی چالوں کے ساتھ مسلمانوں کی مخالفت میں اضافہ کر دیا۔" سیاسیات ملیہ"، از محمد امین زبیری میں درج ہے کہ ہندو نے اپنی مطلب براری کی فطرت کے عین مطابق کانگریس کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا۔ کبھی تو نہایت ہی خوشامدانہ انداز اختیار کیا اور کبھی باغیانہ انداز میں گفتگو سے بھی گریز نہ کی۔ کبھی تو انگریز کی ستائش و حمایت میں جلسے منعقد کیے جاتے لیکن کبھی حکومت پر نکتہ چینی پر مبنی کسی قسم کا لٹریچر جو نہایت باغیانہ انداز میں تحریر ہوتا تھا اور تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہندو کے اس رویے کو دیکھ کر خود لارڈ ڈفرن نے اہل کلکتہ کی ایک الوداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عوام کو بالخصوص اور بنگالی اخبار نویسوں کو بالعموم یہ بات کہی جاتی ہے کہ کوئی فرد دوسرے فرد کو حکومت کے خلاف کسی قسم کا اشتعال نہ دلائے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے گا تو بہت ممکن ہے کہ ۱۸۵۷ء والے واقعات پھر رونما ہونے لگیں۔ اس پر کانگریس نے نہایت مدبرانہ غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ انگریز کے بارے میں کوئی ایسا جملہ جلسے میں استعمال نہ کیا جائے جس سے اس کی شہرت پر زد پڑتی ہو۔

کانگریس کی تشکیل میں انگریز کی سازش

انگریز نے انڈین نیشنل کانگریس اور اس کے طرز عمل کا بھی نہایت غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جو مقاصد لے کر یہ کانگریس تشکیل پائی تھی وہ اگر پورے ہو جائیں تو انگریزی حکومت آج نہیں تو کل ضرور لرزاں ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بھانپ لیا کہ بیشتر مسلمان ہندوؤں کے جھانسے میں نہیں آنا چاہتے۔ وقتی تقاضوں کے لحاظ سے یہ ایک گونہ تقلید میں یا اپنے اکابرین ملت کے پیش نظر کچھ مسلمان اس میں ضرور شریک ہو گئے لیکن انگریزوں نے ان دونوں بڑی قوموں میں کانگریس کے معنی بیان کرتے ہی پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی۔ انگریز نے اپنوں ہی کی وساطت سے مسلمانوں کے دلوں میں انڈین نیشنل کانگریس کے خیال یہ بتائے کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جس میں صرف ہندو لوگ بحیثیت قوم آزاد زندگی گزاریں گے چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کا ترجمہ ہندوستانی قومی اجتماع بتایا گیا۔ اور ہندوستانی سے مراد ہندوستان کا ہندو قرار دیا گیا۔ اسی لفظی ترجمے ہی سے مذہبی منافرت کی ابتداء ہو گئی۔ انگریز کے اس منافقت کے بیج کو بہت بڑے خاردار درخت کی صورت دینے کے لیے بہت جتن بھی کیے۔ تاکہ اہل ہندان کانٹوں میں الجھ کر رہ جائیں اور خود اپنے ہی ہاتھوں زخمی ہو کر رہ جائیں۔ سرسید احمد خاں انگریز کی اس چال کو نہایت زیرکی سے جان گئے تھے چنانچہ انھوں نے فی الفور اعلان کیا کہ انگریزی تعلیم کا حصول مسلمانوں کی بقاء کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس لیے انھیں یہ صرف انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف نہایت حوصلہ مندی سے قدم اٹھانا چاہیے بلکہ اسی تعلیم

کی مدد سے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے بھی کوششیں جاری رکھنا چاہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں سرسید احمد خاں نے ذاتی کوششوں سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اہتمام بھی کیا اور اس کانفرنس میں جو دسمبر ۱۸۷۷ء میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوئی۔ بہت سے اہم فیصلے کیے گئے جن میں مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کا تناسب، کونسلوں میں طریق انتخاب پر نظر ثانی اور مقابلے کے امتحانوں میں مسلمانوں کو تناسب کے لحاظ سے شرکت کرنے کی اجازت وغیرہ شامل تھی۔

اب سرسید احمد خاں نہایت بے باکی سے ہندو کے خلاف تنقید کرنے لگے۔ ۱۸۸۸ء میں انھوں نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندو چالوں سے ہمیں نقصان پہنچایا جارہا ہے۔ سیلف گورنمنٹ کی تشکیل کے سلسلے میں انگریزوں نے جن دھاندلیوں سے کام لیا وہ اس بات کی دلیل تھیں کہ مسلمان کو زیادہ سے زیادہ پس پردہ رکھا جائے۔ چونکہ ہندو کی یہ سازش شروع ہی میں فاش ہوگئی تھی اس لیے مسلمان شروع ہی میں محتاط ہوگئے تھے۔ انھوں نے کانگریس کے گمراہ کن پروپیگنڈے کا جواب دینے کی غرض سے ایک جماعت "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" بنائی۔ اس جماعت نے دو سال تک نہایت مؤثر انداز میں کام کیا۔ بعد میں سرسید کی توجہ زیادہ تر علی گڑھ تحریک کی طرف مبذول ہوگئی جس نے پورے ہندوستان میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس لیے دو سال کے عرصہ کے بعد مذکورہ ایسوسی ایشن خود بخود ختم ہوگئی۔

انڈین نیشنل کانگریس میں ہندو انگریز سازش کو مسٹر حسن ریاض مصنف "پاکستان ناگزیر تھا" نے اس طرح بیان کیا ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے بڑی ذہانت سے ہندوستان میں اپنے سیاسی تجربات استعمال کیے۔ مسلمانوں کو ان کی تہذیب، تمدن، علم اور سیاسی اقتدار کے بلند مقام سے گرا کر اور بالآخر ان پر معاش کے تمام دروازے بند کرکے اور حکومت کی تعزیری سے ڈرا کر اطاعت پر مجبور کیا اور ہندوؤں کو یہ یقین دلایا کہ برطانیہ کی طاقت و سنگینوں کی حمایت میں ان کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا موقع دیا جائے گا اور اپنی وفاداری پر آمادہ کیا۔ جس انداز کی پارلیمنٹری حکومت کا ۱۸۶۱ء میں آغاز کیا گیا وہ صاف اسی نتیجے کی طرف اشارہ تھی۔ سرسید نے اس ہولناک انجام سے بچانے اور اتنی مہلت حاصل کرنے کے لیے کہ اعلیٰ تعلیم پاکر مستقبل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں۔ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے الگ رہ کر انگریزوں کا اعتماد حاصل کریں۔ اس طرح انگریزوں نے اپنی وفاداری کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رقابت پیدا کر دی۔

انگریز کی جانب سے رقابت کے بیج نے آخر کار دو ہی وفادار لو دا پیدا کیا۔ جس کی توقع تھی کہ کانگریس کے ارکان رفتہ رفتہ متعصب ہندوؤں کے گروہوں کی شکل اختیار کر گئے۔ ان دریدہ دہن اور بد نیت

ہندوؤں کی کثیر تعداد نے مسلمانوں کے لیے کانگریس کے دروازے کسی حد تک بند ہی کر دیے۔ مشہور کانگریسی لیڈر "بال گنگا دھر تلک" آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی لالہ لاجپت رائے اور بی سی پال ان متعصب ترین کانگریسیوں میں شمار ہوتے تھے۔ جنھوں نے اپنی شخصیت سے سوائے مسلم دشمنی کے اور کوئی کام نہیں لیا۔ ان لوگوں کے بدعزائم کو دیکھ کر سرسید احمد خاں نے احتیاط برتتے ہوئے مسلمانوں کو سیاست سے وقتی طور پر الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی۔

مستقبل میں پیش آنے والے لاتعداد تاریخی واقعات نے ثابت کر دیا کہ کانگریس مخلوط سیاسی جماعت نہیں تھی۔ بلکہ یہ ہندو قوم کی ایک اہم سیاسی جماعت تھی۔ جس کا مقصد سب سے پہلے مسلمانوں کو ہر طرح کمزور کرنا اور ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنا تھا۔ ایسی آزادی جس میں نہ تو کوئی انگریز کا عمل دخل رہے اور نہ ہی کسی مسلمان کا۔ دیانند سرسوتی نے کانگریس کے ایک جلسے میں برملا اعلان کیا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے اور ہم مسلمانوں کو ایک غیر ملکی قوم گردانتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اب بھی انھی ملکوں کو لوٹ جائیں جہاں سے یہ ہندوستان میں آئے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل سے مسلمانوں کا ردعمل

انڈین نیشنل کانگریس کا بظاہر قیام ایک ایسی جماعت کا وجود پذیر ہونا تھا۔ جو ملک کے تمام مکاتب فکر و مذاہب کے افراد کی مشترکہ نوعیت کی جماعت تھی۔ اور جس کا ایک مشترکہ نصب العین اور لائحہ عمل ہو لیکن واقعات و حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ جماعت صرف ہندوؤں کی ایک موثر سیاسی جماعت تھی۔ جس کو انگریزوں کی واضح حمایت حاصل تھی اس طرح یہ جماعت ایک ایسے فریق کے کنٹرول میں تھی جو پہلے ہی مسلمانوں کا ازلی دشمن تھا۔

ان حالات کو دیکھ کر سرسید احمد خاں نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کو اس قسم کی جماعت میں شامل ہونے سے بہتر تو یہ ہے کہ اس کی رکنیت ہی حاصل نہ کی جائے اور سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی جائے تاکہ مسلمانوں کے بچے آسانی سے تعلیم حاصل کر سکیں۔

اس کانگریس کی تشکیل ہی نے برصغیر ہندوستان میں دو قومی نظریے کو ہوا دی اور عوام میں احساس پیدا ہوا کہ ہندو بحیثیت محکوم تو بہت تابعدار رعایا کی حیثیت سے رہ سکتے تھے لیکن سیاسی برتری حاصل ہونے کے بعد اور انگریز سے قار ورہ مل جانے کے بعد وہ مسلمانوں کے ایسے دشمن بن گئے جن کو وہ ایک پل بھر کے لیے بھی ہندوستان میں نہ دیکھنا چاہتے تھے جس کا صاف اور واضح نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان من حیث الجماعت ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سیاسی جماعت نے نہایت مردانہ وار

کانگریس جیسی بوقلموں جماعت سے سیاسی مقابلہ کیا اور آخرکار اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئی۔

سرسیّد اور کانگریس

سرسید احمد خاں پہلے مسلمان رہنما تھے جنھوں نے کانگریس کے خوف ناک عزائم کا اپنی خداداد بصیرت سے اندازہ کر لیا تھا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس جماعت سے الگ رہیں۔ اپنی مختلف تحریروں میں، تقریروں میں، نجی مجالس میں اور نجی خطوط میں، انھوں نے بار بار مسلمانوں کو ہدایت کی کہ موجودہ حالات میں ان کا اس تنظیم میں شمولیت اختیار کرنا سیاسی لحاظ سے سخت نقصان کا باعث ہو گا۔ سرسید کی اس تنبیہہ سے مسلمانوں پر جو اثر ہوا وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اس تنبیہہ سے ہندو ایک اور رنگ میں متاثر ہوئے۔ انھوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لی اور اپنے مطلب کے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ ذیل میں ایک خط درج کیا جاتا ہے جس کے مطالعے سے ہندوؤں کے اندازِ فکر میں تبدیلی اور کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے متعلق سرسید احمد خاں کے نقطۂ نگاہ کا علم ہو جائے گا۔

۱۸۸۸ء کا واقع ہے کہ گجرات (پنجاب) کے ایک مسلمان رئیس اور آنریری مجسٹریٹ شیخ غلام حسین نے مسلمانانِ گجرات کی طرف سے سرسید کو ایک خط لکھا جس میں ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ "ہمارے شہر کے ہندوؤں میں آج کل انڈین کانگریس کا بڑا زور ہے اور یہاں کے ہندو ہم مسلمانوں کو بھی کانگریس میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔"

اس کے جواب میں سرسید نے شیخ غلام حسین صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"مکرمی شیخ صاحب! سلام مسنون۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گجرات کے مسلمان اب ہر معاملے میں میری رائے یعنی ضروری خیال کرتے ہیں۔ میں خداوند تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ مسلمان مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور مجھے اس لائق جانتے ہیں کہ میں سیاسی طور پر ان کی رہنمائی کروں۔ ملک ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کانگریس بھی انھی کی جماعت ہے اس جماعت کی کارگزاریوں کا فائدہ ان کو ہی پہنچتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مسلمانوں کی شرکت سراسر زیاں اور نقصان دہ ہے میں اپنی تقریر مطبوعہ ۲۸، دسمبر ۱۸۸۷ء کی ایک جلد انجمن اسلامیہ گجرات کی رہنمائی کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ میں نے کتاب کے صفحہ ۹ پر ضروری نشان لگا دیا ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد میری رائے کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

علی گڑھ

سید احمد"

اسی زمانے میں سر سید احمد خاں کے متعلق مدارس کے مشہور انگریزی اخبار "ہندو" نے ایک مضمون شائع کیا جس میں لکھا کہ سر سید نے اپنی سیاسی پالیسی تبدیل کر لی ہے۔ اس کے جواب میں سر سید احمد خاں نے ۲۲ ستمبر ۱۸۹۳ء کو الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار "پایونیر" کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا جس میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کانگریس کے متعلق بھی اظہار کیا۔ ذیل میں ان کی اس تحریر کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"چند سال ہوئے جبکہ انڈین نیشنل کانگریس نے اوّل اوّل شور و غل کیا کہ میں نے اپنی پبلک اسپیچوں میں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ اس کانگریس کی خطرناک۔ ۔ ۔ اور گمراہ کرنے والی تحریک سے بالکل الگ رہیں اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ کانگریس کی رپورٹوں میں اپنے مسلمان ممبروں کو بہت کچھ بڑھایا جاتا ہے لیکن اگر غور سے امتحان کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک بھی بڑا معزز شخص مسلمانوں میں سے اس میں شریک نہیں ہوا اور مسلمان امراء اور اشراف عموماً کانگریس کے شور و غل میں شریک نہیں ہوئے اور کانگریس معقول طور پر اپنے اس دعویٰ کو صحیح ثابت نہیں کر سکتی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور آرائے اور خواہشوں اور امیدوں کو ظاہر کرتی ہے۔"

گویا سر سید احمد خاں نے نہ صرف مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی تلقین کی بلکہ کانگریسی رہنماؤں کے اس غلط دعویٰ کی بھی تردید کر دی کہ یہ ایک غیر مذہبی جماعت ہے۔ اس میں ہندو ہی نہیں مسلمان بھی شامل ہیں انھوں نے صاف لکھ دیا کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ شاید ان کی روشن ضمیری نے ان کے پردۂ ذہن پر مستقبل کے واقعات منعکس کر دیے تھے۔ جب کانگریس یہ دعویٰ کرنے والی تھی کہ یہ ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے اور اسے ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کی نیابت کا بھی حق حاصل ہے۔

سر سید کے دور میں ان کے علاوہ تمام بڑے بڑے اور ذی اثر مسلمان بھی کانگریس کے خطرناک عزائم سے آگاہ ہو گئے تھے اور سب نے سر سید احمد خاں کی پیروی میں مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی تلقین کی تھی۔ ذیل میں اس عہد کے بعض مسلمان اکابر کی آراء جو انھوں نے اس فرقہ وارانہ جماعت کے بارے میں ظاہر کیں درج کی جاتی ہیں۔

نواب محسن الملک اور کانگریس

سر سید کے معاصرین میں نواب محسن الملک بڑے پائے کے مسلمان رہنما گزرے ہیں۔ جن کی ملی خدمات اور اسلامی دردمندی کسی تعارف و تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس زمانے کے ایک اخبار "لوکن بجٹ" نے ان کی نسبت یہ خبر شائع کی کہ وہ کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب ممبر لیجسلیٹو کونسل ممالک مغربی و شمالی و اودھ اور رئیس علی گڑھ نے اس کی تردید میں ایک نوٹ شائع کیا۔ ذیل میں

یہ تار بھی درج کیا جاتا ہے۔

"دکن بجٹ اخبار نے اپنے اخبار مطبوعہ ۱۵ ستمبر میں یہ فقرہ چھاپا ہے کہ ہم نے حیدر آباد میں اسی مشتبہ ذریعہ سے سنا ہے کہ ہمارے سابق پولیٹکل اور فنانشل سیکرٹری نواب مہدی علی بھی کانگریس والا ہو گئے۔ گزشتہ زمانے میں کبھی وہ اس تحریک میں کھلتے تھے لیکن خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی رائے اس مسئلہ پر درست تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہندوؤں کے زیر حکومت نہیں ہو سکتی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ کوئی دور اندیش ہندو گزشتہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد کبھی یہ امید کر سکتا ہے کہ مسلمان دیدہ و دانستہ نیشنل کانگریس کے اصول کو قبول کرلیں گے۔ مسلمان انگریزوں کی حکومت قبول کرلیں کیونکہ انھوں نے فتح کیا ہے لیکن کیا بات ہے جو کہ ہندوؤں کی حکومت کو قبول کرلیں گے جبکہ ہندو سات سو برس تک مسلمانوں کے غلام رہے۔ کیا نیشنل کانگریس اس سوال کا صاف جواب دے سکتی ہے؟ کیا یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ انگلش سنگینوں سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ یہ نہیں کریں گے۔"

"مگر ہم دکن بجٹ کو غیر مشتبہ ذریعے سے اطلاع دیتے ہیں کہ جو امر اس نے مشتبہ ذریعے سے سنا ہے کہ نواب مہدی علی بھی کانگریس والا ہو گئے ہیں محض غلط اور جھوٹ ہے وہ علی گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں اور جس طرح ہمیشہ سے ان کی رائے نیشنل کانگریس کے مخالف تھی اب بھی ان کی وہی رائے ہے کوئی ذی عقل اشراف مسلمان نیشنل کانگریس کو پسند نہیں کر سکتا۔ نہ اس میں شریک ہو سکتا ہے۔"

شمس العلماء مولانا نذیر احمد اور کانگریس

عہد سر سید کے دوسرے قابل ذکر بزرگ شمس العلماء مولانا ڈپٹی نذیر احمد تھے جو اپنے علم و فضل، اپنی ذاتی قابلیت، اپنی وسیع النظری اور اپنی ملّی خدمات کے لحاظ سے بجا طور پر اردو ادب اور مسلمانان ہند کے محسن کہلانے کے مستحق ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی کانگریس کی سرگرمیوں اور اس کے خطرناک عزائم کے پیش نظر مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کانگریس میں شامل نہ ہوں۔ انھوں نے تو صاف الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کانگریس سے تعاون کرنا قومی غیرت و حمیت کے خلاف ہے۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ٹاؤن ہال دہلی کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے جو لیکچر دیا تھا اس کے بعض اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"چند اصحاب نے اصرار کیا (ہے) کہ نیشنل کانگریس کی نسبت میں اپنے خیالات علی رؤس الاشہاد ظاہر کروں۔ انھوں نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ تمہارے خیالات معلوم ہونے سے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ مسلمانوں کے فائدہ کا نام سن کر میں نے نقض عادت کیا اور بے تامل آپ لوگوں میں آ کھڑا ہوا۔۔۔

کانگریس کی شرکت ہم مسلمانوں کے حق میں مہلک ہے۔(چیرز) خرابی اور بڑی خرابی ہم مسلمانوں کی ہے کہ ہم مذہب رکھتے ہیں محکم، مضبوط، استوار، اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء (چیرز) کہ انقلاب دنیا کی آندھیاں اس کو جنبش بھی تو نہیں دے سکتیں۔ ہمارے پاس لٹریچر ہے جس نے ایک وقت تمام روئے زمین کو ہلا مارا تھا (چیرز) وہ ہمارے دلوں کی تسلی ہے۔ ہماری جان کی توانائی، ہماری آنکھوں کا نور، ہماری روحوں کا سرور، ہمارے پاس علوم ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر انگریزوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر لیے ہیں مگر آخر ہیں تو ہمارے۔ غرض ہماری عظمت کے نشان ماند پڑ گئے ہیں مگر مٹے نہیں (چیرز) میرا ریزیف یہ ہے اور یہ ارزیف (دلی یقین) مبنی ہے ساری عمر کے تجربہ پر کہ کارفرمائی جیسی ایک مسلمان کر سکتا ہے۔ ہندوؤں سے نہیں ہو سکتی (چیرز) کارفرمائی کی شرط اعظم ہے خودداری، ذاتی تعزز، فورس آف کیرکٹر، (نیک چال چلن) ہمت جرأت اور یہ حرارت مسلمانوں کے خون سے ابھی تک تو نکلی نہیں الغرض ہمارا کیس ایک اسپیشل کیس ہے اس کی روئیداد کسی طرح ہندوؤں کی روئیداد سے نہیں ملتی۔ ہندو جب زور دیں گے کثرت اور انگریزی دانی پر، یہی جگہ ہمارے یہاں پانی مرنے کی ہے چیرز پس ہم کو ہندوؤں کی رفاقت ضرور نقصان پہنچائے گی نیشنل انڈین کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہماری حمیت تو گوارا نہیں کرتی کہ ہندوؤں کے طفیل بن کر دنیوی مفاد حاصل کریں گو وہ مفاد کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔"

نواب وقار الملک اور کانگریس

عہد سرسید کی تیسری قابل ذکر شخصیت نواب وقار الملک کی ہے۔ نواب صاحب حیدرآباد دکن کے ریونیو سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری، سرسید کے جانشین، علی گڑھ مسلم کالج کے منتظم اعلیٰ، اپنے عہد کے بہت بڑے مدبر، نہایت ذی علم بزرگ اور مسلمانان پاک و ہند کے عظیم رہنما تھے۔ انھوں نے ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاست میں جو سرگرم حصہ لیا اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔ نواب وقار الملک نے بھی اپنی تقریروں اور تحریروں میں کانگریس کے اغراض و مقاصد اور اس میں مسلمانوں کی شرکت کے نتائج پر اظہار خیال کیا اور مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اس جماعت میں شامل نہ ہوں۔ ان کے عہد میں کانگریس نے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی تحریک کو تیز کر دیا تھا اور انھیں بعض عہدے بھی دینے شروع کر دیے تھے تاکہ اس جماعت کی نمائندہ حیثیت مسلم ہو جائے اور مسلمانوں میں اس کے خلاف جو نفرت پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے۔ نواب وقار الملک نے کانگریس کی اس چال کو بھانپ لیا اور اپنے ایک مضمون میں اس طرف بھی اشارہ کیا۔ ذیل میں نواب صاحب کی اس تاریخی تقریر اور قیمتی مضمون کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"جناب سرسید مرحوم و مغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور و ممنون ہیں۔ نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور ان کی حفاظت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگریس میں شریک ہونے سے باز رکھیں اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت تک وہی ہے۔"

"نیشنل کانگریس بعض مسلمانوں کو اپنی پریسیڈنٹی کے عہدہ تک سے سرفراز فرماتی ہے لیکن پھر کیا وہ مسلمان بزرگوار مسلمانوں کے کسی کام کے ہوتے ہیں۔ ہمارے وہ ایک دفتری کام کے بھی نہیں ہوتے۔ اس طرح اگر اپنی قوم کی اور حقوق کی قربانی کر کے کسی نے کوئی ممبری حاصل بھی کی تو ایسی ممبری انھی کو مبارک رہے قوم کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوگا بلکہ ایسے ممبر قوم کے حق میں بعض اوقات سخت مضرت کا موجب ہوں گے کیونکہ جب وہ ظاہر میں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ کونسل میں نشست کریں اور وہ ووٹ وہ دیں جو مسلمانوں کے قومی حقوق کو پامال کرنے والا ہو تو ایسے ووٹوں سے مسلمانوں کو بہ نسبت خالص ہندو صاحبوں کے بہت زیادہ نقصان پہنچ جاوے گا۔"

یہ اس دور کے چند مسلمان اکابر کی آراء ہیں جو بطور نمونہ درج کی گئی ہیں ورنہ کانگریس کے عزائم کے پیش نظر اس عہد کے اکثر و بیشتر قابل ذکر مسلمان نہ صرف کانگریس سے علیحدہ رہے بلکہ اپنے زیر اثر مسلمانوں کو بھی اس فرقہ وارانہ جماعت میں شامل ہونے سے روکتے رہے اس میں شک نہیں کہ گنتی کے چند مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے سرسید اور ان کے ہم خیال اصحاب کی آراء سے اتفاق نہیں کیا اور کانگریس کے پلیٹ فارم ہی کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مرکز بنایا۔ مگر ان میں سے جن لوگوں کی زندگی نے وفا کی انھیں تلخ تجربات ہوئے اور آخر کار ایک دن انھیں اس فرقہ پرست جماعت سے الگ ہونا پڑا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئیں؟ اس کا اندازہ زمانۂ مابعد کے ایک مشہور کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے :۔

"وہ دن کس کو بھولے نہیں جب کانگریس میں کرائے کے مسلمان لائے جایا کرتے تھے محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہیں اور کانگریس صحیح معنوں میں نیشنل باڈی ہے۔"

سوال یہ ہے کہ کیوں ایسے ذی شعور مسلمان اتنی تعداد میں کانگریس میں شامل نہیں ہوتے تھے جن کی گنتی پوری کرنے کے لیے کرائے کے مسلمانوں کو کانگریس کے جلسوں میں لانا پڑتا تھا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے میں کانگریس نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جن کی وجہ سے مسلمان ان تحریکوں

سے بدظن ہو گئے تھے جن کی زمام کار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی ان کی معاشی حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ وہ فاقہ کشی پر مجبور تھے۔ تعلیمی لحاظ سے وہ اکثریت کے صوبوں میں بھی نہایت پس ماندہ تھے۔ ہندو زمیندار ان پر طرح طرح کے مظالم کر رہے تھے ادھر کانگریس جیسے انگریزوں نے محض اپنے مخصوص مفادات کے لیے قائم کیا تھا اب اعتدال پسند ہندوؤں کے تسلط سے آزاد ہو کر انتہا پسند ہندوؤں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ اس لیے مسلمان ایسی کسی تنظیم میں شامل ہونا سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اپنے حق میں مضر سمجھتے تھے جو حکومت سے ٹکر لے رہی ہو کیونکہ ابھی ان کی حالت اس قابل نہ ہوئی تھی کہ وہ بیک وقت ہندو اور انگریز دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ذیل کی تصریحات سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت مسلمان کن مصائب سے گزر رہے تھے۔

مسلمانوں کی معاشی حالت

صوبہ اڑیسہ جو کبھی بنگال کا حصہ تھا اور جہاں مسلمانوں کا طوطی بولتا تھا۔ جہاں تجارت، صنعت اور امارت غرض ہر شعبے میں مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ قیام کانگریس کے قریبی زمانے میں اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں کے لیے جہنم بنا ہوا تھا۔ اس عہد کے مسلمانوں نے اڑیسہ کے کمشنر کے نام ایک درخواست بھیجی تھی۔ جسے سر ولیم ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب میں درج کیا ہے۔ اس درخواست کے مطالعے سے اس عہد کے ہندی مسلمانوں کی حالت زار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دردناک درخواست کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"مسلمانان اڑیسہ کو اتنا پیسا گیا ہے کہ ان کے دوبارہ جی اٹھنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ ہم لوگ نسلاً شریف مگر پیشے کو دیکھتے ہوئے نادار ہیں۔ حکومت نے ہمیں اپنی سرپرستی سے محروم کر دیا ہے۔ ہم ان مچھلیوں کی طرح ہیں۔ جنھیں پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ ہم مسلمانوں کی حالت زار حضور والا کے گوش گزار اس لیے کی جا رہی ہے کہ آپ ملکہ معظمہ کے نائب ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی تمام اقوام وملل کے ساتھ رنگ ونسل کا امتیاز کیے بغیر یکساں سلوک کیا جائے گا۔ ہمیں سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا گیا ہے اور اب ہم نادار اور مایوس ہو کر اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اگر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور سائبیریا کے ہولناک جنگلوں میں جانے کو کہا جائے اور بیس روپے ماہوار بھی دیے جائیں تو ہم یہ زحمت اٹھانے سے بھی انکار نہیں کریں گے بلکہ اس میں بھی خوشی محسوس کریں گے۔"

بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا جو اڑیسہ کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔

بنگالی مسلمانوں کا زور توڑنے اور انھیں ذلیل و خوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی اور نہایت منظم طریقے سے ہندوؤں کو آگے لایا گیا چنانچہ

"سندربن کے کمشنر نے ایک سرکلر جاری کیا کہ سرکار میں جو عہدے خالی ہوئے ہیں، ان پر ہندوؤں کو مقرر کیا جائے ان کے سوائے اور کسی کا تقرر عمل میں نہ لایا جائے" مسٹر ہنٹر لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی حالت اب اتنی خراب ہو گئی ہے کہ اگر ان میں وہ اہلیت موجود بھی ہو جو کسی سرکاری عہدے کے لیے ضروری ہے تو ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ یہ عہدے ان کے لیے شجر ممنوعہ ہو جاتے ہیں ان کی بے بسی قابل رحم ہے اور اعلیٰ سرکاری افسروں کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کے وجود تک کو تسلیم کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔"

تعلیمی حالت

یہ دو صوبوں کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور ملازمتوں سے بے دخل کیے جانے کا وہ نقشہ ہے جو کسی مسلمان نے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم نے کھینچا ہے غیر مسلم بھی اس قوم کا فرد جو مسلمانوں کو غلام بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں اقتصادی، تہذیبی اور تعلیمی اعتبار سے بھی پس ماندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کی حالت کس قدر بے بس و بے کسی کی ہو گی جسے دیکھ کر ایک انگریز بھی چیخ اٹھا۔ اقتصادی پہلو کے بعد مسلمانوں کا تعلیمی پہلو بھی نہایت کمزور تھا۔ سرکاری رپورٹوں اور ذاتی معلومات کے بعد سرسید کے قابل فرزند سید محمود نے اس دور کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا ایک جائزہ مرتب کیا تھا۔ اس کے مطابق اگرچہ سابق صوبہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی یعنی ۵۳ فیصد مگر ۱۸۰۳ء کی رپورٹ کے مطابق مسلمان طالب علم کل طلباء کا ۲۵ فیصد تھے۔ ایسا کیوں تھا اس کا جواب حکومت مدارس کی ایک رپورٹ سے مل جاتا ہے یہ رپورٹ ۱۸۷۳ء کی ہے اس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ:۔

"موجودہ تعلیم کا طریقہ اس طرح وضع کیا گیا ہے جو ہندوؤں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اس سے مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ درس گاہوں میں مسلمان طلبہ کی کمی حیرت کی بات نہیں بلکہ اگر کوئی حیرت کی بات ہے تو وہ یہ کہ مدرسوں میں ان کا وجود برقرار کیسے ہے"

برعکس اس کے ہندو نہ صرف انگریزوں کی دی ہوئی تعلیمی مراعات سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے بلکہ ان کے مخیر اور متمول اکابر اپنی قوم کی تعلیمی ترقی کے لیے ذاتی خرچ سے بھی تعلیمی ادارے قائم کر رہے تھے۔ بنارس کا ہندو کالج جو بعد میں ہندو یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا ۱۸۱۶ء میں قائم ہو چکا تھا اس کے بعد ۱۸۲۰ء میں بمقام پونا ہندو کالج قائم ہوا۔ ۱۸۳۰ء میں ہندو کالج کا قیام

عمل میں آیا اور رفتہ رفتہ ہندو اسکولوں اور ہندو کالجوں کا سارے ملک میں جال بچھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو روز بروز تعلیمی لحاظ سے ترقی کرتے گئے اور مسلمان روز بروز جہالت کے عمیق گڑھے میں گرتے چلے گئے۔ اس کا ایک سبب وہی تھا جو ہندو اور انگریز کی سازش سے اس نظام تعلیم کی صورت میں رونما ہوا جو ہندوؤں کی تعلیمی ضروریات کو کمال خوش اسلوبی سے پورا کرتا تھا، مسلمانوں کے لیے سخت نقصان کا موجب تھا اور جس کا اعتراف حکومت مدراس کی رپورٹ میں کیا گیا ہے۔

ہندو زمیندار اور مسلمان

مسلمانوں کو اقتصادی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ رکھنے کے لیے ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر جو سازش کی اس کا اجمالی خاکہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے ورنہ اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے مگر افسوس کہ اسی ظلم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لیے ہندوؤں نے نہایت شرمناک حربے استعمال کیے چنانچہ ایک انگریز افسر مسٹر جیمس اوکینیل کا بیان ہے کہ ۱۸۳۸ء میں پونا کے ایک ہندو زمیندار کشن رائے نے اپنے مسلمان کاشت کاروں پر ڈھائی روپے فی کس ایک محصول عائد کیا جسے وہ داڑھی ٹیکس کہتا تھا کیونکہ اپنے گاؤں میں اسے طاقت حاصل تھی۔ اس لیے وہاں کے مسلمانوں سے تو وہ بلا مزاحمت یہ ٹیکس وصول کرتا رہا مگر جب اس کے گماشتے سرفراز پور نامی گاؤں میں داڑھی ٹیکس وصول کرنے گئے تو وہاں ان دنوں (حضرت) سید احمد (شہید) کے ایک معتقد نثار علی عرف ٹیٹو میر اپنی جماعت کے ہمراہ موجود تھے۔ انھوں نے کشن رائے کے ان گماشتوں کو قید کر لیا۔ جب کشن رائے کو اس واقع کی خبر ہوئی تو اس نے ہندوؤں کی ایک جمعیت جو تین سو افراد پر مشتمل تھی، مقابلے کے لیے بھیجی۔ ٹیٹو میر سے ان لوگوں کی جنگ ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کا جانی نقصان کے علاوہ املاک کا بھی نقصان ہوا۔ ان کے مکان نذر آتش کر دیے گئے اور ایک مسجد بھی جلا دی گئی۔"

ایک طرف تو ہندو مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے، ان کے عقائد کے ساتھ مذاق کرنے اور انھیں نیست و نابود کرنے کے لیے اپنے سارے ذرائع استعمال کر رہے تھے اور دوسری طرف ان پس ماندہ اور کمزور انسانوں کے خلاف انگریزوں کو مشتعل کر رہے تھے تاکہ اگر ان میں کچھ جان باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی ختم ہو جائے اور جو مسلمان اکابرین کو پس ماندگی کے گہرے غار سے نکالنے اور ایک آبرومند قوم بنانے میں کوشاں ہیں۔ انھیں کامیابی حاصل نہ ہو۔ چنانچہ یہی انگریز افسر یعنی مسٹر جیمس اوکینیل رقم طراز ہیں :۔

"ان حالات میں کہ مسلمان اخبارات اور بعض انگریز حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اس پستی سے نکال کر اس قابل بنائیں کہ وہ بھی امور مملکت میں حصہ لے سکیں تو ہندو اس اعلان کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک خاص گروہ (اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جنھوں

وہابی کے نام سے پکارا جاتا تھا) ایسے لوگوں کا موجود ہے جو حکومت کے وفادار نہیں اور ملک کے تمام مسلمانوں سے انھیں پوری ہمدردی ہے۔ "ہندو پیٹریٹ" میں ۲۶ اگست ۱۸۷۰ء کو ایک مقالہ شائع کیا گیا (یہ مضمون ایک بنگالی ہندو اہل قلم کا ہے) جس کا لب لباب یہ ہے کہ اس روشن عہد حکومت میں جب کہ رعایا کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جا رہا ہے مگر اس کے باوجود اس عہد کو ہم عاقلانہ نہیں کہہ سکتے۔ (کیونکہ) وہابیوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جس کا اثر ہندوستان کی تمام ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے ان کی تنظیمی کیفیت وہی ہے جو عیسائیوں کے اس فرقے کی ہے جسے یعقوبی فرقہ کہا جاتا ہے۔ وہابی لوگ بظاہر تو سرکاری عدالتوں میں محرر کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ تجارتی کاروبار میں منہمک رہتے ہیں اور ملک کی معاشرتی زندگی میں گھل مل جاتے ہیں لیکن اپنے حقیقی مذہبی طور طریقوں کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ لوگ نہایت خاموشی سے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم رہتے ہیں ان میں اتحاد عمل کا جذبہ موجود ہے ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی میں وہ سادگی اختیار کر لیں جو آغاز اسلام میں پائی جاتی تھی اس طرح یہ سیاسی برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں ان لوگوں سے سخت خطرہ ہے کہ زمانہ حال کی تہذیب کو اپنی درندگی سے تباہ نہ کر دیں۔"

اس اقتباس کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ہندو قوم مسلمانوں کو چکی کے دو پاٹوں میں ڈال کر پیس دینا چاہتی تھی۔ ایک طرف تو یہ لوگ انھیں خود ہر ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے تھے اور دوسری طرف انگریزوں کو ان کے خلاف بھڑکا رہے تھے تاکہ وہ مسلمانوں سے اور بدظن ہو کر ان پر زیادہ سے زیادہ تشدد کریں۔ اس طرح ہندوؤں کے لیے راستہ صاف ہو جائے اور کسی وقت مسلمان ان کے مدمقابل نہ بن سکیں۔ کیا ان حالات میں مسلمانوں کا ہندوؤں کی نیشنل کانگریس میں شامل ہونا اپنے قتل کے محضر نامے پر دستخط کرنے کے مترادف نہ تھا۔؟

کانگریس کے قیام کے بعد مسلم آزادی

کہا جا سکتا ہے کہ واقعات سطور بالا میں پیش کیے گئے ہیں ان کا تعلق اس عہد سے ہے جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اور کانگریس قائم ہی اس لیے کی گئی تھی تاکہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہی ہے کہ کانگریس کے قیام سے حالات میں کسی قسم کی بہتری پیدا نہیں ہوئی بلکہ ملک کی سیاسی فضا اور زیادہ خراب ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو کانگریس کو مسلمانوں کے لیے خواب آور دوا کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے تاکہ اس جماعت میں شامل ہو کر وہ سب کچھ بھول جائیں۔ ہندو ان پر مظالم کرتے رہیں اور وہ اس ڈر سے

اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کر سکیں کہ ان کو فرقہ واریت کا مجرم نہ ٹھہرایا جائے۔

کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اور اس واقعہ کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۸۹۳ء میں ہندوؤں نے ملک میں مسلم کشی کا بھیانک ڈرامہ شروع کر دیا۔ بمبئی اور اعظم گڑھ میں ہندو مسلم فسادات نے نہایت خون ریز صورت اختیار کر لی۔ ستمبر ۱۸۹۳ء میں کانگریس کے مشہور رہنما مسٹر بال گنگا دھر تلک نے پونا میں گنپتی کا دس دن کا ایک میلہ جاری کیا جس کے جلوسوں میں انگریزوں اور مسلمانوں کے خلاف (اشتعال انگیز) گیت گائے جاتے تھے۔ اس میلے میں ہندوؤں نے ایک مسجد میں مسلمانوں پر حملہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ انھی کانگریسی رہنما مسٹر تلک نے "انجمن انسداد ذبحۂ گاؤ" قائم کی اور گئو کشی کے خلاف سارے ملک میں وہ تحریک چلائی جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمان ذبح کر دیے گئے۔

ہندو مہاسبھا

اس کے چند سال بعد یعنی ۱۹۰۰ء میں مہاراجہ دربھنگہ نے "آل انڈیا ہندو مہاسبھا" کے نام سے ہندوؤں کی ایک خالص مذہبی تنظیم کی۔ اس کا دہلی میں بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس موقع پر ایک جلوس بھی نکالا گیا۔ مہاراجہ دربھنگہ نے اس کی قیادت کی۔ اس جلوس میں ایک لاکھ ہندو شریک ہوئے۔ قائد جلوس کے ہاتھوں میں ہندوؤں کی مقدس کتاب "وید" تھی جسے لے کر انھوں نے پا پیادہ سڑکوں پر گشت کیا۔ ابتداء میں اس تحریک کا نام مہامنڈل تھا۔ یہ ہندوؤں کی مذہب کے نام پر پہلی کھلم کھلا منظم تحریک تھی جس کا مقصد ہندوؤں کی طاقت کا علی الاعلان مظاہرہ کرنا تھا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہندو مہاسبھا کانگریس سے الگ اور اس کی مخالف جماعت تھی۔ یقیناً یہ کانگریس سے ایک الگ اور مستقل جماعت تھی مگر اسے کانگریس کا مخالف کہنا تاریخ سے واقفیت اور درجے کی نادانی ہے۔ زیادہ سے زیادہ محتاط الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کام کانگریس اپنے نام سے اور کھلم کھلا نہیں کر سکتی تھی وہ ہندو مہاسبھا سرانجام دیتی تھی اس لحاظ سے یہ جماعت کانگریس کا مثنیٰ اور اس کا چربہ تھی۔ اس کے قائدین میں اکثر و بیشتر کانگریسی رہنما شامل تھے اور اس کا مقصد میں خالص ہندو راج قائم کرنا تھا۔ سرن سی چیٹرجی، لالہ لال چند، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو غرض تمام قابل ذکر کانگریسی رہنما اس کے معاون و مددگار تھے۔ حتیٰ کہ مسٹر گاندھی جیسا شخص جو بہ ظاہر تمام عمر غیر فرقہ واریت کا درس دیتا رہا۔ ہرادوار میں اس کی شاخ "بھارت ورشیہ ہندو مہاسبھا" کے اجلاس میں شریک ہوا۔ مشہور کانگریسی پنڈت مدن موہن مالویہ نے اس اجلاس کی صدارت کی۔

یہ مالوی جی ایک زمانے میں بظاہر کانگریس کے مخالف تھے مگر اس کے بعد کانگریس کے کھلم کھلا ہم نوا بن گئے اور ایک موقع پر اپنے نظریات کا یوں اعلان فرمایا کہ "ہمیں کانگریس میں ضرور شامل ہونا چاہیے مگر زدائے اپنی جماعت (ہندو جماعت) کی بہتری کو ملحوظ رکھ کر دینی چاہیے"

یہ مالوی صاحب مومہا سبھا اور کانگریس دونوں سے وابستہ تھے۔ مسلمانوں کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ ذیل کے اقتباس سے جو انھی کی تقریر کا ایک حصہ ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"میں یورپین اور مسلمانوں پر چماروں کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر مجھے کسی ایسے ملک میں جانے کا اتفاق ہو جہاں اچھوتوں اور مسلمانوں اور یورپینوں کے بغیر اور کوئی نہ ہو، تو میں یورپینوں اور مسلمانوں کے ہاتھ کا پانی پینے کی بجائے چماروں اور اچھوتوں کا پانی پینا پسند کروں گا کیونکہ اچھوت میرے دھرم بھائی ہیں"

مسلمانوں کو چماروں سے بدتر سمجھنے والے انھی مالوی جی اور ان کے ہم مسلک کانگرسی ہندوؤں نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو اس قدر خراب کر دیا کہ کسی مسلمان کا کانگریس میں ایک باعزت اور باحمیت رکن کی حیثیت سے شریک رہنا ناممکن ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مالوی جی اور تلک جیسے فرقہ پرست کانگریسیوں کی روش اور ان کے خطرناک عزائم دیکھ کر مسلمان رہنماؤں نے اپنی الگ تنظیم قائم کرنے کے متعلق غور و خوض کرنا شروع کر دیا۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی انجمن

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں حصہ لینے یا اپنی الگ سیاسی تنظیم قائم کرنے سے سب سے پہلے سرسید نے روکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ساری توجہ معاشرتی اصلاح اور علوم جدید، کے حصول پر صرف کرنی چاہیے۔ جب قوم کا خاصا بڑا حصہ تعلیم یافتہ اور نئے خیالات سے روشناس ہو جائے تو مسلمانوں کو سیاسی میدان میں اترنا چاہیے۔ مگر حالات اس تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ سرسید کو بھی اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی اور انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی طرف توجہ دینی شروع کر دی، چنانچہ اس مقصد کے لیے ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو سرسید کے دولت کدے پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں اس عہد کے بہت سے قابل ذکر مسلم اکابر نے شرکت کی۔ جیسے نواب محسن الملک، خان بہادر، ڈپٹی برکت علی خاں، سید محمود، خان بہادر مولوی فرید الدین، خان بہادر مولوی زین العابدین، خان بہادر مرزا عابد علی بیگ، خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، خان بہادر شیخ الٰہی بخش اور حاجی محمد اسماعیل خاں۔ اس اجلاس میں علی گڑھ مسلم کالج کے پرنسپل مسٹر بیگ بھی شامل ہوئے اور بحث و تمحیص میں بھی حصہ لیا۔ اس بحث و تمحیص کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان نوجوان کانگریس میں شریک نہ ہونے پائیں۔ انھیں ہر قسم کی ایجی ٹیشن

سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ بلکہ ایک منظم اور محتاط طریقے سے ملک کے سیاسی معاملات میں حصہ لینا چاہیے۔ اگر اس مرحلے میں تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی سیاسی رہنمائی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ غلط رہنماؤں کے ہاتھوں میں نہ کھیلنے لگیں۔ آخر مسر سید کی تحریک اور نواب محسن الملک کی تائید سے یہ ریزولیشن پاس ہوا۔ کہ ایک ایسوسی ایشن "محمڈن اورئینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن اپر انڈیا" کے نام سے قائم کی جائے۔

چونکہ سرسید کے پیش نظر ہر وقت علی گڑھ مسلم کالج کی ترقی اور مسلمانوں کی تعلیمی برتری کے مقاصد رہتے تھے اور وہ عمر کے ایک ایسے مرحلے میں تھے جب انسان کے قومی جواب دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی پریشانیوں میں بھی مبتلا تھے۔ اس لیے یہ انجمن کوئی عملی کام نہ کر سکی۔ البتہ ... سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد جب یو پی میں ہندی اردو کا مسئلہ پیدا ہوا اور ہندوؤں کی کوشش سے جنھیں کانگریس کی حمایت حاصل تھی عدالتوں میں ہندی زبان رائج ہو گئی تو مسلمان اکابر نے محسوس کر لیا کہ اب سیاسی معاملات سے مسلمانوں کا قطع تعلق رکھنا ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوگا۔ چنانچہ پہلے مئی ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا۔ جس میں مسلمانوں نے عدالتوں میں ہندی زبان رائج کیے جانے کے خلاف سرکاری حکم پر کھل کر تنقید کی۔ اس کے دو ڈھائی ماہ بعد یعنی ۱۸۔ ۱۹ اگست ۱۹۰۰ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں نواب محسن الملک کی زیر صدارت ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک نے اس جلسے میں نہایت جوشیلی اور حوصلہ افزا تقریر کی جس کا اختتام ان الفاظ پر کیا کہ "مجھ کو امید ہے کہ ہماری کوششوں سے ملک کو اس دن کے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا جب کہ اردو کا جنازہ سرکاری دفتروں سے اٹھایا جاتا ہو"۔

یہ پبلک جلسہ دراصل مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا اور اس کا سہرا نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، محمد حامد علی خاں بیرسٹر بار ایٹ لاء، سید محمد شرف الدین بیرسٹر ایٹ لاء، "البشیر" اٹاوہ کے مدیر مولوی محمد بشیر الدین کے سر ہے۔ جنھوں نے اس اخبار کی روئیداد نہایت عمدگی سے اپنے اخبار میں شائع کی اور مسلمانوں کو سیاسی حقوق کے حصول کی غرض سے منظم ہونے کی تلقین کی۔ "البشیر" کے علاوہ اس عہد کے دور بہت سے مسلم اخبارات نے بھی انگریزوں کی ہندو نوازی اور نیشنل کانگریس کے اسلام دشمن رویے کے پیش نظر مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی سیاسی تنظیم کی طرف متوجہ ہوں۔

سیاسی انجمن کا قیام

آخر حالات کا رخ دیکھ کر اور نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد ۲۱، ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں مسلم اکابرین کا ایک اجلاس حامد علی خاں بیرسٹر کے دولت کدے پر منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک کی تحریک پر سید محمد شرف الدین بیرسٹر ایٹ لاء نے پہلے دن کے اجلاس کی صدارت کی، دوسرے دن کا اجلاس نواب وقار الملک کی زیر صدارت منعقد

ہوا۔ ان جلسوں میں جو قرارداد یں منظور ہوئیں ۔ ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خلاصہ درج کر دیا جائے۔ "اس جلسے کی رائے یہ ہے کہ مسلمانان ہندوستان کو ایک ایسی آرگنائزیشن (تنظیم) قائم کرنی چاہیے۔ جو اپنے سوشل اور پولیٹیکل معاملات اور ضروریات میں متفقہ طور پر کارروائی کر سکے۔ اس جلسے کی رائے یہ ہے کہ مقاصد متذکرہ بالا کو محفوظ رکھ کر کمیٹی کو دوسری قوموں کی نسبت معاندانہ برتاؤ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس جلسے کی رائے میں محمد حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لاء اور منشی احتشام الحق اور نواب وقار الملک بہادر نمائندوں کا ایک جلسہ عام کسی مناسب وقت پر منعقد کریں۔ ہر ضلع میں عام اشتہار کے ذریعے سے ایک جلسہ منعقد کیا جائے، جس میں عام طور پر مسلمان پبلک کو شریک ہونے کا موقع دیا جائے۔ اشتہار میں بتا دینا چاہیے کہ مسلمانان ضلع کی سوشل اصلاح اور پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کی غرض سے جلسے میں نمائندے منتخب کیے جائیں گے اور جلسے میں مجارٹی سے ممبروں کا انتخاب کیا جائے جن کی تعداد کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہو گی۔ ان ممبروں سے ضلع کمیٹی بنائی جائے گی۔ شرائط انتخاب یہ ہوں گی کہ منتخب شدہ ممبر تعلیم یافتہ مسلمان ہو اور کم از کم پانچ سو روپیہ سالانہ کی آمدنی رکھتا ہو اور یہ کہ وہ سرکاری ملازم نہ ہو۔ ہر ایک صوبے میں ایک لوکل کمیٹی قائم کی جائے گی۔ جس کے واسطے ہر ایک کمیٹی اپنے میں سے کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ پانچ ممبر نامزد کرے گی۔ جب تک اور صوبوں کی طرف سے سنٹرل کمیٹی کے لیے ممبر نامزد نہ ہوں اور روپیہ کی مدد حاصل نہ ہو اس وقت تک صوبجات متحدہ (یو پی) کی لوکل کمیٹی جہاں تک کہ اس سے ہو سکے گا سنٹرل کمیٹی کے بھی فرائض انجام دے گی اور اس کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ میں رہے گا۔ ہر ایک صوبہ کمیٹی کو بحسب ضرورت چندہ وغیرہ کے ذریعے سے فنڈ فراہم کرنا ہوگا۔ جس سے بقدر گنجائش ایک مناسب حصہ سنٹرل کمیٹی کو بھی دیا جایا کرے گا۔ اس کے بعد پریزیڈنٹ صاحب نے کہا کہ سب سے اہم کام یہ باقی ہے کہ کارروائی کے لیے کچھ چندہ اسی وقت ہونا چاہیے چنانچہ چندہ کی فہرست کھولی گئی اور اس وقت کا چندہ لکھا گیا اور صدر انجمن کے شکریہ کے بعد اجلاس برخاست ہوا۔"

ان قراردادوں کے مطالعے سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱۔ ۱۹۰۰ء کے قریب مسلمانوں نے بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے ان کے سماجی اور سیاسی حقوق کی حفاظت ناممکن ہے۔ اس لیے انھیں اپنی علیحدہ اور مستقل تنظیم قائم کرنی چاہیے۔

یہ تنظیم فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم نہ ہو یعنی ملک کی دوسری قوتوں کے ساتھ مخالفانہ طرز عمل اختیار نہ کیا جائے۔

۳۔ اسے عوامی تحریک بنایا جائے اور ہر ضلع میں جلسے کر کے اس کے اغراض و مقاصد سے مسلمان عوام کو باخبر کیا جائے۔

۴۔ ہر ضلع میں انتخاب کے ذریعے اس کے نمائندے منتخب کیے جائیں اور پھر ضلعی شاخیں قائم کی جائیں۔

۵۔ اس کا دائرہ وسیع کر کے ہر صوبہ میں اس تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے اور پھر ایک مرکزی ادارہ تشکیل دیا جائے جس میں ہر ضلع کے نمائندے شامل ہوں۔

۶۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں کے تین مسلمہ راہنماؤں کی ایک ایڈ ہاک کمیٹی قائم کی گئی۔

۷۔ اس کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسی اجلاس میں ایک فنڈ بھی قائم کر دیا گیا۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمان رہنماؤں کے ذہنوں میں کتنی وسعت تھی۔ ان کا شعور کتنا بیدار تھا اور تنظیمی ڈھانچہ بنانے کی ان میں کس قدر صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ اگرچہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور انڈین نیشنل کانگریس، مہا منڈل، "انجمن انسداد ذبیحۂ گاؤ" اور "مہاجن منڈل" جیسی تنظیمیں قائم کر کے مسلمانوں کو تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی لحاظ سے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر جب مسلمانوں نے اپنی پولیٹیکل ایسوسی ایشن یا سیاسی انجمن قائم کی تو اس کے اغراض و مقاصد میں صاف صراحت کر دی کہ یہ انجمن دوسری قوموں کے ساتھ معاندانہ برتاؤ سے اجتناب کرے گی۔ اس دور کے مسلمان رہنماؤں کی عالی ظرفی، رواداری اور عدم تعصب کا یہ ایک درخشندہ نمونہ ہے جس کی مثال برصغیر تو کیا ساری دنیا کی اقوام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

باب ۸

مسلمانوں کی تعلیمی تحریکیں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کا وہ اندوہناک باب شروع ہوتا ہے۔ جس میں نہ صرف ان کی سیاسی عظمت، معاشی ثروت، اخلاقی فوقیت اور ثقافتی شان و شوکت کا خاتمہ ہوگیا بلکہ انھیں زندگی کے ہر شعبے سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ان پر ترقی کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ جبکہ دوسری طرف ہندوؤں کو ہر طرح کی مراعات کا مستحق سمجھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کو گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے سب سے اہم مسئلہ اسلامیان ہند کے علمی، مذہبی اور ثقافتی ورثے کا تحفظ تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکست خوردہ مسلمان اپنے زوال اور انحطاط پر راضی ہو جائیں گے اور تاریخ کے اس فیصلے کو تسلیم کریں گے کہ فاتح قوم کے اثرات مفتوح قوم کے دل و دماغ کو بھی فتح کر لیتے ہیں اور وہ قوم آخر کار اپنی قدیم روایات سے نفرت کرنے لگتی ہے اور اس کے لیے صرف فاتح قوم کی نقالی سرمایۂ افتخار بن جاتی ہے لیکن اس تاریک دور میں کچھ ایسے مسلمان بھی موجود تھے جن کے دل نورِ ایمان سے منوّر تھے اور دین ملت کی خدمت کے لیے سخت بے تاب تھے۔ ان کی بدولت انیسویں صدی میں احیائے مذہب اور علمی ترقی کی تحریکیں رونما ہوئیں۔ یہ تحریکیں برصغیر کے مسلمانوں کی حیاتِ نو کا باعث بنیں۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو پسماندگی اور مایوسی و محرومی کے اندھیروں سے نکال کر مادی ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی۔

اس کے علاوہ علماء کرام کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو نظریات کی تقلید کا سدباب کرنے اور اسلام کے صحیح نظریات اور اعمال سے قوم کو روشناس کرانے کے لیے دینی مدارس کے قیام کو مسلمانوں کے مسائل کے حل تصور کرتا تھا۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، انجمن حمایت اسلام لاہور اور جامعہ ملیّہ اسلامیہ دہلی ایسے ملّی ادارے عالم وجود میں آگئے جنھوں نے رفتہ رفتہ ایک تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔

دارالعلوم دیوبند

حملہ آور کا مقابلہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ آگے بڑھ کر یا اپنے آپ کو قلعہ میں محصور کر کے۔ تحریک علی گڑھ نے آگے بڑھ کر مغربی افکار کا مقابلہ کیا اور تحریک دیوبند نے قلعہ بند ہو کر۔ مؤخر الذکر کا طرز عمل یہ تھا کہ ہر مغربی چیز بری ہے۔ اس کے قریب ہی نہ جاؤ نہ انگریزی پڑھو، نہ مغربی معیشت اپناؤ۔ مگر اس طرز عمل نے اپنی انتہائی صورت میں یورپی علمی دور کی دونوں بنیادی خصوصیتوں۔ حواس ظاہری سے حاصل شدہ تجرباتی علم اور استدلالی طرز فکر۔ ہی سے دوری اختیار کرلی۔ اس روش نے انھیں حقیقت پسندی اور مبنی بر معقولیت سوچ دونوں سے محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے شرعی اور سیاسی دونوں معاملات میں ٹھوکریں کھائیں اور باوجود خلوص نیت کے برّ عظیم کے مسلمانوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں اور دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ مولانا موصوف مولوی رشید الدین دہلوی کے تربیت یافتہ تھے۔ جنھوں نے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبدالعزیز سے علمی فیض حاصل کیا تھا۔ گویا یہ دونوں تحریکیں ولی اللہی تحریک کے سرچشمہ سے فیض یاب تھیں۔ علی گڑھ تحریک نے شاہ ولی اللہ کے اس کام کو ہاتھ میں لیا۔ جس کا تعلق شریعت محمدیؐ کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنے اور مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے سے تھا اور تحریک دیوبند نے ان کے کام کے اس حصہ کو سنبھالا جس کا تعلق مختلف اسلامی فرقوں میں مفاہمت پیدا کر کے اسلامی معاشرے کو لبعد کی نقصان دہ رسوم سے پاک و صاف کرنے اور روحانیت اور شریعت کو ساتھ ساتھ رکھنے سے تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی جنھوں نے مدرسہ دیوبند کی توسیع کی اور اسے ایک بڑے دارالعلوم کا درجہ دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب کے سلسلہ بیعت میں داخل تھے۔ حاجی صاحب موصوف شاہ محمد اسحاق سے فیض یافتہ تھے، جو شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور جانشین تھے۔ حاجی صاحب ساری عمر مختلف اسلامی فرقوں کے اختلافات دور کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ مسائل نزاعیہ میں سے اکثر میں محض نزاع لفظی ہے اور مقصود متحد۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کے جو قوائد مرتب کیے ان سے اس تحریک کے ابتدائی رنگ پر روشنی پڑتی ہے۔

"اس مدرسہ میں آمدنی کی جب تک کوئی سبیل یقینی نہیں۔ اس وقت تک یہ مدرسہ انشاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی۔۔۔ تو یوں نظر آتا ہے کہ پھر یہ خوف و رجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔"

"سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران حاجی امداد اللہ نے تھانہ بھون کا انتظام سنبھال لیا۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی اس کام میں ان کے ساتھ تھے۔ انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو انھوں نے ان حضرات کے خلاف کارروائی کی۔ اس طرح یہ تحریک انگریز دشمنی کی نہج پر چل نکلی۔ سر سید احمد بریلوی کے ساتھیوں اور انھیں مالی امداد دینے والوں کے خلاف انگریزوں کی کارروائیاں، نیز ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم امراء پر انگریزوں کے مظالم پہلے ہی اس کے لیے پس منظر مہیا کر چکے تھے۔ مولانا محمد قاسم کے بعد مولانا محمود الحسن انگریز دشمنی کی پاداش میں جزیرہ مالٹا میں نظر بند ہوئے۔ مگر آپ مغربی تعلیم سے متنفر تھے بلکہ آپ نے علی گڑھ کالج کی طرف دست تعاون بڑھایا۔ آپ کے دست راست اور شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی تھے جو انگریز دشمنی کے سلسلہ میں تقریباً ساری عمر ملک سے باہر رہے۔ وہ بھی عام دیوبندی حضرات کے برعکس مغربی علوم سے متنفر نہ تھے، بلکہ صاف کہتے تھے کہ اسلام کا مستقبل مغربی تعلیم یافتہ حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ مگر حضرات دیوبند بالعموم مغربی تعلیم سے متنفر اور انگریز دشمنی کے باعث کانگریس کی تحریک وطنیت سے وابستہ رہے۔ جن سے بالآخر ہندو کو فائدہ پہنچا۔ مولانا محمود الحسن کے بعد مولانا حسین احمد مدنی دیوبند میں صدر مدرّس ہوئے۔ اگرچہ وہ زہد و تقوٰی میں اپنے بزرگوں کے صحیح جانشین تھے مگر سیاسی طور سے وہ بالکل ہی کانگریس کی گود میں چلے گئے انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔"

مسٹر اصفہانی اپنی انگریزی کتاب "جناح۔ جیسے میں انھیں جانتا ہوں" کے صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں کہ جون ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے شرکت کی۔ پہلے دن انھوں نے مسٹر جناح کی اس تحریک کی حمایت کی کہ مسلم لیگ کو آئندہ انتخابات میں حصّہ لینا چاہیے مگر آخری روز ان میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ انتخابات میں مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کے لیے بڑے مسلسل اور موثر پروپیگنڈہ کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے دیوبند کی خدمات حاضر ہیں۔ بشرطیکہ مسلم لیگ اس کے اخراجات برداشت کرے اور بطور قسط اوّل انھیں پچاس ہزار روپے ادا کرے۔ مسٹر جناح نے انھیں بتایا

کہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں کہ وہ ان کا مطالبہ پورا کر سکیں۔ مولانا صاحبان بہت مایوس ہوئے۔ بعد میں وہ کانگریس کی جانب لڑھک گئے جو ان کا مالی مطالبہ پورا کر سکتی تھی"۔

تحریک دیوبند میں روحانیت اور ظاہری شریعت کا حسین امتزاج تھا۔ ان لوگوں نے نقصان دہ اور غیر اسلامی رسوم دور کرنے کے سلسلے میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مگر ان کی کانگریس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔ سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے چند رفقاء کے، ان میں سے کسی قابل قدر ہستی نے تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیا۔ شروع میں یہ حضرات فرقہ پرستی سے بالا اور کٹر وہابیوں اور انتہا پسند بریلویوں کے درمیان راہ اعتدال پر گامزن رہے مگر بعد میں انھوں نے اپنی مصالحت پسندانہ روش ترک کر دی اور خود ایک فرقہ بن کر دوسرے فرقوں کے مقابل آ گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی وسعت نظری کو بھی ترک کر دیا اور روح اسلام کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر زور دینے اور جھگڑنے لگے۔ خاص طور پر ان کی انکار مغرب سے بیزاری نے انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث ان کے فکر کے سوتے خشک ہو گئے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ

انیسویں صدی کے آخر میں مغرب اور مشرق کی کش مکش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس عقلی و فکری کش مکش کے دور میں بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ اسی دور میں عربی مدارس اپنی تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ موجود تھے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام سرگرمی سے انجام دے رہے تھے مگر یہ مدارس نئے مسائل سے پیدا شدہ حالات پر اپنی زیادہ توجہ صرف نہیں کرتے تھے اور شاید یہ خیال کرتے تھے کہ آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت زیادہ ضروری ہے اور ان کے خیال میں اسی طریقے سے دین کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

اسی دور میں عربی مدارس میں نصاب تعلیم اپنی قدیم شکل میں جاری تھا اور نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ ان مدارس میں عام طور سے فلسفہ اور دیگر فرسودہ مضامین کی بھرمار تھی جبکہ قرآن اور حدیث کی تعلیم پر نسبتاً کم وقت صرف کیا جاتا تھا۔ دیوبند کے اکثر علماء نے ان فرسودہ مضامین خاص طور سے فلسفہ کی تعلیم پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اس نظام تعلیم میں طالبعلموں کی ساری طاقت اور صلاحیت باہمی جھگڑوں فلسفیانہ بحثوں منطقی موشگافیوں میں گذر رہی تھی۔ تاریخ

جغرافیہ، جدید علم الکلام اور دوسرے موضوعات جن کا تعلق قوموں کے عروج و زوال اور فلسفہ تمدن و اجتماع فکر و اجتہاد سے تھا، نظرانداز ہو رہے تھے پھر اسی دور میں علماء میں فراخ دلی فکری حوصلہ مندی کی بجائے فروعی اختلافات اور علمی طبقہ واریت کی اس قدر گہری تقسیم ہو چکی تھی کہ علماء کا شغل چھوٹے چھوٹے مسائل جن کا انسان کی عملی زندگی کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں پر بحث اور کفر سازی ہوتا تھا۔ ہندوستان کے اکثر علماء پر کفر کے فتوے عائد کیے گئے۔ دوسری جانب مغربی طرز تعلیم مسلمانوں میں مقبول ہو رہی تھی جس کے سبب نوجوان طبقہ میں نت نئے ذہنی مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ سرسید احمد خاں نے جس مقصد کے لیے کالج قائم کیا تھا وہ مقصد ابھی تک پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

ان تمام مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا محمد علی مونگیری نے ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ میں یہ طے کیا کہ علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے تاکہ خرابیاں مسلمانوں میں خصوصاً ان کی تعلیم میں واقع ہو گئی ہیں۔ ان پر غور و خوض کیا جائے اور علماء میں اتحاد کی صورت پیدا کی جائے اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء تجویز کیا گیا۔ مولانا محمد علی مونگیری کو اس کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل مقاصد طے پائے۔

۱۔ دینی مدارس کے طلباء کو دنیوی معاملات سے روشناس اور آگاہ کروانا۔

۲۔ علماء کے باہمی نزاع جس سے اسلام اور مسلمانوں کی توہین ہوتی ہے کو دور کرنا۔ ہندوستان کے تمام جید علماء نے اس تنظیم کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۴ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں نواب محسن الملک نے ایک قرارداد ندوۃ کی حمایت میں پیش کی جس کی سید محمود نے تائید کی سرسید احمد خاں نے بھی ندوۃ العلماء کے قیام کا خیر مقدم کیا اور اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کیا۔

دارالعلوم کے بانی مولانا محمد علی مونگیری کے ذہن میں جو خاکہ تھا۔ اس میں پہلی بات یہ تھی کہ علماء کی جماعت حالات حاضرہ، واقعات سے باخبر ہوں۔ طلباء صفائی کا خاص خیال رکھیں ان کے لیے ایک سی یونیفارم ہو۔ طلباء اخلاقی اور علمی مضامین پر مباحثوں میں حصہ لیا۔ دارالعلوم کے انتظامی خاکہ میں طلباء کے تہذیب و اخلاق اور تزکیہ نفس کو فراموش نہیں کیا گیا۔

اس تحریک کی اساس خالص دینی تھی اور اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی قرار دیا گیا تھا۔ اس تحریک میں طبقہ علماء کو مرکزی مقام دیا گیا۔ اس کا اولین بنیادی مقصد رفع نزاع باہمی تھا۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز اصلاح و ترقی نصاب کے

کام سے شروع کیا گیا۔

۲۵ دسمبر ۱۸۹۵ء کو مولانا سید عبدالحیٔ کو مددگار ناظم مقرر کیا گیا۔ جنھوں نے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ ۲ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ندوۃ کا دفتر لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اور اسی ماہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ابتدائی کلاسوں کا آغاز کر دیا گیا۔ دارالعلوم کے لیے گورنمنٹ نے وسیع اراضی مہیا کی۔ ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ سر آغا خاں اور نواب آف بہاولپور نے دل کھول کر ندوۃ کی مالی مدد کی۔ مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ سے استعفیٰ دے کر ندوۃ سے منسلک ہو گئے مگر ۱۹۱۳ء میں انھوں نے ندوۃ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل طلباء میں علامہ سید سلیمان ندوی جنھیں علامہ اقبال نے استاد الکل کا خطاب دیا مولانا عبدالسلام ندوی سید، نجیب اشرف اور مولوی ابو ظفر شامل ہیں جن پر ندوۃ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل طلباء برصغیر پاک و ہند کے مشہور علمی اور تحقیقی رسالہ معارف کو چلا رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اسلامیان برصغیر پاک و ہند کے تعلیمی اداروں میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے۔ جس کی بنیاد سالار کاروان حریت حضرت مولانا محمد علی جوہر نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی تھی۔ سرسید کے خلیفہ ثانی نواب وقار الملک نے ۱۹۱۲ء میں ان مسلمانوں کے واسطے جو سرکاری ملازمتوں کے خواہاں نہیں تھے۔ ایک جداگانہ جامعہ اسلامیہ قائم کرنے کی سکیم پیش کی۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ یہ نئی یونیورسٹی گورنمنٹ کے اثرات سے پاک ہو۔ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہو لیکن انگریزی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل درس رہے اور طلباء کی تعلیم میں مذہبی تربیت اور کفایت شعاری کی تعلیم کو خاص اہمیت ہو۔ نواب وقار الملک کے ان خیالات کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں عملی جامہ پہنایا گیا۔

بنیاد ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت اور عدم تعاون زوروں پر تھی۔ اس پروگرام میں سرکاری تعلیمی اداروں اور سرکاری مالی امداد کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل کے اجلاس میں ترک موالات پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جو لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں ان

سے ترک موالات کیا جائے، اسلامیہ کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کیا جائے اور کالج کی سرکاری امداد قبول نہ کی جائے۔" مولانا محمد علی جوہر اپنے قدیم کالج علی گڑھ پہنچے اور وہاں کے ارباب اقتدار سے مطالبہ کیا کہ سرکار کے ساتھ کالج کا تعلق ختم کر دیا جائے۔ منتظمین علی گڑھ نے اس مطالبے سے اتفاق نہ کیا۔ طلباء کی کثیر تعداد مولانا محمد علی جوہر کی ہم نوا تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کالج کو تو آزاد نہ کرا سکے لیکن انھوں نے اپنے حمایتی طلباء کو لے کر کالج کے ساتھ ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ کلاسیں درختوں کے سائے میں لگنے لگیں اور مولانا محمد علی جوہر نے شیخ الجامعہ کے فرائض سنبھال لیے۔

۱۹۲۵ء میں اس ادارے کو دہلی منتقل کر دیا گیا۔ جہاں جامعہ نگر اوکھلا میں اس کے لیے شایان شان عمارات تعمیر کی گئیں حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے حسن تدبر اور انتظامی قابلیت سے اس نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ اس درسگاہ پر انڈین نیشنل کانگریس کا گہرا اثر تھا اور یہ "حریت" کے ساتھ "متحدہ قومیت" کے لیے کوشاں تھی۔

اغراض و مقاصد

سر سید احمد خاں جس درس گاہ کا حسین خواب دیکھ رہے تھے اس کے متعلق انھوں نے خود کہا تھا کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج سر پر۔" علی گڑھ کالج ان کے خواب کی تعبیر نہ بنا اور سرکاری ملازمت کے حصول کو زندگی کی معراج سمجھ لیا گیا۔ وہاں مادیت اور ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملاتے لیکن مسلمانوں، مسلمان بادشاہوں اور اسلام پر اعتراضات کا انھوں نے کبھی جواب نہ دیا۔ دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علماء جدید مسائل کو نہ سمجھ سکتے تھے اور نہ حل کر سکتے تھے۔ لہٰذا قدیم و جدید علوم کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کرنا ضروری تھا۔ بانیانِ جامعہ کا مقصد و منشاء یہی تھا کہ مغربی اور اسلامی تعلیم کو بیک وقت حاصل کیا جائے اور اس کے طلباء سرکاری ملازمت کی تلاش سے آزاد ہوں۔

خصوصیات

یہ درس گاہ بہت سی خصوصیات کی حامل ہے اس کے اساتذہ نے ایثار و قربانی کی مثالیں قائم کیں۔ برصغیر اور یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل اساتذہ نے اعلیٰ ملازمتوں کو ٹھکرا کر معمولی تنخواہیں قبول کیں اور قومی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں جامعہ کے لیے وقف کر دیں۔ اس جامعہ کی دوسری نمایاں خصوصیت اساتذہ اور طلباء کی سادہ زندگی ہے۔ وہ بلند معیار زندگی کے چکر میں پڑ کر مادی فوائد کے پیچھے نہیں دوڑتے۔ قناعت

اور کفایت شعاری ان کا معمول ہے۔ صنعت و حرفت کی تعلیم اس کی تیسری بڑی خصوصیت ہے۔ سرکاری ملازمت کا حصول ان کا مقصد تعلیم نہیں۔ دست کاری کو طلباء کے لیے حصول معاش کا وسیلہ بنایا گیا بڑھئی کا کام، قفل سازی، کپڑا بننا، ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتوں کی تعلیم دی جاتی تاکہ طلباء عملی زندگی میں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ جامعہ کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہاں کی عملی زندگی ہے۔ جامعہ ملیہ اشاعت علم و ادب کا ایک مرکز بن گیا۔ ایک اردو اکیڈمی قائم ہوئی۔ دار الاشاعت جامعہ سے بہت سی قابل قدر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے کئی بچوں کے لیے ہیں۔

انجمن حمایت اسلام

سر سید احمد خاں کی تحریک نے جن صوبوں کے مسلمانوں کو متاثر کیا ان میں صوبہ پنجاب خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانان پنجاب کے لیے نہایت نازک تھا۔ نصف صدی تک سکھوں کی کی لی الہ نہ حکومت نے پنجاب کے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ان کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا وہ سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی غرض ہر لحاظ سے پس ماندگی کا شکار تھے۔ سکھوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب پنجاب پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا، تو اس علاقے کے مسلمانوں کو امن و سکون کا سانس لینا نصیب ہوا اور انھیں سکھوں کے ہولناک اور انسانیت سوز مظالم سے نجات ملی۔ مگر ابھی ان کی سیاسی بیداری، فکری تربیت اور سماجی ترقی کی شدید ضرورت تھی اور یہ عظیم کارنامہ انجمن حمایت اسلام نے سرانجام دیا۔ بلاشبہ اسی انجمن نے سابق پنجاب میں وہی کام کیا جو شمالی ہند میں سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک نے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انجمن حمایت اسلام کا قیام سر سید احمد خاں ہی کی تحریک کا مرہون منت ہے۔ چنانچہ انجمن کی "مختصر تاریخ" کے مولف خواجہ محمد حیات (پبلسٹی انچارج) نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"چودھویں صدی ہجری کا پہلا سال یعنی ۱۳۰۱ھ مسلمانان پنجاب کی تعلیمی ترقی کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا کیونکہ اس سال شروع ماہ جمادی الاول بمطابق مارچ ۱۸۸۴ء میں لاہور کے چند مسلمان جن کے دل قومی درد اور اسلامی جذبہ سے معمور تھے۔ ایک جگہ اکٹھے ہوئے تاکہ عیسائی مشنریوں کی مخالف اسلام ریشہ دوانیوں اور نئی جاری شدہ آریہ سماج کی تازہ معاندانہ سرگرمیوں کی روک تھام کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہندوستان کے قائد اعظم جناب سر سید احمد خاں بہادر علیہ الرحمۃ کی اٹھائی ہوئی آواز پر کہ "قوم کی پستی کا علاج دینی تعلیم کے ساتھ مروجہ تعلیم کے اجزاء میں مضمر ہے" غور کیا جائے اس مجلس مشاورت کا نتیجہ ایک جماعت کی تشکیل ہوا،

جس کا نام انجمن حمایت اسلام لاہور رکھا گیا۔"

اس انجمن کے قیام کا اعلان ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو ایک جلسہ عام میں کیا گیا۔ جو مسجد بکن خاں اندرون موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ جن اولین لوگوں نے اس انجمن کے قیام میں حصہ لیا ان میں منشی چراغ دین، قاضی خلیفہ حمید الدین خلیفہ عماد الدین، مولوی غلام اللہ قصوری، منشی پیر بخش، منشی عبد الرحیم خاں دہلوی، سید احمد علی شاہ دہلوی، حاجی سید شمس الدین، میاں کریم بخش رئیس اعظم لاہور، میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور و آنریری مجسٹریٹ، منشی محمد کاظم، ڈاکٹر محمد الدین ناظر، خان بہادر شیخ خدا بخش، منشی نجم الدین، شمس العلماء شمس الدین شائق، حافظ بہادر الدین، شیخ ایزد بخش، مولوی دوست محمد، میاں محمد چھوٹو، خان بہادر سید امیر شاہ، شیخ رحیم بخش، مولوی احمد دین وکیل اور مولوی عبد اللہ انجینئر کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

انجمن نے اپنی تعلیمی کوششوں کا آغاز دو پرائمری سکولوں سے کیا۔ اس مقصد کے لیے ابتداء میں جو سرمایہ فراہم ہوا وہ ۷۵۴ روپے پر مشتمل تھا۔ اس کے مستقل ممبروں کے لیے ۴ آنے ماہوار چندہ مقرر کیا گیا اور ڈھائی روپے ماہوار کرایہ پر ڈبی بازار کی حویلی سکندر خان میں ایک مکان حاصل کر کے اس میں اس انجمن کا دفتر قائم کیا گیا۔ انجمن کے پہلے صدر قاضی خلیفہ حمید الدین، پہلے جنرل سیکرٹری مولوی غلام اللہ قصوری، پہلے اسسٹنٹ سیکرٹری منشی چراغ دین و منشی پیر بخش اور پہلے خزانچی منشی عبد الرحیم خاں دہلوی مقرر ہوئے۔

بانیان انجمن اور معاونین انجمن کی پر خلوص کوششوں سے انجمن حمایت اسلام روز بروز ترقی کرنے لگی اور رفتہ رفتہ اس کے پرائمری اسکولوں کی تعداد ۶۳ تک پہنچ گئی۔ یہ اسکول لاہور شہر کے مختلف علاقوں کے علاوہ لاہور کی تحصیلوں چونیاں اور قصور میں بھی قائم کیے گئے۔ انھی میں سے ایک اسکول کو ترقی دے کر پہلے مڈل اور پھر ۱۸۸۹ء میں ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ جو اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ رفتہ رفتہ انجمن کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اس نے لاہور میں متعدد ہائی سکول زنانہ اور مردانہ بھی، متعدد ڈگری کالج طلبہ کے لیے بھی اور طالبات کے لیے بھی طب اسلامی کی سرپرستی کے لیے طبیہ کالج اور قانون کی تعلیم کے لیے لاء کالج قائم کیے۔ انجمن نے اپنی خدمات کے دائرے کو لاہور سے باہر گوجر خان اور کراچی تک پھیلا دیے۔ گوجر خان میں ایک ہائی سکول انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام قائم ہے۔ کراچی میں شانۂ اطفال کے نام سے سماجی بہبود کا ادارہ بھی انجمن ہی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ مگر اب وہ ایک مقامی تنظیم کے زیر اہتمام جاری ہے۔ انجمن نے تعلیمی خدمات

کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات کا بھی نہایت عظیم الشان ریکارڈ قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام یتیم بچوں، بچیوں اور بیوہ عورتوں کی فلاح کے لیے متعدد ادارے قائم کیے۔ جن میں اب تک ہزاروں یتیم اور بیوائیں تعلیم و تربیت اور پرورش پاکر معاشرے میں آبرومندانہ مقام حاصل کر چکی ہیں۔ انجمن کی درسگاہوں سے تعلیم پانے والوں کی فہرست نہایت طویل ہے اور ان میں بکثرت ایسے لوگ ہیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور مسلمانوں کی ہر ملی تحریک میں ہراول دستے کے طور پر کام کیا۔

انجمن حمایت اسلام صرف ایک تعلیمی و سماجی ادارہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے انجمن کے سالانہ جلسوں کو ہماری ملی جدوجہد میں نہایت نمایاں مقام حاصل ہے اس کے پلیٹ فارم سے ہر عہد کی ممتاز شخصیتوں نے مسلمانوں سے خطاب کیا اور قومی و دینی مسائل میں ان کی رہنمائی کی۔ انجمن کے ان جلسوں کے ذریعے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی و ملی بیداری پیدا ہوئی۔ سر فضل حسین، سر عبدالقادر، علامہ اقبال اور خلیفہ شجاع الدین جیسے اکابر اس انجمن کے صدر رہے۔ علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز ہی اس انجمن کے پلیٹ فارم سے ہوا اور انھوں نے اپنی نہایت فکر انگیز اور معرکتہ آلارا نظمیں جیسے نالۂ یتیم، شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام انجمن ہی کے پلیٹ فارم پر پڑھیں۔ انجمن نے اپنے تعلیمی و سماجی اور دینی مقاصد کی اشاعت اور اپنا پیغام عام مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے حمایت اسلام کے نام سے ایک جریدہ کی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ رسالہ پہلے ماہانہ تھا مگر ۱۹۲۶ء میں اسے ہفت روزہ کر دیا گیا اس وقت سے تا ایں دم یہ رسالہ نہایت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے ملک کے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور اخبار نویس اس شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری، سعادت حسن منٹو، رشید اختر ندوی، وقار انبالوی، نشتر جالندھری، ابو صالح اصلاحی، عبداللہ بٹ، مولانا صلاح الدین احمد اور بشیر محمد اختر نے مختلف اوقات میں اس کے فرائض ادارت سرانجام دیے۔ ہفت روزہ "حمایت اسلام" نے اپنا دائرہ صرف انجمن کی ترجمانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اعلیٰ درجے کے علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی مضامین شائع کر کے اس نے اردو ادب کے سرمائے میں بیش از بیش اضافہ بھی کیا۔ اس جریدے نے تحریک پاکستان کا پیغام عام کرنے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ قائداعظم محمد علی جناح دوسرے مسلم اکابر کی تقریروں، پیغامات اور ...... مسلم لیگی اجتماعات کی خبروں اور ان پر تبصروں کے ذریعے اس نے مسلمانوں کو ان کی منزل کا تعین کرنے میں بھرپور امداد دی۔ اس طرح انجمن حمایت اسلام نے پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی خدمت کرنے کے علاوہ ان میں حرکت و عمل کی روح بھی پھونکی اور انھیں ایک ایسی جدوجہد کے لیے تیار کیا جس کا نقطۂ آخر برصغیر میں ایک آزاد اور اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

آج کل مشہور سیاسی و سماجی رہنما میاں امیرالدین صاحب اس کے صدر، شفاءالملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی، مولانا غلام مرشد اور شیخ محمد لطیف صاحب ایڈووکیٹ اس کے نائب صدر، شیخ مقبول احمد صاحب اور خان ذوالقرنین خاں صاحب اس کے جنرل سیکرٹری اور خواجہ غلام دستگیر صاحب اس کے فنانشل سیکرٹری ہیں۔ انجمن کا سالانہ بجٹ نصف کروڑ سے بھی زیادہ۔ جو قوم کے بچوں کی تعلیمی و سماجی بھلائی پر خرچ ہوتا ہے۔

اُردو ہندی تنازعہ

ہندی یا ہندوی سے لفظی معانی میں ہر وہ چیز ہندوستانی ہے۔ مراد لی جاتی ہے۔ جہاں تک زبان سے اس کا تعلق ہے یہ کم از کم ابتدائی غزنوی تک چلی جاتی ہے۔ گیارہویں صدی کے البیرونی اور تحقیق سے لے کر اٹھارہویں صدی کے سراج الدین خان آرزو تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلم مصنفین اس نام کو مبہم انداز میں پنجاب دہلی یا دوآب کی بولیوں کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اسے مشترک محاوروں کے لیے بھی استعمال میں لایا گیا جو از اں بعد ایک علیحدہ زبان کی شکل اختیار کر گئی اور جسے بالآخر اردو کا نام ہو۔ دوسرے لفظوں میں قرون وسطیٰ کے مصنفین کی قریب وہ "ہندی" متعدد ہندی آریائی زبانوں پر مشتمل رہی ہے۔ یہ مختلف زبانیں دو گروہوں، مغربی ہندی اور مشرقی ہندی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے پنجابی، ہریانی، بانگرو، راجستھانی، بیرج بھاشا، بندیلی، قنوجی اور نگھی زیادہ مشہور ہیں۔ ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ متعدد مقامی نام اور مختلف شاخیں ہیں۔ سب کی سب ماسوائے پنجابی یا نگھی کے ایک ہی رسم الخط استعمال کرتی ہیں۔ قطع نظر اس کے یہ معمولی ادبی سرمایہ کی حامل رہی ہیں۔ اس رسم الخط کی بناء پر ان سب کو ہندی کے غیر واضح نام میں اکٹھا کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت میں یہ تمام بولیاں ایک دوسرے سے بڑی مختلف پائی گئی ہیں اس ضمن میں ایک اور نکتہ قابل بیان ہے۔ وہ یہ کہ اب بھی یہ مقامی طور پر متھرا سے لے کر بنارس تک بولی جاتی ہے۔ لیکن ان کی ادبی حیثیت زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی زبان اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جس "ہندی" نے اردو سے مناقشت کا روپ دھارا وہ ان سب سے مختلف زبان ہے۔ دراصل انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز افسروں اور کارکنوں کو ہندوستانی زبان سکھائیں۔ اور ساتھ ہی عیسائیت کے متعلق اس زبان میں معلومات شائع کریں۔ چنانچہ کئی اہم کتابیں لکھوائی گئیں اور نتیجۃً اردو نثر کے ذخیرہ پر اچھا اثر ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی کی ہمہ گیری کے حق میں یہ کالج بہت مضرت رساں

ثابت ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں وہ خیال ہندوستانیوں کے دماغوں میں بیج کی طرح بویا گیا۔ جو آہستہ آہستہ ایک خوفناک تناور درخت کی شکل حاصل کرکے تمام فضا میں مہلک اور زہر آلودہ پھیلانے لگا۔ اس کے قیام سے پیشتر اردو زبان کو ناگری رسم الخط لکھنے کا شاید ہی کسی کو خیال گزرا ہو۔ لیکن اس کالج کے چودھریوں نے اپنے ہندو منشیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس عام مشترکہ زبان کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا کے رسم الخط میں لکھیں کیونکہ فارسی رسم الخط ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے لیے غیر ملکی ہے۔ جس طرح ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل جول اور یکجائی کے بعد بھی جداگانہ طرز معاشرت اور ذہنیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ بے حد ضروری ہے کہ ان کا رسم الخط بھی ان کی ضروریات اور رجحانات کے مطابق علیحدہ ہو۔ ہندی کی ابتداء کی داستان بیان کرتے ہوئے ہندی ادب کی تاریخ کے مصنف۔ ایف کی اے رقم طراز ہیں۔

"ہندی بولنے والوں کے لیے ایک ادبی زبان کی ضرورت جو ان کے لیے قابل ہو محسوس کی گئی نتیجۃً اردو میں فارسی یا عربی کے الفاظ نکال دیے گئے اور ان کی جگہ سنسکرت یا ہندی کے الفاظ کو شامل کر لیا گیا۔"

لکھنؤ کے ایک درباری شاعر انشاء اللہ خان نے اپنی غیر سنجیدہ کیفیت مزاج میں ایک مختصر داستان عام بول چال کے محاورات میں لکھی۔ اس نے عربی اور فارسی کے الفاظ کو بالکل استعمال نہ کیا لیکن دور اندیش برطانوی سامراجیوں کے عزائم بے حد خطرناک تھے۔ انھوں نے اس قسم کی تحریک کو ایسے معمول سے آغاز سے تشبیہ دی جو آگے چل کر نہایت اہم نتائج کا سبب بنی۔ اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو جو تعلیم یافتہ بھی تھے۔ دو مخالف فرقہ ورانہ گروہوں میں آسانی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جان گلکرائسٹ نے سادل معرا اور للوجی لال کو ہدایت کی کہ وہ مسلمانوں کی فارسی زدہ ہندی یعنی اردو کی بجائے ہندوؤں کے لیے خصوصی ادبی ذریعہ کی تخلیق کریں۔

ان کوششوں کا پہلا ثمرہ ۱۸۰۹ء میں للوجی لال کی پریم ساگر کی صورت برآمد ہوا۔ اس کی تصدیق ایک مشہور ہندو عالم ڈاکٹر تاراچند نے کی۔ ان کے الفاظ میں "بعض حال کے ان ہندی مصنفین نے جدید ہندی کی ابتداء کی۔ اس داستان پر سخت احتجاج کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں ان کے یہ احتجاجات زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید ہندی کی ابتداء نشوونما ارتقاء کا بے لاگ مطالعہ (سنسکرت زدہ ہندی) صرف ایک نتیجہ نکالنے میں مدد دیتا ہے کہ یہ زبان صرف ۱۲۵ برس پرانی ہے اور شاید اس سے زیادہ نہیں۔ اگرچہ سادل معرا اور للوجی لال نے ہندی کے آغاز کے

متعلق اس سے بہت پہلے کی خبر دی ہے ۔ لیکن یہ سب کچھ غلط ثابت ہوتا ہے ۔ اور ایک تاریک دور کی طرف لے جاتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہی اس کی نشوونما شروع ہوئی اس سلسلے میں راجہ شیو اپرشاد ، راجہ لکشمن سنگھ ، بابو ہریش چندر اور دیگر حضرات کی خدمات قابل ذکر ہیں ۔ انھوں نے جدید ہندی ادب کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ۔"

یہاں یہ بات بیان کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کے اختیارات عطا کرتے وقت مغل حکمرانوں نے یہ ہدایت کی تھی کہ فارسی کو ہندوستان کی سرکاری زبان کی حیثیت میں استوار کیا جائے گا لیکن برطانوی سیاسی بالادستی نے مغل بادشاہوں کی اہمیت کو بے حد کم کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۳۲ء میں فارسی کو بڑی خاموشی کے ساتھ رخصت کر کے ہندوستانی کو رواج دینے کا فیصلہ ہوا ۔ کسی نے بھی اس آمرانہ فیصلے کے خلاف احتجاج نہ کیا ۔ لیکن حیدرآباد کے وزیر جناب سالار جنگ اوّل نے اپنی موت تک ۱۸۸۳ء اس تبدیلی کی پرواہ نہ کی اور انھوں نے نظام کے علاقوں میں فارسی کو جاری رکھا ۔ یہ مسلم ثقافت اور بالا دستی کی نشانی قرار دی گئی ۔ دوسری طرف اردو کے بدل بنانے پر لالوجی کی ہندی کے حامیوں نے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ کی ۔ اس ہندی نے اب تک کوئی خاص ترقی نہ کی ۔ درحقیقت سیاسی کیا ویلیائی لالو اور گلگرائسٹ تخلیق بہت عرصے تک بغیر اہم ادبی بدعت کے طور پر برقرار رہی ۔ اس اثناء میں اردو عملاً پورے ہندوستان میں دفتری زبان کے طور پر استعمال ہونے لگی ۔ یہ فارسی کا مؤثر جانشین ثابت ہوئی ۔ جدید علوم وفنون کے زمانے میں اسے دہلی کالج میں ذریعہ تعلیم بنایا گیا ۔ علاوہ ازیں اردو ، فارسی اور عربی الفاظ کے حامل ہونے کے باوجود یہ لازماً ایک ہندوستانی زبان ہے ۔

اردو کی ساخت ، آغاز وارتقاء کے متعلق مواد جو اس وقت موجود ہے ۔ اس کی چار قسمیں ہیں ۔ پہلی قسم کا مواد اردو شاعری کے ان تذکروں پر مشتمل ہے ۔ جو زیادہ تر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں ۔ جن میں سوائے اردو شاعروں پر ایک سطحی نظر ڈالنے کے کوئی اہم تاریخی مواد پیش نہیں کیا گیا ۔ دوسری قسم کے مواد میں سب سے پہلے گارساں وتاسی کے کارنامے پیش نظر ہوتے ہیں یہ پہلا شخص ہے جس نے ایک مکمل تاریخ ادبیات ہندوستانی میں لکھی ۔ تیسری قسم کا مواد عہد متوسط کی تحریریں مثلاً میرامن کا دیباچہ باغ وبہار ، آزاد کا مقدمہ آب حیات سرسید اور ان کے رفقاء کار کی بعض عبارتوں اور شعر کے چند مضامین پر مشتمل ہے ۔ چوتھی قسم کا مواد عہد حاضر کی تحقیقات میں جو انگریزی اور اردو زبان میں پیش کی گئی ہیں ۔

ان تمام تحریروں کے مطالعہ کے بعد تحقیقات کرنے والا عجب کشمکش میں پڑ جاتا ہے کیونکہ اس طرح اسے کو قسم قسم کے خیالات اور بیانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اتنا ضرور ہے کہ ان سب میں اردو زبان

کے آغاز کو ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس میل جول کے مقام نوعیت اور پھر نتیجہ نکالنے میں سب تحریروں کو ایک دوسرے کو مختلف پایا گیا ہے۔ اور اس طرح ہندوستانی کے آغاز کے متعلق جدا جدا نظریے قائم کیے گئے ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستانی کا آغاز دکن میں ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں عرب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت تجارتی مقاصد کی خاطر سمندری راستہ کے ذریعے ہندوستان وارد ہوئی۔ ساحل مالابار اس کا مسکن بنا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ہندو میل جول کی بناء پر یک زبان بنی جو موجودہ اردو کی ماں ہے۔

دوسرا مقام جہاں مسلمان ٹھہرے وہ سندھ تھا۔ یہاں پر انھیں تقریباً چار سو برس تک عمل دخل رہا بعض نقادوں کا یہ خیال ہے کہ سندھ میں انھوں نے فطرتاً ایک زبان کی بنیاد ڈالی جو اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سندھ میں ایک زبان یقیناً معرض وجود میں آئی۔ مگر وہ اردو نہیں تھی وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو جدید دور میں سندھی کہلاتی ہے۔

مسلمانوں کی تیسری فتوحات گو افراد (محمود غزنوی اور ان کے ہمراہیوں) کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔ سب سے پہلے پنجاب فتح ہوا۔ غزنوی دور میں ایک ایسی زبان پیدا ہوئی۔ جو برج بھاشا کی بجائے پنجابی سے زیادہ مشتق ہے۔

اردو زبان کا آغاز اس وقت ہوا ہے جب سلطان محمود غوری نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کو فتح کیا اور بعد ازاں مسلمان مدتوں یہاں حکومت کرتے رہے۔ متعدد مصنفوں کا یہ خیال ہے کہ اردو دہلی میں فارسی اور ہندی کے میل جول کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ نیز یہ کہ وہ عام طور پر محمد تغلق (۱۳۲۸ء) کے دور حکومت میں بولی جاتی تھی جب انھوں نے دکنی مہمات شروع کیں تو اردو دکن پہنچ گئی۔

اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں اس نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اس وقت تک حاصل نہ کی جب تک مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت نہ بنا لیا۔ زبان ہندوستانی کا ارتقاء پنجاب ہی سے شروع ہوا۔ لیکن اس کے ثانوی مدارج دوآبہ گجرات اور دکن میں تکمیل کو پہنچے۔ دہلی میں اردو زبان تقریباً ڈیڑھ سو سال تک رہنے کے بعد گجرات اور دکن کا رخ کرتی ہے۔

مغلیہ سلطنت کے آخری ایام میں شمال میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبانیں (یعنی کھڑی اور اردو) مرورِ ایام کے ساتھ گھل مل کر ایک ہو گئیں۔ لیکن جہاں دوآبہ کے ہندوؤں نے ایک طرف مسلمانوں

کی بولی ہوئی زبان کو اپنا لیا۔ دوسری طرف اپنی ادبی زبان برج بھاشا کو ترک کر کے فارسی میں تصنیف و تالیف شروع کی۔ چنانچہ ان کی اس فارسی تحصیل نے ان کی روزمرّہ کی زبان کو بہت متاثر کیا۔ برعکس اس کے دکنی ہندو اگر فارسی میں کتابیں لکھنا چاہتے تو انھیں اردو کے علاوہ ایک اور اجنبی زبان بھی سیکھنی پڑتی۔ خود اردو یا ہندوستانی ان کے لیے ایک اجنبی زبان تھی۔ بہرحال مغلوں کے آخری زمانے میں سراج الدین خان آرزو کی سفارش پر اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا اور اس نے ہندی۔ گجراتی دکنی وغیرہ زبانوں کی جگہ سنبھال لی۔

فارسی کی بجائے ہندوستانی کو اپنایا۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین کی طرف سے محض اپنی عمومی حکمت عملی پیرا ہونے کے مترادف تھا۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح اسلامی بالادستی کے تمام نقوش کو مٹانے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس کے فوراً بعد انگریزی کو جو ملک کے لیے ایک اجنبی زبان تھی مسلط کر دیا گیا۔ اس سے پہلے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ایک خطرناک تحریک کی ابتدا کی۔ مقصد یہ تھا کہ مذہبی بنیادوں پر ہندو مسلمانوں سے اپنی ایک علیحدہ زبان تشکیل و ترتیب کریں۔ مناسب اور حقیقی موقع انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہاتھ لگا۔ مسلمانوں نے ہندو کے ساتھ مل کر غیر ملکی سیاسی قوت کو ختم کرنے کی تحریک شروع کی۔ جو ناکام ہوئی۔ اب انگریز زبان کے مسئلہ پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو آسانی کے ساتھ دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر سکتے تھے۔ برطانوی سامراجیت اس سے استفادہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ نئی ہندی تحریک اور اس کے نتیجے میں معرض عمل میں آنے والی ہندی اردو مناقشت عموماً ۱۸۶۷ء میں شدید تر صورت میں شروع ہو گئی۔ ہوا یوں کہ بنارس کے متعدد بااثر ہندوؤں نے حکومت کو ایک عرضداشت پیش کی اس میں انھوں نے اردو کی جگہ ناگری رسم الخط کی ہندی کو عدالتی زبان بنانے کا مطالبہ کیا۔ ان کی اس جسارت پر احتجاجات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

بظاہر بنارس کی ہر تحریک تکلیف دہ اور باعث تعجب افکار کی حامل تھی۔ سرسید احمد خان کو اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ ہندو اور مسلم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے۔ اور وہ تمام کوششیں جو انھیں ایک قوم کی حیثیت میں متحد کرنے کے لیے جاری ہیں وہ سب ناکام ہوں گی۔ اس دوران ان تحریک ہندی جو بنارس میں شروع ہوئی کافی مقبولیت اور قوت حاصل کرنے لگی۔ سرسید کی کلکتہ یونیورسٹی کے ہم پلہ ایک چارٹرڈ یونیورسٹی دیسی زبان ذریعہ تعلیم بنتی۔ تجویز اردو ہندی مناقشت کا پہلا شکار بنی۔ انھوں نے اس تجویز کو ترک کر دیا۔ برعکس اس کے کہ اردو کی نگہداشت کے لیے الٰہ آباد کے مقام پر ایک مرکزی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کی شاخیں کئی شہروں میں قائم ہوئیں۔ اس وقت کے بعض

اردو اخبارات (مثلاً بنارس گزٹ ، ملکھنؤ کا نوراللہ معیار اور سرسید کا سائیٹفک سوسائٹی گزٹ علی گڑھ) نے بڑی سختی سے اردو کی نگہداشت کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے واضح الفاظ میں ان خطرات اور ممکنہ امکانات کا ذکر کر دیا جو بنارس مطالبات ماننے کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے تھے۔

ہندی کے حامیوں کو روشن خیال ہندوؤں کی ہمدردیاں حاصل نہ ہو سکی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت کا یہ آمرانہ فیصلہ جس کی بناء پر بہار میں اردو پر پابندی لگا دی گئی، نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ ان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ ہندوستان میں برطانوی کارپردازوں کی شروع ہی سے یہ حکمت عملی رہی ہے۔ کہ "تقسیم کرو اور حکومت چلائے جاؤ" کے اصول پر سختی سے عمل کیا جائے۔ برطانوی حکام کو مولوی امداد کی طرف سے اردو میں پیش کیے گئے خطبہ استقبالیہ (انھوں نے یہ خطبہ استقبالیہ بنگال و بہار کے لیفٹیننٹ گورنر سر۔ جی کیمبل کو ۱۸۷۱ء میں پیش کیا۔ میں ایک بہانہ نظر آیا۔ گورنر موصوف نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس دوغلی اردو جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی بھرمار تھی۔ کو سخت ہدف تنقید بنایا۔ انھوں نے اس پر بس نہ کی۔ بلکہ شعبہ تعلقات عامہ کو احکامات دیے کہ اردو کی درسی کتابوں کو فوراً بند کیا جائے۔ اس طرح کی ہدایات دیگر شعبوں کے نام بھی جاری ہوئیں۔ جن میں اردو کو بالکل ختم کرنے پر زور دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں سرکاری سکولوں اور دفتری کاموں میں اردو کو بالکل استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کئی اسباب موجود ہیں۔ جن کی رو سے یقین کے ساتھ یہ بات کی جا سکتی ہے کہ کیمبل کے احکامات کو برطانوی اعلیٰ افسروں اور اعلیٰ ہندو شرفاء کی تائید کلی حاصل نہ تھی۔

انھوں نے تاہم صوبائی زبانوں (میتھلی اور بھوجپوری) کو ہندی کے مشترکہ لبادے میں اردو بولنے والے اہم علاقے میں سرکاری زبان کی حیثیت میں رواج دینے کی پوری پوری کوشش کی۔ علاوہ ازیں ان انسداد اردو کے اقدامات نے قدرتی طور پر قرب و جوار کے دیگر علاقوں میں بھی ہندی کے حامیوں کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ یو پی کے مشرقی ضلعوں میں تجدید شدہ سرگرمیوں کا مشاہدہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ہندی کی کتابوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر انگریزی اور بنگالی کتابوں کے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔ ناگری رسم الخط میں اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ ابھی ان کی تعداد اردو اخبارات کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ان اخباروں نے عربی فارسی کا غیر ملکی طرز اپنایا۔ جن اصطلاحات کے خلاف وہ پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ ہندی کے حامیوں نے اپنے مطالبات کے حق میں ایک اور پرزور مہم بڑے پیمانے پر شروع کی۔ اس سے مجبوراً سر سید احمد خاں کو اپنی اردو انجمن کے دماغ کی تنظیم نو (دسمبر ۱۸۷۳ء) کرنا پڑی تاکہ وہ ہندی شورش کے اثرات کو کم کر سکیں جو بڑی تیزی سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مناقشات

جذبات کو ہوا دے رہی تھی۔ اس انجمن کی سرگرمیاں زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکیں۔ لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اب انگریزی حکام علی الاعلان اردو کے خلاف ہندی کے حق میں اقدامات کرنے سے گریز کرنے لگے۔

مغربی ثقافت سے قریبی روابط اور ہندوؤں میں اور خصوصاً بنگال میں انگریزی تعلیم کے رواج پا جانے سے اس قوم کے اندر نئے رجحانات اور تصورات پیدا ہونے لگے۔

مغربی علماء کے قدیم ہندوستانی تاریخ اور سنسکرت کے ادب کے مطالعہ نے ہندوؤں کو نئے فخریہ جذبات سے نوازا۔ انھوں نے اپنے ماضی میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اور اپنے باقیات کی تجدید کی امید کرنے لگے۔ قومی تحریکوں کی شکل میں اس بیداری کے سیاسی اظہار نے دلکشی تک پہنچنے کے لیے کچھ وقت ضرور لیا۔ لیکن مذہبی اور سیاسی پروپیگنڈے اپنی تکثیری نوعیت کے اعتبار سے جلد ہی منظر عام پر آ گیا۔ آریا سماج کی بنیاد پڑی اور دیگر کئی فرقہ وارانہ حامئی احیائے مذہب تنظیمیں معرض عمل میں آئیں۔ ان میں سے اکثر اسلام اور مسلمانوں کی سخت مخالف تھیں نتیجۃً فرقہ وارانہ تعصبات اب زبان کے متعلق جھگڑے میں سرایت کرنے لگتے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کے مقام پر بھاشا سا مروتن سبھا کی تشکیل ہوئی۔ یہ انجمن مسلمانوں کی مخالفت میں بنی لیکن اسے متوقع حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اور یہ جلد ختم ہو گئی۔ تعلیمی جائزہ کے دوران جو ہنٹر کمیشن نے ۱۸۸۲ء میں مکمل کیا۔ اس تحریک کو از سر نو زندہ کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تحریک پنجاب کے ہندوؤں تک پہنچ گئی۔ جنھوں نے ہندی کی حمایت میں جاری ہونے والی مہم میں اپنے یو۔ پی کے بھائیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ کمیشن کو سینکڑوں کی تعداد میں معروضات اور قرار دادیں ملیں۔ انھیں مختلف اصلی یا نقلی سبھاؤں یا انجمنوں نے بھیجا تھا۔ ان میں کمیشن سے یو۔ پی میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت میں برقرار رکھنے پر سخت احتجاج کیا گیا۔ ہنٹر نے ایم۔ اے۔ او کالج میں ایک استقبالیہ کے جواب میں کہا کہ کس طرح کمیشن کو اردو ہندی مناقشت کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سر سید احمد خاں نے کمیشن کی مدد کرتے ہوئے فرمایا کہ زبان کا سوال سیاسی ہے۔ اور کمیشن کو اس سلسلے میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے لیکن ابھی تک اس طوفان میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

سر سید احمد خاں کی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کرنے کی جد و جہد ان کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ انھیں غفلت کی نیند سے بیدار ہونا پڑا۔ اسلامی رائے عامہ کی تشکیل و ترتیب میں علی گڑھ نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے مسلمان سیاسی امور میں علی گڑھ کی قیادت کی طرف رجوع کرنے لگے۔ سر سید احمد خاں کے مسلمانوں پر بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے پیش نظر بعض ہندو رہنما بڑے چراغ پا ہو گئے۔ انھوں نے اپنی اس مخالفت کا مظاہرہ علی گڑھ میں "بھارت ورشا قومی انجمن کی تشکیل کی صورت میں

کیا۔ علی گڑھ سرسید کے حامیوں میں گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اس عظیم نام کے باوجود اس تنظیم کو جلد ہی بھلا دیا جاتا۔ لیکن اس کی ناگری پرچارنی سبھا ایسی ادبی شاخ (جسے مناسب اور اصلی پیدائش کی جگہ بنارس میں منتقل کر دیا گیا) نے اپنی سرگرمیوں سے اسے برقرار رکھا۔ اس کے ادبی کام قابل تعریف ہیں۔ ایک اور ادبی انجمن "ہندی ساہیا سمیلان" بھی الہ آباد کے مقام پر قائم ہوئی۔ علاوہ ازیں "نارتھ انڈیا ٹریکٹ سوسائٹی آف دی کرائسٹ مشن" نے بھی اپنے دائرہ کار کے اندر جدید ہندی ادب کے مفاد کے لیے بڑا قابل قدر کام کیا۔

مجموعی حیثیت میں زبان کے مسئلہ کا زور انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں وجہ زوال تھا۔ لیکن ابھی آگ پوری طرح بجھی نہ تھی۔ اور برطانوی حاکموں نے اسے مزید سلگا ڈالا۔ انھوں نی میکڈانلڈ کو ۱۸۹۷ء میں یو پی کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ اپنے عہد کے چار برسوں کے دوران اس نے ہندی کے سرگرم حامی کی حیثیت میں زبان کے اس اکھاڑے میں شرکت فرمائی۔ اس کے میلان کے علم کے پیش نظر ہندی کے حامیوں نے اس کے تقرر کا والہانہ انداز میں خیر مقدم کیا۔ وہ ایک زبردست سرپرست ثابت ہوا۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں ایک یادداشت (جس پر ہندو رہنماؤں کے دستخط تھے) حکومت کو پیش کی گئی اس میں ہندی کو عدالتی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ علی گڑھ کا معمر شخص اس وقت مرض الموت میں مبتلا تھا۔ انھوں نے نہ صرف اردو دفاعی انجمن کو بیدار کیا بلکہ اپنے ہفتہ وار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اشاعت کے لیے اپنا سخت احتجاج روانہ کیا۔ جوان کی موت کے چند دن قبل بازار میں آگیا تھا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ حکومت سوچ میں پڑ گئی۔ یو۔ پی کے لیفٹیننٹ گورنر نے ہندی کے حامیوں کے ایک وفد کو اس سال صبر کرنے کی تلقین فرمائی لیکن میکڈانلڈ بے انتہا ضدی شخص واقع ہوا تھا۔ اس نے بالآخر ۱۹۰۰ء میں ایک قرارداد کے ذریعے ہندی رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے ڈالی۔ اس اصلاح کو لارڈ کرزن کی حکومت نے "زبان" میں بدل ڈالا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حالات مزید خراب ہو گئے۔

مسلمانوں کی طرف سے احتجاجات کا ایک زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لکھنؤ کے مقام پر ۱۷، ۱۸، اگست ۱۹۰۰ء کو نواب محسن الملک کی کوششوں سے ایک بہت بڑی ریلی منعقد ہوئی۔ مؤخر الذکر سرسید احمد خان کی جگہ علی گڑھ کے سیکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ اس احتجاج میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اس میں بعض مشہور عیسائی دانشور بھی شریک ہوئے۔ ان حضرات نے حکومت کے فیصلے کے خلاف تقریریں کیں۔ محسن الملک ایک زبردست مقرر تھے۔ انھوں نے سامعین کے جذبات خوب بھڑکائے۔ اس اجتماع نے متفقہ طور پر کئی قراردادیں منظور کیں۔ جن میں اس وقت تک اس تحریک کو جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا گیا تھا۔ جب تک کہ حکومت اپنے فیصلے کو واپس نہیں لے لیتی۔

اس مظاہرے نے میکڈانلڈ کو بے حد برانگیختہ کر دیا۔ اس نے بنفس نفیس علی گڑھ کا دورہ کیا۔ اس نے کالج کے ٹرسٹیوں کو سرکاری امداد بند کرنے کی کھلی دھمکی بھی دی۔ اگر اس کے بعد انھوں نے اپنے سیکرٹری کو سیاسی تحریک سے قطع تعلق کرنے پر آمادہ نہ کیا۔ محسن الملک نے سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہونے کی پیش کش کی لیکن احباب نے انھیں کام جاری رکھنے پر مجبور کر ڈالا۔ آخر کار اردو دفاعی تنظیم سے انھیں علیحدہ ہونا پڑا۔ لکھنؤ کے اجتماع میں وہ اس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس واقعے سے تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہندی نے نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ ہندی کو اس علاقے میں جہاں اردو چند سال قبل بلا شرکت غیرے سرکاری زبان تھی۔ اردو کے مساوی سرکاری حیثیت مل گئی۔ جدید ہندی کو اس سے بڑی تقویت ملی۔ اور یہ اقدام اس کی حیثیت کو مستحکم بنانے پر منتج ہوا۔ ہندی اخبارات اور ادبی کتابیں کثیر تعداد میں شائع ہونے لگیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ہندی کتابیں اور رسالے بے حد ناقص تھے لیکن ان میں پروپیگنڈہ کرنے کی بے پناہ قدر پائی جاتی تھی۔ اس ادب کی دلچسپ سادہ عام بول چال طرز کی ہندی تھی۔ جو اس صدی کے ابتدائی سالوں میں استعمال کی جاتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ تاہم اس زبان میں زیادہ سے زیادہ سنسکرت کے الفاظ داخل ہونے لگے۔

ہندو تجدیدیت کا قابل ذکر رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ ہے۔ اس نے سنسکرت زیادہ ہندی کے لیے خوب پرچار کیا۔ قانون اور سیاست میں ماہر یہ فاضل پنڈت ہندو مذہب کا زبردست محافظ رہا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس نے بے پناہ اثر و رسوخ حاصل کیا۔ ۱۹۱۱ء میں مردم شماری کے موقع پر اس نے ایک زبردست تحریک شروع کی جس میں یو۔ پی کے ہندوؤں کے نام ہندی میں درج کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر گرائسن (آپ مردم شماری کے کمشنر تھے) کو وہ قائل کرنے میں وہ ناکام رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی موجودہ افتاد کے متعلق ہندی انشا پردازوں کے جو خیالات یا اعتراضات ہیں وہ ہمارے لیے قابل غور ہیں۔

اوّل اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ روز بروز داخل ہو رہے ہیں اور وہ بھی اردو بن کر نہیں آرہے ہیں۔ بلکہ بالکل اجنبیوں کی سی شکل میں پائے گئے ہیں۔

دوم۔ اردو میں فارسی قواعد کا اثر شدت سے عمل کر رہا ہے۔ اردو لفظوں کی جمع ہندی طرز [illegible] فارسی طریقوں پر بنائی جاتی ہے۔ جیسے کاغذ، قصبہ اور امیر کی جمع جیسے کاغذوں، قصبوں اور امیروں [illegible] بنا کر کاغذات قصبات اور امرا بناتے ہیں۔ اور اس قسم کی جمع کا رواج روز افزوں ہے۔

سوم۔ اکثر فارسی اضافت کے ذریعہ مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ جیسے ستارہ ہند، دفتر فوجداری،

مالک مکان، اس طرح معمولی حروف جر کے، سے وغیرہ کے لیے فارسی لفظ، از استعمال ہوتا ہے مثلاً از خود، از طرف، اسی طرح میں اور، سے کی جگہ در استعمال کیا جارہا ہے۔ مثلاً دراصل، درحقیقت کہیں کہیں، در کی جگہ عربی، فی بھی لکھا جاتا ہے جیسے فی الحال، فی الحقیقت۔

چہارم۔ ہندی اور اردو کا سب سے بڑا فرق حرفی ترکیب میں نظر آتا ہے۔ ہندی میں پہلے فاعل پر مفعول اور پھر فعل لاتے ہیں، مگر اردو کے جملوں میں معلوم ہوتا ہے کہ الٹ پھیر ہے۔ اس میں فعل کو فاعل سے پہلے بھی لاتے ہیں۔ مثلاً راجہ اندر کا آنا۔ لڑکا راجہ اندر کا، کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ نہ کہہ کر اس نے ایک نوکر سے پوچھا یہ کہیں گے ایک نوکر سے اس نے پوچھا۔

ارباب ہندی کا سب سے بڑا اعتراض فارسی اور عربی لفظوں کی درآمد کے متعلق رہا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ خود ہندی میں سنسکرت اور برج بھاشا کے کیسے کیسے اور نامانوس الفاظ روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش تو اردو یا ہندوستانی کی سرشت میں داخل ہے۔ ان میں سے اکثر لفظ خود اردو ہو گئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئے نئے الفاظ کا داخلہ جہاں تک ہو سکے روکنا چاہیے اور یہ خیال اس وقت تک اردو کے تمام اہل ذوق انشا پردازوں میں مقبول ہو گیا ہے لیکن ہندی کے ایسے کتنے اہل قلم ہیں جو سنسکرت اور برج بھاشا کو چھوڑ کر قدیم لفظی خزانہ پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔

باب ۹

تقسیم بنگال

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال ہے اس وقت برصغیر میں سات صوبے تھے۔ اور برصغیر کی تمام آبادی کا ایک تہائی حصہ اس ایک صوبے میں رہتا تھا۔ صوبے کی تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ بنگال کی حکومت کے انتظامی بوجھ کو ہلکا کیا جائے۔ تقسیم کی مختلف تجویزیں پچھلے تیس برس سے پیش ہو رہی تھیں۔ لیکن کسی ایک تجویز پر بھی عمل درآمد نہ ہو سکا بالآخر لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا نام مغربی بنگال اور دوسرے کا مشرقی بنگال اور آسام رکھا۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو ۶۶ فیصد اکثریت حاصل تھی، اس صوبے کی حدیں کم و بیش وہی تھیں جو بعد میں مشرقی پاکستان کو ملیں۔ یہ علاقہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے حکومت کی توجہ سے محروم تھا۔ سرکاری افسر اس کے دور دراز حصوں میں جانے سے خائف ہوا کرتے تھے انگریزوں کو یہاں کے لوگوں کے طرز زندگی اور اقتصادی حالت سے بہت کم واقفیت تھی۔ جو انگریز افسران اصلاح میں متعین کیے جاتے ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوا کرتی تھی۔ کہ جلد سے جلد یہاں سے تبادلہ کروائیں۔ یہ ایک طرح کی سرزمین بے آئین تھی۔ جہاں تعلیم کم۔ جرائم زیادہ اور ہر طرف زمینداروں کا ظلم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ان زمینداروں کا حکومت میں بہت اثر و رسوخ تھا۔ وہ سال کا زیادہ حصہ حکومت کے مرکز یعنی کلکتے میں گزارتے اور اپنی زمینوں کے کاشتکاروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے داد عیش دیتے تھے۔ ان کی اپنی عدالتیں تھیں جو جرائم کی سزائیں دیتی تھیں۔ ان کے اپنے جیل خانے تھے جہاں مجرموں کو رکھا جاتا تھا مجرم زیادہ تر وہی مسلمان کاشتکار ہوتے جو اکثر و بیشتر بلاوجہ ہندو زمینداروں کے غیض و غضب کا نشانہ بنتے تھے۔ نیا صوبہ بننے سے ان خرابیوں کا تدارک ہو سکتا تھا۔ اور یہاں کی مسلم اکثریت کی حالت بہتر بنائی جا سکتی تھی۔ لیکن جب اس تقسیم پر عمل درآمد کیا گیا تو ایک غیر متوقع صورت پیدا ہو گئی اور تقسیم کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔

تقسیم بنگال کے محرکات وائسرائے لارڈ کرزن نے جولائی ۱۹۰۵ء میں

بنگال کو دو صوبوں مشرقی بنگال اور مغربی بنگال میں تقسیم کرنے کی سکیم کا اعلان کیا۔ اس تقسیم کا خالق لارڈ کرزن نہیں تھا بلکہ اس کی ہندوستان میں آمد سے پیشتر انگریزی حکومت صوبہ بنگال کی سرحدوں میں ضروری تبدیلیاں کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت علاقائی حدود کسی سوچ بچاؤ کے بعد قائم نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ یا تو مغلیہ سلطنت کے ڈھانچے کو بہت معولی ردو بدل کے بعد رائج کیا گیا یا جو بھی علاقے قبضے میں آئے فوری طور پر اس کا انتظام سنبھال لیا گیا۔ اس وجہ سے انگریزوں کے زیر نگیں علاقوں کی صوبائی اور علاقائی حدود کافی ڈھیلی ڈھالی تھیں جب ان کے قدم ذرا مضبوط ہوئے تو انھوں نے انتظامیہ کے ڈھانچہ کی طرف توجہ دینی شروع کی کیونکہ وہ اس بات کے متمنی تھے کہ انتظامیہ کی کارکردگی میں اضافہ کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے مختلف علاقوں کی حدود میں ضروری تبدیلیاں شروع کیں۔

انگریزوں نے سب سے پہلے بنگال میں اپنے قدم جمائے اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں کو زیر نگیں کرنے میں معروف ہو گئے اس وجہ سے بنگال کی انتظامیہ پر کام کا بوجھ بڑھتا رہا۔ انتظامی ضروریات کے پیش نظر بمبئی اور مدارس کی پریذیڈنسیوں کو لیفٹیننٹ گورنروں کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں بنگال کی انتظامیہ پر وزن کم کرنے کے لیے جنوب مغربی صوبہ کے لیے لیفٹیننٹ گورنر کا مقرر کیا گیا۔ آگرہ اس صوبہ کا صدر مقام مقرر ہوا۔ ماضی میں یہ علاقہ بنگال کی انتظامیہ کے ماتحت تھا۔ بنگال کی انتظامی حدود میں تبدیلی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۸ء کے بعد بھی جاری رہا کمپنی کی حکومت کے بعد ملکہ برطانیہ کی حکومت نے اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی۔ ۱۸۷۴ء میں آسام اور بنگال کے تین ضلعوں کو صوبہ بنگال سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اگرچہ آسام کا رقبہ کافی چھوٹا تھا لیکن اس سے آسام کی معاشی حالت پر اچھا اثر پڑا۔ آسام کو ریل کے ذریعے چٹا کانگ سے دور رنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ رسل و رسائل کی بہتری سے یہاں کی حالت بہت ہو۔ کیونکہ ماضی میں کلکتہ کی حکومت آسام کے علاقوں کی ترقی کی طرف توجہ نہیں دے رہی تھی۔ آسام اور اس سے منسلک علاقوں کو ایک چیف کمشنر کے ماتحت کر دیا گیا۔

ان تمام انتظامی ردو بدل کے بعد بھی بنگال ایک بہت وسیع صوبہ تھا۔ ۱۹۰۱ء میں بنگال کا رقبہ ۱۸۹۰۰۰ مربع میل اور آبادی ۸۰۰۰۰۰۰۰ تھی۔ اتنے بڑے صوبہ کا انتظام بطریق احسن چلونا ایک لیفٹیننٹ گورنر کے بس کی بات نہیں تھی۔ صوبے کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرنے لفٹیننٹ گورنر کو موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اور ڈھاکہ جیسے اہم شہر میں ایک دو بار سے زیادہ جانے

کا موقعہ نہ تھا۔ اس کا بڑا اثر انتظامیہ پر ہوتا تھا صوبہ کے صدر مقام کلکتہ کے قریب کے علاقوں کے سوا انتظامیہ کی کارکردگی غیر تسلی بخش تھی۔ کلکتہ کی انتظامیہ اپنے کاموں میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ اُسے موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ دُور دراز علاقوں کے مسائل طرف توجہ دی جائے بعض دور دراز علاقوں میں تو انتظامیہ برائے نام تھی۔ اس لیے وہاں کے عوام حکومت کی نافذ کردہ مختلف اصلاحات سے مستفیض ہونے سے محروم رہتے۔ بنگال میں ذرائع آمد ورفت کی حالت کافی خراب تھی۔ قدرتی مشکلات اور قدرتی آفات کی وجہ سے انھیں مزید نقصان پہنچتا تھا۔ اتنے بڑے صوبے کی انتظامیہ کے لیے کلکتہ سے ممکن نہیں تھا کہ ذرائع رسل ورسائل کو درست رکھا جائے جس سے دور دراز کے علاقوں کا مرکز سے رابطہ برائے نام رہ جاتا تھا۔ ان سب باتوں کا عام لوگوں کی معاشی، معاشرتی حالت پر برا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اگرچہ انتظامیہ کا معیار تمام صوبے میں خراب تھا۔ لیکن اس علاقے میں جو کہ بعد میں مشرقی بنگال بنا، حالت ناگفتہ بہ تھی صوبائی صدر مقام سے دور ہونے کی وجہ سے حکومت ان علاقوں کی طرف کم توجہ دے رہی تھی۔ ان علاقوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ لیکن ان کی معاشی اور معاشرتی حالت بہت خراب تھی۔ دور دراز کے علاقوں اور شہروں کا ذکر کیا ڈھاکہ اور چٹاگانگ جیسے شہر صوبائی حکومت کی بے توجہی کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ صوبہ کی صنعتی، تجارتی اور معاشی ترقی کا مرکز کلکتہ اور اور ادر گرد کا علاقہ تھا۔ مشرقی بنگال کی حیثیت کلکتہ کے عقبی صحن کی تھی۔ جس سے ضروری اشیاء کلکتہ سے سے جائی جاتیں جو کہ وہاں کی اقتصادیات کو نیا خون دیتیں لیکن اس کے عرض عقبی۔ صحن یعنی مشرقی بنگال کی ترقی کی طرف برائے نام توجہ دی جاتی۔ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔

اوّل: حکومت کی توجہ کا مرکز کلکتہ تھا اس لیے تمام تر ترقی اسی علاقہ میں ہوتی رہی کلکتہ کی بندرگاہ کی موجودگی کی وجہ سے چٹاگانگ کی بندرگاہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ یہی حال مشرقی بنگال کی صنعت وحرفت کا تھا۔

دوئم: صوبائی حکومت میں مسلمانوں کی نسبت ہندو زیادہ تھے۔ اُن کے اثر کی وجہ سے ان علاقوں کو نظر انداز کیا گیا جن میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے تعاون سے مسلمان بنگال کی دولت ہندو بنگال کی ترقی کے لیے خرچ کی۔ پٹ سن سے مختلف مصنوعات بنانے کے کارخانہ مغربی بنگال میں بنائے گئے جس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بنگال کا مکمل انحصار ہندو بنگال پر ہو گیا۔ اور اس کی پیداوار کو ہندو بنگال میں لے جایا جاتے لگا۔ اس وجہ سے نہ صرف بنگال کے مشرقی علاقوں کی ترقی رک گئی۔ اور عوام (یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔) غریب سے غریب تر ہونے لگے بلکہ اپنی تمام پیداوار کو بنگال کے مغربی علاقے والوں (یہاں ہندو اکثریت میں تھے) کے حوالے کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ کیونکہ بنگال کے مشرق علاقے میں ان کی کھپت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس علاقہ میں ذرائع آمد و رفت اور امن عامہ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ ایک مغربی تاریخ دان نے مشرقی علاقوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ دریاؤں پر زندگی اور جائیداد اتنی غیر محفوظ ہے کہ کسی مہذب ملک کی حکومت اسے برداشت نہیں کر سکتی متحدہ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم گرے نے صوبہ کے انتظامی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ کہا لیفٹیننٹ گورنر کے کندھوں پر اتنی ذمہ داری ہے کہ ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا اور نہ صوبے کے تمام مفادات سے انصاف کر سکتا ہے۔

حکومت ان مسائل سے ایک حد تک آگاہ تھی۔ لارڈ کرزن کے ہندوستان میں آنے سے قبل صوبہ بنگال میں وسیع پیمانہ پر انتظامی تبدیلیاں کرنے کے متعلق غور کیا جا رہا تھا۔ اڑیسہ میں قحط کے سلسلے میں تحقیقات کرنے والی سرکاری کمیٹی نے صوبہ بنگال کا غیر ضروری طور پر بڑا ہونے کا تذکرہ کیا اور اس نے تجویز پیش کی کہ صوبائی حدود میں ضروری رد و بدل کیا جائے گا تاکہ قحط اور دیگر ہنگامی حالات میں انتظامیہ اپنی ذمہ داریوں سے بطریق احسن سبکدوش ہو سکے۔ جب ۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن وائسرائے بن کر ہندوستان آیا سرکاری حلقوں میں بنگال کی حدود میں ضروری تبدیلیوں کا مسئلہ زیر غور تھا لارڈ کرزن بھی انتظامیہ کی کارکردگی بہتر کرنے کی ضرورت پر زور دیتا رہا۔ صوبائی سرحدوں کے مسئلہ کا بغور مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ بنگال آسام سی پی اور۔ مدراس کی سرحدیں وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں اور ان سے انتظامی کارکردگی پر برا اثر پڑتا ہے۔ لارڈ کرزن نے اسی دوران بنگال کے مشرقی علاقوں کا دورہ کیا تاکہ حالات کا بخوبی جائزہ لیا جا سکے اور رائے عامہ معلوم کرنے کی کوشش کی واپسی پر اس نے بنگال کی تقسیم کے سوال کا بغور جائزہ لیا اور ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اس تجویز کو وہائٹ ہال روانہ کر دیا۔ وہاں برائے نام تبدیلیوں کے بعد یہ تجویز منظور کی گئی۔ کرزن کا خیال تھا کہ نئے صوبہ کو جنوب مشرقی صوبہ کا نام دیا جائے۔ لیکن سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان لارڈ برو ڈرک نے اس کا نام بنگال اور آسام رکھا۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ بنگال کے مشرقی علاقوں ڈھاکہ، چٹاگانگ اور

راجشاہی لکھنا اور کچھ علاقہ آسام کا م) پر مشتمل ایک نیا صوبہ بنام مشرقی بنگال اور آسام وجود میں آگیا۔ اس کا صدر مقام ڈھاکہ تھا۔ اس تقسیم کی خصوصیت یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو عددی کثرت حاصل تھی جب کہ مغربی بنگال (کلکتہ صدر مقام) میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اس طرح انگریزوں نا مسلم بنگال کو ہندو بنگال سے الگ کر دیا۔ ڈھاکہ میں صوبہ مشرقی بنگال کی انتظامیہ قائم کی گئی جس کی قیادت ایک انگریز مسٹر فلر لیفٹیننٹ گورنر کر رہے تھے۔ اس صوبہ کا رقبہ ۱۰۶۵۰۰ مربع میل اور آبادی ۳۱ لاکھ تھی۔ (۲/۳ حصہ مسلمان)

تقسیم بنگال اور ہندو

تقسیم کا اعلان ہندوؤں پر بہت شاق گزرا۔ انھوں نے فی الفور اس کے خلاف ایک منظم ایجی ٹیشن شروع کر دی جو روز بروز زور پکڑتی گئی۔ بنگال کے ہندوؤں نے اس تقسیم کو انگریز حکمرانوں کی بدنیتی سے تعبیر کیا۔ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہمارا بنگالی قومیت کا جذبہ حکومت کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ حکومت نے صوبے کو تقسیم کر کے ہمیں اپنی سیاسی بیداری کی سزا دی ہے حکومت چاہتی ہے کہ بنگالی نسل کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا جائے اور اس طرح بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑا جائے۔ اور بنگالی زبان کی ترقی کو ہمیشہ کے لیے روک دیا جائے۔ یہ الزامات یکسر بے بنیاد تھے بنگال کے دونوں حصوں میں گہرے روحانی اقتصادی اور معاشرتی اختلافات تھے۔ مشرقی بنگال کے ناتعلیم یافتہ اور افلاس زدہ انسانوں میں یہ دن رات ہندو زمینداروں کی ہوس زر کا نشانہ بنے رہتے تھے اور مغربی بنگال کے بڑھتے ہوئے ہندو تاجروں۔ اخبار۔ نویسوں۔ وکیلوں ڈاکٹروں اور دفتری کارکنوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ مرکز سے دوری انگریزی حکومت کی بے توجہی اور دوسرے ناساعد حالات نے مشرقی اور مغربی بنگال کے علاقوں کو پہلے ہی ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا۔ گورنر جنرل کرزن نے تقسیم کی جو لکیر کھینچی وہ دونوں خطوں کے عرصہ دراز کے اختلافات پر مبنی تھی، ہندوؤں کا مطالبہ یہ تھا کہ تقسیم کو منسوخ کر کے پرانا صوبہ بحال کیا جائے روزانہ دونوں صوبوں کے بڑے بڑے شہروں میں جلوس نکالے جاتے نعرے لگتے۔ جلسے ہوتے اور تقسیم کے خلاف قرار دادیں پاس ہوتیں۔ پہلے پہل تو انگریز حکمرانوں پر اس شور کا کوئی اثر نہ ہوا اور حکومت کے نمائندوں نے اعلان کیا کہ تقسیم برقرار رکھی جائے گی۔ انگلستان کی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے تحریک کے لیڈروں نے ولایتی مال کا بائیکاٹ شروع کیا۔ جن دکانوں پر برطانیہ کی بنی ہوئی چیزیں فروخت

ہوتی تھیں ان کا محاصرہ کیا جاتا اور ان چیزوں کی خرید و فروخت کو جبر و تشدد سے روکا جاتا۔ یہ تحریک جو سودیشی تحریک کہلاتی ہے بنگال کے ہندوؤں میں بہت کامیاب ہوئی اس نے انگلستان کے صنعت کاروں اور تاجروں کو بہت نقصان پہنچایا۔ جب حکومت نے جھکنے سے انکار کیا تو انقلاب پسند ہندو نوجوانوں نے خفیہ تنظیمیں بنائیں جہاں انھیں بم بنانے اور پستول چلانے کی تربیت دی جاتی تھی تقسیم کا بدلہ لینے اور انگریز افسروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ان کو بموں اور گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ تشدد کے واقعات میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ ڈکیتی اور آتش زنی کی وارداتوں میں اضافہ ہوا۔ اور امن و امان مفقود ہو گیا۔

ہندو تحریک تمام کی تمام تحریک پر گہرا ہندوانہ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس میں بنگالی ہندوؤں کی بہت سی رسمیں مثلاً کالی دیوی کی پوجا اور راکھی بندھن شامل ہو گئیں، مسلمان اس تحریک سے مکمل طور پر علیحدہ تھے۔ جب تقسیم کو پورا ایک سال گزر چکا تو مسلمانوں نے اس کی سالگرہ پر خوشی کا جشن کیا لیکن ہندوؤں نے اس موقع پر سیاہ کپڑے اور اپنے سروں میں راکھ ڈالی جوں جوں یہ تحریک ہندووانی ہوتی گئی مسلمان اس سے دُور ہوتے گئے۔

ہندوؤں کی مخالفت کی وجوہات شاید آپ کے دل میں یہ سوال ابھرے کہ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی مخالفت اتنی شدت کے ساتھ کیوں کی۔ اس سوال کا جواب مشکل نہیں تقسیم سے پہلے صوبہ بنگال کے سات آٹھ کروڑ آبادی میں صرف دو کروڑ ہندو بنگالی تھے۔ تجارت کے میدان میں، اخباری دنیا میں سرکاری دفتروں میں، ڈاکٹری، وکالت اور انجینئری جیسے شعبوں میں ان کی اجارہ داری تھی۔ یہ سرکاری اور دفتری ملازمت کے رسیا تھے۔ دفتری کام سے ان کو لگن نہیں عشق تھا۔ ظاہر تھا کہ نیا صوبہ بننے سے ان کا اثر و رسوخ ختم ہو جاتا اور مسلمانوں کو اپنی اکثریت کے صوبے میں اپنے جائز حقوق ملتے۔ انھیں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ ڈھاکہ کا شہر ترقی کرے گا۔ اس کا اپنا ہائی کورٹ ہوگا۔ علیحدہ یونیورسٹی بنے گی اور نئے اخبار نکلیں گے اور ان سب باتوں کی زد کلکتہ پر پڑے گی۔ کلکتے کے وکیلوں کی آمدنی اور اثر و رسوخ کم ہوگا ہر میدان میں نئی یونیورسٹی کے گریجوایٹ کلکتہ یونیورسٹی کے گریجوایٹوں کے ساتھ مقابلہ کریں گے ہندوؤں کی ایجی ٹیشن کی غرض و غایت صرف یہی تھی کہ مسلمان بدستور پستی کی حالت میں رہیں اور ان کو معاشرے میں

اپنا جائز مقام نہ مل سکے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کی تہ میں ایک انتقامی جذبہ تھا۔ اور وہ ہرگز اس بات کے روادار نہ تھے کہ اثر و رسوخ اور روزگار کے جو مواقع انہیں حاصل ہیں۔ ان میں مسلمان حصہ دار بنیں۔ یہ صوبہ چھ سال تک قائم رہا ہندوؤں کی اقتصادی برتری کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ ان کو اکھیڑنا مشکل تھا۔ صوبے کے پہلے گورنر نے جس کا نام فلر تھا مسلمانوں کی پست حالی کی طرف توجہ کی سرکاری ملازمتوں میں ان کی بھرتی کی حوصلہ افزائی کی۔ اسلامی عہد کی شکستہ حال عمارتوں کی مرمت کا بندوبست کیا اس کا ہر فعل ہندوؤں کے لیے وجہ شکایت بن جاتا تھا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ

۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان شاہ جارج پنجم کی زبان سے کر دیا گیا کلکتہ کی بجائے دہلی کو دارسلطنت بنایا گیا۔ شاید اس سے مسلمانوں کی اشک شوئی مقصود تھی۔ لیکن مسلمانوں کو تقسیم کی تنسیخ کا بہت قلق ہوا۔ انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ انگریز حکمران کسی طبقہ کے جائز مطالبات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں البتہ اگر کسی غیر معقول مطالبے کے پیچھے زور شور کا ایجی ٹیشن ہو تو وہ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔ تقسیم کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ قوم نے سرسید کی سیاست سے دور دور رہنے والے مسلک کو ترک کر دیا اور نوجوان طبقہ بے دھڑک سیاست کے میدان میں کود پڑا۔ تقسیم بنگال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی کشیدہ تعلقات میں کشیدگی اور بھی بڑھی۔ اور ایسی بڑھی کہ دونوں کو تقسیم ملک تک لے گئی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ۱۹۰۵ء میں ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی پرزور مخالفت کی تھی اور ۱۹۴۷ء میں زور شور سے مخالفت کی تھی۔

باب ۱

شملہ وفد اور جداگانہ انتخابات

۱۸۵۷ء میں جب مغلوں کی حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا تو مسلمان ہر طرف سے آلام و مصائب میں گھر گئے۔ قوم کی تعلیمی پس ماندگی اور اقتصادی بدحالی کے کوائف اکثر دہرائے گئے ہیں۔ اور عام طور پر معلوم ہیں۔ ان حالات میں سب سے اہم مسئلہ جو عارضی طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا وہ مسلمانوں کے قومی تشخص کا مسئلہ تھا۔ جنگ آزادی سے پہلے اس تشخص کو مٹانے کی بھرپور کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان اپنی سرکاری اور دفتری حیثیت سے محروم کر دی گئی تھی اور عیسائی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں زور پکڑنے لگیں۔ وہ مسلمانوں کے مذہب، طریقہ تعلیم، تاریخ، ثقافت، ادب اور ہر چیز کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے تھے۔ پادریوں کو حکومت وقت کی جارحانہ تائید اور حمایت حاصل تھی۔ رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے پوری کر دی اور حکومت نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوؤں میں سماجی اصلاحی تحریکیں جاری ہوئیں۔ ان تمام تحریکوں میں مسلم دشمنی کا عنصر نمایاں ہی نہیں بلکہ واضح تھا۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کا موقف یہ تھا کہ "ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے"

ان سب خطروں کے علاوہ ایک نیا خطرہ جو مسلمانوں کے خلاف ابھر رہا تھا۔ وہ ایک نظریاتی خطرہ تھا۔ یہ خطرہ ان تصورات سے پیدا ہوا تھا جو مغربی تعلیم کے ذریعے نسل کے ذہنوں میں زہر گھول رہا تھا۔ یہ تصورات، قومیت اور جمہوریت کے مغربی تصورات تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ تصورات یورپ میں مقبول ہوئے اور محکوم ملکوں میں بھی پھلنے پھولنے لگے۔ انھی تصورات نے کانگریس کی تحریک کو جنم دیا۔ اس کے جلسوں اور جلوسوں کی رونق کو بڑھایا۔ کانگریس کی کارروائی تمام تر انگریزی زبان میں ہوتی تھی۔ اس کے ابتدائی دور میں اس کے کرتا دھرتا بال گنگا تلک۔ سریندر ناتھ بینرجی اور مدن موہن مالویہ۔ جیسے ہندو لیڈر تھے۔ ان کے نزدیک انڈین نیشنلزم کے معنی صرف ہندو نیشنلزم کے تھے۔ ان لیڈروں

نے کچھ اپنی تعلیم اور کچھ اپنی انگریز شناسی کی بدولت مطالبات کی ایک فہرست تیار کرلی۔ جو ہر سال کانگریس کی طرف سے حکومت کو پیش کی جاتی تھی۔ ان تمام مطالبات میں "نمائندہ حکومت" کا مطالبہ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ جیسا طرز حکومت قائم کیا جائے۔ اور حکومت کے تمام اختیارات ایک منتخب پارلیمنٹ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ کانگریس کے انتھک مقرر اس بات پر بار بار زور دیتے تھے کہ انگریز جو اپنے ملک میں آزادی کی نعمت سے مالا مال ہیں وہ ہندوستان کے لوگوں کو آزادی کی نعمت سے محروم رکھ رہے ہیں۔ بظاہر اس سیدھی سادھی منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سے بہت سے انگریز بھی متاثر ہوئے۔ حقیقتاً اس منطق کی تہ میں مسلم دشمنی کا جذبہ کام کرتا تھا۔ ان کے ہاں نمائندہ حکومت کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کی باگ ڈور بلا روک ٹوک اکثریت کے ہاتھ ہو۔ اور اقلیتی قومیں ہمیشہ کے لیئے اکثریت کے رحم و کرم کی محتاج ہو جائیں۔ اس نکتے تک سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے رسائی حاصل کی۔

تاہم انھوں نے اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کیا۔ انھوں نے "نمائندہ حکومت" کے مطالبے کی پرزور مخالفت کی اور مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روکا۔ کانگرس کے وجود میں آنے سے پہلے بھی انھوں نے ۱۸۸۳ء میں وائسرائے کی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ مغربی جمہوری ادارے نہ اس ملک کے مزاج کے مطابق ہیں اور نہ ہماری روایات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے اکثریت کو تو بلاشبہ فائدہ ہوگا لیکن وہ آبادی کے تمام طبقوں کی جائز خواہشات اور امنگوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اگر انتخاب کا مغربی طریقہ یہاں رائج کرنا مقصود ہو تو اس میں پس ماندہ طبقوں کے لیئے موزوں تحفظات کو مد نظر رکھتے ہوئے مناسب تبدیلیاں کی جائیں ورنہ یہ طبقے تیزی کے ساتھ پستی کے غار میں گر جائیں گے۔

بلدیاتی انتخابات میں مسلمانوں کی ناکامی

لارڈ رپن ہندوستان کا ایک نیک نام وائسرائے تھا۔ وہ لبرل خیالات رکھتا اور مغربی جمہوری اداروں کا دالدادہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے شہروں میں میونسپلٹیاں قائم کرکے جمہوری اداروں کی بنیاد رکھی۔ کمیٹیوں کے بہت سے ممبر انتخابات کے ذریعے چنے جانے لگے۔ اس زمانے کے انتخابات آج کل جیسے انتخابات نہ تھے۔ اب تو ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا حق

حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن ان دنوں میں حق صرف ان کو ملتا تھا جو صاحب جائیداد ہوں یا ایک مقررہ حد تک تعلیم یافتہ ہوں ۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن حلقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی وہاں بھی مسلمان رائے دہندے اقلیت میں ہوتے ۔ یہ صورت حال اکادکا حلقوں تک محدود نہ تھی ۔ بلکہ کم و بیش ہر جگہ پائی جاتی تھی ۔ انتخابات کے نتائج یوں نکلتے کہ مسلمان اپنی اکثریت کے حلقوں میں بھی ناکام رہتے ۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی ۔ عام طور پر ہندو ووٹر اپنے ہم قوموں کی حمایت بھی کرتے تھے ۔ اور کبھی کسی مسلمان کو ووٹ نہ دیتے تھے ۔ اگر کبھی کبھار حالات سے مجبور ہو کر وہ کسی مسلمان امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالتے تو ان کی نظر کرم صرف ایسے امیدواروں پر پڑتی جو اپنی قوم کی نظروں میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ منتخب ہونے کے بعد ہندوؤں کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے ۔ اس طرح مغربی جمہوری اداروں کے قیام سے مسلمانوں کے مفاد کو ایک کاری ضرب لگی اور وہ عملی طور پر حق نمائندگی سے محروم ہو گئے ۔ اپنے مضامین میں سید امیر علی نے سلطنتوں کی اس محرومی کا جائزہ لیا اور سرسید نے اپنی پبلک تقریروں اور مضامین میں آنے والے خطرے کی واضح طور پر نشان دہی کی ۔ انھوں نے کہا کہ اگر حالات کا رخ یہی رہا تو مسلمان مکمل طور پر ملک کی حکومت سے بے دخل ہو جائیں گے اور آخر کار ہندو اکثریت کے غلام بن کر رہ جائیں گے ۔ جب ۱۸۹۲ء کے ایک قانون کی رُو سے کونسلوں میں توسیع ہوئی اور ان میں منتخب عناصر کے لیے گنجائش نکالی گئی تو یہ خطرہ اور بھی کھل کر سامنے آ گیا ۔ انتخابات کا مجوزہ طریقہ مسلمانوں کے قومی تشخص کو ختم کرنے کا سب سے آسان راستہ تھا ۔ چوہدری خلیق الزمان نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں سرسید نے اپنے بیٹے سید محمود کو کہہ کر ایک یادداشت تیار کروائی جس کا منشا یہ تھا کہ الیکشن کے طریقے میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا بندوبست ہو سکے ۔

اکثریت کو مطمئن کرنے کی برطانوی کوشش

جب تک سرسید جیتے وہ اپنی قوم کے نقطہ نظر کو کامیابی کے ساتھ حکومت تک پہنچاتے رہے ۔ ان کے جانشین کو اتنا اثر رسوخ حاصل نہ تھا ۔ کانگریس کے پلیٹ فارم پر تند و تیز تقریریں کرنے والوں سے تو حکومت دبتی تھی ۔ لیکن مسلمانوں کی ضروریات کو ناقابلِ التفات قرار دیتی تھی ۔ اور ان کی ہر بات سُنی اَن سُنی کر دیتی تھی ۔ حکومت کی صغری پروری کی روش اس ملک کی ایک روشن مثال تھی ۔ بعد کے پے در پے

واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو اپنی اکثریت تعلیم، ثروت اور اقتصادی برتری کی بنیاد پر اس ملک پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور بدیشی حکومت کے کل پرزے بھی ان پہ مائل بہ کرم ہیں۔ اپنے مستقبل کی تیاریاں کرتے کرتے "جمہوریت" اور "نمائندہ حکومت" کے تذکرے ہر وقت سرکردہ ہندوؤں کی زبان پر ہوتے تھے۔ مسلمان اس سارے منظر کو بے چینی سے دیکھ رہے تھے۔ اور گومگو کے عالم میں تھے۔ تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی شورش نے ان کو ایک اور جھٹکا دیا پہلے پہل تو حکومت نے ہندوؤں کی ناراضگی کو اتنی اہمیت نہ دی۔ لیکن جب حالات خراب ہوئے تو انگلستان کی لبرل حکومت کے وزیر ہند مارلے نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ہندوؤں کے نمائندہ حکومت والے مطالبے کو کسی حد تک تسلیم کر کے ایجی ٹیشن کے زور کو توڑا جائے۔ مارلے نے اپنے اعلان میں بتایا کہ کونسلوں کی رکنیت کو بڑھا دیا جائے گا۔ اور ان سے نمائندہ عناصر کو جگہ دی جائے گی۔ یہ بھی نظر آتا تھا کہ کونسلوں کے اختیارات کو وسیع کر کے ان کے ارکان کو حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے کا حق بھی دیا جائے گا۔ اس سے اکثریت کا دبدبہ اور بھی بڑھنے لگا۔ اور اقلیت کی کمزور آواز اور بھی دب جائے گی۔

شملہ وفد

(۱) ابتدائی مراحل

مارلے کے خیالات سے مسلمان لیڈروں کو بہت پریشانی ہوئی۔ اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں باہمی گفت و شنید ہوئی۔ ابتداءً علی گڑھ تحریک کے قائدین کی طرف سے ہوئی۔ انھوں نے دوسرے صوبوں کے سرکردہ مسلمان راہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ اقرار پایا کہ مسلمانوں کے خدشات سے حکومت کے سربراہ لارڈ منٹو کو آگاہ کیا جائے۔ اسی سلسلے میں محسن الملک نے علی گڑھ کے پرنسپل آرچ بولڈ کو جو تعطیلات کے دن حکومت کے گرمائی صدر مقام شملہ میں گزار رہا تھا، ایک چٹھی لکھی کہ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ سمتھ کے پاس جا کر دریافت کرے کہ اگر وائسرائے مسلمانوں کی جائز شکایات سننے کے لیے آمادہ ہو تو مسلمانوں کا ایک وفد ملاقات کے لیے ترتیب دیا جائے۔ ڈنلپ سمتھ سے تفصیلات طے کرنے کے بعد آرچ بولڈ نے محسن الملک کو اثبات میں جو خط لکھا اس کا اصل تو موجود نہیں لیکن اس کا اردو ترجمہ سید نفیس احمد بنگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں مل جاتا ہے۔ اس خط میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تحریر کا انداز زمانے

قاعدے کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جن پر الزام تراشوں کا ایک طومار باندھ دیا گیا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے آرچ بولڈ نے اس بات کی پیشکش کی کہ وائسرائے کے روبرو پیش کیا جانے والا ایڈریشن مجھ سے لکھوا یا جائے کیونکہ میں سپاس نامے لکھنے کے فن میں طاق ہوں۔ اس کے علاوہ پرنسپل نے محسن الملک کو یہ سبق پڑھانے کی کوشش بھی کی کہ وفد انتخابی اصول پر زور نہ دے بلکہ یہ مطالبہ کرے کہ بننے والی کونسلوں میں مسلمانوں کی حکومت اپنی پسند کے مطابق پورا کرے۔ نکتہ چینوں کی صوابدید کے مطابق یہی دو باتیں سب سے اہم ہیں۔ ایڈریس کا مسودہ حسین بلگرامی (جن کو عام طور پر عماد الملک کہا جاتا ہے) نے تیار کیا۔ لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں اس کی منظوری دی گئی۔ کسی مرحلے پر یہ ایڈریس آرچ بولڈ کے ہاتھوں یا نظروں سے نہیں گزرا۔ بلکہ ایڈریس میں آرچ بولڈ کے اس مشورے کو کہ مسلمان الیکشنوں میں واقع ہونے والی کمی کو حکومت کی نمائندگی کے ذریعے پورا کرنے کی درخواست گزاریں۔ نظر انداز کر دیا تھا۔

(ب) وفد کے مطالبات۔ وائسرائے کا جواب

وائسرائے کا جواب۔ جب ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔ تو وفد کے ۳۵ ارکان نے جو مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے تھے آغا خان کی سرکردگی میں پہلی اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے منٹو سے ملاقات کی۔ ایڈریس کسی قدر طویل تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر وہی باتیں کہی گئی تھیں جو سرسید کے وقت سے مسلمان حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھیں یعنی جمہوریت کے مغربی اداروں کو ہندوستان جیسے ملک میں مناسب تبدیلیوں کے بغیر رائج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ قائم ہونے والی کونسلوں کو موثر نمائندگی ملے اور مسلمانوں کے نمائندے صرف مسلمان ووٹروں کی رائے سے چنے جائیں۔ وائسرائے نے اس ایڈریس کا حوصلہ افزا جواب دیا۔ جس سے مسلمان حلقوں میں امید بندھ گئی۔ کہ شاید ان کی بات مان لی گئی ہے۔ لیکن یہ خوش فہمی کس قدر قبل از وقت تھی۔

مخالفوں کی کوشش

جب وائسرائے نے حکومت برطانیہ سے اس مطالبے کو قبول کرنے کی سفارش کی تو ایک غیر متوقع صورت حال پیدا ہو گئی۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک درجن کے قریب حکومتی پارٹی کے ایسے ارکان تھے جو ہندوستان میں ملازمت کر چکے تھے۔ ہندو راہنماؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ یہاں کے حالات پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اور بعض حالتوں میں ان کے تنخواہ دار ایجنٹ بھی تھے۔ ان ممبروں

نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر مسلمانوں کے لیے حق جداگانہ انتخاب کی سر توڑ مخالفت کی۔ اور بار بار اس مسئلے کو چھیڑ کر اپنی حکومت کو پریشان کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ کامیاب ہوجاتے لیکن ہندوستان کے اندر مسلمانوں نے اس رویے کی خلاف پرجوش احتجاج کیا۔

جداگانہ انتخاب کی منظوری

انگلستان میں سید امیر علی نے اپنی بے نظیر فراست اور اور اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے مخالفوں کے استدلال کو بے اثر بنایا۔ اور برطانوی حکومت کو وائسرائے کے وعدے کا پاس کرنا پڑا۔

یہ بات یاد رکھنا از حد ضروری ہے کہ۔

مسلمانوں نے نہایت استقلال کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور یہ مہم تین سال کی جدوجہد کے بعد سر کی۔ ۱۹۰۹ء میں جو اصلاحات رائج گئیں ان میں جداگانہ انتخاب کا اصول شامل کر لیا گیا۔ مسلمان اور ہندو ووٹروں کے نام علیحدہ علیحدہ رجسٹروں میں درج کیے گئے اور دونوں قوموں کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے بنائے گئے یہ طریقہ انتخاب برطانوی دور حکومت کے آخر تک جاری رہا۔

ہندو اور جداگانہ انتخاب

جداگانہ انتخاب کا حصول مسلمانوں کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ جو حصول پاکستان کا ذریعہ بنا۔ اگر مخلوط انتخاب کا طریقہ جاری رہتا۔ تو مسلم علیحدہ طور پر اپنے اپ کو منظم نہ کر سکتے اور جلد یا بدیر اکثریت میں جذب ہو کر اپنا قومی تشخص کھو بیٹھتے۔ اس احساس کے ماتحت کہ جداگانہ طریق انتخاب سے قوم کو سیاسی تنظیم کے بغیر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ یہ بھی یاد رہے کہ ۱۹۰۶ء کا مطالبہ اسی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ اور ان کے مفاد بھی بہت حد تک علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جداگانہ انتخاب کے اجراء سے ہندو بہت برہم ہوئے اور ان کے اہم ترین لیڈروں نے یک زبان اس کی مخالفت کی۔ صرف گوکھلے نے اپنی قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر تم اس ملک میں اقلیت میں ہوتے تو تم بھی اپنی حفاظت کا انتظام اس طرح پر کرتے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ ہندو لیڈر یہ بات کہتے نہ تھکتے تھے کہ حکومت نے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ اور جداگانہ انتخاب کے بل پر مسلمانوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوجائے گی۔ یہ سارا شور و شغب برطانوی حکومت کو دھمکانے کے لیے تھا۔ ورنہ مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء کے آئین کے تحت جو نفع پہنچا وہ صرف اتنا تھا کہ سارے ہندوستان کی

ساری کونسلوں کی کل ۲۱۴ نشستوں میں جداگانہ بنیاد پر مسلمانوں کو صرف ۱۶ نشستیں دی گئی تھیں ۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہندو اس بات کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کونسلوں کی رکنیت کا نو فیصد حصہ بھی مسلمانوں کو ملے ۔

۱۹۱۱ء میں جب تقسیم بنگال کو منسوخ کیا گیا تو مسلمانوں کا مفاد بُری طرح مجروح ہوا ۔ حالات تیزی سے تبدیل ہوئے ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا۔ اور ان کی جداگانہ حیثیت کو مان لیا گیا ۔ ہندوؤں کا یہ موقف کہ جداگانہ انتخاب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے ۔ قطعی طور پر غلط نکلا۔ جب ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کو مان لیا تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی فضا قائم ہو گئی تھی ۔ اصل بات تو یہ تھی کہ جداگانہ انتخابات ہندو مسلم اختلافات کا نتیجہ تھے ۔ ان کا سبب نہیں ۔ معاہدہ لکھنؤ پر ہندو چند سال تک قائم رہے۔ یہی وہ سال ہیں جب کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس ساتھ ساتھ ایک ہی شہر میں منعقد ہوتے تھے۔

۱۹۲۴ء ۔ کے بعد جداگانہ انتخاب کی مخالفت ۔

۱۹۲۴ء میں ہندو مہا سبھا نے جداگانہ انتخاب کے خلاف بھرپور پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ یہ پروپیگنڈہ عجب نوعیت کا تھا ۔ اگر کسی ہندو بنیے اور اس کے مسلمان مقروض کے درمیان لین دین کا کوئی جھگڑا اٹھتا اور بیچ بچاؤ کرنے والے فساد پر اتر آتے۔ مہاسبھائی لیڈر جھٹ پٹ کہہ دیتے کہ اس فساد کی وجہ جداگانہ انتخاب ہے ۔ اگر چلتی ریلوے ٹرین میں کوئی مسلمان عورت غلطی سے کسی مسافر ہندو عورت کے برتن کو چھو دیتی تو اس پر شور مچتا ۔ اور ہاتھا پائی تک نوبت پہنچتی ۔ تو اس کی وجہ ہی جداگانہ انتخاب بھی بتائی جاتی تھی۔ یہی طفلانہ منطق زندگی کے دوسرے شعبوں میں پیش کی جاتی تھی ۱۹۰۶ء کے بعد عملی طور پر کانگریس ہندو مہاسبھا کی باندی بن گئی ۔ تو یہ بھی جداگانہ انتخاب کے خلاف ہندو مہاسبھا کی نعرہ بازی میں شامل ہو گئی ۔ جب ہندو جماعتوں میں اس مسئلے پر متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ تو مسلمانوں کا رویہ بھی مضبوط ہو گیا۔ اور وہ بھی کسی قیمت پر جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے واقعات کو مسلمانوں کے اس رویے کی تصدیق کرتے تھے ۔ جہاں جہاں چند مخلوط انتخابی حلقے برقرار رکھے گئے تھے وہاں کسی مسلمان امیدوار کا کامیاب ہونا ۔ ناممکن تھا۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۶ء میں جب میاں فضل حسین نے پنجاب یونیورسٹی کے مخلوط حلقے سے پنجاب کونسل کا انتخاب لڑنا چاہا تو انھوں نے اپنے ہم نفس ہندو دوستوں سے رابطہ قائم کیا ان میں سے ۲۷ ہندوؤں نے ان کو کہا کہ واقعی آپ

بہت لائق و فائق آدمی ہیں اور ہر طرح سے کونسل کی رکنیت کے اہل ہیں لیکن ہم آپ کو ووٹ نہیں دے سکتے۔ اس حلقے میں ہندؤوں کی اکثریت تھی اور میاں فضل حسین کی کامیابی کی کوئی توقع نہیں تھی۔ وہ صرف اس لیے منتخب قرار دے دیئے گئے کہ ان کے مدمقابل کی نامزدگی کے کاغذات ٹیکنیکل بنیاد پر نامنظور ہو گئے تھے۔ اسی طرح دہلی شہر کے مخلوط انتخابی حلقے میں ہندؤوں کی اکثریت تھی وہاں دسمبر ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں مشہور و معروف مسلمان کانگریسی آصف علی مرکزی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار بنے چونکہ وہ کانگریس کے سرکردہ لیڈر تھے اس لیے کانگریس نے ان کے مقابلے پر کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا لیکن در پردہ سازش کر کے ایک ہندو مہاسبھائی کو ان کا حریف بنا دیا جب نتیجہ نکلا تو کانگریس اور ہندؤوں کی قوم پرستی کا پول کھل گیا مولانا محمد علی نے قرائن سے اندازہ لگایا کہ کسی ہندو نے بھی آصف علی کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ مسلمان تھے۔ اس موقع پر دہلی کے چیف کمشنر نے حکومت کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس حلقے سے کبھی کسی مسلمان کا منتخب ہونا غیر یقینی ہے۔

۱۹۴۰ء میں مسلمان جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے اس لیے دست بردار ہو گئے تھے کہ اب مسلمانوں کا مقصد برصغیر میں اسلامی سلطنت قائم کرنا تھا۔

باب ۱۱

مسلم لیگ کا قیام

مسلم لیگ کی بنیاد دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں رکھی گئی۔ اس سال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے کا انعقاد اسی شہر میں قرار پایا تھا۔ مندوبین کو پہلے سے اطلاع دی جا چکی تھی کہ کانفرنس کے اختتام پر ایک دن کے لیے سیاسی معاملات پر صلاح مشورہ ہوگا۔ ۳۰ دسمبر کا دن اس مقصد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن تمام صوبوں کے سرکردہ اور نمائندہ مسلمانوں کا ایک اجلاس کانفرنس کے پنڈال میں ہوا۔ رسمی کاروائی کے لیے کم وقت رکھا گیا تھا۔ کیونکہ بہت سے ڈیلی گیٹ اسی دن دوپہر کو سپیشل گاڑی کے ذریعے کلکتہ کو واپس جا رہے تھے لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کی نشستوں کے دوران ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کے موضوع پر مندوبین کے درمیان بات چیت ہوتی رہی تھی۔ مقررہ وقت سے کچھ عرصہ بعد پٹنہ کے مسٹر مظہر الحق نے وقار الملک کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا اور ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے نوجوان سیاست کے میدان میں کودنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان کے گرم خون کی رہنمائی کا فریضہ وقار الملک کا تدبر اور توازن ہی انجام دے سکتا ہے۔

رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد وقار الملک نے حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا اور مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

مسلمانوں کے خدشات

مسلمانوں کی آبادی اس ملک کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ جب برطانوی حکومت یہاں سے رخصت ہوگی تو اقتدار اعلیٰ اس قوم کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جو تعداد میں ہم سے چار گنا ہے۔ اس وقت صورت حال کیا ہوگی؟ ہماری زندگیاں ہماری املاک، ہمارا ناموس اور ہمارا مذہب سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس وقت جب کہ برطانوی حکومت جیسی قومی حکومت ہمارے درمیان موجود ہے تو ہم اپنے اقتدار کے ہندو کے ہمسایوں کے ہاتھوں ہر صوبے، ہر ضلع اور ہر شہر میں پریشان ہیں۔ جب یہ دور ختم ہو جائے گا تو ہم ان لوگوں کے رحم وکرم پر ہوں گے جو مسلمانوں سے اورنگ زیب اور اس سے پہلے کے مسلمان بادشاہوں کے حقیقی یا فرضی مظالم کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اس صورت

حال کا مقابلہ کرنے کے لیئے ہمیں اپنی قوت کو ایک مرکز پر لانا ہوگا۔ ہمیں کانگریس سے کوئی عداوت نہیں۔ ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ اخلاق، ہمدردی اور انصاف سے پیش آئیں گے۔ کانگریس نے چند ایسے کام کیے ہیں۔ جن کا فائدہ ہم کو بھی پہنچا ہے۔ اعتدال پسندی ہماری طبیعت کا خاصہ ہے اور یہی ہماری جماعت کا امتیازی نشان ہوگا۔"

نواب سلیم اللہ خان کے خیالات

جب وقار الملک اپنی تقریر ختم کر چکے تو نواب سلیم اللہ خاں نے نئی سیاسی جماعت کی تاسیس کا ریزولیشن پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم اپنی روائتی پالیسی پر کاربند رہتے اور تعلیم کی اشاعت سے ہمارے سب قومی مقاصد پورے ہوجاتے تو آج ہم کو کوئی سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ قدم صرف مجبوری کی حالت میں اٹھایا جارہا ہے صورت حال یہ ہے کہ برطانیہ کا صاحب اقتدار طبقہ ہندوستان کے حقیقی حالات سے بے خبر ہے۔ ان کی نظروں میں خاموشی سے کام کرنے والے بے لوث کارکنوں کی کوئی قدر نہیں۔ اقلیت کے مفاد کو ایک طاقت ور اکثریت مسلسل نظر انداز کرتی چلی آرہی ہے حالات نے ثابت کر دیا کہ ہماری شکائتیں بالکل جائز ہیں۔ ہمارے بزرگ لیڈر سر سید احمد خاں نے ۱۸۸۷ء میں قوم کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا تھا۔ یہ مشورہ قطعی طور پر صائب تھا۔ انھوں نے خود ۱۸۹۳ء میں ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں بھی لکھنؤ میں اس غرض سے مسلمان عمائد کا ایک اجتماع ہوا تھا۔ آج کل مشرقی بنگال جس بحران سے گزر رہا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک فیصلہ کن قدم اٹھا کر اپنے آپ کو منظم کریں۔ اس وقت ہمارے سامنے چار راستے ہیں:۔

اوّل ہم پہلے کی طرح سیاست سے بے تعلق رہیں۔

دوم سیاست کے میدان میں داخل ہو کر براہِ راست ہندوؤں کی مخالفت شروع کردیں۔

سوم خود ہی کانگریس کے حاشیہ بردار بن جائیں۔

چہارم اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنائیں۔

کانگریس میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۸۸۷ء سے لے کر اب

تک ہم اسی موقف پر قائم ہیں۔ صرف ہندوؤں کی مخالفت کرنے کے لیے علیحدہ جماعت بنانا بھی خارج از بحث ہے۔ ہمارے بدترین دشمن بھی ہم پر کسی قوم کی مخالفت کا الزام نہیں دھر سکتے۔ سیاست سے پرے پرے رہ کر بھی دیکھ لیا۔ ہماری خاموشی نے ہمیں کمزور بنا کر ہمیں بہت سی صبر آزما مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔ ہم اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ شر پسندی اور شورش سے دور رہیں گے۔ سیاست کے میدان میں داخل ہو کر سلامت روی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ ہم متحد ہوں گے۔ ہماری جماعت ایک نمائندہ جماعت ہو گی جو مسلمانوں کے احساسات کو حکومت تک پہنچائے گی۔ لیگ کی سپرٹ یہ ہو گی!

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے۔

لیگ کا وجود میں آنا

حکیم اجمل خاں نے قرارداد کی تائید کی۔ دوسری تقریریں ظفر علی خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد، شیخ عبداللہ اور مسٹر محمد علی کی طرف سے ہوئیں۔ جماعت کا نام مسلم لیگ رکھا گیا۔ محسن الملک اور وقار الملک اس کے جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ دلبعد میں آغا خاں اس کے صدر مقرر ہوئے، لیگ کا آئین بنانے کے ایک مختصر سی کمیٹی نامزد کی گئی۔ چوتھی اور آخری قرارداد میں تقسیم بنگال کی حمایت کی گئی اس کو مسلمانوں کے حق میں مفید بتایا گیا اور اس کے خلاف برپا ہونے والی طوفانی شورش کی حوصلہ شکنی کا مطالبہ کیا گیا۔

سیاسی حالات اور لیگ کے بانیوں کے خیالات

اگر ۳۰ دسمبر والے اجلاس کی کارروائی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو لیگ کے بانیوں کے خیالات اور ان دنوں کی سیاسی حالات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے:

(الف) لیگ کے بانی زیادہ تر وہی لوگ تھے جو ماضی میں سرسید کی تعلیمی تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان کے نزدیک سیاست ایک بدمزہ چیز یا بے مزہ تھی۔ وہ اپنی خوشی سے سیاست کے میدان میں نہیں آئے۔ بلکہ حالات کے ریلے نے ان کو اس طرف دھکیل دیا تھا۔

(ب) مسلمانوں کی طرف انگریز حکمرانوں اور ہندو ہمسایوں کا رویہ یکساں طور پر معاندانہ تھا۔ انگریزوں کے دل سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے خونی نقوش ابھی تک محو نہیں ہوئے تھے۔ بدستور مسلمانوں سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو حکمرانوں کے قریب لانے کے لیے جو کوششیں کیں تھیں۔ اُن کی کامیابی جزوی تھی۔ شروع ہی سے ہندوؤں کے تجارتی مفاد انگریزوں سے وابستہ تھے۔ انھوں نے ہر موقع پر انگریزوں اور مسلمانوں کی باہمی بیزاری میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب حکومت کسی اہم یا غیر اہم عہدے پر کسی مسلمان کا تقرر کا فیصلہ کرتی تو ہندو اخبار جھٹ پٹ منتخب ہونے والے مسلمان کی اہلیت کا مقابلہ اس کے ہندو حریفوں سے کرتے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ انتخاب جلدی میں کیا گیا ہے اور تمام امیدواروں کی صلاحیتوں کا مناسب جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس طرح کی نکتہ چینی کے خوف سے حکومت مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے میں بھی پس وپیش کرتی تھی۔ دوسری طرف کانگریس کے پلیٹ فارم پر جو ہندو لیڈر حکومت کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے، ان کو حکومت کے ایوانوں میں بازیابی حاصل ہوتی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کے فہم سے بالا تھی کہ ہماری قوم تو حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے سے ہمیشہ پرہیز کرتی ہے لیکن حکومت اپنے مخالفوں کی دلجوئی اور عزت افزائی کرتی ہے۔ اس لیے جدید تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کا ایک طبقہ کانگریس کی رہنمائی اور کارگزاری سے متاثر تھا اور اس بات کے لیے مضطرب تھا کہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اپنی شکائتوں کا اظہار کرے۔ مسلم رہنما کو نوجوانوں کے رویے سے خاصی تشویش بھی اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے بھی کانگریس جیسا ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ جو نوجوانوں کے قومی جوش کو قومی مفاد کی خاطر استعمال کر سکے۔

(ج) ہندوؤں میں متعین انگریزی حکومت کے کارکن مسلمانوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے لیکن انگلستان کے عائد تو لیاں کے حقیقی حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کو نہ تو ہندو مسلم اختلافات کا علم تھا اور نہ ہی وہ اپنے ہم وطنوں کی مسلم دشمنی سے آگاہ تھے۔ ہندوستان کے معاملات پر برطانوی پارلیمنٹ کی نگرانی برائے نام تھی۔ پارلیمنٹ کے ارکان مسلمانوں کے حالات اور ان کی ضروریات

سے ناواقف تھے۔ البتہ دارالعلوم میں ایک درجن کے قریب ایسے ممبر تھے۔ جو کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ قریبی رابطہ رکھے ہوئے تھے ان کی معرفت ہندوؤں کا نقطہ نظر علی التواتر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوتا رہتا تھا۔ یہ صورت کئی سال سے چلی آ رہی تھی۔ بعض انگریز کانگریس سے باقاعدہ مالی امداد حاصل کر کے انگلستان کے بااثر حلقوں میں ہندوؤں کے حق میں پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ مسلمان ان وسائل سے بالکل محروم تھے۔ پارلیمنٹ کے روبرو ان کا کیس پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس مشکل کا شدت سے احساس تو تھا لیکن اس سلسلے میں قوم نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تھا۔ توقع یہی تھی کہ ایک سیاسی جماعت کے قیام سے یہ دقت کسی حد تک رفع ہو جائے گی۔

(د) تقسیم بنگال سے پہلے بھی ہندوؤں کا قومی شعور بہت حد تک پیدا ہو چکا تھا۔ تقسیم کی تنسیخ کے لیے جو شورش ہوئی اس میں بارود بھرنے کے لیے ہندو لیڈروں نے مذہب کا سہارا لیا۔ سردیشی اور دہشت زدگی کی تحریکوں کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے ان میں بہت سی خالص ہندووانہ رسمیں شامل کر لی گئیں۔ کلکتے کا ذی اثر پریس ان تحریکوں کی پرجوش حمایت کرتا تھا۔ یہ اخبار اپنے پڑھنے والوں کو دن رات اس بات کا یقین دلاتے رہتے تھے کہ یہ تقسیم صرف بنگالی ہندوؤں کو ان سیاسی بیداری کی سزا دینے اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی ہے اس لیے وہ ایک سانس میں مسلمانوں اور انگریزوں دونوں پر برستے تھے۔ اور دونوں کو گالیوں کی بوچھاڑ کا نشانہ بناتے تھے۔ ایک ہندو دیوی نے ان مسلمان سپاہیوں کے خلاف جنھوں نے ایک فرقہ وارانہ فساد میں زیادتی کرنے والے فریق سے نپٹنا چاہا تھا، ایک اخبار کو یہ خط لکھا کہ جب تک ان خطاکاروں کو زندہ آگ میں نہیں جلا دیا جاتا ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ایسی باتوں سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بگاڑ پڑا۔ یہاں تک کہ اس مسموم فضا میں بعض سکولوں میں ہندو طلبا نے اپنے ہم جماعت مسلمان طلبا کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے سکولوں کی انتظامیہ کو ہندو اور مسلمان طالب علموں کی تعلیم کا بندوبست علیحدہ علیحدہ کمروں میں کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے خلاف مخالفت کا لاوا ہر دم پھوٹتا اور اس کی تندی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وقارالملک کی صدارتی تقریر جس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے اسی ذہنیت کی نشان دہی کرتی ہے۔

لیگ کے ابتدائی سال

پہلے پانچ سالوں میں تو لیگ اپنے بیان کردہ مقاصد کے مطابق اپنے پروگرام پرکاربند رہی۔ لیکن اپنی تمام اعتدال اور رواداری کے باوجود مسلم لیگ کے لیے بنگال کی شورش کے بارے میں منہ بند رکھنا مشکل تھا۔ ۱۹۰۸ء میں امرتسر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدر منتخب سید امیر علی کی غیر حاضری میں سید علی امام نے جو خطبہ صدارت پڑھا اس میں کانگریس کی سیاست اور اس کے عزائم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے ہمیں حکومت خود اختیاری صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ کہ ہندوستان کی دو بڑی بڑی قوموں کے باہمی اختلافات اس حد تک رفع ہو جائیں کہ ان کے دلوں میں متحدہ قومیت کا جذبہ بیدار ہو جائے لیکن موجودہ حالات میں یہ امر محال نظر آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ملک کے سب سے ترقی یافتہ صوبے یعنی بنگال کے اندر ایک دلازار اور تعصب سے بھرے ہوئے بندے ماترم کے نعرے کو قومی نعرہ بنایا جاتا ہے اور راکھی بندھن کی فرقہ وارانہ ریت کو قومی رسم کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو میرا دل مایوسی کے جذبات سے بھر جاتا ہے اور میرا یہ شعبہ کہ خالص ہندووانہ تصورات کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے لبادے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یقین میں بدل جاتا ہے۔ . . . میں کلکتہ اور پونا میں بسنے والے قوم پرستوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ مسلمانوں سے یہ توقع کیوں کر لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر بندے ماترم کا گیت گائیں یا سیواجی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریبوں میں شرکت کریں۔ جس جمہوریت کا راگ الاپا جا رہا ہے وہ مسلمانوں کے لیے صرف آقاؤں کی تبدیلی کا پیغام ہے۔ سر علی امام نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ مسلمانوں کو تو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے ہر پہلو میں اپنے اعمال اور افعال کے لیے مذہبی احکام کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا سارے کا سارا نیشنلزم مذہبی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اسی جلسے میں ہی ایک طویل تقریر کے دوران محمد علی نے جو ابھی مولانا نہیں کہلاتے تھے، برطانوی حکومت کی ان خفیہ بلکہ سازشی کارروائیوں کو بے نقاب کیا جن سے وائسرائے منٹو کے وعدے کے باوجود وہ نہایت چابک دستی سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے حق سے محروم کرنا چاہتی تھی۔

۱۹۱۱ء کے بعد حالات

۱۹۱۱ء کے بعد لیگ کے رویّے میں تبدیلی

نے پلٹا کھایا۔ دسمبر میں تقسیم بنگال منسوخ ہوئی، اس کی منسوخی، ایجی ٹیشن اور دہشت زدگی کی فتح تھی۔ ہندوؤں کو برطانوی حکومت کے اس اقدام سے بے پایاں مسرت ہوئی۔ انھوں نے شہروں بلکہ دیہات میں بھی چراغاں کیا۔ کھلے میدانوں میں ہزاروں من ایندھن جلایا اور روشنی کر کے فتح کا جشن منایا۔ مسلمانوں کو بھی اپنی بے حیثیتی کا اندازہ ہو گیا۔ وقار الملک (جو سرسید کے مکتبۂ فکر کے اہم رکن تھے) نے لکھا کہ تنسیخ کا اعلان ایک توپ خانے کی مانند تھا جو ہماری زندہ لاشوں کے اوپر سے گزر گیا۔ مولانا محمد علی نے اس اعلان کو حکومت کی بدترین بدعہدی اور غداری سے تعبیر کیا۔ ملک کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کا ردِ عمل اس سے مختلف نہ تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مسلسل اور واضح احتجاج کے باوجود مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا ایک حصّہ گرائے جانے اور نہتے مسلمان مظاہرین پر فائرنگ ہونے سے مسلمانوں کی طرف انگریز حکام کی فرعونیت عیاں ہوگئی۔ مسلم یونیورسٹی کے مطالبے پر حکومت کے معاندانہ رویے نے قوم کو اور بھی مشتعل کیا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں اور ان کے بارے میں برطانوی حکومت کے مسلم کش رویے نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ان تمام واقعات سے قوم کا اندازِ فکر یک سر بدل گیا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلک میں بھی تبدیلی آئی۔ انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ عارضی طور پر مسلم لیگ کو کانگریس کے قریب لے گیا۔ ۱۹۱۱ء میں لیگ کے صدر نبی اللہ نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندوستان کے انگریز حکام پر یہ الزام لگایا کہ وہ دو بڑی بڑی قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اس قسم کی گستاخی لیگ کے پلیٹ فارم پر پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی۔ ۱۹۱۲ء کے سالانہ اجلاس میں لیگ کے پلیٹ فارم پر ہندو لیڈر بھی موجود تھے۔ ان کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں میں گورنمنٹ کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی کے جذبے کو کانگریس کا اثر رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔

لیگ کے مقاصد میں تبدیلیاں

انھی دنوں مسلم لیگ نے اپنے اغراض و مقاصد میں بعض تبدیلیاں کر دیں۔ پہلی تبدیلی تو یہ تھی کہ آئندہ سے قوم کی وفاداری کا مرکز حکومت ہند نہیں بلکہ برطانیہ کے شہنشاہ کی ذات ہوگی اس سے "وفاداری" کی پرانی پالیسی کا خاتمہ ہوا۔ دوسرے لیگ نے بھی کانگریس

کی طرح سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس سلسلے میں جو محاورہ استعمال کیا گیا وہ سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ تھا۔ اس سے لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ برق رفتار سیاست کے حامی اپنے آپ کو احرار کہتے اور سوٹ ایبل کے لفظ کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان میں شبلی پیش پیش تھے۔ لیکن "سوٹ ایبل" کا لفظ بہت سے لیگی راہنماؤں کی نظر میں بہت اہم تھا۔ مولانا محمد علی اس کا یہ مطلب لیتے تھے کہ مسلمانوں کو بھی اس سلف گورنمنٹ یعنی حکومت خود اختیاری میں اپنا مناسب حصّہ ملے۔

لیگ میں جناح کی شمولیت

۱۹۱۳ء کے موسم گرما میں مولانا محمد علی اور وزیر حسن کانپور کی مسجد اور دوسرے قومی معاملات کے متعلق برطانوی حکومت تک مسلمانوں کے جذبات پہنچانے کے لیے انگلستان گئے۔ محمد علی جناح بھی کانگریس کے ایک مشن کے سلسلے میں وہیں قیام پذیر تھے۔ محمد علی اور وزیر حسن دونوں جناح کے پاس پہنچے اور انھیں لیگ میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح برِ مسلمانانِ ہند کے آئندہ قائداعظم، اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مولانا محمد علی جس مقصد کے لیے انگلستان گئے تھے۔ وہ تو پورا نہ ہوا لیکن ان کے اپنے الفاظ میں (میرے سفر کا ٹھوس نتیجہ) یہ نکلا ہے کہ میں جناح کو لیگ میں لے آیا ہوں۔ اس واقع کی جو لفظی تصویر کشی مسز نائیڈو نے کی ہے وہ شاعرانہ مبالغہ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وزیر حسن اور محمد علی دونوں کو جناح نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں لیگ کی رکنیت تو قبول کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ اگر کہیں کسی مرحلے پر لیگ اور کانگریس ہوگی۔ لیگ نہیں۔ یہ قصہ ایسی دلاویز عبارت میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا چھٹ پٹ ایمان لے آتا ہے۔ مسز نائیڈو کے الفاظ کو اتنی بار دھرایا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس کو مسلمہ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو قائداعظم کے ارادے کی محکمی اور سیرت کی پختگی کا اندازہ تھا وہ اس روائت کو روائت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیں گے۔ کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت کی جو کوششیں ۱۹۱۲ء میں شروع ہوئی تھیں۔ ان کا نتیجہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس معاہدے سے مسلمانوں کو کچھ خسارہ تو ضرور ہوا لیکن اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت اور جداگانہ طریق انتخاب کو قبول کر لیں۔ بدلی ہوئی فضا میں کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک ساتھ ساتھ ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔

باب ۱۲

اسلامی سیاست میں بحران

(۱۹۱۱ء —— ۱۹۱۲ء)

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۳ء تک کے دو سالوں میں مسلمانوں کی سیاست میں دور رس بلکہ انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ ہر چند کہ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں قائم ہو چکی تھی اور اس کے سالانہ اجلاس بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ پھر بھی اس کے لیڈر سرسید کے مکتبۂ فکر کے محتاط ارکان تھے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو حکومت کی بدگمانی سے بچاتے تھے۔ اس لیے لیگ کو قرار دادوں اور اس کے پلیٹ فارم پر ہونے والی تقریروں میں احتیاط کا پہلو غالب ہوتا تھا۔ البتہ تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی شورش کی بھرپور مذمت کی جاتی تھی۔ اور جداگانہ انتخاب کے متعلق برطانوی حکومت کے منفی رویے پر حرف گیری ہوتی تھی۔ باقی ماندہ معاملات پر بحث تمحیص کے دوران نیاز مندی کا رنگ جھلکتا تھا۔

بحران کے اسباب ۱۹۱۱ء کے بعد پے در پے پیش آنے والے واقعات نے مسلمانوں کی سیاست کا رُخ بدل دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اہم واقعہ تقسیم بنگال کی تنسیخ تھی۔ یہ تقسیم ۱۹۰۵ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس وقت حکومت کا کہنا یہ تھا کہ یہ اقدام مشرقی بنگال کے علاقوں کی کسمپرسی دور کرنے اور ان کی انتظامی حالت کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ کئی سال پہلے ایک دو موقعوں پر سید امیر علی کی قائم کی ہوئی نیشنل سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن نے تقسیم بنگال کے حق میں ایک آدھ قرارداد پاس کی تھی۔ لیکن بحیثیت "مجموعی" مسلمانوں نے اس مطالبے کے پیش کرنے یا اس کے منظور کروانے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ تقسیم کے ابتدائی ایام میں چند مسلمانوں نے ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ لیکن جلد ہی قوم کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ تقسیم سے گذشتہ بے انصافیوں کا تدارک ہوگا۔ علاقے کے حالات بہتر ہوں گے اور امن عامہ کی فرضی ابتری کی اصلاح ہوگی۔ اس لیے مسلمان بہ یک زبان تقسیم کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ نئے صوبے میں کسی حد تک چند اصلاحی اقدامات کیے گئے۔ لیکن روزمرہ کی بدامنی، سودیشی تحریک کی گرماگرمی اور دہشت گردگی کے دھماکوں نے حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیا اور عملاً اس تقسیم سے مسلمانوں کو متوقع فائدہ نہ پہنچا۔

(الف) تقسیم بنگال کی تنسیخ

کہنے کو تو وزیر ہند مارلے نے تقسیم بنگال کو ایک "طے شدہ" حقیقت قرار دیا تھا اور یہاں کے برطانوی افسروں نے لوگوں کو بار بار یقین دلایا تھا کہ تقسیم کی تنسیخ خارج از بحث ہے لیکن تقسیم کے مخالفوں کی زیر زمین سازشیں اور ایجی ٹیشن کامیاب رہیں اور برطانوی حکومت نے خفیہ خفیہ تقسیم کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان ڈرامائی طور پر برطانیہ کے حکمران کی زبان سے ۱۹۱۱ء کے دربار دہلی کے موقع پر کروا دیا۔ یہ اعلان ہندوؤں کی زبردست فتح تھی۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کو اس سے سخت مایوسی ہوئی۔ بلکہ ان پر یہ اعلان بجلی بن کر گرا۔ کیونکہ تقسیم کو برقرار رکھنے کی متواتر یقین دہانیوں کے باوجود برطانوی حکومت اپنے وعدوں سے مکر گئی تھی۔ وقار الملک محمد علی اور نواب سلیم اللہ نے شاہی اعلان پر بہت کڑے انداز میں نکتہ چینی کی۔ اب مسلمانوں کے پاس اس بات کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے انگریزوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں اور صرف اپنی قوت بازو پر بھروسہ کریں۔

(ب) مچھلی بازار کانپور کی مسجد

مسلمانوں کے اس عزم میں پختگی پیدا کرنے والا دوسرا واقعہ کانپور میں مچھلی بازار والی مسجد کے متعلق تھا۔ یہ مسجد ایک سڑک کے کنارے پر واقع تھی۔ کانپور شہر کی میونسپلٹی اس سڑک کو چوڑا اور سیدھا کرنا چاہتی تھی۔ راستے میں مسجد حائل تھی چنانچہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسجد کے ایک حصّے کو گرا کر حاصل ہونے والی زمین کو سڑک کی توسیع کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس فیصلے سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلی چنانچہ بہت سے مقامی اور غیر مقامی مسلمانوں نے حکومت کے متعلقہ افسروں کو لاتعداد یادداشتیں اس مضمون کی بھیجیں کہ کمیٹی اپنے فیصلے کو واپس لے لے۔ صوبہ کے گورنر میسٹن (MESTON) سے مولانا محمد علی کی پرانی راہ و رسم تھی، انھوں نے اس معاملے کو اپنے اخبار میں تو جگہ نہ دی لیکن اپنے طور پر میسٹن پر برابر دباؤ ڈالتے رہے کہ حکومت مسلمانوں کے صبر کا امتحان نہ لے اور اپنے فیصلے کو بدل کر حالات کو بگڑنے سے روکے۔ لیکن نہ تو لاٹ صاحب پر اس استدعا کا کچھ اثر ہوا اور نہ ہی حکومت کے کسی افسر نے اس بات کا نوٹس لیا۔ چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو حکومت کے کارندوں نے چند ہزار احتجاج کرنے والے مسلمانوں کی موجودگی میں مسجد کے کچھ حصّے کو گرا دیا۔ ۳ اگست کو مسلمانوں نے پھر اسی جگہ مظاہرہ کیا۔ یہ لوگ صرف احتجاج کرنے کی غرض سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ لڑنا یا مرنا مارنا ان کا مقصد نہ تھا۔ ایک مجسٹریٹ ٹائلر کی نگرانی میں پولیس نے نہتے مظاہرین پر گولی چلائی۔ بہت سے مسلمان موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ اس المیہ سے بھی حکومت کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ بلکہ انھوں نے خون مسلم کی ارزانی کو حق بجانب ثابت

کرنے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں پر سرکاری منطق کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس واقعہ
کے تاثرات کو بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر قلم بند کیا۔ شبلی نے جو نظم لکھی
اس کا عنوان تھا: ”ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں“ یہ قطعہ مسلمانوں کے زخم خوردہ دل کی فریاد تھی۔ برطانیہ
کے اخبارات روز بروز مسلمانوں کے دینی جوش کو غلط رنگ میں پیش کر کے ان کے زخموں پر نمک پاشی
کرتے تھے۔ معاملہ یہیں پر بس نہ ہوا۔ بلکہ پولیس مظاہرین کو بلوائی قرار دے کر عدالتوں میں لے گئی۔ اس
سے مسلمانوں کی برہمی بڑھی اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی۔ ہندوستان
کے مختلف حصوں سے ملزموں کو صفائی کے لیئے درجنوں وکیلوں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حالات
کا یہ رُخ دیکھ کر میسٹن چار مہینے کی چھٹی لے کر انگلستان چلا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد وائسرائے ہارڈنگ
نے محسوس کیا کہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اپنی انتظامیہ کونسل کے مسلمان رکن سر علی امام کو اپنے
ہمراہ لے کر وہ خود کانپور گیا۔ سرکردہ مسلمانوں کے وفد سے گفت و شنید کے بعد اس نے مسجد کے گرائے
ہوئے حصے کو بنوانے کا متبادل انتظام کیا۔ ہارڈنگ نے اپنی جیب سے مسجد کے تعمیر ہونے والے
حصے کے لیئے چندہ دیا۔ برطانیہ کے اخباروں نے اس پر تند اور شذرے لکھے جن میں وائسرائے کی اس
”فیاضی“ کی مذمت اس لیے کی گئی کہ اس نے باغیوں اور شورش پسندوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس
سے معاملہ وقتی طور پر تو ختم ہو گیا لیکن مسلمانوں کا زخم مدتوں مندمل نہ ہو سکا۔

(ج) الحاق اور مسلم یونیورسٹی سے انکار

کانپور کی مسجد کا قضیہ ابھی اختتام کو نہ پہنچا تھا کہ مسلمانوں پر حکومت کا ایک اور عذاب نازل ہوا۔ علی گڑھ کالج
۱۸۷۵ء میں جاری کیا گیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں وائسرائے لارڈ لٹن کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔
اس وقت بانی کالج نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ ان کا تعلیمی منصوبہ اس دن تکمیل کو پہنچے گا جب اس کالج کو
یونیورسٹی کا درجہ مل جائے گا۔ سرسید سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کارکردگی سے سخت بددل تھے۔
ان کا عقیدہ تھا کہ یہ درس گاہیں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ ان میں نہ
مذہبی اور اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے۔ نہ ہی عربی کی تدریس کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کو اپنے
مذہبی فرائض پورا کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان اداروں پر ہندو اساتذہ چھائے ہوئے ہیں
اور ان کو مسلمان طالب علموں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں کے علاوہ اس درس گاہوں
کا معیار تعلیم بھی پست ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں کبھی کوئی نامور فلسفی یا
سائنس دان پیدا نہیں ہوا ان کے اپنے الفاظ یہ تھے کہ سرکاری یونیورسٹیاں صرف ”خچر“ بناتی ہیں۔ سرسید

دل و جان سے چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج پھل پھول کر ایک معیاری یونیورسٹی بنے اور مسلمانوں کی پرانی علمی روایات کو تازہ کرے۔ ان کی زندگی میں کالج میں علمی اور دینی فضا تو قائم ہوئی۔ لیکن سرسید کا بنیادی مقصد یعنی کالج کو یونیورسٹی بنانے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ان کی زندگی کے آخری سالوں میں کچھ ایسے حوصلہ شکن حالات پیدا ہو گئے تھے کہ وہ اس طرف کوئی توجہ ہی نہ دے سکے۔ ۱۹۰۲ء میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے دہلی میں منعقد ہونے والے اجلاس کی صدارت آغاخاں نے کی اور قوم کی توجہ یونیورسٹی کے قیام کی طرف دلائی۔ اس وقت سے یہ مسئلہ گفتگو کا موضوع تو بن گیا۔ لیکن عملی طور پر پیش رفت ہونے میں عرصہ لگا۔ ۱۹۱۱ء میں اس تجویز کا پھر جائزہ لیا گیا اور اس سلسلے میں عملی اقدامات شروع ہوئے۔ حکومت سے سلسلہ جنبانی کی گئی تو جواب ملا کہ کالج کو یونیورسٹی بنوانے کے لیے قوم پہلے تیس لاکھ روپیہ یونیورسٹی فنڈ میں جمع کرے۔ پھر اس تجویز پر غور ہوگا۔ اس زمانے میں تیس لاکھ روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ حکومت کے مشیروں کا یہ خیال تھا کہ نہ اتنا روپیہ جمع ہوگا اور نہ ہی اس تجویز پر غور کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن قوم اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھی۔ اس لیے روپیہ جمع کرنے کی تگ و دو جھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ فراہمی کے لیے چھوٹی چھوٹی پارٹیاں ملک کے کونے کونے میں پھیل گئیں۔ لیکن اس تگ و دو میں آغاخان اور مولانا شوکت علی نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ انھوں نے سارے ملک کا دورہ کئی ہفتوں میں ختم کیا اور تمام وقت ریلوے ٹرینوں میں ہی قیام کرتے رہے۔ قوم کی متفقہ کوششوں سے مطلوبہ رقم بہت جلد پوری ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حکومت کی توقع کے خلاف تھی۔ حکومت نے جب سنجیدگی سے اس معاملے پر غور شروع کیا تو مسلمانوں کے دو بنیادی مطالبات کو فوراً رد کر دیا۔ پہلا مطالبہ تو یہ تھا کہ مجوزہ ادارے کا نام مسلم یونیورسٹی ہو۔ حکومت کو لفظ "مسلم" سے عناد تھا۔ اس کی جوابی تجویز یہ تھی کہ اسے صرف علی گڑھ یونیورسٹی کہا جائے گا۔ "مسلم" کا واقعہ غیر ضروری ہے اس کے علاوہ مسلمان یہ بھی چاہتے تھے کہ تمام ملک کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام مسلم یونیورسٹی کے سپرد کر دیا جائے اور اس بات کی مجاز ہو کہ تمام اسلامیہ سکولوں اور کالجوں کا اپنے ساتھ الحاق کر سکے۔ اگر یہ بات مان لی جاتی تو ہندوستان کے مسلمان تعلیم کے معاملے میں خودمختار ہو جائیں۔ یہ بات بھی حکومت کے مقاصد کے خلاف تھی۔ جواب ملا کہ اگر مسلمان کالج کو یونیورسٹی بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو اس کی حیثیت صرف مقامی ہو گی اور اسے الحاق کے اختیارات نہیں دیے جا سکتے۔ حکومت کی شرائط کا اعلان ہونا تھا کہ اسلامی ہند میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا محمد علی نے شروع سے آخر تک اپنے اخبار میں یونیورسٹی کے مطالبے کی پرزور حمایت کی تھی اور حکومت کی منطق کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ حکومت کی ہٹ کے آگے سب

بے بس تھے۔

د پہلی عالمی جنگ کے شروع ہوتے پر معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور بالآخر ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کا اقامتی اور مقامی یونیورسٹی کا چارٹر ملا، تقسیم بنگال کی تنسیخ اور کانپور کی مسجد کے سانحے سے مسلمان پہلے ہی بگڑے بیٹھے تھے۔ تازہ ترین فیصلے سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ حکومت مسلمانوں کی کوئی بات بھی سننے کے لیئے تیار نہیں۔

(د) ترکوں کی ابتلا یہ تو ملک کے اندرونی حالات تھے، اسلامی دنیا کے مسائل کی سنگینی سے بھی مسلمانوں پر بہت سے چرکے لگے۔ ترکوں کی عثمانی سلطنت، اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی، جنوب مشرقی یورپ میں بلقان کے ممالک اور دنیائے عرب کے بہت سے حصے اس کے زیر نگین تھے۔ سلطان ترکی، ہندی مسلمانوں کے لیے خلیفۃ المسلمین بھی تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کو ترکوں اور ان کے سلطان سے عقیدت تھی۔ وہ ترکوں کے لیئے ہر وقت سینہ سپر رہتے تھے۔

لیکن یورپی ممالک مدت سے ترکی کو یورپ کا "مرد بیمار" قرار دے چکے تھے اور ترکوں کی وسیع سلطنت کے حصے بخرے کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کی سازشوں کی بدولت انیسویں صدی میں فرانسیسیوں اور انگریزوں نے شمالی افریقہ کے وسیع حصوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔

(ا) جنگ طرابلس اس بانٹ میں اطالوی حکومت اپنا حصہ وصول کرنے کے لیئے بے تاب تھی۔ اس کی للچائی ہوئی نظریں طرابلس پر تھیں جو عثمانی سلطنت میں شمالی افریقہ کا ایک صوبہ تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جو آج کل لیبیا کہلاتا ہے۔ اس کی آبادی عربوں پر مشتمل ہے۔ اٹلی کے بہت سے تجارت پیشہ باشندے یہاں مستقل یا نیم مستقل بنیادوں پر آباد تھے۔ ان کی مدد سے سازش تیار ہوئی۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ حکومت کے کارکن اطالوی باشندوں پر بہت سی پابندیاں لگاتے اور ان سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ اطالوی حکومت نے اس بدسلوکی کو اپنی برداشت سے باہر قرار دیتے ہوئے ترکی حکومت کو الٹی میٹم دے دیا۔ لیکن جواب آنے سے پہلے ہی پچاس ہزار اطالوی فوج طرابلس میں داخل کر دی۔ اس فوج نے درندگی کے بدترین مظاہرے کیے۔ گھروں میں گھس کر عورتوں کی بے حرمتی کی۔ بوڑھوں اور بچوں تک کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ محب وطن عربوں کو سنگینوں سے اذیت دے دے کر ہلاک کر دیا۔ بہت سے مخالفوں کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتارنا ہوتا تو ان کو یک لخت گولیوں کی بوچھاڑ کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ ایک ایک کر کے بندوق کی گولی سے مار دیا جاتا۔ برطانوی اخباروں کے نمائندوں نے یہاں آ کر ان تمام نظاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے اخباروں کو بے لاگ رپورٹیں بھیجیں۔

برطانوی حکومت اٹلی کی حمایت پر تھی۔ جب برطانوی پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے صدائے احتجاج بلند کی تو ان کی آواز کو دبا دیا گیا۔ کیمبرج کے تاریخ کے مشہور و معروف پروفیسر ٹریولین جو اٹلی اور اٹلی والوں کے بہت مداح تھے۔ اس بات پر بہت تلملائے کہ انگلستان جیسے دوست ملک میں اٹلی کو خواہ مخواہ بدنام کیا جا رہا ہے۔ بہرحال حقائق خود اپنے منہ سے بول رہے تھے۔ سید امیر علی نے جو انگلستان میں ایک بہت بڑے عدالتی عہدے پر فائز تھے۔ اخباروں کو اس مضمون کی چٹھیاں لکھیں کہ اٹلی کی عیسائی حکومت، طرابلس کے مسلمانوں کے ساتھ جس قسم کا وحشیانہ سلوک کر رہی ہے اگر اس کا دسواں حصّہ بھی کوئی مسلمان حکومت عیسائیوں کے ساتھ روا رکھتی تو یورپ والے قیامت کا شور مچا تے اور ایک صلیبی جنگ کا منظر برپا کر دیتے۔ ایک سال کے بعد طرابلس کی جنگ ختم ہوئی۔ اس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ بہمیت اور تشدد کی فتح ہوئی۔ یہاں کے مسلمان خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ انھوں نے اطالوی تشدد کے خلاف پُرزور احتجاج کیا۔ اخباروں نے متواتر اور طویل مضمون لکھے اور جلسے منعقد کرکے قراردادیں پاس کیں۔ برطانیہ اٹلی کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ جنگ کے دوران ترکی حکومت مصر کے راستے طرابلس میں اپنی فوج کو کمک پہنچانا چاہتی تھی۔ مصر برائے نام عثمانی سلطنت کا حصّہ تھا لیکن انگریزوں کے تسلط میں تھا۔ انگلستان کا پریس بھی اپنی حکومت کا ہم نوا بن گیا۔ برطانوی حکومت اٹلی کے وقار کو اپنا وقار سمجھتی تھی اور اسلامی دنیا کے متعلق اس کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ معاندانہ فضا پیدا ہو چکی تھی اور حکومت اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

(۱۱) جنگ بلقان

ابھی طرابلس کی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ بلقانی ایجنسیوں کے ایک جتھے نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔

یہ ریاستیں گذشتہ تین سو سال سے عثمانی سلطنت کا حصّہ تھیں۔ ان سب کو اندرونی خود مختاری حاصل تھی۔ ان کے باشندوں کی غالب اکثریت عیسائیت کی پیرو تھی۔ ترکوں نے یہاں اسلامی رواداری کی درخشاں مثالیں قائم کر رکھی تھیں۔

یورپی ملکوں کو عیسائی دنیا میں ترکوں کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور ان کو یہاں سے بے دخل کرنے کی سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس لیے بلقانی ملکوں سے آئے دن بغاوت کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ۱۹۱۱ء کی جنگ بلقان کے شروع میں تو ترکوں کا پلڑا بھاری تھا۔ بعد میں پانسا پلٹا تو برطانوی حکمرانوں نے بغلیں بجائیں اور اپنی مسلم دشمنی اور ترک دشمنی کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ بعضوں نے اس جنگ کو صلیبی جنگوں کے سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا۔ اس دوران ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو جنگ

کا ایک فریق تصور کرتے تھے. نوجوان طبقے میں بے پناہ جوش و خروش تھا. طالب علموں نے اپنے کمروں کے پردے بیچ ڈالے. ناشتہ کرنا چھوڑ دیا. گوشت کا استعمال ترک کیا. ہو سکا تو فاقے کیئے اور بچا ہوا روپیہ ترکوں کے امدادی فنڈ میں دیا. ظفر علی خاں جمع شدہ سرمائے کا ایک حصّہ لے کر خود ترکی گئے اور یہ رقم خود صدر اعظم کو پیش کی. سلطان نے مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا. ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک وفد زخمی ترک سپاہیوں کی خبر گیری کے لیئے بھیجا گیا. سلطان ترکی نے لاہور کی بادشاہی مسجد کے لیئے شکریے کے طور پر دو قالین بھیجے۔

نئی قیادت

۱۹۱۱ء ۔ ۱۹۱۳ء کے سال مسلم لیگ سیاست کے بحرانی سال تھے۔ قوم کے پرانے رہنما ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا گوشہ نشین تھے۔ ہوا کا رُخ بدلا، تو قوم کی سیاست بھی بدلی. نئی سیاست سے نپٹنے کے لیئے نئی قیادت ابھری. اُس قیادت کے اہم ارکان محمد علی (جو ابھی مولانا نہیں تھے)، ظفر علی خان اور ابوالکلام آزاد تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں ارکان ادیب اور اخبار نویس تھے۔ تینوں کو مذہب سے گہری وابستگی تھی. تینوں بلا کے مقرر تھے۔ محمد علی اور ظفر علی خاں شاعر بھی تھے۔"

محمد علی نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے آپ کو جوہر نہیں کہلوایا. یہ بدعت اُن کی وفات کے تیس سال بعد چلی. انھوں نے آکسفورڈ سے تاریخ عصر جدید میں ڈگری حاصل کی اور برسوں محمد علی آکسن کہلاتے رہے. کلکتے سے ہفتہ وار کامریڈ نکلتا رہا. انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا. تقسیم بنگال منسوخ ہوئی تو وہ اپنے اخبار کو ساتھ لے کر نئے دارالسلطنت میں چلے آئے. محمد علی کو انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت تھی. اس لیئے ان کا اخبار انگریزوں میں بھی بہت مقبول تھا. ساتھ ہی انھوں نے عوام کی ذہنی تربیت کے لیئے اردو اخبار ہمدرد بھی نکالا۔

ظفر علی خاں اخبار زمیندار کے ذریعے مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار کیا. وہ بہت اعلیٰ درجے کے مترجم اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔

ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار جریدہ الہلال کلکتے سے نکلتا تھا. اُس کے مضامین اپنی ادبیت اور دینی حرارت کی وجہ سے خاص طور پر مقبول تھے. اقبال بھی اس زمانے میں اپنی شہرت کے نصف النہار تک پہنچ چکے تھے. اُن کی نظمیں "ہلال عید، شکوہ جواب شکوہ، فاطمہ بنت عبداللہ اور حضور رسالت مآبؐ" میں اسلامی دنیا کے مسائل اور مصائب کی عکاسی کرتے تھے. محمد علی جناح ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں

شامل ہوئے اگرچہ جوان سال لیکن سیاست کے پیچ وخم سے بہت واقف تھے۔ کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے، اُن کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی ایسا اتحاد ہو جائے جس کے ذریعے ملک کو بیرونی غلبے سے نجات ہو۔ ۱۹۱۶ء والا میثاق لکھنؤ انھی کی کوششوں کا ثمر ہے۔

باب ۱۴

معاہدہ لکھنؤ ۱۹۱۶ء

تقسیم بنگال کی تنسیخ کے اچانک حکم نے برصغیر میں ایک عجیب گومگو کا عالم برپا کر دیا تھا۔ بالخصوص مسلمانوں کے لیے نہایت غیر یقینی مستقبل کا سامنا تھا۔ مسلم لیگ نے جس قسم کا نصب العین ابتداء میں تیار کیا تھا۔ اس کے پنپنے کی اب کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے مل کر مسلم لیگ کے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنا شروع کیا۔ مسلمان اس حقیقت کو بالکل مبین انداز میں سمجھ گئے تھے کہ انگریز کی پالیسی یہی ہے کہ اگر ہندوستان میں اپنے پنجے گاڑے رکھنے ہیں تو یہاں کی دو عظیم قوموں مسلم اور ہندو کو آپس میں ہر وقت لڑاتے رہو اور کچھ نہ کچھ ایسے اقدامات کرتے رہو جن سے کبھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا رہے اور کبھی ہندوؤں کو۔ اس طرح جب مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا تو ہندو ان سے حسد کی آگ میں جلا کر دیں گے اور اگر ہندوؤں کی افادیت کو تھپکی دی گئی تو مسلمانوں کے لیے دل سوزی کا باعث ہوگا۔ جس نتیجے میں یہ دونوں قومیں کبھی اتحاد و اتفاق سے نہیں رہ سکیں گی اور انتظامی امور کا سہارا لے کر ان دونوں قوموں سمیت سارے ہندوستان پر حکومت کی جاتی رہے گی۔ اس قسم کے احساسات ہندوؤں میں بھی پائے گئے اور سمجھ گئے کہ انگریز کو اس بھید کا پتہ چل گیا ہے کہ گذشتہ صدی میں دیانند اور تلک جیسے مذہبی تعصب کے پرستار افراد نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دی تھی اور اس مذہبی منافرت سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے چنانچہ اس نے کبھی بنگال کو تقسیم کر دیا اور کبھی اس تقسیم کی تنسیخ کر دی۔ سیاست کو ان دو قوموں کے لیے ایسا کھلونا بنا دیا۔ جو صرف کھلانے والے ہی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ چنانچہ انگریز کی اس سکیم کو حل کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح جو اس وقت کانگریس کے ایک اہم رکن تھے۔ میدان عمل میں نکلے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے انھوں نے اپنی خدمات دونوں قوموں کے سامنے پیش کیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک انڈین نیشنل کانگریس کے منشور میں یا کانگریس کے دستور رکنیت میں یہ پابندی ہرگز موجود نہیں تھی کہ کوئی شخص جو انڈین نیشنل کانگریس کا رکن ہے کسی دوسری سیاسی جماعت کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتا اس قانونی آسودگی کے پیش نظر مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ

کی رکنیت بھی اختیار کر لی تھی۔

قبل ازیں مسلم لیگ کے سربرآوردہ حضرات جن میں علی گڑھ کے نواب محسن الملک اسید مہدی علی شاہ پور پنجاب کے ملک عمر حیات خان ٹوانہ، لاہور کے میاں شاہ دین، میمن سنگھ بنگال کے نواب سید نواب علی چوہدری پٹنہ کے سید علی امام، پونہ کے مولوی رفیع الدین احمد، امرت سر کے شیخ غلام صادق، دہلی کے حکیم اجمل خاں، لکھنؤ کے مولوی احتشام علی اور سید نبی اللہ بیرسٹر اور آگرہ آباد کے سید کرامت حسین بالخصوص قابل ذکر ہیں یں نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ انگریز کی مخالفت اب اعلانیہ کی جانی چاہیے۔ کیونکہ وہ انگریز کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں (یاد رہے کہ یہ تمام حضرات ۱۹۰۶ء والے شملہ وفد کے ارکان میں سے تھے جن کی سربراہی آغا خاں صاحب نے کی تھی) مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ سے ہی مسلم لیگ کا صدر مقام ڈھاکہ سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر مسلم لیگ کو نہ صرف اچھے کارندے میسر آئے بلکہ باعمل رہنما بھی ملے اور اسی جگہ مسٹر محمد علی جناح نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ لکھنؤ سے جاری ہونے والے مسلم لیگی بیٹنوں میں فرنگی حکومت پر واضح نکتہ چینی کی جانے لگی اور ایک ذمہ دار حکومت جو نہ صرف مفادات عامہ کا تحفظ کر سکتی بلکہ افادیت سیاست برصغیر کا پرخلوص انداز سے جائزہ لے کر منصفانہ فیصلہ کر سکنے کی جرأت رکھتی، کے حصول کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کے نصب العین میں بھی ترمیم کر دی گئی ۱۹۱۲ء میں اس نئے نصب العین کے تحت طے پایا کہ

۱۔ مسلم لیگ ہندوستان کے لیے ذمہ دار حکومت کے حصول اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اس وقت تک مسلسل کوشاں رہے گی۔ تاوقتیکہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔

۲۔ مسلم لیگ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مفادات کے تحفظ کی بھی کوشاں رہے گی۔

۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں اور دوسری قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے مسلم لیگ اپنی تمام پرخلوص کوششوں اور اپنے وسائل کو بروئے کار لائے گی اور باہمی اتحاد و تعاون کی فضا سے استواری کے ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔

۴۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے درمیان جذبہ اخوت و محبت کو استوار کرنے کے لیے مسلم لیگ پورے انہماک کے ساتھ کوشش کرے گی۔

چونکہ مسلم لیگ کے اس اعلان میں خلوص و محبت کے رنگ کا امتزاج موجود تھا۔ اس لیے بہت

جلد ہندوستان کی فضا میں کچھ سکون سا نمایاں ہونے لگا۔ شروع شروع میں دونوں سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا لیکن جب اس میں شامل سرکردہ افراد کی حقیقی کوششوں کا جائزہ لیا گیا تو ۱۹۱۳ء کے شروع ہوتے ہی ہندو مسلم اتحاد کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کانگریس کے رہنماؤں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کرنا شروع کر دی اور اس طرح مسلم لیگ کے مقتدر افراد نے کانگریس کے جلسوں میں باہمی افہام و تفہیم کے جذبے کے پیش نظر جانا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ دو سال تک برابر جاری رہا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بیک وقت بمبئی میں منعقد ہوئے۔ اس کے بعد دونوں جماعتوں نے متفقہ طور پر انگریز کے سامنے اپنا مطالبہ دہرایا کہ باشندگان ہندوستان کو خود مختار حکومت دی جائے اس مشترکہ مطالبے کے پیش نظر دونوں جماعتوں میں اتحاد کا یہ عالم ہو گیا کہ دونوں جماعتوں کی مجالس عاملہ کے اجلاس الٰہ آباد کے مقام پر پنڈت موتی لال نہرو کے گھر میں منعقد ہونے لگے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو بمبئی میں دونوں جماعتوں سے یکجا ہونے والے اجلاس میں کانگریس کے صدر ایس۔ پی۔ سہنا، مدن موہن لال گاندھی، مالویہ سروجنی نائیڈو، سرسیندر ناتھ بنرجی نے شرکت کی۔ جب کہ مسٹر مظہر الحق نے خطبہ صدارت پڑھا۔ اس خطبہ کے دوران مسٹر مظہر الحق نے خدا کی حاکمیت مختلف فرقوں کی باہم رواداری اور جداگانہ انتخاب پر زور دیا۔ اگرچہ اس اجلاس میں پولیس نے خود (جو اس وقت حکومت کی ٹاؤٹ تھی) ہنگامہ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ دوسرے روز تاج محل ہوٹل میں ایک دور اجلاس بلایا گیا جس میں مسٹر محمد علی جناح نے ایک قرارداد پیش کی۔ جس میں ایک کمیٹی نامزد کی گئی جو آئینی اصلاحات کے لیے ایسی تجاویز مرتب کرنے کی ذمہ دار قرار دادی گئی جو کانگریس کے موقف کے قریب ترتھیں۔ اس قرارداد کی تائید مولوی فضل الحق، مولانا ابو الکلام، نواب غلام محمد مدارسی نے کی اور مسلم لیگ نے اس کو مجموعی طور پر منظور کر لیا۔ اسی نوعیت کی ایک اور قرارداد اسی روز کانگریس کی طرف سے بھی منظور کی گئی۔ ان دونوں قراردادوں کا مقصد دراصل یہ تھا کہ انگریز جو ایک عرصہ سے ملک میں جمہوریت کی اقدار کی افزائش کا اعلان کرتا چلا آرہا ہے۔ اس پر عمل بھی کر کے دکھائے جنگ عظیم اوّل کے دوران بھی انگریز نے یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کہ اس کی جنگ محض جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے ہے اس کے حق میں ہندوستان جیسے ملک میں ایک ایسی مثال بن گیا کہ اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔ جنگ کے دوران ہندوستان والوں نے انگریز کی اگرچہ غیر مشروط مدد کی تھی۔ لیکن اس غیر مشروط مدد کے پس منظر میں مشروط احوال ضرور تھے۔

معاہدہ

مسلم لیگ اور کانگریس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ دونوں جماعتوں کا کسی خاص مقام پر ایک مشترکہ اجلاس ہو اور اس میں ضروری امور پر اتفاق رائے کو معاہدے کی صورت دے دی جائے۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں کے تحت بننے والی کمیٹیوں کا ایک مشترکہ اجلاس نومبر ۱۹۱۶ء کو بمقام لکھنؤ منعقد ہونا چاہیے۔ جس کی صدارت سریندر ناتھ بیرجی کریں۔ مسلم لیگ کی طرف سے سربراہی مسٹر محمد علی جناح اور راجہ صاحب محمود آباد کر رہے تھے۔ درپیش حالات کا بغور مطالعہ کیا گیا اور مختلف معاملات کی گہرائی میں جانے کے بعد فریقین نے مثبت نوعیت کے نتائج برآمد کیے۔ چنانچہ خاصی تفصیلی بحث کے بعد دونوں جماعتوں نے بہت سے اہم نکات پر اتفاق رائے کیا اور اس اتفاق رائے کو فریقین نے آئینی طور پر تسلیم کر کے معاہدے کا نام دے دیا۔ جس کا نام "میثاق لکھنؤ" رکھا گیا۔ اس معاہدے کے تحت مندرجہ ذیل امور کو جزو معاہدہ بنایا گیا۔

۱۔ صوبائی مجالس قانون ساز

۱۔ صوبائی مجالس قانون ساز ۵/۴ منتخبہ اور ایک چوتھا نامزد کردہ ارکان پر مشتمل ہوں گی۔

۲۔ اُن کی تعداد بڑے صوبوں میں ۱۲۵ ارکان اور چھوٹے صوبوں میں ۵۰ تا ۷۵ ارکان سے کم نہ ہو گی۔

۳۔ مجالس کے ارکان کو لوگوں کی طرف سے براہِ راست ممکن حد تک وسیع رائے دہی کے حق پر منتخب کیا جانا چاہیے۔

۴۔ اہم اقلیتوں کو انتخاب کے ذریعے نیابت دینے کے لیے مناسب دفعات کا اہتمام ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو صوبائی مجالس قانون ساز میں درج ذیل تناسب سے خصوصی انتخابات کے ذریعے نمائندگی ملنی چاہیے۔

صوبہ	منتخب ہندوستانی ارکان کا فی صد
پنجاب	نصف (۵۰ فی صد)
متحدہ صوبہ جات	۳۰ فی صد
بہار	۲۵ ″
مرکزی صوبہ جات	۱۵ ″
مدارس	۱۵ ″

بمبئی ایک تہائی پر ۳۳ فی صد

بشرطیکہ کوئی مسلمان شاہی یا صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں ماسوائے خصوصی مفادات کے نیابتی انتخابات میں حصہ نہیں لے گا۔

ثانیاً کسی ایسے مسودے قانون یا اس کی کسی دفعہ اور کسی ایسی قرارداد پر جو کسی غیر سرکاری رکن نے پیش کیا ہو اور اس سے ایک یا دوسری قوم متاثر ہوتی ہو۔ کسی مجلس قانون یا شاہی مقننہ میں کوئی کاروائی نہ کی جائے گی۔ اگر متاثرہ قوم کی تین چوتھائی تعداد اس مسودہ قانون یا اس کی دفعہ یا قرارداد اس قوم پر نقصان کے ساتھ اثر انداز ہو۔ اس قوم کے اُن لوگوں کا کام ہو گا جو اس مجلس قانون ساز کے رکن ہوں گے۔

۵۔ صوبائی حکومت کے سربراہ کو مجلس قانون ساز کا صدر نہیں ہونا چاہیے بلکہ مجلس کو اپنے صدر کو بذات خود منتخب کرنے کا اختیار ملنا چاہیے۔

۶۔ ضمنی سوالات پوچھنے کے حق کو اصل سوال کرنے والوں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس امر کی اجازت ہونی چاہیے کہ کوئی بھی رکن اسے استعمال کر سکے۔

۷۔ (الف) محصولات، ڈاک، تار، ٹکسال، نمک، رفیون، ریلوے، بری اور بحری فوج اور ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے نذرانوں کے سوا آمدنی کے دیگر تمام ذرائع کو صوبائی حکومتوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔

(ب) آمدنی کی منقسم مدات نہیں ہونی چاہئیں۔ حکومت ہندوستان کو صوبائی حکومتوں کی طرف سے مقرر کردہ رقوم کی فراہمی ہونی چاہیے۔ ان معینہ رقوم کی ضرورت کے مطابق غیر معمولی اور غیر متوقع اتفاقی مصارف کے پیش نظر ہونی چاہیئے۔

(ج) صوبائی مجلس کے پاس صوبے کے اندرونی نظم ونسق کو نپٹنے کے لیے بشمول قرضے جاری کرنے، محصول عائد یا اس میں کمی بیشی کرنے اور میزانیہ پر رائے شماری کے اختیار کے پورے اختیارات ہونے چاہئیں۔ اخراجات کی تمام مدات اور ضروری آمدنی کے حصول کے ذرائع سے متعلق تمام تجاویز کو مسودات قانون کی شکل دے کر اور اُسے اپنانے کے لیے صوبائی مجلس میں پیش کیا جانا چاہیئے۔

(د) صوبائی حکومتوں کے دائرہ کار کے اندر تمام امور کے متعلق قراردادوں پر قواعد کے مطابق جو اس ضمن میں مجلس نے خود بنائے ہوں بحث کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

(ر) صوبائی مجلس قانون ساز کی طرف سے پاس کی ہوئی قرارداد انتظامیہ حکومت پر واجب ہوگی. جہاں تک کہ گورنر یہ اجلاس مجلس اُسے مسترد نہ کر دے اس شرط پر تاہم اگر یہ قرارداد مجلس کی طرف سے کم از کم ایک سال کے وقفے کے بعد دوبارہ پاس کر دی جائے ۔ تو اس صورت میں اس پر عمل درآمد کروانا ہوگا۔

(س) ضروری سرکاری اہمیت کے واضح معاملے پر بحث کرنے کے لیے تحریک التواء پیش کی جائے گی۔ اگر حاضر ارکان میں سے کم از کم ⅛ اراکین اس کی حمایت کریں۔

۸۔ ⅛ اراکین کی درخواست پر صوبائی مجلس کے خصوصی اجلاس کو بلایا جائے ۔

۹۔ روپیہ پیسہ کے مسودہ قانون کے علاوہ کسی بھی مسودہ قانون کو مجلس کی طرف سے وضع کردہ قواعد کے مطابق مجلس کے روبرو پیش کیا جائے ۔ حکومت کی منظوری لینے کی بالکل ضرورت نہیں ہونی چاہیئے۔

۱۰۔ صوبائی مجالس کی طرف سے پاس کیے جانے والے مسودہ ہائے قانون کو قانون بننے کے لیے گورنر کی منظوری لینا ضروری ہوگا۔ لیکن گورنر جنرل کو انہیں مسترد کر دینے کا حق بھی ہونا چاہیئے

۱۱۔ اراکین کے عہدے کی میعاد ۵ برس ہوگی۔

۲۔ صوبائی حکومتیں

۱۔ ہر صوبائی حکومت کا سربراہ گورنر ہوگا جو عام حالات میں آئی ۔ سی ۔ ایس نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی مستقل سروس سے اس کا تعلق ہوگا۔

۲۔ ہر صوبے میں گورنر کی معیت میں ایک انتظامیہ کونسل ہوگی اور یہ صوبے کی انتظامیہ حکومت کی حیثیت میں کام کرے گی ۔

۳۔ عام حالات میں آئی ۔ سی ۔ ایس کے ارکان کا انتظامیہ کونسل میں تقرر نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ انتظامیہ کونسل کے کم از کم نصف اراکین صوبائی مجلس قانون ساز کے منتخب کردہ ہندوستانیوں پر مشتمل ہوں گے۔

۵۔ اراکین کے عہدے کی میعاد پانچ سال ہوگی ۔

۳۔ شاہی مجلس قانون ساز

۱۔ شاہی مجلس قانون ساز کے اراکین کی تعداد ۱۵۰ ہوگی ۔

۲۔ ⅘ ارکان منتخبہ ہوں گے۔

۳۔ شاہی مجلس قانون ساز کے حق رائے دہی کو ممکن حد تک صوبائی مجالس قانون ساز کے لیے

مسلمانوں کے لیے انتخابات کی طرز پر وسیع ہونا چاہیئے۔ صوبائی مجالس قانون ساز کے منتخبہ ارکان سے شاہی مجلس قانون ساز کے لیے انتخابی حلقے کا کام لینا چاہیئے۔

۴۔ ہندوستانی منتخبہ ارکان کا ایک تہائی مسلمان ہونے چاہئیں۔ جنھیں مختلف صوبوں میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے منتخب کیا گیا ہو۔ تقریباً اسی تناسب جس انھیں جداگانہ مسلم انتخابات کی بنیاد پر صوبائی مجلس قانون ساز میں نمائندگی ملی ہو (بمطابق دفعات، سیکشن ا شق نمبر ۴)

۵۔ مجلس کا صدر اس کی طرف سے منتخب ہوگا۔

۶۔ ضمنی سوالات پوچھنے کے حق کو اصل سوال کرنے والوں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس امر کی اجازت ہونی چاہیئے کہ کوئی بھی رکن اس سے استفادہ کر سکے۔

۷۔ ⅛ اراکین کی درخواست پر مجلس کے خصوصی اجلاس کو بلایا جائے۔

۸۔ مالیات کے مسودہ قانون کے علاوہ کسی بھی مسودہ قانون کو مجلس کی طرف سے وضع کردہ قواعد کے مطابق مجلس کے روبرو پیش کیا جائے۔ حکومت کی منظوری لینے کی بالکل ضرورت نہیں ہونی چاہیئے۔

۹۔ مجلس کی طرف سے پاس کردہ تمام مسودہ ہائے قانون کو قانون بننے کے لیے گورنر جنرل کی منظوری لینا ہوگی۔

۱۰۔ ذرائع آمدنی اور اخراجات کی مدات سے متعلق تمام مالیاتی تجاویز کو مسودہ قانون کی صورت دی جائے گی۔ اس قسم پر مسودہ قانون اور میزانیہ بحیثیت مجموعی شاہی مجلس قانون ساز میں رائے شماری کے لیے پیش کیا جائے گا۔

۱۱۔ ارکان کے عہدے کی معیاد پانچ برس ہوگی۔

۱۲۔ درج ذیل بیان کردہ امور خصوصی طور پر شاہی مجلس قانون ساز کی نگرانی میں ہوں گے۔

(الف) وہ امور جن کے لیے پورے ہندوستان میں یکساں قانون سازی کی ضرورت ہو۔

(ب) بین الصوبائی مالیاتی تعلقات پر اثر انداز ہونے والی صوبائی قانون سازی۔

(ج) ہندوستانی ریاستوں سے حاصل ہونے والی رقوم کے ماسوا خصوصی طور پر شاہی آمدنی پر اثر انداز ہونے والے سوالات۔

(د) خصوصی طور پر شاہی اخراجات کو متاثر کرنے والے سوالات ماسوائے اس کے کہ ملک کے دفاع کے لیے عسکری اخراجات کے متعلق شاہی مجلس قانون ساز کی کوئی بھی قرارداد گورنر جنرل

یہ اجلاس مجلس واجب نہ ہوگی۔

(ر) ہندوستانی بحری اور بری محصولات پر نظر ثانی کرنے، عائد، تبدیلی کرنے یا کسی محصول یا چونگی کو منسوخ کرنے، رائج الوقت کرنسی اور بنکاری میں ترمیم کرنے اور امداد دینے یا ملک کی چند یا تمام ابتدائی صنعتوں کو سرکاری مالی امداد کرنے کا حق۔

(س) بحیثیت مجموعی ملک کے نظم و نسق سے متعلق تمام امور پر قرار دادیں۔

۱۳۔ شاہی مقننہ کی طرف سے پاس کردہ قرار داد انتظامیہ حکومت پر واجب ہوگی۔ جہاں تک کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اسے مسترد نہ کردے۔ تاہم اس شرط پر اگر یہ قرارداد مجلس کی طرف سے کم از کم ایک سال کے وقفہ کے بعد دوبارہ پاس کر دی جائے تو اس صورت میں اسے قانون سمجھا جائے گا۔

۱۴۔ ضروری سرکاری اہمیت کے واضح معاملے پر بحث کرنے کے لیے تحریک التوا پیش کی جائے گی۔ اگر حاضر ارکان میں سے کم از کم ۱/۸ اراکین کی حمایت کریں۔

۱۵۔ جب تاج دار برطانیہ صوبائی مجلس یا شاہی مقننہ کی طرف سے پاس کردہ کسی مسودہ قانون کے سلسلے میں اپنے حق استرداد کے اختیار کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ تو اُسے مسودہ قانون کے پاس ہونے کی تاریخ سے بارہ ماہ کے اندر اندر ایسا کرنا چاہیئے اور اس مسودہ قانون پر اس تاریخ سے عمل درآمد نہیں ہوگا۔ جس دن اس حق استرداد کے استعمال کی حقیقت متعلقہ مجلس تک پہنچا دی گئی ہوگی۔

۱۶۔ شاہی مجلس قانون ساز کو حکومت ہندوستان کے فوجی امور اور ملک کے خارجی اور سیاسی تعلقات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، ان میں اعلان جنگ، صلح کرنا اور معاہدات میں شامل ہونا بھی شامل ہے۔

۴۔ حکومت ہندوستان

۱۔ ہندوستان کے گورنر جنرل حکومت ہند کے سربراہ ہوں گے۔

۲۔ اُن کی ایک انتظامیہ کونسل ہوگی، اس کے نصف ارکان ہندوستانی ہوں گے۔

۳۔ ہندوستانی اراکین کو شاہی مقننہ کے منتخبہ ارکان میں سے منتخب کرنا چاہیئے۔

۴۔ عام حالات میں آئی۔سی۔ایس کے ارکان کو گورنر جنرل کی انتظامیہ کونسل میں نہیں لیا جائے گا۔

۵۔ شاہی سول سروس میں تمام تقرریوں کا اختیار اس تجویز کی مطابقت میں حکومت ہندوستانی کو

تفویض ہوگا۔ رائج الوقت مفادات کو شاہی مقننہ کے بنائے ہوئے قواعد کے تحت مناسب اہمیت دی جائے گی۔

۶۔ حکومت ہند عام حالات میں صوبوں کے مقامی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی اور وہ اختیارات جو خصوصی طور پر صوبوں کو نہیں دیئے گئے۔ خود بخود اوّل الذکر کو تفویض ہوں گے حکومت حکومت ہندوستان کے اختیارات عام حالات میں صوبائی حکومتوں پر عمومی نگرانی و انتظام کرنے تک محدود کر دیا جائے۔

۷۔ قانون سازی اور انتظامی معاملات میں حکومت ہند اس تجویز کے عین مطابق جہاں تک ممکن ہوسکا۔ وزیر برائے امور ہند سے آزاد ہوگی۔

۸۔ ہندوستان کے باضابطہ طور پر حساب و کتاب جانچنے کے لیے خود مختار نظام کی تشکیل کرنا۔

۵۔ وزیر برائے امور ہند بہ اجلاس کونسل

۱۔ وزیر برائے امور ہند کی کونسل منسوخ کر دینا چاہیے۔

۲۔ وزیر برائے امور ہند کی تنخواہ کا بار برطانوی خزانے پر ڈالنا چاہیئے۔

۳۔ وزیر برائے امور ہند کو جہاں تک ممکن ہوسکے۔ حکومت ہندوستان کے ساتھ تعلقات میں اپنی حیثیت کو وزیر برائے نوآبادیات کے مساوی بنانی چاہیئے موخرالذکر خود مختار استمراتی حکومتوں میں زیادہ مقام نہیں رکھتا۔

۴۔ وزیر برائے امور ہند کی مدد کے لیے دو انڈر سیکرٹری ہونے چاہئیں اور ان میں سے ایک لازمًا ہندوستانی ہو۔

۶۔ ہندوستان اور سلطنت برطانیہ

۱۔ شاہی معاملات کے تصفیہ یا نگرانی کے لیے جو بھی مجلس یا دوسرا ادارہ تشکیل کیا جائے یا بلایا جائے ہندوستان کو مستعمرات کے ساتھ موزوں طریق سے مناسب نمائندگی دی جائے۔

۲۔ مقام اور حقوق شہریت باشندوں کے ضمن میں ہندوستانیوں سے اعلیٰ حضرت ملک المعظم کے دیگر باشندوں کے ساتھ پوری سلطنت میں یکساں سلوک کیا جائے۔

۷۔ فوجی اور دیگر امور

۱۔ ملک المعظم کی بری اور بحری ملازمتوں کو کمشنڈ دونوں قسم کے درجوں میں ہندوستانیوں کو شامل کرلینا چاہیئے اور ہندوستان میں ان کی تقرری تعلیم و تربیت کے لیے مناسب دفعہ مرتب کی جائے۔

۲۔ ہندوستانیوں کو رضا کار بننے کی اجازت بھی ملنی چاہیے۔

۳۔ انتظامیہ کے افسروں کے پاس ہندوستانیوں یں عدالتی اختیارات نہیں ہونے چاہئیں۔ ہر صوبے یں عدلیہ کو اس صوبے کی اعلیٰ ترین کے ماتحت کر دیا جائے۔

جو چیز برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں "یثاق لکھنؤ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ وہ مندرجہ بالا مشترکہ منصوبہ ہی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ یثاق لکھنؤ جناب محمد علی جناح کی دور اندیشی، مستقل مزاجی، معاملہ فہمی، پیچیدہ امور کو سلجھانے کی غیر معمولی صلاحیت اور متحارب و بدگمان اقوام کے درمیان افہام و تفہیم کی بے مثال قابلیت کا ایک ممتاز شاہکار ہے جو ایک مرتبہ معرض عمل یں آسکا۔ لیکن چوہدری خلیق الزمان صاحب نے اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" یں اس معاہدے کو مسلمانوں کی سیاسی ناتجربہ کاری قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس زمانے یں آبادی کے تناسب پر نمائندگی کا فیصلہ نہ کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں نے پنجاب یں ۵۰ فی صد اور بنگال یں ۴۰ فی صد نمائندگی کو منظور کر لیا۔ اس کے عوض مسلم اقلیتی صوبوں یں توازن برقرار رکھنے کے لیے انھیں چند زائد نشستیں مل گئیں وہ اس پر رقم طراز ہیں۔ اس سے وہ مسائل پیدا ہوئے جنھوں نے ہندو مسلم تعلقات یں زہر ملا دیا اور ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد پڑ گئی اور ازاں بعد ۱۹۴۷ء یں جب ملک آزاد ہوا تو پاکستان پنجاب اور بنگال کے وسیع علاقوں سے محروم ہو گیا۔ چوہدری صاحب کی یہ رائے ناقابل قبول ہے پُرانے مسلم لیگی اکابرین اس سلسلے یں اتفاق نہیں کرتے۔

ہندوؤں نے کبھی بھی مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک مشہور مصنف کے الفاظ میں "ہندوؤں کے دلوں یں مسلمانوں کے خلاف عناد کا زہر ہے اور اس کا سبب مسلمانوں کا مسلمان ہونا ہے۔ لکھنؤ پیکٹ، جداگانہ انتخاب اور ویٹیج وغیرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں البتہ یہ وہ تدبیریں ضرور تھیں جو مسلمانوں نے اس زہر سے بچنے کے لیے اختیار کیں۔ جب شکاری کی گولی خطا کرتی ہے تو شکاری کو اپنے صید پر غصہ آتا ہے خواہ وہ بھولا کبوتر ہو یا چالاک گلدار۔

جس طرح ہندوؤں نے بنگال کی تقسیم کو محض اس پر گوارا نہ کیا کہ مشرقی بنگال یں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اگر مسلمان ۱۹۱۶ء یں اس امر کا مطالبہ کرتے کہ متحدہ بنگال یں آبادی کے تناسب سے انھیں اکثریت کی حیثیت یں نمائندگی دی جائے۔ تو اس مطالبے سے ہنود کبھی بھی اتفاق نہ کرتے اور یہی مشکل پنجاب بھی پیش آتی۔ لہٰذا ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں کے درمیان یثاق لکھنؤ پر دستخط نہ ہوتے اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں کو بعض سیاسی فوائد سے محروم ہونا پڑے۔

میثاق لکھنؤ پر سید حسن ریاض یوں لکھتے ہیں۔ "لکھنؤ پیکٹ ہوا۔ مگر اس سے تمام کام کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اس ہندو مسلم سمجھوتے کے مطابق، حکومت برطانیہ سے آئینی اصلاحات حاصل کرنے کے لیے مسٹر جناح کو بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑتی اور یہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اس مقصد کو پورا کرنے کی سعی کے ساتھ کہ ملک کے انتظام حکومت میں مستحکم اور مستقل اصلاح کی جائے۔ انتظام حکومت میں اصلاح کے لیے انھوں نے انڈین ڈیفنس فورس بل اور ابتدائی تعلیم کے مسودہ قانون پر (سنہ ۱۹۱۷ء) پر زور تقریریں کیں۔ انھوں نے اس پر سخت اصرار کیا کہ آئینی اصلاحات کی جو اسکیم مرتب کی جائے۔ اس سے قبل کہ وہ آئین کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں منظور ہو، ہندوستانیوں کو اس موقع دیا جائے کہ وہ اس پر غور و بحث کریں۔ اس زمانے میں اس پر گفتگو کی بھی کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کی معقول نیابت ہونی چاہیئے۔ مسٹر جناح نے اس میں بھی ہندوستان کی بڑی قوت سے ترجمانی کی"

بے شک لیگ کے جس نویں اجلاس میں "میثاق لکھنؤ" کو منظور کیا گیا۔ اس میں بعض ممتاز مسلم لیگی زعما غیر حاضر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، مولانا حسرت موہانی مولانا ظفر علی خاں اور بعض دیگر قائدین برطانوی ہندوستان کی جیلوں میں بند تھے۔ اس تاریخی اجلاس میں بنگال کے مولوی اے۔ کے فضل الحق اور مظہر الحق اور پنجاب کے میاں فضل حسین اور جناب برکت علی نے نمائندگی کی۔

جلد ہی میثاق لکھنؤ کے ضمن میں غلط فہمی کے دور کا آغاز ہوا۔ مسلم لیگی رہنما بنگال اور پنجاب کی غیر مناسب نمائندگی پر خوش نہ تھے۔ جب علی برادران رہا ہوئے تو انھوں نے بھی اس پر بڑی تنقید کی۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر پاک و ہند میں پہلی مرتبہ ہندوؤں نے جداگانہ انتخابات کے نظام کو منظور کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ قوم کی حیثیت میں تسلیم کر لیا اور یہ مسلم لیگ کی عظیم کامیابی تھی۔

جناب مختار اپنی کتاب "دی ٹیرآف دی گریٹ انڈین کنفلکٹ" کے صفحہ ۶۲ پر اس معاہدے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں:۔

"مشہور میثاق لکھنؤ جناح کی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون پیدا کرنے کے لیے ان تھک کوششوں کا ثمرہ تھا۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ جس وقت کانگریس اور لیگ کے قائدین نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔ ہندو مہاسبھا نے جس نے لکھنؤ ہی میں اجلاس منعقد کیا تھا۔

کانگریس کے اس دعوے کی تردید کی کہ وہ ہندوؤں اور ہندو طرز فکر کی ترجمان تھی۔ اُس (کانگریس) نے اجلاس منعقد کیے، کارروائیوں میں حصہ لیا اور لیگ کانگریس کے مشترکہ اعلان میں مسلمانوں کے مطالبات سے اتفاق کیا۔ علاوہ بریں اس نے مہاسبھا کے اجلاس میں شرکت کی اور اس پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی سخت مخالفت بھی کی۔ لہٰذا معاہدہ لکھنؤ کو ہندوؤں نے ماننے سے انکار کر دیا اور وہ بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ جدوجہد اور کشیدگی پر ختم ہوا۔ ہندوستان کے متعدد مقامات پر فسادات شروع ہو گئے۔ صرف کرتارپور میں بیس مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

ابتداً اس معاہدے کو ہندو مہاسبھا نے بُرا بھلا کہا لیکن بعد میں کانگریسی چوہدری بھی اس کے حق میں نہ رہے۔ یہ مخاصمانہ روّیہ ہندو قوم کی عیاری اور سیاست میں اُن کے منافقانہ مسلک کی وضاحت کرتا ہے۔ بڑے بڑے ہندو رہنما مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کا حق دینے پر سخت اعتراضات کرنے لگے تھے۔

غرض کہ مجموعی حیثیت میں "معاہدہ لکھنؤ" ہندو مسلم اتحاد کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اس سے دونوں اقوام کے باہمی تعلقات رو بہ اصلاح ہوئے۔ وہ ایک دوسرے کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ بعض چوٹی کے قائدین نے کانگریس اور لیگ کے اجلاسوں کی صدارت بھی فرمائی اور یہ باہمی اتحاد ۱۹۲۱ء تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ برقرار رہا۔

باب ۱۴

تحریک خلافت

تحریک خلافت، اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک طوفانی دور تھا۔ کہنے کو تو یہ تحریک پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی لیکن اس کی بنیادیں بہت پہلے سے موجود تھیں۔ یہ حالات اور واقعات کے دو دھاروں سے پیدا ہوئی۔

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں کو دنیائے اسلام سے بے پناہ محبت تھی اسے جذبہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران برطانوی حکومت نے، سلطان ترکی سے ہندی مسلمانوں کے لیے یہ فتویٰ حاصل کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جنگ بند کر دیں۔ اگرچہ اس وقت تو یہ فتویٰ موثر ثابت نہ ہوا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترکی اور اس کی حکومت کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں کا لگاؤ بڑھتا گیا

(۲) ۱۸۹۵ء میں جب ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی تو یہاں سے مبارک باد کے سینکڑوں تار سلطان کی خدمت میں بھیجے گئے اور فتح کی خوشی میں دکن تک دور افتادہ دیہات میں چراغاں کیا گیا۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس اور اس کے بعد بلقان کی جنگ میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ جذبہ اخوت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ہر روز ترکوں کی فتح کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ ترکوں کی امداد کے لیے بہت سارو پیہ اکٹھا کیا گیا۔ ایک طبی مشن ترکی بھیجا گیا۔ چند مسلمان راہنماؤں نے خود استنبول جا کر ترکی حکومت کو ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔ سینکڑوں پبلک جلسوں میں ترکی کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی برطانوی حکومت کے روپے کی مذمت کی قراردادیں پاس کی جاتی تھیں۔

ان دونوں جنگوں میں شکست کھانے کے بعد ترکی کے اندرونی حالات بہت ابتر ہو چکے تھے ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ برطانیہ اور جرمنی اس جنگ کے دو بڑے فریق تھے۔ یہاں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بہتر ہوگا کہ ترک اپنے آپ کو کسی نئی ابتلا میں نہ ڈالیں۔ بلکہ جنگ سے دور رہتے ہوئے پچھلے نقصانوں کی تلافی کریں۔ ۱۸۷۱ء سے ترکوں اور جرمنوں کا دوستانہ چلا آرہا تھا۔ خدشہ تھا کہ ترکی، جرمنی کا ساتھ دیتے ہوئے اس جنگ میں کود پڑے گا۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے ترکی کے وزیر اعظم کو ایک طویل تار بھیجا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ اپنے ملک کو جنگ

میں جھونکنے سے پہلے ایک ہزار مرتبہ اس کے امکانی نتائج کا جائزہ لیں۔ یہ پیغام بے اثر رہا۔

ترکوں کا جنگ میں شامل ہونا

نومبر کے مہینے میں ترکوں نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس اعلان سے یہاں کے مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش پیدا ہوئی۔ ایک طرف تو وہ برطانوی حکومت کی رعایا تھے۔ اس کے قانون کے پابند، دوسری طرف خلیفۃ المسلمین کی اطاعت بھی ان پر واجب تھی۔ اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس جنگ میں برطانیہ کی کوئی امداد نہ کریں۔ اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۵ء کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ خلیفۃ المسلمین اور ملک معظم کی حکومتیں آپس میں سرپیکار ہیں جزیرہ نمائے عرب ترکوں کی حکومت میں شامل تھا اسلام کے مقاماتِ مقدسہ اسی سرزمین پر واقع ہیں۔ نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت ترکوں سے نپٹنے کے لیے اپنی جنگی سرگرمیوں کا رخ عرب علاقوں کی طرف موڑ دے گی جنگ وہاں پہنچی تو مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی ہو گی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے ناقابل تصور تھی۔ حکومت کو ان جذبات کا بخوبی علم تھا چنانچہ جنگ کے ابتدائی دنوں ہی میں برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں کو اطمینان دلانے کے لیے اس امر کا اعلان کر دیا کہ اتحادی فوجیں عرب علاقوں میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ روس کی حکومت کو بھی اس اعلان سے اتفاق تھا۔ لیکن ایک طرف تو ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دہانی کے لیے اس مضمون کا اشتہار چھاپ کر تقسیم کیے جا رہے تھے اور دوسری طرف اتحادی فوجیں جزیرہ نمائے عرب کلیدی مقامات پر اتاری جا رہی تھیں۔ یہ سراسر فریب اور دھوکا تھا۔ اس وعدہ خلافی سے مسلمانوں کے دل پر گہرا زخم لگا۔ ۱۹۱۶ء میں لارنس جیسے برطانوی ایجنٹوں کے اکسانے پر شریف مکہ، حسین، نے، عثمانی حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا اور ترکوں پر لادینی کے الزامات عائد کیے۔ یہاں کسی کو اس معاملے میں غلط فہمی نہ تھی۔ شریف کے لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد تھے اور وہ صرف انگریزوں کا پڑھایا ہوا سبق دہرا رہا تھا۔ لاہور کے مسلمانوں نے اس کارستانی پر احتجاج کرنا چاہا۔ پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر نے سنگین دھمکیاں دے کر غم و غصے کو روک دیا۔

برصغیر کے مسلمان اور حکومت

جنگ کے اس دور میں حکومت نے چن چن کر مسلمانوں سے بدلے لیے۔ بڑے بڑے اخباروں، زمیندار، الہلال اور ہمدرد کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ اس سے ان کی اشاعت بند ہو گئی۔ ترکوں سے پرجوش ہمدردی کرنے والے سب لیڈروں، محمد علی، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور سران جیسے بیسیوں کو یاتو

گھروں میں نظر بند کر دیا گیا یا جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ فوج کی بھرتی جبری تھی۔ ناواجب ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ اور اظہار رائے پر ظالمانہ پابندیاں تھیں، ملک چھوڑ کر بہت سے نوجوان ترکوں کی فوج میں شامل ہونے کے لیے چلے گئے۔ انگریزوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے کابل میں ایک منصوبہ کیا جا رہا تھا جس کی تفصیلات ظاہر ہونے پر اس کو "ریشمی رومال کی سازش" کا نام دیا گیا تھا بیرون ملک کہیں کہیں برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا جنرل الین بی نے بیت المقدس کو ختم کیا تو برطانوی وزیر اعظم نے اس کو آخری صلیبی جنگ قرار دیا۔

جنگ نومبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہو گئی۔ جرمنوں اور ان کے

جنگ کا خاتمہ اور ترکی کی حالت حلیفوں نے شکست تسلیم کر لی۔ جنگ کے دوران انگریزوں اور فرانسیسیوں نے خفیہ معاہدوں کے ذریعے ترکوں کی سلطنت کے حصے بخرے کر لیے تھے۔ خود ترکی میں تھریس اور سمرنا کے صوبوں پر اتحادیوں کے اشارے پر یونانیوں نے فوج کشی کر دی تھی استنبول پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ خلیفۃ المسلمین ان کے ہاتھوں میں ایک بے بس قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے دستخطوں سے جبراً ایسے احکام جاری کرائے جا رہے تھے جو ترکوں کے مفاد کے لیے تباہ کن تھے۔ دوسری طرف انگریز اور ان کے اتحادی، ترکوں کو انتہائی ذلت آمیز سلوک کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ترکوں کی سلطنت تو پہلے ہی جا چکی تھی۔ فاتحوں کا خیال تھا کہ تھریس اور سمرنا کے علاقے یونانیوں کے سپرد کر کے ترکی کی حدود کو صرف ایشیائے کوچک تک محدود کر دیا جائے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک طرف تو عثمانی خلافت ختم ہو جائیگی۔ دوسری طرف مقامات مقدسہ اتحادیوں کی گرفت میں چلے جائیں گے۔ اور کسی ایسے حکمران کو خلیفہ بنایا جائیگا جو انگریزوں کے لیے قابل قبول ہو۔ ان سب باتوں کا سدباب کرنے کے لیے خلافت کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس موقع پر گاندھی نے مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ وہ کیوں؟ اس کا جواب دینے کے لیے تاریخ کے دوسرے دھارے کا جائزہ لینا ہوگا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ، کانپور کی مسجد کے المیے اور علی گڑھ

لیگ اور کانگریس کی مفاہمت کالج کو الحاقی یونیورسٹی کا درجہ دینے سے حکومت کے انکار نے مسلمانوں کے جذبات کو بہت مشتعل کر دیا تھا۔ بہت سے مسلمان اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ حکومت کے ساتھ دوستی اور رواداری کا مسلک اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ اور آگے چل کر قوم کے لیے نہایت خطرناک نتائج پیدا ہوں گے۔ مسلمانوں کے اس طرز فکر سے ہندو

نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ کانگرس کے راہنماؤں نے مسلم لیگ کے اجلاسوں کی رونق بڑھانا شروع کر دی ۱۹۱۲ء میں الہ آباد کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں قوموں میں اتحاد کی فضا قائم کی جائے۔ کانگرس اپنی قرار دادوں میں یہ مطالبہ دھرایا کرتی تھی کہ ہندوستان کو برطانوی نو آبادیات یعنی کینیڈا، آسٹریلیا جیسی سیلف گورنمنٹ دے دی جائے۔ سیلف گورنمنٹ کے مطالبے سے انگریز بدلتے تھے۔ ۱۹۱۳ء کی بدلی ہوئی فضا میں لیگ نے بھی کس قدر مختلف انداز میں "سیلف گورنمنٹ" کی قرار داد پاس کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سیاسی طور پر لیگ اور کانگرس ہم آہنگ ہیں۔ اس کے محمد علی جناح کے لیے لیگ میں شمولیت کا دروازہ کھل گیا۔ اس زمانے کی کانگرس میں، اس کی سراپا ہندویت کے باوجود، چند اعتدال پسند اور آزاد خیال ہندو شامل تھے۔ جناح کی سیاسی رفاقت انہی عناصر کے ساتھ تھی۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ ملک کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کی کوشش شروع کر دی۔ اس تگ و دو کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ ۱۹۱۵ء میں دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس ساتھ ساتھ بمبئی میں منعقد ہوئے اور دونوں کے صدارتی خطبوں کا لب و لہجہ ایک جیسا تھا، بلکہ مسلم لیگ کے خطبے کا انداز کسی حد تک جارحانہ تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۱ء تک لیگ اور کانگرس اپنے اپنے سالانہ اجلاس باہمی مشورے سے ایک ہی شہر میں اور ایک ہی تاریخوں میں کرتی تھیں اور اہم مسائل پر ایک دوسرے کی ہم نوا تھیں۔

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ ہوا جس کی رو سے کانگرس نے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلم لیگ کی نمائندہ جماعت مان لیا۔ اس معاہدے کو تکمیل تک پہنچانے والوں میں محمد علی جناح پیش پیش تھے۔

حکومت کا رویہ

اس پر دستخط ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی تلخیاں بہت حد تک کم ہو گئیں۔ جنگ کے سالوں میں بدیسی حکومت بہت سے اندرونی اور بیرونی خطروں سے گھری ہوئی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں زیر زمین انقلابی تحریکیں پنپ رہی تھیں۔ جوں جوں سرگرمیوں کا پتہ چلتا جاتا تھا، حکومت کی سخت گیری بھی تشدد میں تبدیل ہوتی جاتی تھی ۱۹۱۷ء میں ہوم رول لیگ بنی اور ملک کے تمام قابل ذکر لیڈر اس میں شامل ہو گئے۔ حالات سے خائف ہو کر اور اپنی گذشتہ پالیسی کے برعکس برطانوی حکومت کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہندوستان کو بتدریج حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی۔ اس اعلان سے کوئی خوش گوار تاثر پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ حاکموں

کے قول اور فعل میں بہت تفاوت تھا۔ آزادی کا وعدہ اور تشدد کی انتہا دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے
عوام صبر آزما دقتوں سے دوچار تھے۔ روزمرّہ ضرورت کی اشیا کی قلت ہوشربا گرانی اور حکومت کے
آمرانہ رویے نے بلالحاظ مذہب و ملّت، سب طبقوں میں اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو
حالات کی بہتری کی توقع پیدا ہو گئی۔ لوگ حکومت کے رویے میں مناسب تبدیلیوں کے منتظر تھے
لیکن جلد ہی حالات نے ثابت کر دیا کہ حکومت لوگوں سے جنگ کے زمانے کے بدلے لینا چاہتی ہے
قاعدہ ہے کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد دشمن کا خطرہ ٹل جاتا ہے تو لڑائی کے زمانے

رولٹ بل کے قوانین اور ضابطوں کو نرم کر دیا جاتا ہے اور عوام پر سے بہت سی پابندیاں اٹھا
لی جاتی ہیں۔ لیکن حکومت کا ارادہ اس کے اُلٹ تھا۔ وہ زمانہ جنگ کے انتہائی تشدّد آمیز ضابطوں
کو روزمرّہ کے ملکی قانون میں مستقل طور پر شامل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس غرض سے مجلس
قانون ساز میں دو سرکاری بل پیش کیے گئے جن کو عام طور پر رولٹ بل کہا جاتا ہے۔
ان کا ماحصل یہ تھا کہ شہری آزادیوں کو مکمل طور پر سلب کر لیا جائے۔ قانون کے اس
مسلمہ اصول کو، کہ ملزم کے جرم کو ثابت کرنے کا فرض استغاثے پر عائد ہوتا ہے ختم کر کے قرار
دیا گیا کہ ہر ملزم کو مجرم تصور کیا جائے اور یہ اس کا اپنا فرض ہے کہ اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ باغیانہ
دستاویزیں رکھنے والوں کے لیے بھی کڑی سزائیں تجویز کی گئیں۔ چنانچہ اس قانون کے ماتحت سودا
سلف باندھنے والا ردی اخباری کاغذ بھی باغیانہ دستاویز شمار کیا جا سکتا تھا۔ نیز مرے ہوئے افراد
کے حوالے سے دی ہوئی گواہی بھی عدالتوں کے لیے قابل قبول قرار پائی۔ مجوزہ قانون کی ان وحشیانہ
دفعات سے لوگ تلملا اُٹھے اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے (یہ بات بھی قابل ذکر ہے
کہ اسی کالے قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے محمد علی جناح مجلس قانون ساز کی رکنیت
سے مستعفی ہو گئے تھے)

حکومت بھی اپنے مخالفوں کو مکمل طور پر کچلنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ پہلا
جلیانوالہ باغ کا حادثہ تصادم دہلی کے ریلوے سٹیشن پر ایک معمولی جھگڑے سے ہوا۔ جہاں
پولیس نے بے سوچے سمجھے گولی چلا دی۔ سب سے زیادہ دردناک واقعہ امرتسر میں ہوا جہاں
۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کے ایک جلسۂ عام پر فوج کے ایک دستے نے جنرل ڈائر کے
حکم پر گولی چلا دی اور گولیوں کی بارش اس وقت تک جاری رہی جب سپاہیوں کے پاس ایک
کارتوس بھی نہ رہا۔ تو ساتھ ہی امرتسر میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد لاہور اور

کے دوسرے بڑے بڑے شہروں کا نظم و نسق بھی فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کیونکہ معاملات سول حکومت کے بس سے باہر تھے۔ انگریزوں کے لگائے ہوئے مارشل لا میں عوام کو ہر طرح سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی کرنے والوں کو فی الفور گولی سے اڑا دیا جاتا بعض گلیوں میں لوگوں کو پاؤں پر چلنے کی مخالفت تھی۔ وہاں سے گزرنے والوں کو اپنے پیٹ کے بل رینگ کر راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ لاہور کے شہریوں سے ان کی بائیسکل اور بجلی کے پنکھے تک چھین لیے گئے۔ طالب علموں کو دن میں چار مرتبہ رُو برُو حاضری دینا پڑتی تھی اور ہر انگریز کو آگے بڑھ کر سلام کرنا پڑتا تھا۔ معمولی معمولی خطاؤں پر لوگوں کو بجلی کے کھمبوں سے باندھ کر وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ اخبارات پر سنسر تھا۔ پنجاب کی خبریں باہر نہیں نکلنے پاتی تھیں۔ تاہم کچھ عرصے کے بعد جب یہ پابندیاں بے کار ہو گئیں اور حکومت کے مظالم کی تفصیلات کا علم ہوا تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک غم و غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ انہی حالات میں گاندھی کی قیادت کا آغاز ہوا۔ گاندھی کا پہلا مطالبہ یہی تھا کہ پنجاب کے لوگوں پر جس قدر ظلم و ستم ہوا ہے۔ اس کی تلافی کی جائے۔ مالی اور جانی نقصان اٹھانے والوں یا ان کے وارثوں کو معاوضہ دیا جائے۔ یہ مطالبات روز بروز زور پکڑ رہے تھے۔

تحریک خلافت کا آغاز

دوسری طرف مسلمان بھی ترکی کی سب ابتلاؤں کا سارا الزام بجا طور پر برطانوی حکومت پر دھرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں بپھرے ہوئے تھے اور دونوں حکومت سے بیزار تھے۔ لیکن دونوں کی وجوہات مختلف تھیں۔ مسلمان ترکوں کے مصائب سے پریشان تھے اور ہندو پنجاب کے مظالم کی تلافی چاہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں غم و غصّے کے جذبات شدید تر تھے۔ ایک انگریز نے لکھا کہ "مسلم انڈیا اس وقت ایک بہت بڑے بارود خانے کی طرح ہے جس میں چنگاری لگنے سے سارا ملک بھک سے اڑ جائے گا۔" مسلمانوں کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ مسلمان اپنے گھروں میں بھی صرف ترکی اور خلافت پر گفتگو کرتے تھے۔ کسی دوسرے معاملے سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔

خلافت کی بقائے حق میں ایک ملک گیر تحریک وجود میں آ گئی۔ اور اس کو منظم کرنے کے لیے (آل انڈیا خلافت کمیٹی) وجود میں آئی۔ اپنے حجروں سے نکل کر علماء بھی سیاست

کے میدان میں آ گئے۔ چونکہ خلافت ایک مذہبی مسئلہ تھا اس لیے علماء نے بھی ضروری سمجھا کہ وہ اس نازک مرحلے میں قوم کی قیادت کریں۔

انہی دنوں اقبال نے بھی اپنی ایک تحریر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کے دنیاوی اور سیاسی معاملات میں بھی علماء کی مداخلت ضروری ہے۔ ملک کے بہت سے قابل ذکر علماء اور سیاسی لیڈر تحریک خلافت میں شامل ہو گئے۔ اور اس کی سربراہی محمد علی جناح اور شوکت علی کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی ۱۹۱۹ء میں قید سے رہا ہو کر اپنے گھر کو جانے کی بجائے سیدھے امرتسر کے قومی جلسوں میں شریک ہونے کے لیے پہنچ گئے۔ یہیں اقبال نے محمد علی کی طرف منہ کر کے وہ مشہور قطعہ پڑھا جو یوں شروع ہوتا ہے۔

"ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند"

(الف) تحریک خلافت کے مقاصد:- تحریک خلافت کے تین بڑے بڑے مطالبات تھے۔

(i) خلافت عثمانیہ کو قائم رکھا جائے۔

(ii) ترکی کی علاقائی سلامتی کا تحفظ کیا جائے۔

(iii) مقامات مقدسہ ترکوں کے پاس ہی رہیں اور جزیرہ نمائے عرب سے فرنگیوں کا تسلط ختم کیا جائے

اُدھر روز بروز یورپ میں چھپنے والی خبریں اور اتحادی ترجماں کے بیانات سے یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ ترکوں کی قومی ہستی ملیامیٹ کر دی جائے گی اور ان کو اتحادیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا پورا پورا مزہ چکھایا جائے گا۔ اس قسم کی ہر خبر مسلمانوں کے لیے رنج و الم کا ایک نیا پیغام لاتی تھی۔ مسلمان، خلافت اور ترکوں کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار تھے۔ لیکن برطانوی حکومت اُن کے جذبات کو قطعی طور پر نظر انداز کرتی چلی جاتی تھی۔ بلکہ اس بات سے برہم تھی کہ ہندوستان کے مسلمان ترکوں کے کیا لگتے ہیں۔ جو اتنا شور مچا رہے ہیں۔ اس وقت حکومت ہند کا سربراہ اوسط درجے کی لیاقت کا مالک لارڈ چیمسفورڈ تھا۔ اس نے لندن کو اس مضمون کے بہت سے پیغام بھیجے کہ ترکوں سے نرم شرائط پر صلح کر کے مسلمانوں کے غصے کو ٹھنڈا کیا کیا جائے۔ لیکن وائسرائے کی شخصیت میں وہ دبدبہ نہ تھا کہ وہ اپنی بات منوا سکتا۔ برطانوی حکومت اور اس کے حلیف فتح کے نشے میں چور تھے اور اس مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھتے

تے۔ چیمسفورڈ نے مختلف قوموں کے ایک نمائندہ وفد سے اس معاملے پر اظہار ہمدردی کیا۔ لیکن اس
ے پاس خالی خولی تسلیوں اور اپنی مجبوریاں کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

جو ہندو مسلم اتحاد ان غیر معمولی حالات میں وجود میں آیا
ب) **ہندو مسلم اتحاد کی نوعیت:-** وہ سبھاش چندر بوس کے الفاظ میں اس طرح پر تھا
کہ گاندھی اور کانگرس مسلمانوں کے ترکی اور خلافت کے بارے میں مطالبات کی حمایت کریں گے
اور خلافت والے گاندھی کی اس بات کی تائید کریں گے کہ جلیانوالہ باغ میں مرنے والوں کے
جانی نقصان کی تلافی کی جائے۔ ان کی رائے میں یہ سمجھوتہ ایک طرح کا سودا تھا۔ ایک طبقے میں یہ
خیال پایا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے گاندھی کی راہنمائی کو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا تھا۔ اس
زمانے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی، گاندھی کے متعلق پبلک جلسوں میں جو غیر معمولی توصیفی
کلمات استعمال کرتے تھے اس سے بھی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جواہر لال نہرو کی روایت ہے کہ اس
افراتفری کے اتحاد والے دور میں بھی ہندو اور مسلم نیشنلزم کو علیحدہ علیحدہ شناخت کیا جا سکتا تھا۔ اور
بیرون ملک کے واقعات مسلم نیشنلزم کی توجہ کا مرکز تھے۔

جب تحریک خلافت کے راہنماؤں نے محسوس کیا کہ یہاں بیٹھ کر ان کی
ج) **وفد خلافت:-** ہم نوائی نہیں ہوتی تو انہوں نے مولانا محمد علی۔ مولانا سلیمان ندوی اور
سید حسین پر مشتمل ایک وفد انگلستان کو بھیجا تاکہ برطانوی حکومت پر ہندوستان کے مسلمانوں
کا نقطہ نظر واضح کر دیا جائے۔ اس وفد کے ارکان مارچ ۱۹۲۰ء کو بمبئی سے علیحدہ علیحدہ روانہ ہوئے
اور آٹھ مہینے بعد ناکام لوٹے۔ اس دوران انہوں نے برطانیہ کی پارلیمنٹ، حکومت کے ارکان اور
زندگی کے مختلف شعبوں کے عمائد سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ لیکن کسی کے ہند سے ترکوں کے لیے
کلمۂ خیر نہ نکلا۔ فرانس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی جا کر دیکھا۔ یورپ سے بھی ملاقات کی۔ اس
سے نتیجہ تگ و دو کے بعد جب وطن واپس پہنچے تو مولانا محمد علی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم خود
زاد ہوئے بغیر عملی طور پر کسی اسلامی ملک کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ اب ان کا اولین مقصد یہ
یا کہ سب سے پہلے آزادی کے لیے جدوجہد کی جائے۔ گاندھی بھی اس مقصد سے متفق تھے
نے آزادی کا نام سوراج رکھا۔ ملک میں ہر طرف "سوراج" "سوراج" کے نعرے لگنے لگے۔

سوراج حاصل کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا جس کے
تعاون کی تحریک مصنف خود گاندھی تھے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ تقسیم بنگال کے

دنوں کی طرح برطانوی حال کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے سرکاری عدالتوں سے رجوع نہ کیا جائے۔ بلکہ ان کو پنچائتوں کے ذریعے نپٹایا جائے۔ سرکاری واجبات کی ادائیگی روک دی جائے۔ وکیل عدالتوں کے سامنے پیش نہ ہوں۔ سرکاری ملازم اپنے استعفیٰ داخل کر دیں۔ طالب علم سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے باہر نکل آئیں۔ نشہ آور چیزوں پر مکمل پابندی لگا دی جائے۔ غرض کہ ہر محاذ پر انگریزوں کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اس سارے پروگرام کو "نان کو آپریشن" کا نام دیا گیا "عدم تعاون" اس کا اُردو ترجمہ ہوا جو غالباً ابوالکلام آزاد کی اختراع تھی گاندھی کا اندازہ تھا کہ اگر اس پروگرام پر پورا ایک سال عمل کیا جائے تو "سوراج" حاصل ہو جائے گا۔ "عدم تعاون" کا پورا گرام پہلے خلافت کمیٹی والوں نے قبول کیا۔ پھر کانگرس اور دوسری جماعتوں نے اسے اپنایا۔ نان کو آپریشن اور خلافت کی تحریکیں دوش بدوش چلنے لگیں۔ بلکہ دونوں ایک ہی تحریک کا حصہ بن گئیں۔ حکومت نے تشدد کی انتہا کر دی۔ لوگوں کو ناحق بدنی سزائیں دی گئیں۔ جیلوں میں بند کیا گیا۔ ان کی املاک ضبط کی گئیں اس کے باوجود مسلمانوں میں قربانی کا جذبہ بڑھتا ہی گیا۔ مولانا محمد علی کا یہ شعر شاید اسی موقع کے لیے لکھا گیا ہو:

تعزیر جرم عشق ہے بے حرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یہاں سزا کے بعد

تحریک کے دنوں میں گاندھی کے طول طویل دوروں کے اخراجات خلافت فنڈ سے ادا کیے جاتے تھے لیکن وہ اکثر و بیشتر ہندوؤں کے گھر میں رہتے تھے۔ اور ان کے اثر میں آگئے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی جب سرکاری تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا مسئلہ پیش ہوا تو علی گڑھ پر حملہ آور ہونے والوں اور اس کو توڑنے والوں میں گاندھی پیش پیش تھے لیکن بنارس ہندو یونیورسٹی کے معمولات میں انہوں نے دخل دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس سے کئی مسلمان گاندھی کی طرف سے کھٹک گئے۔

چورا چوری کا حادثہ

گاندھی بار بار کہتے تھے کہ ان کی تحریک کبھی تشدد سے ملوث نہیں ہو گی۔ لیکن اس آگ اور خون کے ماحول میں تشدد روز مرہ کا معمول بن گیا۔ جب ایسے واقعات گاندھی کے نوٹس میں لائے جاتے تو وہ ان کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیتے۔ حکومت نے بہت سے لیڈروں کو جیل میں بھیج دیا۔ اس کے باوجود تحریک اتنی جان دار تھی کہ کامیابی سامنے نظر آتی

حکومت نے اپنے اعتبادی لیڈروں کی معرفت گفت وشنید کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن بات آگے نہ بڑھی تھی کہ گاندھی نے از خود چورا چوری نام کے ایک گاؤں میں آتش زدگی کے ایک واقعہ کے (جس میں پولیس کے اٹھارہ سپاہیوں کو تھانے کی عمارت کے اندر زندہ جلا دیا تھا) آڑ لیتے ہوئے ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو نان کوآپریشن کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی خلافت کی تحریک بھی ختم ہوگئی۔ یہ بھی ایک معمہ تھا۔ کہ گاندھی نے اپنے کسی مسلمان ساتھی سے مشورہ کیے بغیر ایک اچھی کامیابی کے دروازے تک پہنچی ہوتی تحریک کو یکایک کیوں ختم کر دیا گیا۔ اس معمے کے حل سے تاریخ کے بعض اہم گوشے بے نقاب ہوگئے۔ انگلستان میں تاریخ خلافت کی سربراہی سید امیر علی، آغا خان اور اصفہانی کر رہے تھے۔ جہاں تک ہوسکا انہوں نے اخباری مضمونوں کے ذریعے اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر برطانوی حکومت تک پہنچایا۔

تحریک خلافت کے مثبت اور منفی پہلو

تحریک خلافت کے نکتہ چین اس زمانے میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود تحریک خلافت کے بہت سے مثبت پہلو بھی تھے۔ اس تحریک کی وساطت سے مسلمانوں کی سیاست میں آزادی کا تصور داخل ہوا۔ تحریک خلافت اسلامی یگانگت اور اخوت کے جذبے کا ایک بے پناہ مظاہرہ تھا۔ ترکوں کے لیے ہندی مسلمانوں نے ایسی قربانیاں دیں جن کی تاریخ میں نظر نہیں ملتی۔

تحریک خلافت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ خلافت عثمانی کے ذریعے دنیائے اسلام کا ایک مرکز قائم رہے اور آہندہ اتحاد کی بنیادیں سمار ہونے سے بچ جائیں۔ اس تحریک سے مسلمانوں میں پہلی مرتبہ ایسے لیڈر ابھرے جو عوام کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے تھے۔

ہزاروں کارکنوں نے سیاسی تربیت حاصل کی جو بعد میں تحریک پاکستان کے لیے قوت کا باعث بنی۔ اگر خلافت جیتی یہ قوت تحریک کا وجود نہ ہوتا تو اتحادی ترکوں کو ملیا میٹ کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔ تحریک خلافت کا سب سے اہم منفی پہلو یہ تھا۔ کہ اس سے ہجرت کی تحریک نے جنم لیا۔ بعض علماء کا خیال تھا کہ انگریزی عملداری میں ہندوستان دارالحرب ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کرکے کسی قریبی اسلامی ملک میں پناہ لینی چاہیے۔ چنانچہ اسے دینی جذبے سے مغلوب ہوکر اٹھارہ ہزار سیدھے سادے مسلمانوں نے اپنے

اثاثوں اور املاک کو کوڑیوں کے مول بیچ دیا اور اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمسایہ ملک کے پاس اتنے ذرائع نہیں تھے کہ مہاجرین کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتا چنانچہ جو پہنچ گئے تھے۔ ان کو واپسی کا حکم ملا۔ جو راستے میں تھے ان کو روک دیا گیا۔ راستے میں سردی کی شدت تھی، خوراک بھی نہ ملتی تھی۔ سینکڑوں وہیں مر کھپ گئے جو واپس آئے ان کے واسطے چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس طرح ہزاروں خاندان تباہی کے منہ میں چلے گئے۔

باب ۱۵

فرقہ وارانہ کشیدگی

۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا تھا۔ کہ ہندوستان کو بتدریج سیلف گورنمنٹ یا حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی اس کے بہت جلد بعد وزیر ہند مانٹیگو نے یہاں آ کر سیاسی لیڈروں، اعلیٰ سرکاری افسروں اور صوبائی گورنروں سے ملاقاتیں کیں اور ملک کے لیے ایک دستوری خاکہ (جس کے خد و خال اس کے دماغ میں پہلے سے موجود تھے۔ تیار کیا اس خاکے کی بنیاد پر ۱۹۱۹ء کا دستور بنا، جو متفقہ طور پر تجرباتی اور محض عبوری دور کے لیے تھا۔ اس میں صوبوں کو پہلے کی نسبت بہت وسیع اختیار سونپے گئے تھے اور جزوی طور پر جمہوری طرزِ حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا گیا، یہ وہی جمہوریت تھی جس کا گذشتہ تجربہ مسلمانوں کے لیے چنداں خوش گوار نہ تھا اور جس سے وہ جلد یا بدیر ایک بے حیثیت اقلیت میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اس بات پر تو مسلمانوں کا اتفاق تھا کہ جمہوریت سے کوئی مفر نہیں وہ صرف یہی چاہتے تھے کہ اس جمہوریت کو ایسے تحفظات کے ساتھ نافذ کیا جائے جس کی مدد سے قوم کے جائز مفاد کا تحفظ ہو سکے۔ ان تحفظات میں سے اہم جداگانہ انتخاب کا طریق تھا۔ چونکہ مغربی جمہوریت میں بندوں کو گنا کرتے ہیں اور تولا نہیں کرتے، مسلمانوں کے لیے یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ مگر ہندوؤں کو اپنی اکثریت کی وجہ سے اس میں سراسر فائدہ نظر آتا تھا۔ اس لیے ان کی خواہش اور کوشش تھی کہ حکومت خود اختیاری کا نفاذ تدریجی نہیں بلکہ فوری ہو اور وہ جلد سے جلد بلا شرکت غیرے اقتدار کے مالک بن جائیں نئے آئین کے ماتحت، مجالس قانون ساز کے انتخابات انتہائی طور پر ناساز گار حالات میں ہوئے۔ عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ بڑی بڑی پارٹیوں کے تمام اہم کارکنوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور بعض جگہوں پر چوہڑے اور نائی امیدوار کامیاب قرار دیئے گئے۔

فسادات کا دور

۴۔ فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی نے کسی مسلمان لیڈر سے مشورہ کیے بغیر عدم تعاون کی تحریک کا گلا گھونٹ

دیا۔ اس سے تحریک خلافت بھی بے جان ہو کر رہ گئی۔ اس وقت بہت سے با اثر راہنما جیلوں میں تھے۔ گاندھی پر مقدمہ قائم ہوا۔ انھیں پانچ سال قید کی سزا ملی۔ ابھی یہ مدت پوری نہ ہوئی تھی کہ انھیں رہا کر دیا گیا۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران تو ہندو مسلم اتحاد کے نعرے گونجتے تھے۔ لیکن ان کے اختتام پر ہندو مسلم کشاکش کئی گنا قوت کے ساتھ واپس آگئی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک کے زمانے کو عام طور پر فسادات کا دور کہا جاتا تھا۔

ابتداً ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مالا بار سے ہوئی جہاں ہندو مخبروں اور حکومت کے افسروں کی ملی بھگت سے مسلمانوں پر غیر انسانی تشدد کے تمام ریکارڈ مات کر دیے گئے۔ ملتان لاہور کلکتہ، بمبئی اور دوسرے تمام بڑے بڑے شہروں بلکہ قصبوں میں بھی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ سب سے زیادہ ہولناک فساد ۱۹۳۱ء میں کانپور میں ہوا جہاں مسلمانوں کے جان و مال کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

فسادات کی ابتدا تو معمولی جھگڑوں اور رنجشوں سے ہوئی۔ مگر ان کے نتائج نہایت سنگین ہوتے تھے۔

شدھی اور سنگھٹن تحریکیں

اسی مسموم فضا میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوئیں شدھی، کے لفظی پاک کرنا ہے۔ اس تحریک کا بانی جالندھر کا ایک وکالت پیشہ سماجی کارکن منشی رام تھا۔ اس نے چولا بدلا تو شردھانند کہلایا۔ عدم تعاون کی تحریک کے پلیٹ فارم پر وہ دہلی میں پیش پیش نظر آتا تھا ایک مرتبہ تو اس نے دہلی کی جامع مسجد سے بھی مسلمانوں کے ایک ہجوم سے خطاب کیا۔ وہ کسی سیاسی مقدمے میں ملوث ہو کر جیل بھیجا گیا لیکن معینہ مدت سے پہلے نامعلوم وجوہات کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔ جیل سے باہر نکلا تو اس نے شدھی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہندو مذہب میں (جو کبھی تبلیغی مذہب نہیں رہا تھا) داخل کر لیا جائے بظاہر

> اس تحریک کے دو مقصد ہو سکتے تھے۔ پہلے تو یہ کہ اس تدبیر سے ہندوستان میں مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور اگر یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب نہ ہو تو ہندو اکثریت اتنی غالب ہو جائے کہ مسلمان اقلیت کی آواز، مغربی جمہوری نظام کے ماتحت، مکمل طور پر دبا دی جائے۔

شدھی کی تحریک کی کامیابی یا ناکامی تو اپنی جگہ پر رہی۔ اس نے ہندوؤں کا بگاڑ بہت

زیادہ بڑھا جو کئی جگہ پر (یہاں آریہ سماجی پرچار مسلمان عورتوں اور بچوں کو اپنے اثر سے ورغلا کر ہندو بنا لیا کرتے تھے) ہندو مسلم فسادات کا باعث بنا۔ اسی دور میں ہندو قوم کا سب سے بااثر لیڈر اردو زبان کا جانی دشمن اور بنارس ہندو یونیورسٹی کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھا۔ وہ کھلم کھلا ہندوؤں کو کہا کرتا تھا کہ تمہیں اپنے تاریخی دشمن یعنی (مسلمان) سے نپٹنا ہے تمہیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو مقابلے کے لیے تیار کرو اکھاڑوں میں جا کر ورزش کرو جسمانی صحت کو بہتر بناؤ۔ دست بدست لڑائی کا فن سیکھو تاکہ وقت پر اپنی اور اپنی عورتوں کی حفاظت کر سکو وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ تاریخی طور پر ہندوؤں کی نا اتفاقی ان کی غلامی کا سبب بنا ہے ہندوؤں کی آئندہ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے باہمی اختلافات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے جائیں۔ اس اتحاد کی تحریک کو سنگٹھن کہا جاتا ہے۔ اس اتحاد کا نشانہ صرف مسلمان تھے۔

ہندو مہا سبھا اس کے علاوہ مالویہ ہندو مہاسبھا کا بانی بھی تھا۔ پہلے پہل تو یہ جماعت اپنے آپ کو غیر سیاسی کہتی تھی لیکن جلد ہی سیاست کے میدان میں کود پڑی اور اس نے جداگانہ انتخاب کی سر توڑ مخالفت شروع کر دی۔ جداگانہ انتخاب کو مسلمان، سیاسی طور پر اپنے قومی وجود کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے ہندو مہاسبھا کے اس اقدام سے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافقت کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر ہونے والی تقریروں میں اس قسم کے خیالات ظاہر کیے گئے تھے۔

"مسلمان باہر سے آئے تھے، یہاں یہ ایک غیر قوم ہیں، ہندوستان کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں اگر وہ اس کو چھوڑنا چاہیں تو خوشی سے اپنی راہ لیں۔ اگر یہاں رہنا ہو تو ہندو بن جائیں۔ اور ہندو معاشرے میں اپنے آپ کو جذب کر لیں۔ ورنہ ان کا وہی حشر ہو گا، جو چند سو سال پہلے سپین میں مسلمانوں کا ہوا تھا حکومت مسلمانوں پر متواتر مہربانیاں کرتی جاتی ہے۔ جو رعائتیں ان کو دی جاتی ہیں اس سے ہندوؤں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے لیے لازمی ہے کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے گٹھ جوڑ کے خطرناک نتائج سے خبردار رہیں" اس قسم کی ہتک بہتان تراشیوں سے ملک کی فضا کا تناؤ بڑھتا گیا۔

کانگریس اور سوراجی دھڑا

تحریک عدم تعاون اور خلافت کے خاتمے پر کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک طبقہ تو عدم تعاون کے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھا۔ دوسرا اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ کونسلوں کا بائی کاٹ ختم کر دیا جائے۔ ان کے اندر جا کر پارلیمانی حربوں سے کام لیتے ہوئے حکومت کے کاروبار کو کمل بلکہ ممکن بنا دیا جائے۔ دونوں فریقوں کے جھگڑے نے طول پکڑا۔ بالآخر مولانا محمد علی کی کوششوں سے ان کے درمیان ایک سمجھوتا ہو گیا جس کی رو سے بعض شرائط کے ماتحت کانگریسیوں کو انتخابات لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ کونسلوں کے اندر پہنچنے والے کانگریسی سوراجی کہلاتے تھے اور ان کے سب سے اہم لیڈر موتی لال نہرو تھے۔ جو مرکزی اسمبلی میں اپنی پارٹی کے قائد تھے۔ بنگال اور سی پی میں سوراجیوں نے اپنی جارحانہ تنقیدوں سے ہر محاذ پر حکومت کو شکست دی۔

مسلم لیگ کا اجلاس ۱۹۲۴ء

ادھر لیگ کے اندرونی حالات دگرگوں تھے تحریک خلافت کی ناکامی نے قوم میں مایوسی بے بسی اور بے دلی کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا۔ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں لیگ کا کوئی اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۴ء کا اجلاس لاہور میں بلایا گیا۔ محمد علی جناح اس کے صدر تھے۔ ان کے خطبۂ صدارت کا ایک ایک لفظ ہندوؤں اور دوسری ہمسایہ قوموں کے لیے خیر سگالی کا پیغام تھا۔ انھوں نے کانگریس کے رہنماؤں سے پرزور اور دردمندانہ اپیل کی کہ وہ بگڑتے ہوئے حالات کو سنوارنے کی کوشش کریں اس معاملے میں انھوں نے لیگ کی طرف سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ یہ اپیل اگلے دو سالوں میں بھی دہرائی گئی لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ کانگریس نے ہندو مہا سبھا کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔

فسادات کی ذمہ داری

فرقہ وارانہ فسادات بار آور ہوئے۔ ہر فساد کے بعد بدلے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ بدلے کا بدلہ چلتا رہا۔ ہندو مہاسبھا کے راہنما کھلم کھلا فسادات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ فساد برپا کرتے اور ان کو طول دینے سے ہندو نوجوانوں کو بہت سی کارآمد تربیت ملتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود تو ہندو ہر وقت فسادات کی تیاریوں میں مصروف رہتے یا فساد برپا کرنے کے لیے شوشے چھوڑتے رہتے مگر جب فساد پھوٹ پڑتا۔ تو اس کا سارا الزام مسلمانوں پر دھرتے اور مسلمان راہنماؤں سے مطالبہ کرتے کہ فسادیوں کی مذمت کریں۔ جب فسادات

میں ہندوؤں کی زیادتی ثابت ہو جاتی تو منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتے ۱۹۲۴ء میں کوہاٹ میں ہندوؤں کی طرف سے ایک دلآزار نظم شائع کی گئی اور ایک خوں ریز فساد ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر گاندھی نے ایک طویل بیان شائع کیا جس میں بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہر ہندو بزدل ہوتا ہے اور ہر مسلمان فسادی۔ اگر ایک فریق دنگئی ہو تو دوسرا لازمی طور پر بزدل ہوتا ہے ان الفاظ میں گاندھی نے فسادوں کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی اور ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ اپنی بزدلی چھوڑ دو اور مقابلے پر آجاؤ۔ گاندھی کی اس منطق سے بہت سے مسلمانوں کی خوش فہمیاں دور ہو گئیں مولانا محمد علی جو گاندھی کی حمایت کا راگ الاپنے نہ تھکتے تھے۔ گاندھی سے کھٹک گئے۔

ہندو مہاسبھا، کانگریس اور جداگانہ انتخاب

۱۹۲۶ء کے آخر ہونے والے عمومی انتخابات میں ذلت آمیز شکست اٹھانے کے بعد کانگریس ہندو مہاسبھا کی باندی بن گئی موتی لال نہرو کا اثر و رسوخ کم ہوا۔ کانگریسی ارکان سمیت اسمبلی کے تمام ہندو ممبروں نے مالویہ کی قیادت قبول کر لی جو بات آج ہندو مہاسبھا کے لیڈر کہہ دیتے کل کو کانگریس والے بھی بے سوچے سمجھے دہرا دیتے۔ اس سے کانگریس بدترین قسم کی فرقہ پرستی کی دلدل میں پھنس گئی ہندو مہاسبھا نے جداگانہ انتخابات کے خلاف جس غوغا آرائی کا بندوبست کیا تھا۔ کانگریس بھی اس میں شریک ہو گئی۔ انہی دنوں برطانوی لیبر حکومت کے ایک اہم رکن نے ورا اس کے سوراجی سیتا مورتی کے نام اپنے ایک ذاتی خط میں جداگانہ طریق انتخاب کی پرزور مذمت کی اور بتایا کہ یہ طریقہ برطانوی طرز فکر کے خلاف ہے۔ اس حوصلہ افزائی سے جداگانہ انتخاب کے مخالفوں نے اپنی مہم کو اور بھی تیز کر دیا۔ اسی نسبت سے مسلمانوں کو اور بھی تشویش ہوئی۔ ہر چند کہ برطانوی حکومت کا سرکاری موقف یہی تھا کہ جتنی دیر تک مسلمان جداگانہ انتخاب کی ضرورت محسوس کرتے رہیں گے اتنی دیر تک ان کی آئینی حیثیت برقرار رہے گی۔ لیکن تقسیم بنگال کے حشر سے ثابت ہو چکا تھا کہ انگریز حکمرانوں کے وعدوں پر اعتبار کرنا کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ کانگریس کے لیڈروں نے کم و بیش تیس چالیس سال سے برطانیہ کے بااثر حلقوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور ان کو ہندوستان کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ کانگریس والوں کا مقصد ہندوستان کے متعلق انگریزوں کو صحیح خبریں فراہم کرنا نہ تھا۔ بلکہ اپنے نقطۂ نظر کی اشاعت

مقصود تھی۔ ان خبرناموں میں مسلمانوں کے متعلق سفید جھوٹ اور نصف سچ ملا جلا کر پیش کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد کانگریسی لیڈروں نے ہر سال موسم گرما میں برطانیہ کے دورے شروع کے لیے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ مرکزی اسمبلی کے صدر وی۔ جے پٹیل (جن کو اپنے عہدے کے اقتضا سے سیاسی دھڑے بندیوں سے پرے پرے رہنا چاہیئے تھا) ۱۹۲۷ء میں صرف اسی لیے انگلستان گئے تھے کہ برطانوی حکومت کو کانگریس کا یہ پیغام دیں کہ اگر آئینی کمیشن میں گاندھی کو مقرر کر دیا گیا تو سب معاملات خود بخود سلجھ جائیں گے۔

باب ۱۶

ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کی ناکامی

ہندو مہا سبھا اور دیگر انتہا پسند ہندوؤں کی چلائی ہوئی تحریکیں شدھی اور سنگھٹن کی وجہ سے ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا میں ہیجان اور اضطراب کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور کئی مقامات پر فسادات کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں لیکن مسلمانوں کا ایک طبقہ ابھی تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں تھا ان کا خیال تھا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ "کچھ دو اور کچھ لو" کے اصول کی بنیاد پر ان دونوں قوموں کا اتحاد ہو جائے گا۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ یہ اتحاد انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ کانگرس میں بھی اس قسم کے خیالات رکھنے والا طبقہ پایا جاتا تھا۔ جو کہ مسلمانوں کو ساتھ ملانے کے لیے کچھ رعائتیں دینے کے لیے تیار تھا لیکن ہندو مہا سبھائی اور کچھ دوسرے ہندو مسلمانوں کی طرف سخت رویہ اختیار کرنے کے حامی تھے ان کا خیال تھا جو لوگ مسلمانوں کے علیحدہ وجود کا نعرہ لگاتے ہیں اور مخصوص مراعات مانگتے ہیں درحقیقت عام مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہیں اور انھیں کوشش سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ بیس پچیس سال کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ہندو مہا سبھائی اور ان کے حامیوں کا اندازہ کتنا غلط تھا اور وہ مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کو ختم نہ کر سکے۔

تجاویز دہلی

پاک و ہند کی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندو مسلم تعلقات تھے ہندوؤں کے خیال میں ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں جداگانہ انتخاب سب سے بڑی رکاوٹ تھی حالانکہ قائداعظم کی کوشش سے ۱۹۱۶ء میں معاہدہ لکھنؤ ہوا تھا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کو تسلیم کر لیا تھا لیکن جلد ہی ہندو اس سے منحرف ہو گئے اور جداگانہ طریق انتخاب کی مخالفت شروع کر دی اس مخالفت میں انھوں نے اس قدر شور مچایا کہ مسلمانوں میں بھی اضطراب پیدا ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس میں لیگ نے ہندوستان کی دوسری جماعتوں بالخصوص کانگریس سے سیاسی سطح پر مفاہمت کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی اور قائداعظم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سمجھ دار طبقے یہ بات محسوس کر لیں گے کہ ہندوستان

کا مسئلہ اتحاد و تعاون کے ذریعے ہی حل ہو سکتا ہے لیکن کانگرس نے کسی خوشگوار ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ ۱۹۲۷ء میں ایک ہندو ممبر نے ایوان بالا میں اس طریقہ انتخاب کے خلاف ایک قرارداد بھی پیش کی۔

موتی لال نہرو نے مقننہ کے اجلاس میں براہ راست محمد علی جناح سے گفتگو کی اور کہا کہ اگر مسلمان جداگانہ انتخاب کا مطالبہ واپس لے لیں تو میں کانگریس سے دیگر مطالبات منوا سکتا ہوں۔ جناح نے فوراً تیئس سرکردہ مسلمان لیڈروں کا ایک اجلاس ویسٹرن ہوٹل دہلی میں بلایا شرکاء میں مولانا محمد علی جوہر راجہ صاحب محمود آباد، سر علی امام مولانا شفیع داؤدی سر شفیع ڈاکٹر انصاری اور مفتی کفایت اللہ شامل تھے کئی نشستوں کی بحث و تمحیص کے بعد مسلمان لیڈر مخلوط انتخاب کو مندرجہ ذیل شرائط پر تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے یہ شرائط ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو شائع ہوئیں اور تجاویز دہلی کے نام سے مشہور ہوئیں۔

اہم نکات

(۱)۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے۔

(۲)۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دیا جائے اور ان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ۱/۳ نشستیں دی جائیں۔

محمد علی جناح نے یہ تجاویز ایک یادداشت کی صورت میں مرتب کروائیں اور اس نوٹ کے ساتھ مسٹر گاندھی کو بھجوا دیں کہ انھیں یا تو کلی طور پر منظور کیا جائے یا کلی طور پر مسترد کر دیا جائے ان تجاویز پر قانون ساز اداروں کے ۴۸ مسلمان ارکان کے دستخط تھے کانگریس کے سامنے ان تجاویز کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان آئینی حقوق سے آگاہ ہو جائیں جو مسلمان بحیثیت ایک قوم کے حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد اگر وہ اس سے اتفاق کریں تو دونوں قومیں مل کر ایسی آئینی تجاویز حکومت کو پیش کریں جن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کی جا سکے لیکن اس سے پہلے کہ ہندو مسلمانوں کی ان تجاویز کو قبول کرتے اور پھر دونوں قومیں مل کر حکومت کو آزادی کے لیے متفقہ دستور پیش کرتیں گورنمنٹ نے از خود ہندوستانیوں کو یہ دعوت دی کہ وہ ہمیشہ حکومت پر تنقید ہی کرتے رہتے ہیں اگر ان کے بس میں ہو تو وہ دستور کی کوئی متحدہ و متفقہ سکیم سامنے لائیں۔

کانگرس کا رویہ

قائداعظم محمد علی جناح کی دہلی تجاویز کو پہلے تو کانگرس کے راہنماؤں نے بڑا سراہا موتی لال نہرو سروجنی نائیڈو اور دیگر ہندو راہنماؤں نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا پنڈت لال موہن مالوی جیسے لوگوں نے بھی بمبئی کے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے

اجلاس منعقدہ مئی ۱۹۲۷ء میں ان تجاویز کی تائید کی اور کانگرس کے اجلاس میں اس کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ کانگرس کی طرف سے تجاویز دہلی کے منظور کیے جانے کے باوجود ہندوؤں نے ان تجاویز کے خلاف ہنگامے شروع کر دیے متعدد مقامات پر بلوے ہوئے مسلمانوں کو مارا اور پیٹا اور تجاویز دہلی کی طرح طرح کی تاویلیں کی حیلے بہانے گھڑے۔

مسلمانوں کا ردِ عمل

ہندوؤں کے اس نا معقول اور تشدد آمیز طرز عمل کو دیکھ کر مسلم لیگ کے کچھ رہنماؤں کے دلوں میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ اگر ابھی سے ان کے عزائم اتنے خطرناک ہیں تو کل جب ہم جداگانہ انتخابات سے دستبردار ہو جائیں گے تو نہ جانے کیا ہو تجاویز دہلی کی وجہ سے مسلمان جو کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے ہندو اپنی اکثریت کے بل پر اسے چھین سکتے تھے اور اس کا مظاہرہ انھوں نے ابھی سے شروع کر دیا تھا۔

مسلم لیگ کے دو گروہ

شرکائے اجلاس میں ایک گروہ سر محمد شفیع کی قیادت میں ان تجاویز کا مخالف رہا ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر مخلوط انتخابات کو مان لیا جائے تو مسلم نشستوں سے صرف وہی مسلمان منتخب ہوں گے جو ہندوؤں کو پسند ہوں گے اگر اکثریت چند جاہل کمینے قابل نفرت اور قطعی بے دین قسم کے امیدوار ہمارے نمائندے بنا کر بھیجنا چاہے تو وہ آسانی سے ایسا کر سکتی ہے ان کا اصرار تھا کہ صرف نشستوں کی تخصیص کافی نہیں بلکہ مسلمان نمائندے صرف مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہوں ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ مخلوط انتخابات کا سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ سے کیا مغلق مسلمان کم از کم دے کر زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر میں کانگریس نے پہلے تو ان تجاویز کی تائید کی اور پھر ان کی مخالفت شروع کر دی سر شفیع محمد نے لاہور پہنچ کر ان تجاویز کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ اور اعلان کیا کہ کسی صورت مسلمانوں میں بھی جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہیں ہوں گے ان کے اس مؤقف کو علامہ اقبال، سر فضل حسین اور سر آغا خان جیسے رہنماؤں کی تائید بھی حاصل تھی لیکن قائد اعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کے ایک مضبوط گروپ کے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جانے کے باوجود تجاویز دہلی کے بارے میں اپنے وعدے پر قائم رہے۔

سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں ایک شق یہ بھی تھی کہ حکومت سائمنگو چیمسفورڈ آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے اور اس کے رد عمل کو جاننے کے لیے ایک مخصوص مدت کے بعد ایک کمیشن مقرر کرے گی

جو مناسب ترامیم کی سفارش کرے گا۔ حکومت کے خیال کے مطابق مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات باشندگان ہند پر ایک عظیم احسان تھا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوستان کے عوام ان اصلاحات سے قطعی طور پر مطمئن نہ تھے بلکہ ان اصلاحات کو انھوں نے اپنی توقعات کے برعکس ہی پایا۔ تاہم کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ کا ہونا غنیمت تھا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت عوام کا دل جیتنے میں ناکام رہی تھی تاہم ہندوستان کے وائسرائے نے برطانوی حکومت کی ہدایت پر مذکورہ مقصد کے لیے ایک کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۲۷ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اردن تھے انھوں نے ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو سر جان سائمن کی قیادت میں یہ کمیشن مقرر کیا اور اسے ہدایت دی گئی کہ وہ ملک کے دستوری مسائل کا جائزہ لینے کے بعد ایک مفصل رپورٹ پیش کرے جن میں وہ نئی اصلاحات اگر کوئی مناسب نوعیت کی ہوں کا تفصیلی ذکر کرے سر جان سائمن کو حکومت نے مدد کے لیے ہندوستان کے عوام کے مسائل و جذبات و احساسات اور خیالات کی ترجمانی کرنے کے لیے جتنے بھی ارکان مقرر کیے گئے وہ سب کے سب انگریز تھے ان میں سے ایک بھی ہندوستان کا باشندہ نہیں تھا اور نہ ہی ان میں کوئی ایسا انگریز تھا جس کی ہمدردیاں ہندوستان کے عوام کے ساتھ وابستہ ہوں حالانکہ جس وقت اس کمیشن کے تقرر کی خبر ہندوستان کے اکابرین ملت کو ملی تو انھوں نے باقاعدہ اعلانیہ انداز میں انگریزوں کو احساس دلایا کہ ہندوستان کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے اور ہندوستانی جذبات کی ترجمانی کے لیے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اس کمیشن کا رکن بنایا جائے تاکہ اگر کمیشن نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہی ہے تو ان ارکان کو باشندگان ہند کے مزاج کا پتہ تو چل سکے۔ بالخصوص مسٹر محمد علی جناح نے عوامی جذبات کی ترجمانی کی ذمہ داری خود سنبھالنے کا اعلان کیا انھوں نے عوامی سطح پر مختلف حلقوں میں مختلف افراد سے رابطہ قائم کیا۔ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئے اور ان سب کی متفقہ رائے کے تحت ایک بیان جاری کیا جس میں حکومت کو مطلع کیا گیا کہ کمیشن میں ہندوستانی نمائندوں کو شامل نہ کرنا حکومت برطانیہ کی بنیادی غلطی ہے انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ تجاویز مرکزی و صوبائی مجالس مقننہ کو کمیشن کے سامنے سفارشات پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی اور پھر کمشن مشترکہ پارٹی سے گفت و شنید کرے گا۔ حقیقت میں ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں جو اس وقت ہندوستان کے عوام کے متعلق ہیں اور بنیادی طور پر کمشن کے سامنے ہندوستانیوں کو ضروری مواد پیش کرنے شہادتیں دینے کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عوام کی اس حد تک عمل و دخل ہوگا کہ وہ اس کمشن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ان تجاویز پر مثبت انداز میں اپنے سروں کو ہلا دیں۔ اور کمشن کی ان تمام تجاویز کو احسن اور قابل قبول قرار دیں جو برطانوی مفاد کے

پیش نظر حکومت کو پیش کریں حکومت برطانیہ کو اس کمیشن نے تقرر سے قبل واضح الفاظ میں آگاہ کیا گیا کہ اگر واقعی حکومت برطانیہ ہندوستان کے عوام کی محسن بن کر انھیں آئینی مراعات دینے کا ارادہ رکھتی ہے اور خلوص نیت سے جمہوری زندگی بحال کرنے کی جانب گامزن ہے تو اس کمیشن کے ارکان کی تعداد کا کم از کم نصف ہندوستان کے عوام کے نمائندوں میں سے منتخب کیا جائے۔ ورنہ بصورت دیگر اس کمیشن سے استبدادیت فرنگی کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کے علاوہ کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود حکومت برطانیہ نے کسی کی ایک نہ سنی اور ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو اس کمیشن کا اعلان کردیا۔ جس کا ڈھانچہ اس نے اپنی مرضی سے تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں اس بن بلائے اور ناپسندیدہ مہمان کی خاطر مدارت کس انداز کی ہو سکتی تھی۔

سائمن کمیشن اپنے تمام جہیز کے ساتھ ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو بمبئی پہنچا رس کی آمد سے پیشتر تمام لیڈروں نے متفقہ طور پر فیصلہ کرلیا ہوا تھا کہ ہر ممکنہ انداز میں اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لارڈ اروِن نے اس کمیشن کی آمد سے ایک روز قبل قومی اسمبلی کے تمام ارکان سے اپیل کی تھی کہ آنے والے کمیشن کے ساتھ بھرپور تعاون کریں۔ لیکن اس کی اپیل کا غیر سرکاری ارکان پر بالخصوص کوئی اثر نہ ہوا فروری ۱۹۲۸ء میں جب کہ اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہونے والا تھا۔ اس میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا راجہ غضنفر علی خان نواب اسمٰعیل لالہ لاجپت رائے اور مسٹر جناح جیسے اکابرین نے پہلے ہی اس سلسلے میں ملک میں ایسی لہر دوڑا دی تھی جس سے عدم تعاون کے جذبات مجسم نظر آنے لگے تھے پہلے پہل نواب اسمٰعیل خان نے بائیکاٹ کرنے کے مسئلہ کو اس لیے پسند نہ کیا کیونکہ اس سے انھیں اندیشہ تھا کہ اس بائیکاٹ کے آخری نتائج کانگرس کی تقویت میں مؤثر ثابت ہوں گے لیکن جب انھوں نے اتفاق رائے کا اظہار کردیا اس اندیشے کا سبب ماضی کے وہ ہندو مسلم تضادات تھے جو گزشتہ کئی برسوں میں رونما ہوئے تھے۔ یہی تضادات بالآخر ہندو مسلم فسادات کا باعث بھی بنے تھے بالخصوص شدھی کی تحریک سنگھٹن کی تحریک ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ، مسجدوں اور مسلم عبادت گاہوں کے قریب ہندوؤں کے باجوں کا استعمال ہندی اردو کا مسئلہ محرم، رام لیلہ عید الاضحیٰ اور ہولی وغیرہ کے تہوار پر ایک دوسرے کا معاندانہ رویے کا موجب تھے اور انھی تضادات کی بناء پر دونوں قوموں میں یہ شعور پختہ ہوچکا تھا کہ مذہبی تہذیبی معاشی اور سیاسی اعتبار سے ہندو مسلم کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے تاہم اسی قسم کے خیالات و احساسات بالآخر تقسیم ملک کا بھی موجب بنے۔

بالآخر ۱۶ فروری ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے نے جو اسمبلی کے رکن تھے سائمن کمیشن سے بائیکاٹ

کی تحریک پیش کر دی ۔ یہ تحریک ۶۷، ۸ ووٹوں سے منظور کر لی گئی اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ مرکزی اسمبلی نے کمیشن کے ساتھ بیٹھنے کے لیے جن تیس نمائندوں کو منتخب کر کے روانہ کرنا تھا وہ اب نہ بھیجے جائیں اور انہیں حکومت اگر منتخب کر بھی لے تو وہ از خود کمیشن کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیں حسب پروگرام کونسل آف سٹیٹ نے تیس نمائندوں کو کمیشن کا ساتھ دینے کے لیے منتخب کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگائی کہ یہ نمائندے کمیشن کی طرف ان معاملات میں رہنمائی کریں گے جس کے بارے میں کمیشن خود ضرورت محسوس کرے ان نمائندوں کی کمیشن کی رپورٹ میں بطور سفارش کوئی آواز ٹھوس نوعیت نہیں رکھے گی ۔

بدقسمتی سے انہی دنوں مسلم لیگ میں کچھ انتشار آمیز عناصر پائے جانے لگے تھے تجاویز دہلی ہندو مسلم فسادات کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین رابطوں اور زندگی کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے کردار کے موضوعات کے پیش نظر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی تھی ایک حصہ جناح لیگ اور دوسرا حصہ شفیع لیگ کہلانے لگا تھا سر محمد شفیع کے ساتھیوں میں سر فضل حسین علامہ اقبال حسرت موہانی اور سر ذوالفقار علی خان کے نام قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ تمام مسلم اکابرین مثلاً نواب اسمٰعیل خان وغیرہ نے مسٹر جناح کی حمایت کی اگرچہ یہ انتشار بالکل عارضی نوعیت کا تھا لیکن دشمن نے اس سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی دو سال کے اس اختلافی نظریات کے زمانے میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی نیت کا زیادہ واضح انداز میں پتہ چل گیا ۔

اس اختلافی نظریات کی بنا پر سر شفیع نے کمیشن کی حمایت کے ارادے کا اظہار بھی کر دیا سر شفیع نے اس حمایت کے لیے یہ مؤقف اختیار کیا کہ وہ یہ مخالفت ان امور کے لیے مول نہیں لینا چاہتے ان کے خیال میں انڈین نیشنل کانگرس ایک ہندو تنظیم تھی اس میں مسلمانوں کی شرکت محض خود فریبی تھی اور وہ سمجھ گئے تھے کہ ہندو کا ہر قدم سیاست کے میدان میں بالخصوص مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہی اٹھے گا اور وہ کبھی اس تحریک میں اس وقت تک شامل نہیں ہوگا جب تک اسے واضح طور پر پتہ نہ چل جائے کہ اس میں یا تو کھلے بندوں ہندو افادیت کا تحفظ ملتا ہے یا اس سے کم از کم مسلم مفادات کو نقصان پہنچتا ہے چنانچہ اس خیال کے پیش نظر وہ سمجھتے تھے کہ کانگرس کا مطالبہ بڑا سیدھا سادہ ہے اور اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ تمام ممالک میں جمہوری اقدار کے مطابق اختیارات کو تفویض کیا جانا چاہیے اس مطالبے میں جمہوری انداز کا نکتہ واشگاف الفاظ میں ہندو ذہنیت کی بدنیتی کی ترجمانی کرتا ہے یعنی مسلمانوں کو براہ راست ہندوؤں کے ماتحت کر دیا جائے چنانچہ اس مطالبے کی موجودگی میں ہندوؤں کا سائمن کمیشن سے بائیکاٹ کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا نہیں ہوگا بلکہ ان کے اپنے مطالبات کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے مترادف ہوگا سر شفیع کے خیال کے مطابق مسلمانوں کا مقصد صرف انگریزوں سے حصول آزادی نہیں بلکہ ان کے نزدیک

آزادی بھی ایک خصوصی نوعیت تھی علامہ اقبال انھیں اس آزادی کے تصور سے باتوں باتوں میں آگاہ کر چکے تھے۔ چنانچہ اس صورت حال میں سائمن کمیشن کا صرف اس مقصد کے لیے ساتھ دینا کہ ہندوؤں نے اس کا ساتھ نہیں دیا زیادہ سود مند نہیں ہوگا۔ تاہم ہندوستان بھر میں سائمن کمیشن کی مخالفت ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

ہندوستان بھر میں کمیشن کے خلاف ہنگامے

بمبئی سے دہلی پہنچ کر اس کمیشن کے سربراہ سر جان سائمن نے اعلان کیا کہ وہ آئینی مسائل میں ہندوستان کے منتخب ارکان کی آراء کی قدر کرے گا۔ اور ان میں سے چند ایک ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائے گا جو مطمئن نہ تھے تاہم پروگرام کے مطابق کونسل آف ٹیسٹ نے اپنی طرف سے تین ارکان اس مقصد کے لیے منتخب کر دیے اور حکومت نے اسمبلی کے نمائندے بھی نامزد کر دیے اور کمیشن نے اپنا دورہ ہندوستان شروع کر دیا ہندوستان کے اس دورے میں مختلف شہروں میں جگہ جگہ مخالفانہ مظاہرے ہوئے پولیس اور عوام کے درمیان مسلح متصادم بھی ہوئے لکھنؤ میں پولیس نے عوام پر شدید لاٹھی چارج کیا اس لاٹھی چارج کی زد میں ہندوؤں کے لیڈر زادے یعنی پنڈت لال نہرو کے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو کو پولیس کی لاٹھیوں سے ضربیں آئیں اس کے علاوہ انڈین نیشنل کانگرس کے سرگرم رکن پنڈت گوبند بلبھ پنت بھی عصائے عسکر کی زد سے محفوظ نہ رہے دہلی لکھنؤ اور دیگر ہندوستانی شہروں کے علاوہ سب سے زیادہ شدید مظاہرہ اس کمیشن کے خلاف لاہور میں ہوا لاہور میں ہونے والے اس مظاہرے کے کارنامے کی تصویر سید نور احمد نے اپنی کتاب "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" میں ان الفاظ میں کھینچی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو یہ کمیشن ریل کے ذریعے لاہور پہنچا ریلوے اسٹیشن پر اس کے استقبال کے لیے اعلیٰ سرکاری افسر اور کئی غیر سرکاری نمائندے موجود تھے پلیٹ فارم پر اور اسٹیشن کے باہر پولیس کے سخت انتظامات تھے دوپہر کے قریب مظاہرین کا ایک جلوس کالی جھنڈیاں اٹھائے اور سائمن گو بیک کے نعرے لگاتا ہوا موچی دروازے کے باہر سے چلا جن راستوں پر اس دن جلوس نکالنے کی اجازت نہ تھی انھیں چھوڑ کر یہ جلوس دہلی دروازے کی طرف گیا وہاں سے لنڈے بازار کا رخ کیا جلوس کی قیادت کرنے والوں میں لالہ لاجپت رائے۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر قصوری اور کئی ہندو کانگریسی لیڈر شامل تھے لالہ لاجپت رائے نیم کانگریسی اور نیم مہا سبھائی قسم کے بزرگ تھے اسی لیے ہندوؤں میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے وہ باضابطہ کانگریسی اور کانگرس کے احکام کے پابند نہ تھے لیکن اس موقع پر بطور خاص انھوں نے اس جلوس کا جو کانگرس کے زیر اہتمام نکالا گیا تھا۔ ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا۔ تقدیر انھیں کشاں کشاں موت کی طرف لے جا رہی تھی

لنڈے بازار کے اختتام کے قریب سڑک پر خاردار تاروں کا جنگلا، ریلوے اسٹیشن کی حدود سے دو سو گز کے قریب لگا ہوا تھا جلوس یہاں رک گیا اور کمیشن کے خلاف نعرے لگاتا رہا خاردار تار کی فصیل کے باوجود تھوڑی دیر کے بعد اس جلوس اور پولیس کے درمیان تصادم ہو گیا۔ ایک پولیس افسر مسٹر سکاٹ غصے میں بھرا ہوا مظاہرین کی جانب لپکا اور اس نے اگلی قطار پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ ایک ڈنڈہ رائے زادہ ہنس راج کو لگا ایک سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو زخمی ہوئے اور تین ضربیں لالہ لاجپت رائے پر پڑیں جن میں ایک ضرب دل کے قریب تھی فوری طور پر اس کا زیادہ اثر محسوس نہ ہوا اسی شام ایک پبلک جلسے میں لالہ لاجپت رائے نے تقریر کی لیکن ایک دورہ کے بعد اس چوٹ کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہو گئے اور پھر بستر سے نہ اٹھ سکے، ۱۷، نومبر ۱۹۲۸ء کو شیر پنجاب (وہ ہندوؤں میں اسی خطاب سے مشہور تھے) لالہ لاجپت رائے کا انتقال ہو گیا یہ تصادم کس طرح ہوا؟ اس سے متعلق حسب معمول دو بیان تھے جلوس والوں کی طرف سے خود لالہ لاجپت رائے نے اسی شام کو ایک اجتماعی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جلوس نے جنگلے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی تھی مظاہرین قطعاً پر امن تھے اور صرف نعرے لگا رہے تھے ان نعروں سے مشتعل ہو کر "سکاٹ" نے ان پر حملہ کر دیا۔

اگلی صبح جو سرکاری بیان جاری ہوا کہ خاردار تاروں کی جو رکاوٹ قائم کی گئی تھی وہ سڑک کی پوری چوڑائی کے مطابق نہ تھی تھوڑی سی جگہ خالی رہ گئی تھی مظاہرین نے اس جگہ گھیرا توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

بعد میں پنجاب کی مجلس قانون ساز، مرکزی اسمبلی اور برطانوی پارلیمنٹ میں اس واقع کے متعلق سوالات پوچھے گئے اور مزید تحقیقات کے مطالبے کیے گئے لیکن حکومت نے مزید تحقیقات سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں پنجاب میں چند دہشت پسند نوجوانوں کی خفیہ پارٹی نے اس واقعہ کا بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا لیکن تقدیر نے ستم ظریفی سے کام لیا جو حرکت سکاٹ نے کی تھی اس کی پاداش میں ایک دوسرے بے گناہ انگریز افسر سانڈرس کی جان گئی۔

یہ واقعہ ۱۷، دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیش آیا مسٹر سانڈرس لاہور کا ایس پی تھا اس مخالفت کے باوجود سائمن کمیشن نے اپنا کام جاری رکھا اور آخر کار ۱۳، اپریل ۱۹۲۹ء کو پورے ہندوستان کے دورے کے بعد واپس عازم برطانیہ ہوا اور اس نے اپنی رپورٹ حکومت برطانیہ کو پیش کر دی ان دنوں ہندوستانی امور کے متعلق برطانوی کابینہ میں مسٹر برکن ہیڈ بطور وزیر کام کر رہے تھے وہ دلی طور پر ہندوستانیوں سے چڑتے تھے اور انہیں خاص طور پر بلکہ صرف انسانی سطح پر نفرت تھی ظاہر ہے ایسا شخص ہندوستان

کے لوگوں سے کس طرح ہم خیال ہو سکتا ہے اور کس طرح ان کی بہبود کے لیے کام کر سکتا ہے۔

بہرحال رسمی طور پر اس کمیشن کی رپورٹ کو منظر عام پر لانا ہی تھا اس لیے مئی ۱۹۳۰ء میں کمیشن کی رپورٹ کو شائع کر دیا گیا اس رپورٹ میں جن اہم امور پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ پورے ہندوستان کے لیے ایک آئینی لائحہ عمل ہونا چاہیے جس کے تحت مجموعی طور پر اس ملک کو آئینی زندگی دی جا سکے اور آئینی فریم ورک بھی تیار کیا جائے۔

۲۔ پورے ملک کو صوبائی سطح پر تقسیم کی جائے۔

۳۔ ہندوستان میں فیڈرل طرز حکومت قائم ہو۔

۴۔ صوبائی حکومتیں بنانے کے لیے متعلقہ گورنروں کو اختیار دیا جائے تاکہ وہ ارکان اسمبلی سے ان افراد کو وزارت کا قلمدان سنبھالنے کے لیے منتخب کر سکیں جن کو پارٹی اکثریت حاصل ہو۔

۵۔ گورنروں کو یہ بھی آزادی دے دی گئی کہ وہ صوبائی سطح پر وزیر کا انتخاب کرتے وقت کسی وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کی ہدایات کی پابندی کریں۔

۶۔ بالغ رائے دہی کو زیادہ سے زیادہ حد تک کام میں لایا جائے۔

۷۔ سندھ اور اڑیسہ کو صوبائی سٹیٹس دینے کے لیے مزید غور و فکر کیا جائے اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے امور کو ماہرین سیاسیات یا ریاستی امور کی ایک کمیٹی کے سامنے جائزہ لینے کے لیے پیش کیا جائے۔

۸۔ برما کو حکومت ہند سے فی الفور علیحدہ کر دیا جائے۔

۹۔ آئینی اصلاحات کے لیے سب سے پہلے شمالی مغربی سرحدی صوبے سے کام شروع کیا جائے اس لیے اس صوبے کو لیجسلیٹو کونسل دینے کے علاوہ اس مرکزی آئین ساز اسمبلی میں بھی استواریت دی جائے۔

۱۰۔ اسمبلی میں رکنیت کے لیے جو ارکان منتخب ہوں وہ بلحاظ آبادی ہوں۔

۱۱۔ ہر صوبے سے کونسل آف سٹیٹ میں نمائندگی کے لیے کم از کم تین ارکان ہوں۔

۱۲۔ مرکز کو مضبوط رکھنے کے لیے صوبوں کی طرف سے پوری پوری مدد حاصل رہنا چاہیے اور کوئی قدم ایسا نہیں اٹھانا چاہیے جس سے مرکزیت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

۱۳۔ جہاں تک انتظامیہ کا تعلق ہے اس میں کمیشن نے صرف اس قدر التفات کیا کہ انتظامیہ میں تدریج وار آہستہ آہستہ اصلاحات کی جانی چاہییں تاہم کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہ کیا انتظامیہ

کی بہتری کے لیے لفظ (GRAPUALNESS) پر زور دیا گیا۔

۱۴۔ اس طرح صوبوں کو انتظامی اور آئینی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے آہستہ آہستہ ترقی کرنے کی تلقین کی گئی کیونکہ اگر تمام صوبوں کو فی الفور تمام اختیارات خود مختاری تفویض کر دیے گئے تو (کمیشن کے خیال کے مطابق) بہت ممکن ہے یہ ملک ترقی معکوس کی طرف پلٹ جائے اور ملک کے حالات بہتر ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہو جائیں۔

۱۵۔ وسیع تر ہندوستان بنانے کے لیے ایک کونسل تشکیل دی جائے جس میں تمام حالات کا بغور جائزہ لیا جائے اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کو پہلے سے ہی جانچ لیا جائے۔ وسیع تر سے مراد برٹش انڈیا اور ریاستوں کا اشتراک تھا یہ کونسل ایک ایکٹ کا مسودہ تیار کرے جس میں وسیع تر ہندوستان کی تشکیل سے حاصل ہوں گے۔

جہاں تک اس کمیشن کے ہندوستان کے عام حالات کا جائزہ لیا اس میں فرقہ وارانہ صورت حال کو بے حد مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا گیا اور رپورٹ میں یہ بات درج کر دی گئی کہ بہت ممکن ہے کہ اگر کمیشن کے سفارشات پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کی گئی تو فرقہ وارانہ گڑبڑ اس پر غلط اثر انداز ہو ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریات کو خود کمیشن نے مخالفانہ انداز میں اچھالنے کی کوشش کی سر سائمن نے اپنی رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا کہ جمہوریت کا مطالبہ کرنے والی سب سے زیادہ سرگرم جماعت انڈین نیشنل کانگرس دراصل ایک مذہبی جماعت ہے جس نے سیاست کا روپ دھارا ہے اور سادہ لوح مسلمانوں کو محض مطالبات کی ظاہری کشش سے لالچ دیا جا رہا ہے اور کچھ مسلمان ہندو کے لالچ میں آچکے ہیں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رپورٹ مسلم مطالبات کے حق میں تھی لیکن مجموعی طور پر اس کو پورے ہندوستان میں ناپسند کیا گیا جس کی بہت سی وجوہات حسب ذیل تھیں۔

۱۔ کمیشن میں بحیثیت رکن کوئی ہندوستانی شامل نہ تھا۔

۲۔ کمیشن کو یہاں آنے سے پہلے تصویر کا ایک رخ دکھا کر بھیجا گیا تھا اور دوسرے رخ کی طرف توجہ نہ کرنے ہی کو مصلحت قرار دیا گیا۔

۳۔ کمیشن کے قیام کے مقاصد اگر آئینی اصلاحات کا جائزہ لے کر عوام کو جمہوریت سے نوازنا تھا لیکن اس کی رپورٹ میں تاخیر کے ساتھ بحالی جمہوریت کی تلقین کی گئی۔

۴۔ مخالف مظاہروں کے باوجود اس کمیشن نے نہایت ڈھیٹ پن اور سرکاری تحفظ کے تحت اپنا کام جاری رکھا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی سفارشات میں حمایت عوام کی بجائے حمایت

حکومت برطانیہ ہی کار فرما ہوگئی۔

۵۔ نفسیاتی طور پر بھی کمیشن عوام سے ہمدردی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان کے خلاف پورے ملک میں زہر اگلا جا رہا تھا اور اس سلسلے میں بہت سی قیمتی جانیں بھی ضائع ہوگئی تھیں۔

نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء

سائمن کمیشن نے اپنے سفارشات حکومت برطانیہ کو پیش بھی نہ کی تھیں کہ برطانوی وزیر امور ہند مسٹر برکن ہیڈ پہلے ہی سے برہم ہونا شروع ہوگیا تھا اس کے خیال میں ہندوستانی اس قابل نہ تھے کہ انھیں جمہوری اقدار سے آشنا بھی کرایا جائے اس کے برعکس ہندوستان والوں میں سیاسی شعور اس قدر بیدار ہو چکا تھا کہ وہ کسی قسم کی مزید مزاحمت کو برداشت کرنے کی سکت بھی نہ رکھتے تھے اپنے چڑچڑے مزاج کی بناء پر مسٹر برکن ہیڈ نے پارلیمنٹ میں ہندوستانی عوام کے بارے میں بڑی اہانت سے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان کے لوگ اس حد تک ایک دوسرے سے بیزار ہیں اور ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا دستوری اساس بھی تیار نہیں کر سکتے جس پر وہ متفقہ طور پر راضی ہو جائیں"

انڈین نیشنل کانگرس نے اس ریمارک کو ایک چیلنج قرار دیا اور اس طنز کا جواب دینے کے لیے ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو ایک "آل پارٹیز کانفرنس" بمقام دہلی بلائی اس میں ہندوؤں مسلمانوں اور دوسری اقوام کے نمائندے بھی شریک ہوئے ان کے درمیان یہ طے پایا کہ آئندہ دستور پھر اس تصور کے ساتھ گفتگو کی جائے کہ ہندوستان میں کامل ذمہ دار حکومت قائم ہوگی دوسرا سوال اس میں یہ پیش کیا گیا کہ فرقہ وارانہ تناسب اور تعلقات کس طرح قائم ہوں بقول حسن ریاض دو مہینے کے اندر آل پارٹیز کانفرس کے ۲۵ اجلاس پورے ہوئے لیکن کچھ فیصلہ نہ ہوا۔

آخر کار مئی ۱۹۲۸ء میں پھر ایک اجلاس منعقد کیا گیا دریں اثناء ہندوؤں نے اس قدر کھل کر مسلمانوں کی مخالفت کی کہ ملک بھر میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی بہر حال ڈاکٹر انصاری مولانا شوکت علی اور مسٹر بسنت مسٹر گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو کے ذاتی دوست بھی تھے اس لیے انھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی اس کانفرنس میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے تحت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمے ہندوستان کا دستور مرتب کرنے کا کام لگایا گیا۔

مولانا شوکت علی نے مسٹر گاندھی کی اس تجویز کی تائید کی چنانچہ مندرجہ ذیل عہدیداران کو نامزد

آئین ساز اسمبلی کے ارکان منتخب کر لیا گیا۔

نہرو رپورٹ کمیٹی

۱۔ پنڈت موتی لال نہرو	صدر
۲۔ محمد شعیب قریشی	رکن
۳۔ مسٹر ایس ایم اینے	〃
۴۔ مسٹر ایم آر جیکار	〃
۵۔ سبھاش چندر بوس	〃
۶۔ سردار منگل سنگھ	〃
۷۔ سر علی امام	〃
۸۔ این ایم جوشی	〃
۹۔ سر تیج بہادر	〃
۱۰۔ جی آر پردھان	〃

اس کمیٹی کے ارکان کی تفصیل پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے لیے دستوری امور میں حصہ لینے کا تناسب کیا رکھا تھا بہر حال جب اس کمیٹی کا اجلاس ہوا بدقسمتی سے سر علی امام بھی اس میں شرکت نہ کر سکے کیوں نہ کر سکے اس کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے بعض حلقوں کا خیال ہے کہ اس کمیٹی کی تشکیل پر ہی مسلمانوں کو اطمینان نہ تھا پھر یہ کہ اس کمیٹی کو ارکان میں اضافے کا اختیار دے دیا گیا لیکن وہ اضافہ ہندوؤں نے اپنے مفادات کی خاطر ہندوؤں سے ہی کیا مسلمانوں کو سوائے لیبل سلپ کے اور کوئی وقعت نہ دی جس سے مسلمانوں میں اس کے بارے میں بددلی پائی جاتی تھی دوسرا خیال یہ ہے کہ خود سر علی امام کسی مصلحت کی بنا پر اس میں شریک نہ ہوئے۔ بہر حال اس دس رکنی کمیٹی میں ہندوستان کی کل آبادی کے ایک تہائی حصے کی نمائندگی صرف ایک مسلم رکن کر رہا تھا اور اس کا نام محمد شعیب قریشی تھا۔

نہرو رپورٹ سفارشات

تین مہینوں کی محنت کے بعد اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں تمام ایسی باتیں درج کی گئیں جو مسلمانوں کے مفادات کے قطعی خلاف اور ہندوؤں کے عین مطابق تھیں اس رپورٹ کی تکمیل پر واحد مسلمان

لیڈر کے دستخط موجود تھے۔ یعنی محمد شیب قریشی کے انھوں نے بھی رپورٹ پر بلا خوف و خطر اور بلا لحاظ و مروت کمیٹی سے اختلافی نوٹ دیا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ رپورٹ دہلی تجاویز کے بالکل مخالف تھی اور مہاسبھائی نکتہ نظر سے تیار کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کی سفارشات کی تلخیص اس طرح ہے۔

۱۔ ہندوستان میں وحدانی طرز کی ڈیننس سیٹ قائم کی جائے اور اختیارات کا ارتکاز مرکز میں ہو۔

۲۔ جداگانہ طریق انتخاب ختم کر دیا جائے۔ کمیٹی کے رائے میں انتخاب کا یہ طریقہ قومی ارتقاء کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

۳۔ مسٹر جناح کی دہلی تجاویز کے مطابق نشستوں کے تحفظ کا اصول رد کر دیا گیا ہے، اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ کل آبادی کا دس فیصد مسلم آبادی والے صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے نشستوں کا تحفظ کیا جائے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی نشستیں دی جاسکتی ہیں۔

۵۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کو مکمل صوبوں کی حیثیت دی جائے۔

۶۔ جنوبی ہندوستان میں ایک نئے ہندو صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۷۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم نہیں کیا جانا چاہیے۔

۸۔ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی قرار دی جائے۔

۹۔ بلوچستان کو مکمل صوبہ تصور کیا جائے۔

۱۰۔ مرکزی حکومت وزیراعظم کے علاوہ چھ وزیروں پر مشتمل ہو جن کا تقرر گورنر جنرل خود کرے۔ ان دس سفارشوں میں سے آٹھ سفارشیں صریحاً مسلمانوں کے خلاف تھیں اور جو موافق تھیں وہ بالکل برائے نام تھیں۔

جو دہلی تجاویز ۱۹۲۷ء کے مرکزی اسمبلی کے جلسے کے دوران تیار کی گئی تھیں اور ان کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ اسی سال میں ہندو مسلم منافرت زوروں پر تھی اور جو ہندو لیڈر خود کو پورے ہندوستان کا رہنما قرار دے رہے تھے ان کو اپنی ساکھ ڈوبتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کی آئیڈیالوجی میں نمایاں فرق آیا۔ ہندوؤں کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اس لیے انھوں نے باقاعدہ حریفانہ انداز اختیار کرنے کی ٹھانی۔

انھی دنوں مسٹر موتی لال نہرو نے مسٹر محمد علی جناح سے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ ہندو مسلم فساد میں اصل رکاوٹ کا باعث جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہے۔ جس کو مسلمان اچھال رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس ضد سے باز آجائیں تو کانگرس باقی تمام مطالبات فی الفور حکومت برطانیہ سے منوا سکتی ہے۔ یہ بات مسلمان لیڈر

مسٹر جناح کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے پنڈت موتی لال نہرو کو مثبت یا منفی جواب دینے سے گریز کیا اور تمام مسلم پارٹیوں کے اکابرین کا ایک اجلاس دہلی میں طلب کر لیا۔ ان دنوں مسلمانوں میں بھی افتراق تھا۔ مسلمان کئی حصوں میں بٹ گئے ہوئے تھے۔

مثلاً ۱۔ کانگرسی مسلمان

۲۔ نیشنلسٹ مسلمان ۳۔ نہرو کمیٹی کے حامی مسلمان۔

۴۔ حکومت کے طرفدار مسلمان ۵۔ نہرو کمیٹی کے مخالف مسلمان۔

اگرچہ مسلمان بہت سے حصوں میں منقسم تھے لیکن اس معاملے میں وہ مسٹر جناح کی آواز کو لبیک کہنے کے لیے ایک جان ہو گئے۔ ان پارٹیوں کے اکابرین میں سے شمولیت کرنے والوں میں مولانا محمد علی۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ سر علی امام۔ مولانا محمد شفیع داؤدی، سر محمد شفیع۔ ڈاکٹر انصاری اور مفتی کفایت اللہ کے علاوہ ۲۵۰ افراد اور بھی تھے۔ چند ایک نشستوں کے بعد ایک متفقہ فارمولا تیار کیا گیا جس کو "دہلی تجاویز" کا نام دیا گیا۔ دہلی تجاویز کی اہم باتیں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبے کی شکل دی جائے۔

۲۔ صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو باقاعدہ صوبائی مراعات دی جائیں۔

۳۔ وہاں آئینی اصلاحات کا نفاذ بھی کیا جائے۔

۴۔ سندھ میں مسلمانوں کو اسی طرح کی اضافی نمائندگی کی مراعات حاصل ہوں گی جس طرح ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو حاصل ہوں گی جو ایک ہندو اکثریتی صوبے میں مسلمانوں کو حاصل ہوں۔

۵۔ اسی قسم کا آئینی دستور صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی نافذ العمل ہو گا۔

۶۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی حاصل ہو گی۔

مسلمانوں کے مفاد کی بربادی

نہرو رپورٹ میں ان تجاویز کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔ جب اس رپورٹ کا علم مولانا شوکت علی اور مولانا سید فضل حسین حسرت موہانی کو ہوا تو انھوں نے واشگاف الفاظ میں کامل آزادی کی بجائے ڈومینین سٹیٹس (DOMINION STATUS) کا مطالبہ کر دیا اور کہا کہ فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ دفاع اور خارجی معاملات کے محکمے مرکز کے پاس رہیں۔ نہرو رپورٹ کی وہ باتیں جو مسلمانوں کے خلاف پائی جاتی تھیں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ وفاقی نظام حکومت کی بجائے وحدانی نظام حکومت تجویز کیا گیا۔

۲۔ سندھ کو بمبئی کا جزو ہی رہنے دیا جائے تاکہ مسلم اکثریت ہی رہے۔
۳۔ سرحد اور بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے کی مخالفت کی گئی۔
۴۔ مرکز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی کے بجائے ایک چوتھائی نمائندگی کی تجویز پیش کی گئی۔

موتی لال نہرو کی طفل تسلی

مسلمانوں نے جب اس پر احتجاج کیا تو انہیں یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی گئی کہ فی الحال ہمیں تو برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب دینا ہے اس کو مؤثر جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب اسی پر اتفاق کریں بعد میں ہم حالات کو مسلمانوں کے موافق بنالیں گے۔

پنڈت جی کی اس طفل تسلی اور شعبدہ بازی کو کون نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ان دنوں مسلمانوں کے بے باک لیڈران مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح انگلستان میں تھے۔ مولانا حسرت موہانی تو اپنا علاج کرا رہے تھے اور مسٹر جناح بیرسٹری میں مصروف تھے اور ادھر ہندوؤں کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف دو بلند ہمت مجاہد موجود تھے۔ یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی۔

مولانا حسرت موہانی نے رپورٹ کی ہر ہر دفعہ پر زبردست تنقید کی اور اس کے جواب میں خود بھی تجاویز پیش کیں۔ جو نہ صرف رپورٹ کی دفعات سے زیادہ ٹھوس تھیں بلکہ مسلم مفادات کے تحفظ کی ضامن بھی تھیں پنڈت موتی لال نہرو جیسے مدبر شخص نے ان متبادل تجاویز کو اپنی توہین گردانا۔ اور اعتراضات کا جواب دینے کی بجائے مولانا کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اور پوری فضا کو ان کے خلاف ایک تمسخر کے رنگ میں تبدیل کر کے ان کی ہر دلیل کو برباد کر دیا۔ حقیقت میں مسٹر نہرو کو آئینی سطح پر شکست کا سامنا تھا جسے انھوں نے نفسیاتی رنگ میں ہی ختم کر دینا چاہا۔ ان حالات میں بھلا کونسی تجویز منظور ہو سکتی تھی۔ آخر کار مولانا شوکت علی خاں نے اپنا ہاتھ دراز کرتے ہوئے اور آستین چڑھاتے ہوئے باآواز بلند کہا کہ۔

"میں بتاتا ہوں کہ مسلمانوں کا نمائندہ کون ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مسٹر شعیب نے پہلے ہی اس رپورٹ پر اختلافی نوٹ درج کیا ہے۔ اور اگر اس جلسے میں یہ رپورٹ منظور ہوئی تو مسلمانوں کو وہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔"

مسلمانوں کی طرف سے ترامیم

مسلمانوں کی طرف سے اس شدید مخالفت کے باوجود کانفرنس میں نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس رپورٹ کو آخری شکل دینے اور حتمی توثیق حاصل کرنے کے لیے اے دسمبر میں ایک اور آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں بلائی جائے۔ نہرو رپورٹ کے جزئیات کی جزء جب انگلینڈ میں مسٹر محمد علی جناح اور مولانا

محمد علی جوہر کو پہنچی تو وہ بھی کرب سے تڑپ اٹھے۔ چنانچہ دونوں نے ہر صورت ہندوستان پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر جناح نے یہاں پہنچ کر مسلم لیگ کا اجلاس کلکتے میں طلب کیا۔ اگرچہ مسلمانوں میں اس وقت بہت سا اختلاف پایا جاتا تھا۔ لیکن اس موضوع پر تمام مسلمان اکٹھے ہو گئے اور آل پارٹیز نیشنل کنونشن کے تحت مسلمان کی نیابت میں ایک کمیٹی مقرر ہو گئی۔ اس کمیٹی کے سامنے مسلم لیگ کی طرف سے نہرو رپورٹ میں بہت سی ترامیم پیش کی گئیں ان میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ مرکز میں مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہو گی۔

۲۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو دس سال کے لیے متناسب نمائندگی حاصل ہو۔

۳۔ غیر متذکرہ اختیارات مرکز کی بجائے صوبوں کو حاصل ہوں تاکہ وحدانی طرز حکومت کی بجائے وفاقی طرز حکومت کو کامیابی سے چلایا جا سکے۔

۴۔ کنونشن کے تیور سے پتہ چلتا تھا کہ مسلمانوں کی ان تجاویز کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو گی۔ اس لیے انھوں نے بڑے واضح الفاظ میں اس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا۔

"نہرو کمیٹی نے اپنی سفارشات میں کوتاہ نظری کی پالیسی اختیار کی ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں منصفانہ شرکت سے محروم ہو جائیں گے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ سے نہ کوئی مدد ملتی ہے اور نہ بار آور ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ ہماری ترقی کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ ہو اور تمام مختلف جماعتیں ملک میں دوستانہ ربط و ضبط کے ساتھ رہیں۔ اکثریتیں جابرانہ ظلم کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اقلیتیں اس امر پر خوف زدہ ہیں کہ ان کے مفاد اور حقوق کو ضرور پہنچے گا۔"

انجام کار

وہی ہوا جس کا مسٹر محمد علی جناح کو اندیشہ تھا انھوں نے اس اجلاس میں جس قدر ترمیمات پیش کیں انھیں مسترد کر دیا گیا۔ اور کانگرس کے ایک دریدہ دہن رکن جو نہرو رپورٹ تیار کرنے والی کمیٹی کا بھی رکن تھا۔ یہاں تک کہنے سے بھی نہیں جھجکا کہ۔

"مسٹر جناح ایک ضدی بچے کی طرح ہیں جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار سے خراب ہو گیا ہے۔"

یہ فقرہ مسٹر جناح کے دل میں کانگرس کی نفرت کا طوفان برپا کرنے کے لیے کافی تھا کیونکہ اس سے واضح تھا کہ ہندو ان کی انفرادی اہمیت اور لیڈر ہونے کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ بعد ازاں مسٹر جناح تمام مسلمانوں کو یکجا کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے اور مسلمانوں نے متحد ہو کر اس رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔ لیکن اس شدید مخالفت کے باوجود آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں ہندو کانگرس نے یہ بڑ ہانک ماری کہ اگر اس

رپورٹ میں ایک کامے کی بھی ترمیم کی گئی تو اس کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک حکومت نے اس رپورٹ پر عمل نہ کیا تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔

ردِّعمل نہرو رپورٹ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی و سماجی تعلقات کی خلیج اور زیادہ وسیع اور گہری ہو گئی۔ ہندوؤں کی مکاری مصدقہ انداز میں سامنے آئی۔ مسلمانوں کو اب سوچنا پڑا کہ ہندو کے خلاف باقاعدہ ایک پلیٹ فارم تیار کرنا چاہیے مولانا محمد علی جوہر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہندو نے یہ رپورٹ پیش کر کے مسلمانوں کو غلام بنانے اور ہندو تسلط کو مضبوط کرنے کے لیے سب سے مؤثر ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح نے بجائے مایوس ہونے کے خود کو زیادہ مستعد بنایا اور آزادیٔ قوم اور آزادیٔ وطن کی طرف زیادہ انہماک سے توجہ دینی شروع کر دی۔ نہرو رپورٹ کے ہاں کس حد تک مقبول ہوئی اور کس درجے تک مؤثر ہوئی اس کا اندازہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے لگایا جاسکے گا۔ جس کی ضرورت کو انگریز نے بھی محسوس کیا۔

مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات ۱۹۲۹ء

نہرو رپورٹ مسلمانوں کے لیے ایک کھلے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہندو پورے ہندوستان میں ہندو اکثریت کی بنا پر مبنی ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانانِ ہند کے لیے ایک پائیدار جوئے کی حیثیت رکھے۔ جو مسلمان کی گردن سے کبھی اترنے نہ پائے یہ رپورٹ مختلف الخیال مسلمانوں کے لیے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اس تازیانے نے واقعی مسلمانوں کو انتشار کے دشت سے نکال کر اتفاق کے پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا۔ سر شفیع اور سر فضل حسین کی مشترکہ کوششوں سے اس رپورٹ کی تردید کرنے کے لیے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست کیا گیا۔ یہ کانفرنس ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوئی۔ لیکن اس دفعہ اتحادِ مسلمانانِ ہند میں تھوڑی سی کسر رہ گئی یعنی جناح مسلم لیگ شامل نہ ہو سکی۔ آخرکار یہ کانفرنس دوبارہ مارچ ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی انعقاد پذیر ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ شفیع لیگ اور جناح لیگ کے دو مختلف وجود ختم کر دیے جائیں اور ان کی جگہ ایک ہی لیگ یعنی مسلم لیگ کا قیام مستحکم کیا جائے۔ اس طرح دو سال کے نفاق کے بعد یہ دونوں لیگیں مل کر متحدہ مسلم لیگ کانفرنس کی صورت میں برسرِ عمل ہوگئیں۔ نہرو رپورٹ کو ایک ہندو رپورٹ قرار دیا اور اس کی جگہ مسلمانوں کے مطالبات مندرجہ ذیل چودہ نکات کی صورت میں پیش کیے گئے یہ نکات محمد علی جناح نے تیار کیے اور تمام مسلمانانِ ہند نے اس کانفرنس

میں انھیں سراہا یہی نکات آگے چل کر جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے رسمی طور پر ان نکات کے سلسلے میں جو بیان جاری کیا گیا اس کا متن حسب ذیل تھا۔

۱۹۲۸ء میں کل جماعتی کنونشن کے انعقاد کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ملک میں سیاسی اصلاحات کا ایک ایسا جامع منصوبہ تیار کیا جائے جس کو ہندوستان کی سرکردہ تنظیموں کی حمایت حاصل ہو۔ اور جس کی حیثیت ایک ہی قومی سمجھوتے کی ہو۔ انڈین نیشنل کانگرس نے آئینی طور پر اس قسم کے منصوبے کو نہرو رپورٹ کی شکل میں قبول کر لیا جس میں کہا گیا کہ اگر برطانوی حکومت ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء تک نہرو رپورٹ کی سفارشات کو تسلیم نہیں کرتیں تو ملک میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا جائے گا۔ اور کانگرس نے عوام کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اگر اس میعاد تک مطالبات تسلیم نہیں ہوئے تو ٹیکسوں کی ادائیگی روک دی جائے گی۔ اور عدم تعاون کو پروان چڑھایا جائے گا۔ یہ دھونس ہندو مہاسبھا کی طرف سے حکومت کے لیے ایک الٹی میٹم کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہرو رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس میں ایک لفظ کی بھی تبدیلی کی گئی تو ہندو اس پوری رپورٹ کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔ اور یہ کہ کنونشن میں نیشنل لبرل فیڈریشن (NATIONAL LIBRAL FEDERATION) کے ڈیلیگیٹوں نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا اور الہ آباد کے جلسہ عام میں قطعی مؤقف اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہ غیر برہمن اور پسماندہ اقوام اس رپورٹ کی واضح مخالفت کر چکی ہیں اور یہ کہ مسلم لیگ کے ڈیلیگیٹوں میں نہایت معقول اور اعتدال پر مبنی تجاویز پہلے ہی پیش کر دی ہیں اور ان ترامیم کو مناسب مقام نہیں ملا۔ اور انھیں مانا نہیں گیا اس لیے مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو تسلیم کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہے۔

مسلم لیگ ایک عمیق غور و خوض کے بعد اور بہ عزم کلی و خلوص تمام یہ اعلان کرتی ہے کہ حکومت ہندوستان کے آئندہ آئین کے سلسلے میں مسلمانان ہند کو کوئی ایسا منصوبہ تسلیم نہیں ہو گا جس میں مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کو پیش نظر نہ رکھا جائے گا۔ اور جب تک مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے انھیں اس کا جزو نہ بنایا جائے گا۔

۱۔ آئندہ آئین وفاقی نوعیت کا ہو۔ جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں۔
۲۔ تمام صوبائی حکومتوں کو یکساں بنیاد پر اور یکساں اصولوں پر داخلی خود مختاری دی جائے گی۔
۳۔ ملک کی آئین ساز اسمبلیاں اور انتخابی اداروں کی تشکیل اس واضح اور حتمی اصول پر ہوگی کہ تمام صوبوں میں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی حاصل ہوگی۔ اور کسی اکثریت کو کم کر کے اقلیت نہیں بنایا جائے گا۔ اور نہ ہی اس کو مساویانہ درجے تک لایا جائے گا۔
۴۔ مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ایک تہائی ہوگی۔

۵۔ مختلف فرقوں کی نمائندگی رائج طریقوں کے مطابق جداگانہ انتخاب کے ذریعے ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر فرقے کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے اختیار سے جداگانہ انتخاب کی بجائے مخلوط انتخاب تسلیم کرے۔

۶۔ صوبوں کی حد بندی سکیم پنجاب، بنگال، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی مسلم اکثریت پر اثر انداز نہ ہو۔

۷۔ مذہبی آزادی کا پورا پورا اہتمام کیا جائے اور ہر عقیدے عبادت، تبلیغ، تعلیم وغیرہ کی کامل آزادی ہو۔ اور سب کو اس کا یقین دلایا جائے۔

۸۔ کوئی مسودۂ قانون یا اس کا کوئی حصہ آئین ساز اسمبلی میں پاس نہیں ہوگا۔ یا کسی اور منتخبہ ادارے کی وساطت سے پاس نہیں ہوگا جبکہ اس فرقے کے نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد یہ کہہ کر اسے رد کر دے کہ اس قانون یا اس جزو قانون سے اس مخصوص فرقے کو نقصان پہنچتا ہے۔

۹۔ سندھ کو بمبئی ریذیڈنسی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

۱۰۔ صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بھی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے عین مطابق آئینی اصلاحات کا نفاذ کیا جانا چاہیے۔

۱۱۔ آئین میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کو بھی دوسرے ہندوستانیوں کی طرح سرکاری ملازمتوں اور خود مختار اداروں کی ملازمتوں میں ان کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق متناسب حصہ مل جائے۔

۱۲۔ آئین میں مسلمان کی تہذیب و تمدن، زبان، تعلیم، مذہب اور اوقات اور شخصی قانون وغیرہ کو مکمل تحفظ حاصل ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے اداروں سے دی جانے والی امداد میں سے ان کے لیے متناسب حصے کی ضمانت دی جائے۔

۱۳۔ ملک میں کوئی صوبائی یا مرکزی وزارت ایسی قائم نہ کی جائے جس میں کم از کم ایک تہائی مسلمان شریک نہ ہوں۔

۱۴۔ مرکزی دستور سازی میں کوئی تبدیلی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک وفاق کے رکن صوبوں کی منظوری حاصل نہ ہو۔

چودھویں نقطے کے ساتھ ایک متبادل تجویز یہ بھی رکھی گئی کہ موجودہ علامات میں ملک کی آئین ساز اسمبلی اور انتخابی اداروں کے لیے جداگانہ انتخاب کا طریقہ لازمی قرار دیا جائے کیونکہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ لازمی قرار دیا جائے کیونکہ جداگانہ انتخاب کا یہ حق مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء سے حاصل ہے اور حکومت نے بارہا وعدہ کیا ہے کہ ان کا یہ حق بحال رکھا جائے گا۔ اور اس وقت تک اسے تبدیل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ خود

مسلمان اس کو ترک کرنے کے ارادے کا صریحاً اظہار نہ کریں۔

چنانچہ مسلمان اس حق کو قطعی طور پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں بالخصوص اس وقت تک جب سندھ علیحدہ صوبے کی حیثیت سے وجود میں نہیں آجاتا اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا عملی نفاذ نہیں ہو جاتا۔ علاوہ ازیں اس حق سے مسلمان اس وقت تک دستبردار ہونے کے متعلق سوچ نہیں سکتے جب تک کہ تمام صوبوں میں ان کی آبادی کے مطابق متناسب نشستیں محفوظ نہیں کرلی جاتیں جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ اس کے باوجود صرف تناسب کے لحاظ سے اپنی نشستوں کا انتخاب لڑیں گے اس طرح وہ صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں گے ان کو متناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دینے کے سوال پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

مسٹر محمد علی جناح نے یہ نکات پیش کر کے ہندوستان کے ہندوؤں کو بتا دیا کہ آئینی امور کی مہارت مسلمانوں کو بھی حاصل ہے۔ ان نکات کا جب سرکاری حلقوں میں جائزہ لیا گیا۔ تو انگریز نے تسلیم کیا کہ جہاں تک مطالبات کا تعلق ہے وہ ہندو مطالبات کے مقابلے میں زیادہ قرین قیاس ہیں کیونکہ ان میں زیادہ تر وہ چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا وہ پہلے بھی اعادہ کر چکے ہیں اور جن کی ضمانت کا تصور خود حکومت برطانیہ نے دیا ہے۔

باب ۱۷

علامہ اقبالؒ کا خطبہ الہ آباد

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی تمام جدوجہد کی بنیاد دو قومی نظریہ تھی سرسید احمد خاں کے مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے "قوم" کا لفظ استعمال کیا۔ مسلمان سیاسی رہنماؤں کا خیال تھا کہ مسلمان ہند اپنی ذات میں ایک قوم ہیں ان کی اپنی تہذیب و تمدن انداز فکر اصول حیات اخلاقی اور معاشرتی اصول ہیں۔ انھیں ہندوؤں کے ساتھ شامل نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے کچھ حقوق اور مفادات ہیں۔ جن کے تحفظ کے بغیر مسلمانوں کا مستقبل بطور ایک قوم تاریک رہے گا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق اور تضاد زیادہ واضح ہونے لگا۔ مسلمانوں کی خواہش تھی کہ ان کی طرز بود و باش، تہذیب و تمدن اور ثقافت کو ہندو ازم کی یلغار سے بچانے کے لیے مخصوص تحفظات دیے جائیں۔ ۱۹۰۵ء میں مسلمانوں کا جداگانہ انتخابات اور ملازموں میں خاطر خواہ نمائندگی کے مطالبہ کا محرک یہی جذبہ تھا۔ ہندو اور کانگرس مسلمانوں کے انداز فکر اور مطالبات سے رضامند نہیں تھے۔ اس لیے وہ انھیں مطلوبہ تحفظات دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اگرچہ ۱۹۱۶ء میں مسلمانوں کے بہت سے مطالبات مان لیے لیکن ۱۹۲۸ء میں کانگرس نے ماضی میں مسلمانوں کو دی ہوئی رعائتوں کو واپس لینے کا فیصلہ کیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کے مسئلے کو حل کرنے کی کوششوں کے مجموعہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سیاسی رہنما کوئی تسلی بخش حل تجویز نہ کرسکے جو حل مسلم لیگ پیش کرتی کانگرس کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا تھا۔ کانگرس نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں کی۔ نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس مسئلہ کا جائزہ لیا اور اس کے حل کے لیے تجاویز پیش کیں۔ جو اتنی سخت تھیں کہ اگر مسلمان انھیں قبول کرلیتے تو ہندو اکثریت مستقل طور پر ان کے حقوق غصب کرلیتی اور ان کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی۔ اس رپورٹ میں نہ صرف جداگانہ انتخابات کے اصول کو رد کردیا بلکہ معاہدہ لکھنؤ کی تمام مراعات کو رد کردیا۔ اس رپورٹ کا مسلمانوں کی سیاست پر گہرا اثر پڑا انھیں احساس ہوگیا کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے خود کوششیں کرنا پڑیں گی۔ دہلی میں

قائدین کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں مسلمانوں نے اتحاد کی فضا کو فروغ دینے کے لیے چند تجاویز پیش کیں۔ لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ نہرو رپورٹ اور قائداعظم کے چودہ نکات ہندو مسلم تعلقات کے حل کی دو متضاد تجاویز تھیں۔ یہ ہندو اور مسلمان ذہن کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ ہندو اور کانگرس مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جبکہ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کی ضروریات اور مطالبات ہندوؤں سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی وجود سے انکار کرنا حقیقت کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔

علامہ اقبال بھی ہندو مسلم سیاست کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء تک آپ کو ہندوستان میں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ آپ فلاسفر اور شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ نے اسلام اور ان کے ضابطہ حیات کا خصوصی مطالعہ کیا۔ آپ کو کامل یقین تھا کہ اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے مسلمانوں کا یہ ضابطۂ حیات۔ تہذیب و تمدن اور ثقافت انہیں دوسری قوموں سے ممتاز کرتا ہے علامہ اقبال کو مغربی تہذیب اور مغربی جمہوریت کے کھوکھلا ہونے کا کامل یقین تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی نظام حیات اور اسلامی جمہوریت مغربی جمہوریت سے بدرجہا بہتر ہے۔ ان سب خیالات کی جھلک آپ کے اشعار میں نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے آپ کو مسلمانوں کے زوال اور ذلت کا قوی احساس تھا۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے اسلام کی حقیقی روح کو نظرانداز کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی بقاء اور ترقی اسی میں مضمر ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر چلیں اور اسلاف کے کارناموں کو فراموش کرنے کی بجائے سبق حاصل کریں جب تک مسلمان "خودی" کا جذبہ پیدا کر کے "مردِ مومن" کی خصوصیات اپنے اندر پیدا نہیں کرتے ان کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

علامہ اقبال کو مکمل یقین تھا کہ مسلمان اپنی ذات میں ایک قوم ہیں۔ ایک ایسی قوم جو کہ ایک مکمل ضابطہ حیات رکھتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ شامل کرنا یا یہ سمجھنا کہ ان میں صرف مذہبی اصولوں کا فرق ہے۔ اور باقی کچھ نہیں سراسر زیادتی ہے۔ مسلمانوں کا ماضی ہندوؤں سے مختلف تھا ان کا حال ہندوؤں سے مختلف ہے اور ان کا مستقبل بھی ہندوؤں سے مختلف ہو گا۔ مسلمان ایک ایسے ضابطہ حیات کے پیروکار ہیں۔ جو ہندوازم کے اصولوں سے مختلف ہی نہیں۔ بلکہ منافی بھی ہے۔ یہاں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ آیا وہ اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھ سکیں گے اس کا جواب ہاں میں ہے تو ان کی پوزیشن ہندوؤں کے مقابلے میں کیا ہو گی؟ اور ان کے حقوق کی

گے۔ اس زمانے میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے میں معروف تھی۔ قائد اعظم کے چودہ نکات بھی اس کا ایک حل تھے۔ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا اور ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے درمیان کشمکش ہوتی رہی۔ اس وقت جبکہ ہندوستان کے سیاسی رہنما لندن میں گول میز کانفرنس میں مصروف تھے۔ علامہ اقبال نے الہ آباد میں ہندو مسلم مسئلہ کا حل اور مسلمانوں کے مستقبل کا خاکہ پیش کیا۔ اس وقت اسے شاعر کا خواب کہا گیا لیکن ۱۷ سال بعد اس خواب کی تعبیر سامنے آ گئی۔

۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ آپ کے خطبہ صدارت کی مسلمانان ہند کی سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت ہے۔ آپ نے اس خطبہ میں مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے نظریہ پر روشنی ڈالی۔ اسلام کے سیاسی تصورات کا مغرب اور عیسائیت کے فلسفہ سے موازنہ کر کے یہ بات یاد کرائی کہ اسلام صرف چند عقائد کا نام نہیں ہے بلکہ اس نے ایک سیاسی سماج بھی دیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانان ہند دوسری قوموں سے مختلف ہیں اور وہ مستقل اور مثبت طریق پر ایک علیحدہ قوم ہیں ذیل میں خطبہ کا اردو متن درج کیا جاتا ہے۔

خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ

(حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

حضرت علامہ کا اصلی خطبہ انگریزی میں ہے۔ جن حضرات نے آپ کی انگریزی تحریر دیکھیں ہے وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس کا اردو میں ترجمہ کس قدر مشکل ہوتا ہے بالخصوص اس وقت جبکہ لفظی التزام بھی پیش نظر ہو۔ اس ترجمہ میں الفاظ سے زیادہ مفہوم کی ادائیگی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اور وہ بھی اپنی استعداد کے مطابق اس لیے ہو سکتا ہے کہ کہیں ہم مفہوم کے سمجھنے اور اس کے صحیح طور پر ادا کرنے میں غلطی کر گئے ہوں۔ جس کے لیے ہم بدل معذرت خواہ ہیں۔

حضرات میں آپ کا بے انتہا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں جو مسلمانان ہند کے سیاسی خیالات و اعمال کی تاریخ میں نہایت نازک ہے۔ مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان اجتماع میں بعض ایسے حضرات موجود ہیں جن کا موجودہ سیاسی تجربہ میری نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور امور مہمہ کے متعلق جن کی معلومات میرے دل میں بے انتہا وقعت ہے اس لیے اگر میں ان سیاسی امور میں جن کے تصفیہ کے لیے یہ حضرات آج اس جگہ جمع ہوئے ہیں۔ ان کی رہنمائی

کا دعویٰ کردوں تو یہ بالکل بے جا نہ ہوگا۔ میں کسی جماعت کا لیڈر نہیں اور کسی لیڈر کا پیرو نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین اسلام اور اس کی شریعت اس کی سیاست تمدن۔ اس کی ثقافت (کلچر) اس کی تاریخ اور اس کے ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے میرا خیال ہے کہ اس روح اسلامی کے ساتھ جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ میری مستقل وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کر دی ہے۔ جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہو جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقت سے حاصل ہے چونکہ اس امر کے فرض کر لینے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مسلمانان ہند اس روح اسلامی سے عہدو فا باندھ چکے ہیں۔ اس لیے میرا منشا یہ نہیں کہ میں آپ کے فیصلوں میں آپ کی رہنمائی کی جرأت کروں۔ بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس فراست کی روشنی میں جو مجھے حاصل ہے کہ آپ کو اس اصل اساس کا صحیح اور واضح احساس کرادوں جو ان فیصلوں کی عمومی تشکیل کر سکے۔

اسلام اور قومیت (NATIONALISAM)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جو ایک اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کی سیاست دان کا مجموعہ ہے۔ اس سے میری مراد ایک ایسے معاشرتی نظام سے ہے جو ایک خاص ضابطۂ قوانین کے ماتحت ہوا اور جس میں ایک مخصوص اخلاقی تخیل کی روح کار فرما ہو) مسلمانان ہند کی تاریخ حیات میں سب سے بڑا جزو ترکیبی رہا ہے اس نے وہ اساسی جذبات اور باہمی کشش کے سامان مہیا کیے ہیں جو منتشر افراد اور مختلف گروہوں کو بتدریج متحد کر کے بالآخر انھیں ایک متمیز اور معین قوم کی صورت میں منظم کر دیتے ہیں جو اپنا مخصوص اخلاقی شعور رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں اسلام کا وہ شعبہ جو قوموں کی تعمیر سے متعلق ہے۔ اپنی پوری آب و تاب سے کار فرما ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کے نظام ترکیبی نے سوسائٹی کی جو صورت اختیار کی ہے وہ صرف اس امر کی رہین منت ہے۔ کہ اسلام ایک ایسے کلچر کی حیثیت سے عمل پیرا ہوا ہے۔ جس کا محرک ایک مخصوص اخلاقی تخیل ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی نے اپنی نمایاں ہم آہنگی اور قلبی یک جہتی کے ساتھ جو موجودہ شکل اختیار کی ہے وہ ان آئین و قوانین کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی ہے جن کا اسلامی کلچر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن وہ خیالات جو مفکرین یورپ نے دنیائے سیاست میں پھیلا دیے ہیں وہ ہندی و غیر ہندی مسلمانوں کی موجودہ نسل کے مطمع نگاہ کو نہایت تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان ان خیالات سے متاثر ہو کر اس امر کے لیے مضطرب ہو رہے ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں ان خیالات کو عمل میں لے آئیں۔ وہ ان حقائق پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے۔ جو یورپ میں ان خیالات کے ارتقاء کا باعث ہوئے

یورپ میں مسیحیت صرف تارک الدنیا اشخاص کا ایک نظام سمجھا جاتا تھا جسے رفتہ رفتہ ایک وسیع نظام کلیسائی کی صورت اختیار کر لی۔ لوتھر نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ اس کلیسائی نظام کے خلاف تھی نہ کہ دنیائے معاملات نئے کسی نظام وودیعت کے خلاف اس لیے عیسائیت کو تو کسی ایسے سیاسی نظام سے تعلق ہی نہیں بلاشبہ لوتھر اس نظام کے خلاف بغاوت کرنے میں بالکل حق بجانب تھا مگر میرے نزدیک اس نے اس امر کا احساس نہ کیا تھا کہ یورپ کے مخصوص حالات میں اس بغاوت کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ حضرت مسیح کا عالمگیر نظام اخلاق کاملاً تہ و بالا ہو جائے گا اور بے شمار قومی اور محدود نظام ہائے اخلاق اس کی جگہ لے لیں گے روسو اور لوتھر جیسے آدمیوں کی اس قسم کی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت لوٹ کر ایسی کثرت میں تبدیل ہو گئی جس کے مختلف اجزاء میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی۔ اور انسانیت کا ایک ہمہ گیر تصور قومیت کے تنگ دائرہ میں گھر کے رہ گیا۔ قومیت کا یہ تصور کسی مخصوص بنیاد مثلاً عقیدہ وطنیت پر ہی قائم ہو سکتا تھا اور اس کا اظہار ایسے مختلف نظام ہائے سیاست کے ذریعہ سے ہی ممکن تھا جو قومی خطوط پر نشوو ارتقاء حاصل کر سکتے ہوں وہ خطوط جو صرف اس اصول کو ہی تسلیم کریں کہ سیاسی اتحاد کی بنیاد جغرافیائی حدود پر ہی قائم ہو سکتی ہے اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ٹھہرے کہ اس کا تعلق کاملاً اگلے جہاں سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا حضرت مسیح کے عالمگیر اصولِ اخلاق کی جگہ قومیت کے نظریۂ اخلاق و سیاست نے لے لی۔ اس تخریب و تعمیر اور ردّ و بدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے اور انسان کی دنیاوی زندگی سے اس کا تعلق کوئی نہیں۔ لیکن اسلام، وحدت اسلامی کو روح اور مادہ کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا باہمی تعلق ہے اس کے نزدیک انسان کسی ایسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں ہے۔ جسے کسی ایسی مقدس دنیا کے حصول کی خاطر تیاگ دینا پڑے جو اس دنیا سے الگ کہیں اور واقع ہو اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس صورت کا نام ہے۔ جو زمان و مکان کے لباس مجاز میں جلوہ فرما ہے۔ یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح مادہ کی ثنویت (Duality) کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ آج یورپ کے بہترین مفکر تو اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں لیکن اس کے سیاسی مدبر غیر محسوس طور پر دنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ انداد صند اس غلطی کو ایک ایسے عقیدہ کی حیثیت سے قبول کرے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ روح اور مادہ کی یہی وہ غلط تفریق ہے۔ جو یورپ کے مذہبی اور سیاسی افکار پر اس نہج سے اثر انداز ہوئی ہے۔ گو اس نے یورپ کے نظام حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب بالکل خارج کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے یورپ ایسی بے جوڑ سلطنتوں کا مجموعہ بن کے رہ گیا ہے۔ جن کے سر میں انسانیت کا سودا نہیں۔ بلکہ اس پر قومیت

کا بھوت سوار ہے یہیے یورپ کی مملکتیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو پامال کرنے کے بعد اب ایک متحدہ یورپ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہیں۔ یعنی پھر اس وحدت کا احساس مجھے مسیحی کلیسا کے نظام نے ابتداءً میں ان کو دیا تھا۔ لیکن انھوں نے بجائے اس کے کہ حضرت مسیح کے عالمگیر اخوت انسانی کے تصوّر کی روشنی میں اس کی تشکیل کرتے لوتھر کی تعلیم سے متاثر ہو کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا تصوّر ہی ممکن نہیں کیونکہ اسلام میں یورپ کے از منۂ متوسط جیسا کوئی کلیسائی نظام ہی موجود نہیں جو اپنے کسی تباہ کرنے والے کو بلا رہا ہو۔ دنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالمگیر نظام سیاست موجود ہے۔ بنیادی اصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے۔ کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے۔ ان بنیادوں پر جو عمارت قائم ہے وہ البتہ ضروریات زمانہ کے اقتضاء کے مطابق ایک نئی روح کی محتاج ہے۔ اور اس احتیاج کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے فقہاء و ضعین قوانین، دنیائے جدید کے واجبات سے ستک نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دنیائے اسلام میں قومیت کے اس تصوّر کا انجام کیا ہوگا یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ آیا اسلام اس کو اپنے اندر جذب کر کے اس کی ترکیب کو بدل دے گا۔ جیسا کہ یہ اس سے قبل بہت سے مختلف النوع خیالات کو اپنے اندر جذب کر کے ان کی نوعیت کو بدل چکا ہے یا خود اسلام اس نظریہ کی قوت سے متاثر ہو کر اپنے نظام کو یکسر تبدیل کر دے گا۔ حال ہی میں مجھے لنڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے پروفیسر وین سنک (WEN SINOK) نے لکھا تھا کہ۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس وقت اسی نازک دور میں داخل ہو رہا ہے جو مسیحیت پر ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے طاری ہے۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کونسا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے قدیم دقیانوسی غلط تصوّرات کی عمارت تو منہدم ہو جائے لیکن مذہب کی بنیادیں محفوظ رہیں۔ میرے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ میں بتا سکوں کہ اس بحران میں مسیحیت کا کیا انجام ہوگا چہ جائیکہ میں یہ کہہ سکوں کہ اسلام پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

اور موجودہ دور میں تو یہ ہو رہا ہے کہ قومیت کا تصوّر مسلمانوں کے مطمح نگاہ میں نسل پرستی کا جذبہ ابھار رہا ہے۔ جو ان مسائل حسنہ کو غارت کر رہا ہے جنھیں شرف انسانیت کی خاطر اسلام نے سرانجام دیا تھا اور نسل پرستی کے اس شعور کا مطلب یہ ہے کہ نظام حیات کے متعلق ایسے نظریے اور معیار قائم ہو جائیں جو نہ صرف اسلامی نظریات زندگی سے مختلف ہوں بلکہ ان سے متصادم ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے اس بظاہر علمی بحث (ALCEDEMIS DISCUSSION) سے معذور سمجھیں گے۔ آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے۔ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدے میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے۔ جو نگہہ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد ہو کر

لیے اس کی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور جس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے۔ جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں، ہماری تاریخ میں اسلام پر کبھی ابتلا و آزمائش کا ایسا زمانہ نہیں آیا جیسا آجکل اسے درپیش ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہر ایک قوم اس بات میں خود مختار ہے کہ اپنے اپنے معاشرتی نظام کے اصول اساسی میں ترمیم، تادیل یا تنسیخ کرے لیکن ایک تازہ تجربہ کرنے سے پہلے اس کے لیے قطعاً ضروری ہے کہ اپنے اس تجربہ کے نتائج و عواقب پر واضح انداز سے غور و خوض کرے۔ اس اہم مسئلہ کو جس پہلو سے میں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ میں ان حضرات سے جو مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں آمادہ پیکار ہوں۔ یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے اور میرا یقین ہے کہ اس کے افراد اسلام کی روح اور اس کے نصب العین سے قلبی تعلق کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ موجودہ صورتِ حالات کے متعلق جس چیز کو میں نیک نیتی کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اس کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دوں۔ صرف یہی وہ طریق عمل ہے۔ جس کی رو سے میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اپنی بصیرت کی روشنی میں آپ حضرات کے سیاسی مسلک کو واضح کر سکوں۔

قومیت ہند کی وحدانیت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کیا ہیں؟ کیا مذہب سچ مچ ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ اس امر کو پسند فرمائیں گے کہ بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نظریہ کے اسلام کا بھی دنیائے اسلام میں وہی حشر ہو جو اس سے پہلے عیسائیت کا یورپ میں ہو چکا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو ایک اخلاقی نظریہ کی حیثیت سے تو باقی رکھیں لیکن ایک نظام ریاست کی حیثیت سے اس کو رد کر کے اس کی جگہ وہ قومی (NATIONAL) نظام ہائے سیاست اختیار کر لیں جن میں مذہب کو کسی قسم کی دخل دہی کی اجازت نہ ہو؟ یہ سوال ہندوستان میں ایک خاص اہمیت پیدا کر لیتا ہے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ ایک یورپین کی زبان سے تعجب انگیز نہیں کہ مذہب ایک نجی اور انفرادی چیز ہے یورپ میں عیسائیت کا تصور ایک کیش رہبانیت

کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مادی دنیا کو ترک کر کے تمام توجہات صرف روحانی دنیا پر مرکوز کر دی جائیں۔ اس کیش کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا جو مذکورہ بالا دعویٰ میں بیان کیا گیا ہو یعنی یہ مذہب نجی معاملہ ہے) لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات وکیفیات روحانی (RELIGIOUS EXPEVIENCES) کی جو نوعیت قرآن مجید سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے یہ کیفیات و واردوات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ محض شخص متعلقہ کے قلب میں پیدا ہو کر صرف اسی پر اثر انداز ہوں اور اس کا معاشرتی ماحول ان سے کچھ بھی متاثر نہ ہو۔ ایسی کیفیات ہیں کہ ان کا مہبط تو قلب انسانی ہو لیکن ان سے ایک پورا معاشرتی نظام وجود میں آجائے جو آئینی تصورات (قوانین وضوابط) کا ایک جہان خاموشی اپنے آغوش میں لیے ہوتے ہیں اور جن کی تہذیبی اہمیت محض اس لیے کم نہیں ہوسکتی کہ ان کا ماخذ ہی الہٰی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مذہب اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی نظام میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو رد کر دیا جائے تو دوسرا خود بخود رد ہو جاتا ہے بنا بریں قومیت کے خطوط پر کسی ایسے نظام تمدن کی تعمیر جو وحدت اسلامی کے اصول سے متصادم ہوتا ہو۔ مسلمان کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی یہ تو وہ مسئلہ ہے جو اس وقت براہ راست مسلمانان ہند کو درپیش ہے رینان لکھتا ہے کہ "انسان نہ تو اس کی نسل اور مذہب کا غلام بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی دریاؤں پہاڑوں کی حدود بندیاں اسے مقید کر سکتی ہیں بلکہ صحیح الدماغ اور گرم جوش دل رکھنے والے انسانوں کی عظیم الشان اجتماعیت ایک اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے جسے "قوم" کہتے ہیں۔ اس قسم کی جماعتی ترکیب ناممکن نہیں۔ اگرچہ اس کے لیے ایک طول طویل اور زہرہ گداز مرحلہ طے کرنا پڑے گا۔ جس میں یوں کہیے کہ انسان کو نئے قالب میں ڈھالنا اور انھیں تازہ جذبات سے مسلح کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان میں کبیر کی تعلیم اور شہنشاہ اکبر کا دین الہٰی کی ذہنیت پر غالب آجاتا تو اس قسم کی قومیت اس ملک میں بھی قائم ہوجاتی لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور اس کے مختلف مذہبی گروہوں میں یہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اپنی اپنی انفرادی جزئیات کو ایک "عظیم الشان" کل میں فنا کر دیں (اور یوں قطرات سمندر میں حل کر سمندر بن جائیں) ہر گروہ اپنی جماعتی حیثیت قائم رکھنے کے لیے بعند ہے اس قسم کے اخلاقی شعور کا پیدا ہونا جو رینان کے نظریۂ قومیت کا اصل اصول ہے اتنی بڑی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے کہ اقوام ہند اسے ادا کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں اتحاد قومی یہاں کی مختلف اقوام کے جداگانہ وجود کے انکار میں نہیں بلکہ ان سب کے تعاون اور ہم آہنگی میں تلاش کرنا چاہیے صحیح تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ حقائق خواہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں۔ ان سے چشم پوشی نہ کی جائے حصول مقصد کا عملی طریق یہ نہیں کہ جس صورت حالات کا وجود ہی نہ ہو اسے خواہ مخواہ موجود فرض کر لیا جائے۔ بلکہ یہ حقائق جس انداز میں ہیں ان کو تسلیم کرتے ہوئے

ان سے حتی الوسع بہترین استفادہ کیا جائے ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر حقیقتاً اسی بات پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں اتحاد قومی کو ان ہی راستوں سے تلاش کیا جائے ہندوستان بجائے خویش ایک چھوٹا سا ایشیا ہے۔ اس کے باشندوں کے ایک حصہ کا کلچر اقوام مشرق کے کلچر سے ہم آہنگ ہے اور دوسرے حصہ کا کلچر وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے کلچر کے ساتھ اگر ہندوستان میں باہمی اشتراکِ عمل کا کوئی موثر اصول دریافت کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر کارگہ تاریخ میں اپنے محل وقوع کی وجہ سے مدت دراز تک مصیبت وابتلاء کی آماجگاہ رہی ہے۔ امن وامان اور مصالحت باہمی کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں گی اور اس کے ساتھ ہی ایشیا بھر کی تمام سیاسی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یکجہتی کے لیے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں! غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کا شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریق مقابل پر تغلب وتسلط حاصل کر لیا جائے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آ چکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں انا الموجود غیری کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چوغے میں چھپایا جاتا ہے۔ بلند آہنگ و عادی کو دیکھو تو حب الوطنی کی وسعت قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات اور قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشوونما کر سکے بہرحال ہماری ناکامی کی وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یکجہتی کے میدان کا پتہ دیتی ہے۔ اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگ بنیاد تسلیم کر لیا جائے۔ کہ مسلمانوں کو اپنے اس وطن عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر اپنی نشوونما کر سکتے ہیں۔ تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہو گا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشوونما وارتقاء کا حق حاصل ہونا چاہیے کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے۔ اور اس کے اقسام میں بین فرق پایا جاتا ہے۔ جو قوم دوسروں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات

کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر قوانین و ضوابط، مذہبی و معاشرتی ادارات کا بے حد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں بایں ہم مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی افتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب اپنے لٹریچر، اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنا دیا ہے۔ اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔ ملت پرستی کے اس بلند ترین پہلو کی قدر و قیمت کو نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا کہ فرقہ وار صوبوں کا وجود میں لانا قومیت پرستی کے وسیع نظریہ کے منافی ہوگا ایسا ہی ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا میں الگ الگ فرقوں کی ہستی بین الاقوامیت کے وسیع ترین تصور کے منافی ہیں۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کا سرگرم سے سرگرم حامی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بین الاقوامی نظام حکومت اس وقت تک ناممکن بلکہ محال ہے جب تک ہر قوم مکمل طور پر خود مختار نہ ہو اس طرح جب تک مختلف فرقے اس باب میں بالکل آزاد نہ ہوں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن، کلچر کی بنیادوں پر اپنے نظام زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ ایک ہم آہنگ قوم کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اور یہ کسے یاد نہیں کہ جب فرقہ پرستی کسی بہتر جذبہ پر مبنی ہو تو وہی کلچر بن جاتی ہے"

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ کل ہند کی تشکیل کے لیے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے برعکس یورپین ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں ہندوستان ایک ایسا بر اعظم ہے۔ جس میں مختلف النسل۔ مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں ان کے نظریہ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے۔ جن کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کو معرض وجود میں لایا جائے۔

دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو ریزولیشن پاس کیا ہے۔ میرے نزدیک تو اس کا محرک یہی مقدس

جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبہ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انھیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشوونما کر سکیں۔ اور پھر ان صحیح عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ کل کی تخلیق ہو۔ اور مجھے وثوق ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پرزور تائید کرے گا۔ جو مذکورہ قرارداد میں بیان کیے گئے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے (ہندوستان کو) حکومت اختیاری زیر سایہ برطانیہ ہے۔ یا اس کے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ لیکن اس کو اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے ایک ایسی ریاست معرض وجود میں آجائے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے کمیٹی کی یہ رائے صحیح ہے۔ لیکن بلحاظ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں میں سے بھی چھوٹی ہوگی اگر قسمت انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہے اس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائے گی۔ اور اس میں مسلمانوں کی آبادی کی آبادی کا تناسب بڑھ جائے گا جب اس طرح غیر مسلم آبادی کا تناسب بہت کم رہ جائے گا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست میں اس قابل ہو جائے گی کہ وہ اپنے علاقہ کے اندر رہنے والی اقلیتوں کو مؤثر تحفظات دے سکے۔ اس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہیے اور نہ ہی انگریز کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسی ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے مسلمانان ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے۔ باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالذکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیاء کی گتھیاں سلجھا دے گا اس سے مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اور ان کا جذبۂ حب وطن اور بھی زیادہ ہو جائے گا جب اس طرح شمال مغرب کے مسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے اور پھلنے اور پھولنے کے مواقع حاصل ہوں گے تو وہ ہر بیرونی حملے کے مقابلہ میں خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو یا شمشیر و سنان کا ہجوم ہندوستان کی بہترین مدافعت کر سکیں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصدی ہے۔ لیکن ہندوستانی فوج کا چون فیصدی حصہ انھیں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ انیس ہزار گورکھے علیحدہ کر دیے جائیں

جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کیے جاتے ہیں تو پنجاب کے فوجی سپاہیوں کی تعداد ساری ہندوستانی فوج میں باسٹھ فیصد ہو جاتی ہے۔ اس میں ابھی وہ چند ہزار سپاہی شامل نہیں ہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اس سے آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستی سے محفوظ رکھنے کے لیے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے۔ جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشوونما ارتقاء کا موقع ملے اس لیے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظام حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لیے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصود وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ بھی لاحق نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام سے مقصد یہ ہوگا کہ ان میں ایک قسم کے مذہبی نظام حکومت کی ترویج ہوگی میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں اسلام کے متعلق جب "مذہب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام" خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی" کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظام حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی کہ وہ عمل خیر کو اپنے اندر جذب کرے اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا۔ جبکہ دنیا میں کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے۔ جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابہ گل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے، بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے۔ جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو اس مشینری کا ایک فعال پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لیے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسلامی نظام حکومت کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے ٹائمز آف انڈیا" کا وہ مقالہ افتتاحیہ پڑھنا چاہیے جو جریدہ مذکور نے آج سے کچھ عرصہ پیشتر انڈین بینکنگ انکوائری کمیٹی سے متعلق لکھا تھا۔ ٹائمز لکھتا ہے۔

"قدیم ہندوستان میں حکومت کی طرف سے شرح سود متعین کرنے کے لیے قوانین وضع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس شرح سود پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی، باوجودیکہ اسلام میں رقوم قرضہ پر سود لینا صاف طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے"۔

لہٰذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور مسلمانان ہند

دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے۔ اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا اس لیے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا یا تو ہندوستان کا فائدہ ہو گا اور اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں۔ ان سے مخلصی حاصل کرے۔ اور اپنے شرعی خواتین اپنی تعلیم اور اپنے کلچر کی تنظیم کرکے انہیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکے۔

فیڈرل ریاستیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ چونکہ ہندوستان میں آب و ہوا۔ نسل۔ زبان معتقدات اور معاشرتی نظام میں گوناگوں اختلافات ہیں۔ اس لیے یہاں کسی محکم دستوری نظام کے لیے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں زبان۔ نسل۔ تاریخ۔ مذہب کی وحدت اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت کی بنیادوں پر خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں۔ سائمن رپورٹ نے فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین انتخاب عام سے مرتب نہ کیا جائے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے مختلف نمائندوں کی مجلس ہو۔ نیز سائمن رپورٹ میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ ملک کو مختلف علاقوں میں نئے سرے سے اسی اصول پر تقسیم کیا جائے۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے سائمن کمیشن کی ان سفارشات کی میں پوری پوری تائید کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میں اس اضافہ کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ صوبوں کی جدید تقسیم دو شرطوں کے ماتحت ہونا چاہیے کہ اس سے آئے دن کے فرقہ وارانہ بکھیڑوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ اگر صحیح طریق پر صوبوں کی جدید تقسیم عمل میں آگئی تو ہندوستان کے آئینی مباحث میں سے جداگانہ اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا مسئلہ خود بخود معدوم ہو جائے گا کیونکہ صوبجات کی موجودہ ترکیب ہی موجودہ مناقشات کی سب سے بڑی وجہ ہے ہندو کا خیال ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اصول حقیقی قومیت پرستی کے منافی ہے قومیت کا جو تصور اسے قائم کر رکھا ہے اس سے مفہوم یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اور فرقے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں کہ کسی جماعت کا جداگانہ انفرادی تشخص باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حالات موجود نہیں اور نہ اس کا ہونا مناسب ہے۔ ہندوستان مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسانوں کا ملک ہے اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام اقتصادی پستی۔ تمام ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص ان کا لاتعداد قرضہ۔ صوبوں میں ان کی ایسی ناکافی اکثریت جو کسی وقت اقلیت میں بدل جا سکتی ہے اگر ان امور کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو آپ پر بالکل واضح ہو جائے گا کہ ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لیے اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ ایسے ملک میں اور ایسے حالات کے ماتحت فیڈریشن میں اگر اقوام کی نمائندگی کی بجائے صوبوں کی نمائندگی ہو تو اس سے ہر ایک طبقہ کے مفاد کی صحیح صحیح نمائندگی نہیں ہو سکے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ زمام

حکومت چند افراد کے ہاتھ میں (OBLIGARCHY) رہے گی ہاں اگر موجودہ صوبجاتی تقسیم کی بجائے ہندوستان کی جدید تقسیم مختلف قوموں کی لسانی نسل تمدنی کلچرل" اور مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر کردی جائے تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ فیڈریشن میں بجائے مختلف اقوام کی نمائندگی کے مختلف علاقوں کی نمائندگی ہو۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل حکومت کے اختیارات کا تعلق ہے۔ جو نظام حکومت "ہندوستانی پنڈتوں" (یعنی نہرو رپورٹ) اور انگلستانی پنڈتوں" (یعنی سائمن رپورٹ) نے تجویز کیا ہے۔ اس کی پشت پر جو جذبات کارفرما ہیں۔ ان میں ایک ایسا باریک فرق ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا" ہندوستانی پنڈت،، مرکز کو بحالت موجودہ قائم رکھنا چاہیے یعنی وہ فیڈریشن کی بجائے یونیٹری (UNAITRY) کی شکل کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام صوبے مرکز کے ماتحت رہتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور مرکزی اسمبلی کے ہاتھ میں ہو۔ جسے وہ بصورت موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موجودہ نامزدگی (NOMINATION) کا سلسلہ ختم ہو جانے پر مرکزی اسمبلی میں ان کی اکثریت اور بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہو جائے گی برعکس اس کے چونکہ" انگلستانی پنڈت،، یہ محسوس کرتے ہیں کہ مرکز کی جمہوریت ان کے مفاد کے خلاف جائے گی اور اگر ذمہ دار حکومت کے حصول کے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو جو اختیارات آج ان کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ان سے چھن جائیں گے اس لیے وہ جمہوری نظام کو مرکز کے بجائے صوبوں کی طرف منتقل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ بلاشبہ وہ فیڈریشن کے اصول کی ترویج کر رہے ہیں اور چند تجاویز کی رو سے انھوں نے اس کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ لیکن جن مقاصد کے پیش نظر وہ اس اصول کی قدر و قیمت متعین کر رہے ہیں وہ ان مقاصد سے بالکل مختلف ہیں جن کے ماتحت ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ مسلمان فیڈریشن کا مطالبہ اس لیے کرتے کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان کا مشکل ترین عقدہ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن شاہی کمیشن (ROYAL COMMISSION) کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولاً کتنا ہی درست و محکم کیوں نہ ہو ان کی غرض و غایت یہ معلوم نہیں ہوتی کہ فیڈریشن ریاستوں کو مکمل طور پر خود مختار کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے برطانیہ کے لیے جو صورتِ حال پیدا ہوگی اس سے بچاؤ کی کوئی شکل نکل آئے۔ انھیں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی کوئی فکر ہی نہیں اس لیے وہ اسے جوں کا توں چھوڑ رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے۔ سائمن رپورٹ فیڈریشن کے اصول کی اصلی ماہیت کو ہی رد کر رہی ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین

اس چیز کو بھانپ کر مرکزی اسمبلی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہو گی وحدانی نظام حکومت UNITARY FORM OF GOVT کی تجویز پر تُل گئے ہیں کیونکہ اس نظام حکومت کی رو سے ہندوؤں کو سارے ہندوستان پر عام غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا سائمن رپورٹ برائے نام فیڈریشن کے چلمنی پردہ کی آڑ میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے کچھ تو اس وجہ سے کہ اہل برطانیہ قدرتی طور پر اس اقتدار سے دست کش نہیں ہونا چاہتے جو انھیں آج تک حاصل رہا ہے۔ اور کچھ اس لیے کہ اگر ہندوستان کی مختلف اقوام میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو تو اہل برطانیہ کو بہانہ مل جاتا ہے کہ موجودہ طاقت اپنے ہی ہاتھ رکھیں جہاں تک وحدانی نظام حکومت کا تعلق ہے وہ میرے نزدیک آزاد ہندوستان میں قابل التفات ہی نہیں باقی رہی فیڈریشن تو وہ اس قسم کی ہونی چاہیے کہ اس میں باقی ماندہ اختیارات (RESIDENCY POWER) کلیتہً خود مختار ریاستوں کے ہاتھ میں رہیں اور مرکزی فیڈرل حکومت صرف انھی اختیارات کے استعمال کی اہل ہو جو مختلف آزاد ریاستیں اپنی رضامندی سے اس کی تحویل میں دے دیں میں مسلمانان ہند کو کبھی ایسے نظام کے منظور کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول ناپید ہو' یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے، خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو یا ہندی الاصل۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

مرکزی حکومت کی وضع و ہیئت میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس اغلباً اس سے بہت پہلے ہو رہا تھا جب کہ برطانیہ نے اس کے نفاذ کے مؤثر ذرائع اختیار کرنے کا خیال کیا یہی وجہ ہے کہ اس امر کا اعلان کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی شرکت بھی نہایت ضروری ہے بہت دیر کے بعد کیا گیا والیان ریاست کی طرف سے گول میز کانفرنس میں دفعتہً آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت پر آمادگی کا اظہار، اور اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو مندوبین کا جو اب تک وحدانی نظام حکومت کے بالکل غیر متزلزل حامی چلے آتے تھے، خاموشی سے فیڈرل اسکیم کی ترتیب پر اظہار رضامندی باشندگان ہند کے لیے علی العموم اور اقلیتوں کے لیے علی الخصوص بڑا تعجب انگیز تھا۔ حتیٰ کہ مسٹر شاستری نے بھی جنھوں نے چند ہی روز قبل ہندوستان کے لیے فیڈرل اسکیم کی سفارش کی پاداش میں سر جان سائمن پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی تھی اپنی رائے بدل لی اور اس تبدیلی رائے کا کانفرنس کے پہلے اجلاس عام میں اعتراف کیا اور اس طرح وزیر اعظم انگلستان کے لیے اپنی افتتاحی تقریر میں ایک نہایت برجستہ فقرہ چست کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔

انگریزوں کی یہ خواہش کہ والیان ریاست آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہو جائیں اور ہندوؤں کا

یہ اقدام کہ انھوں نے فیڈرل حکومت کو بلا تامل منظور کر لیا خالی از علت نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست (جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے) کے فیڈریشن میں شامل ہونے سے دو نتیجے بالکل عیاں ہیں یعنی یہ چیز ایک طرف تو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے علی حالہٖ استحکام اور استقرار کا بڑا عمدہ ذریعہ بن جائے گی اور دوسری طرف آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ہندوؤں کو ایک زبردست اکثریت حاصل ہونے کا موجب ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی آخری وضع و ہیئت کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو برطانوی مدبرین نہایت شاطرانہ انداز سے والیان ریاست کے مہروں کی وساطت سے اپنی مطلب برآری کا ذریعہ بنا رہے ہیں ادھر والیان ریاست کو اس سکیم میں اپنی مطلق العنان حکومت کے برقرار رکھنے کے احتمالات نظر آ رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ایسی سکیم کو منظور کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اس طرح وہ اپنی جداگانہ ملی ہستی کی قبر اپنے ہاتھ سے کھود ڈالیں گے۔ ہندوستان میں اس وضع کی فیڈرل حکومت کی پالیسی حقیقتاً ہندو والیان ریاست کے ہاتھ میں ہوگی۔ کیونکہ مرکزی فیڈرل اسمبلی میں انھی کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی اور وہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق برطانوی شہنشاہیت سے ہوگا، تاج برطانیہ کی پوری پوری حمایت کریں گے اور جہاں تک اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے تسلط اور اقتدار کو برقرار رکھنے اور اسے اور زیادہ مستحکم کرنے میں ہر طرح کی مدد دیں گے۔ بہ الفاظ دیگر اس سکیم کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم اور ہندو انڈیا میں ایک ایسا سودا ہو جائے جس کی رو سے ہندو ہندوستان میں انگریز کے وجود کو دائمی بنا دیں اور اس کے صلہ میں ہندوستان میں ہندوؤں کو ایک ایسا نظام حکومت عطا کر دیں جس میں تمام دیگر اقوام ہندوؤں کی مستقل غلامی کے پھندے میں جکڑی رہیں لہٰذا اگر برطانوی ہند کے صوبوں کو حقیقی معنوں میں خود مختار ریاستوں میں متشکل نہ کیا گیا تو ہندوستان کی فیڈریشن میں والیان ریاست کی شمولیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھا جائے گا کہ انگریز اپنے خاص شاطرانہ انداز میں ایسی چال چلنا چاہتا ہے کہ ہاتھ سے کچھ نہ جائے اور ہر ایک کو خوش بھی کر دیا جائے یعنی مسلمان کو فیڈریشن کے لفظی کھلونے سے، ہندو کو مرکز میں اکثریت سے اور برطانوی ملوکیت کو خواہ وہ ٹوری (TORY) ہوں یا لیبرائٹ (LABOURITES) حقیقی اختیارات کی تفویض سے۔ ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلم ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں سے مرکزی ایوان (HOUSE) یا ایوانوں (HOUSES) میں مسلمانوں کے تینتیس ۳۳٪ فیصد مطالبہ کو کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیڈریشن کی جس سکیم پر گول میز کانفرنس پر بحث ہوئی ہے۔ مسلم مندوبین اس کے متعلقات سے پورے طور پر آگاہ ہیں مجوزہ آل فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ ابھی تک زیر بحث نہیں آیا۔ رپورٹر نے مخلصاً لکھا ہے "فیڈرل کمیشن کی سفارشات کے مسودہ (INTERIM REPORT) میں دو ایوانوں کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ دونوں میں برطانوی

ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں۔ ان کے تناسب کے معاملہ پر بعد میں فیڈرل سب کمیٹی ان عنوانات کے زیر نظر غور کرے گی جو ابھی اس کمیٹی کے لیے متعین نہیں کیے گئے۔

میری رائے میں تناسب کا معاملہ بے حد اہم ہے اور اس پر اسمبلی کی وضع و ہیت کے ساتھ ہی غور ہونا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں بہترین طریق کار یہ تھا کہ سردست صرف برطانوی ہند کے صوبوں کی فیڈریشن بنائی جاتی ہے۔ فیڈریشن کی جس سکیم کا آغاز جمہوریت (صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے) اور استبداد (ریاستوں کے نامزد نمائندے) کے غیر مقدس اتحاد سے ہو گا اس سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستان وحدانی نظام حکومت کے گورکھ دھندے میں الجھا رہے۔ یہ وحدتی نظام انگریزوں کے لیے برطانوی ہند کی سب سے بڑی قوم کے لیے (یعنی ہندوؤں کے لیے) اور والیان ریاست کے لیے بہت سے فوائد کا سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک انھیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اختیارات یعنی باقی ماندہ اختیارات (RESIDENT POWERS) فیڈریشن کے بجائے صوبوں کی تحویل میں ہوں اس کے ساتھ اکثریت حاصل نہ ہو جائے نیز فیڈرل اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد میں سے ایک تہائی نشستیں نہ مل جائیں۔ جہاں تک برطانوی ہند کے صوبوں کو مکمل اختیارات تفویض کرنے کا تعلق ہے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال، سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا مطالبہ نہایت مستحکم بنیادوں پر مبنی ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہو رہے ہیں اس لیے برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کی نیابت کا ہے اب ہمارا یہ مطالبہ پیش ہونا چاہیے کہ ہمیں آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں دی جائیں اور فیڈریشن میں شامل ہونے والی مسلم ریاستوں کی نمائندگی کو اس ایک تہائی سے علیحدہ رکھا جائے۔

مسئلہ دفاع

ایک اور مشکل مسئلہ جو ہندوستان میں فیڈریشن کو کامیابی سے چلانے کے راستہ میں مزاحم ہو رہا ہے ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام خامیوں کو ابھار کر سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ تاکہ فوج کے نظم و نسق کی باگ ڈور حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں رکھنے کے لیے وجہ جواز پیدا کر سکیں ارکان کمیشن لکھتے ہیں کہ۔

"ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے دفاع کو اس وقت یا مستقبل قریب میں ایسا مسئلہ نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا تعلق خالصۃً ہندوستان سے ہو۔ فوج

پر کامل اختیارات ملک معظم کی حکومت کے کارندوں کے ہوں گے اور وہی اس کا نظم و نسق کریں گے یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ صورت حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ ہند میں ذمہ دار حکومت کی طرف پیش قدمی کا دروازہ اس وقت تک بند سمجھا جائے جب تک ہندوستان برطانوی افسروں اور برطانوی فوجوں کی امداد کے بغیر اپنی مدافعت کا پورا اہل نہ بن جائے۔ بحالات موجودہ آئینی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ تو ضرور موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق اس امر پر اصرار کیا جائے کہ کسی آئندہ تغیر و تبدل میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فوج کا نظم و نسق منتخب مجلس وضع قوانین کی تحویل میں چلا جائے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ جو امیدیں بندھ رہی ہیں کہ مرکزی حکومت ارتقائی منازل طے کر کے اس نصب العین تک پہنچ جائے۔ جس کا ذکر ۲۰ راگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کیا گیا ہے وہ ایک غیر معین مدت تک کے لیے دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

اپنی اس دلیل کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لیے ارکان کمیشن نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہندوستان میں ایسے مذاہب موجود ہیں جو ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ایسی قومیں موجود ہیں جن کی قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جن میں باہمی چشمک ہر وقت موجود رہتی ہے اور ارکان کمیشن نے یہ کہہ کر مسئلہ کو بالکل لاینحل بنانے کی کوشش کی ہے کہ

"یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان عام محاورہ کے مطابق ایک واحد قوم (NATION) نہیں ہے کہیں اتنی ابھر کر سامنے نہیں آتی جتنی اس خیال کو پیش نظر رکھنے سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی عسکری اور غیر عسکری قوم میں اقوام میں کتنا فرق ہے۔

کمیشن نے مسئلہ کے ان پہلوؤں کو اس شدومد سے بیان کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انگریز ہندوستان کو محض بیرونی خطرات ہی سے محفوظ نہیں کر رہے بلکہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی غیر جانبدار محافظ ہیں۔

فیڈریشن کا جو نظام میرے ذہن میں ہے اس کی رو سے ہندوستان میں فیڈریشن کے نافذ ہونے کے بعد صرف بیرونی حفاظت ہی کا سوال باقی رہ جائے گا۔ تمام صوبوں میں داخلی امن کے قیام کے لیے لازماً فوجیں موجود ہوں گی۔ ان کے علاوہ ہندوستان کی فیڈریشن کانگریس ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر ایک طاقتور سرحدی فوج متعین کر دے گی جس میں تمام صوبوں کے دستے شامل ہوں گے اور تمام قوموں کے قابل و کار دان فوجی افسروں کے ہاتھ میں ان کی قیادت ہوگی میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں اس وقت قابل فوجی افسر موجود نہیں ہیں اور کمیشن کے ارکان نے اسی امر واقعہ کو پیش کر کے نظم و نسق فوج کو

ملک معظم کی حکومت کے ہاتھ میں رکھنے کے لیے وجہ جواز پیدا کی ہے۔ اس معاملے کے متعلق میں سائمن رپورٹ ایک اور اقتباس پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو میری رائے میں خود کمیشن کی اختیار کردہ پوزیشن کے خلاف ایک محکم دلیل ہی رپورٹ مظہر ہے کہ "جن ہندوستانیوں کو ملک معظم کی طرف سے شاہی کمیشن ملا ہوا ہے ان میں سے کسی کو بہ حالات موجودہ کپتانی سے اونچا فوجی منصب حاصل نہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس وقت ۳۹ کپتان ہیں۔ جن میں سے ۲۵ عام رجمنٹوں میں مامور ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر ایسی ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات پاس بھی کر لیں تو بھی پنشن پانے سے پیشتر کپتانی سے اونچا عہدہ حاصل نہیں کر سکتے اکثر ایسے ہیں جنھوں نے سینڈہرسٹ کے فوجی کالج میں تعلیم نہیں پائی بلکہ جنگ عظیم میں انھیں کمیشن مل گئے۔ جب حالت یہ ہے تو تغیر کی حالت کتنی ہی مخلصانہ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کتنی ہی سرگرم کیوں نہ ہو تو ظاہر ہے کہ نشوو ارتقا کی رفتار بہت سست اور مدہم رہے گی۔ اس سلسلے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ان حالات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جو سکین کمیٹی نے (جس کے ممبر سب دیسی شرفا تھے) ان مؤثر الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ "ترقی بہر حال اس پر موقوف ہوگی کہ ہر مرحلہ میں کامیابی حاصل کی جائے۔ اور فوجی صلاحیت کو برقرار رکھا جائے" موجودہ ہندوستانی افسر تمام کے تمام چھوٹے درجے کے ہیں اور ان کا تجربہ بہت محدود ہے۔ ان میں سے اونچے درجے کے افسر قلیل مدت میں پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ جب تک افسروں کے درجوں میں موزوں ہندوستانیوں کی بھرتی کی تعداد میں معتدبہ اضافہ نہیں ہوگا (اور ہم ان کی تعداد میں اضافہ کے دل سے خواہاں ہیں) جب تک ہندوستانیوں کی کافی تعداد تعلیم و تجربہ حاصل کرکے اس قابل نہیں ہو جائے گی کہ کم از کم چند ہندوستانی رجمنٹوں کے سارے عہدے سنبھال سکیں جب تک پورے دستے اپنی صلاحیت کا پورا عملی ثبوت نہ دیں گے۔ جب تک ہندوستانی افسر کامیاب فوجی خدمت کے ذریعہ اعلیٰ کمان کے قابل نہیں بن جائیں گے اس وقت تک یہ پالیسی کہ تمام فوج ہندوستانی افسروں پر مشتمل ہو بروئے کار نہیں لائی جا سکتی پھر بھی اس سکیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے سالہا سال درکار ہوں گے۔

اب میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ ہماری عسکری اقوام کی فطری ناقابلیت کا نتیجہ ہے یا فوجی تعلیم دینے کی سستی رفتار کا؟ ہماری عسکری اقوام کی فوجی صلاحیت ناقابل انکار ہے ہو سکتا ہے کہ فوجی تعلیم کے لیے دوسری تعلیمات کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہو۔ میں فوجی معاملات کا ماہر نہیں ہوں کہ اس چیز کا صحیح اندازہ کر سکوں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ مذکورہ استدلال کے مطابق یہ لائحہ عمل تو ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ ہندوستان ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی فوج کے مسئلہ کو ایک ایسی کمیٹی کے حوالے کر دیا جائے جس کے عناصر ترکیبی کا

فیصلہ باہمی سمجھوتے سے کر لیا جائے اگر یہاں فیڈرل حکومت قائم ہو گئی تو مجھے یقین ہے کہ اسلامی ریاستیں ہندوستان کی حفاظت کے لیے ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج اور غیر جانب دار ہندوستانی بحری طاقت کی تعمیر پر بعد خوشی رضامند ہو جائیں گی۔ مغلوں کے عہد میں اس قسم کی غیر جانب دار دفاعی فوج موجود تھی بلکہ اکبر کے زمانے میں سرحد ہند کی محافظ فوج کے تمام جرنیل ہندو تھے مجھے کامل یقین ہے کہ فیڈرل حکومت کے ماتحت غیر جانب دار ہندوستانی فوج کے پیش نظر مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کے یہ شکوک بھی بالکل رفع ہو جائیں گے کہ مسلمانان ہند بیرونی حملے کی صورت میں اپنے ماورائے سرحد کے مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

دوسری شکل

میں نے اختصار کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو میری رائے میں اس ملک کے دو نہایت اہم آئینی مسئلوں کے متعلق کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کا اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کی از سر نو اس انداز پر تقسیم کی جائے کہ اس سے فرقہ وارانہ مسئلہ کا مستقل طور پر حل ہو جائے (یعنی صوبوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ ان میں ہر قوم کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنی نشوونما میں کامل آزادی حاصل ہو) لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ قابل التفات نہ سمجھا جائے تو میں پورے زور کے ساتھ ان اسلامی مطالبات کی تائید کرتا ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی طرف سے بار بار پیش کیے جا چکے ہیں۔ مسلمانان ہند کسی ایسے آئینی تغیر پر ہر گز رضامند نہیں ہو سکتے جو جداگانہ انتخاب اور پنجاب اور بنگال میں ان کے حقوق اکثریت پر اثر انداز ہو یا اس امر کی ضمانت نہ دے کہ مرکزی وضع قوانین میں ان کی نیابت ایک تہائی یقینی طور پر ہو گی۔ مسلمانوں کے سیاسی رہنما اس سے پہلے ان دونوں پر غلطی کھا چکے ہیں۔ اول میثاق لکھنؤ جس کی تخلیق ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کے غلط نظریہ کے ماتحت کی گئی اور جس کی رو سے مسلمانان ہند کے سیاسی اقتدار کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے۔ دوسرے وہ کوتاہ نگہی جو پنجاب سے مسلمانوں کی دیہاتی (RURAL) اور شہری (URLAN) تقسیم کا موجب بنی۔ اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل گئی۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق لکھنؤ اور مسلمانان پنجاب کے دیہاتی اور شہری تقسیم کی تجویز کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانان پنجاب اور بنگال کے لیے لیے آئینی اکثریت (STATUTRY MAJARITY) کی سفارش نہیں کی اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے اور یوں مسلمانوں کے لیے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ وہ یا تو میثاق لکھنؤ پر قانع رہیں یا مخلوط انتخاب کی سکیم منظور کریں۔ سائمن رپورٹ کے متعلق حکومت ہند کے خریطہ (DESPATCH) میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ رپورٹ

شائع ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں نے ان تجاویز میں سے کسی ایک کے قبول کرنے کے متعلق بھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ حکومت ہند اس خریطہ میں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو حقوق اکثریت سے اس بناء پر محروم کردینا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے ان میں انہیں زائد نشستیں (WEIGHTAGE) دی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے جائز شکایات کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کی اس مجوزہ بے انصافی کی کوئی تلافی نہیں کی۔ بہرنوع لارڈ ارون اور ان کی حکومت نے تسلیم کرلیا ہے کہ اکثریت کے لیے فرقہ وارانہ نیابت اس وقت تک باقی رہنی چاہیے جب تک کہ حق رائے دہندگی (FZANCHISE) کو اتنا وسیع نہ کردیا جائے اس سے ہر قوم کے ووٹ دینے والوں کی تعداد کا تناسب قریب قریب وہی ہو جو ان کی کل آبادی کا تناسب ہے اور دوسرے جب تک صوبہ کی مجلس مقننہ کے مسلم ارکان دو تہائی اکثریت کے ساتھ جداگانہ انتخاب سے دست برداری پر رضامندی کا اظہار نہ کریں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ باوجودیکہ حکومت ہند مسلمانوں کی شکایات کو حق بجانب تسلیم کرتی ہے۔ پھر بھی اس کو یہ ہمت کیوں نہیں پڑتی کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو آئینی اکثریت دینے کی سفارش کرے۔

مسئلہ سندھ

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسے نظام پر رضامند نہیں ہو سکتے جس میں سندھ کو ایک مستقل نمونہ بنایا جائے اور صوبہ سرحد کی سیاسی حیثیت دوسرے صوبوں کے برابر نہ کردی جائے۔ مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ سندھ کو بلوچستان کے ساتھ ملاکر ایک مستقل صوبہ کیوں نہ بنادیا جائے۔ سندھ اور احاطہ بمبئی میں تو کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی خود ارکان کمیشن اعتراف کرتے ہیں کہ طریق بود وماند اور تمدن کے اعتبار سے سندھ ہندوستان کی بجائے عرب اور عراق سے زیادہ قریب ہے۔ مشہور جغرافیہ دان مسعودی نے اس حقیقت کو بہت پہلے محسوس کرلیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ "سندھ ایک ایسا ملک ہے۔ جسے ہندوستان کی بجائے ممالک اسلامیہ سے زیادہ قرب حاصل ہے"۔ روایت ہے کہ امیہ خاندان کے پہلے حکمران نے مصر کے متعلق کہا تھا کہ اس کی پشت افریقہ کی طرف ہے اور منہ عرب کی طرف" ضروری ترمیمات کے ساتھ یہی قول سندھ کی اصلی پوزیشن کو بھی واضح کردیتا ہے مصر کی طرح سندھ کی بھی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی طرف۔ علاوہ بریں جب ہم سندھ کے زراعتی وسائل اور معاملات پر غور کرتے ہیں۔ جو اپنے متعلق حکومت بمبئی کے دل میں کبھی جذبات ہمدردی پیدا نہیں کرسکتے۔ نیز جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ کراچی لازماً نشو و ارتقاء پاکر ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شہر بن جائے گا اور اس سے سندھ کی تجارت میں لامتناہی

ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں گی تو صاف نظر آجاتا ہے کہ سندھ کو احاطہ بمبئی کے ساتھ وابستہ رکھنا تدبر اور دور اندیشی کے منافی ہے۔ کیونکہ اگرچہ آج ان دونوں کے درمیان بظاہر کشمکش نہیں لیکن مستقبل قریب میں ان کے درمیان جذبات رقابت پیدا ہونے کے بہت امکانات ہیں ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ علیحدگی سندھ کے راستہ میں مالی مشکلات حائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق آج تک میرے سامنے کوئی قطعی اور مستند بیان نہیں آیا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ واقعی اس قسم کی مشکلات موجود ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند ایک ہونہار صوبہ کو مستقل نشوو ارتقاء کی جدوجہد میں عارضی طور پر مالی امداد دینے کے لیے آمادہ کیوں نہیں ہوتی۔

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد کے متعلق یہ دیکھ کر بے حد قلق ہوتا ہے کہ ارکان کمیشن نے اس امر سے انکار ہی کر دیا ہے کہ اس صوبہ کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا کوئی حق حاصل ہے کمیشن نے صوبہ سرحد کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ مجھے (BRAY) کمیٹی کی تجاویز سے بھی کم ہیں۔ اور اس صوبہ کے لیے جو کونسل تجویز کی گئی ہے۔ اسے چیف کمشنر کی مطلق العنانی کو چھپانے کے لیے ایک نظر فریب پردے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ افغان کے سگریٹ سلگانے کا فطری حق محض اس لیے چھین لیا گیا ہے کہ وہ اتفاق سے بارود خانہ (POWER HOUSE) میں مقیم ہے۔ ارکان کمیشن کا یہ تمثیلی استدلال بظاہر کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو لیکن ہے بے حد ناقابل اطمینان۔ سیاسی اصلاحات کو "روشنی" کہنا چاہیے۔ نہ کہ "آگ" اور روشنی کا ہر انسان حقدار ہے۔ خواہ وہ بارود خانہ کے اندر مقیم ہو یا کوئلہ کی کان میں افغان بہادر ہے، بالغ نظر ہے اور اپنے جائز حقوق کے لیے ہر تکلیف برداشت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس لیے اسے کامل خود اختیاری حکومت کے مواقع سے محروم کرنے کی جو کوشش کی جائے گی وہ یقیناً اس کی برافروختگی کا باعث ہوگی۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ اس قوم کو مطمئن رکھا جائے۔ حال ہی میں اس بدنصیب صوبے میں جو الم انگیز واقعات پیش آچکے ہیں وہ اسی ناروا سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندوستان میں خود اختیاری حکومت کا اصول نافذ کرنے کے وقت سے اہل سرحد کے ساتھ روا رکھا گیا۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صوبہ سرحد کی موجودہ بے چینی کو بیرونی اسباب کا نتیجہ قرار دے صورت حالات کے صحیح اندازہ سے چشم پوشی نہیں کریں گے۔

صوبہ سرحد کے متعلق حکومت ہند کے مراسلہ میں جو سفارشات کی گئی ہیں وہ بھی اطمینان بخش نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مراسلہ میں ایک نام نہاد مجلس نمائندگان اور ایک نیم نمائندہ SEMI REPRESE

سی کابینہ مہیا کر کے سائمن رپورٹ کی سفارش پر اضافہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ محض اشک شوئی ہے کیونکہ اس اہم ترین مسلم صوبے کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی سطح پر نہیں لایا گیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ افغان فطرتاً ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں جمہوری ادارت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

گول میز کانفرنس

میرا فرض ہے کہ اب میں گول میز کانفرنس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ ذاتی طور پر گول میز کانفرنس کے نتائج میری توقعات سے کچھ زیادہ خوش آئند نہیں ہیں۔ امید تو یہ تھی کہ فرقہ وارانہ منافشات کی کش مکش گاہ سے دور نئی فضا زیادہ بصیرت افروز ہو گی اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلاف کا مخلصانہ تصفیہ آزادی ہند کے مقصد کو قریب تر لے آئے گا۔ لیکن واقعات کچھ اور ہی داستان سنا رہے ہیں۔ لندن میں فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق جو بحث و تمحیص ہوئی اس سے یہ حقیقت کہ ہندوستان میں ان دو بڑی تہذیبوں کی حامل اقوام میں کس قدر اصولی اختلافات موجود ہیں۔ اس انداز سے عریاں ہو گئی کہ اس سے پیشتر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ اس کے باوجود وزیر اعظم انگلستان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی مسئلہ نہیں، بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وزیر اعظم نے کہا کہ میری حکومت کے لیے یہ مشکل ہو گا کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کے حق میں تجاویز پیش کر سکے۔ اس لیے کہ مخلوط انتخاب کے اصول کو برطانیہ کے خیالات جمہوریت کے ساتھ زیادہ مطابقت حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعظم انگلستان نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایک ایسی سرزمین میں جہاں مختلف قومیں آباد ہوں، برطانوی جمہوریت کے نمونہ پر کوئی نظام حکومت قابل عمل نہیں ہو سکتا اور اس نے یہ بھی نہیں سمجھا کہ مخلوط انتخاب تو ایک طرف خود جداگانہ انتخاب بھی اس تجویز کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو تہذیبی خطوں کے مطابق صوبوں کی از سر نو تقسیم پر مشتمل ہے۔ اقلیتوں کی سب کمیٹی میں بھی اطمینان بخش تصفیہ کی کوئی امید نہیں۔ اس لیے یہ ضروری کہ تمام کا تمام مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے ہو اور ہمارا خیال ہے کہ زیرک برطانوی مدبرین اکثر ہندوستانی سیاست دانوں کی طرح اس مسئلہ کو سطحی نظر سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر ہندوستان جیسے ملک میں امن و سکون کے صحیح اصول و مبانی کا واضح طور پر مشاہدہ کر لیں گے۔ ہندوستان کے لیے نظام حکومت کی بنیادیں "متحدہ قومیت" کے غلط تصور پر رکھنا یا یہاں ان اصولوں کو ٹھونسنا جو برطانیہ کے انداز جمہوریت کے رہین منت ہوں، ہندوستان سے دوستی نہیں بلکہ اسے نادانستہ خانہ جنگی کے لیے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میری بصیرت کام دیتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن قائم نہیں

ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام کو ایسے مواقع بہم نہ پہنچائے جائیں کہ وہ اپنی ماضی کے شجر مقدس سے پیوستہ رہتے ہوئے عصر حاضر کے داعیات کے مطابق خود مختارانہ اپنی ملت کی نشوونما کر سکیں۔

مقام مسرت ہے کہ ہمارے مندوبین اس مسئلہ کو صحیح اصول پر حل کرنے کی اہمیت سے پورے طور پر آگاہ ہیں جسے میں ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے وہ اس بات پر زور دینے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ مرکزی حکومت میں خود مختارانہ حکومت کے مسئلہ سے پیشتر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ کسی مسلم سیاستدان کو فرقہ پرستی (COMMUNALISM) کے طنز سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ جسے اغیار نے محض مخالفانہ پروپیگنڈہ کے لیے اختیار کیا ہے اور اسے اس غرض سے ایجاد کیا گیا ہے کہ اہل برطانیہ کے جذبات جمہوریت کی اپیل کر کے اپنا الو سیدھا کیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں جس چیز (متحدہ قومیت) کا وجود ہی نہیں اسے انگلستان کو باور کرا کر اسے خواہ مخواہ غلط راستہ پر لگا دیا جائے۔ اس وقت سر دھڑ کی بازی لگ رہی ہے ہم تعداد میں بھی سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کی کوئی دوسری قوم ایسی نہیں جو ہماری طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے۔ جس پر صحیح معنوں میں موجودہ زمانے کے مفہوم کے مطابق لفظ قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے اگرچہ ہندو ہم سے ہر اعتبار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان میں آج تک وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جو منتشر افراد کو ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لیے لانیفک ہے اور جو آپ کو اسلام کی بارگاہ سے بلا مزد و قیمت بطور عطیہ کے مل گئی ہے اس میں شک نہیں کہ آج ہندو ایک قوم بننے کے لیے بے حد مضطرب اور بے تاب ہیں لیکن افراد کو قوم بننے کے لیے ایسے ہی دشوار گزار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں جیسے قطرے کو گوہر بننے کے لیے اور ہندو تو اس وقت تک ایک قوم بن ہی نہیں سکتے جب تک وہ اپنے تمام معاشرتی نظام کو یکسر بدل نہ ڈالیں۔ نہ ہی مسلمان لیڈروں اور سیاستدانوں کو اس قسم کے عیارانہ اور گمراہ کن استدلالات کی رو میں بہہ جانا چاہیے کہ ترکی اور ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ کے باشندے قومی یعنی جغرافیائی نظریات کے ماتحت ترقی کرتے جا رہے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ ہندوستان سے باہر کے اسلامی ممالک میں قریب قریب تمام آبادی مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی اقلیتیں باصطلاح قرآن کریم "اہل کتاب" پر مشتمل ہیں اور اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاشرتی حد بندی نہیں ہے کوئی یہودی یا عیسائی یا اہل زرتشت اگر مسلمانوں کے کھانے کو چھو دے تو اس کا کھانا بھرشٹ نہیں ہو جاتا اور اسلامی شریعت میں اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی بھی جائز ہے۔ اسلام نے تمام نوع انسانی میں ایک وحدت پیدا کرنے کے لیے پہلا عملی قدم یہ اٹھایا کہ ان لوگوں کے آگے بڑھنے اور اتحاد پیدا کرنے کی دعوت دی جن کا اخلاقی نصب العین اسلام کے نصب العین

سے قریب تر تھا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ۔ اے اہل کتاب آؤ اس حقیقت پر متحد ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام اور عیسائیت کی جنگوں نیز اہل یورپ کی مختلف النوع چیرہ دستیوں نے اس آیۂ مقدسہ کے لامتناہی مفہوم کو دنیائے اسلام میں عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ دیا۔ آج اسلامی ممالک میں اس حسین خواب کی تعبیر اس رنگ میں ہو رہی ہے جسے "اسلامی قوت" کہا جاتا ہے۔

میرے لیے یہ عرض کرنا چنداں ضروری نہیں کہ ہمارے نمائندے جتنے زیادہ اس بات میں ہوں گے کہ وہ غیر مسلم نمائندوں کو ہمارے "دہلی ریزرویشن" کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر رضامند کر لیں، اتنی ہی ان کی کامیابی زیادہ سمجھی جائے گی۔ اگر یہ مطالبات منظور نہ کیے گئے تو پھر قوم کے لیے موت اور حیات کا سوال در پیش ہوگا اس وقت مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر متحدہ طور پر عملی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ سچ مچ اپنے مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اس متحدہ عمل کے لیے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیے اکابر ملت سیاسی معاملات کے متعلق کافی غور و تدبر کر چکے ہیں۔ جس نے ہمارے دلوں میں ان قوتوں کا کم و بیش احساس ضرور پیدا کر دیا ہے جو اس وقت ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوتوں کی تقدیروں کو سانچے میں ڈھال رہی ہیں لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انھوں نے ہمیں اس عملی قدم کے لیے بھی تیار کر دیا ہے۔ جس کے لیے مستقبل میں رونما ہونے والے حالات متقاضی ہوں گے۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ دور حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں پہلی مصیبت قحط الرجال کی ہے۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی یہ تشخیص بالکل صحیح تھی کہ مسلم قوم میں رہنماؤں کا فقدان ہے۔ جیسا کہ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا لیڈروں سے میری مراد ایسے حضرات ہیں جنھیں مبداء فیض کی کرم گستری یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اس کے منتہائے نگاہ سے متعلق بصیرت نامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصر حاضرہ کے تاریخی شواہد بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں ہوتے ہیں جو قوم کے عرق مردہ میں خون زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ جسے چاہے دے، حسب فرمائش بنوائے نہیں جا سکتے۔ دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے یہ ہے کہ ان کے دل سے احساس اجتماعیت فنا ہو رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے الگ الگ راستوں پر گامزن ہو رہے ہیں۔ اور ان کا کوئی ملت کے اجتماعی افکار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ہم آج میدان سیاست

میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں لیکن فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو نقصان نہیں پہنچاتے ان جھگڑوں سے کم از کم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصل اصول (مذہب) جو ہماری اجتماعیت کا نقطہ ماسکہ ہے۔ اس سے ہمیں گہری دلچسپی ہے۔ پھر یہ اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے۔ لیکن سیاسیات کے دائرے میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جب کہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحاد عمل پر ہو قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ان ہر دو مصیبتوں کا علاج کیا کریں۔ پہلی مصیبت (یعنی صحیح رہنماؤں کا فقدان) کا علاج تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔ البتہ دوسری مصیبت (عدم احساس اجتماعیت) میرے خیال میں ناقابل علاج نہیں اس باب میں میرے سامنے ایک منظم لائحہ عمل موجود ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک وہ مزعومہ خطرہ پیدا نہ ہو جائے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اگر وہ صورت حالات پیدا ہو جائے تو اس وقت ضرورت ہو گی کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے ممتاز اکابر ملت ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس لیے نہیں کہ ریزولیوشن پاس کیے جائیں بلکہ اس لیے کہ مسلمانوں کے لیے آخری طریق کار متعین کیا جائے اور انھیں حصول مقاصد کا عملی راستہ بتایا جائے۔ میں نے اس خطبہ میں اس دوسری شکل کا تذکرہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ آپ اسے اپنی پیش نظر رکھیں۔ اور اس دوران میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔

خاتمۂ سخن

حضرات مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ خاتمہ پر میں اس امر کی اہمیت واضح کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آج آ چکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدت افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملت اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ہوتی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لیے لاتعداد مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے اور اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اس سرزمین کو اظہار خودی کی اس مسرت سے یکسر محروم کر دیا جس کی برکت سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی جس سرزمین (یعنی ہندوستان) کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیا کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندان توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر اسلام کے لیے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملت اسلامیہ۔ اس لیے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اسلام کا حشر ہو گا۔ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطہ خیال سے بھی کہ ہماری موت و حیات کا

عالمِ اسلامی پر کیا اثر ہوگا ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ان سے کبھی ہم عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لیے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کریں ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں متحد ہوں ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملت کی موت اور زندگی وابستہ ہے۔ بہت بری طرح اثر انداز ہو چکا ہے میں فرقہ وار مسائل میں سمجھوتہ کی طرف سے ناامید نہیں ہوں لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصول مقاصد کے لیے تلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم کو ایک متحدہ نصب العین پر مرکوز کیے ہوئے ہوں اچھا تو کیا اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ مسلمانوں میں اس قسم کی وحدتِ افکار پیدا ہو سکے۔ ہاں ایہ ممکن ہے اس کے لیے طریق عمل یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو پارٹی بازی کے محدود مفاد اور ذاتی اغراض کی سطح سے بلند کریں اور اس بلند ترین نصب العین کی روشنی میں جس کی نیابت کے لیے دنیا میں ملت اسلامیہ کا وجود قائم ہے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت متعین کریں خواہ وہ بلحاظ مادی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ہی کیوں نہ ہوں اس مادیت کے کثیف مقاصد سے روحانیت کی لطیف منازل کی طرف گامزن ہوں۔ مادہ انتشار کا مظہر ہے اور روح نورانیت۔ زندگی اور وحدانیت کی قندیل۔ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ ان کی تاریخ کے نازک ترین ادوار میں مذہب (اسلام) نے ملت کو بچایا ہے نہ کہ ملت نے مذہب کو یعنی اگر اسلام کی حفاظت ہو جائے تو اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرتکز کر دیں اور جو زندہ اور پائندہ قائم و دائم نظریہ حیات وہ پیش کرتا ہے اس سے اپنی بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے جمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہ و برباد کی مہیب جہنم سے بچا لیں گے قرآن کریم کی ایک مہتم بالشان آیت میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ ایک فرد واحد کی تخلیق اور بلند ترین کے اولین مظہر ہونے کے جائز مدعی ہو سکتے ہیں۔ باہمی بے تعلقی کو چھوڑ کر ایک جسدِ واحد کی طرح ایسی زندگی بسر کریں (کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ سے آب گینہ میں آنسو چھلک پڑے) جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں معاملات جس طرح بظاہر نظر آتے ہیں۔ ان کی حقیقت اس سے کہیں مختلف ہے تو اس سے میں آپ کو کسی چیستاں میں الجھانا نہیں چاہتا۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم آپ کے افق دماغ پر اس وقت نور افشاں ہوگا جس وقت آپ اپنی حقیقی اجتماعی خودی کی روشنی میں دیکھنے کا ملکہ حاصل کر لیں گے قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔

"اپنی خودی کا استحکام کرو اگر تم خود صحیح راستہ پر گامزن ہو گے تو کوئی غلط راستہ پر چلنے والا تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے گا۔"

باب ۱۸

گول میز کانفرنسیں

پہلی گول میز کانفرنس

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انگریزی حکومت کے لیے زبردست سوچ بچار اور بحران کا دور رہا۔ بالخصوص ہندوستان کی سیاست نے انگریز کو مجبور کر دیا کہ اس ملک کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو ایک جگہ بٹھا کر انگریزی مقام کی موجودگی میں اپنے اپنے موقف کو بالوضاحت بیان کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ افہام و تفہیم کا کوئی سلسلہ بن جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو انگلستان مدعو کیا گیا، اور وہاں پر ہر ایک کو اپنے اپنے نکتہ نظر کو کھل کر بیان کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس طرح کی تین کانفرنسیں وقوع پذیر ہوئیں۔ اور ہر ایک کو گول میز کانفرنس کا نام دیا گیا۔

پہلی کانفرنس ۱۹۳۰ کے آخر میں منعقد ہوئی۔ جب کہ باقی دو کانفرنسیں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں انعقاد پذیر ہوئیں۔ ان پر سہ کانفرنسوں کا تفصیلی حال ذیل کی سطور میں بیان کیا جاتا ہے پہلی گول میز کانفرنس، پہلی گول میز کانفرنس ۔ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو انگلستان میں شروع ہوئی اور ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے وائسرائے نے کل ۸۹ مندوبین کی دعوت نامے جاری کیے جن میں ہندو اور مسلمان لیڈر شامل تھے۔ ہندوؤں کی سازش تھی بلکہ بعض مقامات پر تو کھلی دشمنی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کی برتری کو تسلیم کیا جائے اور حکومت میں اُن کی فوقیت کو برقرار رکھا جائے اور مسلمانوں کو دوسرا درجہ دے کر ان کے ماتحت کر دیا جائے لیکن اس میں کانفرنس میں ہونے والی بات چیت کا موضوع کچھ اس قسم کا تھا۔ اس سے بیشتر جو اقدام انگریز نے کیے تھے۔ ان سے بھی واضح طور پر پتہ چلتا تھا کہ انگریز ایک ایسا آئین تیار کرنا چاہتا ہے جس سے دو قومی نظریے کی وضاحت ہو جائے اور مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں ایک منفرد اور با اختیار قوم کی حیثیت حاصل ہو۔

مدعومندوبین میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام قابل ذکر ہیں۔

مسلم لیگ :۔ ۱۔سر آغا خاں
۲۔سر شاہنواز
۳۔نواب سر احمد سعید چھتاری
۴۔مولانا محمد علی جوہر
۵۔راجہ شیر محمد
۶۔مولوی فضل الحق
۷۔غلام حسین ہدایت اللہ
۸۔سر میاں محمد شفیع
۹۔چوہدری ظفر اللہ خاں
۱۰۔بیگم شاہنواز
۱۱۔مسٹر محمد علی جناح

کانگریس :۔ ۱۔سر تیج بہادر
۲۔مسٹر جیکر
۳۔ڈاکٹر مونجے وغیرہ

کانگرس کا شرکت سے انکار کانگرس نے اس کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جنوری ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے یوم آزادی منایا اور اعلان کیا کہ جب تک ہندوستان کے عوام کو کامل آزادی نہیں مل جاتی اس وقت تک تحریک سول نافرمانی جاری رہے گی۔اس کے ساتھ ہی کانگرسیوں نے لارڈ ونلگڈن جیسے مقتدر وائسرائے کو زیر سیاست کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے ان سے حکومت نے اپنی زبردست بیزاری کا اظہار کیا کیوں کہ کانگرس تشدد کرتی جا رہی تھی۔

حکومت نے نمک پر محصول لگا دیا تو کانگرس نے انگریزوں کے خلاف احتجاجاً خود نمک سازی شروع کر دی اور محصول دینے سے گریز کیا۔اس کے علاوہ کانگرسیوں نے انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لیے راہیں ہموار کرنی چاہئیں۔چنانچہ وائسرائے کے حکم سے کانگرسیوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔مہاتما گاندھی بھی دھر لیے گئے۔کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو ممبر قانونی قرار دے دیا گیا۔

ہندو اس سے برہم ہو گئے۔انہوں نے انگریز کی تجویز کی ہوئی کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔اس انکار سے ان کا خیال تھا کہ شاید ان کی عدم شرکت سے کانفرنس کا اجلاس ہی نہیں ہوگا۔لیکن انگریز نے پروگرام کے مطابق اس کانفرنس کا انعقاد کیا۔جو ہندوؤں کے لیے پچھتاوے کا باعث بنا۔

جب یہ کانفرنس شروع ہوئی تو اس میں اگرچہ کانگرس کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہ

تھا لیکن وزیر اعظم برطانیہ اور وزیر ہند کے رویہ سے یہ بات بالکل صاف نظر آ رہی تھی کہ کانگرس کی موجودگی میں وہ خود کانگرس کا موقف بیان کریں گے۔ برطانوی وزیر اعظم رمیزے میکڈونلڈ (RAMZEY MECDONALD) نے اقلیتوں کے تحفظات کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں نیشنلزم کے نظریے کو بھی دھرایا۔

کانگرسی ذہن کی نمائندگی ایک مخصوص ہندوستانی گروپ بھی کر رہا تھا جو اس کانفرنس میں شریک تھا۔ ان میں مہاراجہ بیکانیر سب سے پیش پیش تھے۔ مہاراجہ بیکانیر نے تجویز پیش کی کہ تمام ہندوستانی ریاستوں کو اپنا وجود یکسر ختم کر دینا چاہیے اور ایک وفاق قائم کر لینا چاہیے اور والیان ریاست کے حقوق کی ضمانت دی جانی چاہیے تاکہ وفاق کے ساتھ الحاق کے بعد ان کا اپنا مستقبل مخدوش نہ ہو جائے۔ ان تمام امور پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا گیا۔

اگرچہ مسلم لیگ کے وفد کی سربراہی سر آغا خاں کر رہے تھے۔ لیکن ان میں جوش اور ولولے کے لحاظ سے سب سے زیادہ سرگرم رکن مولانا محمد علی جوہر تھے۔ انہوں نے انگلستان جاکر نہ صرف اپنے موقف کو کمال احسن طریقے سے انگریزوں کے سامنے پیش کیا بلکہ ان کی احساس آزادی اور آرزوئے حصول استقلال کی تعیین کے جذبات ان کے مندرجہ ذیل الفاظ میں مضمر ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔

دیس ایک غلام ملک میں زندہ رہنے سے آزاد ملک میں چلاجانا بہتر سمجھتا ہوں۔ میں یہاں سے ہندوستان کے لیے آزادی لے کر جاؤں گا۔ یا اسی ملک میں اپنی قبر کے لیے جگہ دوں گا۔

پہلی گول میز کانفرنس میں بنیادی امور طے پائے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں وفاقی طرز کی حکومت قائم ہوگی۔

۲۔ سر تیج بہادر سپرد کے کہنے پر انگریز نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ہندوستان میں مرکزی طور پر ایک ذمے دار حکومت بنائی جائے اور ہندوستان کو قلمرو کا درجہ دیا جائے۔ سر تیج بہادر کی اس تجویز کو مسلم لیگی زعما نے بھی مان لیا۔

۳۔ تمام سیاسی جماعتوں کو اپیل کی گئی کہ وہ ہندوستان کے حالات میں امن پیدا کرنے کے [illegible] کی طرف توجہ دیں۔ وزیر اعظم میکڈونلڈ نے بالخصوص کانگرس کی تحریک سول نافرمانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب ان لوگوں کو تعمیری کام کی طرف توجہ کرنی چاہیے تاکہ ہندوستان کے صوبوں میں بھی ذمہ دار حکومت قائم ہو سکے۔

۴۔ کانفرنس میں مندرجہ ذیل آٹھ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاکہ کانفرنس کو درپیش مختلف مسائل کو علیحدہ علیحدہ پرکھا جائے۔

i۔ رائے دہی کمیٹی

ii۔ وفاقی ہیئت اور تنظیم کمیٹی

iii۔ صوبائی دستور کمیٹی

iv۔ صوبہ سندھ کی تشکیل کی کمیٹی

v۔ صوبہ سرحد کے لیے کمیٹی

vi۔ برما کے مائل کے بارے میں کمیٹی

vii۔ ہندوستان کے دفاع کے بارے میں کمیٹی

viii۔ اقلیتوں کے مائل کی کمیٹی

کانفرنس کی ابتدائی کاروائی نہایت خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں ہوئی اور متعدد امور میں مصروف رہے، اور کام کی کثرت۔ جذبات کی شدت اور احساسات کی زیادتی سے نہ صرف خوشی ومسرت کی ایک لہر دوڑنے لگی۔ لیکن اس تمام سازگار ماحول کو گدلا کرنے والے عناصر بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ جنہوں نے کانفرنس کی کامیابی اور خوشی کو جزوی ناکامی اور سنجیدگی میں تبدیل کر دیا، کیونکہ جس وقت کانفرنس میں فرقہ وارانہ مائل کا ذکر شروع ہوا تو ہندو مہا سبھا کے مسٹر جیکر نے زہر افشانی شروع کر دی جس سے تمام فضا مکدر ہو گئی۔

چونکہ ہندوستان میں فرقوں کی ایک وافر تعداد پائی جاتی ہے اور جب تک ان کے مسائل کو حل نہ کیا جائے یا ان کے ساتھ کوئی افہام و تفہیم کا معاملہ طے نہ کیا جائے۔ دستور کس طرح بن سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کمیونل مسئلہ آئین ہند کی تشکیل کے لیے ایک بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انگریزوں اور مسلمانوں نے بہت کوشش کی کہ معاملہ کسی نہ کسی طرح طے پا جائے لیکن مسٹر جیکر ہندو مہا سبھائی کی ہٹ دھرمی نے اس مسئلہ کو حل نہ ہونے دیا۔

۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک اس موضوع پر بحث رہی لیکن جب کوئی مثبت نتیجہ نکلتا نظر نہ آیا تو کانفرنس کو برخواست کر دیا گیا۔

محمد علی جوہر کی وفات

مولانا محمد علی جوہر مسلمانانِ ہند کی آزادی کے جذبے سے پوری طرح سرشار تھے، اور ان کی دلی آرزو یہ تھی جس قدر جلدی

ہو سکے وہ آزادی کی شمع اپنے ہاتھ سے روشن کریں اور برصغیر پر چھائے ہوئے اس خوفناک اندھیرے کو اُجالے سے تبدیل کردیں۔ وہ انگلستان روانہ ہونے سے قبل ہی علیل تھے لیکن بقول اُن کے آزادی صحت انسانی سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔اس لیے آزادی کے حصول کو صحت کے حصول پر ترجیح دینی چاہیے۔ان کا خیال تھا کہ اگر ان کو سٹریچر پر بھی انگلستان جاکر آزادی حاصل کرنی پڑے تو وہ ضرور جائیں گے۔

کانفرنس میں شرکت کے دوران انہوں نے اپنی ذہانت۔ مضامت۔ بلاغت۔علمیت اور قانون دانی کا سکہ انگریزوں سے منوا لیا، ان کے طرز خطابت نے پورے ملک فرنگی کو متاثر کیا، یہاں تک کہ مشہور انگریزی ناول نگار ایچ۔ ڈی۔ جی ویلز یہ بات کہنے پر مجبور ہوگیا کہ— محمد علی کے پاس برق کی زبان، میکالے کا قلم اور ہنوشین کا دل ہے۔

مولانا موصوف نے کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان پہنچ کر بھی دن رات کام کیا جو ڈاکٹروں کے مشورے کے بارے میں جس میں انہوں نے مولانا کو مکمل آرام کے لیے کہا تھا مولانا اپنے مشن میں مصروف رہے، اور کام کی کثرت۔جذبات کی شدت اور احساسات کی زیادتی نے دل پر اثر ڈالا، بلکہ دماغ پر بھی بہت بوجھ ڈال دیا، اور یہی بات بالآخر اُن کی وفات کا باعث بنی۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کی شب مولانا کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور اس کے سبب وہ جانبر نہ ہو سکے۔

گاندھی اروِن معاہدہ

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں کانگرس غیر حاضر رہی تھی۔ مگر جب دوسرے اجلاس کی تیاریاں جاری تھیں تو برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگرنس سے صلح کرکے اس نقص کو دور کر دیا جائے۔ مزدور پارٹی کے وزیر ہند ویجوڈ بین نے وائسرائے لارڈ اروِن کو لکھا کہ کانگریس سے کسی نہ کسی قسم کی مصالحت کرلینا مناسب ہے۔تاکہ وہ اپنی سول نافرمانی کی مہم ملتوی کرکے دوسرے اجلاس میں شریک ہو جائے۔ان ہدایات کے مطابق اروِن نے گاندھی کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا اور اس کے بعد وائسرائے اور گاندھی کی وہ تاریخی ملاقات ہوئی جو چار دن تک یعنی ۱۷، ۱۸، ۱۹ اور ۲۷ کو جاری رہی۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدے پر ۵ مارچ کو دستخط ہو گئے۔

"میثاقِ دہلی" یا "گاندھی اروِن میثاق" میں حسب ذیل تجاویز تھیں۔

۱۔ کانگرس اپنی تحریک سول نافرمانی بند کر دے گی۔ ۲۔ کانگرس گول میز کانفرنس میں شریک ہو گی۔ ۳۔ کانگرس کو اس کی اجازت ہو گی کہ وہ لوگوں کو صرف ہندوستان کا بنا ہوا مال خریدنے کی ترغیب دینے کے لیے پُرامن طور پر دھرنا دے سکے۔ ۴۔ حکومت ان تمام آرڈیننسوں کو واپس لے گی جو کانگرس پر پابندی عائد کرنے کے لیے جاری کیے گئے ہیں۔ ۵۔ حکومت ان تمام اعلانات کو واپس لے گی جو بعض انجمنوں کو خلاف قانون قرار دینے کے لیے جاری کیے گئے ہیں۔ ۶۔ حکومت ان تمام جرائم سے متعلق مقدمات واپس لے لے گی جن کا تعلق تشدد سے نہیں ہے۔ ۷۔ حکومت اُن تمام اشخاص کو رہا کر دے گی جو سول نافرمانی کی تحریک میں اپنی سرگرمیوں کے باعث سزا بھگت رہے ہیں۔ ۸۔ حکومت عائد کردہ جرمانوں، ضبط شدہ اموال منقولہ اور بدامنی کے دوران تعزیری پولیس کے تعین مقام کے بارے میں بعض مخصوص مراعات اور بھی دے گی۔

اس میثاق کے حضرات واقع تھے۔ گاندھی اور کانگرس کو اس وقت مراعات دی گئی تھیں جب کہ وُہ اُس حکومت کی جو ازروئے قانون قائم تھی اعلانیہ اور دانستہ مزاحمت کر رہے تھے۔ گاندھی کا اثر دگنا ہو گیا۔ حکومت کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ گاندھی نے حکومت سے مساوات کی بنیاد پر اس انداز سے گفت و شنید کی کہ گویا دو مقتدر ہستیاں ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر رہی تھیں۔ کانگرس کے علاوہ دیگر جماعتوں کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ سیاسی شورش کی سرپرستی کی گئی۔ یہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار پر ایک ضرب کاری تھی۔ اس سے مسلمانوں کی بھی ہمت شکنی ہوئی۔ انہوں نے دیکھا کہ تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے میں لارڈ کرزن کی جو کارگزاری تھی یہ اسی کا اعادہ ہے۔

تمام شہادت اس نتیجے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ برطانوی حکومت کانگرس کو کانفرنس کی میز پر لانے کے لیے مضطرب تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے کسی قیمت کو گراں نہیں سمجھتی تھی گاندھی ارون گفتگوؤں کے دوران مسلمان بےچین ہو رہے تھے اور جب یہ میثاق شائع ہوا تو انہوں نے اپنی ناپسندیدگی اور خطرات کے اظہار میں تذبذب سے کام نہیں لیا۔

دوسری گول میز کانفرنس

دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ مہاتما گاندھی نے بہ نفس نفیس اس کانفرنس میں شرکت کی۔ کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ حکومت برطانیہ سنجیدگی کے ساتھ کانفرنس کی کارروائی کو آگے بڑھا رہی ہے اور بہت سے مقامات پر وُہ کانگرس کی نمائندگی بالواسطہ خود کر رہی ہے۔ اس لیے ایسا نہ ہو کہ حکومت کوئی ایسا فیصلہ کرے جس سے ہندوستان کے ہندوؤں کو بالخصوص اور

دیگر عوام کو بالعموم کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اس کانفرنس میں شرکت کا دوسرا مقصد مہاتما گاندھی کا یہ تھا کہ وہ اس کو ناکام بنانا چاہتے تھے تاکہ برطانوی حکومت کو کانگرس کے اثر کا پتہ چل سکے۔

مہاتما گاندھی نے کانفرنس کے پہلے دن سے نہایت قابل اعتراض رویہ رکھا انہوں نے خود کو پورے ہندوستان کا واحد نمائندہ قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی واحد سیاسی جماعت ہے تو وہ محض کانگرس ہے۔ باقی تمام ذیلی جماعتیں ہیں اور میں کانگرس کا واحد منتخبہ نمائندہ ہوں۔ اسلیے میں کانگریس کے مفاد کے علاوہ کسی قسم کی بحث سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

انہوں نے نہایت متکبرانہ انداز میں پکار کر کہا کہ اس کانفرنس میں شامل ہونے والے کانگرس کی طرف سے بھیجے گئے نمائندوں کے باقی تمام نمائندے حکومت کے "ٹوڈی" ہیں ظاہر ہے کہ مہاتما کے رویے سے کانفرنس کے ماحول پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ یہ اجلاس شروع سے ہی فرقہ وارانہ تعصبات کا شکار ہونے لگا اور گاندھی نے امن و آشتی کی بات چیت کو ڈنگ مارا۔ جب کہ یہ نہایت خوشگوار ماحول میں پروان چڑھنے والی تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس میں جو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں سے ایک کو فرقہ وارانہ مسائل کے حل کرنے کے ذرائع تلاش کرنا سپرد کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے اجلاس میں یعنی رپورٹ بھی پیش کرنا تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی) کے تعصب انگریز سلوک نے مسائل کی راہ پہاڑ کھڑے کر دیے۔ مہاتما گاندھی جانتے تھے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر اگر انصاف کی نظر سے فیصلہ کیا گیا تو مختلف فرقوں کو پورے معاشرے میں ایک گراں قدر مقام بن جائے گا جس سے کانگرس کی عظمت کی ساتھ ٹوٹ جائے گی۔ بہت سی اور خواتین ابھر آئیں گی اور وہ ہندو لگانگت کو پارہ پارہ کر دیں گی ہندو مذہب رکھنے والے اچھوت بھی کل اپنا مقام پالیں گے۔ اس لیے اُن کی سرتا پیر یہ کہ کسی نہ کسی طریقے سے فرقہ وارانہ مسئلے کو کھٹائی میں ڈالا جائے اور اسے ناکام بنا دیا جائے اور اس مسئلے پر کانفرنس میں بحث ہی نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف دیگر مندوب خوب تیار ہو کر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دلائل و حقائق کے ذریعے مہاتما گاندھی کی ایک بدنیتی پر مبنی کوشش کو سراسر ناکام بنا دیا اور فرقہ وارانہ مسائل کا موضوع کانفرنس میں زیر بحث آیا۔ جب مہاتما گاندھی بھی اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے کانفرنس میں افراتفری ڈالنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے نہرو رپورٹ (جس کے ردِ عمل کے طور پر مسٹر محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کر دیئے تھے اور مسلمانان ہند نے اس نہرو رپورٹ کو یکسر ناقابل تسلیم قرار دے

دیا تھا، تو ایک بار پھر معمولی ردو بدل کے ساتھ اس کانفرنس میں پیش کر دیا تھا۔ گاندھی کے اس اقدام نے نہ صرف کانفرنس کے مندوبین کے ذہنوں میں گاندھی کی طرف سے استعمال کیے جانے والے تعصب ناک رویے کو عیاں کر دیا بلکہ ان کے دلوں میں نفرت بھی پیدا کر دی۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں نے مخالفت کرنی ہی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے غیر مسلم مندوبین نے بھی شدید مخالفت کا اظہار کیا۔ چونکہ گاندھی ایک تجویز پیش کر چکا تھا اس کے جواب میں مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ اس لیے انہوں نے پسماندہ اقوام (اچھوت) ہندوستانی عیسائی، اینگلو انڈین اور دیگر یورپین نمائندوں کے مطالبات پیش کر دیے اور اعلان کیا کہ ان مطالبات کو یا تو پورا پورا تسلیم کیا جائے یا کاملاً رد کر دیا جائے۔ ان مطالبات میں کسی قسم کے سمجھوتے یا ردو بدل کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ تجویز سر آغا خاں نے پیش کی۔ اس تجویز پر کھل کر بحث ہوئی۔ لیکن بات کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچی۔ چونکہ یہ مسئلہ زبردست اہمیت کا حامل تھا اور لازمی طور پر تصفیہ طلب تھا۔ کیوں کہ ملک میں نافذ کیا جانے والا آئندہ آئین جماعتی اور آبادیاتی لحاظ سے تمام فرقوں کی نمائندگی کے تقاضوں کے مطابق بنتا تھا۔ ہندوستان کے مذہب اپنے اندر لاتعداد فرقے سموئے بیٹھے تھے اور ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کو برہمن اپنی زبان میں اچھوت کہتے ہیں برہمن اِن اچھوتوں کی حمایت تو چاہتے تھے لیکن انہیں نمائندگی کے حق سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ اور یہ چال محض اس لیے تھی کہ اپنی فوقیت کو وہ برقرار رکھ سکیں۔ انگریز کے نزدیک یہ نکتہ تھا کہ اسے کسی مذہب یا فرقے سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ نہیں اُسے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کو کس طرح جماعتی نمائندگی دی جا سکتی ہے۔ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بذاتِ خود بہت کوشش کی کہ اس کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی حل نکل آئے لیکن گاندھی کی اس ان بدل ہٹ نے مسئلہ کھٹائی میں ڈال ہی دیا، اور وزیر اعظم برطانیہ کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں اس کانفرنس کے نمائندوں سے پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلد از جلد فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تلاش کریں۔ ورنہ حکومت برطانیہ جو بھی مناسب حل خیال کرے گی نافذ کر دے گی، اور اس اعلان کے ساتھ کانفرنس کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

یہ کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو ناکام ہو کر انجام پذیر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں گاندھی کی چال کامیاب رہی۔ ان کا خیال تھا کہ اب یہ مسئلہ اس قدر زیادہ دیر کے لیے التوا میں پڑا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی اور مسائل ارتقاء پذیر ہو جائیں

گے اور یہ مسئلہ حالات کی نذر ہو جائے گا۔ وقتی طور پر تو بہت خوش ہوا کیونکہ وہ کانفرنس کو اگر پہلی ضرب سے نہ مار سکا تو دوسری منافقت سے پریشان کر گیا اور مسائل حل کرنے کی بجائے ان کی راہ میں چٹان بن کر حائل رہنے کا مصداق بنتا رہا۔ اگر وہ کسی ایک مسئلے پر راضی ہو جاتا تو حالات کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ تاہم اس کی خوش فہمی زیادہ دیر تک اسے خوش نہ رکھ سکی اور برطانوی حکومت صرف ایک سال آٹھ ماہ انتظار کرنے کے بعد فرقہ وارانہ مسائل پر اپنا فیصلہ صادر کرنے پر مجبور ہو گئی۔

۴ اگست ۱۹۳۲ء کو برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا (اس اعلان کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں آ چکی ہیں) اچھوتوں کو متناسب نمائندگی مل جانے پر گاندھی پر جو گذری اور پھر اس نے جو کارروائیاں روا رکھیں ان کا ذکر "کمیونل ایوارڈ" کے موضوع کے تحت آ چکا ہے)

تیسری گول میز کانفرنس تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہو گئی۔ اس اجلاس میں کانگرس نے شرکت نہ کی اس کی وجہ واضح تھی، کانگرس نے ہندوستان میں نافذ کی جانے والی آئینی اصلاحات کے سلسلے میں انگریز کے انہماک کا جائزہ لیا تھا اور اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ اصلاحات بہت جلد نافذ ہو جانے والی ہیں۔ اگر کانفرنس میں شرکت کر لی گئی تو ممکن ہے۔ان اصلاحات کے سلسلے میں حکومت برطانیہ کانگرس سے براہ راست یا بالواسطہ کسی ایسے مسئلے کو حل کرانے پر مجبور کر دے جس کو کانگرس اصولی طور پر پسند نہ کرے اور بہت ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا مسئلہ کھڑا کر دے جس پر باہمی اتفاق نہ ہونے کی صورت میں کمیونل ایوارڈ کی طرح انگریز کا کوئی فیصلہ بھی تسلیم کرنا پڑے۔ اُدھر مسلمانوں کی طرف سے گذشتہ کانفرنس میں مسٹر محمد علی جناح نے اس لیے شرکت نہ کی تھی کہ وہ سیاست سے بیزار ہو کر انگلستان چلے گئے تھے اور وہاں وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اور تیسری کانفرنس میں بھی انہوں نے شرکت نہ کی حالانکہ وہ انگلستان میں موجود تھے۔ وہ گاندھی کے رویہ سے سخت نالاں تھے۔ تاہم اُن کی تمام تر نیک خواہشات مسلم لیگ کے وابستہ تھیں۔

اس کانفرنس میں کوئی اہم کام سرانجام نہ پایا۔ صرف تین کمیٹیوں نے جن میں اتفاق رائے دہی کمیٹی۔ وفاقی مالیاتی کمیٹی اور ریاستوں کے امور کی کمیٹی شامل تھی، تو اپنی رپورٹ

پیش کرنا تھی۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹوں پر چند دن غور ہوتا رہا اور بالآخر ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو یہ کانفرنس اختتام پذیر ہوگئی۔ اس کانفرنس کے علاوہ برطانوی ضرب اختلاف نے بھی شرکت نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں جو اصلاحات نافذ کی جارہی ہیں وہ ضرورت سے زیادہ ہیں۔ حالانکہ یہ اعتراض حقیقت کے بالکل برعکس تھا۔ وہ آئینی اصلاحات جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نافذ کی گئیں اگرچہ سے اُن کی توقع کم ہی تھیں لیکن وہ مطالبات سے کم تھیں۔ ان اصلاحات کو ہندوستان کی آزادی کی طرف ایک اہم قدم ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس کے بعد ایک قرطاس ابیض "WHITE PAPER" شائع کیا گیا جس میں تینوں کانفرنسوں کی کاروائیوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس اشاعت مارچ ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور اگلے سال اس کو برطانوی پارلیمنٹ میں برائے بحث و تمحیص پیش کیا گیا۔ قرطاس ابیض میں کچھ ٹھوس نوعیت کی سفارشات بھی کی گئیں۔ ان سفارشات پر تفصیلی بحث کے بعد آئین سازی کے لیے مشترکہ کمیٹی بنا دی گئی جس میں دونوں ایوانوں سے سولہ سولہ نمائندوں کے علاوہ ۱۹ ہندوستانی ۷ ہندی ریاستوں اور ۱۲ برما کے نمائندوں کو شامل کر مسودہ تیار کرنے کی غرض سے نامزد کیا گیا۔ ۱۹ ہندوستانی نمائندوں میں ۵ مسلمان نمائندے تھے۔ اس کمیٹی نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء تک اپنی کاروائی مکمل کرلی اور اپنے مسودہ آئین کو آخری شکل دے کر فروری ۱۹۳۵ء کو آخری صورت دے کر منظور کروالیا۔ شہنشاہ برطانیہ نے ۲۴ جولائی ۱۹۳۵ء کو اس قانون پر دستخط کر دیئے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نام سے نافذ ہوا۔

اگر تینوں گول میز کانفرنسوں کو بہ نظر غور دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کانفرنسوں کی کامیابی کے لیے اگر کسی نے خصوصی کام کیا تو وہ محض مسلم لیگ تھی۔ کیونکہ مسلم لیگ نے تینوں کانفرنسوں میں مسلسل شرکت کی اور اس کے برعکس کانگرس نے دو مرتبہ اس کا مقاطعہ کیا اور ایک دفعہ جو شرکت کی تھی تو محض فساد ڈالنے کے لیے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کے تیسرے دور میں برطانوی ضرب اختلاف بھی اس سے علیحدہ ہوگئی اور اس کی وجہ یہ تھائی کہ انگریز ہندوستانیوں کو ضرورت سے آئینی مراعات دے رہا ہے۔ حالانکہ وہ یہی بات کانفرنس میں شریک ہو کر بھی کہہ سکتے تھے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت بالکل عیاں ہوگئی تھی کہ انگریز اب کسی

نہ کسی طریقے سے ہندوستانیوں کی آئینی حکومت بنانے کو تیار ہوگیا تھا۔ اور خود اس آئینی حکومت کے نفاذ کے لیے بے قرار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کانفرنس کے بہت سے مسائل کو حل کرنے کے لیے اس نے خود کو کبھی کانگرس کا ہم فریق گردانا اور پہلی کانفرنس میں نمائندوں کی عدم موجودگی میں اس کے موقف کو خود بیان کیا اور پھر دوسری کانفرنس میں کانگرس کی ہٹ دھرمی کو کمیونل ایوارڈ دے کر توڑ بھی دیا۔ کیونکہ انگریز خود چاہتا تھا آئینی خلفشار کا معاملہ کسی نہ کسی صورت میں اندازِ حسن حل ہو جائے۔ اور ملک میں امن وامان قائم ہو اس لیے ہم نہایت محتاط ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ گول میز کانفرنس مسلمانوں کی کامیابی کی دلیل تھیں کیوں کہ دگرگوں حالات اور دو طرفہ مخالفت کے باوجود ان کی آواز برطانیہ کے دونوں ایوانوں کو بلند ہوگئی اور تاجدار برطانیہ ہندوستان کے عوام کو حکومت کے کاموں میں شریک کرنے پر رضامند ہوگیا۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی کا آغاز ہندوستان کی سیاست میں زبردست افراتفری پیدا کرنے کا دَور ثابت ہوا تھا۔ چاروں طرف سیاسی خلفشار برپا ہو رہا تھا۔ انگریز حاکم حالات کو مناسب صورت میں درست اور پر امن رکھنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن ہندوستان کے لوگ اب انگریز کو مار بھگانے کے ہی درپے ہو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مہاتما گاندھی کئی رخی سیاست بل بوتے پر ہندوستان کے عوام کو اشاروں پر نچا رہے تھے۔ وہ مسلمانوں سے ملتے تو اپنی تمام ترہمدردیاں انہیں کے لیے وقف ظاہر کرتے اور ہندوؤں سے ملتے تو وہ تمام تر ان کے لیے تھے۔ اچھوتوں کا سامنا ہوتا تو خود کو ان کی بھی خدمت کے لیے کوشاں ظاہر کرتے۔ انہیں تو انگریز سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک نئی ہندو مملکت کے حصول سے غرض تھی۔ ان کی راہ میں حائل ہونے والے مسلمان راہنما بھلا کس طرح اچھے لگتے پھر مسٹر محمد علی جناح اور علامہ اقبال جیسے مقتدر مدبر اور بے مثال متفکر اور قانون دان ان کو تو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ تاہم انہیں ملک کی ہندو اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے انہوں نے لارڈ ارون جیسے نرم طبیعت وائسرائے کو زیر اثر کیا ہوا تھا۔ لارڈ ارون اپریل ۱۹۳۱ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگڈن نے لے لی۔ لارڈ ولنگڈن لارڈ ارون کے مقابلہ میں سخت گیر اور رعابہ دار وائسرائے تھا اور اُسے ہندوستان کے حالات سے بخوبی آگاہ کر کے روانہ کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے حسب عادت نہایت خشک اور رعب دار انداز میں ایک تار لارڈ ولنگڈن کو حسب ذیل متن کا ارسال کیا۔

"صوبہ سرحد اور یوپی کے نئے آرڈی ننس، صوبہ سرحد میں فائرنگ اور دونوں صوبوں میں میرے عزیز دوستوں کی گرفتاریاں۔ یہ اچانک ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ جن کو میں قطعی پسند نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کو حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے کانشان سمجھوں یا ابھی آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے مل کر کچھ راہنمائی حاصل کر دوں کہ مجھے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے اور کانگرس کو کیا مشورہ دینا چاہیے۔

یوپی میں لوگوں نے مالیہ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ اور عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک کی رہنمائی پنڈت نہرو کر رہے تھے۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان نے پنڈت نہرو کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ اِس بنا پر حکومت نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا تھا۔

لارڈ ولنگڈن کو جب اس تار کا علم ہُوا تو انہوں نے نہ صرف زبردست ناپسندیدگی کا اظہار کیا بذاتِ خود اس کا جواب دینا بھی گوارہ نہ کیا۔ اِدھر مہاتما گاندھی کا خیال تھا۔ کہ لارڈ ولنگڈن میرے اس تار سے بہت متاثر ہو گا اور مجھے فی الفور ملاقات کے لیے بلاتے گا لیکن لارڈ ولنگڈن نے اِن کی توقعات برعکس کیا۔ سیکرٹری کو ہدایت کی کہ وہ اپنی طرف سے مہاتما گاندھی کو واضح جواب دے۔ جو جواب مہاتما گاندھی کو اپنے تار کے عوض ملا۔ اس کا متن حسبِ ذیل تھا۔

وائسرائے نے فرمایا ہے کہ وُہ اور اُن کی حکومت تمام سیاسی جماعتوں سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یوپی اور سرحد میں کانگرس کی سرگرمیاں ان کے دوستانہ تعلقات کے منافی ہیں۔ جن کا ہندوستان سے مفاد تقاضا کرتا ہے۔ وائسرائے کی طرف سے اس خشک جواب سے مہاتما گاندھی کی توقعات اگرچہ خاک میں مِل گئیں۔ قوم کے سامنے وُہ کیا منہ دکھاتے چنانچہ اپنے ہٹ دھرم رویہ کے تحت اپنا راگ الاپتے ہی رہے اور وائسرائے کو اپنے مطالبات پیش کرتے ہی رہے۔ جس کا انہیں حوصلہ افزا جواب نہ مِلا۔ تنگ آکر انہوں نے تحریک سول نافرمانی چلائی اور اس خطرناک حد تک بڑھائی کہ عورتوں کو بھی اس سلسلے میں مسلح کر کے میدانِ سیاست میں لاکھڑا کر دیا بنگال میں مسلم دہشت گردی شروع ہو گئی۔ مہاتما گاندھی گرفتار کر لیے گئے۔"

مسلمانوں نے شروع سے لے کر آخر تک انگریز کے خلاف آئینی جنگ ہی لڑی ہے البتہ جب کہ کانگرسی لیڈروں کے مقابلے میں مسلم لیگی رہنماؤں کو بہت کم جیل جانا پڑا ہے۔

اگر کہیں مسلم لیگیوں کو جیل میں ٹھونسا بھی گیا ہے تو وہ محض انگریز کی سینہ زوری اور تحکم کی بنا پر۔ ورنہ مسلمانوں نے ہمیشہ قانون کے دائرے میں رہ کر انگریز کو مارا ہے۔ انگریز کے سخت رویے کی بنا پر۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بے اطمینانی بڑھتی جارہی تھی اور کانگرس کے رویے نے انہیں انگریز سے اور بھی زیادہ بدظن کر دیا تھا۔ اور یہ ساری بے چینی کا علم وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو بخوبی تھا لیکن وہ محض حالات کی رفتار کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ آخر کار برطانوی وزیر اعظم کی سرد مہری کو دیکھ کر مسلمانوں نے ڈائریکٹ ایکشن کی مہم شروع کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ لارڈ ولنگڈن کو اس پروگرام کا پتہ چل گیا۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر مسلمان نے ڈائریکٹ ایکشن شروع کیا اور ادھر کانگرس کی تحریک سول نافرمانی جاری رہی تو انگریز کو دو مختلف سیاسی جماعتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے احرار جیسی جماعتیں میدان سیاست میں کود پڑیں گی اور نظام حکومت میں زبردست خلل واقع ہو جائے گا۔ اس بات کا وائسرائے پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے معلوم کیا کہ ڈائریکٹ ایکشن کے لیے کس دن تحریک پیش ہونے والی ہے اسے بتایا گیا کہ مسلم کانفرنس کا اجلاس ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو ہونے والا ہے۔ اور اسی میں یہ قرارداد پاس ہو جائے گی۔ چنانچہ وائسرائے نے اس تاریخ کے دو دن پہلے ہی یعنی ۱۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو ایک سرکاری اعلان جاری کیا کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے بارے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے بہت جلد فیصلے کا اعلان کیا جانے والا ہے۔ اس لیے کسی سیاسی جماعت کو کوئی ایسا قدم اٹھانے سے احتراز کرنا چاہیے جس سے ملکی معیشت کو نقصان پہنچے۔ ۲۱ مارچ کو مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں قرارداد ڈائریکٹ ایکشن کے بارے میں طے پایا کہ حکومت کی موجودہ یقین دہانی کے پیش نظر مسلم لیگ کو جون ۱۹۳۲ء تک سرکاری اعلان نہ آیا۔ لیکن علامہ نے اپنے رسوخ سے اجلاس ملتوی کرا دیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس مسئلے پر انگلستان میں زبردست غور و فکر ہو رہا ہے اور اعلان بہت جلد ہو رہا ہے۔

بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم برطانیہ کی طرف سے "کمیونل ایوارڈ" کا اعلان کر دیا گیا۔ اس ایوارڈ میں جداگانہ انتخاب اور نشستوں کے تحفظ کا اصول برقرار رکھا گیا تھا۔ پس ماندہ اقوام۔ سکھ۔ ہندوستانی عیسائی اور یورپین فرقوں کے لیے علیحدہ نشستوں کا تحفظ دیا گیا تھا۔ مفادات کی بنیاد پر زمینداروں تاجروں اور مزدوروں کے لیے بھی نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

الہ صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے ان کی نشستیں علیحدہ محفوظ کر دی گئیں۔ لیکن جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں نشستوں کی تقسیم کچھ اس انداز سے کی گئی کہ مجموعی طور پر مسلمان زبردست خسارے میں رہے۔ مثلاً صوبہ پنجاب کی کل آبادی میں ۵۷ فیصدی آبادی مسلمانوں کی تھی۔ لیکن نشستوں کی تخصیص صرف ۴۹ ٪ کی گئی جو سراسر ناانصافی تھی۔ اس کے برعکس سکھوں کی آبادی کل آبادی کا صرف ۳ ٪ حصہ تھی۔ لیکن انہیں ۱۸ فیصدی کے لحاظ سے نشستیں دی گئیں۔ اس منطق و ریاضی کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ یہ کون سی بنیاد پر طے پایا گیا ہے۔

اسی طرح بنگال میں جہاں مسلمانوں آبادی کل آبادی کا ۵۵ فیصد حصہ تھی۔ انہیں صرف ۴۸ فیصد نشستیں دی گئیں۔ اس طرح انگریز نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان کو نقصان پہنچانے میں ایک زبردست موثر کردار ادا کیا۔

فرقہ وارانہ فیصلے کے تحت ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جملہ نشستوں اور مسلمانوں کے لیے مخصوص کی گئی نشستوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

مدراس	۲۱۰	میں سے	۲۹
بمبئی	۱۷۰	" "	۳۰
بنگال	۲۵۰	" "	۱۱۹
یوپی	۲۲۸	" "	۶۶
پنجاب	۱۷۵	" "	۸۶
بہار اور اڑیسہ	۱۷۵	" "	۴۲
سی پی	۱۱۲	" "	۱۴
آسام	۱۰۸	" "	۳۴
صوبہ سرحد	۵۰	" "	۳۶

وزیر اعظم برطانیہ کا یہ اعلان صرف صوبائی نمائندگی کے بارے میں تھا۔ متصل اعلان جس میں مرکزی اسمبلی کے متعلق فیصلہ ابھی باقی تھا اور مسلم لیگ و کانگرس کے دوسرے مطالبات بھی زیر غور تھے۔ ہونا ابھی باقی تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۳۲ء والے اس اعلان سے مسلمانوں کی توقعات اور مطالبات پر پراوس پڑگئی۔ کیونکہ انگریز نے اس میں بھی ڈنڈی مار کردار ادا کیا تھا۔ تاہم حالات کا تقاضہ کچھ

ایسا تھا کہ مسلمان اس فیصلے کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے اور انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ ۲۰ اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں طے پایا گیا کہ مسلم لیگ کو حکومت کی طرف سے کمیونل ایوارڈ کے باقی ماندہ حصے کا بھی انتظار کرنا چاہیے، چنانچہ کمیونل ایوارڈ کے باقی ماندہ حصے کا بھی اعلان ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کر دیا گیا۔ کمیونل ایوارڈ کے مندرجہ ذیل کے نکات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ ہر فرقہ کے جداگانہ نمائندگی کے حق کو تسلیم کر دیا گیا۔ اور انہیں متناسب نمائندگی دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں آباد بڑی قوموں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ اچھوتوں اور عیسائیوں کو بھی متناسب نمائندگی کا حق مل گیا۔

۲۔ مسلمانوں کو مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں ہر جگہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے نمائندگی دینا منظور کر لیا گیا۔

۳۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب پورے ایوان کا ایک تہائی مقرر کر دیا گیا۔

۴۔ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انہیں آبادی کے تناسب سے زائد نمائندگی کی وہی رعایت دی جائیگی جو انہیں ۱۹۱۶ء کے لکھنو پیکٹ میں حاصل تھی۔

۵۔ سندھ کو غیر مشروط طور پر بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنانا منظور کر لیا گیا۔

۶۔ مرکزی ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے ایک چوتھائی حصہ مقرر کر دیا گیا حالانکہ مسلمان کا مطالبہ ایک تہائی حصے کا تھا۔

کمیونل ایوارڈ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ایک کھلا اعلان تھا اور اس میں مسلمانوں کے نہ صرف مطالبات کو ٹھکرا دیا گیا بلکہ ان کے حقوق کو بھی پامال کر دیا گیا۔ اس ایوارڈ میں بالواسطہ انداز میں ہندوؤں کی سرپرستی کی گئی اور پنجاب اور بنگال جیسے مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلم نمائندگی کے لیے نشستوں کو جان بوجھ کر کم کر دیا گیا۔

ہندوستانی عیسائیوں اور اینگلو انڈین لوگوں کو ان کی تعداد سے کہیں بڑھ کر نمائندگی دی گئی۔ مثلاً ان لوگوں کی نسبت ایک فیصد کے لگ بھگ تھی لیکن انہیں دس فیصد کے حساب سے نمائندگی دی گئی جو انصاف کے سراسر منافی ہے۔ حکومت برطانیہ نے جان بوجھ کر ہندوستان کے عوام کو عالم تحیر میں پھنسائے رکھا اور کمیونل ایوارڈ کے اعلان کو ٹالتے ٹالتے اتنا وقت ضائع کر دیا کہ ہندوستان بدامنی کا شکار ہو گیا۔

پونا پیکٹ ۱۹۳۲ء

کیمونل ایوارڈ جس کا اعلان اگست ۱۹۳۲ء میں کیا گیا تھا کہ تحت ہندوستان کے اچھوتوں کو حق رائے دہی کے علاوہ حق متناسب نمائندگی بھی مل گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان اچھوتوں کے منتخبہ نمائندے ہندو نمائندوں کے ہمراہ اسمبلی کی سیٹوں پر براجمان ہونے کے اہل قرار دے دیئے گئے تھے۔ مسلمان چونکہ زبردست کشادہ دل اور فراخ ذہن کا مالک ہے اور اس مذہب انسانی مساوات کا درس دیتا ہے۔ چونکہ اس کے لیے ایوارڈ کی اس شق پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا لیکن ہندو جو چھوت چھات کا سب سے بڑا بیمار ہوتا ہے۔ اس امتزاج کو برداشت نہ کر سکا۔ اسکے نزدیک اچھوتوں سے ملنا مذہبی طور پر منع ہے۔ وہ اچھوتوں کو انسانی اقدار سے بہت نیچے درجے کا افراد خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اچھوت کا بھٹک جانا بھی "پاپ" کے مترادف ہے۔ چنانچہ اچھوتوں کی متناسب نمائندگی کو ہندو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

مہاتما گاندھی سول نافرمانی کی تحریک کی بنا پر لارڈ ولنگڈن کے حکم سے جیل میں تھے۔ اور جیل میں ہی انہیں کمیونل ایوارڈ کی خبر ملی۔ یہ خبر ان پر برق سوزان کی طرح گری اور وہ اسے سنتے ہی نہ صرف تلملا اٹھے بلکہ اُن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اب زیادہ دیر تک اپنے اس جھوٹے پر دپیگنڈے سے پردہ نہ ڈال سکے جس میں وہ اور اُن کے حواری یہ کہتے رہتے تھے کہ ہم تو ہندوستان کے باسیوں کے لیے سوراج مانگتے ہیں۔ اور ہم کو نہ تو مذہب کی پابندی ہے۔ نہ ذات پات کی کیونکہ ہندوستان کے باسیوں کے لیے ایک جیسی آزادی چاہیے"۔

لیکن ہندو کی اصل دُم پر جب پیر آتا ہے تو وُہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا منہ کس کی ٹانگوں پڑ رہا ہے۔ وہ فی الفور کاٹنے کو پڑتا ہے۔

اس دفعہ مہاتما گاندھی جو چلائے تو انہوں نے اپنا منہ برطانوی کابینہ میں وزیر ہند کی طرف کیا اور انہیں ایک زہریلے خط میں جو انہوں نے جیل ہی میں ڈرافٹ کیا تھا لکھا کہ برطانوی حکومت کے کمیونل ایوارڈ کا یہ فیصلہ کہ اچھوتوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے متناسب نمائندگی حاصل ہوگی، سراسر غلط ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی عقائد پر سب سے بڑی ضرب ہے۔ اگرچہ یہ امر قابل تسلیم ہے کہ ہندوستان میں اچھوتوں کی تعداد برہمنوں اور کشتریوں سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود برہمن یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے

کہ کوئی اچھوت اُن کے نزدیک آکر بیٹھ جائے۔ مہاتما گاندھی اس بات کو دانستہ بھول گئے کہ ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کی حمایت میں اگر انہیں اکثریت حاصل ہوئی ہے تو وہ انہیں زیادہ تر اچھوتوں کے ووٹ پر ہوئی ہے۔ بلکہ ہندوؤں کے سب سے بڑے مہابھائی "مونجے" نے ۱۹۲۹ء میں بالکل واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کے ملک کی حفاظت صرف اچھوت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اچھوت تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ان میں بہادری اور بے باکی کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے برعکس کھشتری جو تعداد میں ویسے بھی بہت کم ہیں اور برہمن جو صرف خود کو حکمران ٹولہ تصور کرتے ہیں میدان جنگ میں رہنے والے ملک کے تحفظ کے لیے ایک لمحہ بھی کھڑے نہیں ہو سکتے اس لیے اچھوتوں سے نفرت اپنے تحفظ کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس قسم کے خیالات ہونے کے باوجود اور ان حقائق کے ہوتے ہُوئے بھی مہاتما گاندھی آخر کار انتہائی تعصب کا مظاہرہ کرنے سے باز نہ رہے۔ بلکہ مہاتما گاندھی کے اس خط نے تو ان کی ہندوستان کے تمام اقوام کے مطلوبہ آزادی کے مطالبے کی قلعی کھول دی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو پتہ چل گیا۔ کہ جو شخص خود اپنے اچھوتوں (جو دراصل اسی دھرم کے پیروکار ہیں) سے اس قدر تعصب اور تنفر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ سے (جو اُن کی نظر میں ان کے جاتی اور ازلی دشمن ہیں) کب اچھا سلوک کر سکتا ہے۔ یا ان سے کب خلوصِ دل کے ساتھ وفاداری کر سکتا ہے۔

بہرحال مہاتما گاندھی نے وزیر ہند کو لکھا کہ کمیونل ایوارڈ میں اچھوتوں کو دی گئی یہ رعایت ہندؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ ہندو کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کونسلوں میں اچھوتوں کو نمائندگی ملے۔ اچھوتوں کو حق رائے دہی تک ہی محدود رکھنا درست ہے اس سے آگے وُہ کاروبار سلطنت میں حصّہ لینے کے مجاز نہیں قرار دینے چاہیں۔ مہاتما نے اس کے ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر ان کا یہ مطالبہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء تک تسلیم نہ کیا گیا تو وُہ ترن برت "بھوک ہڑتال تادم مرگ" رکھیں گے اور لوٹ واقع ہونے کی تمام ذمہ داری حکومت برطانیہ پر ہوگی۔

مذہبی طور پر تمام اچھوت ہندو عقائد کے ماننے والے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور انکی تہذیب و تمدن تمام تر ہندو مذہب کے مطابق ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں جب ہندوستان کی مردم شماری ہوئی تو مسلم لیگ نے مطالبہ کیا تھا کہ اچھوتوں کو مذہبی لحاظ سے ان کے

ذات میں تسلیم کیا جائے تاکہ ہندوؤں کی اصل تعداد معلوم ہو سکے۔ اگرچہ یہ تجویز ٹھوس اور قابلِ عمل تھی لیکن اس وقت ہندو اخبارات نے اس پر بے حد برہمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تاہم اچھوتوں کو ہندو ہی تصور کیا گیا۔

مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ ایک تو میں جیل میں ہوں۔ دوسرے تحریک سول نافرمانی تیزی پر ہے۔ اس سے حکومت متاثر ہو گی اور وہ دباؤ محسوس کر کے ان کا مطالبہ تسلیم کرے گی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوؤں کے عقائد پر لگنے والی یہ ضرب ہندوؤں میں زیادہ تحریک پیدا کرے گی جس کا حکومت ہند کو احساس ہو گا اور اس احساس کے پیش نظر وہ ان کا مطالبہ تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے گی۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ ۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کو مہاتما گاندھی کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا۔ حکومت کا یہ فیصلہ ہندو لیڈر کے منہ پر زبردست تھپڑ کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ قطعی طور پر برداشت نہ کر سکتے تھے۔ رعب اور عدم تعاون کی دھمکیوں میں ناکام ہو کر بیرون جیل ہندو لیڈروں نے اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کو مختلف قسم کے ہتھکنڈوں سے ورغلانا شروع کر دیا اور اس کو متعدد نوعیت کے سبز باغ دکھائے۔ ہندوؤں کی طرف سے مسٹر راجا جو ایک متعصب کانگرسی تھے اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر (Dr. AMBEDKAR) مغلوب ہو گیا۔ چنانچہ پونا پیکٹ کو پونا کے مقام پر ایک معاہدہ طے پایا (جو اچھوتوں اور ہندوؤں کے درمیان ہوا۔)

اس معاہدے کے تحت اچھوت اپنے اس حق سے دست بردار ہو گئے جو انہیں کمیونل ایوارڈ کے تحت ملا تھا اور جس کے مطابق انہیں جداگانہ حق انتخاب حاصل تھا۔ البتہ مخلوط انتخاب کے ذریعے تحفظات کے ساتھ چند ایک نشستیں ان کے لیے مخصوص کر دی گئیں۔ اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ جو اچھوت تعلیمی استعداد بڑھا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اس کے لیے انتخاب میں حصہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔ آخر میں یہ بھی کہا گیا کہ مختلف ہندو اداروں میں سے اچھوتوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص رقم رکھی جائے گی۔ اور یہ بات اچھوتوں کی کم ظرفی سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ اور کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان اس متفقہ معاہدے کو حکومت ہند کے سامنے پیش کیا تو حکومت نے بلا تامل منظور کر لیا۔ اس کی فی الفور منظوری بھی اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ انگریز کو اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ اچھوتوں کا دینے حق سے دستبردار ہو جانا دراصل ہندو

کی دیوار مخاصمت جو اس نے مسلمانوں کے خلاف تعمیر کرنا شروع کر دی ہوئی ہے میں زبردست تقویت کا موجب بنے گی۔ اس لیے اس نے اس معاہدے کو بلاحیل وحجت تسلیم کر لیا۔ لیکن انگریز کو شاید یاد نہیں رہا تھا کہ مسلمان تو ۱۹۱۰ء میں بذات خود اچھوتوں کو ہندو قرار دینے کی ایک تحریک چلا چکے ہیں۔ اور جس کے تحت ان اچھوتوں کو مردم شماری میں ہندو مذہب کا پیرو کار تسلیم کر لیا گیا ہوا تھا۔ چنانچہ انگریز کے اس بعض نے بھی ہندو کے اس پروپیگنڈے کو فیل ہونے سے بچا لیا جس کے تحت وہ لا مذہبی اقدار کا پابند کرتا ہوا ہندوستان کی آزادی کا طلب گار بنا ہوا تھا۔ اگر انگریز اس معاہدے کو رد کر کے اپنے فیصلے کا اطلاق جاری رکھتا تو بہت ممکن ہے کہ خود ہندو قوم ایک زبردست خلفشار کا شکار ہو جاتی۔ لیکن انگریز نے اس کو اس یقینی بحران سے محفوظ رکھنے میں عملی طور پر زبردست مدد کی۔[1] جیسے کہ وہ مختلف معاملات میں بالواسطہ کرتا چلا آرہا تھا۔

باب ۱۹

کانگریسی وزارتیں

حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت برصغیر میں اصلاحات نافذ کیں۔ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس قانون کو مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ کے رہنما قائد اعظم محمد علی جناح نے اس کو انتہائی فرسودہ از کار رفتہ اور ناقابل قبول قرار دیا اور کہا کہ اس پر عمل درآمد کرنے سے ہندوستان کے مفادات پر مہلک اثرات پڑیں گے۔ کانگریس نے بھی اس کو مسترد کر دیا۔ مسٹر جواہر لال نہرو نے کہا کہ دستور ہندوستان کی غلامی کے لیے ایک فرمان ہے۔ لہٰذا اس کو ٹھکرا دینا چاہیے۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو مسترد کر دیا۔ لیکن اس دستور کے تحت ہونے والے انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ دستور جیسا بُرا بھلا بھی ہے اس کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ مسلمانوں کو مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ کانگریس انتخابات میں اس لیے حصّہ لے رہی تھی کہ اسمبلیوں میں جا کر اس دستور کو ناکام بنایا جائے۔

مسلم لیگ کا منشور

۱۔ صوبوں میں مکمل حکومت خود اختیاری رائج کیا جائے۔

۲۔ تمام ظالمانہ اور جابرانہ قوانین کو منسوخ کرانے کی بھرپور کوشش۔

۳۔ فوج کو قومی فوج بنانا اور اس کے اخراجات میں کمی کرنا۔

۴۔ صنعتوں کو فروغ دینا۔

۵۔ مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ کرنا۔

۶۔ ایسے اقدامات کی مخالفت کرنا جن سے ہندوستان کے مفادات مجروح ہوتے ہیں۔

۷۔ مرکزی اور صوبائی انتظامیہ کے اخراجات میں کمی کرنا۔

۸۔ اسمبلیوں میں دوسری جماعتوں سے مل کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے

کام کرنا۔

۹۔ بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت کرنا۔

۱۰۔ ٹیکس کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کرنا

۱۱۔ مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا۔

۱۲۔ کسانوں کو قرضوں کے بوجھ سے نجات دلانے کے لیے رقوم مخصوص کرنا۔

۱۳۔ اردو رسم الخط اور اردو زبان کا تحفظ کرنا۔

کانگریسی منشور

کانگریس نے بھی کم بیش یہی مقاصد اپنے منشور میں رکھے تھے صرف اردو زبان کا مسئلہ متنازعہ تھا پھر جداگانہ انتخاب کا سوال تھا جداگانہ طریق انتخاب کو کانگریس ۱۹۱۶ء میں معاہدہ لکھنؤ کے تحت بڑی خوشی سے تسلیم کر چکی تھی زبان کے مسئلہ پر مسلم لیگ اردو زبان اور رسم الخط کے تحفظ پر اڑی ہوئی تھی جب کہ کانگریس ہندی زبان کو قومی زبان بنانے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ بہر حال اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ان باتوں میں اختلاف صرف زبان کے مسئلہ پر تھا۔ جداگانہ انتخاب کے مسئلہ کو تو وہ بہت پہلے مان چکے تھے۔ اور اب اس کی مخالفت کرنا سراسر غیر اخلاقی تھا۔ مگر افسوس کہ کانگریس نے مسلم لیگ کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اگر کانگریس نے اس پیش کش کو قبول کر لیا ہوتا تو دستوری اختلافات کی صورت حال بدل گئی ہوتی۔

انتخابات ۱۹۳۷ء

۱۹۳۷ء میں انتخابات ہوئے۔ انتخابات میں ووٹروں کی کل تعداد ۳۵ ملین تھی جس میں سے کانگریس نے ۱۵ ملین ووٹ حاصل کیے کل نشستوں کی تعداد ۱۷۷۱ تھی۔ اس میں سے کانگریس نے ۷۰۶ نشستیں حاصل کیں۔ ہندو نشستوں میں سے ۲۱۱ نشستوں پر غیر کانگریسی قابض ہو گئے۔ انتخابات نے کانگریس کا پول کھول دیا۔ مسلمانوں کی نمائندہ بننا تو درکنار یہ ہندوؤں کی بھی پوری نمائندہ نہ تھی۔ جہاں تک مسلمانوں کی نمائندگی کا تعلق ہے کانگریس نے ۴۸۲ مسلم نشستوں میں سے ۵۸ پر امیدوار کھڑے کیے اور ان میں سے ۲۶ سیٹیں حاصل کیں۔ گویا اس دعویٰ کی بھی قلعی کھل گئی کہ مسلمانوں کی صحیح نمائندہ کانگریس ہے۔ اگر سر فضل حسین، سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کو کانگریس کے کیمپ میں نہ دھکیلتا تو کانگریس کو یہ ۲۶ نشستیں بھی نہ ملتیں یا ہمیں ان صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے اور کانگریس ہندو وانہ ذہن لوگوں کے سامنے عیاں تھا یہاں کانگریس کو شا لی شکست ہوئی۔ یو پی سے کوئی کانگریسی مسلمان منتخب نہ ہو سکا۔ صرف ایک کانگریسی مسلمان یونیورسٹی کی مخلوط انتخاب والی نشست سے کامیاب ہوا۔

مسلم لیگ نے مسلمانوں کی نمائندگی کا جو دعویٰ کیا تھا۔ اس کا بھرپور ثبوت بھی مسلم لیگ نہ دے
سکی۔ مسلم لیگ ۴۸۲ میں سے صرف ۱۰۲ پر کامیابی حاصل کر سکی۔ مسلم لیگ کی ناکامی کا سبب وہ مسلمان
قائدین تھے۔ جنہوں نے پنجاب، بنگال، اور سندھ میں مقامی سیاست کے تقاضوں کے تحت مختلف
تنظیمیں تیار کی تھیں۔ اور وہ ملکی سیاست کی بجائے مقامی سیاست کا نقطہ نظر سے سوچتے تھے۔
کانگریس نے ہندو سرمایہ داروں کی مکمل حمایت اور مالی تعاون سے انتخاب میں حصہ لیا تھا اور
اس کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اسے بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کی مکمل تائید حمایت حاصل ہے لیکن
۱۹۳۷ء کے انتخابات نے اس کی بنیادیں ہلا دیں۔ پنجاب میں ۸۵، میں سے ۱۸، بنگال میں ۲۵۰ میں سے
۶۰ اور سندھ میں سے ۸ نشستیں حاصل ہوئیں۔

صوبوں میں وزارتوں کی تشکیل

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔ جن میں یو۔پی
مدارس، سی۔پی، بہار اور اڑیسہ کے صوبے شامل تھے۔
بمبئی میں اس کو تقریباً نصف نشستیں حاصل ہوئیں۔ متعلقہ گورنروں نے اپنے اپنے صوبے کی
اسمبلیوں میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کے لیڈروں کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ لیکن انھوں نے
جواب دیا کہ ہمیں اس بات کی یقین دہانی کروائیں کہ گورنر اقلیتی قوتوں کے تحفظ کے سلسلے میں اپنے خصوصی
اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ جو وزیر چاہیں گے اس کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔ یاد رہے
کہ ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت گورنروں کو اقلیتی قوتوں کے حقوق کے تحفظ کے خصوصی اختیارات
حاصل تھے اور وہ اس بات کے بھی ذمہ دار تھے کہ اقلیتی قوتوں کے منتخب نمائندوں کو اکثریت پارٹی میں
معقول حصہ دلائیں۔ تاکہ وہ بھی حکومت میں شریک ہوں۔ گورنروں نے یقین دہانی کرانے سے انکار کر دیا
کیونکہ ایسا کرنا قانون کی خلاف ورزی تھا۔ اس پر کانگریس نے وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا اور
وزارت سازی کے سلسلہ میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ آخر گورنر جنرل نے ایک تقریر کی کہ گورنر بلاوجہ اپنے
اختیارات استعمال نہ کریں گے اور وزراء سے نہ الجھیں اور کانگریس سے اپیل کی کہ وہ مجھ پر پورا پورا بھروسہ
کر سکتے تھے۔ اور وزارتیں بنائیں۔ اس تقریر کے بعد، جولائی کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے ایک قرار
داد کے ذریعہ پارٹی کو وزارتیں بنانے کی اجازت دے دی۔ سات صوبوں میں کانگریس نے وزارتیں
بنائیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اڑیسہ میں بسوا ناتھ وزیر اعظم مقرر ہوا۔

۲۔ مدارس میں کانگریس نے ۲۱۵ کے ایوان میں ۱۴۰ نشستیں حاصل کیں اور راجگوپال اچاریہ وزیر اعلیٰ ہے۔

۳۔ بمبئی میں ۱۷۵ ارکان میں سے ۸۴ کانگریسی تھے۔ یہاں پر بی جی کھیر وزیر اعلیٰ بنے۔

۴۔ یوپی میں ۲۲۸ کے ایوان میں کانگریس نے ۱۳۴ نشستیں حاصل کیں اور جی بی پنڈت وزیر اعلیٰ بنے

۵۔ بہار میں ۱۵۲ کے ایوان میں کانگریس نے ۹۱ نشستیں حاصل کیں اور کرشنا سنہا وزیر اعلیٰ بنے۔

۶۔ سی۔پی میں ۱۱۲ کے ایوان میں کانگریس کے ارکان کی تعداد ۷۰ تھی اور مسٹر کھرے وزیر اعلیٰ بنے۔

۷۔ صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی نے ۵۰ کے ایوان میں ۱۹ نشستیں حاصل کیں لیکن جوڑ توڑ کر کے کانگریسی وزارت بنالی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت بنی اور سر فضل حسین وزیر اعلیٰ بنے۔

بنگال میں مخلوط وزارت بنی اور مولوی فضل الحق وزیر اعلیٰ بنے۔

آسام میں بھی مخلوط وزارت بنی اور سعد اللہ خان وزیر اعلیٰ بنے۔

سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعلیٰ بنے۔

انھوں نے ہندوؤں کی مدد سے وزارت بنائی تھی۔

پنجاب میں وزارتیں

پنجاب میں انتخاب ہوئے تو سب سے زیادہ نشستیں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کو ملیں۔ پنجاب میں پارٹی پوزیشن یہ تھی۔ یونینسٹ ۸۸، کانگریس ۱۸، مسلم لیگ ۲، آزاد مسلم ممبر ۴، سکھ ۲۶، آزاد ارکان ۲۷، کل نشستیں ۱۷۵ تھیں۔

پنجاب میں مسلم لیگ کی ناکامی یونینسٹ پارٹی کی وجہ سے تھی۔ سر فضل حسین اگرچہ بظاہر مسلم لیگ کے حامی تھے۔ لیکن وہ یونینسٹ کو مضبوط بنانے کے لیے اس زمانے میں مسلم لیگ کے خاتمہ پر تلے رہے انھوں نے سر ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا صدر بنوانا چاہا۔ لیکن عام مسلمان ان کو اپنا قائد نہیں مان سکتے تھے۔ اسی لیے عبدالعزیز بیرسٹر نے اس کا بروقت سدباب کیا۔ سر فضل حسین نے ملک فیروز خان نون کے ذریعے مسلم لیگ کے خاتمہ کی قرارداد پاس کرانے کی کوشش کی تھی۔ جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کو مناسب نمائندگی کے مسئلہ پر ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ صوبہ میں وزارت سازی کے لیے یونینسٹ پارٹی کے پاس واضح اکثریت موجود تھی۔ سر فضل حسین وائسرائے کونسل کے رکن تھے۔ ان کی ہدایت کے مطابق سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں وہ فوت ہوئے۔ تو ملک خضر حیات ان کے جانشین ہوئے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی

کی وزارت آخر دم تک مضبوط رہی۔

بنگال میں وزارتیں

بنگال اسمبلی میں پارٹی پوزیشنیں حسب ذیل تھیں۔
کل نشستیں ۲۵۰ تھیں، کانگریس ۵۴۔ غیر کانگریسی ہندو ۴۲، آزاد مسلم اراکین ۴۵، مسلم لیگ ۴۰، دوسرے مسلمان اراکین ۴۳، اینگلو انڈین اور یورپین ۳۱ تھے۔ انتخاب میں مخلوط وزارت اپریل ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی۔ جس کے سربراہ کرشک پرجا پارٹی کے سربراہ مولوی فضل الحق تھے وزارت میں آدھے وزیر مسلمان تھے۔ آدھے ہندو تھے۔ وزارت کو کانگریس کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا تھا۔ اس مخالفت کا بہت بڑا فائدہ مسلمانوں کا باہمی اتحاد تھا۔ جو خارجی خطرے کے پیش نظر بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں بنگال کے مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ کی ہائی کمان سے اجازت لیئے بغیر ڈیفینس کونسل کی رکنیت قبول کر لی۔ تو مسلم لیگ نے انھیں مستعفی ہونے کے لیے کہا انھوں نے فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا اور بالآخر کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے ایک نئی مخلوط جماعت بنائی۔ جس میں کرشک پرجا پارٹی کانگریس فارورڈ بلاک عناصر شامل تھے۔ مسلم لیگ نے خواجہ ناظم الدین کو اپنا قائد چن لیا۔ مولوی فضل الحق کی وزارت میں ۵ مسلمان، ۲ فارورڈ کانگریس۔ اس وزارت کی وجہ سے مولوی صاحب مسلم عوام میں غیر مقبول ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں ضمنی انتخاب میں ایک سرکاری امیدوار کو ایک مسلم لیگی نے شکست دی۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں فضل الحق نے وزارت سے استعفیٰ دیا اور خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگی وزارت تشکیل دی۔

آسام میں وزارتیں

آسام اسمبلی میں مختلف پارٹیز کی پوزیشن اس طرح تھی۔ آزاد مسلم اراکین ۹، مسلم لیگ ۹، وادی آسام کے مسلمان ۵، وادی سرما کے مسلمان ۵۔ کرشک پرجا پارٹی ۱، آزاد ہندو ۱۰، مزدور کے نمائندگان ۴، یونائیٹڈ پیپلز پارٹی ۳۔ کاروبار کاشت کار کے مالکان ۲، ہندوستانی عیسائی ۱، آزاد خواتین ۱، یورپین ۹، کانگریس ۳۵،

شروع میں کانگریس نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا تو محمد سعد اللہ خان نے چار رکنی کابینہ بنائی۔ جن میں دو مسلمان، ایک ہندو اور ایک عیسائی تھا۔ سر محمد سعد اللہ خان نے کابینہ میں ردوبدل کر کے اکثریت حاصل کر لی۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں انھیں استعفیٰ دینا پڑا اور گوپی ناتھ بردولائی نے کانگریس کی مخلوط وزارت بنائی۔ جس میں تین مسلمان شامل تھے۔ یہ وزارت مستحکم نہ تھی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری کانگریس وزارتوں کے ساتھ یہ بھی مستعفی ہو گئی۔ تو سر سعد اللہ خان نے نئی کابینہ بنائی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی وزارت پھر ختم ہو گئی اور صوبہ میں وائسرائے راج قائم کر دیا گیا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں سعد اللہ خان نے ایک مرتبہ پھر

وزارت بنائی۔

سندھ میں وزارتیں

سندھ اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد ۶۰ تھی اور پارٹی پوزیشن اس طرح تھی۔

کانگریس ۸، ہندو مہاسبھا ۱۱، آزاد ہندو ۲، کانگریس کی ہم نوا پارٹی ۳، باقی نشستیں مسلمانوں کے مختلف گروپس میں تقسیم ہوئیں۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ سندھ میں پاکستان بننے تک کوئی مستحکم وزارت قائم نہ ہو سکی۔ پہلی وزارت مسلم لیگی لیڈر غلام حسین ہدایت اللہ نے ہندوؤں کی مدد سے بنائی جو ۱۹۳۸ء میں بجٹ کے موقع پر ٹوٹ گئی۔ دوسری وزارت اللہ بخش نے بنائی۔ ۱۹۴۰ء کے اوائل میں یہ بھی وزارت ٹوٹ گئی۔ تو مسلم لیگ نے آزاد مسلم ارکان کو ساتھ ملا کر وزارت بنائی۔ جس کے سربراہ بندے علی خان تھے۔ مارچ ۱۹۴۱ء میں یہ وزارت بھی ٹوٹ گئی اور اللہ بخش نے ایسی وزارت بنائی۔ جس میں مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں یہ بھی برطرف کر دی گئی نئی حکومت ہدایت اللہ نے بنائی۔ جس میں دو مسلم لیگی ارکان بھی تھے۔ خود ہدایت اللہ بھی مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہوا۔

کانگریسی وزارتوں کے مظالم

ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں پر کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں وزارتیں بنائیں اس کانگریس نے ملک کے بیشتر حصے پر برسر اقتدار رہی۔ اس کامیابی سے ان کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ انہوں نے برصغیر میں ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں کے ساتھ بے انتہا ظلم اور ناانصافیاں کیں۔ جن کو اگر بیان کیا جائے تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی تھیں لیکن ان کا مختصر خاکہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ **مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش** کانگریس نے پوری کوشش کی کہ عہدوں وزارتوں اور اسمبلیوں کی ممبری کا لالچ دے کر مسلمانوں کو مسلم لیگ سے برگشتہ کرے اور جب ان ہتھکنڈوں کے باوجود اسے کامیابی نہ ہوئی تو سرکاری روپیہ خرچ کر کے مسلم لیگ کے مقابلہ میں آزاد مسلم لیگ کھڑی کی گئی۔ اس سلسلہ میں پنڈت نہرو نے مسلمان عوام سے رابطہ مہم شروع کی۔

۲۔ مسلمانوں کو حکومت میں شامل کرنے سے انکار

آئین کی رو سے ضروری تھا کہ کانگریس اپنی وزارتوں میں مسلم لیگ کو بھی شامل کرے تاکہ مسلمانوں کو حکومت میں ان کا جائز اور قانونی حصہ مل سکے۔ لیکن کانگریس نے مخلوط وزارت بنانے سے انکار کر دیا اور مسلم لیگ کے ارکان کو توڑ کر کانگریس میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ یو پی میں کانگریس کی طرف سے ابوالکلام آزاد نے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر کو گھٹیا شرائط پر دو وزارتوں کی پیشکش کی۔ شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱۔ یو پی اسمبلی میں مسلم لیگ کانگریس میں شامل ہو جائیں۔

۲۔ اسمبلی میں مسلم لیگ کے اراکین کانگریس میں شامل ہو جائیں۔

۳۔ صوبہ یو پی کا مسلم لیگی پارلیمانی بورڈ توڑ دیا جائے۔ آئندہ مسلم لیگ کوئی امیدوار نامزد نہ کرے اور مسلم لیگ کے ارکان اس نمائندہ کی حمایت کریں جو کانگریس نے کھڑا کیا ہو۔

۴۔ کانگریس پارٹی ان کو کنٹرول کرے گی۔

۵۔ اگر کانگریس اقتدار سے استعفیٰ دے دیں تو وہ بھی اس کی پابندی کریں۔

۳۔ مسلمانوں کی مذہبی رسومات میں مداخلت

کانگریس نے مسلمانوں کی مذہبی رسوم میں بھی رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں۔ محرم اور عید کے موقع پر دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ اور بقر عید پر گائے ذبح پر پابندی لگا دی جاتی۔ نماز کے وقت مسجد کے سامنے ڈھول پیٹے جاتے۔ باجے بجائے جاتے۔ بعض جگہ اذان کی مخالفت کر دی۔ بعض مساجد پر قبضہ کر لیا۔

۴۔ ذبح گاؤ کا مسئلہ

مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کا حق حاصل تھا۔ پنڈت نہرو نے قائداعظم کو خط میں لکھا کہ کانگریس ذبیحہ گائے پر کوئی قانون بنانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ جب کہ گاندھی جی نے کانگریس کے اجلاس میں فرمایا کہ چرخہ چلانا اور گائے کی حفاظت ایک ہی پالیسی کے تحت آتے ہیں اور گاؤ رکھشا کو کانگریسی قرار داد دیا۔ عملاً یہ صورت حال تھی کہ گائے کی ذبح کی اطلاع پاتے ہی ہندو حملہ کر دیتے۔ مردوں بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالتے۔ مکان کو لوٹ لیا جاتا۔ انتظامیہ موقع پر پہنچتی اور مصالحت کروا دی جاتی اور مسلمانوں کو معافی مانگنے کے لیے کہا جاتا۔

۵۔ زبان کا مسئلہ

کسی قوم کی زبان اور رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کے بقا دوام میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ ایک قوم کو دوسری قوم میں بدلنے

کے لیے اس کی زبان اور رسم الخط کو تبدیل کر دیا جاتا ہے تاکہ اسلاف سے اس کا تعلق ٹوٹ جائے کانگریسی حکومت نے اردو کی مخالفت کی اور ہندی کی حمایت کی۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تو ایک مشترکہ قومی زبان ہندوستانی کا ڈھونگ رچایا جس میں اسی فیصد الفاظ ہندی یا سنسکرت کے تھے۔ دراصل ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ گاندھی نے کئی مرتبہ کہا۔ ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے اردو دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے۔ سبھاس چندر بوس جو کانگریس کے صدر تھے کہا کہ ہندی زبان ہندوستانی ہے۔

۶۔ ہندو مسلم فسادات

کانگریسی وزارتیں ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئیں اور یکایک ہندو مسلم فسادات میں اضافہ ہو گیا۔ کانگریسی حکومت نے ہندو مہاسبا کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے مقدمات گول کر دیئے گئے۔ پولیس نے ان کی سرپرستی کی مجسٹریٹوں اور ججوں تک سفارش کی جاتی۔ ناگپور ہائی کورٹ نے ایک مقدمہ میں کانگریسی وزراء کی اس طرح کی حرکت پر ریمارکس بھی دیئے۔

۷۔ ترنگا جھنڈا

کانگریس نے اپنا ترنگا جھنڈا تمام پبلک عمارتوں پر لہرایا۔ حالانکہ پارٹی کے جھنڈے کو سرکاری عمارتوں پر لہرانے کا حق کسی کو بھی نہیں۔ مسلم لیگ کا اپنا جھنڈا تھا۔ جس کو لہرانے پر کبھی کبھی ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ جب قائداعظم نے پنڈت کی توجہ اس طرف مبذول کروائی تو انھوں نے اس کے رنگوں کو خوبصورت قرار دیا اور اس کے برعکس مسلم لیگ کے جھنڈے کو فرقہ وارانہ قرار دیا۔

۸۔ مورتی پوجا

سکولوں میں مہاتما گاندھی کی مورتی کی پوجا کرائی جاتی تھی۔ ہندو بچوں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی مہاتما کی مورتی کے سامنے پوجا پاٹ پر مجبور کیا جاتا تھا۔ پیر پور رپورٹ میں سی پی کے ایک قصبہ کا واقعہ درج ذیل ہے۔ جہاں میونسپل سکولوں میں گاندھی کے یوم ولادت پر ایک خاص تقریب ہوئی بچوں کے ساتھ ان کے والدین کو بھی وہاں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔

۹۔ عدلیہ و انتظامیہ کے کام میں مداخلت

کانگریس کا ہر ممبر اپنے آپ کو حکومت کا ایک رکن سمجھتا تھا۔ عدالتوں کے نام احکام جاری کیے گئے تھے کہ مقدمات کے فیصلے کانگریس کے لیڈروں کی ہدایت کے مطابق کریں حتیٰ کہ یوپی کے چیف سیکرٹری نے اپنے صوبے کے تمام ضلعی حکام کو حکم دیا ہے کہ اپنے اپنے کانگریسی کمیٹی کے عہدیداروں

سے مشورہ کیا کرو۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے ایک مجسٹریٹ کو خط لکھا جس میں تاکید کی کہ اس کی عدالت میں جن کانگریسی ممبروں کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے انھیں بری کر دیا جائے۔

۱۰۔ **بندے ماترم** کانگریس نے برسر اقتدار آتے ہی بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا۔ یہ ترانہ ایک بنگالی ہندو نے لکھا تھا جس ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا گیا تھا اور ان سے نجات پانے کے لیے کہا گیا تھا۔ کانگریس نے اس کو تمام سرکاری و غیر سرکاری تقریبات میں بجانے کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی کے اجلاس میں بھی یہ ترانہ سنایا جاتا تھا۔ قائداعظم نے اس پر اعتراض کیا۔ تو پنڈت نہرو نے لکھا کہ اس کا تعلق ہندو جذبات سے ہے اور یہ قومی ترانہ بن چکا ہے۔ یہ ترانہ ان اسکولوں میں بھی بجایا جاتا تھا جہاں مسلمان بچے پڑھتے تھے اور انھیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بھی ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوں۔ چنانچہ پٹنہ کے طلباء نے اس کے خلاف ہڑتال کر دی تھی۔

۱۱۔ **واردھا سکیم** واردھا سکیم گاندھی کی رہنمائی میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے تیار کی تھی۔ اس سکیم کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ملا کر ایک ہی شکل میں ڈھالنا۔
۲۔ تمام بچوں میں یہ ذہن نشین کرانا کہ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔
۳۔ وطنیت کے جذبات پیدا کرنا۔
۴۔ ہندوستان کی پچھلے زمانے کی عزت ان کے دل میں پیدا کرنا۔

یہ سکیم ۷ سال سے ۱۴ سال تک کے بچوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس سکیم کا مقصد متحدہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر تھا۔ اس کا سارا زور مادیت پر تھا۔ اس کے تحت پرورش پانے والے تمام بچوں میں روحانیت کی بنیاد پر قائم کی تہذیب کے پرورش پانے کا کوئی امکان نہ رہ جاتا۔ کانگریس جمہوریت کا تصور بچوں کے ذہن میں اُتار دیا جاتا۔ وطن کی محبت اور باہمی اتحاد کے نام پر مسلمانوں کو شدھی کرنے کی سکیم تھی۔ مذاہب کو نصاب سے نکال دیا گیا تھا۔

۱۲۔ **ودیا مندر سکیم** صوبہ سی۔ پی میں ایک تعلیمی سکیم پر عمل کیا گیا۔ جس کو ودیا مندر سکیم کہتے ہیں۔ اس کے مصنف صوبہ کے وزیر اعلیٰ پنڈت شکلا تھے جو سی۔ پی کے مسلمانوں نے اس کو نامنظور کر دیا۔ اخبارات اور سیاسی لیڈروں کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی۔ اس سکیم کی خصوصیات مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ اس سکیم کے تحت قائم ہونے والے سکولوں کا نام ودیا مندر سکول ہوتا تھا۔ مندر سے مراد ہنود کی عبادت گاہ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

۲۔ اس سکیم کو شروع میں اختیاری رکھا گیا۔ مگر یہ واضح کر دیا گیا کہ آگے چل کر یہ جبری ہو گی۔

۳۔ ہر ودیا مندر مدرسے کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔

۴۔ ہر ودیا مندر میں ایک ہی مدرس ہو گا۔

۵۔ اس سے گاؤں کے بچوں میں قومی نقطہ نظر بیدار کیا جائے گا۔

۶۔ ودیا مندر کے ذریعہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے گی۔

۷۔ ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں سے تعلق رکھتی تھی۔

۸۔ ودیا مندروں کے لیے اساتذہ کی تربیت کے لیے واردھا میں انتظام کیا گیا تھا۔

جب یہ سکیم صوبائی اسمبلی میں پیش ہوئی تو کانگریسی مسلمانوں نے بھی اس کے حق میں ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔ کانگریسی وزیر محمد شریف صاحب نے بھی اس کی حمایت نہ کی۔ اس سکیم میں سکول کو مندر قرار دیا گیا تھا۔ دیہاتی علاقوں میں تعلیم کی وسیع اشاعت کے لیے مندر ہی میں سکول کھولے گئے۔ ودیا مندر سکول میں ہندوؤں میں تہوار منائے جاتے تھے۔ تعلیم مرہٹی اور ہندی زبان دی جاتی تھی۔ اور سکول ہندکر کے ودیا مندر سکول قائم کئے گئے تھے۔ مندروں میں مسلمان بچوں کو ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھنی پڑتی تھی۔ وہ مندر پوجا اور دیگر رسوم میں بھی شریک کرتے تھے اس کے باوجود وہ اچھوتوں کی طرح رہتے تھے۔ ان کے پانی کا بندوبست الگ تھا۔ ان کے برتن الگ رکھے جاتے تھے۔ الغرض مسلمان بچوں میں سے قومی شعور اور عزت و وقار کے تمام جذبات ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس سکیم کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان بچے اپنے مذہب سے ناآشنا ہو جائیں۔

۱۴۔ **معاشی و سماجی دباؤ** مسلمانوں کو شدھی کرنے کے ساتھ انھیں بدحال کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ہندو مسلمانوں سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ انھیں اچھوت خیال کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں پر معاشی دباؤ کا یہ عالم تھا کہ ٹیکس پالیسی اور درآمد و برآمد پالیسی تشکیل کے وقت ہندوؤں کے مفادات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ معاشی مقاطعہ کا یہ عالم تھا کہ ایک ہندو عورت ایک پھیری والے سے سودا خریدتے وقت یہ پوچھ لیتی تھی کہ کہیں تم مسلے تو نہیں ہو۔ مسلمانوں کے لیے حصول ملازمت مشکل تھا۔

رابطہ مسلم عوام مہم

کانگریسی وزارتوں کی تشکیل کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، مسلم عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ کی مہم شروع کی۔ اس کے خیال میں مسلم لیگ حکومت سے محروم کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے اس کا اثر و رسوخ ختم کر دیا جائے اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ پنڈت نہرو نے کہا۔ مسلمانوں کا علیحدہ کوئی وجود نہیں۔ وہ ہندوستانی قوم کا ایک حصہ ہیں۔ ہندوستان اب صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس ہے جو ہندوستانی قوم کی ترجمان ہیں اور دوسری انگریز حکومت۔ مسلم رابطہ مہم کا مقصد مسلمانوں کے علیحدہ وجود کو ختم کرنے ان کو کانگریس میں شامل کرنا تھا۔ کانگریس کو ہندو سرمایہ کاروں کے علاوہ انگریزوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ پنڈت نہرو نے کہا کانگریس کے ہاتھوں اقلیتوں کو قطعی کوئی خطرہ نہیں۔ پچھلے سالوں میں ہم نے مسلمانوں کو نظر انداز کیا ہے۔ اب ہم اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ رابطہ مہم چند ماہ جاری رہی۔ پنڈت نہرو نے فرقہ وارانہ جماعتوں کی آزادی کے لیے خطرناک قرار دیا۔ لوگوں کی غربت اور افلاس کا رونا رویا اور اعلان کیا کہ کانگریس سب کو غربت و افلاس سے نجات دلائے گی۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان اپنی فرقہ وارانہ تنظیمیں چھوڑ کر کانگریس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ مہم کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ پنڈت نہرو نے غلطی سے سمجھ لیا تھا کہ مسلم عوام کو حسین نعروں سے اپنے پیچھے لگایا جا سکتا ہے یا کم از کم اس طریقہ سے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی جا سکتی ہے۔

مسلم لیڈروں نے اس مہم کا نوٹس لیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا جواب یہ تھا کہ کانگریس کی مسلم عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے بھیس میں اصل کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرکے اور انھیں کمزور کرکے ختم کر دیا جائے اور ان کو اپنے قائدین سے بدظن کر دیا جائے۔ یہ ایک خطرناک مسلم لیگ کے علاوہ دوسری مسلم جماعتوں نے بھی کانگریس کی اس مہم کی سختی سے مخالفت کی اور اس کے پردہ جو خطرناک عزائم تھے ان کو بے نقاب کیا۔ پنجاب موڈریٹ اسمبلی کے صدر مولوی عبدالحکیم خان نے کہا کہ ہندوؤں نے اپنی حکومت کے بل بوتے پر رابطہ کی جو مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس کا مقصد اسلامیان برصغیر کو ان کے دین سے برگشتہ اور منحرف کرنا ہے۔

پنڈت نہرو نے اپنے رابطہ کے دوران کہا تھا کہ برصغیر میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس اور دوسری انگریز حکومت اس کا جواب دیتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ مسلمان ہیں۔

کانگریس نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے جب یہ کہا کہ مذہبی اختلافات کچھ حقیقت نہیں رکھتے ہندوستان کے تمام لوگ ایک قوم ہیں۔ لہٰذا انھیں کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیے تو اس کے جواب میں مسلمان

کو کچلنے کے درپے کیوں ہیں۔

اس مہم کا اثر یہ ہوا کہ اس موجود مسلمان کانگریس کو چھوڑ چھاڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ اس مہم کے پس پردہ جو خطرہ اس کو بھانپ نہ سکے۔

پیرپور رپورٹ

کانگریسی وزارتیں جو مظالم مسلمانوں پر ڈھا رہی تھیں۔ ان کا ذکر اخبارات میں آ رہا تھا اور مسلم قائدین کی طرف سے ان کا ردعمل اور مذمت بھی ہوتی رہتی تھی۔ پنڈت نہرو نے قائد اعظم سے اس بارے میں خط و کتابت کی اور ان حقائق کو بے بنیاد قرار دیا اور اُردو اخبارات کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ قائد اعظم نے راجہ سید محمد مہدی آف پیرکوٹ کی قیادت میں ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو ایک کمیٹی مقرر کر دی جس کے ممبران میں سید محمد اشرف احمد، خان بہادر، حاجی رشید احمد۔ میاں غیاث الدین ایم۔ ایل۔ اے۔ مولوی عبدالغنی ایم۔ ایل۔ اے۔ سید حسن ریاض، سید تقی ہادی، سید ذاکر علی اور اے بی حبیب اللہ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگ ہائی کمان کو اپنی رپورٹ پیش کر دی جس کو پیرپور رپورٹ کا نام دیا گیا۔ اس رپورٹ کی اشاعت نے کانگریس کے پراپیگنڈے کی قلعی کھول دی اور کانگریس اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود مسلمانوں کو ورغلانے میں ناکام رہی۔

کانگریس حکومت کے دوران مسلم لیگ کی جدوجہد

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کانگریس کی جیت کے بعد کانگریس کا مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ رہا وہ ان کے لیے ایک عبرت ناک تازیانے سے کسی صورت بھی کم نہ تھا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو ووٹ دے کر جس پشیمانی کا مظاہرہ کیا، وہ مسلم لیگ کی آئندہ دو سالوں میں وسعت اور مقبولیت سے واضح رہے۔ ہندوؤں کا خیال یہ تھا کہ کانگریس کی قومیت کا لبادہ اوڑھ کر ہم تمام مسلمانوں کو اپنے دام فریب میں لے آئیں گے اور پھر کر کے آہنی پنجوں میں جکڑ کر ان کی شہ رگ تک کا خون پئیں گے اور ان سے گزشتہ کئی صد سالہ عہد حکومت کا خمیازہ اٹھوائیں گے۔ لیکن قدرت کو ان کی مکاری زیادہ دیر تک پسند نہ آئی۔ مسلم لیگ نے بھی اپنی خامیوں کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا اور اس کے رہنماؤں نے ان کوتاہیوں کو دور کرنے کا ایک جامع پروگرام بنایا۔

کانگریس کے دوران حکومت میں مسلم لیگ کی توجہ اب دو محاذوں کی طرف تھی۔ ایک محاذ ان حالات

کا جو کانگریس کی حکومت کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے اور جن کی بنا پر مسلمانوں پر دن بدن سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور ان کے عقائد کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ دوسری طرف ان اقدامات پر غور کرنا تھا جن کے تحت مسلم لیگ کو مزید مقبول عام تر اور استوار بنانے کے ذرائع اختیار کیے جانے تھے۔ اس دور میں مسلم لیگ کے پاس تین عظیم ترین شخصیتیں تھیں۔

اول :۔ قائداعظم محمد علی جناح

دوم :۔ علامہ اقبال ؒ

اور سوم :۔ نواب راجہ صاحب محمود آباد

ان تینوں اکابرین نے سر جوڑ کر مسلم لیگ کی مقبولیت کے لیے ذرائع تلاش کیے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل کرنے کا عمل پروگرام بنایا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کی جائیں۔

۱۔ جلسوں کا انعقاد۔

۲۔ جلوسوں کی راہنمائی۔

۳۔ مختلف شہروں میں مسلم لیگ سے ملاقاتیں۔

۴۔ کانگریس کی سیاہ کاریوں کی واضح تشہیر۔

۵۔ مختلف جماعتوں کے لیڈروں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطے۔

چنانچہ سب سے پہلے ۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو قائداعظم نے راجہ صاحب محمود آباد کے کہنے پر لکھنؤ میں ایک جلسے کا انعقاد کا بندوبست کیا۔ اس اجلاس کی کامیابی کے لیے ہزاروں مسلم لیگی مسلمان جلسہ گاہ میں پہنچنے کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ جلسے کی اس قدر عظیم سطح پر تیاریوں کو دیکھ کر کانگریس کے منہ میں جھاگ آنے لگی اور انہوں نے جلسے کو ناکام کرنے یا اس کو منعقد نہ ہونے کی کوشش شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ خبریں عام ہو گئیں کہ جس وقت قائداعظم جلسہ گاہ کے پنڈال پر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ ان کے پنڈال کو آگ لگادی جائے گی اور قتل کر دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ پوری جلسہ گاہ میں موجود اور حاضر لوگوں پر شدید پتھراؤ کیا جائے گا۔ لیکن قائداعظم نے ان خبروں کے سننے کے باوجود اپنے ارادے میں ذرا برابر تبدیلی نہ کی اور بڑی جرأت مندی کے ساتھ وہ جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور للکار کر ان گیدڑوں کو پکارا جو کئی دنوں سے بھبکیاں دے رہے تھے۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا اور قائداعظم نے جم کر ایک زبردست جذبات

انگیز تقریر کی جس سے تمام مسلمانوں کے گوشہ ہائے ہوش کھل گئے۔

اسی دن سے یوپی میں کئی افراد کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے اس کے بعد قائد اعظم نے جلسوں میں خطاب کرنے کی مہم کو اور تیز کر دیا اور ۳ نومبر ۱۹۳۷ء کو بمبئی میں عظیم الشان جلسہ میں روح پرور تقریر کی۔ اس تقریر میں قائد اعظم نے ان جھوٹے وعدوں کی نقاب کشائی کی جس کے تحت کانگریس نے مسلمانوں سے ووٹ حاصل کر کے انتخاب جیتا تھا اور جو بعد ازاں ان کے مفادات کو مسل دینے کا موجب بنی۔

قائد اعظم نے عوام پر واضح کر کہ کانگریس کبھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتی۔ اگر مسلمانوں کی افادیت کی فکر رکھنے والی کوئی جماعت ہے تو وہ صرف مسلم لیگ ہے اس لیے کہ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں۔ انھوں نے انگریزوں کو بھی متنبہ کیا کہ اس کی کانگریس پروری اس کے ہندوستان میں زیادہ دیر تک قدم جمائے رکھنے میں ممد نہیں ہوگی کیونکہ کانگریس ایک ایسی جماعت ہے جسے ہوس ملک گیری لاحق ہے۔ اور وہ اپنی تسکین ہونے تک اس ہوس کی تکمیل کے لیے شکار ڈھونڈتی رہے گی اور انگریز کو کبھی یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ ہندو کی پرورش کر کے وہ مسلمانان ہند کے عزائم میں کوئی فرق نہیں ڈال سکے گا۔

قائد اعظم نے کہا کہ اگر کانگریس یہ چاہتی ہے کہ ملک کو جلد از جلد آزاد کرایا جائے اور انگریز کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ زیادہ دیر تک ہندو مسلم فسادات کا تماشا دیکھتا رہے تو اسے چاہیے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد مسلم جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرے اور اس کے ساتھ مشترک نظریات ہو کر انگریز کو نکال باہر پھینکنے میں ممد و معاون ہو۔ لیکن کانگریس کے لیے مسلم لیگ یہ باتیں زہر قاتل معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ان جلسوں کی زبردست کامیابیوں سے بہت پریشان ہو چکی تھی۔ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ کا پلیٹ فارم دن بدن وسیع اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے جس سے نہ صرف کانگریس کو ضعف پہنچ رہا ہے بلکہ کانگریس کے دشمن کو قوت ملتی جا رہی ہے۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا۔ اس اجلاس کے انعقاد سے پیشتر وہاں کے عوام کو خبر مل چکی تھی۔ اور لکھنؤ اور بمبئی کے جلسوں میں مسلم کو عالی شان کامیابیاں حاصل ہوئیں تھیں اور جن خیالات کا اظہار قائد اعظم نے ان جلسوں میں کیا تھا کہ اب مسلم لیگ فعال جماعت بن گئی ہے اور اب یہ کچھ نہ کچھ کر چھوڑے گی۔ اس کے ساتھ مزید دشمنی کانگریس کی مزید کمزوری کا باعث ہوگی۔ اس لیے جس قدر جلدی ہو سکے قائد اعظم کا منہ بند کیا جائے اور ان سے مذاکرات کیے جائیں۔

یہ جلسہ کانگریس کے لیے زیادہ تشویش کا باعث اس لیے بھی ہوا کہ مسلم لیگ کی طرف سے اس

ایک آٹھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جسے کانگریس کی طرف سے کیے گئے غیر آئینی اقدامات اور دیگر مظالم کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ اس کمیٹی کے سربراہ نواب راجہ سید محمد مہدی آف پیر پور سٹیٹ تھے۔ اس کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو اس کو شائع بھی کر دیا گیا۔ اس طرح کانگریس کی تمام کردار یاں منظر عام پر آگئیں جو انگریزوں کی نظروں میں بھی کانگریس کی ذلت کا باعث بنیں۔ یہ رپورٹ کانگریس کے بھانڈے کو چوراہے میں پھوڑنے کا باعث ہوئی لیکن ڈھیٹ قوم اس قدر کھسیانی ہوگئی کہ ان حقائق کی توضیح پیش کرنے کی بجائے ایسا راستہ اختیار کرنے لگی جس سے مسلمانوں کے جذبہ شوق میں کمی واقع ہو جائے یعنی انداز گفتگو میں اور لیڈروں کے لہجے میں نرمی آگئی۔ لیکن دل اور کردار میں کوئی فرق نہ آیا۔

۱۹۴۳ء میں قائد اعظم نے سندھ کا بھی دورہ کیا اور وہاں جگہ جگہ لوگوں کے اجتماعات کو خطاب کر کے مسلم لیگ کی عظمت اور کانگریس کی فطرت سے آگاہ کیا اور پورے سندھ کو اس بات پر متفق کر لیا کہ ہندو اور مسلمان دو ایسی قومیں ہیں جو ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ اب زیادہ دیر تک اکٹھی ہرگز ہرگز نہیں رہ سکتیں۔ سندھ کے مختلف مقامات کے اجلاس کے اجلاس میں قائد اعظم نے نہایت واضح انداز میں بتایا۔ ہندوؤں کے نظریہ حیات اور ہے اور مسلمان قوم کا نظریہ زندگی کچھ اور۔ دونوں کے نظریات میں بعد المشرقین ہے اور یہ آپس میں کبھی نہ ملنے والی اقدار و روایات کی مالک قومیں ہیں۔ اس لحاظ سے قائد اعظم نے پہلی دفعہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے دو قومی نظریے کا اعلان کیا۔ دو قومی نظریے کے اعلان نے کانگریس کے رہے سہے سکون میں ہلچل مچا دی۔

جلسوں اور جلوسوں کے انعقاد کی سکیم اس قدر مفید ثابت ہوئی کہ مسلم لیگ کو تازہ روح اور نئی حیات مل گئی۔ اس میں ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی۔ جس سے کانگریس جیسی جماعت کو سوچنا پڑا کہ اب مسلم لیگ کے سیلاب کو روکنے کی کاروائیاں پہلے سے مختلف انداز میں کرنی چاہئیں۔ دوسرے لفظوں میں کانگریس جب مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے میں بالکل ناکام رہی تو وہ قائد اعظم سے بات چیت کرنے اور خط و کتابت کرنے پر مجبور ہو گئی۔

خط و کتابت

مہاتما گاندھی نے قائد اعظم کو ایک طویل خط لکھا جس میں بہت سے گلے شکوے کیے گئے۔ قائد اعظم نے اس خط کا جواب نہایت سنجیدگی سے دیا مہاتما گاندھی نے یہ خط ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنو جلسے کی کاروائی سن کر سیگاؤں سے لکھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ:۔

"جس طرح میں نے اسے پڑھا ہے آپ کی پوری تقریر اعلان جنگ ہے۔"

قائداعظم نے اس خط کا جواب ۵ دسمبر ۱۹۳۷ء کو دیا اور لکھا۔

" مجھے افسوس ہے کہ میری لکھنؤ کی تقریر کو اعلان جنگ سمجھتے ہیں۔ وہ بالکل حفاظت خود اختیاری میں ہے۔ مہربانی کر کے اسے دوبارہ پڑھیے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال میں جو واقعات پیش آئے ہیں۔ ان پر آپ کی نظر نہیں رہی"۔

اسی دوران پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی قائداعظم سے خط کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے مراسلات کا مقصد یہی تھا کہ ہم آپس میں بیٹھیں اور کوئی مفاہمت کر لیں۔ قائداعظم نے انھیں بھی یہی شرط پیش کی کہ کانگریس پہلے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرے۔

نہرو کا کیرکٹر

پنڈت نہرو ایک خالص ترین برہمن تھا اس میں تمام وہ صفات پائی جاتی تھیں جو ایک اہل برہمن میں ہونی چاہییں۔ یعنی زبان کا بے حد شیریں دل کا مکمل خود غرض۔ مطلب برآری کے لیے ذاتی ذلت کو عین خدمت تصور کرنا اور وقت نکل جانے پر پورا پورا طوطا چشم، کمزور کے سامنے بے حد خوف ناک بلا کی حیثیت رکھے اور اپنے سے طاقت ور کے سامنے ... جس سے کوئی مطلب نکلتا نظر آتا ہو اس کی مبالغہ خوشامد اور جس سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہ ... ہے اس سے سخت نفرت۔ قوت کے ہاتھ میں آجانے کے بعد خود کو اتنا مدہوش طاقت کر لینا کہ ماحول سے اٹھکیلیاں لینے لگنا۔ ان ... صفات کا مصداق پنڈت نہرو عملی طور پر قائداعظم کے سامنے آگیا۔ اور شرمندگی اور جہالت کا طوق گلے میں ڈال کر واپس لوٹا۔

اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جب کانگریس کی جماعتیں قائم ہوئیں اور مسلم لیگ اسمبلی میں حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھی تو انھیں حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے ... ہی ... تے ہوئے دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسری گورنمنٹ آف گریٹ برٹن۔ اس پر قائداعظم نے فی الفور جواب دیا کہ یہ امر غلط ہے ہندوستان میں تین سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک مسلم لیگ، ایک کانگریس اور حکومت برطانیہ۔

انھیں دنوں یوپی میں پانچ ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ قائداعظم نے اعلان کر دیا کہ اگر کانگریس کو اپنا ... نمائندہ جماعت ہونے کا اتنا ہی زعم ہے تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ان پانچوں ضمنی نشستوں کے ضمنی انتخابات مسلم لیگ کے امیدواروں کے سامنے اپنے کانگریسی امیدوار کھڑے کر کے دیکھ لے اور انتخابات جیت کر دکھائے۔ پنڈت جی نے یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے پانچوں نشستوں پر امیدوار کھڑے کیے قدرت خدا کی دیکھیے ان پانچوں نشستوں پر کانگریس کے امیدواروں کو بری طرح شکست ہوئی اور پانچوں

مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہو گئے۔ انتخابات کے نتیجے پر پنڈت جی کھسیانے ہو کر خط و کتابت کی راہ پر چل نکلے۔ ادھر تو پنڈت جی قائداعظم کے ساتھ مراسلہ نگاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ادھر رابطہ مہم کا آغاز کر دیا۔ (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے)۔

پنڈت کے بعد کانگریس کی صدارت سوبھاش چندر بوس نے سنبھالی مسٹر سوباش چندر بوس مسلم لیگ کی کامیابی اور اس کی مقبولیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ سوبھاش چندر نے انھی خطوط پر خط کتابت کی جن پر ان کے پیش رو کر رہے تھے۔

اس مقصد پر لانے کے لیے قائداعظم نے سوبھاش چندر بوس کو ایک خط میں تحریر کیا کہ۔

"کانگریس نے مسلم لیگ کی حیثیت کو دراصل ۱۹۱۶ء میں تسلیم کر لیا تھا۔ حیرت ہے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر کانگریس اپنے فیصلے سے پھر گئی ہے۔"

سوبھاش چندر نے اس کے جواب میں لکھا کہ۔

"آپ کے خط کے سیاق سباق سے نہ مفہوم واضح ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اس بات کی توقع رکھتی ہے کہ کانگریس اسے ایک واحد مسلم تنظیم تسلیم کرے اس لیے میں آپ کو یہ خوش خبری دیتا ہوں کہ کانگریس کی مجلس عاملہ مسلم لیگ کی مقررہ کمیٹی سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہے۔"

علامہ اقبال کی وفات

ابھی مسلم لیگ کی تنظیم نو کا سلسلہ پورے جوش و خروش سے جاری تھا پنجاب میں علامہ اقبال اپنی پوری قوتِ دانش سے قوت افرنگ کے جن کو گرانے میں معروف تھے اور پوری قوم میں نئی روح پھونکنے میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ بستر علالت پر بھی انھوں نے قائداعظم کے ساتھ رابطہ قائم رکھا اور مسلم لیگ کی مضبوطی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کی کوشش کو تیز کرنے کے لیے پوری جان فشانی سے معروف رہے۔ اس کثرت کار کی بنا پر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کا لاہور کے مقام پر انتقال ہو گیا۔ علامہ اقبال کی رحلت پوری "ملت بیضا" کے لئے ناقابل تلافی نقصان تھا۔ قائداعظم کو جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو ان پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ اور بے ساختہ ان کے منہ سے کہ اعلیٰ ترین دانش ور ایک قابل قدر قومی رہنما جس نے اپنی نظموں اور خیالات سے پوری قوم میں نئی روح پھونکی تھی۔ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

مولانا شوکت علی کی وفات

مولانا شوکت علی تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد مسلم لیگ کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے اور ایک

فعال، اہم، اور مخلص کارکن بن گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے ماہ نومبر میں آپ نے اس جہان فانی سے رحلت فرما کر پوری ملت اسلامیہ میں ایک زبردست خلاء پیدا کر دیا۔ ان دونوں اکابرین ملت کی وفات نے مسلم لیگ کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم مسلم لیگ کا ایک اور اہم ترین کھیون ہار زندہ تھا۔ اس نے نہ صرف پوری مسلم لیگ کو ارفع ترین مقام پہ لا کھڑا کر دیا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کی عظمت کا اعتراف کانگریسی جیسی متعدد الاشکال جماعت سے کرا دیا۔

مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک جس قدر محنت سے کام کیا اور اس کے راہنماؤں نے جس حوصلہ مندی سے قدم بڑھاتے اس کی مثال اقوام کی زندگیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ دو سال کے عرصہ میں اس جماعت نے متکبر و حاکم جماعت سے اپنی عظمت کا لوہا منوا لیا۔ اس اعتراف عظمت کا سہرا دراصل قائد اعظم محمد علی جناح کے سر پر تھا۔ جنھوں نے ہر ایک کانگریسی لیڈر کو اس کی بساط کے مطابق دلائل سے انھیں قائل کیا۔ اور مسلمانوں کو حقیقت کی قبولیت کی طرف مائل کیا۔ اس طرح ان دو سالوں کا عرصہ مسلم لیگ کی زندگی میں ایک نئی روح پیدا کرنے کا دور تھا۔ جو قوت ان دو سالوں میں اسے حاصل ہوئی اس کی مدد سے بالآخر یہ ایک نیا ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

جنگ عظیم دوم اور ہندوستان کی سیاست

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے ۳ ستمبر کو اس جنگ میں ہٹلر کے خلاف فریق بننے کا اعلان کر کے خود کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ اسی روز فرانس نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ آہستہ آہستہ اسی طرح یہ جنگ دوسری جنگ عالم گیر کی صورت اختیار کر گئی۔ یہ وہ دور تھا۔ جب ہندوستان میں کانگریس راج قائم ہوئے ابھی دو سال کا عرصہ ہی گزرا تھا۔ اور کانگریس اپنے منشور کی تکمیل کو رازدانہ انداز میں مصروف تھی۔ کانگریس کو عالمی حالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو ہر وقت یہ خیال تھا کہ کسی طرح جلد از جلد مسلمانان ہند پر غیر کانگریسیوں کا استحصال کر کے انھیں زیر کیا جائے اور اکھنڈ بھارت کے خواب کی تعبیر کی جائے۔

برطانیہ کی جنگ میں شمولیت کے اعلان کے ساتھ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ہندوستان کے عوام کی جانب سے ہٹلر کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے لاء ممبر سر محمد ظفر اللہ خان نے مرکزی اسمبلی میں اعلان کیا کہ ہم ہندوستانی ہر وہ فرض ادا کرنے کے لیے تیار ہیں جو شہنشاہ برطانیہ کی طرف سے ہم پہ عائد ہوتے ہیں۔ ۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے

آف انڈیا ایکٹ کا مسودہ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کر دیا۔ جس پر چار دن تک بحث ہوتی رہی۔ اس کے بعد اس بل کو ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ اسے آخری شکل دے سکے۔ تقریباً ۱۵ دن کے غور و خوض کے بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ مسودہ اسمبلی کی منظوری حاصل کر کے قانون ملک کی صورت اختیار کر گیا۔

وائسرائے ہند کے یک طرفہ ہندوستان کو آگ میں جھونک دینے کی بناء پر پورے ہند میں غم و غصے اور خوف ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت کو اس حقیقت کا واضح طور پر احساس تھا اور اس نے فوراً اعلیٰ ترین لیڈروں سے ملاقاتیں کرنا ضروری سمجھا تاکہ ان عمائد پر اس ضرورت کی شدت کو واضح کیا جائے جس کی بناء پر حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو شامل جنگ کر لیا تھا۔ لارڈ لنلتھگو نے ہندوستانی عوام سے اپیل بھی کی کہ وہ جنگ میں انگریزوں کی مدد کریں اور ساتھ ہی اعلان کیا کہ میں ہندوستانی عوام کے رہنماؤں سے بالمشافہ گفتگو کرنے کو بصمیم قلب تیار ہوں۔ چنانچہ اس نے بیک وقت مسٹر گاندھی اور قائداعظم محمد علی جناح کو گفتگو کے لئے بلایا۔ ان دونوں رہنماؤں کو بیک وقت بلایا جانا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے باعث تحیر تھا۔ ہندو اس لیے حیران تھے کہ انگریزوں نے کانگریس جیسی حکمران جماعت کے لیڈر کو اقلیتی جماعت مسلم لیگ کے رہنما کے ہمراہ کیوں بلایا گیا ہے۔ اور مسلمان اس لیے متحیر تھے کہ انگریز کے رویے میں یہ یکایک تبدیلی کیوں کر پیدا ہوئی ہے۔ اور مسلم لیگ کو انگریز نے کس طرح کانگریس کے ہم پلہ تسلیم کر لیا۔ تاہم دونوں لیڈروں سے کھل کر مذاکرات ہوئے۔ اس کے بعد حکومت، مسٹر گاندھی اور قائداعظم کے درمیان بہت سی گفت و شنید اور خط و کتابت ہوتی۔ حکومت ان عوامی رہنماؤں سے واضح انداز میں حمایت طلب کرنا چاہتی تھی اور دونوں جماعتوں کے رہنما اس سلسلے میں توضیحات کی تشریح مانگ رہے تھے۔ دونوں کے انداز گفتگو میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مسٹر گاندھی کی زبان میں اور لہجے میں نرمی بھی دکھائی دیتی تھی۔ تو محض اس لیے کہ وہ خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پاتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں انھیں گریز کی ذراسی گنجائش ملتی تھی۔ وہ مذاکرات کو کامیاب بنانے سے فرار اختیار کر لیتے تھے۔ اس طرح ان کا انداز بالکل منافقانہ اور متعصبانہ تھا۔ اس کے برعکس قائداعظم کی توضیحات بالکل واضح اور مدلل تھیں۔ وہ جہاں کہیں بات کرتے پورے وثوق سے قائم ہو کر کہتے۔ انھیں بات کو گول کرنے سے سخت نفرت تھی۔ وہ خود راست کردار لیڈر تھے اور دوسرے لیڈروں سے یہ توقع رکھتے تھے۔ لیکن انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہندو لیڈر کو فطرت کی طرف سے راست تقی کا ملکہ ہی ملا ہے۔ دراصل مسٹر گاندھی نے جب حکومت کو مبتلائے وبال دیکھا تو انھوں نے اس موقع کو غنیمت شمار کر کے حکومت کے لیے اور زیادہ مسائل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کبھی بات چیت کو بغیر نتیجہ کر دینے کی صورت تھا۔ کبھی خود کو کانگریس کا چوتی کا رکن بھی نہ قرار دیتے ہوئے۔ اور کبھی ہندو قوم کی جنگ سے نفرت کا بہانہ کرتے ہوئے اس دوران کانگریس نے جب یہ دیکھا کہ انگریز اس وقت مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ ہندوستانیوں

کی مدد کی طالب ہے تو اس نے مدد کرنے کی شرائط پیش کر دیں اور انھیں منوانے کے بعد ہندوستانیوں کو جنگ میں شامل کیا جانا مناسب قرار دیا۔ مسٹر گاندھی نے جن بہانوں کو اپنا آلۂ کار بنایا، ان میں سے چند ایک ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جب وائسرائے سے تین گھنٹے ملاقات کرنے کے بعد واپس نکلے تو ان کی زبان پر یہ مطالبہ تھا کہ حکومت اپنی پالیسی کا اعلان کرے اور بتائے کہ جنگ کے بعد فی الفور کانگریس کو ہندوستان کا دستور بنانے کے لیے آزاد چھوڑا جائے گا۔

۲۔ حکومت نے ہندوستانیوں کو جنگ میں ان کے رہنماؤں سے مشورہ کیے بغیر کیوں جھونک دیا ہے اس سلسلے میں حکومت کو پہلے عوام سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔

۳۔ حکومت ہندوستان بھر میں ایک ہی جماعت یعنی کانگریس کو واحد نمائندہ جماعت قرار دے کر اسے حکومت کی اجازت دے۔

۴۔ یہ اعلان کیا جائے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان ایک آزاد ملک ہوگا اور اس میں ملک کی واحد سیاسی جماعت کانگریس حکمران جماعت ہوگی۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں جن سے حکومت کو ایسے آڑے وقت میں ستانے والی حرکات تھیں جب کہ اسے خود یکسوئی اور جامعیت کی ضرورت تھی۔ انگریز وائسرائے نے ان اعتراضات کا جواب دیا تو ضرور لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے کانگریس کا بھیانک کردار ہر وقت گھومنے لگا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وفاقی ہند کا دستور ۱۹۳۵ء عالمی جنگ کے خاتمے تک ملتوی کر دیا جاتا۔ چنانچہ تقاضے کے تحت ملک میں ڈیفنس آف انڈیا کا نفاذ کر دیا گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو گیا ہے کہ حکومت اور جماعتوں کے درمیان گفت و شنید کے دوران مسلم لیگ کا کردار بالکل مثبت رہا اور قائداعظم محمد علی جناح نے حالات کے تقاضوں کے تحت انگریز کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے مذہبی دفاع اور قومی برتری کے مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ چنانچہ مسلم لیگ کی طرف سے حکومت کو تجاویز پیش کی گئیں وہ حسب ذیل تھیں۔ ان تجاویز کو کانگریس رہنماؤں کے مذکورہ بالا اعتراضات کے سامنے رکھ کر اگر پرکھا جائے تو یہ اس قدر اعلیٰ اور برتر دکھائی دیتی ہیں جن کی مثال صرف شرافت سے شناسا ماحول ہی میں مل سکتی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی تجاویز

ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت جنگ عظیم کے خطرات کے مدنظر حکومت کا یہ اقدام بالکل بجا ہے

کہ وہ دستورِ ہند کے وفاقی حصے کو جنگ کے خاتمے تک ملتوی کر دے۔ لیکن جنگ ختم ہو جانے کے بعد حکومت کو ایک بار پھر پورے ملک سیاست کا جائزہ لے کر سارے دستور پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے کیونکہ ہندوستان کی سیاست گزشتہ دو سالوں میں بہت زیادہ تغیرات سے دوچار ہو چکی ہے۔

۱۔ یہ تجویز دراصل کانگریس کی مکارانہ چالوں کی بنا پر اور مسلمانوں کے خلاف ہندو کے ایمان سوز عقیدہ کش اقدام کے پیشِ نظر رکھی گئی کیوں کہ کانگریس کی دو سالہ حکومت میں ایسی بدترین مثالیں تجربے میں پائی گئیں جن سے مسلمان کانگریس سے متنفر ہو کر اسے ترک کر کے مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہو گئے تھے۔ اور ہو رہے تھے۔ قائد اعظم کو یقین تھا کہ جنگ کے خاتمے تک کانگریس میں شمولیت شاذ و نادر ہی دکھائی دے گی اور کانگریس میں صرف وہ مسلمان رہ جائیں گے جن کو ہندو کی زبردست مالی اور سماجی سرپرستی حاصل ہو گی یا جو ہندو کے ورغلانے کے چنگل سے آزادی حاصل نہ کر سکے ہوں گے۔

۲۔ آئندہ دستور کے نفاذ سے پیشتر آل انڈیا مسلم لیگ کو مشورے کے لیے مذاکرات میں ضرور شامل کیا جاتا رہے گا۔ اور دستور میں اگر کوئی ایسی شک ہو جو مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو تو اسے نافذ نہ کیا جائے۔

۳۔ اس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ انگریز کہیں براہ راست کانگریس کے مشوروں کے تحت ایسے قانون بنانے پر مجبور نہ ہو جاتے جو مسلمانوں کے لیے بالآخر نقصان دہ ثابت ہوں کیونکہ گاندھی انگریز کے سامنے کانگریس کی ہمہ گیری کی یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جس میں تمام مذاہب کے نمائندے شامل ہیں اور کانگریس کے جتنے بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ ان تمام مذاہب کے نمائندوں کی مشاورت سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے فرقہ وارانہ باتوں کی آئین میں مخل ہونے کی اجازت نہ دی جانی چاہیے۔

۴۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی اس میں کوئی ایسا نمائندہ نہ تھا جس کو اسلام کی اقدار کے تحفظ کا خیال ہوتا یا اس میں اسلامی نکتہ نظر کے تحت مسلمانوں کی افادیت کا احساس ہوتا۔ اس میں جتنے بھی لوگ تھے انھیں صرف سیاسی آزادی مطلوب تھی۔ انھیں حکومت چاہیے تھی۔ انھیں عملے سلطنت کی ضرورت تھی۔ انھیں اسلام سے قطعی محبت نہ تھی۔ وہ خود کو مسلمان ہونے کی بجائے ایک

ہندوستانی کہلانا زیادہ مناسب خیال کرتے تھے لیکن مسلم لیگ میں شامل مسلمانوں کے مدنظر ملک میں ایک ایسے قانون کے نفاذ کی احتیاج تھی جس کی بنیاد اسلامی اصولوں کے منافی ہرگز ہرگز نہ ہو۔ اور جو اسلام میں کسی قسم کا رخنہ نہ ڈالے۔

۳۔ مرکز میں بننے والی مجوزہ وزارت میں مسلم لیگ کی نمائندگی پچاس فیصد ہوگی۔ اس تجویز کا اصل مقصد کانگریس کی اس پالیسی کو روکنا تھا جس کے تحت وہ کسی بھی وقت کسی قانون کو چاہے وہ مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ پاس کرنے کے لیے اپنی اکثریت کو استعمال کر سکتی تھی۔

۴۔ برطانوی حکومت یقین دلائے کہ ہندوستان کی مسلم فوجیں کسی مسلمان ملک کے خلاف استعمال نہیں ہوں گی اور ہندوستان کے ساتھ یہ بھی کہ فلسطین کا مسئلہ عربوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے گا۔ چوں کہ یہ عالمگیر جنگ تھی اس لیے دنیا کے مختلف ملکوں کو کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دینا ہی تھا بہت ممکن تھا کہ دو مسلم ممالک آپس ہی میں متحارب ہو جائیں۔ اس صورت حال میں کم از کم ہندوستان کے مسلمان اپنے بھائیوں کے سامنے بندوق نہ اٹھائیں گے اور اپنی گولیوں کو ان کے ضیاع کے لیے استعمال کریں۔ مسلم لیگ میں یہ احساس ایک عالمی مسلم اخوت کا جذبہ تھا۔

۵۔ مسلمان اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور مسلمانوں کی شکایات کا فی الفور تدارک کیا جائے۔ گورنروں کو خاص ہدایت جاری کی جائے کہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے وہ اپنے خصوصی اختیارات بروئے کار لائیں۔

اس تجویز کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندو اکثریت والے صوبے کوئی ایسا قانون پاس نہ کریں یا ایسا اقدام نہ کریں جس سے مسلم اقدار کو نقصان پہنچتا ہو یا جس سے اس صوبے کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ غلام ہیں اور ان کی شنوائی کوئی نہیں۔ گورنروں کو ایسی صورت حال میں بالکل غیر جانبدارانہ رویہ رکھنا چاہیے۔

ان تجویزوں کے بعد کانگریس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مندرجہ ذیل تجاویز حکومت کے سامنے رکھیں

۱۔ عوام کو جنگ کے مقصد بتایا جائے اور ان سے حمایت کی منظوری لی جائے۔ یہ ایک ایسی تجویز تھی کہ جس سے ایک معمولی عقل کا شہری بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ کانگریس کا ایسا پوچھنا کس قدر بے جا تھا۔ جنگ ہونے کے اسباب سب پر عیاں تھے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس میں وائسرائے یا حکومت اس کے عوام کی منظوری حاصل کرنے کی پابند نہیں تھی کیونکہ ہندوستان برطانیہ ہی کی ایک ڈومینیس تھی۔ اور اپنی ڈومینینس (DOMINION) کے لوگوں سے کوئی حکومت اس کی بابت

طلب کرنے کی پابندیاں۔ بالخصوص اس وقت جب وہ حاکم خود دشمن کے نرغے میں ہو۔

۲۔ ہندوستان کے لیے آزادی کے پکے وعدے کا اعلان کیا جائے اور جنگ کے ختم ہوتے ہی موجودہ دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے کا حق دیا جائے۔

اس تجویز سے ہندو کی وہ پالیسی بالکل عیاں ہوتی ہے جس کے تحت ـ" پھنسے ہوئے سے بہت شرطیں منوانا" مقصود ہوتا ہے انگریز چونکہ جنگ کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے عوام کی حمایت ازبس ضروری تھی۔ اور ہندوستانی افواج کا استعمال ناگزیر تھا اور ان کے بغیر اس کی بن پڑنا محال تھی۔ اس لیئے یہ موقع اس کے لیے بے حد نوعیت کا تھا۔

ہندو نے اس قدر مجبوری کی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کیا کہ وہ کہہ کہ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے حق دے دیا جائے گا۔ لیکن حقیقت میں جنگ کے بعد کے حالات نے اور پلٹا کھایا جس کے تحت پاکستان تشکیل پذیر ہوگیا۔

۳۔ حکومت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو فوری طور پر قومی حکومت کی عملی شکل دے دے چاہے کسی بھی طریقے سے منتخب ہو۔ اس میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ اس طرح کانگریس کو آئین سازی کا مکمل حق حاصل ہو جائے گا۔

یہ تجاویز اس نوعیت کی تھیں جن کو بیک وقت بروئے کار لایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز کی منشاء یہ بھی تھی کہ فریقین میں سے کوئی بھی ناراض نہ ہو۔ ہندوؤں کی بھی تسلی ہو جائے اور مسلم لیگ کو اپنے مقام پر تشفی ہو۔ کانگریس کے مطالبات کو مان کر انگریز فی الفور ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور ہندوؤں کے حوالے کرنے سے قاصر تھا۔ اور اس طرح اس کو جنگی ضروریات کے لیے ہندوستانی وسائل کے محدود ہو جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ اس لیے حکومت برطانیہ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد وائسرائے نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں جنگ کے خاتمے تک ایسا نظام رائج رہے گا جس سے کسی سیاسی جماعت کی افادیت کو حکومت کی طرف سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے وفاقی حصے کو معطل کر دیا گیا اور ساتھ ہی یہ یقین دلایا گیا کہ آئندہ دستور کی ترتیب کے سلسلے میں ملک کی تمام "سیاسی جماعتوں" کی آراء کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ تمام سیاسی جماعتوں سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز کے نزدیک کون کون سی جماعتیں تھیں ایک کانگریس اور دوسری مسلم لیگ۔ اس طرح دوسرے لفظوں میں حکومت نے مسلم لیگ کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز کو قبول کر لیا۔

جہاں تک ہندوستان کی طرف سے مسلم افواج کے مسلمان ملکوں خلاف لڑنے کا تعلق ہے۔ وائسرائے نے اعلان کیا کہ فی الحال برطانیہ کسی مسلم ملک سے جنگ آزما نہیں ہے اور کسی صورت میں کوئی مسلمان فوجی ان سے لڑنے کے لیے نہیں بھیجا جائے گا۔ برطانیہ نے مسلمانان ہند کو یقین دلایا کہ فلسطین کے معاملے میں عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ وائسرائے کے یہ اعلانات مسلم لیگ کے لیے پوری تشفی کا موجب تھے لیکن کانگریس کے اضطراب میں قطعی کوئی فرق نہ آیا۔ اور نہ ہی انگریز نے کانگریس کی تجاویز کو چنداں مناسب گردانا۔

یہ صورت حال دیکھ کر کانگریس نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ انگریز ہندوستان کی آزادی کو دیدہ دانستہ ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے ان کے پاس اس پروپیگنڈے کی ایک دلیل یہ تھی کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنا چاہتا ہے تو جنگ کے خاتمے کے بعد اس کی آزادی کا وعدہ کیوں نہیں کر لیتا۔ اس پر بھی جب کانگریس کو انگریز کی حمایت حاصل نہ ہوئی تو انھوں نے اس خاموشی سے اپنی بے عزتی تصور کیا۔

کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ

ہندوؤں کا خیال تھا کہ انگریز کو اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ کانگریسی لیڈروں کا شور وغوغا حق بجانب ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ کانگریس کے پروپیگنڈے سے خوف زدہ ہو جائے گا۔ جس کے نتیجے پر مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ لیکن حقیقت اس کے الٹ تھی۔ وائسرائے نے متعدد بار گاندھی کو پاس بلا کر حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اور ملکی سیاست تغیر کو مد نظر رکھتے ہوئے تفصیلات سے آگاہ کیا لیکن گاندھی کی ایک ہی رٹ اور ایک ہی ہٹ تھی کہ واحد نمائندہ جماعت کانگریس ہے اور ہندوستان کی جلد از جلد آزادی مطلوب ہے۔

بالآخر ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا۔ جس میں انھوں نے کہا کہ شہنشاہ برطانیہ کی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ جب مستقبل کے لیے ہندوستانی وفاقی حکومت کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کرنے کا وقت آئے گا۔ نیز اس منصوبے پر غور کرنے کا جس سے سابق وزیر ہند کی ان یقین دہانیوں کی تعمیل ہونے والی تھی جو انھوں نے پارلیمنٹ میں کی تھیں تو یہ ضروری تھا کہ اس وقت کے حالات کی روشنی میں اس پر دوبارہ غور کیا جائے کہ ۱۹۳۵ء کے قانون کا جو منصوبہ ہے اس کی تفصیلات کس حد تک باقی رہتی تھیں۔

علاوہ ازیں مجھے یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے نمائندوں اور والیان ریاست کے مشورہ کروں اور مناسب ترمیمات کروں۔ شہنشاہ کا ارادہ ہے کہ سلطنت کے اندر ہندوستان اور یونائیٹڈ کنگڈم (حکومت متحدہ) کے درمیان اس شرکت کو اس

مقصد یہ ہے کہ برطانیہ عظمیٰ نوآبادیات کے درمیان ہندوستان کو واجبی مقام حاصل ہو جائے۔

اقلیتوں کے بارے میں اعلان کرتے ہوئے وائسرائے نے کہا:۔

کہ ناقابل تصور ہے کہ ہم از سر نو دستور وضع کرنے کا منصوبہ بنائیں یا ہندوستان کے آئندہ دستور کے کسی حصے میں ترمیم کریں۔ اس لیے جو تحفظات اقلیتوں کی دستور میں دیے گئے ہیں ان کی بنظر غائیت نگرانی کی جائے گی اور کسی دوسری جماعت یا فرقے کو اس میں مخل ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔

اقلیتوں کے بارے میں یہ اعلان اگرچہ کسی حد تک ان لوگوں کے لیے مفید تھا۔ جن کا تعلق ایسی جماعتوں سے تھا جو نہ تو کانگریس کے ساتھ تھیں اور نہ ہی مسلم لیگ کے ساتھ، مثلاً اچھوت، سکھ، اینگلو انڈین ہندوستانی عیسائی وغیرہ۔

وائسرائے کا یہ بیان کانگریس کی دل سوزی کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ ۲۲ اکتوبر تا ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمقام وردھا ہوا جس میں وائسرائے کے بیان کی شدید مذمت کی گئی۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ برطانیہ کو اس وجہ سے کوئی مدد نہیں دے سکتی کہ یہ مدد اس کی اس استعماری پالیسی کی تائید کے مترادف ہوگی جس نے کانگریس نے ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہا ہے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں حکم دیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے کانگریس کی وزارتیں ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء تک مستعفی ہو جائیں۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے سیاسی حالات پر بحث ہوئی۔ وہاں تجویز پیش کی گئی کہ کانگریس کو مطمئن کرنے کے لیے وائسرائے کی مجلس انتظامیہ میں توسیع کر کے کانگریسی ارکان کو شامل کر لیا جائے۔ لیکن کانگریس کے رہنما اس پر راضی نہ ہوئے اور فیصلہ بحال رکھا۔

سب سے پہلے ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مدراس کی وزارت مستعفی ہوئی۔ اس کے بعد ۳ نومبر ۱۹۳۹ء تک تمام کانگریسی وزارتیں اپنے استعفے متعلقہ گورنروں کو پیش کر چکی تھیں۔ کانگریس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر انگریز کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ چنانچہ اسی غصے اور غضب کے تحت تمام استعفے منظور کر لیے گئے۔ اور صوبوں کے نظام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے تحت گورنروں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور سرکاری عہدہ داروں کو اپنا ایڈوائیزر مقرر کر لیا۔ کانگریس کی وزارتوں کے بعد جو وزارتیں قائم رہیں۔ ان میں آسام کی مخلوط وزارت جس میں زیادہ تر وزراء مسلم لیگ کے تھے اور جس کے وزیر اعلیٰ سر محمد سعد اللہ تھے۔ پنجاب کی وزارت جس میں یونینسٹ پارٹی کو فوقیت حاصل تھی بنگال اور سندھ وزارتیں۔

کانگریس کا پچھتاوا

کانگریس کا خیال تھا کہ انگریز اس کے عمل سے پریشان ہوگا اور حکومت کی نظامت میں گڑبڑ پیدا ہوگی لیکن نتائج اس کے بالکل برعکس نکلے۔ انگریز نے کانگریسیوں کے استعفوں کی قطعی طور پر پرواہ نہ کی اور دفعہ ۹۳ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا ان صوبوں میں نفاذ کر کے گورنروں کو مکمل انتظامیہ کے اختیارات سونپ دیئے۔ اپنی یہ حالت زار دیکھ کر کانگریس بے حد پچھتائی لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ کانگریس منہ اٹھائے ایک عرصہ دراز تک یہ دیکھتی رہی کہ شاید انگریز حکومت کو کچھ خیال آئے اور انگریز گورنر انھیں دوبارہ وزارتیں بنانے کی دعوت دیں۔

یوم نجات

کانگریس وزارتوں کے استعفیٰ دے دینے سے ان کے وہ تمام بت ٹوٹ گئے جو انھوں نے مسلمانوں کے لیے بھی بناتے۔ ان کے تمام افسوں ٹوٹ گئے جن کے تحت انھوں نے بے بس مسلمانوں کو پتھر بنایا ہوا تھا خود بخود حالات کی ایک ہی ضرب نے کانگریس کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا اور مسلم لیگ کے مقاصد قدرتی طور پر خود بخود حاصل ہو گئے۔ قائد اعظم نے ۵ دسمبر کو تمام مسلمانان ہند سے اپیل کی کہ کانگریس وزارتوں کے استعفوں کے بعد مسلمانوں پر کانگریسی صوبوں میں ظلم و ستم ختم ہونے کی خوشی میں ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منایا جائے۔ قائد اعظم نے تمام مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اس مبارک دن پر کسی قسم کی لاقانونیت کا مظاہرہ نہ کریں۔ کوئی ہنگامہ یا شور برپا نہ کریں کسی قسم کی آویزش میں نہ الجھیں اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی ہڑتال کریں۔

یوم نجات منانے کے لیے تمام مسلمانوں نماز جمعہ کے بعد (۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو جمعہ کا دن تھا) شکرانے کے نوافل پڑھیں۔ اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر پرامن جلسے کریں اور ان میں قرارداد پاس کریں کہ کانگریسی حکومت کے دوران مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی تحقیقات غیر جانبدارانہ طور پر کرائی جائے۔
یوم نجات منانے کا اعلان کانگریس کے بالخصوص اور ہندوؤں کے بالعموم برق سوزاں سے کم نہیں تھا۔ دوسری طرف اچھوتوں، پارسیوں اور دیگر اقلیتی جماعتوں نے قائد اعظم کے اس بیان کا خیر مقدم کیا۔ اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے، پونا پیکٹ کا حوالہ دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا، "میں اپنی غفلت پر شرمندہ ہوں"، ...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پیکٹ پر دستخط کراتے جانے کے وقت جس قدر عجز و انکسار تھی اس وقت ان کے دماغ کی کیفیت اتنی ہی دگرگوں تھی۔ کانگریسی حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کا حق دراصل میرا تھا جسے مسٹر محمد علی جناح نے پہلے ہی مجھ سے چھین لیا ہے۔
المختصر ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو "یوم نجات" پورے وقار اور طمطراق سے منایا گیا۔ اچھوتوں اور پارسیوں

وغیرہ نے بھی اس میں پورے جوش خروش سے حصّہ لیا اس دن کے منائے جانے پر ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار جن کی اشاعت ہندوؤں اور کے ہاتھ میں تھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "مسٹر جناح" نے نہایت جمہوری انداز میں اور وقار طور پر احتجاج کیا ہے"۔ اس سے ان کے بارے میں نہ صرف ہندوستان میں ان کی عظمت و رفعت ذہن کا اعتراف ہو گیا ہے۔ بلکہ انھوں نے پوری دنیا میں مسلم لیگ کے لئے رائے عامہ ہموار کر لی ہے۔

باب ۲۰

قرار داد پاکستان

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں پاس ہونے والی قرار داد سے شروع ہوتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب (Discovry of India) میں لکھا ہے کہ دو قومی نظریہ اور تقسیم ملک کے تصورات قائد اعظم کے اختراع لکھتے اور اس سے پہلے ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز ۱۹۳۷ء سے ہوا جب یوپی کانگرس نے مسلم لیگ کے دو راہنماؤں کو صوبائی وزارت میں لینے سے انکار کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں حقیقت سے بعید ہیں۔ تحریک پاکستان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کا پس منظر بہت وسیع ہے۔ ایک مرتبہ قائد اعظم سے کسی نے اسی نکتے پر استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ

پاکستان کی تحریک اسی دن شروع ہوئی جب اس برصغیر میں پہلا ہندو مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔

یہ طرزِ فکر حقیقت کے بہت قریب ہے ٹائن بی جیسے مغربی فلسفیوں اور مورخوں کی رائے میں پاکستان ایک لمبے تاریخی عمل کا نتیجہ ہے اور وہ ہے، اسلام کا ردِ عمل برصغیر کے ہندو معاشرے پر۔ برصغیر کے غیر مسلم مورخ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔

تقسیم ہند کے تصور کی تاریخ جن معنوں میں گاندھی اور نہرو وحدت ہند کا پرچار کیا کرتے تھے، اس وحدت کا وجود واقعاتی طور پر ثابت نہیں۔ تاریخ میں بہت کم موقع ایسے آئے ہیں جن میں ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کہا جا سکتا ہے مجموعی طور پر ان ادوار کی لذت بھی طویل نہیں۔ یہ کہنا کہ ہندوستانی قوم میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اور دو قومی نظریہ بے بنیاد ہے حقائق سے روگردانی کے مترادف ہے۔

ہندو اور مسلمان معاشرے اس برصغیر میں ایک ہزار سال تک ایک دوسرے کے ساتھ رواں دواں رہے، ایک دوسرے پر دونوں کے اثرات سطحی تھے ہندو ہندو رہے۔ اور مسلمان مسلمان رہے، دونوں کے تصورات زندگی اور طرز زندگی ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے

یہاں رہتے ہوئے بھی مسلمان اپنے آپ کو عالمگیر اسلامی برادری کا جزو سمجھتے تھے اور ہمارے طلبا، علماء، زائرین اور جہاں گرد آزادانہ دوسرے اسلامی ملکوں میں جاتے تھے۔

(الف) بھائی پرمانند آریہ سماج کے صفِ اول کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے تاریخ ہند کا مطالعہ ایک مخصوص زاویۂ نظر سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ صرف اسی طویل اور جانگدازانہ جدوجہد کی داستان ہے جو ہندوؤں نے صدیوں تک اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جاری رکھی۔ بعض ہندو اُمرا مسلمان بادشاہوں کی ملازمت کرتے اور اُن کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور بعض ہندو رؤسا سال ہا سال تک ان کے خلاف لڑتے رہے۔ بھائی پرمانند کہتے ہیں کہ خواہ ہندو اول الذکر جماعت کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے اور خواہ ثانی الذکر گروہ کے ساتھ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اس سرزمین سے اسلام اور مسلمان کا خاتمہ کیا جائے۔ اس رائے کو تقویت پہنچانے کے لیے انھوں نے کچھ شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی اور نہرو کا مصنوعی فلسفۂ سیاست، ہندوؤں کی سیاسی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور با اثر غیر ملکی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مسلم لیگ سے بہت پہلے تقسیم ملک کا تصور مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں نے اپنے اپنے علم ماحول اور فہم کے مطابق پیش کیا تھا۔

(ب) جان برائٹ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جان برائٹ انگلستان کی پارلیمنٹ کا ایک ریڈیکل رکن تھا۔ اس نے اپنی ایک مشہور تقریر میں جس کا حوالہ اکثر قائداعظم دیا کرتے تھے یہ کہا تھا کہ ہندوستان بہ وجود وحدت انگریزوں نے مسلط کی ہے وہ انگریزوں کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔

(ج) مارلین تھیوڈر مارلین علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ سرسید کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور اُن کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ان کی ایک کتاب ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے آغاز میں ہی اُنھوں نے ہندوستان کے سب سے بڑے مسئلے (یعنی قومیت کے جذبے کے فقدان) کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان کی تقریر کا مفہوم یوں تھا۔

اگر ہندوستان برطانیہ سے کچھ مراعات حاصل کرنے پر تُلا ہوا ہے، تو سب سے پہلے

اسے ایک قوم بننا ہوگا۔ قومیت کا جذبہ بذات خود ایک بے پناہ قوت ہے۔ لیکن یہاں اس جذبے کو بروئے کار لانا ناممکن ہے کیوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تاریخی اور معاشرتی اختلافات اس قدر گہرے ہیں کہ دونوں کی دنیا اپنی اپنی ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو لاکر پشاور اور آگرہ کے درمیان آباد کر دو اگر یہ ہو جائے تو اس علاقے میں مسلم قومیت پنپ سکتی ہے اور باقی ماندہ ہندوستان میں ہندو قومیت ،،

مارلین نے بات کو آگے نہیں بڑھایا کیونکہ اس وقت برطانوی اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا اور انگریزی حکومت کا خاتمہ دور کی بات نظر آتی تھی لیکن آنے والے سالوں میں ہندو اور مسلم قومیت کے جذبے ساتھ ساتھ پرورش پاتے رہے۔ مسلمانوں کے نزدیک تو مذہب اسلام ہی ان کی قومیت کی بنیاد تھی لیکن انیسویں صدی کی ہندو اصلاحی تحریکوں پر تقسیم بنگال کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہوا، دونوں نے مل کر ہندوؤں کے قومی جذبے کو شعوری سطح پر پیدا کیا۔ برطانوی دور میں تقسیم بنگال کی تنسیخ اس جذبے کی بہت بڑی فتح تھی۔ ۱۹۱۱ء کے گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ بعض مبصرین کے نزدیک تحریک خلافت میں احیائے اسلام کے کئی عناصر صاف صاف نظر آتے تھے۔ تحریک خلافت ختم ہوئی تو دفعتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے شدید قومی جذبات کے دھارے جو پچھلے دس سالوں میں وقتی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے مخالف سمتوں میں بہنے لگے۔

(د) محمد گل خاں

۱۹۲۲ء میں حکومت ہند نے سرڈینس برے کی زیر صدارت ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کے سوال کا جائزہ لے۔ اس کمیٹی کے سامنے محمد گل خان نے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ بہت بہتر ہوگا کہ شمالی ہندوستان کو مسلمانوں اور جنوبی ہندوستان کو ہندوؤں کا علاقہ قرار دے دیا جائے۔ اگرچہ خان موصوف کے سامنے آبادی کے اعداد و شمار نہیں تھے لیکن ان کے بیان میں تقسیم ملک کا واضح تصور موجود ہے۔

(س) بھائی پرمانند

۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں بھائی پرمانند کی دو کتابیں شائع ہوئیں پہلی کا نام آپ بیتی اور دوسری کا آریہ سماج اور ہندو سنگٹھن تھا۔ ان دونوں کتابوں میں مصنف نے چند طرز فکر کی عکاسی کی ہے۔ آپ بیتی میں

وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۱۳ء سے ہی میرے ذہن میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ہندو مسلم مسئلے کا مستقل حل یہی ہے کہ دونوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ دوسری کتاب میں اسی تصور کو کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ شاید کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلم منطقوں کو اس طرح ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے کہ دو علیحدہ علیحدہ ملک بن سکیں جو مسلمان ہندو ملک میں نہ رہنا چاہیں وہ اسلامی علاقے میں آ کر بس جائیں اور جو ہندو مسلمانوں کی قیادت گوارہ نہ کریں وہ ہندو ملک کی راہ لیں۔

(ش) لاجپت رائے

سی۔ آر۔ داس بنگال کے ایک مقتدر اور بے تعصب رہنما تھے ۱۹۲۵ء میں لالہ لاجپت رائے نے ان کو ایک خط لکھ کر ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر اپنے خدشات کا اظہار کیا ان کی تحریر کا ماحصل یوں ہے۔

میں نے گزشتہ مہینوں میں جیل کے اندر اسلامی قانون اور اسلامی فلسفے کا مطالعہ کیا ہے میں تو اس سے یہی سمجھ سکا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی خلقت میں اس قدر تضاد ہے کہ ان دونوں میں مستقل مفاہمت کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی۔ میں تو اس بات کو مانتا ہوں کہ بہت سے خلافتی راہنما بھی ہمارے ساتھ تحریک آزادی میں دوش بدوش کام کرتے رہے ہیں میں ان کے اخلاص کا معترف ہوں۔ لیکن میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھتا ہوں کہ وہ قرآن کے واضح احکام سے منہ نہیں موڑ سکتے ہماری اور ان کی کیسے بن آئے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دیں لیکن آزاد ہندوستان میں دونوں مل جل کر جمہوری حکومت نہیں چلا سکتے۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ میں انہی خیالات سے مضطرب رہا ہوں اور اس لیے ہے کہ آپ اپنی دانشمندی اور پیش بینی سے اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لیں گے۔ معلوم نہیں سی۔ آر۔ داس نے اس خط کو کوئی اہمیت دی قیاس ہے کہ یہ خط ان کو زندگی کے آخری دنوں میں ملا ہو گا۔

(ل) آغا خان

۱۹۲۴ء کے بعد کی ملکی فضا میں ہندو مسلم اختلافات دن بدن وسعت اختیار کر رہے تھے۔ فسادات کا دور دورہ تھا کسی ایسی سکیم پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق نہ ہو سکتا تھا۔ اسی ماحول میں نہرو رپورٹ تیار ہوئی جس کی سفارشات نے فرقہ وارانہ سنگین نہیں بلکہ آتشیں بنا دیا نہرو رپورٹ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لیے آغا خان سوئم نے ۱۹۲۸ء میں لندن ٹائمز میں دو مضمون لکھے۔ ان میں

مضمون نگار نے کہا کہ آزاد ہندوستان کا متحد رہ سکنا محال ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہندوستان کو لسانی ثقافتی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح موجودہ ہندوستان پانچ آزاد مملکتوں میں بٹ جائے گا صاحب مضمون نے ان ریاستوں کے جو حدود اربع تجویز کیے تھے اس میں کم و بیش دو ریاستیں وہی تھی جو شمال مغرب میں مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔

(م) علامہ اقبال اور خطبہ الہ آباد

دسمبر ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں جو خطبہ پڑھا اسے بہت احتیاط کے ساتھ دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے اس میں انھوں نے بہت مسائل پر بحث کی تھی کچھ مسائل وقتی نوعیت کے تھے اور کچھ دائمی اہمیت کے حامل تھے۔ انھوں نے تاریخی عمل کی قسمت کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی پیشین گوئی کی تھی کہ برصغیر کے شمال مغربی علاقوں میں ایک اسلامی سلطنت کا قیام ناگزیر ہے۔ یہی مملکت اسلامی اقدار کی حفاظت کرے گی اور مسلمانوں کے لیے اسلامی طرز زندگی کو ممکن اور سہل بنائے گی جس وقت یہ خطبہ الہ آباد میں پڑھا گیا تھا لندن میں گول میز کانفرس اجلاس ہو رہا تھا۔ علامہ اس میں شریک نہ تھے اگلے سال وہ دوسری گول میز کانفرس میں شامل ہونے کے لیے انگلستان گئے وہاں اُن کی ملاقاتیں قائد اعظم کے ساتھ ہوئیں ان ملاقاتوں میں تقسیم ملک کا ذکر بھی آیا ہو گا۔ لیکن اس کا کوئی فوری نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اسی دوران علامہ کی ملاقاتیں پنجاب اور سرحد کے اُن طالب علموں کے ساتھ بھی ہوئیں جو ان دنوں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

(ن) چوہدری رحمت علی

ان طالب علموں میں جنہوں نے اقبال کا گہرا اثر قبول کیا سب سے زیادہ شہرت رحمت علی کو ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء کے شروع میں ایک پمفلٹ لکھا جس کا عنوان تھا (Now or Never) اس کتابچے میں انھوں نے تقسیم ہند کی ایک تجویز پیش کی تھی اور پاکستان کا نام بھی خود ہی تجویز کیا تھا۔

(و) ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تقاضے

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے متعلق علامہ اقبال اور قائد اعظم دونوں کے دلوں میں شکوک و شبہات موجود تھے سرسید کے زمانے میں اکثریت گردی کا خدشہ کسی قدر مبہم تھا۔ اب وہ کھل کر سامنے آگیا فیڈریشن حقیقی فیڈریشن نہ تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ وحدانی حکومت جیسا تھا اور اس میں اقلیتوں کے تحفظ کے انتظامات بھی بالکل غیر مؤثر تھے کانگرس کی صوبائی حکومتوں کے مسلک نے اس بات کو بالکل ثابت کر دیا تھا کہ اکثریت کے نزدیک مسلمانوں

کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو وہ اپنی تہذیبی قدر کو
خیر باد کہیں اور اپنے آپ کو اکثریت میں ضم کر دیں۔ انہی دنوں علامہ اقبال نے قائد اعظم کو خطوط لکھے
ان میں تقسیم ملک کی تجویز پیش کی اس وقت کے حالات میں اس تجویز پر گہرا غور و فکر شروع ہوا۔ اور
مختلف سمتوں سے تقسیم ہند کی تجویزیں پیش کی گئیں۔ علامہ اقبال تو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے خالق
حقیقی سے جا ملے لیکن ان کے خیالات دن بدن گہری جڑ پکڑتے گئے قائد اعظم نے تقسیم ملک کی تجویز
کو مکمل طور پر کب قبول کیا۔ اس کے متعلق مختلف آرا ہو سکتی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۸ء کے
آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلم ثقافت کے تحفظ کے لیے تقسیم ملک کے سوا کوئی چارہ نہیں
یہ بات اس خطبہ صدارت سے عیاں ہے جو انھوں نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں لیگ کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں
پڑھا تھا۔ کانگرس وزارتوں کی کارروائیوں نے ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ان
کے مستعفی ہونے کے بعد قائد اعظم کی ہدایت پر ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منایا گیا اور ۲۳ مارچ
۱۹۴۰ء کو لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں قرار داد پاکستان پاس ہوئی

لیگ کے اجلاس کا پس منظر

اس وقت لاہور کی فضا انتہائی طور پر ناخوشگوار تھی، ۱۹ مارچ کو خاکساروں
کے ایک دستے پر حکومت کے اشارے پر پولیس نے ظالمانہ فائرنگ کی تھی۔ اس وحشیانہ طرز عمل
سے مسلمانوں کے دل خون خون تھے۔ پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے رو کان اپنے آپ کو مسلم لیگی بھی
کہتے تھے ان کے خلاف مسلمانوں میں زبردست ہیجان تھا۔ حکومت کی زبردست خواہش تھی کہ لیگ
کے اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے تاکہ عوام کو اپنے غم و غصہ کے اظہار کا موقعہ نہ مل سکے لیکن قائد اعظم
نے التوائی تجویز کو ٹھکرا دیا لاہور ریلوے اسٹیشن سے وہ سیدھے زخمی خاکساروں کو دیکھنے ہسپتال
گئے۔ اس کے بعد اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔

قرار داد پاکستان

لیگ کے اجلاس میں قائد اعظم کا خطبہ صدارت ہنگامہ انگیز تھا۔ انھوں نے تاریخی شہادت کی روشنی میں متحد
ہندوستان کے تصور کو غیر فطری قرار دیا اور کہا مسلمان قومیت کی ہر تعریف پر پورے اترتے ہیں
اس لیے وہ اپنے علیحدہ قومی وطن کے مستحق ہیں یہی بات ہندوؤں پر صادق آتی ہے۔ قرار داد
پاکستان کا متن یوں تھا۔
قرار پایا کہ غور و خوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے یہ ہے کہ کوئی آئینی

منصوبہ بغیر اس کے کہ ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے قابل قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو یعنی یہ کہ حد بندی کرکے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے ردوبدل کرکے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنایا جائے کہ وہ علاقے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جیسے ہندوؤں کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقوں میں اس طرح یک جا ہو جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر با اختیار اور خود مختار ہوں۔

یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی ثقافتی اقتصادی سیاسی انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے ان کے مشورے سے بقدر ضرورت موثر اور واجب التحصیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کیے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں حسب ضرورت موثر اور واجب التحصیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی ثقافتی کے سیاسی انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایک ایسی سکیم مرتب کرے جس میں اس کا انتظام ہو کہ بالآخر یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں جیسے دفاع امور خارجہ رسل و رسائل، کسٹم اور دوسرے امور جو ضروری ہیں۔

مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے اس قرار داد کی تحریک کی اور چوہدری خلیق الزمان نے تائید کی مزید تائید جن حضرات کی طرف سے ہوئی وہ مولانا ظفر علی خاں، سردار اورنگ زیب خاں، حاجی عبداللہ ہارون، نواب محمد اسماعیل، قاضی محمد عیسیٰ، بیگم محمد علی وغیرہ ہیں۔

ہندوؤں کا ردعمل

قرار داد بہ اتفاق رائے منظور ہوئی۔ تہنیت اور تحریک کے نعروں کے ساتھ لوگوں کو اس ریزولیشن کے منظور ہونے پر بڑی مسرت ہوئی، پہلی دفعہ ہندوستانی مسلمانوں کو وہ نصب العین ملا جس کا حصول ان کی جدوجہد پر منحصر تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اُن کے ہاتھ پر کھل گئے ہیں یہ آزاد اور خود مختار مملکت انھی علاقوں میں بننے والی تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس قومی وطن میں اسلامی تہذیب، تمدن ثقافت اور دین کو ترقی دینے کا موقعہ ملے گا۔ جو تقریریں اس موقعہ پر ہوئیں ان میں پاکستان کا قطعی طور پر کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس ریزولیشن کو محض تقسیم ہند کا ریزولیشن کہا گیا چوہدری رحمت علی کی کوششوں سے پاکستان کا لفظ مشہور ہو چکا تھا۔ ہندو پریس نے طعن اور طنز کے طریق پر اس نام کو

ایسا اچھالا کر زبان زدعوام ہوگیا بالآخر مسلم لیگ نے بھی اس کو قرارداد پاکستان کا نام دے دیا۔ قرارداد کی منظوری کے بعد برصغیر کے ہندوؤں میں ایک شور وغوغا مچ گیا، اس کے خلاف ہر ہندو بول رہا تھا اور ہر ہندو اخبار لکھ رہا تھا۔

مسلم اکثریت کے صوبوں کی سیاست

قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں میں ایک تلاطم آنا لازمی تھا۔

(الف) پنجاب

کی یونینسٹ وزارت نے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ۱۹۳۷ء کے لکھنؤ سیشن میں لیگ سے ناطہ جوڑا تھا۔ سردار سکندر حیات خاں صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے وہ طبعاً معتدل مزاج اور شائستہ انسان تھے انھوں نے ایک حد تک لیگ کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کو نبھانے کی کوشش کی اور ۱۹۴۱ء میں قائد اعظم کے حکم پر نیشنل ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن دسمبر ۱۹۴۲ء میں اُن کے انتقال کے بعد حالات بدلے۔ ان کے جانشین خضر حیات خاں لارڈ ویول کے قول کے مطابق، برطانوی تسلط کے دلی خیر خواہوں میں سے تھے ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ تھی وہ صوبائی گورنر اور وائسرائے کے اشاروں پر چلتے تھے انھوں نے پے در پے لیگ کے احکامات کو نظر انداز کرنا شروع کیا اسمبلی کے حکام اس میں کچھ دیر تو ان کی حمایت کرتے رہے لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ نے لیگ کو عوامی جماعت بنایا، اس سلسلے میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا فیڈریشن نے لیگ کے لیے ہراول دستے کا کام دیا ۱۹۴۴ء میں خضر حیات خاں کو لیگ سے نکال دیا گیا۔ ابتدا میں ان کے تقریباً بیس پیروکاروں نے پارٹی سے قطع تعلق کر کے اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کا علیحدہ بلاک بنایا لیکن ایوان سے باہر مسلم لیگ کو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے ہر مخالف پارٹی کو فیصلہ کن شکست دی۔

(ب) صوبہ سرحد

جنگ کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور گورنر راج قائم ہوا ۱۹۴۳ء کے آغاز میں یہاں سردار اورنگ زیب خاں کے سرکردگی میں مسلم لیگ کی وزارت بنی جو دو سال تک چلی سرحد کی رائے عامہ مسلم لیگ کے ساتھ تھی لیکن کچھ تو انتخابی حلقوں کی تشکیل ایسے ہوئی تھی اور کچھ اقلیتوں کو اپنی تعداد کے مقابلے میں اتنی وافر نمائندگی ملی ہوئی تھی کہ کانگریس نے اس مسلم

صوبے کو لیگ کے اقتدار سے بچانے کے لیے کامیابی کے ساتھ بہت سے ناواجب ذرائع استعمال کیے
اس لیے مسلم لیگ کو ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں متوقع کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے باوجود مسلمانوں
نے کی رائے عامہ پاکستان کے حق میں سیسہ پلائی دیوار بن گئی جب پنڈت نہرو ۱۹۴۶ء کے آخر میں صوبہ
سرحد کا دورہ کیا تو اُن کو لوگوں کے غیض و غضب کا ایسا سامنا کرنا پڑا کہ وہ مرتے دم تک نہ بھول سکے
ہونگے اسی طرح جب ماؤنٹ بیٹن اپنے آنے کے بعد صوبے کا دورہ کیا تو انھوں نے اپنی آنکھوں سے
دیکھ لیا کہ لوگ حصول پاکستان کے لیے کتنے مضطرب ہیں فریڈم ایٹ مڈنائٹ میں اس نظارے کا خاکہ
نہایت نپے تلے الفاظ میں مصورانہ چابکدستی سے کھینچا گیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کو خدشہ تھا کہ اس نے پاکستان
کے خلاف ایک کلمہ بھی منہ سے نکالا تو وہ اپنی جان بھی سلامت لے کر نہیں جا سکے گا۔ ۱۹۴۷ء میں جب
استصواب ہوا تو سرحد کے ووٹروں نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔

(ج) سندھ

سندھ میں مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی ضرب المثل تھی۔ ہندوؤں نے
اپنی اقتصادی برتری کے بدولت صوبائی سیاست میں بہت عمل دخل
حاصل کر لیا تھا۔ کانگرس نے یہاں بھی حصول اقتدار کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی تعجب کی بات
یہ ہے کہ جہاں کانگریس کو کسی صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی تو کانگریس راہنما وزارت بناتے
وقت کسی دوسری پارٹی کا تعاون ضروری نہ سمجھتے بلکہ جہاں کانگریس اقلیت میں ہوتی وہاں اسے
وزارت میں شامل ہونے کی کھلی اجازت تھی۔ وزارت میں شامل ہونے یا اس کی تائید کرنے کا
صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ ہر محاذ پر لیگ زک پہنچائی جائے چنانچہ سندھ میں تین چار سال تک
یہی ہوتا رہا۔ کمیونل ایوارڈ کی روح سے اسمبلی میں مختلف قوموں کی نشستوں کا تعین اس طرح کیا گیا
تھا کہ دس پندرہ ارکان کے گروپ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس چھوٹے سے گروپ نے
اپنے ذمے یہ فرض لگا رکھا تھا کہ اسمبلی کے اندر مسلمان ممبروں کے اتحاد کے تمام امکانات کو ختم کر دے
کچھ عرصہ تک تو یہ کھیل نہایت کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا، لیکن ایوان سے باہر رائے عامہ کی کیفیت
مختلف تھی آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ اس نے ۱۹۳۸ء میں ہی اس مضمون کا ریزولیوشن
پاس کر دیا تھا۔ اسمبلی کے اندر جوڑ توڑ ہوتے رہتے تھے ان میں سب سے نمایاں کردار خان بہادر
اللہ بخش نے ادا کیا جو کانگریس کے حکم پر اپنے قول سے پھر جانے پر تیار ہوتے تھے، انھی کی وجہ سے
سندھ کی سیاست مدوجزر کا شکار ہوتی رہی ان کے قتل کے بعد حالات بدلے اور کچھ عرصے کے بعد
مسلم لیگ پارٹی کی قیادت غلام حسین ہدایت اللہ کے ہاتھ میں آئی انھوں نے دو عمومی انتخابات

میں مخالفوں کو شکست دے کر اس صوبے کے لیے پاکستان میں شمولیت کا راستہ صاف کیا۔ حاجی عبد اللہ ہارون اس علاقے میں قائد اعظم کے دست راست تھے۔

(د) بنگال

مسلمانوں کی اکثریت تو بنگال کے مشرقی علاقوں میں تھی، لیکن کلکتہ کا شہر ہندو سیاست ہندو اخباروں اور ہندو تحریکوں کا گڑھ اور تحریک پاکستان کی مخالفت کا مرکز تھا ہندو اہل سیاست بے اصولی جائز سمجھتے تھے اور اپنے ڈھب کے ہر مسلمان کو گلے لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں قائد اعظم اور مولوی اے۔ کے فضل حق کے درمیان ڈیفنس کونسل کی رکنیت کے سوال پر اختلاف پیدا ہوا قائد اعظم نے مولوی صاحب کو مستعفی ہونے کا حکم دیا فضل الحق نے یہ بات تو مان لی لیکن ساتھ ہی لیگ کے ساتھ بھی اپنا تعلق قطع کر لیا بنگال اسمبلی کے مسلمان ممبروں پر اس کا ردعمل بہت شدید ہوا اور اُن کی اکثریت مولوی صاحب کی حمایت سے دست کش ہو گئی، اپنی ڈوبتی ہوئی وزارت کو بچانے کے لیے فضل الحق نے ہندو مہاسبھا کے ساتھ مفاہمت کر لی، لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ نے اُن کا ساتھ نہ دیا ان کی دست برداری کے بعد خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگی وزارت بنائی اس وزارت کو ہر قدم پر ہندو پریس اور ہندو تاجروں کی طرف سے بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا بدقسمتی سے جنگی ضروریات اور رسد کی دقتوں کی وجہ سے بنگال میں قحط کی صورت پیدا ہو گئی۔ ہندو منافع خوروں کی ہوس زر سے اس قحط کو اور بھی بھیانک بنا دیا اور یہ قحط خدائی عذاب بن گیا اس قحط کی تمام ذمے داری وزارت پر ڈال دی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں خواجہ ناظم الدین مستعفی ہو گئے ۱۹۴۶ء میں دہلی میں مسلم لیگ کنونشن میں حسین شہید سہروردی نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ڈائرکٹ ایکشن ڈے اور نواکھلی کے فسادات نے آئندہ تبدیلیوں کا راستہ ہموار کیا۔ بے لوث سیاسی کارکنوں اور طالب علموں کی کوششوں سے مسلم لیگ کو ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں عدیم النظیر کامیابی حاصل ہوئی۔

باب ۲۱

قرارداد سے قیام تک

کانگریس وزارتوں نے اکتوبر ۱۹۳۹ء میں اپنے استعفیٰ داخل کر دیے تھے۔ پارٹی کے لیڈروں کو پوری پوری توقع تھی کہ ان سے اس اقدام سے برطانوی حکمرانوں کے اوسان خطا ہو جائیں گے اور منت خوشامد کر کے ان کو واپس بلایا جائے گا۔ اور اقتدار دوبارہ ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جنگ کی غیر یقینی صورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگریس مرکزی حکومت پر قابض ہو جائے گی اور من مانی کر سکے گی لیکن انگریز حکمرانوں نے کانگریس کے رویے کو غنیمت جانا ان کے نزدیک کانگریس کو واپس بلانا، خانہ جنگی کو دعوت دینا تھا۔ اور جنگ میں ایسی صورت خطرے سے خالی نہ تھی۔ چنانچہ تمام کانگریسی صوبوں میں گورنر راج نافذ ہو گیا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو قائدِ اعظم کے ارشاد کے مطابق نہایت جوش و خروش کے ساتھ یومِ نجات منایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے لیے کانگریس کا محروم اقتدار ہونا کس قدر اطمینان کا باعث بنا۔ قائدِ اعظم نے اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط بنایا اس کو عوامی جماعت کے رتبے تک پہنچایا اور اسے مکمل طور پر مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت بنا دیا ان کی زیر قیادت، مسلم لیگ کو مسلمانوں میں وہی مقبولیت حاصل ہوئی جو کانگریس کو ہندوؤں سے ملی تھی۔ لیگ اس سے پہلے بھی مسلمانوں میں کانگریس کی رابطہ مہم کو ناکام بنا چکی تھی۔ اپنی سیاسی بیکاری کے زمانے میں کانگریسی لیڈر کبھی براہِ راست لیکن اکثر بالواسطہ، وائسرائے پر حصول اقتدار کے لیے زور ڈالتے رہتے تھے۔ لیکن وائسرائے نے (جس کا رویہ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی طرف کسی لحاظ سے بھی دوستانہ نہیں کیا جا سکتا) تمام ایسی تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ بالآخر کانگریسی لیڈر مایوس ہو گئے اور مناسب موقع کی تلاش کرنے لگے۔

جنگ کی صورتِ حال

(الف) ابتدائی دور اور کانگریس:۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہی جرمنی نے پولینڈ کی

فوجی قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔ جون ۱۹۴۰ء میں جرمنی کو فوجوں نے تین ہفتے کے اندر اندر ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کو عبرت ناک شکستیں دے کر مغربی یورپ اور اس کے متصل سمندروں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ یورپ میں مقیم برطانوی فوجیں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں بھاری مالی اور جانی نقصان اٹھانے کے بعد، بموں کی بارش کے نیچے سے گزرتے ہوئے، اپنے وطن کو واپس لوٹیں۔ یہ وقت برطانیہ کے لیے بڑا خطرناک تھا جرمنی کے مقابلے میں اس کی جنگی تیاری اور عسکری قوت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں نظر آ رہا تھا کہ اگر فرانس کو شکست دینے کے بعد جرمنی انگلستان پر حملہ بول دیتا تو اسے انگلستان پر قابض ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ سر انٹونی ایڈن نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ملک میں اسلحہ کی شدید قلت کے پیش نظر ہوم گارڈ کے نوجوانوں کو بندوقوں کی بجائے لکڑی کے ڈنڈوں سے مسلح کیا گیا، گاندھی، جنہوں نے ستمبر ۱۹۴۰ء میں وائسرائے کے روبرو آنسو بہا بہا کر انگلستان کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اب ذہنی طور پر بالکل بدل چکے تھے۔ انگلستان پر برے دن آئے تو انہوں نے اہل انگلستان سے مت ڈرو۔ دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دو۔ جب تمہارے ملک میں داخل ہوں تو عدم تشدد سے ان کا مقابلہ کرو۔ اسی طرح تم اپنی آزادی کی حفاظت کر سکو گے معلوم نہیں کہ گاندھی یا ان کے کسی چیلے نے خود اپنے ملک کے لیے کبھی اس نسخے کو آزمانے کا خیال کیا ہے یا نہیں کئی سال بعد اکالی سکھ لیڈر تارا سنگھ نے لاہور کے ایک غیر مسلم اخبار میں ایک سلسلۂ مضامین لکھ کر اس بات کا انکشاف کیا کہ جون ۱۹۴۰ء میں انگلستان کی شکست کے بعد برطانوی راج کا خاتمہ صرف نظر آ رہا تھا اور ہم نے لاہور بزورِ شمشیر قبضہ کرنے کے تمام انتظامات مکمل کر رکھے تھے۔

(ب) **اگست ۱۹۴۰ء کا اعلان:**۔ اس مخدوش حالت میں برطانوی حکومت نے اہل ملک اور بالخصوص مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانے کے لیے کہ حکومت کو اکثریت کے حوالے نہ کیا جائے گا۔ اگست ۱۹۴۰ء میں ایک اعلان کیا جسے عام طور پر August Declaration کہا جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ جنگ کے خاتمے پر آئین کے مسئلے کا از سر نو جائزہ لیا جائے گا اور ملک کے اہم اور بڑے عناصر کی خواہشات کے خلاف یہاں کسی حکومت یا آئین کو مسلط نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ اعلان میں قراردادِ پاکستان کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ لیکن یہ نہ تو مسلمانوں کے لیے آزادی کا پیغام تھا نہ ہی تقسیم ملک

کے اصول کی تائید تھی، صرف مبہم الفاظ میں یہ بتایا گیا تھا کہ بعد از جنگ نیا آئین وضع کرنے میں مسلمانوں کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا۔ اس طرح کے اعلان سے برطانوی فوجوں کے شانہ بہ شانہ لڑنے والے مسلمان عصر کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی مقصود تھی۔ لیکن جنگ کا نقشہ انگریزوں کے لیے انتہائی ناسازگار تھا اور کسی کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ برطانیہ اس طرح کے وعدے کرنے قابل بھی ہوگا یا نہیں ملک میں بے چینی دن بدن بڑھ رہی تھی، گاندھی دن بدن انوکھا طرز گفتگو اختیار کر رہے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وقت آنے پر وہ حکمرانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دقتیں پیدا کر دیں گے۔

(ج) روس اور جاپان کی جنگ میں شمولیت:- جنگ کا ایک ایک ہفتہ اور ایک ایک مہینہ انگریزوں کے لیے نئی آزمائشوں کا پیغام لاتا تھا۔ انگلستان روز برو ز جرمن بمبار طیارے آگ برساتے تھے جون ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے امن اور دوستی کے معاہدے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنے ملک کے مستقبل کو داؤ پر لگاتے ہوئے۔ روس سے ٹکر لے لی۔ جرمنوں کی یہ توقع کہ روس بھی فرانس کی طرح لقمۂ تر ثابت ہوگا۔ غلط نکلی۔ کچھ عرصہ تک تو جرمن فوجیں روس میں بلا روک ٹوک بڑھتی گئی لیکن آخر کار روسی مزاحمت نے جرمنوں کے دانت کھٹے کر دیے اور اس سلسلے میں سٹالن گراڈ کے شہر کا نام زندہ جاوید ہوگیا۔ اس سے جنگ کا خاتمہ دور کی بات ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں امریکہ اور جاپان بھی جنگ میں شامل ہو گئے امریکہ تو برطانیہ کے حلیفوں کی صف میں کھڑا ہوگیا اور جاپان نے جرمنوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

(د) ہندوستان پر جاپان کے حملے کا خطرہ:- جاپان کے جنگ میں کود پڑنے سے جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادیوں کے لیے، جنگ کی صورت نازک ہوگئی بجلی جیسی سرعت کے ساتھ جاپانیوں نے بحرالکاہل میں واقع وسیع اور زرخیز ملکوں پر قبضہ کر لیا، جلد ہی ان کی جنگی سرگرمیوں کا رخ برما کی طرف مڑ گیا یہ ملک ۱۹۳۵ء کا قانون پاس ہونے تک برطانوی ہند کا حصہ تھا اور ہندوستان کے صوبوں میں شمار ہوتا تھا۔ برما بھی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کے صوبوں میں شمار ہوگیا تھا۔ اور جاپانی فوجیں بڑھتے بڑھتے آسام کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ جاپانیوں کلکتہ کے شہر پر بھی جاپانیوں نے بمباری کی۔ اندازہ کیا جاتا تھا کہ اگر جاپانیوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی تو وہ کسی

کے بغیر ہندوستان کے شمالی حصوں پر قابض ہو جائیں گے ۔ اب تک ہندوستان جنگ کی تخت وتاراج سے بچا ہوا تھا اور یہاں سے جنگی ضروریات کا سامان بھاری مقدار میں جنگ کے محاذوں پر بھیجا جاتا تھا ایک طرف تو برطانوی حکومت متوقع حملے کے پیش نظر انخلاء کے منصوبے بنا رہی تھی ۔ اور دوسری طرف ہندوستان کی اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہاں تھی ، برطانوی وزیرِ اعظم چرچل ، برسوں تک آزادی ہند کے انگریز مخالفوں کی صفِ اول کے سور ما گنے جاتے تھے ۔ لیکن روز افزوں ابتر حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنے پرانے سیاسی دشمنوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور سر سٹیفورڈ کرپس کو چند ایسی تجاویز دے کر بھیجا جس سے کانگرس اور اس کی حواری جماعتوں کا اعتماد حاصل کرنا مقصود تھا ۔

کرپس مشن .... تجاویز

کرپس لیبر پارٹی کا ایک اہم اور وکالت پیشہ رکن تھا ، کانگریس کے اہم لیڈروں کے ساتھ اس کا پرانا دوستانہ تھا ۔ یہ اہم مشن اس کے سپرد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے ذاتی تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں برطانیہ کے لیے سازگار فضا پیدا کرے ۔ اس ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو آتے ہی ریڈیو پر اپنی تجاویز کا اعلان کیا بظاہر یہ تجاویز بہت خوشنما تھیں ۔

(۱) جنگ کے بعد کینیڈا ، آسٹریلیا ، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ جیسی خود مختاری کا وعدہ تھا اس بات کی تشریح کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی ملک چاہے تو دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو سکتا ہے لیکن ہندوستان میں خود مختار حکومت قائم کرنے سے پہلے انگریز ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ملک کا آئین تیار کروائیں گے ۔ اور اس آئین کو نافذ کر کے رخصت ہو جائیں ۔ یہ اسمبلی ترجیحاً متحدہ ہندوستان کے لیے آئین وضع کرے گی ۔ لیکن جس صوبے یا جن صوبوں کو یہ آئین قبول نہ ہو وہ وفاق سے علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں بلکہ چاہیں تو اپنی علیحدہ فیڈریشن بھی بنا سکتے ہیں

(۲) جنگ کے عرصے کے لیے ایک قومی حکومت بنے گی جو جنگی تیاریوں میں مدد تو دے گی لیکن اس کو جنگی معاملات پر کنٹرول نہیں ہوگا ۔ ان تجاویز سے ہندو پارٹیوں کو خوش کرنا مقصود تھا ۔ دولت مشترکہ سے علیحدگی کے اختیار پر گاندھی بے حد زور دیا کرتے تھے ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کا منصوبہ بھی ہندو فسلفہ سیاست کا جزو اعظم تھا ۔ مناسب نمائندگی کا مطلب یہ تھا کہ دستور ساز ادارے میں مسلمان ایک چوتھائی اقلیت میں ہوں گے اور رائے

شماری کے وقت ان کا ہر مطالبہ رد کیا جا سکے گا۔ ان تجاویز میں تقسیم ملک کی طرف ایک خفیف سا یہ اشارہ موجود تھا کہ کسی صوبے کو اس کی منشاء کے خلاف فیڈریشن میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس امر کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس کے متعلق اور بہت سے سوالوں پر "تجاویز" میں کوئی صراحت نہ تھی۔ کرپس نے سب سے اہم پارٹیوں کے نمائندوں سے طویل گفتگوئیں کیں ان کے نیک اعتراضات کے جواب دیے۔ برطانیہ کی نیک نیتی کا یقین دلانے کی کوشش کی چونکہ ان تجاویز کا مقصد محض سیاسی تھا۔ اس لیے ابتدائی مرحلے کے بعد کرپس نے مکمل طور پر کانگرس والوں پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ اور دوسری جماعتوں کو کم و بیش نظر انداز کر دیا۔ صدر امریکہ کا ذاتی نمائندہ کرنل جانسن اس موقع پر دہلی میں موجود تھا۔ وہ ساری کاروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جواہر لال نہرو اور کرپس کے درمیان نامہ و پیام کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ لیکن ان تمام گفتگوؤں کے سر سے چڑھنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ جنگ کا رخ کس طرف ہے اور اس میں برطانوی حکمرانوں کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں؟

(الف) **کانگرس کا ردِ عمل**:- گاندھی کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ انگریز جنگ میں ہار جائیں گے۔ اس لیے جنگ کے دوران اس سے کسی قسم کا عہد و پیمان دینے یا لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے کہ آزادی کا یہ پروانہ ایک ایسے چیک کی مانند ہے۔ جو اس بنک پر کاٹا گیا ہے جس کا دیوالیہ نکل رہا ہے۔ اور چیک کی تاریخ غیر معینہ مدت کے لیے معرض التواء میں ہے۔ اگرچہ کانگرس کے اندر چند اہل سیاست دان ایسے بھی تھے جو کرپس کی تجاویز کو قبول کر لینے کے حق میں تھے۔ لیکن گاندھی کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ کانگریس نے کرپس پر وعدہ شکنی کا الزام لگاتے ہوئے اس کی تجاویز کو رد کر دیا۔ ان قوانین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرپس نے دوسری پارٹیوں کے علم کے بغیر کانگریس والوں سے کسی قسم کے خفیہ معاہدے کیے تھے۔

(ب) **لیگ کا ردِ عمل**:- قائدِ اعظم کا رویہ شروع سے ہی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ان کا سب سے پہلا اعتراض تو آئین ساز ادارے کی غالب ہندو اکثریت پر تھا۔ لیکن اس سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ کرپس کی تجاویز کے مطابق نیا آئین ترجیحی طور پر ہندوستان کے لیے بنایا جائے گا۔ تقسیم ملک کا وعدہ مشروط اور مبہم

تھا۔اس کا پورا کرنا اکثریت کے ہاتھ میں تھا۔ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لیگ نے بھی کرپس کی تجاویز کو منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ واپسی سے پہلے کرپس نے آل انڈیا ریڈیو پر اپنی ناکامی کا اعلان کرتے ہوئے ایک طویل تقریر کی۔

(اس سارے قصے میں مسلمانوں کے لیے صرف ایک پہلو ہی قابل ہی اطمینان ہو سکتا تھا وہ یہ کہ برطانوی حکومت نے اپنے ۱۹۴۰ء کے اعلان پر اضافہ کرتے ہوئے مبہم طور پر ہی سہی تقسیم ملک کے اصول کو ٹھکرانے کی بجائے معرض امکان میں رکھ دیا)۔

اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے کانگرس کا منصوبہ: کرپس کے رخصت ہونے کے بعد

گاندھی کے خیالات میں ایک اور تبدیلی آئی، جنگ کے پہلے دنوں میں جب تک برطانوی سامراج کو کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ وہ برطانیہ کے ساتھ بھرپور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ جوں جوں برطانیہ کی جنگی پوزیشن کمزور ہوتی گئی، وہ مخالفت کا پہلو اختیار کرتے گئے۔ شروع میں تو ان کے سر دھیمے تھے لیکن بات ۱۹۴۱ء کی انفرادی سول نافرمانی سے شروع ہو کر ۱۹۴۲ء کے اعلان جنگ تک پہنچی اتحادیوں کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر انہوں نے حکومت پر جبری طور پر قبضہ کرنے کے لیے ایک نیا منصوبہ وضع کیا، اس منصوبے کے خد و خال آہستہ آہستہ ان کی تحریروں میں ابھرے۔ دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن بالغ نظر مبصرین کا اس بات پر اتفاق تھا۔ کہ گاندھی کی نئی مہم بدترین قسم کی موقع پرستی تھی۔ اب وہ حرکت کے لیے بے تاب تھے اور مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ برطانیہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے گھیرا ہوا تھا۔ جاپانی ہندوستان کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ مسلمان اور انگریزوں سے نپٹنے کا یہ ہی سنہری موقع تھا۔ چنانچہ ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی کے ایماء پر اور اس کی سرکردگی میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہو گئی۔ گاندھی کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ جاپانی ہندوستان پر صرف اس لیے حملہ کرنا چاہتے ہیں کہ برطانیہ سے برسرِ پیکار ہیں اگر انگریز اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں تو جاپانی پر قبضہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گے۔ یہ طرزِ فکر محض حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف تھا۔ وہ یہ بھی کہتے کہ ہماری جنگ آزادی کا یہ مرحلہ کھلم کھلا بغاوت کا مرحلہ ہے۔ ہمیں بدامنی

اور لاقانونی منظور ہے۔ لیکن موجودہ حکومت قبول نہیں۔ حکومت نے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے معقول انتظامات کر رکھے تھے۔ کانگریس انتظامیہ کے تمام ممبروں کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد وسیع پیمانے پر غیر قانونی کاروائیاں شروع ہو گئیں۔ سرکاری عمارتوں کو نظرِ آتش کیا گیا۔ ٹیلی گراف کی تاریں منقطع کی گئیں۔ سرکاری خزانوں کو لوٹ لیا گیا۔ متوازی حکومتی دفتر کھولے گئے۔ ٹیکسوں کی ادائیگی روک دی گئی۔ غرض یہ کہ کانگریسی صوبوں میں زندگی کا نظام معطل ہو کر رہ گیا۔ بعد میں حکومت کو کانگریس کے دفاتر سے جو دستاویزات ملیں ان سے معلوم ہوا کہ یہ سب تیاریاں بہت پہلے مکمل ہو چکی تھیں۔ معاشرے کے کاروبار کو معمول پر لانے کے لیے چند مہینے لگ گئے۔ اس بغاوت کے مقاصد کیا تھے؟ بظاہر "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ منصفانہ نظر آتا تھا۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو انگریزوں کے اخراج کے علاوہ، کانگریس کے دیرینہ ارادوں کے مطابق یہاں ایک ایسی "قومی حکومت قائم ہو جاتی جس میں مسلمانوں کا کوئی مقام نہ ہوتا۔ اور حصول پاکستان کے سلسلے میں جو کچھ ہو چکا تھا۔ وہ ملیا میٹ ہو جاتا اور پاکستان کا وجود میں آنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ اس لیے قائدِ اعظم نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کی پُرزور مخالفت کی۔ اور اپنے مؤقف کو دلائل سے ثابت کیا گیا۔ انہوں نے انگریزوں کو یہ مشورہ دیا کہ ملک کو "پہلے تقسیم کرو اور پھر اسے چھوڑ دو"۔

الزام اور جوابی الزام:- اس محل سرائے سے جسے گاندھی کا جیل خانہ کہا جاتا تھا گاندھی نے وائسرائے کے ساتھ متنازعہ فیہ معاملات پر مراسلات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جس میں تباہی اور لاقانونی کی ساری ذمہ داری حکومت کی انتظامی مشینری پر ڈال دی۔ وائسرائے نے اس یک طرفہ فیصلہ سے شدید اختلاف کیا۔ جنگ جاری رہی کانگریس کے بہت اہم لیڈر زندان میں تھے۔ کہ وائسرائے لن لتھ گو کی جگہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو کمانڈر انچیف ویول نے سنبھال لی۔ گاندھی نے اسے بھی کانگریس کی اصول پرستی اور بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن ویول نے اگے عذر لنگ کو سننے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے اپنی خطا کا اعتراف کرو، آئندہ کے لیے اچھے چلن کا وعدہ کرو اور پھر ہمارے ساتھ گفت و شنید کا آغاز کرو۔

قائدِ اعظم سے گاندھی کی ملاقاتیں:- سیاسی میدان سے کانگریس کی اس طویل غیر حاضری سے خود تو کانگرس کو کوئی نقصان نہ ہوا۔ کیونکہ اس کو ہندوؤں کی تائید حاصل تھی۔ البتہ مسلم لیگ کی پوزیشن مستحکم ہوئی۔ اور دوست و دشمن اس کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنے لگے۔ برطانیہ کو بھی روز بروز اس کا احساس ہو رہا تھا۔ متوازن ذہن رکھنے والے کانگریسی حلقے میں بھی پاکستان کے مطالبے کو حق بجانب قرار دیا جا رہا تھا۔
۱۹۴۲ء کے آغاز یعنی "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک سے چند ماہ پہلے مدراسی لیڈر راج گوپال اچاریہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ اس حق گوئی کی پاداش میں گاندھی نے اس کو جی بھر کر کوسا اور کانگریسی حلقوں میں ذلیل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ لیکن وہ اس سے نہیں دبے بلکہ انہوں نے تقسیم ملک کے لیے ایک فارمولا بھی وضع کر لیا۔ جس کو عام طور راجہ جی فارمولا کہا جاتا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں حکومت نے کچھ گاندھی کی ناسازئی طبیعت اور کچھ ان کی اہلیہ کی وفات کی وجہ سے اس کو رہا کر دیا۔ شاید یہ وجہ بھی ہو کہ اب جنگ کا پانسہ برطانیہ کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ رہائی کے بعد قائدِ اعظم کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں ہوئیں جو دو ہفتے سے اوپر جاری رہیں اس گفتگو میں قرار دادِ پاکستان پر تفصیلی بحث ہوئی۔ بعد میں جو کچھ ان دونوں رہنماؤں کی باہمی خط و کتابت کے شائع ہونے کے بعد معلوم ہوا وہ یوں تھا۔ گاندھی کا خیال تھا کہ یہ قرار داد مبہم اور تفصیل طلب ہے۔ راج گوپال اچاریہ فارمولا نے اسے بامعنی اور کارآمد بنا دیا ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی ہندی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور مذہب کا اختلاف ان کی ہندی قومیت کو باطل نہیں کرتا اگر ملک کو تقسیم کرنا لازمی ٹھہرے تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فوج، مواصلات اور خارجہ معاملات مشترک رہیں گے۔ تقسیم ملک انگریزوں کے جانے کے بعد عمل میں آئے اس سے پہلے ہرگز نہیں یہ تمام نکات قائدِ اعظم کے لیے ناقابل قبول تھے۔ گاندھی نے خود اپنی ایک چٹھی میں لکھا کہ ہمارے گفتگو ایسے دو متوازی خطوط کی طرح آگے بڑھتی ہے جو ایک دوسرے سے قطعی طور پر نہیں مل سکتے تھے۔ اگر ساری گفتگو کا حاصل صرف یہی تھا تو معلوم نہیں اس پر کیوں اتنا وقت صرف کیا گیا شاید گاندھی اپنی وسیع النظری دکھا کر رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہتے تھے۔

ویول کی تجاویز

۱۹۴۵ء کے آغاز میں جنگ کا خاتمہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جاپان کی قوت پر تو ابھی تک کوئی

مہلک ضرب نہیں لگی تھی البتہ جرمنی جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ اور اس کے ابھرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ ویول اپنے دل میں آئندہ کے متعلق منصوبے مرتب کر رہا تھا اور سمجھ دیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر بہت سے حل طلب مسائل جمع ہو جائیں گے۔ اور ان سب سے بیک وقت عہدہ برآمد ہونا ممکن نہ ہوگا۔ اس نے ہوم ورک کی ٹھانی اور قومی حکومت کے گڑے مردے کو نکال کر زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اسمبلی میں کانگریس اور لیگ کے لیڈروں کی بیان کردہ افہام و تفہیم سے مرکزی حکومت کی تشکیل نو کے متعلق تجویزیں مرتب ہوئیں۔ ان کو ساتھ لے کر ویول انگلستان گیا اور برطانوی حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد واپس آتے ہی اس نے ۱۴ مئی کو ان تجاویز کا ریڈیو پر اعلان کیا۔

شملہ کانفرنس

ان تجاویز کی منظوری کے لیے اس نے شملہ کے مقام پر ایک سیاسی کانفرنس طلب کی تجاویز کی جزئیات پر بحث کرنے کا موقع نہیں بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ مجوزہ حکومت کے مسلمان ارکان کس کی نمائندگی کریں گے۔ کانگریس سارے ملک کی نمائندگی کی اجارہ داری کی دعویٰ دار تھی۔ اور مجوزہ حکومت کے پانچ مسلمان ارکان میں سے دو نشستوں پر کانگریسی مسلمانوں کو نمائندگی دلوانا چاہتی تھی ویول پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے ایک یونینسٹ مسلمان کی نمائندگی اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ باقی دو مسلمان لیگ کی نمائندگی کر سکتے تھے قائداعظم کو اس طریق کار سے شدید اختلاف تھا۔ گذشتہ آٹھ سالوں کے ضمنی انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل ثابت تھی کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ویول کی نیت بھی صاف نہ تھی۔ وہ ایک طرف تو کانگریس کی خوشامد میں مصروف تھا۔ دوسری طرف یونینسٹ پارٹی جس کا وجود بھی متنازعہ فیلے تھا اور جو لیگ سے ۱۹۴۴ء میں بغاوت کر چکی تھی۔ لیگ کے مقابلے میں کھڑا کر رہا تھا۔ کانفرنس ناکام ہوئی ویول نے جائز طور پر اس کا اپنے سر لے لیا۔ اس کانفرنس کا مثبت نتیجہ یہی نکلا کہ ملک میں عمومی انتخابات کرانے کا فیصلہ ہوا تاکہ مختلف سیاسی جماعتوں کے دعاوؤں کا امتحان ہو سکے۔ انہی دنوں ایٹم بم کے سامنے خود کو بے بس پاتے ہوئے جاپان نے غیر مشروط طور پر شکست مان لی۔

۱۹۴۵ - ۴۶ کے انتخابات:- انتخابات ۱۹۴۵ء کے موسم سرما میں شروع ہوئے اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں ختم ہوئے۔ ان سے دو باتیں

ثابت ہوئیں، اول لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اور دوم برصغیر کے مسلمان تقسیم ملک چاہتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء کے وسط میں برطانیہ کے عمومی انتخابات میں لیبر پارٹی کو پہلی دفعہ پارلیمنٹ میں فیصلہ کن اکثریت حاصل ہوگئی اس کے پروگرام میں ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بہت اہم بتایا جاتا تھا یوں بھی لیبر پارٹی والوں کی کانگریس کے لیڈروں سے بہت گاڑھی چھنتی تھی لیبر کے برسرِ اقتدار آنے سے کانگریس والوں کے حوصلے اور بھی بڑھے۔ جواہرلال نہرو کو سخن سازی کا فن تو آتا ہی تھا۔ انہوں نے نہایت دیدہ دلیری سے کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کی رائے کو کوئی حیثیت نہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ الیکشنوں سے مسئلے کے تمام الجھاؤ ختم ہو چکے تھے ملک میں دو ہی پارٹیاں تھیں کانگریس اور مسلم لیگ۔ کانگریس ملک کو متحد رکھ کر اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔ مسلم لیگ اکثریت کے علاقوں کو پاکستان میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔

کابینہ مشن

مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے تین وزراء (کرپس پیتھک لارنس اور اے وی الیگزینڈر) پر مشتمل ایک مشن ہندوستان کو بھیجا تاکہ دونوں پارٹیوں کے درمیان افہام و تفہیم کی کوئی راہ نکلے، کرپس اور لارنس دونوں کانگریس کے خیرخواہ مربی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں کرپس کی تجاویز کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے ایک غلطی یہ کی کہ گفت و شنید کے تمام اختیارات کلی طور کرپس کے سپرد کر دیے تھے۔ اور وائسرائے ان سے بالکل بے تعلق تھا۔ اس لیے وہ پس پردہ بیٹھ کر تاریں ہلاتا تھا۔ اب کے وائسرائے ویول کو بھی اس مشن میں باقاعدہ طور پر شامل کر لیا گیا تھا۔ اس لیے اس مشن کے متعلق اس کی چھپی ہوئی ڈائری میں بہت سی کام کی اطلاعات مل جاتی ہیں۔ مشن نے حسب معمول اپنی کاروائی کا آغاز پارٹی لیڈروں کی ملاقات سے کیا۔ دو مہینے کے اندر ان کی ان پر حقیقت حال واضح ہوگئی ایک طرف تو برصغیر کے مسلمانوں میں پورا پورا اتحاد تھا۔ قائدِ اعظم کی قیادت مسلم تھی اور مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے متعلق کوئی اختلافات نہ تھا دوسری طرف کانگریس کو ہندو رائے عامہ کی پوری پوری تائید حاصل تھی اور تقسیم ملک کے بارے میں اس کا ردیہ لچک تھا ان دو نقطۂ ہائے نظر میں رابطہ پیدا کرنا مشکل تھا۔

مشن کی تجاویز:- بہت غور و فکر کے بعد مشن نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنی سکیم کا اعلان کیا۔ جس میں تقسیم ملک کو ٹالنے کی خاطر ایک محدود

اختیارات رکھنے والی ایسی مرکزی حکومت کی سفارش کی گئی تھی جو صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کی نگرانی کرے مرکز کو تو بہر حال اکثریت کی تحویل میں رہنا ہی تھا۔ اسی لیے دانستہ طور پر کمزور بنایا گیا تھا۔ تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو سکے اس مرکز سے نچلی سطح پر ایک دو منزلہ وفاق قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی اس مقصد کے لیے گیارہ صوبوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

ایک گروپ میں مسلم اکثریت کے شمال مغربی صوبے یعنی پنجاب سندھ، سرحد اور بلوچستان

دوسرے گروپ میں مسلم اکثریت کے شمال مغربی صوبے یعنی آسام اور بنگال

تیسرے صوبے میں ہندو اکثریت کے باقی ماندہ چھ صوبے

مجوزہ انتظام یہ تھا کہ ہر صوبے کی اپنی حکومت ہوگی اس کے اوپر ہر گروپ کی حکومت ہو گی۔ اور سب سے اوپر یونین کی محدود حکومت ہوگی جس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے غالباً مشن کا مقصد یہ تھا کہ گروپوں کی حکومتیں بہت با اختیار ہوں گی اور اس طرح اکثریت کے منطقوں کو دفاع امور خارجہ اور مواصلات کو چھوڑ کر باقی تمام معاملوں میں کلی اختیار ہو گا۔

دستور سازی کے لیے ایک، دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہونا تھا جس کو علیحدہ علیحدہ گروپوں میں بیٹھ کر صوبائی دستور نیز گروپوں کے دستور بنانے تھے، یہ تھا مشن کی سکیم کا ایک اہم حصّہ۔

دوسرا حصّہ یہ تھا کہ عبوری دور کے لیے ایک ایسی نمائندہ حکومت بنائی جائے گی جس میں بڑی بڑی پارٹیوں کے ساتھ اقلیتیں بھی شامل ہوں گی۔

ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ دس سال کے عرصہ کے بعد کوئی گروپ چاہے تو وہ انڈین یونین سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔

مشن کا اصرار یہ تھا کہ اس سکیم کے دونوں حصّے باہم مربوط ہیں اس لیے دونوں کو قبول کرو یا نامنظور۔

جو پارٹی اسے نامنظور کرے گی اسے نظر انداز کر کے تعاون کرنے والی پارٹی کی مدد سے عبوری حکومت کی تشکیل کی جائے

(ب) **مشن کی تجاویز کا حشر:**۔ دونوں کیمپوں میں مفصل بحث کے بعد کانگریس نے سکیم کا پہلا یعنی دستور سازی کا حصّہ تو منظور کر لیا لیکن عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ نے دونوں حصّوں کی

توثیق کر دی۔ لیکن قبولیت کی وجہ یہ بتائی کہ صوبوں کے گروپنگ سے مسلمانوں کے حق خودارادیت کو فوری طور پر بروئے کار لایا جاسکے گا۔ اور اس سکیم کے اندر رہتے ہوئے دس سال کے اندر اندر پاکستان بن جائے گا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے مؤقف کے مطابق ،مشن کے ارکان، کانگریس کو نظر انداز کرکے لیگ کو عبوری دعوت بنانے کی دعوت دیتے لیکن وہ اپنے وعدے سے پھر گئے۔

کانگریس نے سکیم کے پہلے حصے کی جو لنگڑی لولی منظوری دی تھی وہ اس طرح واپس لے لی گئی کہ جواہر لال ہنرد نے اعلان کیا کہ گروپنگ کو مشن کی سکیم کا لازمی جزو نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کسی صوبے کو اس کے مقرر گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا نیز دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی حقیقت یہ ہے کہ ساری کی ساری سکیم مشروط تھیں اگر کانگریس کی اس توضیح کو مان لیا جاتا تو مسلمانوں کا حق خودارادیت ساقط ہو جاتا اور دستور ساز اسمبلی کانگریس انتظامیہ کا تابع مہمل بن کر رہ جاتی اس پر لیگی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور لیگ نے بھی مشن کی سکیم پر از سر نو غور کرنے کے بعد اور مشن کی وعدہ خلافی پر احتجاج کرتے ہوئے اپنی منظوری لے لی اور ۱۶ اگست کا دن ڈائریکٹ ایکشن ڈے مقرر کیا جون کے آخر میں مشن کے ارکان انگلستان واپس چلے گئے انہوں نے گفت وشنید کے جو طریقے اختیار کیے تھے ان سے کانگریس اور لیگ کے اختلافات شدید تر ہو گئے۔ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی ناراضگی بہت بڑھی لیکن دستور ساز اسمبلی کے انتخابات بہت جلدی ہو گئے۔

عبوری حکومت اور اس کی ناکامی:- کابینہ مشن کی روانگی کے بعد وائسرائے نے عبوری حکومت بنانے کی کوشش از سر نو شروع کر دی اس ڈائری کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ لیبر گورنمنٹ اس سے اس لیے ناراض تھی کہ وہ سارا اقتدار کانگریس کے حوالے کرنے میں شامل کرتا تھا وہ نہرو اور گاندھی کے ہتھکنڈوں اچھی طرح سمجھتا تھا اس نے ایک انٹرویو میں ان دونوں کو یہ ڈانٹ پلائی۔ تم مجھے پیچ در پیچ قانونی موشگافیوں میں مت الجھاؤ بلکہ دیانت دار آدمیوں کی طرح مجھ سے گفتگو کرو۔ اسے پاکستان کے معاملے میں مسلمانوں کے شدید جذبات کا علم تھا۔ وہ کانگریس اور لیگ دونوں کے بین بین چلنا چاہتا تھا لیکن اپنے آقاؤں کی خواہشات کے سامنے بے بس تھا۔ چنانچہ اس نے ۹ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کانگریس کے نامزد ارکان کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا وقت نہایت نازک ۱۶ اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے موقع

پر کلکتہ میں ہولناک فساد ہو چکے تھے جن میں ہندوؤں نے دل کھول کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ مسلمانوں نے ۲ستمبر کو یوم احتجاج منایا ویول لیگ کو بھی حکومت میں شریک کرنا چاہتا تھا ورنہ خانہ جنگی کا فوری خطرہ سر پر سوار تھا آخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور لیگ بھی حکومت میں آئی۔ کانگریس نے تمام اہم محکمے اپنے پاس رکھے اور لیگ کے پاس صرف مالیات کا محکمہ جانے دیا۔ خیال یہ تھا کہ مسلمان حساب کتاب میں کمزور ہوتے ہیں اس لیے مالیات کا محکمہ لیگ کے نمائندے سے نہیں چل سکے گا۔ یہ عبوری حکومت جس میں لیگ اور کانگریس دونوں شامل تھیں بالکل بے کار ثابت ہوئیں اس کے کسی اجلاس میں کسی مسئلے پر اتفاق رائے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہر میٹنگ تو تو میں میں پر ختم ہو جاتی تھی۔ معاملات پر حکومت کی گرفت کمزور سے کمزور تر ہو رہی تھی۔ بہار مشرقی بنگال اور یوپی ہولناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ مرکزی حکومت کے کانگریسی ارکان ہندو فسادیوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کے جرائم سے پردہ پوشی کرتے تھے لیگی جواہر لال نہرو کو سربراہ حکومت تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔

کانگریس اور لیگ کے اختلافات

برطانوی حکومت کا فیصلہ:۔ سب سے اہم اختلاف صوبوں کی گروپنگ کے متعلق تھا۔ مسلمانوں کا حق خود اختیاری گروپنگ سکیم کی بنیاد پر قائم تھا۔ اگر گروپنگ کو ختم کر دیا جائے تو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ساری سکیم بے کار ہو جاتی تھی کانگریس گروپنگ کو کے لیے اختیاری قرار دیتی تھی اس کا اصرار یہ بھی تھا کہ مسلم لیگ ان کی طے کی ہوئی شرائط کے ماتحت دستور ساز اسمبلی میں داخل ہو ورنہ حکومت سے مستعفی ہو جائے۔ آخر کار

برطانوی حکومت، جو کئی مہینے سے اس بحث کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتی رہی تھی، حرکت میں آگئی اور اس نے لندن میں لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کر کے یہ فیصلہ دیا کہ گروپنگ لازمی ہے اختیاری نہیں۔

اس فیصلے سے کانگریس کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔ لیکن دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا جس میں لیگ نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس سے پاکستان کا حصول یقینی بن گیا۔ عبوری حکومت کے اندرونی اختلافات سالانہ بجٹ کے موقع پر کھل کر سامنے آگئے وزیر خزانہ لیاقت علی خان کی نگرانی میں جو میزانیہ تیار ہوا اس میں صنعت کاروں اور تاجروں پر بھاری ٹیکس

لگائے گئے تھے آج کل کے مقابلے میں تو یہ ٹیکس معمولی تھے لیکن ان دنوں کے معیار سے ان کو بھاری سمجھا جاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ دوران جنگ کی صنعتی ترقی سے بے شمار لوگوں نے بے اندازہ دولت کمائی تھی۔ وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے حکومت کو دھوکہ دیتے تھے اور سرکاری واجبات کو روک لیتے تھے۔ بجٹ میں ایسے نادہندہ ٹیکس گزاروں کا جو زیادہ تر ہندو تھے اچھی طرح تدارک کیا گیا تھا حکومت کے ہندو ارکان اس بات کو لے اٹھے کہ یہ بجٹ ایک انتقامی بجٹ ہے حالانکہ معاملہ اصلاحی اور انتظامی نوعیت کا تھا۔ اس سے ہندوؤں کو مسلم لیگ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے ایک اور ہتھیار مل گیا آخر کار کچھ دو اور کچھ لو۔ کے اصول پر حکومت کے دونوں دھڑوں میں مفاہمت ہو گئی۔ عبوری حکومت کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا اس کا ناکام تجربہ قیام پاکستان کے ساتھ ختم ہو گیا۔

باب ۲۲

انتقالِ اقتدار

دو ستمبر ۱۹۴۶ء کو جواہرلال نہرو کی سرکردگی میں عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی چند ہفتے کے بعد لیگ بھی اس میں شریک ہو گئی لیکن اس مشترکہ حکومت سے کوئی اچھے نتائج برآمد نہ ہوئے۔ بلکہ حالات بدسے بدتر ہوتے چلے گئے فساد اور تشدد کے واقعات روزمرہ کا معمول بن گئے۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں برطانوی حکومت نے اس امر کا فیصلہ کر دیا کہ صوبوں کی گروپ بندی کیبنٹ مشن کی سکیم کا لازمی جزو ہے اس فیصلے کے فوراً بعد ہی کانگریس نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع کرا دیا لیکن وہ اپنے اس موقف پر پہلے کی طرح قائم رہی کہ ہر صوبے کو اپنے گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی پوری آزادی ہے۔ اس رویے کو مد نظر رکھتے ہوئے لیگ کے نمائندے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں سربلند ہوئے۔

لیبر حکومت اور وائسرائے ویول: ۱۹۴۶ء کے آغاز میں حالات اس طرح پر تھے کہ جنگ نے برطانیہ کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اب اس کے لیئے ہندوستان پر قبضہ رکھنا مشکل تھا، ملک میں لیبر پارٹی کی حکومت برسراقتدار تھی، اس کے سربراہ اٹیلی، سائمن کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے اور پارٹی میں ہندوستان کے معاملات میں ایکسپرٹ سمجھے جاتے تھے۔ پتھک لارنس اور سر سٹیفورڈ کرپس اس جماعت کے صف اول کے راہنماؤں میں شمار کیئے جاتے تھے۔ کانگریس والوں کے ساتھ ان کا پرانا دوستانہ تھا اور دونوں کے درمیان اکثر نامہ و پیام ہوتے رہتے تھے وہ کانگریس کے بہت سے ناواجب مطالبات کے ڈٹ کر تائید کرتے اور وقت پر سب وعدوں سے پھر جاتے تھے، ان سے ہو سکتا تو ملک کی حکومت اکثریت کے سپرد کر کے ایک طرف ہو جاتے۔ ان دنوں لیگ کو مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ ویول ہندوستان کا وائسرائے تھا وہ اپنے ذاتی تعصبات تو رکھتا تھا لیکن یہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھا، اسے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک کے اندر رائے عامہ کی کیسا کیفیت ہے اور مختلف پارٹیوں کو کتنی قوت حاصل ہے۔ وہ اس بات کو بھی دیکھ چکا کہ کانگریس کے لیڈر کسی نکتے پر بھی لیگ سے سمجھوتہ کرنے کے لیئے تیار نہیں کیونکہ ان کا مقصد حالات کو سلجھانا نہیں بلکہ اُلجھانا تھا، اگر اس سے بن پڑتا تو وہ کانگریس کو اس کے جائز مقام پر رکھتا اور اس کی نازبرداری نہ کرتا۔

لیکن آخر کار وہ برطانوی حکومت کا ایجنٹ اور اپنے آقاؤں کا حکم بردار تھا۔ اگر وہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی منصفانہ فیصلہ کرنا چاہتا تو اُسے لندن سے ڈانٹ پڑتی اس لیئے اس کی قوت فیصلہ مفلوج ہو چکی تھی، اس بارے میں اس پر الزام دینا درست نہیں۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بھی اپنے آپ کو انہی حالات کے شکنجے میں کسا ہوا محسوس کرتا۔ اپنے طور پر، برطانوی حکومت، کانگریسی لیڈروں کی خواہش کے مطابق ویول کو واپس بلانے کا فیصلہ تو دسمبر ۱۹۴۶ء میں ہی کر چکی تھی لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس فیصلے کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا اور دو مہینے کے بعد ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو اس کا اعلان ہوا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کا اعلان:

اسی اعلان میں برطانوی حکومت کے دو اور فیصلے بھی منظر عام پر آئے اول۔ برصغیر کی حکومت سے برطانیہ جون ۱۹۴۸ء میں قطعی طور پر دست بردار ہو جائے گا۔

دوم۔ کسی اقلیت کو یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ اکثریت کے فیصلوں کے خلاف اپنی رائے منوا سکے۔

اس اعلان پر کسی لمبی چوڑی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں ویول کی واپسی، کانگریس کے راہنماؤں کی منشا کے عین مطابق تھی اور ان کی سفارش پر عمل میں آئی تھی ویول نے بجا طور پر اس کو اپنی برطرفی سمجھا۔ برصغیر کی حکومت سے دست برداری کا فیصلہ تو ۱۹۴۲ء سے ہو چکا تھا لیکن برطانیہ نے حتمی تاریخ کا تعین پہلی بار کیا۔ اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی پالیسی نئی تو نہ تھی لیکن اس کا واشگاف اقرار ۲۰ فروری کے بیان میں ہی کیا گیا۔ گذشتہ کئی سالوں سے برطانیہ کے نمائندے بتکرار کر چکے تھے کہ آبادی کے "اہم عناصر" کی مرضی کے خلاف کوئی آئین یا کوئی حکومت مسلط نہ کی جائے گی لیکن اب اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ اعلان کا اصل مقصد یہ بتایا تھا کہ آئندہ کے لیئے برطانوی حکومت، ہندوستان کی ہندو اکثریت کی مرضی کے تابع ہوگی اور اسی کی خواہشات کے مطابق انتقال اقتدار عمل میں آئے گا۔ جواہر لال نہرو اور کانگریس کے دوسرے راہنماؤں نے اٹیلی پر تحسین کے پھول برسائے۔ نئی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا کام ویول سے نہیں لیا جا سکتا تھا اس کام کے لیئے ماؤنٹ بیٹن کو منتخب کیا گیا۔

ماؤنٹ بیٹن، اس کے مشیر اور اختیارات:

ماؤنٹ بیٹن کی عمر اس وقت ۴۶ برس تھی وہ انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران وہ جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر

رہ چکا تھا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں وہ اکثر وہی آنا جاتا رہتا تھا۔ یہاں کے حالات کا اپنے نقطہ نظر سے تجزیہ کر سکتا تھا اور حکومت ہندوستان کے اعلےٰ ترین افسروں سے واقفیت پیدا کر سکتا تھا۔ یہاں آنے سے کچھ عرصے پہلے وہ سنگاپور میں نہرو سے ملاقات کر کے اس کی میزبانی کر چکا تھا اور اس نے حکومت ہند کی خواہشات کے خلاف نہرو کو سنگاپور میں چلت پھرت اور تقریر کی آزادی دے دی تھی، اس سے دونوں کے درمیان دوستی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن ایک خود سر انسان تھا۔ زبان سے تو وہ جمہوریت کا دم بھرتا تھا لیکن عملاً اس کی طبیعت میں بدترین قسم کی آمریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ باتیں بنانے کا فن جانتا تھا اور لوگوں کو اپنی دلکش گفتگو سے موہ لینے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وائسرائے کا کثیر ذاتی سٹاف اس شاہانہ ضروریات کے لیئے ناکافی ہو گا وہ انگلستان سے اپنے ساتھ مشیروں اور مداحوں کی ایک فوج لے کر آیا۔ ان میں دو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

- اول، لارڈ اسمے جو دوران جنگ برطانیہ کا چیف آف سٹاف رہ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی اس بات پر اظہار اطمینان کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کی ہندو نوازی کے متعلق یہاں کے مسلمانوں کو کوئی علم نہ تھا۔
- دوسرے شخص کا نام کیمپبل جانس تھا جو اس کا تعلقات عامہ کا انچارج تھا۔
- ماؤنٹ بیٹن نے آتے ہی وی۔ پی۔ مینن کو بھی اپنے مشیروں میں شامل کر لیا۔ مینن کہنے کو تو سرکاری ملازم اور عہدے کے لحاظ سے حکومت ہند کا دستوری مشیر تھا، لیکن ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ اس کے تعلقات گہرے تھے۔ وہ حکومت کے اندر رہتے ہوئے کانگریس جاسوس اور وائسرائے کے روبرو کانگریس کا ترجمان بن گیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے اردگرد جس طرح کے لوگوں کا جم غفیر تھا ان میں سے ہر کوئی لیگ، قائد اعظم اور پاکستان کے مطالبے کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ خود بھی ماؤنٹ بیٹن کا طرز فکر یہی تھا۔

اسے برطانوی لیبر حکومت کی طرف سے سب سے اہم ہدایت یہی ملی تھی کہ وہ پاکستان کے مطالبے کو غیر موثر بنا کر رکھ دے اور ملک کی تقسیم ہونے سے روک دے۔

شاید یہ کہنا بھی زیادتی نہ ہو کہ اسے برطانوی حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت بھی ملی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جو ہدایات اُسے دی گئی تھیں، وہ سب کی سب اُس کی خود تجویز کردہ تھیں۔ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انتقال اقتدار کے لیئے لیبر حکومت کی پالیسی ماؤنٹ بیٹن کے مشورے

پر ہی وضع کی گئی تھی اور اس پر عمل درآمد کرانے کا کام بھی اس کے ذمے لگایا گیا تھا۔ آنے سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے لنڈن حکومت پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میں موقع پر تمام فیصلے خود کرونگا اور برطانوی حکومت کو ان میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

اس نوعیت کے وسیع اختیارات ماؤنٹ بیٹن سے پہلے کسی وائسرائے کو حاصل نہیں ہوئے تھے۔ اپنے عہدے کے فرائض کی بجا آوری میں وہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا تھا اور اس کا طرز عمل بہت حد تک غیر ذمہ دارانہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن کا طریقۂ کار

(الف) لیڈروں سے ملاقاتیں: ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو یہاں پہنچتے ہی ماؤنٹ بیٹن نے اہل سیاست سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا، وہ کانگریسی لیڈروں کو بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ان کی باری پہلے آئی۔ قائداعظم کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات اس کی آمد کے چودہ دن بعد ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن کو اپنی کامیابی کا بہت یقین تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اپنی منطق اور اپنی ذاتی جاذبیت سے مطالبہ پاکستان کو ختم کر دونگا۔ لیکن قائداعظم کے ساتھ پہلی ملاقات میں اُس خوش فہمی رفع ہو گئی۔ برسوں بعد اس نے لندن کے ایک پبلک جلسے میں بتایا کہ متحد ہندوستان کے مستقبل کے متعلق پُر امید تھا لیکن اس ملاقات میں ہی میرا یقین متزلزل ہو گیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے خیر خواہوں اور مداحوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کانگریس کا بے حد طرف دار تھا۔ اور اُسے قائداعظم کے ساتھ دلی بغض تھا۔ جلد ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ ملک کی تقسیم ناگزیر ہے۔ کانگریس نے بھی یہی بات محسوس کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کی آمد سے چند دن پہلے بنگال اور پنجاب کے صوبوں کی تقسیم کے حق میں قرارداد پاس کر دی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے فی الفور محسوس کر لیا کہ کانگریس کے لیڈر بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ گاندھی نے اپنی سیاسی پٹاری سے عجیب فرسودہ تجویز نکال لی کہ ملک متحد رہے اور قائداعظم کو اس کا وزیراعظم بنا دیا جائے جواہر لال نہرو بہت جوش وخروش کے ساتھ اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگا رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم والی قرارداد سے ملک کی تقسیم کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ پٹیل اپنے دل میں تقسیم ملک کا قائل ہو چکا تھا لیکن کبھی کبھار

اپنی پارٹی کی دلجوئی کے لیئے قیام پاکستان کے خلاف بیان داغ دیتے تھے۔ نہرو کی مدد سے ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے گاندھی کی مہم اور پریشان کن بیان بازیوں کو بند کرایا۔ ساتھ ہی نہرو کو تقسیم ملک کے حق میں مائل کرنے کی کوشش کی۔ نہرو بھی اپنی ضد کے پکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم کی تجویز حکومت کی طرف سے پیش ہونا چاہیے۔ ہم اسے مان لیں گے لیکن اپنی زبان سے ہم تقسیم کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

(ب) ماؤنٹ بیٹن کی پہلی سکیم: اس مہم سے فراغت کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے آزادی ہند کی ایک سکیم مرتب کی اور اس کی تفصیلات کو دو قاصدوں کے ہاتھ انگلستان بھجوایا اس تجویز کا مرکزی نکتہ یہی تھا کہ ۲۰ فروری کے بیان کے مطابق انگریزوں کے چلے جانے کے بعد تمام صوبے خود مختار تصور کیئے جائیں گے۔ اور اس سے پیدا ہونے والی صورت کو وفاق میں تبدیل کرنے کا اختیار صوبوں کو ہی حاصل ہوگا۔ اس سکیم کو لنڈن بھیج کر ماؤنٹ بیٹن کچھ دن سستانے کے لیئے شملہ چلا گیا طے شدہ انتظام کے مطابق دو چار دن کے بعد نہرو بھی وہاں پہنچ گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی سکیم کو نہرو کے سامنے رکھا نہرو اسے دیکھ کر غصے سے لال پیلے ہوگئے اور اس سکیم کو قطعی طور پر ٹھکرا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ ملک کو تقسیم ہی کرنا چاہتے ہیں تو اسے گیارہ صوبوں کی بجائے دو مملکتوں میں بانٹ دیں۔

(ج) دوسری سکیم: اس پر ماؤنٹ بیٹن نے فی الفور لنڈن میں پیغام بھیج کر اپنی سکیم کو ساقط قرار دے دیا ساتھ وہیں تقسیم ملک کا ایک مسودہ وی۔ پی مینن کے قلم سے تیار کروایا۔ جو مکمل طور پر نہرو کی ہدایت کے مطابق تھا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ دوسرا منصوبہ جو بالآخر تقسیم ملک کی بنیاد بنا صرف نہرو کو مطمئن کرنے کے لیئے بنایا گیا تھا۔ اس مرحلے پر قائداعظم یا مسلم لیگ کو نہ پہلا منصوبہ دکھایا گیا تھا نہ دوسرا۔ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان شملہ میں طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں دونوں گھل مل گئے۔ دونوں تقسیم ملک کے شدید مخالف تھے۔ لیکن دونوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی رائے عامہ کے سامنے بے بس پایا۔ انہوں نے شملہ کی بلندیوں پر بیٹھ کر بہت بحث تمحیص کی۔ اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی دستاویزی شہادت موجود نہیں لیکن بعد کے واقعات سے یہ شبہ یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ تقسیم ملک کے طریق کار اور عمل میں پاکستان کے ساتھ جتنی بے انصافیاں ہوئیں ان کی بنیاد یہیں پر رکھی گئی تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد دہلی میں واپس آ کر ماؤنٹ بیٹن نے ترمیم شدہ منصوبہ

قائد اعظم کو دکھایا اور اسے اپنے ساتھ انگلستان لے گیا۔

۳ جون کا اعلان

حکومت انگلستان نے ماؤنٹ بیٹن کی تجاویز میں معمولی سا رد و بدل کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے دہلی پہنچ کر لیگ، کانگریس اور سکھوں کے سرکردہ لیڈروں کو اس سے آگاہ کیا۔ اور اگلے دن یعنی ۳ جون کی شام کو ریڈیو پر اس کا اعلان میں تقسیم کا اصول تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اور تقسیم کے طریق کار اور پروگرام کے متعلق ضروری تفصیلات دی گئی تھیں تقسیم ملک کے ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی تقسیم لازمی قرار دی گئی تھی وہ اس طرح کہ ان صوبوں کی اسمبلیوں کے ہندو اکثریت کے اضلاع اور مسلم اکثریت کے اضلاع (جن کی فہرست اعلان میں نتیجے کے طور پر شامل تھی) کے نمائندوں کو علیحدہ علیحدہ سیکشنوں میں بیٹھ کر اس امر کا فیصلہ کرنا تھا کہ ان کو تقسیم ہونا چاہیے یا نہیں اگر ان دونوں سیکشنوں میں سے ایک سیکشن بھی تقسیم حق میں رائے دے تو صوبے کو تقسیم کردیا جائے گا۔ یہ منطق نہایت ٹیڑھی تھی۔ اس کی رو سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ عملی طور پر اکثریت کو نہیں بلکہ ان صوبوں کو ہندو اقلیتوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ کیونکہ اس بات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ ہندو اقلیتیں، ہندوستان میں شمولیت کے حق میں ووٹ دیں گی۔ بظاہر ماؤنٹ بیٹن یہ تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا کہ طریق کار جمہوری ہے۔ لیکن یہ صرف ایک چال تھی۔ تقسیم ملک کی صورت میں وہ پنجاب اور بنگال کو خود تقسیم کروانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیئے اس نے ایک ایسا طریق کار وضع کیا کہ فیصلہ تو اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ لیکن فیصلے کی ذمہ داری دوسروں پر ہو۔ سلہٹ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے پاکستان میں شمول کے سوال پر دونوں علاقوں میں ریفرنڈم کی تجویز کی گئی۔ بلوچستان میں اس امر کا فیصلہ کونسل آف ایڈرز پر چھوڑ دیا گیا۔

قیام پاکستان کے راستے میں مشکلات:۔ اگر اس سارے منصوبے پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ اس کی رو سے مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کے حق خود ارادیت ایسے پیچ دار طریقے پر مانا گیا تھا کہ پاکستان میں شامل ہونے والے چپہ چپہ اور اس کے رہنے والوں کو ایک نئے امتحان سے گزرنا پڑے اور اپنے عزم کا اعادہ دوٹوں کے ذریعے کرنا پڑے۔ شاید ماؤنٹ بیٹن یا اس کے کسی مشیر کو یہ بات یاد نہ تھی کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں بھی وسیع اور واضح مسلم اکثریت کے علاقے موجود تھے۔ اگر

مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو خود ارادیت کا حق دے دیا گیا تھا، تو ہندو صوبوں کی اقلیتوں کو اس حق سے محروم رکھنے کا کیا جواز تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن کے فیصلوں کا انحصار منطق، قانون یا انصاف پر نہیں تھا۔ اس کی نیت کچھ اور تھی وہ یہی چاہتا تھا کہ اتنے دشوار طریقے سے قیام پاکستان کو سرے سے ناممکن بنا دیا جائے۔ اور پاکستان وجود میں آ بھی جائے۔ تو اس میں مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہے۔ ۳ر جون کے اعلان میں دونوں ملکوں کی آزادی کی تاریخ ۱۵ر اگست مقرر کی گئی تھی۔ اڑھائی مہینے کم کا یہ عرصہ لیگ کے راہنماؤں کے لیئے سخت محنت شاقہ کا زمانہ تھا۔ اس عرصے میں حکومت ہند کے اثاثوں کی تقسیم کا مشکل کام کیا جانا تھا۔ سلہٹ اور صوبہ سرحد میں استصواب ہونا تھا۔ دونوں ملکوں کے حدبندی کمشن کو اپنی رپورٹ مکمل کرنا تھی۔ پاکستان کی نئی حکومت کو منظم کرنا تھا ظاہر ہے کہ ان گیارہ ہفتوں میں مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کو سخت آزمائش میں سے گزرنا تھا۔ اس امتحان کے دوران ایک طرف ہندوؤں کی پیہم سازشوں اور دوسری طرف برطانوی حکومت اور خصوصاً اسکے نمائندے ماؤنٹ بیٹن کی کھلم کھلا مخالفت کا سامنا کرنا تھا۔ جب کبھی ماؤنٹ بیٹن کی توجہ اس امر کی طرف دلائی جاتی کہ اتنے مختصر وقفے میں اتنے بڑے کاموں کا کامیابی کے ساتھ انجام پانا مشکل ہے تو وہ نہایت بے رخی بلکہ درشتی سے جواب دیتا اور پاکستان کا ذکر نہایت ناشائستہ الفاظ میں کرتا۔

مسلمان اس کڑے امتحان میں کیوں کر کامیاب رہے؟ اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہے: قوم کا جذبہ آزادی اور اس کا عزم و ہمت اور قائد اعظم کی بے نظیر قیادت۔

ماؤنٹ بیٹن کے عزائم

یہاں ماؤنٹ بیٹن کے بعض عزائم کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

(الف) شروع سے ہی اس نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ انڈین آرمی کو دو حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ بلکہ دونوں ملکوں کی دفاعی ضروریات کو ایک ہی فوج پورا کرے۔ یہ تجویز سیاست کے کسی مسلمہ اصول سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ قائد اعظم نے اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ فوج کا مکمل کنٹرول کسی مملکت کے اقتدار اعلیٰ کی پہلی اور لازمی شرط ہے۔ جو حکومت اپنی فوج پر پورا پورا قابو نہیں رکھتی وہ آزاد کہلانے کی مستحق نہیں۔ اگر ماؤنٹ بیٹن اس ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو پاکستان کی آزادی بے حقیقت بن کر رہ جاتی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دونوں ملکوں میں فوجوں اور اسلحہ کی تقسیم کا کام سابق کمانڈر انچیف کلاڈ آکن لیک کے ذمے لگایا تھا۔ اس کے "امداد" کرنے والے ہندوستان کے نمائندوں نے

اس کام میں ہر قدم پر ایسے روڑے اٹکانے شروع کئے کہ آگن لیگ کو یہ کہنا پڑا کہ ہندو ہرگز نہیں چاہتا کہ پاکستان وجود میں آئے۔ لیکن آگن لیگ نے تمام مشکلوں پر عبور پا کر اپنا کام وقت مقررہ کے اندر اندر ختم کر دیا۔ اس پر کانگریس کے لیڈر بہت برہم ہوئے۔ پٹیل کی یہ توقع کہ پاکستان کو بننے دیا جائے لیکن اس کے پاس اپنی کوئی فوج نہ ہو، پوری نہ ہوئی عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہندو اخبارات نے یہ سارا شور دغوغا ماؤنٹ بیٹن کے ایماء پر ہی کیا تھا۔

(ب) ماؤنٹ بیٹن کی دوسری بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ خود ہی دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بن جائے اس نے جس ڈھٹائی اور بے اصولی سے کانگریس اور ہندوؤں کے مطالبات کی تائید کی تھی۔ اس کے صلے میں حصول آزادی کے بعد اسے ہندوستان کی گورنر جنرل کی پیشکش کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ یہ چاہنے لگا کہ پاکستان کی طرف سے بھی یہی انعام اس کی جھولی میں ڈال دیا جائے اس کی یہ توقع بے معنی تھی۔ دولت مشترکہ کی ساری تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ دو ملکوں کی سربراہی کے فرائض بیک وقت ایک ہی شخص کو سونپے گئے ہوں، اس سے وہ اپنی دستار میں ایک اور کلغی لگانا چاہتا تھا۔ اگر اس کی خواہشات کا احترام کیا جاتا تو ایک خطرناک صورت حال پیدا ہو جاتی۔ بیرونی دنیا، ہندوستان اور پاکستان کو ملا کر ایک ہی ملک سمجھتی رہتی اور پاکستان کی آزادی کی علامتی اہمیت بھی نہ رہتی ایک اسلامی مملکت کی سربراہی کے لیئے ایک غیر مسلم کا انتخاب کبھی کسی حیثیت سے موزوں نہ ہوتا۔ چونکہ ماؤنٹ بیٹن تقسیم ملک کا بے حد مخالف تھا اس لیئے دونوں ملکوں کی سربراہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اکھنڈ بھارت کے لیئے راستہ صاف کر دیتا۔ ان دونوں کے علاوہ اگر وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی اپنی پوزیشن کیا ہوتی۔ کیونکہ بہت سے اہم معاملات پر اسے دونوں ملکوں کی حکومتوں کی طرف سے متضاد مشورے ملتے اور ماؤنٹ بیٹن یا اس کی جگہ کوئی اور شخص اس قسم کے دوہرے اعزاز کو نبھانے کی لیاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ اس کی عقل پر اس کی ہوس غالب تھی۔

قائداعظم کا موقف

قائداعظم دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ وائسرائے نے مئی میں انگلستان جانے سے پہلے ہی سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی جتنے دن وہ لندن میں ٹھہرا ہر روز اپنی درخواست کی منظوری کا انتظار کرتا رہا۔ واپس آیا تو بعض اہم معاملات سے نپٹنے کے بعد پورے جوش وخروش سے دوبارہ اسی مسئلے کی طرف متوجہ ہوا کیمبل جانسن کی ڈائری سے معلوم ہوتا

ہے کہ وہ اپنے مشیروں کی روزانہ مجلس میں علی التواتر اس کا ذکر کیا کرتا تھا اور قائداعظم کی خاموشی کو اپنی شان میں گستاخی قرار دیتا تھا۔ آخر کار اس نے خود ہی براہِ راست قائداعظم کے ساتھ اس مسئلے پر گفتگو کا آغاز کیا، اور انہیں بتایا کہ میرے دل میں اپنی ہوس کو پورا کرنے یا اپنی اہمیت اور شان و شوکت بڑھانے کا کوئی خیال نہیں۔ یہ بات خود پاکستان کے مفاد میں ہوگی کہ اس مملکت کی گورنر جنرل کا عہدہ بھی مجھے پیش کر دی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو حکومت پاکستان کے لیے اپنے اثاثوں کا جائز حصہ حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک کھلی دھمکی تھی جس کو ماؤنٹ بیٹن نے پورا کر کے دکھا دیا۔

> لیکن قائداعظم نے اس کو یہی جواب دیا کہ یہ اصول کا معاملہ ہے اور جہاں اصول کی بات ہو وہاں میں صرف ملک اور قوم کے فائدے کو ہی مدنظر رکھا کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اکثر اپنے دوستوں کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے مجھے اس معاملے میں معذور سمجھا جائے۔ بہرحال میں "قانون آزادی ہند" کے مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی اس پر حتمی رائے دے سکتا ہوں۔

چند دن کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو یہ پیغام ملا کہ قائداعظم خود ہی پاکستان کے گورنر جنرل ہونگے۔
آزادی کا پہلا تقاضہ یہی تھا کہ پاکستان اپنے سربراہ مملکت کا انتخاب خود کرے ماؤنٹ بیٹن نے ہر طرف دباؤ ڈالا کہ انتخاب کا قرعہ اس کی مرضی کے مطابق اس کے نام پر نکلے جب یہ نہ ہو سکا تو وہ پاکستان کے لیے مجسم انتقام بن گیا۔ پاکستان کے مفاد پر گہری ضربیں لگتی رہیں۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ دہلی میں مسلمان پر قیامت ٹوٹ پڑی پاکستان کو اپنے اثاثوں سے محروم کر دیا گیا۔ مشترکہ خزانہ سے پاکستان کے حصے کا روپیہ روک دیا گیا۔ سرکاری عملہ اور ریکارڈ کو لے کر جو گاڑیاں کراچی جا رہی تھیں ان پر پے در پے حملے کیے گئے۔ ماؤنٹ بیٹن خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا اور شاید اپنی انا کی تسکین کرتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے قانون آزادی ہند میں ایک شق اس مضمون کی بھی رکھی گئی تھی کہ اگر دونوں مملکتیں چاہیں تو وہ مشترکہ گورنر جنرل بھی مقرر کر سکتی ہیں۔ جب یہ شق دھری کی دھری رہ گئی تو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے برطانیہ کے وزیراعظم کو ہدف تنقید بنایا۔
(ج) دونوں ملکوں کی حد بندی کا مسئلہ بھی پیچیدہ تھا۔ تمام پارٹیوں نے اس اصول کو منظور کر لیا تھا کہ مسلم اکثریت کی آبادی کے متصل علاقوں کو ملا کر پاکستان کی مملکت قائم ہوگی۔ یہ ایک واضح اصول

تھا اور اس میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہ تھا۔ لیکن ۳ جون کے ریڈیائی بیان میں ماؤنٹ بیٹن نے ایک گرہ یہ لگا دی تھی کہ حد بندی کرنے میں تسلیم شدہ بنیاد کے علاوہ "دوسرے عوامل" کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔ یہ دوسرے عوامل (OTHER FACTORS) کیا تھے بیان میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ اس دو لفظی محاورے کو بہت سے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ اس وقت کسی منصف مزاج شخص کو اس بات کا وہم و گمان تک نہ تھا کہ اکثریت کے ٹھوس اصول کو نظر انداز کر کے اور محض (OTHER FACTORS) کا سہارا لیتے ہوئے غالب اکثریت کے بعض علاقوں کو ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ قائد اعظم نے تجویز پیش کی کہ حد بندی کے لیے اقوام متحدہ سے رجوع کیا جائے۔ جواہر لال نہرو نے مخالفت کی کیونکہ اس وقت تک اقوام متحدہ کی غیر جانب داری کا بھرم کچھ نہ کچھ قائم تھا۔ اور کانگریس والے کسی غیر جانب دار فریق کو اس معاملے میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ اس پر قائد اعظم نے مشورہ دیا کہ دوسری صورت میں یہ معاملہ برطانیہ کی پریوی کونسل کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس بات کو بھی سرے نہ چڑھنے دیا۔ اس طرح یہ تصفیہ طلب معاملہ برطانوی حکومت کو لوٹ آیا جو قیام پاکستان کی مخالف اور کانگریس کی طرف دار تھی۔ طے ہوا کہ حد بندی کے ایک نہیں دو کمیشن مقرر کیے جائیں۔ ہر کمیشن کے چار چار ممبر ہوں۔ ان میں سے دو دو کا انتخاب کانگریس کرے اور دو دو کا لیگ۔ اور دونوں کمیشنوں کا مشترک صدر ہو۔ صدارت کے لیے برطانوی حکومت نے ریڈکلف کا نام پیش کیا۔ جسے قائد اعظم نے منظور کر لیا۔ یہ تو سب کو نظر آتا تھا کہ دونوں کمیشنوں کی ہیئت ترکیبی کچھ ایسی ہے کہ کسی کے اندر کوئی فیصلہ بھی اتفاق رائے سے نہیں ہو سکے گا اور ثالثی کا اختیار تمام تر ریڈکلف کو مل جائیگا۔ ریڈکلف ۸ جولائی کو دہلی میں پہنچا۔ وہاں تین دن قیام کرنے کے بعد ایک دن کے لیے کلکتے گیا۔ ۱۲ جولائی کو لاہور پہنچا۔ کمیشن کے ارکان کے پہلے اجلاس میں اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر کمیشن کے ممبروں میں اتفاق رائے ہو گیا تو مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن سکھوں کے دعاوی بہت مبالغہ آمیز تھے وہ پاکستان کی حد دریائے جہلم کو بنانا چاہتے تھے۔ یہ بات سراسر حق و انصاف کے خلاف تھی، کام کا آغاز کرتے ہوئے ریڈکلف نے امرتسر، بٹالہ اور پٹھانکوٹ کے علاقوں پر ہوائی پرواز کی خواہش ظاہر کی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے سفر تو ملتوی ہو گیا لیکن کمیشن کے مسلمان ممبر کو شبہ ہو گیا کہ یہ علاقہ وہی ہے جس کو کانگریس والے حد بنانے کے لیے زور دے رہے ہیں۔ اور کیا وجہ ہے کہ ریڈکلف صرف اس محدود علاقے کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور کسی دوسرے علاقے کی طرف اس کا

خیال تک بھی نہیں گیا۔ پاکستانی رکن نے تجویز پیش کی کہ کمیشن کے مسلمان ممبر بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں کیونکہ کمشن کا صدر معاملے کی چھان بین کیے بغیر ایک پارٹی کے موقف سے اتفاق کر رہا ہے لیکن قائداعظم نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ چار دن بعد تک کمیشن کی کاروائی شروع ہو گئی اور ۳۱ جولائی تک جاری رہی۔ دونوں کمیشنوں کی نشستوں سے غیر حاضر رہا اسے وکلا کے دلائل اور دوسری کاروائیوں کی روزانہ رپورٹ بھیجی جاتی تھی۔ اگست کے پہلے ہفتے میں ریڈ کلف نے کمیشن کے ممبروں سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ اس وقت کمیشن کے ایک دوسرے مسلمان رکن سے اس کی توجہ ضلع فیروز پور کی مسلم اکثریت کی دو تحصیلوں کی طرف دلائی۔ ریڈ کلف نے جواباً کہا کہ اس معاملے پر زیادہ گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں تحصیلیں پاکستان کو دی جا رہی ہیں۔ ریڈ کلف نے اپنا ایوارڈ مکمل کرنے کے بعد ۸ یا ۹ اگست کو ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کیا اس کی اشاعت یوم آزادی کے بعد ۱۷ اگست کو ہوئی۔

پاکستان کی حد بندی میں بد دیانتی

پاکستانیوں کو یہ معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی کہ ۳ جون کے اعلان میں تو گورداسپور مسلم اکثریت کے اضلاع میں شمار کیا گیا تھا لیکن ریڈ کلف نے اس کا تین چوتھائی ہندوستان کو بخش دیا اور حد بندی کی لائن اس جگہ لگائی جس کو وہ طیارے کی اڑان سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے لیے کشمیر کا دروازہ کھل گیا۔ زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں جن کو خود ریڈ کلف نے پاکستان میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی ہندوستان کے حصے میں آگئیں۔ ستلج اور بیاس کا درمیانی ذرخیز اور مسلم اکثریت کا علاقہ بھی ہندوستان کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ملک کے مشرقی بازو کی حد بندی میں بھی مسلم کش جانبداری سے کام لیا گیا۔ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ ریڈ کلف کے قلم سے ایوارڈ میں فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلوں کے متعلق ایسی تبدیلیاں کرائی گئیں جن سے پاکستان کو بہت سا نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تبدیلیاں کس کے کہنے پر کی گئیں اور کیوں کر کی گئیں اس کے متعلق پاکستان میں کوئی اختلاف رائے موجود نہیں اس طرح کی ریڈ کلف حد بندی کسی اصول پر مبنی نہ تھی اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ پاکستان کے رقبے کو امکانی حد تک کم کر دیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی علاقے کو سیراب کرنے والی نہروں کے ہیڈ ورکس ہندوستان کو مل گئے۔ اور ہندوستان کو یہ اختیار مل گیا کہ جب چاہے پاکستان کو پانی کی رسد بند کر دے۔ اس اختیار کو جلد ہی استعمال کیا گیا۔ اس سے ملک کے بہترین زرعی رقبوں میں آبپاشی کا بحران پیدا ہو گیا۔ جو کئی سالوں بعد دور ہوا۔ ہندوستان نے

پاکستان کے حصے کا جنگی سامان اور روپیہ بھی روک لیا۔ پاکستان کو ملا ہوا بہت سا سرکاری ریکارڈ کراچی کے راستے میں تلف کر دیا گیا۔ اس طرح پاکستان کا آغاز نہایت نامساعد حالات میں ہوا لیکن پاکستانیوں کے عزم و ہمت اور قائداعظم کی رہنمائی نے ان مشکلات پر قابو پا لیا۔

انتقال اقتدار کی رسم باقی تھی اس کو ادا کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے ۱۳ راگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچا اس موقع پر اس نے جو تقریر کی اس سے اس کی شخصیت کے کسی انسانی پہلو پر روشنی نہیں پڑتی کیونکہ اس تقریر کا رنگ واعظانہ تھا۔

باب ۲۲

آئینی اصلاحات

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ برطانیہ نے ہندوستان کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر اپنے ذمے لے لیا۔ اس تبدیلی کے تقریباً تین سال بعد ۱۸۶۱ء میں حکومت برطانیہ نے قانون کا قابل ذکر ڈھانچہ نافذ کیا۔ اسے "انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی دستوری تاریخ میں دوسرا اہم قانون ۱۸۹۲ء میں نافذ ہوا۔ یہ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۹۲ء تھا۔ اس کے بعد وائسرائے لارڈ منٹو اور سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان جان مارلے نے ایک نیا دستوری خاکہ تیار کیا۔ یہ دستوری خاکہ لارڈ مارلے نے مسودہ قانون کی صورت میں پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ منظوری کے بعد ۱۹۰۹ء میں ہندوستان میں نافذ ہوا۔ اسے مارلے اصلاحات کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

مسٹر مانٹیگو ایک وفد کے ہمراہ نومبر ۱۹۱۷ء میں ہندوستان آئے اور یہاں رہ کر انھوں نے ایک رپورٹ تیار کر لی۔ اس رپورٹ کا نام مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ تھا۔ چیمسفورڈ اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ جس نے اس رپورٹ کی تیاری میں مدد دی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک دستور کا ایک مسودہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا جو منظوری کے بعد ۱۹۱۹ء میں "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء" کے نام سے ہندوستان میں نافذ ہوا۔

۵ فروری ۱۹۳۵ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان نے ہاؤس آف کامنز میں حکومت ہند کے قانون کا مسودہ پیش کیا۔ ہاؤس آف کامنز سے منظوری کے بعد یہ مسودہ ہاؤس آف لارڈز میں منظور ہوا۔ ۲ اگست ۱۹۳۵ء کو اس قانون پر شاہی دستخط ثبت ہوئے۔ یہ قانون حکومت ہند کا "قانون مجریہ ۱۹۳۵ء" کے نام سے مشہور ہوا۔

بہرحال انگریزوں کے دور حکومت میں دستوری ارتقاء مذکورہ قوانین کی شکل میں ہوتا ہے۔ ت

اب مذکورہ قوانین یا آئینی اصلاحات کا کچھ تفصیلی مطالعہ کریں۔

۱۸۶۱ء سے ۱۸۹۲ء تک آئینی ارتقاء

سر سید احمد کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ قانون بنانے وقت ہندوستانیوں کی خواہشات کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ قانون سازی کا کام گورنر جنرل کی انتظامی کونسل سرانجام دیا کرتی تھی۔ سر سید نے اپنی کتاب رسالہ اسباب بغاوت ہند میں قانون سازی کے کاموں میں ہندوستانیوں کی شرکت پر زور دیا۔ چنانچہ حکومت نے پہلی مرتبہ ۱۸۶۱ء بالکل محدود پیمانے پر ایک چھوٹی سی مجلس قانون ساز قائم کی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد حکومت برطانیہ کی یہ پالیسی رہی کہ ہندوستانیوں کو حکومت کے انتظامات میں شامل کیا جائے یہی پالیسی ان اصلاحات میں کارفرما نظر آتی ہے۔ انڈین کونسلز ایکٹ کے نام سے جو قانون ۱۸۶۱ء میں پاس کیا گیا اس کی مندرجہ ذیل دفعات تھیں۔

۱۔ گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کے ممبروں کی تعداد چار سے بڑھا کر پانچ کر دی گئی۔ کمانڈر انچیف کو بھی انتظامی کونسل کا غیر معمولی رکن بنایا گیا جس کا درجہ گورنر جنرل کے بعد قرار پایا۔ انتظامی کونسل کے ہر رکن کو کسی شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔

۲۔ ۱۸۶۱ء سے قبل قانون سازی کا کام گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کے سپرد تھا۔ مگر اس قانون کے تحت قانون کے کام میں ہندوستانیوں کو شرکت کا موقع دیا گیا گورنر جنرل کی انتظامی کونسل میں زائد ممبران (ADDITIONAL MEMBER) کا تقرر کیا گیا جن کا کام صرف یہ تھا کہ جب بھی گورنر جنرل کی انتظامی کونسل ہندوستان کے لیے قانون سازی کا کام کرے تو یہ اس اجلاس میں شرکت کریں۔ ان ارکان کی تعداد کم سے کم چھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ مقرر کی گئی۔ ان ممبران کی تعداد کا نصف غیر سرکاری ہونا ضروری قرار پایا۔ یہ زائد ارکان گورنر جنرل کی تعداد صوابدید پر دو سال کے لیے نامزد کیے جاتے تھے۔

۳۔ گورنر جنرل کی غیر موجودگی میں کونسل کا صدر (جس کو خود گورنر جنرل نامزد کیا جاتا تھا) یا کونسل کا کوئی ممبر کونسل کی صدارت کرتا تھا۔

۴۔ گورنر جنرل کو ہنگامی حالات میں آرڈیننس جاری کرنے کے اختیارات دیئے گئے۔

۵۔ کونسل کا پاس کردہ کوئی بھی قانون اور ضابطہ گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر قانونی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

۶۔ انتظامی کونسل کے زائد ممبران کو کسی قسم کے بھی اختیارات حاصل نہ تھے۔ نہ تو وہ سوالات ہی پوچھ سکتے تھے اور نہ ہی ان کو قرار دادیں پیش کرنے کی اجازت تھی۔

۷۔ مختلف صوبوں میں بھی انتظامی کونسلوں میں زائد ممبران کا تقرر عمل میں آیا۔ ان صوبوں میں زائد ممبروں کی تعداد کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ آٹھ مقرر کی گئی۔ صوبائی کونسلوں کے اختیارات اور بھی محدود تھے۔ صوبائی کونسلوں کے پاس کردہ قوانین کے لئے پہلے گورنر اور پھر گورنر جنرل کی منظوری لازمی تھی۔

اگرچہ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء کے تحت زائد ممبران کی تعداد اور ان کے اختیارات بالکل محدود تھے لیکن پھر بھی برصغیر میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۹۲ء

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا انڈین ایکٹ ۱۸۶۱ء ہندوستانیوں کی توقعات پر پورا نہ اترا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں مختلف یونیورسٹیوں کے قیام سے مغربی تعلیم عام ہو گئی جس سے ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع میسر آیا ادھر حکومت کی جابرانہ حکمت عملی نے حکومت کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ لارڈ لٹن نے عہد حکومت میں ورنیکلر پریس ایکٹ اور البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اقدامات نے سیاسی طور پر بے چینی پیدا کر دی اس کو دور کرنے کی غرض سے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن نے ۱۸۸۸ء میں ایک کمیٹی قائم کی تاکہ وہ ۱۸۶۱ء کی اصلاحات میں تبدیلیوں کا جائزہ لے۔

انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۹۲ء کی مندرجہ ذیل خصوصیات تھیں

۱۔ گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کے زائد ارکان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اب کونسل کے ممبروں کی تعداد کم سے کم دس اور زیادہ سے زیادہ بیس مقرر کی گئی۔

۲۔ صوبائی کونسلوں کے ارکان کی تعداد بھی بڑھا کر آٹھ اور بیس کے درمیان کر دی گئی۔ صوبہ بنگال کے لیے ممبروں کی تعداد بیس متعین کر دی گئی۔

۳۔ زائد ممبروں کی کل تعداد کا ۲/۵ غیر سرکاری ہونا لازمی قرار پایا۔

۴۔ کونسل کے ارکان کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ان کے حقوق و اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔ اب ان کو کچھ پابندیوں کے ساتھ بجٹ پر بحث کرنے کا حق دے دیا گیا۔ ۱۸۶۱ء میں زائد ممبران

کو سوالات پوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس قانون کے تحت انھیں سوالات پوچھنے کا حق دیا گیا۔ اگرچہ ضمنی سوال پوچھنے سے وہ اب بھی محروم تھے۔

۵۔ زائد ارکان کے لیے انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا۔ لیکن کوئی بھی منتخب شدہ رکن گورنر جنرل کی نامزدگی کے بعد ہی کونسل کا ممبر بن سکتا تھا۔

ہندوستانیوں کو ان کی طویل جدوجہد کا ثمرہ ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کی شکل میں ملا۔ مگر یہاں دراصل برطانوی سامراج نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان کو ٹرخانے کی کوشش کی تھی۔ کونسل کے ارکان کی کم تعداد ان کے محدود اختیارات اور گورنروں گورنر جنرل کو لامحدود اختیارات کی موجودگی ہندوستانیوں کے لیے اس قانون میں کسی کشش کا سبب نہ بنی اور کچھ عرصہ بعد حکومت کو مجبور ہو کر دوبارہ اس قانون میں ترمیم کرنی پڑی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۰۹ء

۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۹ء تک دور میں ہندوستان میں بہت سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تقسیم بنگال کے سلسلے میں ہنگامے ہوئے مسلمانوں کا ایک وفد شملہ میں وائسرائے سے ملا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ عالم وجود میں آئی۔ کانگرس اور مسلم لیگ ہندوستان کے دستور میں ضروری ترامیم کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ وائسرائے لارڈ منٹو اور سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان جان مارلے نے ایک نیا دستوری خاکہ تیار کیا۔ یہ دستوری خاکہ لارڈ مارلے نے مسودہ قانون کی صورت میں برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ منظوری کے بعد ۱۹۰۹ء میں ہندوستان میں نافذ ہوا۔ اسے منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۰۹ء کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ لیجسلیٹو کونسلوں کے ارکین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔ گورنر جنرل کی کونسل کے اضافی اراکین کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۶۰ کر دی گئی۔ مدارس بنگال، یوپی، بمبئی، بہار اور اڑیسہ کے صوبوں کی لیجسلیٹو کونسلوں کے اضافی اراکین کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۵۰ اور پنجاب، برما اور آسام کی ۳۰ مقرر کی گئی۔ ان تمام کونسلوں میں سرکاری اکثریت برقرار رکھی گئی۔ مرکزی لیجسلیٹو کونسل میں ۳۶ سرکاری اور ۳۲ غیر سرکاری اراکین تھے۔ ۳۶ سرکاری اراکین میں سے ۲۸ کی نامزدگی گورنر جنرل نے کرنی ہوتی تھی اور ۸ اراکین اپنے عہدہ کی وجہ سے کونسل کے ممبر تھے۔ ۳۲ غیر سرکاری اراکین میں سے پانچ گورنر جنرل نامزد کرتا تھا اور باقی اراکین کا انتخاب ہوتا تھا۔

صوبائی لیجسلیٹو کونسلوں میں سرکاری اکثریت میں نہیں تھی۔ اکثریت غیر سرکاری افراد کی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر سرکاری ارکان کی اکثریت منتخب ہو گی۔ کچھ غیر سرکاری ارکین کو حکومت نے نامزد کرنا تھا۔ سرکاری ارکین دو قسم کے تھے۔ اوّل جنھیں گورنر اور حکومت نامزد کرتی ہے دوم جو اپنے عہدہ کی وجہ سے ممبرن جاتے تھے۔

۳۔ حکومت نے جداگانہ انتخابات کے اصول کو منظور کر لیا۔ اس کا مطالبہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے کیا تھا۔ مختلف فرقوں، طبقوں اور مفادات کو جداگانہ نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

۴۔ لیجسلیٹو کونسلوں کے فرائض میں اضافہ کیا گیا۔ مرکزی لیجسلیٹو کونسل میں بجٹ کو زیر بحث لانے کی اجازت دی گئی۔ ارکین کو ٹیکس میں تبدیلی کرنے، نئے قرضہ یا مقامی حکومت کے لیے نئی گرانٹ میں ترمیم کرنے کے لیے قرار داد پیش کرنے کا حق تھا۔ لیکن کونسل قرضوں پر سود اور ریلوے وغیرہ کے اخراجات کے ضمن میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

۵۔ لیجسلیٹو کونسلوں کے ارکین کو سوالات اور ضمنی سوالات پوچھنے کی اجازت دی گئی لیکن جواب دینے والا متعلقہ شخص ضمنی سوال کا فوری طور پر جواب دینے سے انکار کر سکتا تھا۔ وہ جواب تیار کرنے کے لیے کچھ وقت مانگ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ارکین کو قرار داد پیش کرنے اور منظور کرنے کا بھی حق تھا۔ کونسل کا صدر کوئی وجہ بتائے بغیر کسی قرار داد یا اس کے کسی حصّے کو پیش کرنے سے منع کر سکتا تھا۔

۶۔ بمبی، بنگال اور مدراس کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکین کی تعداد چار کر دی گئی۔ حکومت کو اس امر کی اجازت بھی دی گئی کہ لیفٹیننٹ گورنر کے صوبہ کے لیے بھی ایگزیکٹو کونسل مقرر کی جائے۔

۷۔ یونیورسٹی سینٹ، زمینداروں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور چیمبر آف کامرس کو لیجسلیٹو کونسل کے لیے ممبر منتخب کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہاں بھی جداگانہ انتخابات کا اصول نافذ ہوا۔ یعنی مسلمان نمائندوں کا انتخاب صرف مسلمانوں نے کرنا تھا۔

حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کا ایک مطالبہ یعنی جداگانہ انتخاب مان لیا گیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے لارڈ منٹو سے مطالبہ کیا تھا کہ مسلمان نمائندوں کو چننے کا حق صرف مسلمانوں کو حاصل ہونا چاہیے۔ وائسرائے نے یہ مطالبہ منظور کر لیا تھا۔ ۱۹۰۹ء کے ایکٹ میں اسے قانونی شکل دے دی۔ ہندوؤں اور کانگریس نے جداگانہ انتخابات کے اصول کو پسند نہ کیا اور اس کی مخالفت کی۔ جہاں تک دوسری شقوں کا تعلق ہے۔ یہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی امیدوں سے

بہت کم تھیں۔ لیجسلیٹو کونسلوں کو بڑا ضرور کر دیا گیا تھا لیکن ان کے اختیارات بہت محدود تھے اور انھیں انتظامیہ پر صحیح معنوں میں کوئی کنٹرول حاصل نہ تھا۔ مرکزی لیجسلیٹو کونسل میں سرکاری اراکین کی اکثریت تھی لیکن کچھ غیر سرکاری اراکین کو حکومت نامزد کرتی تھی۔ اس طرح منتخب اراکین کے ہاتھ کمزور پڑ جاتے تھے۔ حکومت نامزد اراکین کی حمایت پر بھروسہ کر سکتی تھی۔

لیجسلیٹو کونسلوں کے اراکین کا انتخاب براہ راست نہیں۔ عوام مقامی اداروں (LOCAL - BODIES) کے اراکین کا انتخاب کرتے۔ مقامی ادارے انتخابی ادارہ منتخب کرتیں۔ انتخابی ادارہ صوبائی لیجسلیٹو کونسل کے اراکین منتخب کرتا اور صوبائی لیجسلیٹو کونسل کے اراکین مرکزی لیجسلیٹو کونسل کے اراکین کا انتخاب کرتے تھے۔ اس طرح عوام اور کونسل کے اراکین کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ جاتا تھا اور کونسل کے اراکین اور رائے دہندگان میں جو رابطہ ہونا چاہیے وہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ حکومت انگلستان اعلان کرے کہ بالآخر ہندوستان میں ذمہ دار حکومت رائج کی جائے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے کتنا وقت لگے گا۔ حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۰۹ء میں اس ضمن میں کچھ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ ہندوستان میں اس دور میں خود مختار اور ذمہ دار طرز حکومت کے نفاذ کے لیے تحریک چل رہی تھی۔ اس ایکٹ کے نفاذ سے اس تحریک کی شدت میں کمی پیدا نہیں ہوئی۔ کچھ ہندوستان کے سیاست دانوں نے ان اصلاحات کو کھوکھلا قرار دیا۔ ان خیال تھا کہ حکومت انگلستان نے ہندوستان میں بڑی نمائندہ حکومت قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے ہندوستانی باشندوں کو حکومت میں شمولیت کے لیے زیادہ مواقع فراہم کیے۔

یہ درست ہے کہ یہ ایکٹ ہندوستان کے سیاسی قائدین خصوصاً کانگریس قیادت کی امیدوں پر پورا نہیں اترا لیکن اسے کھوکھلا قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کا ۱۸۹۲ء کے ایکٹ سے موازنہ کیا جائے۔ تو یہ ایکٹ اول الذکر ایکٹ سے زیادہ جامع ہے اور انتخابات کا اصول بھی زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ نہ صرف لیجسلیٹو کونسلوں کے ارکان میں اضافہ کر دیا تھا بلکہ پہلی بار صوبوں میں غیر سرکاری اراکین کی تعداد بھی خاصی بڑھا دی گئی تھی۔ اختیارات محدود نظر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی، حکومت انگلستان بتدریج اختیارات بڑھانے کی قائل تھی۔ پہلی بات جو نظر انداز نہیں کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ انگلستان ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا اور وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ جس سے ہندوستان میں اس کے اقتدار اعلیٰ کو ٹھیس پہنچے۔ اس لیے یہ امید کرنا کہ انگلستان ۱۹۰۹ء میں ہندوستان میں خود مختار اور ذمہ دار طرز حکومت نافذ کرے گا۔ ایک انھونی سی بات تھی۔

اس ایکٹ کے تحت تمام لیجسلیٹو کونسلوں کی دوبارہ تشکیل ہوئی اور حکومت کا نظام چلنے لگا۔ یہ ایکٹ ۱۹۱۹ء تک نافذ رہا۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت ہند کا ایک نیا ایکٹ نافذ ہوا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء کے دور میں ہندوستان میں سیاسی بے چینی میں کافی اضافہ ہوا۔ کانگریس تو خود مختار طرز حکومت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء مسلم لیگ نے اپنے مقاصد میں ترمیم کر کے خود مختار طرز حکومت کا حصول مقاصد میں شامل کر لیا۔ اب دونوں جماعتوں شانہ بشانہ ان مقاصد کے حصول کے لیے آگے بڑھنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم کا دور سخت آزمائش کا دور تھا۔ ایک طرف ہندوستان برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے مالی اور جانی قربانیاں پیش کر رہا تھا۔ دوسری طرف ملک میں سیاسی بے چینی اور دنگا فساد بڑھ رہا تھا جس کو دبانے کے لیے ڈیفنس آف انڈیا رولز کا استعمال کیا گیا۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتیں مطالبہ کر رہی تھیں کہ ہندوستان میں ذمہ دار طرز حکومت نافذ کیا جائے اور ہندوستان کے باشندوں حکومت کے کاموں میں شامل ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے مقام پر مسلم لیگ اور کانگریس میں معاہدہ ہو گیا تھا۔ دونوں سیاسی جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ اس معاہدہ کی شقوں کو ہندوستان کے آئندہ دستور میں شامل کیا جائے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں بلقان کی جنگوں اور ترکی کی جنگ میں انگلستان کے خلاف شمولیت سے پریشان تھے۔ جو سکھ آسٹریلیا اور کینیڈا سے واپس آ رہے تھے۔ وہاں بدسلوکی کی داستانیں سنا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کے سکھوں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔

حکومت انگلستان ہندوستان کے حالات اور سیاسی جماعتوں کے مطالبات سے بے بہرہ نہیں تھی۔ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان مسٹر مانٹیگو نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو ہندوستان کے متعلق حکومت انگلستان کی نئی پالیسی کا اعلان کیا۔ یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت انگلستان کی نئی پالیسی یہ ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو انتظامیہ کے ہر شعبہ میں شامل کیا جائے۔ اور ذمہ دار طرز حکومت کو ہندوستان میں بتدریج رائج کیا جائے۔ مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان آکر حالات کا خود جائزہ مطالعہ کرنے وائسرائے حکومت کے دیگر اراکین اور سیاسی رہنماؤں سے معاملات پر گفت و شنید کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر مانٹیگو ایک وفد کے ہمراہ نومبر ۱۹۱۷ء میں ہندوستان آئے یہاں تقریباً ۶ ماہ قیام کے بعد اپریل ۱۹۱۸ء کے آخر میں واپس انگلستان چلے گئے۔ چند ماہ بعد مانٹیگو کی سفارشات رپورٹ کی صورت میں شائع ہو گئیں۔ اس رپورٹ کا نام مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ تھا۔ چیمسفورڈ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ جس نے اس رپورٹ کی تیاری میں مدد دی تھی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر دستور کا ایک مسودہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ اور منظوری کے بعد ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ ۱۹۱۹ء کے نام سے ہندوستان نافذ ہوا۔

حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء کی اہم شقیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی جگہ دیوانی مقننہ قائم کی گئی۔ مرکزی اسمبلی کے ایوان بالا کے نام کونسل آف سٹیٹ تھا اس کے ممبروں کی تعداد ۶۰ تھی ۳۳ ارکان کو گورنر جنرل منتخب کرتا تھا۔ ایوان زیریں جو کہ لیجسلیٹو اسمبلی کے نام سے موسوم تھا۔ ۱۴۵ ممبران پر مشتمل تھا۔ اس میں سے ۱۰۳ کا انتخاب ہوتا تھا۔ اور باقی کو گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ نامزد اراکین ۲۵ سرکاری اور باقی غیر سرکاری ہوا کرتے۔ منتخب شدہ ۱۰۳ اراکین کی تقسیم یہ تھی۔ ۵۱ عمومی حلقوں سے ۳۰ مسلمانوں کے لیے، ۲ سکھوں کے لیے اور ۲۰ انڈین کامرس کی طرف سے، لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کا عرصہ حیات بالترتیب ۳ سال اور پانچ سال تھا۔ گورنر جنرل عرصہ حیات میں اضافہ کر سکتا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخری اسمبلی ۱۱ سال قائم رہی۔ اسمبلی کے لیے سپیکر کی تقرری نامزدگی کے ذریعے تھی۔ اس کے بعد اسمبلی کے اراکین خود سپیکر چن سکتے تھے۔

۲۔ دونوں ایوانوں کے منتخب اراکین کا براہ راست انتخاب ہوتا تھا۔ حکومت نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو برقرار رکھا۔ رائے دہندہ بننے کے لیے ایک خاص حد تک ٹیکس دینے یا جائیداد رکھنا ضروری تھا۔ اس وجہ سے حق رائے دہی استعمال ایک حد تک محدود ہو گیا تھا۔

۳۔ گورنر جنرل مرکزی مقننہ کے دونوں ایوانوں سے اجلاس طلب کر سکتا تھا۔ اور برخاست بھی کر سکتا تھا۔ گورنر جنرل کو دونوں ایوانوں کو خطاب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

۴۔ مرکزی مقننہ کو پورے برطانوی ہندوستان یا اس کے کسی حصہ کے لیے قانون سازی کا اختیار حاصل تھا۔ مرکزی حکومت یہ حق بھی رکھتی تھی کہ وہ کسی بھی موجودہ قانون میں ترمیم کرے۔ اس مقننہ کو برطانوی پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون منسوخ کرنے یا اس میں ترمیم کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی کوئی ایسا قانون بنایا جا سکتا تھا۔ جو برطانوی پارلیمنٹ کے اختیارات اور قوانین کے منافی ہو۔ مندرجہ ذیل امور کے متعلق مسودہ قانون پیش کرنے کے لیے گورنر جنرل کی پیشگی اجازت لینی ضروری تھی۔

و۔ سرکاری قرضوں اور حکومت ہندوستان مالیاتی امور

ب۔ برطانوی شہریوں (جو کہ ہندوستان میں ہیں۔) کے مذہب اور مذہبی اصول۔

ج۔ فوج کے مختلف شعبوں کے ڈسپلن اور تنظیم

د۔ حکومت ہند کے دیگر ممالک سے تعلقات۔

۴۔ کوئی ایسا قدم جو مرکزی قانون یا گورنر جنرل کے آرڈی ننس کو تبدیل یا منسوخ کرنے کے لیے ہو۔
گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ مرکزی مقننہ کو کسی مسودۂ قانون یا اس کا کسی حصہ پر غور کرنے سے منع کرنے کر دے۔ مقننہ کا منظور کردہ قانون اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک گورنر جنرل کو منظوری دے سکتا، رد کر سکتا تھا۔ یا شاہ معظم کی حکومت کے غور کرنے کے لیے مقننہ کے منظور کردہ قانون کو روک سکتا تھا۔ گورنر جنرل نے اختیارات کا بہت دفعہ استعمال کیا۔ شاہ معظم کی حکومت کے غور کے لیے رکھنا سے مراد تھی کہ وہ ویٹو استعمال کرنے سے پہلے حکومت برطانیہ سے مشورہ کرتا تھا۔ حکومت برطانیہ نے اکثر و بیشتر گورنر جنرل کو یہ اختیار استعمال کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ہنگامی حالت میں گورنر جنرل کو آرڈی ننس جاری کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس طرح کے آرڈی ننس چھ ماہ لاگو رہتے تھے۔

۵۔ مرکزی مقننہ کے دونوں ایوانوں کے اراکین کو سوالات اور ضمنی سوالات پوچھنے، قرار دادیں اور تحریک التوا پیش کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ سپیکر کسی بھی قرارداد، تحریک التوا یا سوال کو ایوان میں پیش کرنے سے منع کر سکتا تھا۔ اراکین کو ایوان میں تقریر کی اجازت تھی۔ منتخب اراکین نے اس حق سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اور جب بھی ممکن ہوا۔ حکومت ہندوستان کی پالیسیوں پر تنقید کی اور اپنے مطالبات حکومت کے سامنے پیش کیے۔

۶۔ بجٹ کے سلسلے میں مرکزی مقننہ کے اختیارات بہت محدود تھے۔ بجٹ کے کچھ حصوں پر نہ اسمبلی بحث کر سکتی تھی اور نہ ہی ووٹ دے سکتی تھی۔ گورنر جنرل یہ واضح کر سکتا تھا۔ کہ بجٹ میں اس قسم کے کون سے حصے ہیں۔ باقی ماندہ حصوں پر مقننہ میں بحث ہو سکتی تھی اور اراکین کو کو اختیار حاصل تھا کہ وہ مخصوص شدہ رقوم میں کمی کریں یا منظوری دینے سے انکار کر دیں۔ گورنر جنرل محسوس کرے کہ جو رقم مقننہ نے نامنظور کی ہے یا اس میں رد و بدل کیا ہے۔ حکومت کے لیے اشد ضروری ہے تو وہ اپنے مخصوص اختیارات استعمال کر کے حکومت کی طرف سے مخصوص کردہ رقم کو برقرار رکھ سکتی تھی۔ ہنگامی حالات میں گورنر جنرل خود بجٹ کی منظوری دے سکتا تھا۔

۷۔ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین نامزد ہوتے تھے۔ مقننہ کا کوئی ایوان ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح حکومت برطانیہ کو مقننہ کے اثر سے آزاد رکھا۔ لیکن ایک طریقہ سے وہ حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ مقننہ کے سامنے براہ راست ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔

۸۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے دستور میں دو فہرستیں درج کی گئیں ایک

مرکزی فہرست اور دوسری صوبائی فہرست تھی۔ جن امور کے لیے تمام ہندوستان میں یکساں قوانین کی ضرورت تھی۔ مرکز کے سپرد کیے۔ جن امور کا تعلق خصوصاً کسی صوبے سے تھا۔ صوبائی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ اس تقسیم کے باوجود مرکز کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مرکز کے ذمے جو امور تھے، ان میں سے چند قابل ذکر یہ تھے۔ دفاع، امور خارجہ، سیاسی تعلقات، کسٹم ٹریف، عوامی قرضے، ڈاک تار، کاپی رائٹ، کرنسی، رسل رسائل، کامرس، جہاز رانی، بڑی بڑی بندرگاہیں، دیوانی اور فوجداری کے قوانین کے متعلق امور وغیرہ۔ صوبائی امور میں مندرجہ ذیل امور قابل ذکر ہیں۔ مقامی خود مختاری کی حکومت، پبلک ہیلتھ اور صفائی، تعلیم، دائرورکس، واٹر سپلائی اور آب پاشی، لینڈ ریونیو کا اختیار، جنگلات، کواپریٹو سوسائٹیاں، زراعت، قحط، تکلیف اور امن عامہ وغیرہ۔ یہ تقسیم واضح نہیں تھی۔ اختیارات کی تقسیم کچھ اس طرح تھی، مرکزی حکومت بعض صوبائی میں دخل دے سکتا تھا۔ وہ صوبائی گورنر کو ہدایت دے کر اپنی مرضی کے مطابق صوبوں میں احکامات جاری کر سکتا تھا اگرچہ صوبائی گورنروں کو بعض حالات میں مقننہ کے قوانین اور احکامات کو نظر انداز کرنے کا اختیارات تھے۔

۹۔ صوبوں لیجسلیٹو اسمبلیوں کے ارکان میں بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ ان اسمبلیوں کے ۷۰ فیصد اراکین اور ۳۰ فی صد نامزد۔ ان اراکین کو گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ نامزد اراکین میں سے کچھ سرکاری افسر اور کچھ غیر سرکاری اراکین ہوتے تھے۔ صوبائی مقننہ جات کا عرصہ حیات تین سال مقرر کیا گیا تھا۔ صوبائی گورنر اس مدت کے اختتام سے قبل مقننہ کو توڑ سکتا تھا۔ اور اگر محسوس کرتے تو اس عرصہ حیات میں اضافہ کر سکتا تھا۔ صوبائی مقننہ جات کے اراکین کو سوالات، ضمنی سوالات پوچھنے، قرار دادیں پیش کرنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ اراکین کو صوبائی بجٹ نامنظور کرنے کی اجازت بھی تھی۔ لیکن گورنر جنرل کی طرح گورنر مقننہ کی نامنظوری کو رد کر کے بجٹ کو برقرار رکھ سکتا تھا۔

۱۰۔ صوبائی حکومت کے اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

ا۔ منتقل شدہ (TRANSFERRED)

ب۔ مخصوص شدہ (RESERVED)

منتقل شدہ امور کے زمرے میں مندرجہ ذیل آئے تھے۔ مقامی خود اختیاری کی حکومت، پبلک ہیلتھ اور صفائی، میڈیکل ایڈمنسٹریشن اور ہسپتال، ڈسپنسریاں ہندوستان کے باشندوں کی تعلیم کا انتظام، امور عامہ مثلاً سڑکیں، پل، ٹرام وے، صنعت و حرفت کی ترقی بمعہ صنعتی تحقیق اور فنی تعلیم کواپریٹو سوسائٹیاں وغیرہ گورنر یہ امور وزراء کے سپرد کرتا جو کہ مقننہ کے سامنے جواب دہ تھے۔ اگر کچھ امور کے بارے میں وزیر نہ ہو تو گورنر خود ذمہ داری سنبھال لیتا۔ یہ اس وقت تک رہتا جب تک صوبہ میں ان امور

کے لیے کوئی شخص وزیر مقرر نہ ہو جاتا۔ مخصوص شدہ امور کے زمرے میں مندرجہ ذیل امور آتے ہیں۔
عدلیہ کے انتظام، پولیس، آبپاشی، نہریں، پانی کا نکاس اور پانی روکنے کے لیے بند وغیرہ، پانی اور بجلی، لینڈ ریونیو، قحط ریلیف، اخبارات کتابوں اور پریسوں کا کنٹرول، جیل اور اس میں اصلاحات جنگلات (بمبئی اور برما کے علاوہ) فیکٹریوں کا معائنہ اور لیبر کے جھگڑے، انڈسٹریل انشورنس، رہائش وغیرہ یہ امور گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کے سپرد تھے۔ اور وہ گورنر کو جواب دہ تھے، وزراء (جن کے سپرد منتقل شدہ امور تھے) میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ وزراء صرف صوبائی اسمبلی کے منتخب ارکان میں سے مقرر کیے جاتے تھے لیکن ایگزیکٹو کونسل کے وہ ارکان جن کے ذمے مخصوص امور ہوتے تھے۔ منتخب ارکان نہیں ہوتے تھے۔ گورنر جنرل بمعہ کونسل کے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کی پیشگی اجازت سے کسی ایک یا تمام منتقل شدہ امور کو مخصوص امور کے زمرے میں شامل کر سکتا تھا۔ صوبائی امور کی اس تقسیم کے نظام کو ڈائیارکی (DAARCHY) یا دوعملی کے نظام کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ نظام ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک صوبوں میں نافذ رہا۔

۱۱۔ ماضی میں سٹیٹ آف سیکرٹری برائے ہندوستان کے اخراجات ہندوستان کا خزانہ برداشت کرتا تھا لیکن حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء کے تحت یہ اخراجات انگلستان کے خزانے سے ادا کیے جانے لگے۔ ایک نیا عہدہ قائم کیا گیا یہ عہدہ ہائی کمشنر برائے ہندوستان کا عہدہ تھا اس کے سپرد سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کی کچھ ذمہ داریاں کر دی گئیں۔ ہائی کمشنر کی حیثیت گورنر جنرل اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے نمائندے کی تھی۔ اس کے تمام اخراجات ہندوستان کے خزانے سے برداشت کیے جاتے تھے۔

۱۲۔ گورنر جنرل اپنی کارکردگی کے سلسلہ میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان اور برطانوی کابینہ کی وساطت سے برطانوی پارلیمنٹ کو جواب دہ تھا۔

حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء میں ذمہ دار طرز حکومت قائم کرنے کی سمت میں ایک قدم اٹھایا گیا تھا۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ دو ایوانی مقننہ قائم کی گئی۔ جس میں منتخب اراکین کو اکثریت دی گئی۔ مقننہ کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔ سوالات ضمنی سوالات پوچھنے، قراردادیں اور تحریک التوا پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح صوبائی مقننہ جات میں منتخب اراکین کی اکثریت برقرار رکھی گئی اور مقننہ جات کو ماضی کی نسبت زیادہ اختیارات دیئے گئے۔ یہی حال مرکزی مقننہ کا تھا۔ ماضی کی نسبت زیادہ اختیارات عطا کئے گئے۔ بجٹ کے حصول پر ووٹ کا حق بھی دیا گیا۔ جب

جات قائم ہو گئیں تو ایوان میں حکومت کی کارکردگی کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ مرکزی مقننہ کی قرار دادوں پر حکومت نے بھی عمل کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں صحیح معنوں میں ذمہ دار طرز حکومت رائج کر دی گئی گورنر جنرل اور صوبوں میں گورنروں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مرکزی مقننہ کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں تھا۔ گورنر جنرل ایگزیکٹو کونسل کے اراکین اگر چاہتے تو مرکزی مقننہ کے اراکین کی قرار دادوں اور مطالبات کو یکسر نظر انداز کر سکتے تھے۔ مرکزی مقننہ کو بجٹ پر جو اختیارات حاصل تھے صرف برائے نام تھی کیونکہ گورنر جنرل کو اختیار تھا کہ وہ مقننہ کے نامنظور بجٹ کو نافذ کر دے

صوبوں اور مرکز میں اختیارات تو تقسیم کر دیئے۔ لیکن یہ تقسیم کافی مبہم تھی۔ گورنر جنرل باآسانی صوبائی امور میں دخل دے سکتا تھا۔ صوبوں میں صوبائی گورنروں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ وہ باآسانی صوبائی مقننہ کی آزادی کو کچل سکتے تھے۔ مخصوص امور کے ضمن میں گورنر کو بہت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ وہ اپنی کونسل کے اراکین سے مل کر اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلا سکتا تھا۔ صوبے کے تمام تر اہم امور کے مخصوص امور کے زمرے میں شامل کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے صوبائی خود مختاری ایک حد تک بے معنی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ عملی یا دو ایاری کی (DYARCHY) کا اصول ناقص تھا۔ حکومت کے کاروبار کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کرنا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو ناقابل عمل ہے۔ اول تو حکومت کے کاروبار کی اس طرح تقسیم ممکن نہیں جس طرح برطانوی حکومت چاہتی تھی۔ دوم ایسی تقسیم سے حکومت کے کاروبار پر برا اثر ہوا کیونکہ حکومت کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے اس طرح متعلق ہوتا ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ہندوستانی باشندوں جنھوں نے وزیر کا عہدہ سنبھالا اور منتقل امور کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی۔ نے بعد میں یہ شکایت کی امور کی اس تقسیم کی وجہ سے انھیں اپنی ذمہ داریوں سے بطریق احسن سبکدوش ہونے میں بہت دقت ہوئی۔ مثلاً زراعت اور مچھلی بانی کو منتقل امور کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ آبپاشی، نہریں اور متعلقہ امور کو مخصوص امور کے طور پر رکھا گیا۔ اگر وزیر زراعت کو آبپاشی اور نہروں کے بارے میں اختیارات حاصل نہ ہوں تو وہ اپنے فرائض کس طرح بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اس قسم کا بہت حال صوبائی حکومتوں کے دوسرے محکموں کا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت "آدھا تیتر آدھا بٹیر" جیسے اصول کو نافذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ شعبوں کو وزراء کے سپرد اور کچھ شعبے غیر منتخب افراد کے سپرد کر دیے گئے۔

حکومت کے دونوں شعبوں کو دو مختلف المزاج افراد کے سپرد کیا گیا تھا۔ وزرا و عوام کے منتخب نمائندے تھے جب کہ ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کا زیادہ تر تعلق بیوروکریسی سے تھا۔ اس لیے دونوں کے سوچنے اور کام کرنے کے طریقوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس تفاوت کا بڑا اثر حکومت کی کارکردگی پر ہوا۔

وزراء کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ انہیں دو " مالکوں " کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ وزیر کے لیے ضروری تھا کہ وہ مقننہ کے دیگر اراکین کو خوش رکھے۔ تاکہ مقننہ میں اس کی پالیسیوں کی حمایت جاری رکھے۔

دوسری طرف گورنر کو خوش رکھنا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ وزیر کی تقرری اور وزارت سے علیحدگی کے مکمل اختیارات گورنر کو حاصل تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا کہ وزراء کو خوش رکھنے میں زیادہ مصروف رہتے۔ مقننہ میں اپنے اقدامات کی حمایت کے لیے انھیں سرکاری اراکین پر انحصار کرنا پڑتا تھا کیونکہ منتخب اراکین مختلف گروہوں میں تقسیم تھے اور سرکاری اراکین ملکی سیاست سے دور ایک گروپ کی صورت میں گورنر کی پالیسیوں کی حمایت کرتے تھے۔ لہذا وزراء ان کی حمایت پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔

حکومت کا سب سے اہم شعبہ خزانہ ایگزیکٹو کونسل کے رکن کے سپرد کیا گیا۔ یہ مخصوص امور میں سے تھا۔ قومی ترقی کے امور سے متعلق تمام محکمے وزراء کے سپرد کیے گئے۔ دیر منتقل امور کے زمرے میں آتے تھے۔ یہ محکمے اپنی مرضی سے کوئی بھی منصوبہ نافذ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ روپیہ پیسہ کی منظوری کے لیے خزانے کے محکمہ پر انحصار تھا۔ اگر خزانے کا محکمہ خرچ کی منظوری دے دے تو متعلقہ وزیر آگے قدم اُٹھا سکتا تھا۔ وگرنہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہ جاتا تھا۔

جب ہندوستان میں یہ ایکٹ نافذ کیا گیا۔ سیاسی حالات بہت خراب تھے۔ ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ہندو، مسلمان، سکھ، غرض کہ ہر اہم قوم سخت پریشان تھی اس وجہ سے ان اصلاحات کا ہندوستان میں کوئی خاص خیر مقدم نہیں ہوا۔ کانگریس نے آغاز میں انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد مسلمانوں نے تحریک خدمت کو ہر طرف پھیلا دیا۔ مسلمانوں میں حکومت کے خلاف جذبات بھڑک رہے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی تلخی نے ہندوستان کے باقی ماندہ باشندوں اور حکومت کے تعلقات خراب کر دیے۔ گاندھی اور کانگریس لیڈرشپ نے تحریک عدم تعاون چلائی۔ مسلمان بھی شریک ہو گئے۔ جب ۱۹۲۱ء میں حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء کے تحت انتخابات ہوئے۔ تحریک عدم تعاون اپنے جوبن پر تھی۔ اس وجہ سے ہندوستان کے باشندوں نے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ تحریکیں ختم ہوگئیں اور سیاسی فضا

ایک حد تک پرسکون ہوئی تو ہندوستانی باشندوں نے انتخابات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ہندوستان کی حکومت ۱۹۳۷ء تک اسی ایکٹ کے تحت چلتی رہی۔ ۱۹۳۷ء میں صوبوں میں حکومت ہند کا ایک نیا قانون (مجریہ ۱۹۳۵) نافذ کر دیا گیا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے سرجان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا۔ یہ کمیشن ۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں آیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے بائیکاٹ کے باوجود اس کمیشن نے حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ تاکہ مستقبل میں کی جانے والی ترامیم کے سلسلے میں اپنی سفارشات کرے۔ ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ کمیشن کی رپورٹ دو جلدوں پر مشتمل تھی اس رپورٹ میں ہندوستان کے موجودہ طرز حکومت کا جائزہ لینے کے بعد نئے دستور کے سلسلہ میں سفارشات پیش کی گئی تھیں۔ حکومت انگلستان نے ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کی رائے معلوم کرنے کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس طلب کیں۔ ان کانفرنسوں میں کوئی مشترک فارمولا تیار نہ ہو سکا۔ لیکن وزیر اعظم اور حکومت انگلستان کو مختلف امور پر ہندوستانی رہنماؤں کی رائے معلوم ہو گئی۔

گول میز کانفرنسوں کے بعد حکومت انگلستان نے ہندوستان کے نئے دستور کے متعلق تجاویز مرتب کیں اور مارچ ۱۹۳۳ء میں ایک قرطاس ابیض WHITE PAPER شائع کیا۔ اس قرطاس ابیض کی تجاویز کی رو سے ہندوستان کے نئے دستور میں صوبوں میں دوعملی یا ڈاٹیارکی ختم کر کے مرکز میں نافذ کرنے کا ارادہ تھا۔ صوبوں کو صوبائی خود مختاری دینے کی تجویز بھی رکھی گئی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے قرطاس ابیض کو خوش آمدید نہ کہا۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سولہ اراکین پر مشتمل ایک جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی JOINT SELECT COMMITTEE قائم کی گئی۔ اس کمیٹی کے سامنے کئی ہندوستانی رہنما پیش ہوئے اور کئی یادداشتیں پیش کی گئیں۔ کمیٹی نے ان یادداشتوں اور مختلف رہنماؤں سے گفتگو کی بنیاد پر اپنی رپورٹ مرتب کر کے نومبر ۱۹۳۴ء میں پیش کر دی۔ اس کمیٹی نے قرطاس ابیض میں پیش کردہ تجاویز میں زیادہ تبدیلیوں

کی سفارش نہیں کی۔

۵ فروری ۱۹۳۵ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان نے ایوان زیریں (ہاؤس آف کامنز) میں حکومت ہند کے قانون کا مسودہ پیش کیا۔ ہاؤس آف کامنز سے منظوری کے بعد یہ مسودہ قانون ایوان بالا (ہاؤس آف لارڈز) میں منظور ہوا۔ ۲ اگست ۱۹۳۵ء کو اس قانون پر شاہی دستخط ثبت ہو گئے۔ یہ قانون حکومت ہند کا قانون مجریہ ۱۹۳۵ء کے نام سے مشہور رہا کیونکہ اس کو ۱۹۳۵ء میں منظوری حاصل ہوئی تھی۔

حکومت ہند کا قانون مجریہ ۱۹۳۵ء GOVT OF INDIA ACT, 1935 کی اہم شقیں مندرجہ ذیل ہیں:

ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت نافذ کیا گیا۔ اس وفاق میں ہندوستان کے صوبے اور ہندوستان کی شاہی ریاستیں شامل تھیں۔ تمام صوبے خود بخود اس وفاق کے رکن بن گئے شاہی ریاستوں کے سربراہوں کے ضروری تھا کہ وفاق میں شامل ہونے کے لیے حکومت کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کر کے وفاق میں شرکت کا اعلان کریں۔ حکومت کو حق تھا کہ کسی شاہی ریاست کے سربراہ کی طرف سے پیش کردہ شرائط کو نامنظور کر کے معاہدہ کرنے سے انکار کر دے۔ معاہدہ میں یہ بھی درج ہوتا تھا کہ سربراہ ریاست کس حد تک اور کتنے اختیارات وفاق کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ ایک دفعہ جو اختیارات وفاق کے سپرد کر دیے گئے بعد میں ان میں نہ کمی کا امکان تھا اور نہ واپس لیے جا سکتے تھے۔

۲۔ مرکز میں دو ایوانی مقننہ قائم کی گئی۔ ایوان بالا کا نام کونسل آف سٹیٹ۔ ایوان زیریں کا نام فیڈرل اسمبلی تجویز کیا گیا تھا۔ کونسل آف سٹیٹ میں شاہی ریاستوں کے ۱۰۴ نمائندے اور صوبوں کے ۱۵۶ نمائندے تھے (میزان ۲۶۰) صوبوں کے نمائندوں کا انتخاب ہوگا اور شاہی ریاستوں کے نمائندوں کو ریاستوں کے سربراہ اپنی مرضی سے نامزد کریں گے۔

۳۔ وفاق اور وفاقی اکائیوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے تین فہرستیں اس قانون میں شامل کی گئیں۔

اوّل: مرکزی فہرست اس فہرست میں وہ تمام امور شامل تھے۔ جن پر مرکز کو مکمل اختیارات حاصل تھے۔ مثلاً دفاع، امور خارجہ کون سی، فوج کا انتظام وغیرہ۔

دوم ۔ صوبائی فہرست اس فہرست میں وہ تمام امور شامل تھے جن پر صوبائی حکومتوں کو مکمل اختیارات دیے گئے تھے۔

سوم ۔ مشترکہ فہرست CONCURRENT LIST

اس فہرست میں شامل امور کے متعلق مرکزی اور صوبائی حکومتیں قانون بنانے کا اختیار رکھتی تھیں لیکن اگر مشترکہ فہرست میں شامل کسی چیز کے متعلق مرکز نے قانون بنا دیا ہے تو صوبائی حکومت کو قانون بنانے کا حق نہیں رہتا تھا۔ اگر مرکزی اور صوبائی قانون میں تضاد ہو جائے تو صوبائی قانون کالعدم ہو جائے گا اور مرکزی قانون پر عمل ہو گا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ آ جائے جس کا ذکر ان تینوں فہرستوں میں موجود نہ ہو تو گورنر جنرل فیصلہ کرے گا کہ اسے کسی فہرست میں شامل کیا جائے۔

۴۔ صوبوں میں دوعملی یا ڈائیارکی DYARCHY کو ختم کیا گیا۔ لیکن اس اصول کو مرکز میں نافذ کر دیا۔ اب مرکزی حکومت کے اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اوّل وہ امور جن کا انتظام گورنر جنرل تین کونسلروں کی مدد سے کرتا تھا۔ ان امور میں دفاع ۔ امور، مذہبی امور اور قبائلی علاقوں کے مسائل شامل تھے۔ باقی ماندہ امور کو سرانجام دینے کے لیے گورنر جنرل وزراء کی کونسل بنائے گا۔ وزراء کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ وزراء مقننہ کی منتخب افراد میں سے چنے جاتے تھے۔ مرکزی وزارت مجموعی طور پر مرکزی مقننہ کے سامنے جواب دہ تھی۔

۵۔ فیڈرل اسمبلی کا عرصہ حیات ۵ سال تھا۔ مدت پوری ہونے بعد یہ خود بخود ختم ہو جاتی تھی۔ گورنر جنرل اس کی مدت حیات میں اضافہ کر سکتا تھا کونسل آف سٹیٹ ایک مستقل ادارہ تھی۔ ہر تین سال بعد ایک تہائی اراکین ریٹائر ہو جاتے اور ان کی جگہ نئے اراکین کا انتخاب ہوتا۔ شاہی ریاستوں کے نمائندوں کی نامزدگی سربراہ ریاست کرتا تھا۔ برٹش انڈیا کے نمائندوں کا انتخاب محدود رائے شماری کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ جداگانہ انتخابات کے اصول کو برقرار رکھا گیا۔

۶۔ مقننہ کے اختیارات کو ایک حد تک محدود کر دیا اس ایکٹ میں ترمیم کا اختیار صرف برطانوی پارلیمنٹ کو حاصل تھا۔ ہندوستانی مقننہ اس ایکٹ کے کسی حصہ میں کوئی

کمی یا زیادتی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ امور کے متعلق نہ مرکزی اور نہ صوبائی مقننہ قانون بنا سکتی تھی۔ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکتا تھا جس کا اثر برطانیہ کے شاہی خاندان یا بادشاہت کی جانشینی یا تاج برطانیہ کے اختیارات پر ہو۔ برطانوی شہریت، برّی اور ہوائی فوج کے قوانین یا پرائز کورٹوں کے سلسلہ میں بھی کوئی قانون منظور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو قوانین اور احکامات گورنر جنرل یا سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان نے ذاتی فیصلہ کی بنیاد پر نافذ کیے ہوں ان میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ مقننہ کو کوئی ایسا قانون بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ جس سے برطانیہ کے تجارتی مفادات کو نقصان پہنچے۔ اس کے علاوہ کچھ اہم امور ایسے تھے۔ جن کے متعلق قانون منظور کرنے سے قبل حکومت سے پیشگی اجازت لینی ضروری تھی۔

مرکزی بجٹ کے سلسلے میں مقننہ کے اختیارات محدود تھے۔ تقریباً ۸۰ فی صد بجٹ کو مقننہ کے ووٹ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اگر فیڈرل اسمبلی بجٹ کی کسی شق کو نامنظور کرے تو گورنر جنرل وہی حصہ کونسل آف سٹیٹ کے سامنے پیش کر سکتا تھا۔ اگر بجٹ کے سلسلہ میں دونوں ایوانوں میں نا اتفاقی ہو جائے تو گورنر جنرل دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کرے گا اور اکثریت کی رائے کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

مرکزی مقننہ کے منظور شدہ تمام قوانین گورنر جنرل کے سامنے پیش کیے جاتے تھے اگر گورنر جنرل دستخط کر دے تو قانون نافذ ہو تا تھا۔ گورنر جنرل کسی مسودۂ قانون پر دستخط کرنے سے انکار کر سکتا تھا۔ یا دوبارہ غور کرنے کے لیے مقننہ کو واپس بھیج سکتا تھا۔ یا شاہ معظم کی حکومت کے غور کے لیے روک سکتا تھا۔ اس ایکٹ کی ایک دلچسپ شق یہ تھی کہ اگر کسی قانون کو گورنر جنرل منظور کرے تو اس منظوری کے ایک سال کے اندر اندر" شاہ معظم اپنی کونسل میں" یعنی شاہ معظم اور ان کی کونسل کو یہ قانون رد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

۶۔ صوبائی گورنر، گورنر جنرل کی وساطت سے اور گورنر جنرل براہ راست سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کو جواب دہ تھا۔ مرکز میں گورنر جنرل اور صوبوں میں گورنروں کو ذاتی صوابدید DISCRETION اور اپنی مرضی INDIVIDUAL JUDGEMENT کی بنیاد اختیارات استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ گورنر جنرل ذاتی صوابدید یا اپنی مرضی سے مرکزی مقننہ

کے قانون پر عمل درآمد ہونے سے روک سکتا تھا۔ یا کوئی خاص احکامات جاری کر سکتا ہے۔ ان اختیارات کے استعمال میں وہ صرف سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کو جواب دہ تھا۔ گورنروں کو ان اختیارات کی بنیاد پر وزیروں کی سفارشات رد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ گورنر جنرل اور گورنروں کے ذاتی فیصلہ اور اپنی مرضی سے اختیار استعمال کرنے کی اجازت دے کر ذمہ دار طرز حکومت کی روح کو سخت نقصان پہنچایا گیا۔

۸۔ گورنر جنرل کو مرکزی حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ گورنر جنرل کا تقرر وزیراعظم کی سفارش پر شاہ برطانیہ کرتا تھا۔ گورنر جنرل اپنے اختیارات تین مختلف حیثیتوں میں استعمال کرتا تھا۔

اول: جب وہ وزراء کی رائے پر عمل کرتا تھا۔ اس ضمن میں اس کی حیثیت ایک دستوری سربراہ کی تھی۔

دوم: جبکہ وہ ذاتی فیصلہ کی بنیاد پر کوئی قدم اٹھاتا تھا۔ ایسا قدم اٹھانے کے لیے وہ اپنے وزراء سے مشورہ کر سکتا تھا لیکن اس پر لازم نہیں تھا کہ وزراء کے مشورہ کو قبول کرے۔ گورنر جنرل مندرجہ ذیل امور کے سلسلہ میں ذاتی فیصلہ کا حق استعمال کر سکتا تھا۔

(i) ملک کے مالی استحکام اور قرضوں کے ضمن میں۔
(ii) اگر ہندوستان یا اس کے کسی حصّہ میں امن اور سلامتی کو خطرہ ہو۔
(iii) اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ۔
(iv) سرکاری ملازمین اور ان کے خاندانوں کے جائز حقوق کی حفاظت۔
(v) برما اور انگلستان میں تیار شدہ اشیاء سے امتیازی سلوک۔
(vi) ہندوستان کی شاہی ریاستوں اور ان کے سربراہوں کے حقوق کا تحفظ۔
(vii) جو اختیارات اپنی مرضی کے مطابق کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کے سلسلہ میں۔

گورنر جنرل کو کچھ اختیارات اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی اجازت تھی ان اختیارات کا استعمال کرنے کے لیے گورنر جنرل کو وزراء سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس زمرے میں مندرجہ ذیل امور آتے تھے۔

(i) وہ تمام امور جن کو مخصوص شدہ امور قرار دے دیا گیا تھا۔ مثلاً دفاع، خارجی تعلقات مذہبی امور، قبائلی علاقوں کے امور ان امور کو سرانجام دینے کے لیے گورنر جنرل کونسلر مقرر

کرتا تھا جو کہ اس کو جواب دہ تھے۔

(ii) وہ وزراء کی کونسل کا تقرر کر سکتا تھا یا اسے برخاست کر سکتا تھا۔ گورنر جنرل کو وزراء کی کونسل کے اجلاس کی صدارت کا حق بھی حاصل تھا۔

(iii) آرڈی ننس جاری کرنے کا اختیار، آرڈی ننسوں کی دو اقسام تھیں۔ اوّل ایسے آرڈی ننس جو کسی بھی وقت جاری کیے جا سکتے تھے اور چھ ماہ تک نافذ رہتے تھے۔ دوم اگر مقننہ کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو فوری ضرورت پوری کرنے کے لیے گورنر جنرل آرڈی ننس جاری کر سکتا تھا۔

(iv) بعض امور کے متعلق مقننہ میں مسودۂ قانون پر غور کرنے سے منع کر سکتا تھا اور منظور شدہ مسودۂ قانون پر دستخط کرنے سے انکار کر سکتا تھا یا مسودۂ قانون کو دوبارہ غور کرنے کے لیے مقننہ کو واپس کر سکتا تھا۔

(v) بجٹ کے تقریباً ۸۰ فیصد حصے پر گورنر جنرل کو مکمل اختیارات حاصل تھے۔

(vi) گورنر جنرل صوبائی گورنروں کو حکومت چلانے کے ضمن میں ضروری ہدایات دے سکتا تھا۔

(vii) وہ دستور پر عمل درآمد معطل کر سکتا تھا۔

(viii) گورنر جنرل کو فیڈرل اسمبلی کا اجلاس طلب، ملتوی اور برخاست کرنے کا حق تھا۔ وہ دونوں کا مشترکہ اجلاس طلب کر سکتا تھا اور خطاب بھی کر سکتا تھا۔

۹۔ اس ایکٹ کے نفاذ سے قبل سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کو حکومت ہندوستان پر وسیع اختیارات حاصل تھے اس کی مدد کے لیے دو انڈر سیکرٹری اور ایک ایڈوائزر کمیٹی ہوتی تھی، حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء کی رُو سے سیکرٹری آف سٹیٹ کے اخراجات برطانوی خزانے سے پورے کیے جاتے تھے۔ اب بعض حدود میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کے اختیارات محدود کر دیے گئے تھے۔ صوبوں میں صوبائی خود مختاری اور ذمہ دار طرز حکومت کے نفاذ سے کچھ ذمہ داریاں وزراء کے سپرد کر دی گئیں۔ ان تمام امور پر سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کا کنٹرول کم ہو گیا۔ اگر صوبائی گورنر وزیر کی بات مان لیتا تو اس کا قدم دستور کے مطابق ہوتا تھا لیکن اگر گورنر اپنے مخصوص اختیارات استعمال کرنے کا فیصلہ کرے تو سیکرٹری آف سٹیٹ کا دخل بڑھ جاتا تھا۔ مرکزی حکومت کے مخصوص شدہ امور RESE- RVED SUBJECTS کے ضمن میں سیکرٹری آف سٹیٹ کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔

مخصوص شدہ امور میں دفاع، تعلقات خارجہ، قبائلی اور مذہبی امور، مرکزی ریلوے اور ریزرو بینک شامل تھے۔ یہ تمام کے تمام محکمے خاص اہمیت کے حامل تھے اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی ملازمتوں مثلاً آئی سی ایس کے سلسلہ میں اسے وسیع اختیارات حاصل تھے۔

سیکرٹری آف سٹیٹ تاج برطانیہ کو ہندوستانی امور کے سلسلہ میں دستوری ایڈوائزر تھا۔ وہ حکومت چلانے کے لیے گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کو ضروری ہدایات دینے کا مجاز تھا۔ ہندوستان کے متعلق تمام ضروری معلومات برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرتا تھا اور ہندوستان کے متعلق ممبروں کے سوالات کے جوابات دیتا تھا۔

سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کی مدد کرنے کے لیے جو انڈین کونسل موجود تھی اسے ختم کر دیا گیا۔ اس کی جگہ سیکرٹری آف سٹیٹ کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ ایڈوائزر مقرر کرتا تھا۔ اس میں سے کم از کم نصف ایسے ہونے چاہئیں جنھوں نے کم از کم دس سال تک ہندوستان میں ملازمت کی ہو اور انھیں ہندوستان چھوڑے دو سال سے زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو۔ یہ نامزدگی پانچ سال کے لیے ہوتی تھی اور انھیں پارلیمنٹ میں بیٹھنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ سیکرٹری آف سٹیٹ پر لازم نہیں تھا کہ وہ اپنے ایڈوائزروں سے مشورہ کرے تو اس پر عمل بھی کرے وہ سب ایڈوائزروں یا چند ایک سے مشورہ کر سکتا تھا لیکن مشورہ پر عمل کرنے کا پابند نہیں تھا۔

۱۰۔ ہائی کمشنر برائے ہندوستان کا عہدہ برقرار رکھا گیا۔ یہ عہدہ حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۱۹ء کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا۔ ہائی کمشنر کی تقرری گورنر جنرل اور اس کے ایگزیکٹو کونسل کرتی تھی۔ عہدہ کی مدت پانچ سال رکھی گئی۔ لیکن گورنر جنرل اور اس کی کونسل اس مدت کے پورا ہونے سے قبل اسے عہدہ سے علیحدہ کر سکتی تھی۔ ایک شخص ایک دفعہ سے زیادہ ہائی کمشنر مقرر ہو سکتا تھا۔ برطانیہ میں ہائی کمشنر کی حیثیت گورنر جنرل اور حکومت ہندوستان کے نمائندے کی تھی وہ ایسی تمام ذمہ داریاں سرانجام دیتا تھا جو گورنر جنرل اس کے سپرد کرے۔ ۱۹۲۰ء میں سٹور اور طلباء کا ڈیپارٹمنٹ اس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ انڈین ملازمین کی انگلستان میں ابتدائی تربیت سے متعلق امور کی دیکھ بھال کرتا۔ ان کی واپسی تنخواہوں، تعطیلات وغیرہ کے امور بھی اس کے سپرد تھے۔

۱۱۔ حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۳۵ء کی نمایاں خصوصیت صوبائی حکومتوں کا ڈھانچہ تھا۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ صوبائی خودمختاری اور ذمہ دار طرز حکومت کے اصول کو نافذ کرنے کی

کوشش کی گئی۔ صوبائی حکومتوں کو ایک حد تک مرکزی حکومت کے اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی گئی صوبائی حکومت کا سربراہ گورنر تھا۔ گورنر کا تقرر تاج برطانیہ کے نام میں ایک کمیشن کرتا تھا۔ گورنر جنرل کی طرح گورنر تین حیثیتوں میں اپنے اختیارات استعمال کر سکتا تھا۔ اوّل جب کہ وہ وزراء کی رائے پر عمل کرتا تھا۔ یہاں اس کی حیثیت صوبے کے دستوری سربراہ کی تھی۔ دوم جب کہ وہ ذاتی فیصلے کی بنیاد پر مخصوص اختیارات اس سے مشورہ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اس مشورہ کا پابند نہیں، سوم جب کہ وہ اپنی مرضی کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرتا تھا۔ ان فیصلوں کے لیے وزراء سے مشورہ لینا ضروری نہیں تھا۔ اگرچہ گورنروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے مخصوص اختیارات کا محدود استعمال کریں۔ لیکن ذاتی فیصلے اور اپنی مرضی کے زمرے میں گورنروں کو اتنے اختیارات حاصل ہو گئے تھے کہ وہ وزارت اور حکومت کے کاموں میں کافی دخل دے سکتے تھے۔

۱۲۔ صوبوں میں ڈائیارکی کا نظام ختم کر کے تمام محکمے وزراء کے سپرد کر دیے گئے۔

گورنر سے توقع کی گئی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ وزراء کے مشوروں پر عمل کرے۔ حکومت برطانیہ نے گورنروں کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ اس شخص کو وزارت بنانے کی دعوت دیں۔ جس کو صوبائی مقننہ کے ممبران کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ باقی وزراء کا تقرر وزیر اعلیٰ کی سفارش پر کیا جائے۔ اگر کوئی شخص وزیر مقرر ہو جو کہ مقننہ کا ممبر نہ ہو۔ اس کے لیے لازم تھا کہ وہ چھ ماہ کے اندر مقننہ کا ممبر بنے۔ گورنر کے لیے لازم تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ صوبے کی اقلیتوں کو وزارت میں خاطر خواہ نمائندگی ملے۔ گورنر کو وزیر اعلیٰ اور وزارتوں کو برخاست کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ ان وزارتوں میں مشترکہ ذمہ داری اور مقننہ کے سامنے جواب دہی کے اصول کو فروغ دینے کو اہمیت دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

۱۳۔ تمام صوبوں یکساں نوعیت کی مقننہ جات قائم نہیں کی گئیں۔ آسام، بنگال، لبار مدارس، بمبئی اور یو پی میں دو ایوانی مقننہ قائم کی گئیں۔ صوبہ پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اڑیسہ اور سی پی میں ایک ایوانی مقننہ بنائی گئیں۔ دو ایوانی مقننہ کی صورت میں دونوں ایوانوں کے نام صوبائی ریجسلٹو کونسل کا نام دیا گیا۔ صوبائی لیجسلٹو اسمبلی کے تمام اراکین براہ راست منتخب تھے۔ لیکن لیجسلٹو کونسل کے کچھ اراکین نامزد ہوتے تھے۔ جداگانہ انتخابات کے اصول کو صوبوں اور مرکز دونوں کے لیے برقرار رکھا گیا۔

اسمبلیوں کے اراکین کی تعداد کی تفصیل یہ تھی۔

صوبائی لیجسلٹو اسمبلی : مدارس ۲۱۵، بمبئی ۱۷۵، پنجاب ۱۷۵، بنگال ۲۵۰، یوپی ۲۲۸، لبار ۱۵۲، سی پی ۱۱۲، بربریہ ۱۱۲، آسام ۱۰۸، صوبہ سرحد ۵۰، اڑلیہ ۶۰، سندھ ۶۰، جن صوبوں میں دو ایوانی مقننہ بنائی گئی تھی۔ ایوان بالا صوبائی لیجسلٹو کونسل ایک مستقل ادارہ تھی۔ ایک تہائی اراکین تین سال کے بعد ریٹائر ہو جاتے تھے۔ اس کا رکن بننے کے لیے عمر ۳۰ سال سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ صوبائی لیجسلٹو اسمبلی کی رکنیت کی کم از کم عمر ۲۵ سال مقرر کی گئی تھی۔

رائے دہی کا حق حاصل کرنے کی شرائط مختلف صوبوں میں مختلف تھیں مثلاً پنجاب میں رائے دہی کا حق ان افراد کو حاصل تھا جو سالانہ کم از کم ۵ روپیہ مالیہ ادا کرتے یا ایسی ناقابل انتقال جائیداد کے مالک ہوتے جس کی مالیت ۶۰ روپے سے کم نہ ہوتی۔ یا جو پرائمری تک تعلیم یافتہ ہو خواتین میں سے ان کو حق رائے دہی دیا گیا جو جائیداد کی شرط پوری کرتی ہوں یا وہ ایسے شخص کی بیوی ہو یا بیوہ ہوں۔ جو جائیداد کی شرط پوری کرتا ہو۔ یا وہ ملٹری کے پنشن شدہ افراد کی بیوی یا والدہ یا جو تعلیم کی شرط پوری کرتی ہوں۔

۱۴۔ صوبائی مقننہ کو ان تمام امور کے لیے قانون بنانے کی اجازت تھی جن کا ذکر صوبائی اور مشترکہ فہرست میں کیا گیا تھا۔ اگر مشترکہ فہرست میں مندرجہ کسی چیز کے متعلق صوبائی اور مرکزی قانون میں اختلاف ہو تو مرکزی قانون پر عمل درآمد ہوگا۔ صوبائی فہرست میں مندرجہ ذیل امور شامل تھے۔ امن عامہ، عدالتوں کا انتظام، نظر بندی کے قانون، پولیس، جیل خانے، بورسٹل ادارے، سرکاری قرضے، صوبائی سرکاری ملازمتیں، اور سروس کمیشن، صوبائی مقننہ کے انتخابات، صوبائی وزراء، سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کی تنخواہیں، اسمبلی کے اراکین کی مراعات، بلدیاتی حکومت خود مختاری پبلک ہیلتھ اور صفائی، ہسپتال اور ڈسپنسریاں، تعلیم، سڑکیں، پل، جنگلات، مچھلی، پانی، زرعی آمدنی پر ٹیکس اور آبپاشی وغیرہ مشترکہ امور کی فہرست میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں۔ فوجداری اور دیوانی معاملات اور قوانین شادی اور طلاق، وصیتیں اور جانشینی و وراثت، کاغذات اور معاہدوں کی رجسٹریشن، ٹرسٹ کے معاملات، معاہدات، اور دیوالیہ، اخبارات، کتابوں اور پریس، فیکٹریاں ملازمین کے مفادات، ٹریڈ یونین، انڈسٹریل اور لیبر جھگڑے، بڑھاپے کی پنشن اور الیکٹرک سٹی وغیرہ۔

۱۵۔ صوبائی اسمبلی میں قانون منظور ہونے کے بعد گورنر کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ گورنر منظوری دے سکتا تھا۔ اسے رد کر سکتا تھا یا گورنر جنرل کے غور کرنے کے لیے روک سکتا تھا۔

یا اسمبلی کو دوبارہ غور کرنے کے لیے واپس کر سکتا تھا۔ کچھ قوانین کو منظور کرنے کے لیے گورنر کی پیشگی منظوری ضروری تھی۔ تقریباً نصف صوبائی بجٹ پر اسمبلی کو اختیار حاصل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ حکومت برطانیہ کو اختیار حاصل تھا کہ اگر ضرورت محسوس کرے۔ تو وہ کسی صوبائی قانون پر عمل درآمد ہونے سے روک سکتی تھی۔

۱۶۔ اگر صوبے میں ہنگامی حالات پیدا ہو جائے، امن عامہ کو خطرہ ہو یا کوئی مالی سیاسی یا کوئی اور مشکل در پیش ہو۔ جو کہ صوبائی حکومت کے قابو سے باہر ہو تو گورنر جنرل صوبے کا انتظام گورنر کی وساطت سے خود سنبھال سکتا تھا۔ ایسی صورت میں وزارت کو برطرف کیا جا سکتا تھا۔ تمام اختیارات گورنر جنرل کو حاصل ہو جاتے تھے۔

۱۷۔ ایک فیڈرل کورٹ قائم کی گئی جو کہ ہندوستان میں آخری عدالت تھی اسے براہ راست مقدمات سننے اور اپیلیں سننے کا حق تھا۔ ہر صوبے میں ایک ہائی کورٹ قائم کیا گیا۔ ہائی کورٹ متعلقہ صوبے کی آخری عدالت تھی۔ اس کے فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل ہو سکتی تھی۔

۱۸۔ برما کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۳۵ء نے صوبائی خود مختاری رائج کی لیکن صوبائی خود مختاری پر اتنی پابندیاں لگا دیں کہ اس کی اصل روح سلب ہو کر رہ گئی۔ اگر وزیر اعلیٰ اور گورنر میں اختلاف نہ ہو تو کوئی مشکل در پیش نہیں ہوتی تھی۔ جونہی اختلاف ہوا۔ وزیر اعلیٰ کے لیے آزادی سے حکومت چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ گورنر کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ با آسانی وزارت کے کاموں میں روڑے اٹکا سکتا تھا۔ اپنی مرضی ٹھونس سکتا تھا۔ ذاتی فیصلے اور اپنی مرضی کی بنیاد پر اس کو اتنے اختیارات حاصل تھے کہ وہ با آسانی ذمہ دار طرز حکومت کے اصولوں کو مجروح کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض حالات میں گورنر جنرل صوبائی حکومت کے کاموں میں دخل دے سکتا تھا۔ دستور میں صاف طور پر درج تھا کہ ہنگامی حالات کی صورت میں گورنر جنرل صوبہ کا انتظام خود سنبھال سکتا تھا۔

ایکٹ نے اگرچہ صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کو تقسیم کر دیا۔ لیکن صوبوں کے اختیارات کافی محدود تھے۔ مرکز با آسانی صوبائی امور میں دخل دے سکتا تھا۔ مشترکہ فہرست کے امور کی صورت میں مرکزی قانون کو صوبائی قانون پر فوقیت دی جاتی تھی اگر دونوں اختلاف ہو تو مرکزی قانون پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ گورنر جنرل کو صوبائی انتظام خود

سنبھالنے کا بھی اختیار تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس ایکٹ نے ہندوستان میں صحیح معنوں میں صوبائی خود مختاری اور ذمہ دار طرز حکومت کی بنیاد رکھی۔

سب سے زیادہ قابل غور بات یہ تھی کہ ہندوستان کی کسی مقننہ کو اس ایکٹ ترمیم کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ صرف برطانوی پارلیمنٹ اس میں کوئی ترمیم کر سکتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ باندھ دیے گئے تھے اور ان کے اختیارات کو محدود کر دیا تھا۔ مرکزی حکومت میں گورنر جنرل کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ مرکزی مقننہ کو بجٹ پر برائے نام اختیارات حاصل تھے۔

ہندوستان کے سیاسی رہنماں نے ڈائیارکی کے نظام پر سخت تنقید کی تھی۔ صوبوں میں اس کا تجربہ کامیاب نہیں رہا تھا۔ کیونکہ حکومت کے مختلف شعبوں کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ حکومت کی کارکردگی کے لیے نقصان دہ بھی ہے۔ اب اس نظام کو صوبوں میں ختم کر کے مرکز میں رائج کر دیا۔ اگر ایک اصولی صوبوں میں ناکام ہو چکا تھا۔ اب یہ امید کرنا کہ مرکز میں کامیاب ہو جائے گا۔ ایک غلط فہمی سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

ہندوستان کے وفاق کے قیام کا دارومدار شاہی ریاستوں کی شمولیت پر تھا۔ اس ایکٹ نے ان ریاستوں کو شامل ہونے یا نہ ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کی وجہ سے وفاق کا قیام مشکل ہو گیا تھا۔ صوبوں کو لازمی طور پر وفاق میں شامل ہونا تھا۔ ان کو اس ضمن میں اپنی مرضی استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔

وفاق کے دونوں ایوانوں میں شاہی ریاستوں سے ترجیحی سلوک کیا گیا۔ انھیں آبادی اور علاقہ کی نسبت زیادہ نمائندگی دی گئی تھی یہ تمام نمائندے نامزد ہوتے تھے۔ نقادوں کا خیال تھا کہ ان کے اور منتخب شدہ اراکین کے انداز فکر میں واضح فرق ہوگا۔ ان کا مطمع نظر ریاست کے سربراہ اور برطانوی حکومت کی خوشنودی ہوگا۔ تمام شاہی ریاستیں حکومت کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت تھیں۔ یہ ڈیپارٹمنٹ ان ریاستوں کے والیوں پر خاصا اثر رکھتا تھا۔ لہٰذا خدشہ تھا کہ ریاستوں کے نمائندوں کی نامزدگی میں حکومت کو کافی دخل ہوگا۔ اس طریقہ سے حکومت اپنے حمایتیوں کو مقننہ میں ڈال سکتی تھی۔

فیڈرل اسمبلی کے بالواسطہ انتخابات INDIRECT ELECTIONS کے اصول پر سخت تنقید کی گئی۔ سیاسی نقادوں کی رائے میں یہ اصول جمہوری تقاضوں کے مطابق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ملازمتوں پر سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان کو غیر معمولی اختیارات دیے سیاسی

رہنماؤں نے اس کنٹرول پر بھی اعتراض کیا۔

ہندوستان کے بجٹ کا خاصا بڑا حصہ فوج اور دفاع کی ضروریات کی نظر ہو جاتا تھا۔ دفاع اور کے امور کو مخصوص امور کے زمرے میں شامل کر کے مقننہ کے کنٹرول سے بچا لیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں عوام کے نمائندے فوج اور دفاع جیسے اہم معاملات میں بالکل دخل نہیں دے سکتے تھے۔ اور جو روپیہ ان امور پر خرچ ہوتا تھا۔ اس میں کمی بیشی کا حق انھیں حاصل نہیں تھا۔ ہندوستانی رائے عامہ فوج کے قیام کے خلاف نہیں تھی۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ حکومت ضرورت سے زیادہ دفاع پر خرچ کر رہی ہے اور ہندوستان کی ضروریات سے زیادہ فوج تیار کی گئی ہے۔ کیونکہ حکومت انگلستان اپنے امپیریل مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے ہندوستانی فوج کو استعمال کرنا چاہتی ہے۔ سیاسی رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ فوج کے کمشینڈ عہدوں کے لیے ہندوستانی باشندوں کی بھرتی کی اختیار میں اضافہ کیا جائے اور جلد از جلد فوج کے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کو فائز کیا جائے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ کہ حکومت انگلستان نے ۱۹۱۷ء میں پہلی بار یہ فیصلہ کیا کہ فوج کے کمشینڈ عہدوں پر بتدریج ہندوستان کے باشندوں کو فائز کیا جائے اس سے قبل کوئی ہندوستانی فوج میں کمشینڈ عہدہ سنبھال نہیں سکتا تھا۔ فوج کے کمشینڈ عہدوں کی بھرتی کے لیے رفتار بہت آہستہ تھی، ہندوستان کے سیاسی رہنما اس رفتار میں اضافے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

مسلمان جداگانہ انتخابات کے اصول کے حق میں تھے۔ حکومت نے ۱۹۳۲ء کے کمیونل ایوارڈ کی بنیاد پر مختلف قوموں اور فرقوں کے لیے نشتیں محفوظ کی تھیں۔ کانگریس اور ہندو رہنما جداگانہ انتخابات کے اصول کے خلاف تھے اور انھوں نے ایک قومی یک جہتی کے منافی قرار دیا۔

کانگریس نے اس ایکٹ پر سخت تنقید کی۔ بعض قائدین کا خیال تھا کہ اسے رد کر دیا جائے عام طور پر کانگریس کے رہنماؤں نے گورنروں کے مخصوص اختیارات شاہی ریاستوں کے نمائندوں کی نامزدگی کا اصول، دفاع پر مقننہ کے کنٹرول نہ ہونے کی سخت تنقید کی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد کانگریس نے اس ایکٹ کے تحت منعقد ہونے والے انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کا ردِ عمل اتنا سخت نہیں تھا جتنا کہ حقیقتاً کانگریس کا تھا۔ لیکن اس کے قائدین نے بھی ایکٹ کے مختلف حصوں کو ہدف تنقید بنایا۔ مسلم لیگ کے ۱۹۳۶ء کے سالانہ اجلاس میں سر سید وزیر حسن نے اس ایکٹ کو غیر جمہوری قرار دیا۔ مسلم لیگ نے اس ایکٹ میں صحیح معنوں میں ذمہ دار طرز حکومت رائج نہ کرنے اور بہت محدود صوبائی خود مختاری دینے پر افسوس کا اظہار کیا۔ کانگریس کی طرح

مسلم لیگ نے بھی انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۵ء کا حکومت ہند کا قانون مکمل طور پر ہندوستان میں نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ اس قانون کا صوبوں میں یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو نفاذ کر دیا گیا۔ وفاق اور مرکزی حکومت کے حصے کا نفاذ نہیں کیا گیا۔ انتخابات میں کانگریس نے چھ صوبوں میں مکمل اکثریت حاصل کر لی۔ ساتوں صوبوں میں سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ ابتدا کانگریس نے وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا کیونکہ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ گورنر اپنے مخصوص اختیارات استعمال نہ کرنے کا وعدہ کرے۔ آخر کانگریس اور حکومت میں صلح ہو گئی اور بنگال میں بھی مسلم لیگ برسراقتدار نہ آسکی۔ دیگر مسلم جماعتوں نے وزارتیں بنائیں، یہی حال سندھ اور صوبہ سرحد میں تھا۔ کانگریس کی وزارتیں ۱۹۳۹ء تک قائم رہیں۔ جنگ جنگ عظیم دوم کے آغاز پر حکومت برطانیہ سے اختلافات کی وجہ سے ان وزارتوں نے استعفیٰ دے دیئے غیر کانگریسی وزارتیں کام کرتی رہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ضروری ترمیم کے بعد حکومت کا قانون مجریہ ۱۹۳۵ء میں پاکستان میں آئین کے طور پر استعمال ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں جب پاکستان کا آئین تیار ہو گیا تو حکومت ہند کے قانون مجریہ ۱۹۳۵ء کی جگہ نافذ کر دیا گیا۔ ہندوستان میں بھی دستور کی تیاری تک حکومت ہند کا قانون مجریہ ۱۹۳۵ء میں ضروری ترامیم کے ساتھ دستور کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ہندوستان کا آئین ۱۹۵۰ء میں تیار ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے ۱۹۵۰ء کے آئین اور پاکستان کے ۱۹۵۶ء کے آئین میں حکومت ہند کے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی کئی شقوں کو شامل کیا گیا تھا۔

ہندوستان کی آزادی کا قانون ۱۹۴۷ء

۱۔ آزادی ہند کا مسودہ قانون ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ ۱۵ جولائی کو پارلیمان کے دونوں ایوانوں نے اسے منظور کر لیا۔ ازاں بعد شہنشاہ برطانیہ نے ۱۸ جولائی کو اس کی منظوری دے دی۔ قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کرنے کے بعد عارضی آئین کے طور پر دونوں مملکتوں میں اگست ۱۹۴۷ء سے انڈیا آرڈر کی رو سے ۱۹۴۷ء ہی میں نافذ کیا گیا۔ اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانوی ہندوستان میں دو آزاد مستعمرات کا قیام عمل میں آنا تھا۔

۲۔ ایک دفعہ کی رو سے ہر مملکت میں ایک گورنر جنرل کا تقرر ہونا قرار پایا۔ ایک شخص دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل بن سکتا تھا۔

۳۔ پاکستان اور بھارت کی اعلیٰ اسمبلیوں (آئین ساز اسمبلیوں) کو اعلیٰ اختیارات دیے گئے تھے۔

۴۔ مقامی ریاستوں کی برطانوی حکومت سے آزادی کا اعلان بھی ہوا۔

۵۔ قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء اس وقت تک دونوں ملکوں میں نافذ رہ سکتا تھا۔ جب تک وہ اپنے اپنے آئین نہیں بنالیتیں۔

۶۔ دونوں ملکوں کی مجلس قانون ساز ۱۹۳۵ء کے قانون میں ضرورت کے وقت ترمیم بھی مجاز قرار پائیں۔

تفویض اختیارات

متحدہ آئین ساز اسمبلی کے پاکستانی اراکین نئی دہلی میں چند دن قیام کرکے اپنی مملکت کا ابتدائی انتظام و انصرام کرنا چاہیے تھے لیکن کانگریس اسی کی روادار نہ تھی۔ کانگریس والوں سے تنگ آکر مرکزی شعبوں کے مہمان اہل کاروں کو بھی ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ پاکستان کا دارالحکومت کراچی قرار پایا۔

کانگریس لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھارت کا گورنر جنرل مقرر کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اور اس سلسلے میں انھیں دعوت بھی دی جاچکی تھی۔ اگرچہ وہ پاکستان کے بھی گورنر جنرل بننے کے متمنی تھے۔ اس مسئلے پر مسلم لیگ نے بہت غور کیا۔ دراصل بھارت اور پاکستان کے درمیان بے شمار معاملات پر اختلافات رائے پایا جاتا تھا اور ان حالات میں ہر معاملے پر گورنر جنرل کو اپنا فیصلہ دینا پڑتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مسلم دشمنی کسی سے مخفی نہ تھی۔ اس پر قائداعظم نے بھارت اور پاکستان کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنر اور ان دونوں پر ایک بالائی گورنر جنرل کے تقرر کی تجویز پیش کی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے قائداعظم کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

برطانوی وزیراعظم مسٹر اٹیلی نے برطانوی پارلیمان کے ایوانِ زیریں (دارالعوام) میں اعلان کیا کہ

"پاکستان کے لیے مسٹر جناح گورنر جنرل مقرر کیے گئے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کی اس دعوت کو شرف قبولیت بخشا کہ وہ ہندوستان کے گورنر جنرل رہیں گے۔ جسے مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے قبول کرلیا۔"

باب ۲۴

تحریک پاکستان میں علماء کا کردار

۱۹۳۴ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے دوبارہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔ اس وقت تک مسٹر جناح یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد قائم ہو جائے اور برصغیر کے عام لوگ متحد ہو کر حقوق آزادی کے لیے سعی کریں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں مسٹر جناح نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے مصالحت کے لیے بات چیت کی۔ اس گفتگو میں پوری طرح تو اگرچہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تاہم انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات میں کچھ مقامات پر مسلم لیگ اور کانگرس نے آپس میں تعاون کیا۔

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مسٹر جناح انگلستان سے مستقل طور پہ واپس آگئے اور مسلم لیگ کی تنظیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قبل اس کے مسلم لیگ دو گروہوں میں منقسم رہی تھی۔ نیز اس کی تنظیم بھی اہل اور مخلص افراد کے ہاتھوں میں نہ تھی۔ اس لیے وہ ایک کمزور اور غیر موثر جماعت تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس ابھی تک صوبائی خود مختاری اور فیڈرل گورنمنٹ کے قیام کی تجویز کے بارے میں پس و پیش کر رہی تھیں۔ آخر کار دونوں جماعتیں اس مجوزہ ایکٹ کے تحت صوبائی انتخابات لڑنے پر آمادہ ہو گئیں۔ مسلم عوام ابھی تک سیاسی بدنظمی کا شکار تھے۔ مسلم لیگ کا بھی عوام سے خاطر خواہ رابطہ نہ تھا۔ اس لیے وہ ایک موثر سیاسی جماعت نہ تھی۔ حالانکہ اس الیکشن سے قبل عوام کے ساتھ سیاسی رابطہ قائم کرنا ناگزیر تھا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت سر سید وزیر حسن بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ نے اپنی تیس سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ عوام سے رابطہ قائم کرنے کی قرارداد پاس کی جس کے تحت عوام کو پارلیمانی نظام کا مقصد اور انتخابات کے فوائد و نقصانات اور نتائج سے آگاہ اور باخبر کرنا تھا تاکہ مسلم عوام بھی صوبائی انتخابات میں اپنا مناسب حصہ لے سکیں۔ اس اجلاس میں مولانا احمد سعید ناظم جمعیت ہند کی تحریک پر مسٹر جناح کو ایک مرکزی الیکشن بورڈ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا اور اس بات کا بھی مجاز ٹھہرایا گیا کہ مسٹر جناح مرکزی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل میں

دیگر حضرات کے علاوہ علماء بھی شریک تھے۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے صرف علماء کرام کے نام ہی بیان کیے جاتے ہیں مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ میں کل ۵۴ ممبران تھے جن میں علماء کی تعداد بلحاظ صوبہ حسب ذیل تھی۔

نام صوبہ	نام رکن	تعداد
یو۔ پی	مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا شوکت علی	۲
سندھ	مولانا محمد صدیق (کذافی الاصل صحیح صادق کھڈہ۔ کراچی مولانا حکیم فتح محمد شروانی	۲
پنجاب	مولانا محمد اسحاق خان مانسہروی۔ مولانا عبد القادر قصوری مولوی سید شاہ زین الدین	۳
شمال مغربی سرحد	مولانا عبد الرحیم غزنوی مولانا اللہ بخش یوسفی	۲
بہار	مولانا سجاد پھلواری (کذافی الاصل صحیح بہاری صیحح بہاری، مولوی عبد الحفیظ	۳
دہلی	مولانا احمد سعید	۱
مدراس	مولانا سید مرتضیٰ بہادر صدر خلافت کمیٹی	۱
بنگال	مولانا محمد اکرم خان، مولوی مجیب الرحمٰن	۲
سی۔ پی	مولوی سید عبد الرؤف شاہ	۱

مزید برآں مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت جمعیت علماءِ ہند اور مجتہدین کو مسلمانان ہند کے مذہبی اور شرعی امور کا نگران اور محافظ تسلیم کیا گیا۔ مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں دیگر جماعتوں کے علاوہ جمعیت علمائے ہند اور مجلس احرارِ اسلام کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ اس پارلیمانی بورڈ نے اپنا ایک منشور بھی شائع کیا۔ جس کے خاص خاص نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ ملک میں تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے۔
۲۔ ملک سے انتظامیہ کے گرانبار اخراجات کو کم کرایا جائے گا۔
۳۔ فوج کو قومیا کر فوجی اخراجات کو کم کرایا جائے گا۔
۴۔ ملک میں ایسی صنعت و حرفت کی ہمت افزائی کی جائے گی اور اسے ترقی دی جائے گی۔
۵۔ سکہ و شرح تبادلہ کا خیال رکھا جائے گا۔
۶۔ دیہی آبادی کو سماجی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی دی جائے گی۔
۷۔ مسلمانوں کے مذہب، زبان اور حروف کی حفاظت کی جائے گی۔
۸۔ ملک میں صحتمند سیاسی بیداری پیدا کی جائے گی۔

۸ تا ۱۱ جون ۱۹۳۶ء آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس بمقام لاہور بصدارت جناب قائداعظم محمد علی جناح منعقد ہوا۔ اس نے میں ڈاکٹر اقبال اور علمائے ہند کے نمائندے بھی شریک تھے چار دن کی بحث و تمحیص کے بعد مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اصول و ضوابط، منشور اور دستور العمل منظور ہوئے جس کے خاص خاص نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ناقص اور غلط ہے اور لیگ اس کی ترمیم کا مطالبہ کرتی ہے
۲۔ صوبائی خود مختاری کی سکیم بھی ناقص ہے اور اس کی ترمیم ضروری ہے لیکن صوبائی خود مختاری کے نظام کو قبول کر کے چلانا چاہیئے۔
۳۔ کمیونل اوارڈ ہی کو لیگ قبول کرتی ہے۔ اس وقت تک جب تک کسی معاہدہ بین الاقوامی کے ذریعے اس کا بہتر بدل پیدا کیا جاسکے۔
۴۔ آل انڈیا فیڈریشن اسکیم کو لیگ سختی کے ساتھ ادا کرتی ہے۔ اور بنیادی اور اساسی طور پر اس کے خلاف ہے۔ اور اس کو کبھی نہیں کرے گی۔
۵۔ مسلم لیگ ۱۹۱۶ء کے لیگ کانگریس، لکھنؤ ایکٹ کے مطابق کانگرس سے ایک فریق اور پارٹی کی حیثیت سے معاہدہ کرنا چاہتی ہے لیکن کسی حال میں مسلم قوم کی جداگانہ تنظیم اور جداگانہ انفرادیت کو کم کرنے کی روادار نہیں ہوگی۔
۶۔ جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر جداگانہ مسلم پارٹی کا قیام ضروری ہے۔ لیکن

مسلم لیگ کسی گروپ یا گروپوں سے جن کے اغراض و مقاصد آل انڈیا مسلم لیگ سے قریب ہیں۔ تعاون کرنے کے لیے آزاد ہے۔

۷. مسلم لیگ مسلمانانِ ہند سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اقتصادی یا کسی دوسری بنیاد پر مسلمانوں سے کسی کو ناجائز استفادہ کرنے، ان میں پھوٹ ڈالنے کا موقعہ نہ دیں۔ اور اقتصادی یا کسی طبقاتی سوال پر ملت اسلامیہ کو کسی طرح شکست نہ ہونے دیں مسلم لیگ نے جمعیت علمائے ہند اور دیگر مسلم جماعتوں کی شرکت و مدد سے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا۔ جمعیت علمائے ہند لیگ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی انتھک کوششیں کیں بلکہ مولانا سید حسین احمد مدنی نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو شخص (مسلمان) مسلم لیگ کے خلاف کام کرے گا یا مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ نہ دے گا۔ وہ اصل واصل جہنم ہو گا۔ جمعیت علماء کی اس جدوجہد کے نتیجے میں عوام سے کم رابطگی کے باوجود مسلم لیگ کے امیدواروں کو انتخابات میں امید سے زیادہ کامیابی ہوئی۔

کانگرسی وزارتیں اور مسلم لیگ سے مخالفت

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ اور کانگرس نے کچھ مقامات پر باہمی تعاون اور ہمدردی کا اظہار کیا مگر یہ تعاون صرف وقتی اور عارضی ثابت ہوا۔ چونکہ انتخابات کے نتائج نے اس تعاون کو نہ صرف ختم کر دیا بلکہ کانگرس کو چھ صوبوں میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہو جانے کے بعد کانگریسی سیاست سے اپنا رُخ ہی دوسری جانب متعین کر لیا۔ ڈاکٹر انصاری کی وفات سے بھی اس اتحاد کو خاصی ٹھیس پہنچی علاوہ ازیں مندرجہ ذیل عوامل بھی اتحاد و تعاون کو ختم کرنے میں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

۱۔ کانگرس میں مہاسبھائی ذہنیتوں کے افراد کا غلبہ۔

۲۔ گاندھی جی کا انتخابات کے بعد اعلان کہ برصغیر میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی ہے

۳۔ جواہر لال نہرو کا بیان کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں یعنی کانگرس اور حکومت ہیں۔

۴۔ انتخابات میں کامیابی کے نشے میں کانگرس کا اپنے تمام وعدوں سے انحراف

غرض یہ کہ ان مندرجہ بالا عوامل کی بنا پر مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات کی بنیاد پڑی

کانگرس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں چھ صوبوں میں وزارتیں قائم کیں۔ اس کے بعد صوبہ یوپی میں مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین کولیشن (COALITION) یعنی مخلوط حکومت بنانے کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ اس گفتگو میں مسلم لیگ کی جانب سے چوہدری خلیق الزمان اور نواب محمد اسمٰعیل خان اور کانگرس کی جانب سے پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور پنڈت گوبند بلبھ پنت شریک تھے۔

کانگرس کا آمرانہ رویہ

کانگرس ورکنگ کمیٹی نے مارچ ۱۹۳۷ء میں ایک پارلیمانی سب کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی میں مولانا آزاد، راجندر پرشاد اور ولبھ بھائی پٹیل شریک تھے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اس سب کمیٹی کو بڑے وسیع اختیارات سپرد کیے تھے۔ مثلاً آئینی امور میں صوبائی حکومتوں کو ہدایت اور رہنمائی کرنا۔ کانگرس پارلیمانی پارٹی سے قریبی روابط قائم کرنا۔ کسی بھی ایمرجنسی میں مناسب اور ضروری کارروائی عمل میں لانا۔ صوبائی وزراء کا تقرر اور تنزل کرنا۔ صوبائی کابینہ کے تمام آئینی اور انتظامی امور کا محاسبہ اور کنٹرول کرنا۔ نیز صوبائی وزراء اور ممبران اسمبلی بھی اس کمیٹی کے سامنے جوابدہ تھے۔ اور یہ سب کمیٹی صوبائی وزیراعلیٰ کو بھی حسب ضرورت ہدایات جاری کر سکتی تھی۔ مختصر یہ کہ کانگرس نے ورکنگ کمیٹی اور پارلیمانی سب کمیٹی کو اختیارات اعلیٰ سونپ دیئے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے تبصرہ کے مطابق اس سب کمیٹی کے ایک رکن مولانا آزاد بنگال، یوپی، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کا مختار کار مقرر کیا گیا تھا۔

کانگرس پارلیمانی پارٹی کے رکن مولانا ابوالکلام آزاد اور صوبہ یوپی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ارکان چوہدری خلیق الزمان اور نواب محمد اسمٰعیل خان کے درمیان مخلوط حکومت بنانے کے سلسلے میں ۲۷ جون ۱۹۳۷ء سے گفت و شنید شروع ہوئی جو طویل بحث و مباحثے کے بعد امید و بیم کے عالم میں ختم ہو گئی۔ اسی اثناء میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے اس بات چیت کو مزید کامیابی سے ہمکنار کیا۔ وہ یہ کہ حافظ محمد ابراہیم، مسلم لیگ کے ٹکٹ سے صوبہ یوپی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ حافظ صاحب نے مولانا حسین احمد مدنی کی منظوری سے کانگرس پلیج (عہدنامہ) پر دستخط کر دیئے اور بلا شرط و معاہدہ کانگریس کی تائید و حمایت کا اعلان کر کے منسٹری قبول کر لی۔ حافظ صاحب کی مسلم لیگ سے معاہدہ

شکنی اور کانگرس سے خفیہ معاہدے کے بارے میں عبدالوحید خاں صاحب کی کتاب "تقسیم ہند"، میں مولانا احمد سعید کا ۲ ستمبر ۱۹۳۷ء کا ایک عکسی مراسلہ شائع ہوا ہے۔ اس مراسلے میں تحریر ہے کہ حافظ ابراہیم نے مولانا آزاد سے ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا۔ اور اس کے بعد کانگرس میں شرکت کی اور مولانا حسین احمد مدنی کے ایماء سے کانگرس کے عہد نامے پر دستخط کیئے۔

مولوی طفیل احمد منگلوری کے بیان کے مطابق حافظ محمد ابراہیم نے مئی ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ سے استعفیٰ دے کر علیحدگی اختیار کر لی۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے وزارتیں سنبھالیں تو یوپی میں کانگرس ابراہیم کو وزیر مقرر کیا گیا۔ حافظ صاحب کے وزارت قبول کرنے پر مسلم لیگ نے اصرار کیا کہ حافظ صاحب صوبائی اسمبلی کی نشست پر مسلم لیگ کے ٹکٹ سے کامیاب ہوئے ہیں اس لیے اب صوبائی ممبری سے بھی استعفیٰ دیں اور دوبارہ الیکشن لڑیں، لہٰذا حافظ صاحب نے صوبائی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے کر اکتوبر، نومبر ۱۹۳۷ء میں ضمنی انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ یہ انتخاب دونوں جماعتوں نے بڑی کوشش کی۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی اور حافظ صاحب کے ذاتی اثرات سے حافظ صاحب اس ضمنی انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ حافظ صاحب ممبری سے استعفیٰ دینے کے بعد بھی وزیر رہے۔

مسلم لیگ اور کانگرس کی وجہ مخالفت

چوہدری خلیق الزمان نے بیان کیا ہے کہ کانگریس وزارتیں قائم ہونے کے بعد مولانا آزاد ۱۳ جولائی ۱۹۳۷ء کو میرے پاس آئے۔ اور دوران گفتگو مولانا نے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے رویے اور طریقہ کار کے متعلق دریافت کیا۔ اور کہا کہ "اگر حکومت اور کانگریس کے درمیان کسی معاملے پر کشیدگی ہو جائے اور کانگریس وزارتوں سے مستعفی ہو۔ تو مسلم لیگ ایسی صورت میں ہمارا ساتھ دے گی یا نہیں؟ چوہدری صاحب نے جواباً کہا کہ ہم مناسب اور اور جائز امور میں کانگرس کی اخلاقی تائید اور حمایت کریں گے۔ اس کے بعد مولانا آزاد ۱۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو دوبارہ لکھنؤ آئے۔ اور دو صفحوں کا ٹائپ شدہ نوٹ چوہدری صاحب کو دیا جس میں کانگرس کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے کی شرائط درج تھیں۔ مولانا آزاد نے اس نوٹ پر چوہدری صاحب سے دستخط کرنے کو کہا۔ مگر چوہدری صاحب نے اسے قابلِ اعتراض سمجھ کر دستخط نہ کئے۔ کوپ لینڈ نے کانگریس کی وہ شرائط درج کی ہیں۔ جن کے تحت کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کرنا چاہتی تھی۔

۱. مسلم لیگ گروپ صوبہ یو پی کی اسمبلی میں بحیثیت ایک علیحدہ گروپ کام نہ کرے۔
۲. مسلم لیگ گروپ کے صوبائی ممبران کانگرس کا ایک حصہ بن جائیں
۳. تمام مسلم ممبران اسمبلی کانگرس ورکنگ کمیٹی کی ہدایات و احکام پر عمل کریں۔
۴. اسمبلی کے باہر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ توڑ دی جائے۔ اور آئندہ انتخابات میں بھی مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں۔
۵. تمام مسلمان ممبران کانگرس ڈسپلن کی پابندی کریں۔
۶. اگر کانگرس اسمبلی سے استعفیٰ دے تو تمام مسلم ممبران بھی استعفیٰ دیں۔

کانگرس کی مندرجہ بالا چھ شرائط کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مستقبل میں مسلم لیگ اور دیگر مسلم جماعتیں ختم ہو جائیں۔ مزید یہ کہ کانگرس نے کہا کہ برصغیر میں اس کے سوا کسی دیگر سیاسی جماعت کا وجود ہی نہیں ہے۔ دوسری طرف کانگرس کی شرائط مسلم قوم کی عزت اور خود مختاری کے منافی تھیں۔ اس لیے مسلم لیگ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا

۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے بعد مسلمان "من حیث القوم" زیادہ منظم و متحد ہو گئے تھے اور ان کا قومی مطمع نظر زیادہ واضح اور متعین ہو گیا تھا۔ مسلم سیاست میں اس انقلاب کے بعد ملکی سطح پر اب سیاسی تعاون اور اتحاد کی واحد شکل یہی تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ مل کر کام کریں۔ اور ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے ماتحت مل کر صوبائی حکومتیں قائم کریں مگر مسلم لیگ کی یہ امید موہوم اس وقت ہو گئی جب کہ کانگرس نے یو پی اسمبلی میں شرکت کے لیے مندرجہ بالا چھ شرائط پیش کیں۔ جو کسی حالت میں بھی قابل قبول نہ تھیں۔ اب جبکہ نہ صرف یو پی بلکہ تمام کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں کو "من حیث القوم" نظر انداز کر کے خالصتاً کانگرسی وزارتیں قائم کر لی گئیں تو مسلم لیگ کے لیے مسلم جمہور کو منظم و متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر لانا ناگزیر ہو گیا۔

یوں تو کانگرس ان انتخابات میں ایک عظیم پارلیمانی پارٹی کی حیثیت سے ابھری تھی لیکن اس کی ہیئت ترکیبی میں ایک بنیادی کمزوری یہ تھی کہ مسلم انتخابی حلقوں میں اسے بین طور پر ناکامی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ نہ تو پورے ملک کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی تھی اور نہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو ایک "قومی جماعت" کہہ سکتی تھی۔ اس کمزوری کا مداوا یہی ہو سکتا تھا کہ صوبائی وزارتوں کی تشکیل میں کانگرس پارٹی ایسی

مسلم جماعتوں یا گروہوں سے الحاق کرتی ہے جن کو مسلم عوام کی واقعی تائید حاصل ہو لیکن کانگرس نے فتح کے نشے میں ایسا نہیں کیا بلکہ برسر اقتدار آکر حکومت کے زعم میں ملت اسلامیہ اور مسلمانوں کے انفرادی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف تو کانگریس اپنے اکثریتی صوبوں میں کسی مسلم جماعت سے من حیث الجماعت الحاق کرنے کے لیے تیار نہ تھی اور دوسری طرف جن صوبوں میں کانگرس اقلیت میں تھی۔ وہاں کانگریس پارلیمانی پارٹی کو دوسرے گروہوں سے الحاق کرنے کی پوری چھوٹ تھی۔ چنانچہ پنجاب اور سندھ میں کانگریس نے وقتاً فوقتاً سخت رجعت پسند گروہوں کے ساتھ ناطہ قائم کیا اور اس پالیسی کے معمار خود مولانا آزاد ہی تھے۔

مزید برآں کانگرس نے انتخابات میں غیر معمولی کامیابی کے نشے میں اپنے ہی معاون اور ہمدردوں کو بھی فراموش کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۷ تا ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء کو مجلس احرار اسلام کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے مسٹر کرپلانی، سیکرٹری کانگرس کو مدعو کیا گیا۔ مسٹر کرپلانی نے جواب دیا کہ میں علیل ہونے کی وجہ سے جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتا اور اگر میں تندرست بھی ہوتا تو میں بھی شریک نہ ہوتا کیونکہ مجلس احرار اسلام ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ اس کے جواب میں مولانا مظہر علی اظہر نے اپنے صدارتی خطبہ ۱۹۳۷ء منعقدہ لکھنؤ میں کہا کہ ۱۹۱۸ء کے آخری ایام سے ہی جب کہ مجلس احرار نہ تھی تو ہمارے کارکن قومی آزادی کی تحریکوں میں برابر سرگرم عمل رہے اور آج تک سرگرم عمل چلے آ رہے ہیں "مجلس احرار کے قیام کے وقت کانگریس سے کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ہمارے بہترین کارکن ۱۹۳۰ء کی تحریک میں قید کاٹ چکے ہیں۔ جن میں سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چوہدری افضل حق اور شیخ حسام الدین کے نام بیان کر دینا مناسب ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے رضا کاروں نے تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا۔

مرتب خطبات احرار، شورش کاشمیری نے احرار کے اختلاف اور ہندوؤں کی الزام تراشی کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم کرلیں اور اس میں کوئی متبادل صورت ہمیں قابل قبول نہ ہو تو ہم قوم پرستی کے دلدادہ۔ لیکن اگر پنجاب کے ہندو اور سکھ رہنما جنہوں نے نہرو رپورٹ کے پنجاب والے فارمولے پر دستخط کیے تھے

اپنے تحریری معاہدے سے بیزاری کا اظہار کریں اور اس کی اعلانیہ مخالفت کریں۔ تو ان کی قوم پرستی میں کوئی فرق نہیں آتا"

مہاتما گاندھی نے کلکتے میں کنوینشن کے وقت یعنی ۱۹۲۸ء میں وفد سے ملاقات کی۔ اس وفد کے امیر مسٹر جناح تھے اور مولانا مظہر علی اظہر رکن وفد تھے۔ اس وفد نے مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں سے کہا کہ

"نہرو رپورٹ کے فارمولوں میں اس قدر ترمیم کر دیجئے کہ اگر حکومت برطانیہ حق رائے دہی بالغاں کو تسلیم نہ کرے تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں لیکن مہاتما گاندھی حق رائے دہی بالغاں کے سوائے کسی اور معیار رائے دہی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے فرمایا کہ "کوئی اور متبادل تجویز میرے تصور میں نہیں آسکتی۔ الغرض کانگرس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنوں اور غیروں سے بھی آنکھیں پھیریں اور ہندو راج قائم کرنے کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل عوامل اہمیت کے حامل ہیں:۔

۱۔ کانگریس کے ممبران انتظامیہ پر کنٹرول کر کے انہیں اپنی مرضی سے چلانا چاہتے تھے تاکہ من مانی کارروائی کر سکیں اور اس کنٹرول کو اصلاح کا نام دیتے تھے۔

۲۔ چیف سیکرٹری یوپی نے ایک خط مجسٹریٹوں کو لکھا جس میں ہدایت تھی کہ ضلعی حکام اور کانگرسی راہنماؤں کے مابین اعتماد اور یقین کا رشتہ ہونا چاہیئے اور کانگرسی ورکر کی شکایات خصوصاً نچلے درجے کے سرکاری ملازمین کے متعلق متعلقہ سیکرٹریوں تک پہنچائی جائیں اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس نے ایک مقابل انتظامی ڈھانچہ قائم کر رکھا تھا جس کا کام سرکاری ملازمین اور ان کی جا و بے جا شکایات اضلاع کے سیکرٹریوں تک پہنچانا تھا۔

۳۔ مسلمان دشمن کا ایک عملی ثبوت یہ بھی تھا کہ "بندے ماترم" بحیثیت ایک قومی ترانہ منظور کیا اور گاندھی جی کی شبیہہ کو جھک کر سلام کرنا لازمی قرار دیا۔ جمعیت علمائے ہند اور خصوصاً مولانا سجاد بہاری نے گاندھی ازم کی تعلیمات کو اسلامی کلچر اور اسلامی تہذیب کے خلاف قرار دیا۔ چونکہ مسلمانوں کے نزدیک کسی بڑے سے بڑے پیغمبر بانی کو جھک کر سلام کرنا ناجائز ہے اس عمل سے مسلمانوں کو روحانی صدمہ پہنچتا ہے۔

۴۔ کچھ اضلاع میں کانگریسی پولیس سٹیشن" قائم کیے گئے۔ کانگرسی ورکرز نے اپنے ذاتی عناد اور مقامی دشمنیوں کا بدلہ لینے کے لیے ان پولیس سٹیشنوں کو آلہ کار بنایا۔ جہاں پر پولیس والوں نے اپنی مرضی سے فرضی جرائم قائم کرکے اپنے مخالفین کے خلاف جائز و ناجائز تحقیقات کیں۔ جن کی بناء پر لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہوا۔

۵۔ مزید براں مسلم صوبائی ممبران نے یہ شکایات کیں کہ صوبہ یوپی میں کانگریسی مذہبی معاملات میں بھی مداخلت کر رہے ہیں۔

۶۔ اس کے علاوہ کانگرس نے مسلم ماس کنٹیکٹ (عوامی رابطہ) کی مہم جاری کی۔ اصل میں یہ مہم مسلمانوں کی قومیت کو ختم کرکے ہندوستان کی ایک قومیت میں ضم کر دینے کے لیے یہ باور کرایا جاتا تھا کہ کانگریس غیر فرقہ پرست جماعت ہے اس لیے اس میں شریک ہو کر معاشی اور اقتصادی بدحالی کو ملک سے دور کرنے میں کانگرس سے تعاون کیا جائے۔

۷۔ واردھا، ودیا مندر اور دیہات سدھار سکیمیں جاری کیں۔ ان سکیموں کو سرکاری فنڈز سے نافذ العمل بنایا اور اس کے نفاذ کی جبراً کوششیں کیں۔

الغرض کانگرس نے اپنے دور وزارت میں شروع سے ہی مسلم دشمنی اختیار کی۔ اور مسلمانوں کو ہر جائز و ناجائز طور پر پریشان کرنا شروع کیا۔

کانگریس کی پالیسی اور اختلاف علماء

کانگریس کی اس مسلم آزار پالیسی کے نتیجے میں مسلم لیگ نے خصوصاً اور علماء نے عموماً اپنا اپنا ایک زاویہ قائم کیا۔ اس صورتحال کے نتیجے میں علماء کے تین مختلف گروہ بن گئے۔ ایک گروہ ان علماء پر مشتمل تھا جو کانگریس کی پالیسیوں کے حامی تھے۔ ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسرے گروہ میں وہ علماء شامل تھے جو کانگرس کی بعض اصلاحات سے متفق نہیں تھے۔ مگر اس کے باوجود کانگریس کی حمایت میں تھے۔ اس گروہ میں مفتی کفایت اللہ، مولانا سجاد بہاری اور مولانا احمد سعید وغیرہ شامل تھے۔ تیسرا گروہ ان علماء کا تھا جو کانگریس کے اس معاندانہ رویے کے بالکل خلاف تھے۔ ان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا بشیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع دیوبندی۔ مولانا ظفر احمد تھانوی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا جمیل احمد تھانوی اور مولانا خیر محمد جالندھری شامل تھے۔ ان حضرات نے

نہ صرف کانگرس کی مخالفت کی لیکن آگے چل کر مسلم لیگ کے مجوزہ پاکستان کی قرارداد کی حمایت بھی کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے مفتی محمد شفیع صاحب کے اس فتویٰ کی تائید کی جو مفتی صاحب نے اراکین مجلس دعوۃ الحق کے استفتاء پر دیا تھا جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کے بارے میں شرعی حیثیت کیا ہے۔ اس فتویٰ میں برصغیر کی سیاست حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مطالبہ پاکستان کی حمایت کریں اور مسلم لیگ کو مضبوط کریں۔

مولانا آزاد کا خط مولانا آزاد کے ایک خط کا یہاں ذکر کرنا عین برمحل ہے جو انہوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو مولانا غلام رسول مہر کے نام لکھا تھا۔ اس خط کا پس منظر اس طرح ہے کہ صوبہ سرحد میں الیکشن کے بعد جو وزارت تشکیل ہوئی تھی اس کے متعلق مولانا نے اخبار "انقلاب" کے ایک مضمون "سرحدی کانگریسیوں کے ارادے" پڑھا جس میں ڈاکٹر خان صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ہندی گورمکھی سرکار کے لیے کیا کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ فوراً منسوخ کر دیں گے"۔ مولانا آزاد نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک طویل خط تحریر کیا۔ مولانا آزاد نے اپنی رائے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خان کا یہ قدم نہ تو اردو کی کوئی خدمت کر سکے گا اور نہ ہی مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ ہو گا۔ اس منسوخی سے یہ خدشہ ہے کہ تمام کانگریسی صوبوں کی سرکاری امداد ہی بند کر دی جائے۔ چونکہ ان صوبوں کے لیے صوبہ سرحد کی مثال ایک دلیل اور حجت بن جائے گی اور ان صوبوں کے مسلمانوں میں اتنی سکت نظر نہیں آتی کہ وہ بغیر سرکاری امداد کے اپنے مدارس یا سکولوں کو جاری رکھ سکیں۔ مولانا آزاد نے مزید تبصرہ کیا کہ ہو سکتا ہے کہ دیگر تمام صوبے اس کی آڑ میں اردو کے خلاف کام کریں۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ یہ تمام صوبے نہ صرف اردو کے معاملے میں بلکہ اقلیت اور اکثریت کے دیگر معاملات میں ایسے طریقے اختیار کریں جس کی بنا پر مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ اس کے رد عمل میں اگر مسلمانوں نے کوئی احتجاج بھی کیا تو وہ سود مند نہ ہو گا۔

واردھا سکیم اور علماء واردھا سکیم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ملک کے عام باشندگان کے بچوں کو سات سال سے چودہ سال کی عمر تک جبری تعلیم

دی جائے۔ یہ اسکیم ۱۹۳۸ء میں نافذ العمل ہوئی۔ جہاں یہ سکیم جاری کی گئی تھی وہاں کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظام تعلیم میں شریک ہونے سے روک سکتا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا متبادل نظام تعلیم ہو سکتا تھا جہاں وہ اپنے بچوں کو داخل کروا سکتا۔ اس سکیم کا دوسرا نام "بنیادی قومی تعلیم" رکھا گیا۔ یہ سکیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے تیار کی۔ مگر اس کے معمار خاص مسٹر گاندھی تھے۔ اس سکیم کے بعض پہلو مفید بھی تھے مثلاً صنعت و دستکاری پر تاکید اور بعض پہلو مسلمانوں کے لیے قابل اعتراض تھے جس چیز پر مسلمانوں کو سب سے زیادہ اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ اس سکیم کا بنیادی تصور یہ تھا کہ برصغیر کے سارے باشندے ایک قوم واحدہ ہیں۔ اس سکیم میں مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت کی نفی کی گئی تھی۔ بقول چوہدری حبیب احمد یہ سکیم گاندھی جی نے مسلمانوں کو ہندو بنانے یا ملک بدر کرتے یا غلام اور اچھوت بنانے کے لیے وضع کی تھی۔ اس سکیم میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ گاندھی جی نے مذہبی تعلیم کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہم نے واردھا سکیم میں مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے۔ اس لیے کہ مذاہب آجکل جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جس طرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنے کی بجائے اختلاف پیدا کرنے کا موجب ہیں مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں وہ سکھائی جا سکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں"

گاندھی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم دینا اس سکیم کے دائرہ عمل سے خارج تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے ایک بیان میں اس سکیم کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ واردھا سکیم میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہیں ہونی چاہیئے" مسٹر گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے بیانات کا تضاد واضح ہے۔ دراصل اس سکیم کے تحت بچوں میں اسلامی قومیت کے شعور کو مٹانے کے لیے مذہبی تعلیم کی نفی کی گئی تھی تاکہ اس طرح اسلامی قومیت کا شعور پیدا نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس سکیم پر علماء میں اختلاف پیدا ہوا۔ علماء کا بڑا طبقہ حتیٰ کہ جمعیت علمائے ہند نے بھی اس سکیم سے اختلاف کیا مگر اس سکیم کے مخالفین میں مولانا اشرف علی تھانوی ان کے رفقاء اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پیش پیش تھے۔

واردھا اور دیگر سکیموں کے مخالف علماء

کانگریس نے اپنے دور وزارت میں واردھا، ودیا مندر اور دیہات سدھار

سکیمیں رائج کیں۔ جو رفاہی، تعلیمی اور اصلاحی سکیموں کے نام سے متعارف کرائی گئیں۔ یہ سکیمیں گاندھی جی کے سیاسی و معاشرتی پروگرام کا حصہ تھیں۔ کانگریس اپنے دورِ اقتدار میں گاندھی کا فلسفہ حیات برصغیر کے ہر فرد پر جبراً مسلط کرنا چاہتی تھی۔ علماء کے ایک گروہ نے ان حالات اور سیاسی تبدیلیوں کا بڑے غور و فکر اور دور اندیشی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ ان علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی، ان کے ہم خیال علماء اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اڑیسہ اور صدر انڈی پنڈنٹ مسلم پارٹی و ممبر مجلس عاملہ جمعیت علماء ہند نے دیہات سدھار اسکیم مخالفت کرتے ہوئے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود کو ایک احتجاجی مراسلہ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۳۸ء کو روانہ کیا۔ اس مراسلے میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ دیہات سدھار سکیم مسلمانوں کی مذہبی اخلاقی اور تمدنی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی ہے لہٰذا اس سکیم کے پردے میں گاندھی ازم کی نشر و اشاعت کو روکا جائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مختلف سکیمیں

مولانا مودودی اس وقت کی سیاسی جماعت سے منسلک نہ تھے اور انفرادی حیثیت سے کام کر رہے تھے مگر ملک کی سیاسی صورتحال سے غافل نہ تھے چنانچہ مولانا مودودی نے واردھا، و دیا مندر اور دیہات سدھار سکیموں کو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نہ صرف نقصان دہ ثابت کیا۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ ان سکیموں کے پیچھے اسلام اور شعائر اسلام کو ختم کرنے کا منصوبہ کارفرما ہے۔ مولانا کے بارے مزید تفصیل باب کے آخر میں ملے گی۔

مولانا عبیداللہ سندھی اور گاندھی ازم

مولانا عبیداللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم پر کابل گئے اور ۲۴ سال تک جلاوطن رہنے کے بعد، ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو وطن واپس آئے۔ جلاوطنی کے زمانے میں مولانا کا رجحان کانگریس کی جانب تھا لیکن وطن مراجعت کرنے کے بعد مولانا نے کانگریس کو ایک نئے روپ میں پایا جسے وہ ایک آنکھ پسند نہیں فرماتے تھے۔ مولانا نے ہندوستانی قومیت اور گاندھی ازم کے فلسفہ حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "مسلمانوں کا قومی وجود الگ اور منفرد ہے"۔

آپ نے مزید کہا کہ وحدت انسانیت کے باوجود انسانوں کی قومی اور گروہی تقسیم

ناگزیر ہے، فرد ایک مستقل اکائی ہے۔ جو افراد پر مشتمل ہے۔ اس طرح ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ گاندھی جی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہندوستان کو ہزار سال پہلے "جوُن" میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ آٹھ سو برس سے ایک قوم، ایک زبان، ایک نیا تمدن اور ایک نیا فکر اس وطن کو اپنا گھر بنا چکا ہے اور اس سرزمین پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ گاندھی جی کی قوم، ان کی زبان، کلچر اور فلسفے کا، مولانا نے کہا کہ،

"پچھلے بیس سال سے گاندھی جی نے کانگریس کو مذہبی رنگ دے دیا ہے لیکن مذہبی رنگ خالص ہندوانہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی تمام اقوام کی اکثریت کسی نہ کسی مذہب یا عقیدے کو مانتی ہے لیکن گاندھی جی نے مذہب کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، وہ مسلمانوں عیسائیوں اور سکھوں کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اشتراکیت والے اس کے روادار ہو سکتے ہیں۔"

جمعیۃ علمائے ہند اور وار دھا سکیم

جمعیت علمائے ہند نے وار دھا اسکیم کی بھرپور مخالفت کی اور اس پر کھل کر تنقید کی۔ نیز اس کی اصلاح کے لیے بھی کوشش کی۔ اس سلسلے میں جمعیت علمائے ہند نے ایک سب کمیٹی مقرر کی جس کی رپورٹ مارچ ۱۹۳۹ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں منظور ہو کر شائع ہوئی۔ اس کمیٹی میں مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید محمد سجاد بہاری، مولانا احمد سعید، مولانا نورالدین بہاری اور مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی شریک ہوئے جمعیت کے اجلاس کے بعد اخبارات میں تبصرہ و تنقید ہوئی۔ اس طرح جمعیت نے ودیا مندر اسکیم جو صوبہ سی۔ پی میں رائج کی گئی تھی پر بھی تنقید کی۔ اور کہا کہ سرکاری تعلیم کے لیے اس قسم کے نام کا جاری ہونا ناقابل فہم اور غیر پسندیدہ امر ہے۔ جمعیت علمائے ہند نے ان دونوں اسکیموں کے خلاف اپنی تجاویز کانگریس کے مجلس عاملہ کے پاس روانہ کیں مگر کچھ دنوں بعد کانگریسی حکومتیں مستعفی ہو گئیں۔ جمعیت علماء کی تجویز کے بارے میں کوئی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

کانگریسی وزارتیں اور علماء

کانگریس نے فتح کے زعم میں ملک کی دیگر تمام سیاسی پارٹیوں کو نظر انداز کر دیا۔ حتیٰ کہ تمام اقوام

ہند کو صرف ایک ہندوستانی قوم کے نام سے معروف کرانے کے لیے ہندوستانی قومیت کا نعرہ بلند کیا اور مسلم عوام کو گمراہ کرنے کے لیے "مسلم ماس کنٹیکٹ" کی مہم شروع کی. بعض علماء نے اس سلسلہ میں کانگریس سے اختلاف کیا. مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا کہ "مسلم ماس کنٹیکٹ" کی مہم اسلامی قومیت وقیادت کی تحلیل ہے اور مسلمانوں کے لیے سخت مہلک بھی. مولانا نے مزید کہا کہ بلا شرط و معاہدہ کفار سے موالات واشتراک درست نہیں اور مسلم لیگ کا نظریہ استقلال ملت و تنظیم امت اصولاً صحیح ہے"! مزید برآں مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک بیان دیا جو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں بمقام پٹنہ پڑھا گیا جس میں مولانا نے فرمایا کہ "اس وقت کو اپنی جداگانہ تنظیم کی ضرورت ہے کیونکہ عقلاً نقلاً یہ بات ثابت ہے کہ جو قوم اپنی جداگانہ تنظیم نہیں رکھتی وہ دوسری اقوام میں جذب ہو کر کالعدم ہو جاتی ہے. باخبر حلقہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ مسلمانانِ ہند اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ان کے لیے مشکلات اور پریشانیوں کا دور ہے یعنی گاندھوی فلسفہ حیات مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لہٰذا مسلم لیگ کی تنظیم تو میں مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کی ایک مستقل تنظیم مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکے اور مستقبل میں مسلمانوں کا تمدن، تہذیب و معاشرت، زبان و تعلیم وغیرہ کو محفوظ کیا جا سکے.

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور کانگریس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس زمانے میں مجلس احرار اسلام کے صدر تھے. کانگریس نے اتنی بات جیتنے کے بعد فتح کے نشے میں تلخ بیانات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ "کانگریس اپنی فتح پر نازوا عزور اور غیر مدبرانہ طریقہ عمل اختیار کر رہی ہے یہ مناسب نہیں"، یہی نہیں بلکہ مجلسِ احرار نے اپنے اجلاس منعقدہ پشاور مورخہ ۷ تا ۹ اپریل ۱۹۳۹ء زیر صدارت چودھری افضل حق (مرحوم) مولانا اظہر علی مظہر جنرل سیکرٹری مجلس احرار اسلام نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہندو مسلم مسئلہ کا فیصلہ مسلمانوں کی طرف سے صرف مسلم لیگ کر سکتی ہے اور اگر پاکستان کے متعلق کسی وقت استصواب عامہ کیا گیا تو احرار پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے.

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور کانگریس ۱۹۳۸ء میں جبکہ مولانا اشرف علی تھانوی نے مسٹر جناح کے پاس تبلیغی وفود بھیجے اور علامہ اقبال، مسٹر جناح کو ترغیبی خطوط لکھنے میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں مولانا مودودی اپنی کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کی تدوین میں مصروف تھے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ فروری ۱۹۳۸ء میں اور دوسرا حصہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ مولانا نے جو اس وقت انفرادی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ پوری شرح و بسط کے ساتھ کانگرس کے استعماری پرستانہ عزائم کو بے نقاب کیا۔ مولانا نے ملک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بعض مسلم جماعتوں پر بھی تنقید کی۔ اور اپنے مخصوص نظریے کے تحت جدید انقلابی نصب العین کی توضیح کی۔ مولانا نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی دور کے سیاسی حالات پر بھی تبصرہ کیا اور نیشنلسٹ علماء دیو بند اور جمعیت علمائے ہند پر بھی تنقید کی۔

جمعیت علمائے ہند اور اردو زبان برصغیر میں تقریباً ساٹھ ستر سال سے انگریزوں نے اردو ہندی تنازعہ پیدا کیا ہوا تھا۔ چند صوبوں میں عدالتی زبان انگریزی اور ہندی تھی۔ بہار میں بھی سرکاری زبان ہندی کر دی گئی۔ بہار کا اردو دان طبقہ خاص طور پر مسلمان عرصہ دراز سے ان کوششوں میں تھے کہ سرکاری عدالتوں میں اردو زبان کو ایک خاص مقام حاصل ہو۔ لیکن حکومت ایسا کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ جب صوبہ بہار میں ۱۹۳۷ء میں مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی کی کولیشن وزارت قائم ہوئی تو اس نے صوبہ بہار کی عدالتوں میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے اجراء کا حکم نافذ کر دیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے وزارت سنبھالی تو اس دور میں بھی اردو کا حکم بحال رہا۔ بہار میں مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی کو جمعیت علماء اور امارت شرعیہ بہار کی پوری طرح حمایت حاصل تھی اور دونوں جماعتوں کی مشترکہ کوششوں سے یہ مسئلہ حل ہوا۔

جمعیت علمائے ہند اور دو قومی نظریہ ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے چھ صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کرنے کے بعد مختلف سکیمیں نافذ کیں۔ ان سکیموں میں ایک قومی نظریہ "ہندوستانی قومیت" کا نظریہ کارفرما تھا۔ اس کے برعکس مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ اس نظریاتی

تصادم سے جمعیت علمائے ہند کو بڑی مشکل پیش آئی۔ ایک طرف تو جمعیت کانگریس سے تعاون کی خواہشمند تھی۔ دوسری طرف وہ ایک قومی نظریے کے خلاف تھی جمعیت علماء نے اس سلسلے میں اپنا موقف ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ باشندگان کے مختلف مذاہب اور رجحانات کو بالکل نظرانداز کر دینے والا اصول نہ صحیح ہے اور نہ عملی۔۔۔ مسلمانوں کے لیے یہ محال ہے کہ وہ اپنے اسلامی کلچر کو چھوڑ کر کسی متحدہ قومیت کے اندر جذب ہو جائیں اور اسلامی و غیر اسلامی کلچروں کا کوئی امتیاز تسلیم نہ کریں مسلمان دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا طرز عمل اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس طرز عمل اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس طرز عمل کے برعکس ایک بنا دینے والے کسی ایسے نیشنل ازم کا سبق پڑھایا جانے لگا جو اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو برباد کر دینے والا ہے تو یہ پالیسی نہ صرف سطحی ہو گی بلکہ آئندہ کی تباہی کا باعث ہو گی۔

علمائے دیوبند اور نظریہ پاکستان

برصغیر میں ایک جداگانہ مسلم ریاست کے قیام کا تصور مختلف ایام میں مختلف شکلوں میں سامنے آتا رہا۔ لیکن اس کی صحیح نشوونما اس دور میں شروع ہوئی جب ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات کے بعد کانگریسی حکومتوں نے ہندو راج قائم کرنے کے منصوبوں کو عمل میں لانا شروع کیا مسلم لیگ کی حمایت اور مخالفت میں علماء کے تین گروہ ہو گئے تھے۔ جن میں ایک گروہ کے سرخیل مولانا اشرف علی تھانوی تھے۔ یہ مکمل طور پر مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے۔ مولانا تھانوی نے ایک موقعہ پر خیال ظاہر کیا تھا کہ آجکل حالات ایسے ہیں کہ اگر مولویوں کو حکومت مل بھی جائے تو وہ اسے کامیابی کے ساتھ چلا نہیں سکیں گے لہذا مولانا صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کے اسبابِ اقتدار کو اسلام کا نظریہ حیات سمجھانے کے لیے "تبلیغ" کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب نے قائداعظم محمد علی جناح کے پاس مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں کچھ "تبلیغی وفود" بھیجے۔

مولانا تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی دونوں حضرات مدرسہ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ دونوں کانگریس کے ساتھ بلاشرط و معاہدہ اشتراک و اتحاد کے حق میں نہ تھے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جب کانگریس کی مسلم

دشمنی کھل کر سامنے آگئی تو دونوں حضرات نے مسلم لیگ کی علی الاعلان حمایت کی۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور مسٹر جناح

مولانا اشرف علی تھانوی کو یقین تھا کہ بالآخر مسلم لیگ اپنے مقاصد حاصل کر کے رہے گی۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام لوگوں کو اسلام سے کما حقہ واقفیت دلائی جائے۔ لہٰذا مولانا تھانوی نے مسٹر جناح کے پاس تبلیغی وفود بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ مولانا تھانوی نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو حکم دیا کہ وہ مسلم لیگ لیڈروں پر "تبلیغ" کریں۔ اس سلسلے کا پہلا وفد ۲۴ دسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا مرتضیٰ احسن کی قیادت میں مسٹر جناح کے پاس بھیجا۔ اس وفد نے مسٹر جناح کو نماز باقاعدہ پڑھنے کی تلقین کی۔ جواب میں مسٹر جناح نے کہا کہ:

> "میں گنہگار ہوں۔ خطا کار ہوں، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھوں گا۔"

دوسرا وفد ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں مسٹر جناح سے دہلی میں ملا۔ اس وفد میں مولانا عثمانی کے ہمراہ مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی بھی شامل تھے۔ سیاست اور مذہب پر گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے اختتام پر مسٹر جناح نے کہا وہ دنیا کے کسی

> "دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں۔ بلکہ مذہب کے تابع ہے"

تیسرا وفد مولانا عثمانی کی قیادت میں مسٹر جناح سے پھر ملا۔ دوران ملاقات ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی وہاں موجود تھے۔ مسٹر جناح نے مولانا عثمانی سے کہا کہ "مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو اور جگہ نصیب نہیں ہوئیں۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہے تو بیٹھ جائیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔ غرض یہ کہ مولانا تھانوی نے مسٹر جناح کی دینی اصلاح کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی کو مامور کیا۔ جنہوں نے احسن طریقے سے اپنا فرض ادا کیا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ مسٹر جناح شیعہ فرقہ سے متعلق ہونے کے باوجود اسلامی عبادت کو نسی

مسلمانوں کے ساتھ مل کر ادا کرتے تھے۔

ذیل میں چندان علماء کرام کا الگ الگ ذکر کرنا عین مناسب ہوگا جنہوں نے تحریک پاکستان کی بھرپور حمایت کی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگرد اور ایک باعمل عالم تھے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کی تعمیر میں ایسے مقتدر علماء سے استفادہ حاصل کیا تھا جو انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں برسرپیکار رہتے۔ مولانا عثمانی نے اپنی صلاحیتوں کی بناپر اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ ابتداء میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ مناظرے کیے مولانا محمود الحسن کی انقلابی جمعیت موتمرالانصار میں شمولیت اختیار کی۔ جنگ بلقان کے دوران ترکی کے ہلال احمر کے لیے چندہ جمع کیا اور تحریک خلافت کے سرگرم کارکن بنے۔
مولانا محمود الحسن تحریک ریشمی رومال کی پاداش میں انگریزوں کی شہ پہ مالٹا میں قید کر دیئے گئے تو مولانا عثمانی نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا اور اپنی پرجوش اور موثر تقریروں سے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جذبات مشتعل کیے

تحریک خلافت کی ابتداء میں جب علماء کی ایک جماعت 'جمعیت علمائے ہند' قائم ہوئی تو مولانا شبیر احمد عثمانی بھی اس کے رکن منتخب ہوئے اور اس کے کاموں میں شرکت کی لیکن صرف اس وقت تک جب تک یہ جمعیت کانگریس کے زیر اثر اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی منکر نہ ہوئی تھی، وہ ہندو سیاست کے رویہ سے خوب آشنا تھے اور ہندو مسلم اتحاد پر یقین نہ رکھتے تھے وہ کسی ایسی جماعت یا تحریک کو بھی پسند نہ کرتے تھے جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل ہوں۔ کانگریس اور اس کے نظریئے سے وہ شدید اختلاف رکھتے تھے۔ قائداعظم نے جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا تو کانگریس کے زیر اثر علماء نے بڑی شدت کے ساتھ پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔
مسلم لیگ کے لیے یہ ایک نازک موقع تھا۔ اگر اس کا مناسب سدباب نہ کیا جاتا تو اس کی تحریک اور عام مسلمانوں کی دیرینہ خواہش ناتمام رہ جاتی اور عام مسلمانوں کا قومی وجود ہندو قومیت میں ضم ہو جاتا۔ مولانا عثمانی ان علماء میں سے تھے جنہوں نے اس خطرے

کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ عملی سیاست میں کود پڑے اور اس بات کی کوشش کی کہ ایسے علماء کو متحد کرلیں جو دو قومی نظریے کے قائل ہیں اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گئے۔ اور انہی کوششوں سے ایک جمعیت، جمعیت العلمائے اسلام کی تشکیل کی۔ یہ جمعیت علماء کے ایک بہت بڑے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں قائم کی گئی اور مولانا عثمانی اس کے صدر منتخب ہوئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے جمعیت العلمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے تحریک پاکستان کی حمایت شروع کی اور پاکستان کے مخالفوں کے اعتراضات کے مدلل جواب دیئے۔ قائداعظم نے مولانا عثمانی سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کے اثرات کا بھی انہیں اندازہ تھا۔ چنانچہ صوبہ سرحد میں جہاں کانگریس نواز مسلمانوں کا بڑا اثر تھا۔ مسلمانوں کو ہم خیال بنانے کے لیے اور رائے شماری میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے قائداعظم نے بطور خاص انہیں صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس وقت سے لے کر قیام پاکستان کے بعد قرار دادِ مقاصد کی منظوری تک مولانا عثمانی کی جدوجہد تاریخ کے اوراق کی شاندار زینت ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی

آپ علمائے دیوبند میں ایک عالم اور صوفی کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ سیاسی نقطۂ نظر کے اعتبار سے وہ ہمیشہ دو قومی نظریے کی ترویج کرتے رہے۔ آپ کی سرکردگی اور رہنمائی میں کئی ایک ممتاز علماء اور نمایاں شخصیات نظریہ پاکستان کی حمایت میں سرگرم عمل تھیں۔ وہ کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کو ان کی دینی موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انہوں نے تحریکِ خلافت اور تحریک عدمِ تعاون میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی شرکت کی مخالفت کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک فتوی بھی جاری کیا تھا کہ کانگریس کی تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی اگر ہندوؤں کے اشتراک سے کی جائے تو مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی زندگی کے لیے نقصان دہ ہے اور ان میں مسلمانوں کی شرکت شرعاً حرام و ناجائز ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندو قائدین کے پیچھے چلیں۔ تاریخ کے ایک طویل دور میں جب ہندو اور مسلمان متحد نہ رہ سکے اور ان کے درمیان اختلافات ہمیشہ موجود رہے تو اب اس دور

میں بھی مسلمانوں کو ہندو قائدین سے کوئی بہتر توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ انہوں نے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر علمائے دیوبند کے ایک طبقے سے علیحدگی اختیار کرلی۔ وہ ایک حساس اور باخبر عالم تھے جنہیں اس وقت مسلمانوں کے زوال اور ان کے مصائب کا مکمل احساس اور شعور تھا۔ وہ اپنی قوم کے جملہ امراض سے واقف تھے اور ان کا اعلان بھی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو تمام قوانین احکام شریعت کے مطابق ہوں۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ بیت المال قائم ہو اور نظام زکوٰۃ رائج ہو۔

مسلمانوں کے دستوری معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کے لیے عدالتوں میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کی۔ پنجاب میں مسلمانوں کو شرعاً وراثت دلوانے کی مہم کی ابتدا بھی انہی کی تحریک پر ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریسی حکومتوں کے زیر اثر جب بعض صوبوں میں دینی مدارس بند کئے جانے لگے تو ان کی بحالی کی بھرپور اور کامیاب تحریک بھی مولانا اشرف علی تھانوی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے سیاسی تحریکوں میں خود کبھی عملی حصہ نہ لیا۔ لیکن علماء کی ایک ایسی جماعت کی تربیت کی جس نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور وہ خود ہمیشہ ایک علیحدہ مسلم مملکت کے لیے دعاگو رہے۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم اور قائداعظم کو پکا اور سچا مسلمان سمجھتے تھے۔ وہ قائداعظم کی نہایت اور صلاحیت کے قائل تھے اور ان سے خط و کتابت کا رشتہ استوار کیا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کے حالات میں مسلمانوں کی تنظیم اور قوت کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو کر اپنے قومی تشخص کو اجاگر کریں۔ ایک تنظیم مجلس "دعوۃ الحق" بھی تشکیل دی تھی۔ جس کا مقصد لیگ کے لیے دینی شعائر کی روشنی میں راہ عمل تجویز کرنا اور اس کی اصلاح کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے متعدد مواقع پر لیگ کے جلسوں میں اور قائدین کے پاس تبلیغی وفود بھیجے جاتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی قیام پاکستان کو مسلمانوں کی بقا کے لیے ضروری خیال کرتے تھے انہوں نے ۱۹۳۸ء ہی میں اس وقت جبکہ ابھی قرارداد پاکستان منظور نہ ہوئی تھی قیام پاکستان کی پیش گوئی کردی تھی۔ ان کی اس بشارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام پاکستان ان کے احساسات سے کس قدر قریب تھا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ موجود نہیں تھے لیکن ان کے زیر تربیت

علماء اس کشت کی آبیاری کے لیے ہمہ تن مصروف تھے۔ اور اس طرح ان کا فیض اور ان کی خواہشات حقیقت کی شکل میں سامنے آرہی تھیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانی

آپ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے طرز فکر کے حامل تھے۔ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور دو قومی نظریے پر یقین رکھتے تھے۔ اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے نہ صرف مولانا تھانوی کے پیروکار تھے بلکہ سیاسی معاملات میں ان کے دست راست اور تحریری اور تقریری امور میں ان کے معاونِ خاص رہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے سیاسی سطح پر اصلاح و تبلیغ کی جو مجلس تشکیل دی تھی۔ اس کے اہم رکن تھے۔ قائداعظم اور مسلم لیگ سے ان کا مسلسل رابطہ رہا۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ضمنی انتخاب میں نوابزادہ لیاقت علی خان امیدوار تھے اور ان کے مقابلے میں کانگریس کی طرف سے مولانا ظفر احمد عثمانی کے ایک عزیز امیدوار تھے۔ یہ انتخاب مسلم لیگ کی عزت و وقار کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کا احساس کرتے ہوئے مولانا عثمانی نے اپنے اصولوں کو اہمیت دی اور عملی جدوجہد سے رائے عامہ کو لیگ کے حق میں ہموار کرتے رہے۔ چنانچہ اس انتخاب میں لیگ کو واضح کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریک پاکستان کے نازک لمحات میں جبکہ دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان کے حامی کی ایک تنظیم کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جارہا تھا۔ جن علماء نے اس تنظیم کے قیام کو عملی صورت دینے اور علماء کو متحد کرنے کی کوشش کی ان میں مولانا ظفر احمد عثمانی پیش پیش تھے۔ کلکتہ میں علماء کے ایک بہت بڑے اجتماع میں "جمعیت العلمائے اسلام" کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر احمد عثمانی کی صورت میں ایسی کئی قراردادیں منظور ہوئیں جن میں مسلم لیگ کی جدوجہد کی حمایت کی گئی تھی۔ پاکستان کے لیے ہونے والے فیصلہ کن انتخابات خود پاکستان اور ان لوگوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے جو ایک طویل عرصے سے اس کے قیام کی جدوجہد کر رہے تھے۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کی خواہش پر اس نازک صورتحال میں علماء رائے شماری میں لیگ کے موقف کی کامیابی کے لیے سرگرم و مستعد ہوئے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے تقریباً چار ماہ تک مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور پاکستان کے لیے رائے عامہ کو مزید ہموار کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے ایک موقع پر انہوں نے لیگ کی حمایت اور کانگریس اور اس کے معاونین کے خلاف ایک فتویٰ بھی جاری کیا۔

رائے شماری میں پاکستان کے موقف کی کامیابی کے لیے انہوں نے بالخصوص سلہٹ کے علاقے کو اپنی تبلیغی جدوجہد کے لیے منتخب کیا۔ وہاں کانگرس اور کانگریس کے حامی علماء کا اثر تھا۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ لیکن مولانا ظفر احمد عثمانی کی مستقل جانفشانی اور کوششوں سے پاکستان کے موقف کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ اسی جدوجہد کا ثمر تھا کہ سلہٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ ڈھاکہ میں ہی تھے۔ قائداعظم کی ہدایت کے مطابق پاکستانی پرچم لہرانے کی رسم انہی کے سپرد کی گئی اور حکام سلطنت میں پہلے چیف جسٹس سے انہوں نے حلف لیا۔

مفتی محمد شفیع مفتی محمد شفیع تحریک پاکستان کے علماء میں ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو گئے۔ عالم اسلام اور خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی بدحالی کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے طالب علمی ہی کے زمانے میں عملی سیاست میں پرخلوص اور رضاکارانہ حصہ لیتے رہے۔ کچھ عرصہ وہ نہایت خاموشی اور متانت سے علمی اور دینی تصنیف و تالیف کے عالمانہ کاموں میں مصروف رہے لیکن مسلمانوں کے زوال اور انکی سیاسی غلامی کا انہیں شدید احساس تھا۔ چنانچہ قوم کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ مفتی محمد شفیع خود کو ان حالات سے الگ نہیں رکھ سکتے تھے جو ہندو سیاست اور کانگریس کے غلبہ کے نتیجے میں مسلمانوں کے قومی وجود کو ختم کر دینے کے درپے تھے انہوں نے کانگریس کی ماتحت جمعیت العلمائے ہند سے اختلافِ رائے کی بنیاد پر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی پیروی کو اپنے لیے راہِ عمل کا انتخاب کیا چنانچہ آپ جمعیت العلمائے اسلام کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے اور اس کی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینے لگے انہوں نے پاکستان کے مطالبے کو برحق ثابت کرنے کے لیے متعدد رسالے تحریر کیے اور ایک موثر فتویٰ مرتب کیا۔ اس موضوع پر ان کی ایک مستقل تصنیف "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" بہت مدلل اور مفصل ہے۔ انہوں نے اس میں مطالبہ پاکستان کے سیاسی مقاصد کے علاوہ خاص طور پر اس کی شرعی حیثیت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس مسئلے پر یہ پہلی علمی کتاب تھی۔ جس میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے روابط، مصالحت اور تعاون کی تمام صورتوں

کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ جمع کیے گئے تھے۔ دلائل میں انہوں نے قرآن و حدیث اور فقہی عبادات کی نہایت معتبر شہادتیں پیش کیں۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ تحریک پاکستان کی کامیابی اور مقبولیت کے لیے انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کے دورے کیے اور جگہ جگہ تقریروں کے ذریعے فضا کو ہموار کیا۔ خاص طور سے قیام پاکستان کے لیے رائے شماری کے موقع پر صوبہ سرحد میں جہاں کانگرس کا زبردست اثر اور عمل دخل تھا۔ پاکستان کی حمایت کے لیے دورے کیے اور کانگریسی اثرات کو زائل کیا۔ تحریک پاکستان کے لیے یہ ان کا ایک انقلابی اقدام تھا۔ جس کے نتائج حصولِ پاکستان کے لیے بڑے بارآور ثابت ہوئے۔

مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی

آپ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی کے معتقد تھے۔ اپنی ساری زندگی اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر وقف کر رکھی تھی۔ آپ نے مراد آباد میں "انجمن اہل سنت" کی بنیاد رکھی۔ آپ نے بریلی میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے "جماعت رضائے مصطفٰے" بنائی اور مسلمانوں میں سیاسی و دینی شعور پیدا کرنے کے لیے ایک رسالہ "سوادِ اعظم" کے نام سے شائع کیا۔ آپ دو قومی نظریہ کے پوری طرح قائل تھے، جب برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا تصور سامنے آیا تو آپ نے دو قومی نظریے کی وضاحت کرنے کے لیے ملک گیر مہم شروع کر دی۔ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد سے متاثر ہو کر آپ نے "سوادِ اعظم" میں اس کی حمایت میں مسلسل لکھا۔

جب ۱۹۴۶ء میں بنارس کانفرنس منعقد ہوئی اور اہلسنت والجماعت کے علماء وہاں جمع ہوئے تو حضرت مولانا نعیم الدین کو کانفرنس کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں آپ نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کروائی:۔

"آل انڈیا سُنّی کانفرنس کا یہ اجلاس پاکستان کے مطالبہ کی پر زور حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علماء و مشائخ اہل سنت اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کے لیے تیار ہیں اور یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسی حکومت قائم کریں جو قرآن کریم اور حدیث نبوی کی روشنی میں فقہی اصول کے مطابق ہو۔"

سنی کانفرنس نے پاکستان کی خاطر بھرپور مہم شروع کردی تھی اور اس کانفرنس کے رکن علماء شدت کے ساتھ تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔

حضرت نے ایک بار یہاں تک فرمادیا تھا کہ :-

"پاکستان کی تجویز سے آل انڈیا سنی کانفرنس کو کسی طور دستبردار ہونا قبول نہیں۔ خود جناح اس تحریک کے حامی رہیں یا نہ رہیں۔ کانفرنس پاکستان کا مطالبہ کرتی رہے گی۔"

تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے اور دور دراز بسنے والے مسلمانوں تک دو قومی نظریہ کے تصور کو پہنچانے کے لیے آپ نے بنگال، آسام، بمبئی، مدراس اور کئی دوسرے علاقوں کے دورے کیے۔ آپ نے پاکستان اور اسلام کو ہم معنی قرار دیا اور قائداعظم کے ہم رکاب منزل کی تلاش کو اپنی زندگی کا مشن بنایا۔

پیر سید غلام محی الدین گولڑہ شریف

تحریک پاکستان میں پیر صاحب گولڑہ شریف مسلسل مسلم لیگ کے شانہ بشانہ چلتے رہے۔ آپ نے اپنے عقیدت مندوں کو باضابطہ حکم دیا کہ تحریک پاکستان میں قائداعظمؒ کا پورا پورا ساتھ دیں۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں آپ نے عملی سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔ مسلم لیگ کی حمایت میں پورے پنجاب کا دورہ کیا اور برصغیر کے مسلمانوں کی عظمت اور تحفظ کے لیے سیاسی بالغ نظری کا ثبوت دیا۔ آپ کے اس اقدام سے قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کے حوصلے بہت بلند ہوئے۔

آپ کے والد بزرگوار پیر مہر علی شاہ صاحب کا حلقہ عقیدت بہت وسیع تھا آپ کے علاوہ کئی اور سجادہ نشین بھی قائداعظمؒ کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ حضرت پیر سیال شریف۔ حضرت خواجہ سدید الدین تونسہ شریف اور حضرت پیر فضل شاہ صاحب جلال پور شریف نے بھی قائداعظم کا ساتھ دیا۔

علماء کا یہ گروہ مسلم لیگ کی پوری طرح حمایت کر رہا تھا اور دو قومی نظریہ کے پرچار کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ اس کے برعکس چند ایک علماء ایسے بھی تھے جو کانگریس کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو کر پاکستان کی مخالفت میں اپنی زبان و قلم کو پوری طرح استعمال کر رہے تھے اور محض ہندوؤں کے اشاروں پر ملت اسلامیہ کو غلط

فیصلہ کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ کانگریسی طلسم کا شکار تھے۔ ان میں مفتی، فقیہہ، شیخ الجامعہ، امیر شریعت اور مفسرین قرآن بھی شامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم نہیں ہیں بلکہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذاہب کے باشندوں سمیت واحد قوم کا حصہ ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالم دین فرما رہے تھے۔

"موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب سے"

قائداعظم کی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے علماء مختلف گروہوں میں منظم کانگریس کے اشاروں پر سرگرم عمل تھے۔ وہ اپنی ہی ملت کے مستقبل کو درخشاں بنانے کی بجائے تاریکیوں میں دھکیلنا چاہتے تھے۔ علماء کا یہ ایک بہت بڑا گروپ تھا چند ایک کے نام یہ ہیں :-

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۲۔ مولانا احمد سعید ۳۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۴۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ۵۔ مولانا حسین احمد مدنی ۶۔ مولانا حفظ الرحمٰن۔ ۷۔ مولانا منظر علی اظہر۔

یہ علماء قوم پرست کہلاتے تھے اور دو قومی نظریہ کو باطل قرار دیتے تھے۔ علمائے کرام کی ایک سیاسی جماعت مجلس احرار اور ایک دینی و سیاسی جماعت جمعیت العلمائے ہند نے کھلم کھلا پاکستان کی مخالفت کی اور اپنے دلائل سے ثابت کرنا چاہا کہ جداگانہ مسلم مملکت کا تصور غیر مفید اور خود مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ اس مخالفت میں کانگریس کے ہندو لیڈروں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ حتیٰ کہ جب گاندھی، نہرو اور پٹیل طوعاً و کرہاً پاکستان کے حق میں بیان دے چکے تھے۔ تو ان قوم پرست علماء کی مخالفت میں شدت بڑھ رہی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد

آپ برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ ایک عالم دین اور سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور صحافی تھے۔ آپ نے "الہلال" نکالا اور صحافت کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ آپ نے تفسیر قرآن بھی لکھی۔ اور تحریک آزادی کی مکمل تاریخ INDIA WINS FREEDOM کے نام سے تحریر کی جس کا اردو ترجمہ "آزادی ہندوستان" کے نام سے شائع ہوا۔ "غبار خاطر" آپ کی ادبی کاوش ہے جسے اردو ادب میں ایک

بلند مقام حاصل ہے۔ آپ مہاتما گاندھی کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے۔ آپ نے متحدہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کانگریس کے پلیٹ فارم سے اٹھنے والی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ انہیں گاندھی کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔

مولانا دو قومی نظریہ کے سخت مخالف اور مسلمانوں کی حد وجہد سے عدم تعلق کی پالیسی کے حامی تھے۔ آپ نے کانگریس کی ہائی کمان میں شریک ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ اور قائداعظم کے لیے بے حد مشکلات پیدا کیں۔ آپ کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کرنے میں خاصی دشواریاں پیش آئیں۔ نظریاتی صحافتی، سیاسی غرضیکہ ہر سطح پر قیام پاکستان تک آپ نے قائداعظم اور مسلم لیگ کی راہیں روکیں۔ آپ متحدہ قومیت کے بہت بڑے مسلم داعی تھے۔

سٹیٹسمین نے اپنی ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں مولانا کا یہ بیان شائع کیا۔

"جناح کا دو قومی نظریہ کہ ہندو اور مسلمان الگ قومیں ہیں غلط فہمی پہ اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ میں اس ضمن میں جناح سے اتفاق نہیں کرتا۔"

مولانا نے "الہلال" کی ابتدائی اشاعتوں میں اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کی تنظیم کی ضرورت کا ذکر کیا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ جو مسلمان اپنے عمل اور اعتماد کے لیے قرآن پاک کے علاوہ کسی دوسری تعلیم کو اپنا رہنما بنائے گا۔ وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اسلام کے پیروکاروں کو اپنی سیاسی پالیسی مرتب کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنے کی بجائے اسلام جیسے ارفع و اعلیٰ دین کی پیروی کرنی چاہیئے۔ مسلمانوں کا اپنا ایک راستہ موجود ہے وہ راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازے پر بھٹکتے پھریں۔ وہی آزاد جو مسلمانوں کو اپنی منزل کی تلاش کے لیے اسلامی راہ اختیار کرنے کا درس دیتا رہا جب گاندھی کے طلسم میں گرفتار ہوا۔ تو اپنی پہچان عقیدے کی بجائے زمین کو بنا لیا۔ اسلام کی بجائے ہندوستان سے رشتہ استوار کر لیا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں اور اس دعویٰ سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

مولانا آزاد "آزادیٔ ہندوستان" میں لکھتے ہیں:۔

"یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں، سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے"

مزید کہتے ہیں "

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں میں صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی مصنوعی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں کر سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے۔ اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔"

مولانا نے اپنے زورِ بیان اور زورِ قلم صرف کر دیا کہ ہندوستان کے ٹکڑے نہ ہوں۔ انہوں نے پورے برصغیر کے بے شمار دورے کیے! وہ صوبہ صوبہ اور شہر بشہر گئے اور متحدہ قومیت کا پرچار کیا۔ اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کو اکھنڈ بھارت کے حق میں ڈھل جانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں پونا میں پریس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"میں تمام مسلم جماعتوں، بالخصوص قوم پرست مسلمانوں، احرار وغیرہ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر آنے والے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مسلم لیگ کا بائیکاٹ کریں اور بتا دیں کہ مسلمان متحدہ ہندوستان کے علمبردار ہیں۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ متحدہ ہندوستان کے تصور کی پنجاب، بنگال، سرحد اور سندھ کے مسلمان بڑی تعداد میں تائید کریں گے۔"

۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلم لیگ نے قرار دادِ پاکستان منظور کی تو انڈین نیشنل کانگریس نے بھی اپنا سالانہ اجلاس لاہور ہی میں طلب کیا اس اجلاس میں مولانا آزاد صدر تھے۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا:۔

"مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے حکومت برطانیہ سے تحفظات نہیں مانگنے چاہئیں۔ انہیں اپنے برادرانِ وطن کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیئے بلکہ جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ کانگرس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں۔ جناح کا دو قومی نظریہ غلطی پہ مبنی ہے۔"

مولانا نے اسلام کی بنیاد پر ریاست کے وجود کو غیر مستحکم ٹھہرایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"یہ کہنا کہ مذہبی ہم آہنگی ان علاقوں کو جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی، اور تمدنی طور پر مختلف ہیں متحد کر سکتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی حدود سے بالاتر ہو لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ شروع کے چالیس پچاس برس یا زیادہ سے پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بنیاد پہ تمام مسلم ممالک کو ایک ریاست میں منسلک کرنے میں ناکام رہا۔"

شملہ کانفرنس کا موقع پر مسلم لیگ اور کانگریس کے ایک ایک لیڈر کے مابین مذاکرات کیے جانے کا فیصلہ ہوا اور قائداعظم سے بات کرنے کے لیے کانگریس نے آزاد کو نامزد کیا تو قائداعظم نے آزاد کو صحیح نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کسی ہندو نمائندہ سے گفتگو کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ ایک بار متحدہ قومیت کے حوالے سے آزاد نے صدر کانگریس کی حیثیت میں قائداعظم کو تعاون کرنے کی تحریری درخواست بھیجی تو قائداعظم نے جواب میں لکھا:۔

"میں آپ سے بالمشافہ یا تحریری طور پر اس مسئلے پہ کوئی بات کرنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ ہندوستان کی مسلم قوم کا اعتماد آپ کو ذرہ برابر بھی حاصل نہیں ہے۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ کانگریس نے آپ کو صرف یہ ثابت کرنے کے لیے صدر بنایا ہوا ہے تاکہ وہ ثابت کر سکیں کہ کانگریس مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اگر

آپ میں ذرہ برابر بھی خود داری ہے تو استعفیٰ دے دیجئے "۔

مطالبہ پاکستان پر تنقید کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لفظ پاکستان کی مخالفت کی۔ اسے پاکستان کو پاک سرزمین اور بقایا علاقے کو پلید قرار دینے سے موسوم کیا۔ آپ نے کہا۔

" پاکستان کی اصطلاح بذاتہ یہ مفہوم باور کراتی ہے۔ کہ دنیا کے بعض علاقے تو پاک ہیں۔ اور باقی ناپاک، یہ امتیاز اور تفریق قطعی غیر اسلامی ہے "۔

مولانا حسین احمد مدنی

جمعیت العلمائے ہند اور دیوبندی مکتب فکر کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی کو پاکستان مخالف علماء میں سرفہرست سمجھا جاتا ہے۔ آپ متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ آپ نے اپنی تمام ترقوتیں جداگانہ مسلم مملکت کے لیے کوشش کرنے والی جماعت کے خلاف استعمال کیں۔ اور اپنے پیرو کاروں کو دو قومی نظریہ کے خلاف دلائل دے کر مشترکہ قومیت کی کامیابی کے لیے کام کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنے سیاسی نظریات اور تحریک آزادی کے حوالے سے مولانا آزاد سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

" ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے "۔

ایک اخبار " زمزم " میں ایک مضمون میں مولانا نے لکھا:۔

" ہندو مہاسبھا ویسے ہی ہندوؤں کی الگ جماعت ہے۔ جیسے مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ کانگریس ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی جماعت ہے "۔

علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان متحدہ قومیت کے حوالے سے بڑی عمدہ اور دلچسپ بحث ہوتی رہی۔

مولانا نے جب تحریر فرمایا کہ

" قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب اور نسل سے "

تو اقبال نے جواب میں کہا:۔

وو بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است"

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری آپ ہندوستان میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والے علماء میں سرفہرست ہیں اور نظریہ پاکستان کی مخالفت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ ایک بلند پایہ مقرر تھے۔ عوام نے آپ کو امیر شریعت کا خطاب دیا۔ فن خطابت میں آپ ایک بلند پایہ پر فائز تھے ہندوستان کی تحریکوں میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کئی بار گرفتار ہوئے۔ سزائیں بھگتیں اور بے شمار مصائب برداشت کیے۔

۱۹۳۰ء میں آپ نے مجلس احرار کی بنیاد رکھی اور پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انگریز حکومت کے خلاف سخت الفاظ میں تقاریر کیں اور گرفتار کر لیے گئے۔ انگریزوں نے ایک سازش طشت ازبام ہو جانے کی وجہ سے مولانا کی جان بچ گئی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے دیگر ساتھی علماء نے کانگریسی موقف کی حمایت کی۔ ہندو مسلم اتحاد کے علاوہ وہ واحد قوم کے نظریہ کے داعی تھے۔ انہوں نے عام زندگی میں دو قومی نظریہ کی بھرپور مخالفت کی۔ پاکستان کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

"میں پاکستان قبول کرنے میں مسلمانانِ ہند کی ذلت آمیز موت دیکھ رہا ہوں۔ میری سمجھ میں پاکستان کے حق میں کوئی دلیل بھی نہیں آتی۔ پاکستان کا بننا تو بڑی بات ہے۔ کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی پ بھی بنا سکے۔ پاکستان ایک خونخوار سانپ ہے جو ۱۹۴۰ء سے مسلمانوں کا خون چوستا آ رہا ہے۔"

۱۹۳۸ء میں کچھ نوجوان طلبہ مولانا سے ملنے گئے اور انہیں پاکستان کے حق میں حصہ لینے پر آمادہ کرنا چاہا تو آپ نے ان سے سخت توہین آمیز سلوک کیا۔

مولانا اور ان کے ساتھی علماء نے کانگریس سے پورا پورا تعاون کیا جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے نظریہ پاکستان کی روح کی منفی تشریح مسلمانوں کے سامنے پیش کی پمفلٹس، اشتہارات اور تقاریر کے ذریعے ان علماء نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا۔

"پاکستان میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر آجائے تو میں فوراً مسلم لیگ میں چلا جاؤں۔ لیکن میں پاکستان قبول کرنے میں مسلمانانِ ہند کی ذلت آمیز موت دیکھ رہا ہوں"

ان علماء نے قائداعظم اور پاکستان کے خلاف غیر مناسب الفاظ ادا کیے۔ قائداعظم کے خلاف کفر کے فتوے لگائے۔ چوہدری افضل حق رئیس الاحرار نے کہا۔

"مسٹر جناح کلمہ توحید پڑھ کر آج تک مسلمان نہیں ہوا لیکن پھر بھی مسلمان کا قائداعظم ہے"

"احراری کارکنوں کا وطن مسلم لیگی سرمایہ داروں کا پاکستان نہیں۔ احرار اسے بلیدستان سمجھتے ہیں"

جو لوگ مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے وہ سور باس اور سؤر کھانے والے ہیں"

مجلس احرار نے مارچ ۱۹۴۰ء میں ایک قرارداد منظور کرکے پاکستان اور مسلم لیگ کے متعلق اپنے موقف کی پوری طرح وضاحت کر دی۔ قرارداد کے الفاظ تھے

"مجلس عاملہ مسلم لیگ کے نظریہ پاکستان سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ مسلم لیگ ۱۹۴۰ء سے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلتی آرہی ہے۔ یہ مسلمانوں کو غیر منظم قوم اور بے ہنگم گروہ کی حیثیت دینا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ اس کا عمل ہمیشہ ملت اسلامیہ کے مفاد کے منافی رہا ہے۔ مسلمان سیاسی، مذہبی، تمدنی راہنمائی کی توقع مسلم لیگ کی غیر اسلامی قیادت سے نہیں کر سکتے۔ مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامی ہند کا فیصلہ قرار نہیں دیا جا سکتا"

سید ابُوالاعلیٰ مودُودی

سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک عظیم سکالر، مفکر، مفسر اور اسلام کے داعی اور مبلغ تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں اسلامی علوم کا بحر ذخار قرار دیا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی انہیں متکلم اسلام کہا کرتے تھے۔ الجزائر کے مجاہد عالم اور مفتی محمد بشیر الابراہیمی انہیں "عالم اسلام کی منفرد باکمال شخصیت" کہتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے انہیں "اسلام کی تلوار" کہا تھا۔ قائداعظم نے ان کی

خدمات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کا اعتراف کیا، علامہ اقبالؒ، ترجمان القرآن کو باقاعدہ دیکھتے اور مولانا مودودی کی خدمات کے معترف تھے اور کہا کرتے تھے کہ کانگریس اور نیشنلسٹ کانگرس مسلمانوں کے توڑ کے لیے مولانا مودودی ہی کافی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا مودودی کو حیدرآباد دکن سے دارالسلام پٹھانکوٹ میں منتقل ہونے کا مشورہ بھی دیا تھا تاکہ آئندہ وجود میں آنے والی اسلامی ریاست "پاکستان" جو ان کے تصور میں موجود تھی اس کے لیے اسلامی قانون کی دفعہ وار تدوین پہلے سے کی جاسکے اسی طرح پاکستان کی تحریک کے وقت مولانا مودودی ہندوستانی مسلمانوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور ان کی اسلامی خدمات دینی فکر اور صالح کردار کا ہر کسی کو اعتراف تھا۔

مولانا مودودی کی زندگی کا نیم سیاسی دور دراصل اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ ۱۹۱۸ء میں اخبار مدینہ (بجنور) کی ادارت کے سلسلہ میں مل کر کام شروع کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک بڑی شد و مد سے جاری تھی اور اس کی شدت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مولانا مودودی کے بچپن اور ان کی ابتدائی عملی تربیت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ فطری آزاد خیال کچھ ذاتی مطالعہ کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ انہیں ابتداء سے ہی فرنگیت اور فرنگی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے کی جائے۔ اسی بناء پر انہوں نے ۱۹۱۹ء میں خلافت اور ستیہ گری کی تحریکوں میں حصہ لیا۔

تحریک پاکستان کی ساری جدوجہد مندرجہ ذیل تین بنیادی نظریات پر مبنی تھی۔

۱۔ ہندو اور مسلمان ہر اعتبار سے دو قومیں ہیں۔

۲۔ چونکہ ان دونوں قوموں میں مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے نمایاں فرق ہے اور ان کے نصب العین بھی جدا جدا ہیں۔ اس لیے ایک بڑی تعداد والی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا مستقبل متحدہ ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکتا اس لیے مسلمان اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کل اختیارات حاصل ہونے چاہئیں یا ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہیئے۔

۳۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں میں آنے والے علاقوں میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔

تحریک پاکستان کی ساری جدوجہد مندرجہ بالا تینوں بنیادی نظریات پر استوار تھی، اور دراصل کسی شخصیت، جماعت یا تحریک کو جانچنے کا یہی پیمانہ ہوسکتا ہے کہ آیا وہ

ان تینوں بنیادی معوامل پر ایمان رکھنی اور حمایت میں شامل ایک معمولی مسلمان تک تاریخ کا حصہ ہیں جنہوں نے اپنی بساط کے مطابق پاکستان (آزاد) کے لیے تحریک بالعمل یا بالقلم میں حصہ لیا۔

جس زمانے میں مولانا مودودی مسلمانوں کی فکری اور ذہنی تبدیلی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندو مت کی وطن پرستی کی تحریک اپنے فیصلہ کن مرحلے میں تھی ۱۹۳۵ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء میں جب انتخابات ہوئے تو یہ بات یقینی نظر آنے لگی کہ یہ تحریک بالآخر پورے ملک پر مسلط ہو جائے گی، ہندی وطن پرستی کی تحریک نے بظاہر رابطہ مسلم عوام اور شدھی کی جو تحریک چلائی تھی وہ اس برعظیم میں اسلام کے مستقبل کے لیے سخت خطرات کی حامل تھی۔ ہندوستانی قوم کی تشکیل اور اصل کانگرس کا نصب العین تھا جس کی دو صورتوں نے اپنا اظہار اعلانیہ اور واضح طور پر شدھی اور سنگھٹن کی تحریک کی ابتداء سے قبل ہی کانگرس اور ہندوؤں کے عزائم کو سمجھ لیا تھا۔ ان میں ایک مولانا مودودی بھی تھے۔

مولانا مودودی نے متحدہ قومیت کے تصور کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا وطن پرستی کی بنیاد پر حاصل ہونے والی آزادی کی مذمت کرتے ہوئے مولانا مودودی نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ

> "کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی آپ کا کام ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے"

مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں ہندوؤں کی لادینی جمہوری حکومت کا جسے کانگرس ہندوستان میں قائم کرنا چاہتی تھی اور جسے مسلمانوں کے بہت سے نادان رہنما آزادی وطن کا نام دے کر مسلمانوں کے لیے بھی آزادی کی تحریک سمجھ رہے تھے پورا تجزیہ کر کے بتایا کہ بتایا کہ اس کا ہر جزو بجائے خود کیا معنی رکھتا ہے۔ ہندوؤں کی قوم پرستی کی تحریکوں کی وجہ سے یہ خطرات پیدا ہو رہے تھے کہ کہیں ہندوستان میں اسلامی قومیت رفتہ رفتہ ختم ہی نہ ہو جائے چنانچہ مسلمان کے جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رکھنے اور اس کی نشوونما کے لیے ضروری تھی کہ آزادی حاصل کی جائے۔ اس وقت آزادی وطن کے دو ہی راستے تھے۔ ایک راستہ وطن پرستی کا تھا۔ بقول سید مودودی کے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے

اختیار کر سکتے تھے۔ اس کے حامی وہ لوگ تھے جس کے پیش نظر وطنی قومیت کا مغربی تصور تھا۔ ظاہر ہے اس راستے پر چل کر وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی تھی جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں درکار تھی۔ اس راستے کو اختیار کرنے کا مطلب انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا تھا وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت زیادہ شدت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچتا، اور ہم اس کی تکمیل میں مددگار بنتے بقول مولانا مودودی اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریک آزادی ہند کے دوران ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جائے اور ہم جدا جدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں پھر ہم بحیثیت قوم کے "نشاۃ ثانیہ" کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

آزادی وطن کا دوسرا راستہ

آزادی وطن کا دوسرا راستہ بقول سید مودودی یہ تھا کہ جس میں کسی ہندوستانی باشندے کی حیثیت میں کوئی فرق نہ ہو جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترکہ وطنی مسائل کی حد تک تو امتیاز مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کرے اور ہر قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

یہ تھا وہ نظریہ جس کے تحت مولانا مودودی ہندوستان کی قومیتوں کی آزادی چاہتے تھے نہ کہ بحیثیت ایک قوم ہونے کے۔

اس وقت مسلمانوں میں اس سوال پر کہ آزادی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ دو گروہ نمایاں تھے جو مختلف تجاویز پیش کر رہے تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ آزادی وطن کے لیے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے جائیں اور جب وہ انہیں منظور کر لے تو اس کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ بلا کسی شرط کے آزادی کی تحریک میں حصہ لینا چاہیئے۔

مولانا مودودی کی نظر میں دونوں گروہ غلطی پر تھے ان کے خیال میں پہلے گروہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ اور دوسرا گروہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں گروہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی

موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور و

ان وجوہات کی بنا پر بقول سید مودودی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں۔ اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کا حصول بھی ممکن ہو اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی قوتیں مندرجہ ذیل امور پر خرچ کرنی چاہیئں۔

(۱) مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصولِ اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے۔ تاکہ مسلمان ان سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکام اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۳) مسلمانوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو چھوڑ دیں۔

(۴) مسلمانوں کو اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہیے کہ اپنی جماعت میں سے غداروں اور منافقوں کا استحصال کر سکیں۔

(۵) مسلمانوں میں اس قدر اتحاد خیال و عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تن واحد کی طرح ایک ہو جائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

(۶) مسلمانوں کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے اور نہ ہندو کے غلاموں کو۔ بلکہ یہ منصب ایک ایسی جماعت کے قبضے میں آجائے جو ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے اسلامی مفاد کو قربان کیے بغیر ہمسایوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر دل سے آمادہ ہو۔

ان مقاصد کے لیے مسلمانوں کی تہذیب و قومیت کی بقاء اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔ ایک نظام تعلیم اور دوسرا نظام تہذیب جو اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں۔ اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں اس غرض کے لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

مولانا مودودی کے مطابق ہم آزادیٔ ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی کے حامی سے بڑھ

کر اس کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے۔ جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ مسلم کی نجات بھی ہو۔

اس وقت جو مسلمان زعماء تحریک آزادی میں شامل تھے۔ اور ان میں سے ایسے جو قومیت پرست تھے۔ اور مسلمانوں کی بطور ہندوستانی نجات چاہتے تھے۔ مولانا مودودی ان سے مذکورہ بالا امور کی وجہ سے شدید اختلافات رکھتے تھے وہ ان کے نصب العین اور ان کے طریق کار دونوں کے مخالف رہے ساتھ ہی وہ اس وقت کی مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم مسلم لیگ سے بھی مذکورہ بالا امور کی بنا پر متفق نہ تھے۔ اسی وجہ سے مولانا مودودی نے مسلم لیگ اور اس کے قائدین کی طرف سے جدوجہد پاکستان میں عملاً شرکت نہ کی کیونکہ ان دونوں کے طریق کار مختلف تھے۔

مولانا مودودی اور مسلم لیگ

مولانا مودودی مسلم لیگ کے رویے سے اس وجہ سے بھی مطمئن نہ تھے۔ کہ ان کے خیال میں مسلم لیگ میں مختلف خیالات رکھنے والے افراد ایسا گروہ جمع ہو رہا ہے۔ جو قیام پاکستان کے بعد اسلام کی حکمرانی کی راہ میں معاون بننے کی بجائے رکاوٹ ہی بن سکتا ہے۔ طریق کار کے اختلاف کو مولانا نے صاف طور سے ظاہر کر دیا تھا چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ایک خط کے جواب میں مولانا نے کہا تھا کہ:۔

"آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا دراصل ادھوری تدابیر میرے ذہن کو اپیل نہیں کرتیں اگر کلی تعمیر میرے پیشِ نظر ہوتی تو میں یہ دل و جان سے اس کے لیے ہر خدمت سرانجام دینے کے لیے تیار تھا۔"

یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا مودودی نے تحریک میں عملی طور پر شرکت نہ کی لیکن علمی طور پر وہ نظریۂ پاکستان کی برابر خدمت کرتے رہے۔ اسلام نظام حیات کے خدوخال واضح کرتے رہے اور تصور پاکستان کی تائید بھی کرتے رہے جب تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا گیا اور مسلمانوں کے گروہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے تو مولانا مودودی نے کہا۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے انسان

نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اب کی تقسیم اگر ناجائز ہے تو آئندہ مزید تقسیم ہو جانے گی تو کیا بگڑے گا۔"

مولانا مودودی نے قیام پاکستان کے بارے میں ترجمان القرآن جولائی، اکتوبر ۱۹۴۴ء میں کہا۔

"مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا صرف یہ کہنا کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کو قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں بالفاظ دیگر مسلمان یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے ایک قومی وطن بنایا جائے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔"

جب صوبہ سرحد اور سلہٹ میں ریفرنڈم ہو رہے تھے تو اس موقع پر مولانا مودودی نے وہاں کے عوام کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کا مشورہ دیا تھا، اور انہیں اس امر پر آمادہ کرنے کے لیے کہا تھا (سہ روزہ کوثر ۵ جولائی ۱۹۴۷ء)

"اگر میں صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اس علاقہ کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے۔"

۹، ۱۰ مئی ۱۹۴۷ کے کل ہند اجتماع میں ۳ جون ۱۹۴۷ کی تجویز تقسیم ہند سے تقریباً ایک ماہ قبل مولانا مودودی نے ایک خطاب کے اختتام پر فرمایا تھا کہ

"اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کرکے اس دستور قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان مانتے ہیں غیر مسلم حضرات وہاں

ہماری مخالفت کرنے کی بجائے ہمیں کام کرنے کی بجائے ہمیں کام کرنے دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلے میں خدا پرستانہ خلافت جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی۔ کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لیے اور کہاں تک دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے۔"

مسلم لیگ نے مولانا مودودی کی تحریروں سے کافی فائدہ اٹھایا اور ان کی کئی تحریروں کو اپنے طور پر شائع کرا کے کانگرس اور انگریزی اقتدار کے خلاف استعمال کیا خصوصاً اسلامی تصور قومیت پر ان کے مضامین مسلم لیگ کے حلقوں میں بہت بڑے پیمانے پر استعمال ہوتے رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب یوپی مسلم لیگ نے اسلامی نظام مملکت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس بنائی تو مولانا نے اس کی رکنیت قبول کی اور کام میں بڑی دلچسپی لی۔

قائداعظم کے سید مودودی کے بارے میں خیالات

قمرالدین خاں صاحب ریڈر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کی ایماء پر ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ سے ملے اور راجہ صاحب آف محمود آباد کی مدد سے گل رعنا (دہلی) میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا گیا قائداعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری باتیں سنتے رہے اور پھر کہا کہ مولانا (مودودی) کی خدمات کو وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول ان کی زندگی اور کردار کی تطہیر سے زیادہ فوری اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اور لیگ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اس فوری حل طلب مسئلہ کی طرف متوجہ ہے جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکے گا۔

مولانا مودودی کے بارے میں مندرجہ بالا باتوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مندرجہ ذیل باتیں مولانا کے پیش نظر تھیں۔

۱۔ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔

۲. مسلمانوں کا مقصد متحدہ ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکے گا اس لیے برصغیر کی تقسیم ہوتی چاہیئے

۳. تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کے حصے میں آنے والے علاقوں میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔

آزادی ہند اور حصول پاکستان کے لیے اگر ان تینوں باتوں کو مدنظر رکھ کر مولانا مودودی کی تحریروں اور بیانات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں سے ہی متفق تھے اور اس امر کے شدت سے حامی تھے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ اسلام کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

یہ تھا مولانا مودودی کی شخصیت و کردار کا وہ رخ جس نے تصور پاکستان اور حصول پاکستان کے لیے اپنی تمام مساعی کی بدولت تحریک پاکستان میں اپنی فکری و عملی شمولیت سے نہ صرف اسلام کے احیاء کی کوشش کی بلکہ جو مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے میں دیگر زعماء کے مقابلے میں اپنا انفرادی و امتیازی مقام رکھتا ہے۔

باب ۲۵

تحریک پاکستان میں قائدین کا کردار

تاریخِ اسلام عروج و زوال کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں ملّتِ اسلامیہ نے عہدِ رسالت، خلافت راشدہ، دورِ بنو اُمیہ، خلافت عباسیہ، خلافت عثمانیہ، سلطنت دہلی، سلطنت مغلیہ وغیرہ کی صورت میں عروج و کمال اور شوکت و جلال دیکھا ہے، وہاں بغداد کی تباہی، اندلس سے مسلمانوں کے اخراج، سلطنت مغلیہ کی بربادی، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ وغیرہ کی صورت میں زوال سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ملت اسلامیہ کے جس زوال کا آغاز ہوا وہ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم اول کے خاتمہ پر نقطہ انتہا تک پہنچ گیا۔ مسلمانوں کی سلطنتوں اور وطنوں پر یورپ کے نصرانی سامراجی بالواسطہ و بلاواسطہ قابض ہو گئے۔ عرب میں صرف نجد کا ریگستان ان کی دستبرد سے باہر رہ گیا تھا۔ گذشتہ دو صدیوں میں بے شمار مسلمان قائدین ملت اسلامیہ کو اس زوال سے بچانے اور اس زوال کی حالت سے نکالنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ملّتِ اسلامیہ ان سب قائدین کی خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ لیکن ان قائدین میں سے سرسیّد، سیّد امیر علی، محسن الملک، وقار الملک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی خدمات مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انھیں آزادی دلانے کے سلسلے میں بہت نمایاں ہیں۔ ان قائدین کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات ذیل کے صفحات میں بیان کی جا رہی ہیں۔

سرسیّد احمد خاں (۱۸۱۷ء ۱۸۹۸ء)

سرسیّد احمد خاں کا شمار ان چند گنے چنے سیاسی مسلم مفکرّین اور مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے جنھوں نے تشکیل پاکستان کے لیے نہ صرف ایک خاص جادہ عمل معیّن کیا، بلکہ خود ابتدائی طور پر مسلم مجاہدین کے ساتھ مل کر منزل کی نشان دہی کی۔ اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے انگریزوں کی تہذیب کا مطالعہ کیا اور اس کی کمزوریوں سے واقف ہو کر ہر لمحہ مسلمانوں کو ان سے آگاہ رہنے کی تلقین میں کوشاں رہے۔

سر سیّد احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد متقی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ذی علم، درویش مزاج اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے۔ جہاں تک طریقت کا تعلق ہے ان کے والد حضرت غلام علی صاحب نقشبندی مجددی کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ ان کے نانا دبیر الملک خواجہ فرید اپنے دور کے جیّد علما میں شمار ہوتے تھے۔ سر سیّد خاں نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی تاہم ان کے والد نے اپنے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا۔ عربی اور فارسی کی درسی کتب کی تدریس کے بعد انھیں علم ریاضی کی طرف زیادہ راغب کیا۔

کچھ دن طب کی تعلیم بھی حاصل کی اور پھر مرزا غالب، آزاد اور صہبائی جیسے باکمال ادبا کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ ۱۸۳۸ء میں جب کہ سر سیّد کی عمر ۱۲ سال تھی۔ ان کے والد انتقال کر گئے۔ چنانچہ والد کی وفات کے دوسرے ہی سال انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ تین سال کی سروس کے بعد انھوں نے سب جج ہونے کا امتحان پاس کیا۔ چنانچہ انھیں منی پور میں بطور منصف سب جج مقرر کر دیا گیا۔

۱۸۴۲ء میں وہ مناپور سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آ گئے جہاں وہ چار سال تک مقیم رہے۔ ۱۸۴۶ء میں ان کا تبادلہ دہلی میں ہو گیا اور یہاں وہ ۱۸۵۵ء تک رہے۔ ان دنوں ان کی طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہوئی۔

چنانچہ اس تحقیق پر مبنی انھوں نے ایک مستند کتاب مرتب کی۔ جس کا نام "آثار الصنادید" رکھا گیا۔ یہ کتاب مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ کے لیے ایک بہترین رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۸۵۵ء میں ان کا تبادلہ بجنور ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ بجنور ہی میں مقیم تھے۔ ہنگاموں کے دوران سر سیّد احمد خاں نے لاتعداد انگریز مردوں اور عورتوں کو پناہ دے دے کر ان کی جانیں بچائیں بجنور کے ہندوؤں کی درخواست پر ہنگامے کے وقت انگریزوں نے انھیں ضلع کا حاکم مقرر کر دیا۔

غدر کی آگ کے شعلے جب ان کے دامن عافیت کو چھونے لگے تو ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ بمشکل جان بچا کر میرٹھ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے باقی خاندان والے سب دہلی میں تھے۔ بدقسمتی سے غدر کی آگ سب سے زیادہ دہلی کے در و دیوار کو جلا رہی تھی اسی آگ میں سر سیّد کے بیشتر اہل خاندان جل گئے۔ کچھ اعزا دہلی سے نکل گئے، ان کی والدہ اور خالہ نے ایک پرانے ملازم کے گھر میں پناہ حاصل کی۔ تاہم سر سیّد اپنی والدہ کو دہلی سے میرٹھ لے آئے لیکن

بدقسمتی سے کچھ ہی روز بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

والدہ کی خستہ حالی کی موت، اہل خانوادہ کے حشر، دہلی کی بربادی اور مسلمانوں کی بے سرو سامانی نیز قتل و غارت سے سرسید اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ان کی زندگی کے رجحانات یکسر بدل گئے۔ اس غضب ناک جنگ سے جو عوام اور فرنگی حکمرانوں کے درمیان ہوئی، سرسید کے دل میں نئے نئے جذبات پیدا ہوئے۔ پہلے تو انھوں نے ملک کو خیر باد کہنے کی سوچی۔ لیکن بعد میں کہا کہ ملک میں رہ کر عوام کو ایک تحریک کے ذریعے مستحکم و مضبوط کیا جائے۔

ملک کی خستہ حالی اور معاشی پسماندگی کو سرسید نے نہایت غور سے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ فرنگی کے خلاف نفرت جب عملی طور پر سامنے آئی تو سرسید نے ان کا بنایت و انہاک جائزہ لیا اور ایک کتاب "اسباب بغاوت ہند" تحریر کی۔ اس میں ان تمام اسباب کا ذکر کیا گیا ہے جو اس جنگ آزادی کے وقوع پذیر ہونے کا موجب بنے۔

سرسید نے نہایت بے باکی سے انگریز حاکموں کی غلط پالیسیوں کا تجزیہ پیش کیا اور انگریزوں کی اپنی رعایا کے ساتھ بے راہ روی کا تفصیلاً جائزہ لیا اور نہایت مدلل انداز میں صاف صاف بتا دیا کہ یہ غدر محکوموں کی بغاوت نہیں تھی۔ بلکہ انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی ناانصافیوں اور غلط فیصلوں کا ردعمل تھا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ہندوستان بھر میں سرسید کی حمایت میں ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس کے برعکس انگریز اپنی کوتاہیوں کے متعلق پڑھ کر بہت تلملائے۔
یہ کتاب جب برطانیہ گئی تو وہاں سرسید کے خلاف ایک طوفان امڈ آیا اور برطانوی پارلیمنٹ میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ سرسید کو باغی قرار دے کر سزائے موت دی جائے۔ لیکن حق شناس انگریزوں نے اپنی کرتوتوں پر شرمندگی کا اظہار کیا۔

جنگِ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد سرسید کو پتہ چل گیا کہ مسلمان کھلی بغاوت میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ فرنگیوں کی معاشی، اقتصادی اور دینی کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے مفاہمت کی کوششوں کا آغاز کیا۔ انگریز کی مذہبی کتاب بائیبل کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کا اعلان کیا اور ترجمہ و تفسیر کو قرآن کے ترجمے اور تفسیر کے مشابہ کرنے کی کوشش کی۔

۱۸۶۲ء میں وہ مراد آباد سے غازی پور پہنچے تو ایک سائنٹیفک سوسائٹی کی اساس رکھی اور یہاں سے انگریزی اردو اخبار جاری کیے۔ جن میں سیاست، علوم جدیدہ، معاشرت اور

اقتصادیات پر مضامین پیش کیے جاتے۔ مراد آباد میں دو سال ٹھہرنے کے بعد ۱۸۶۴ء میں وہ علی گڑھ تبدیل ہو گئے۔ معاشی ہم آہنگی کی رونق کو دوبالا کرنے کے لیے یہاں پر بھی انھوں نے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا نام "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" رکھا۔ اس ایسوسی ایشن کی تشکیل کا اصل مقصد یہ تھا کہ عوام کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر ضروری سفارشات مرتب کی جائیں جن کو حکومت کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اس ایسوسی ایشن نے سب سے پہلی سفارش جو حکومت کو پیش کی وہ یہ تھی۔ کہ ہندوستان میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہو۔

اس تجویز کو کچھ عرصے کے بعد ایک سکول کی تشکیل کی صورت میں عملی جامہ پہنایا گیا جو کچھ عرصہ کے بعد سرسید کی ذاتی کوششوں سے ایک عظیم یونیورسٹی کی شکل میں اُجاگر ہوئی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سرسید انگریزی تہذیب و تمدن کا بچشم خود جائزہ لینے کے حق میں تھے چنانچہ اس غرض کے لیے وہ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے۔ جہاں انھوں نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔ یہاں رہ کر انھوں نے ایک انگریز ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں ایک کتاب "الیسیز آن دی لائف آف محمد" تحریر کر کے شائع کر دی۔ اوّل الذکر کتاب میں اس انگریز ملحد نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا اور جا بجا اعتراضات کیے تھے ان اعتراضات کا مدلل جواب سرسید نے اپنی مذکورہ کتاب میں دیا۔

سرسید نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے جس تگ و دو سے کام کیا۔ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ، اپنی ذاتی سعی دوستوں کی اعانت اور حکومت کی معاونت سے آخر کار ایک یونیورسٹی قائم کر ہی لی۔ اس یونیورسٹی کے قیام سے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے لیے نہ صرف جدید علوم کے حصول کے لیے ایک مخزن وجود میں آ گیا بلکہ ہندوؤں کے سینے میں خنجر پیوست ہو گیا۔ معاشی اور جدید علمی زندگی میں مسلمانوں کا ہندوؤں کے مقابلے میں یہ پہلا مثبت قدم تھا۔

سرسید احمد خاں کی اس بیش بہا کامیابی کے بعد حاسدوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سرسید وطن دشمن ہے، انگریزوں کا جاسوس ہے۔ مسلمانوں کا خود ہی نشانہ بنائے جا رہا ہے: کافر ہو گیا ہے۔ لیکن جسے خدا عزت دے اسے کون پریشان کر سکتا ہے۔

سرسید پہلے رہنما ہیں جنہوں نے اعلان کیا کہ سرزمین ہندوستان میں دو جداگانہ قومیں آباد ہیں۔ جن کے رسم و رواج، دین و مذہب اور تہذیب و معاشرت میں اختلاف کے باعث ان

دونوں قوموں کے لیے ملک میں علیحدہ قانونی مراعات کا ہونا لازم ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی منفرد حیثیت کو تسلیم کروانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے پہلی مرتبہ حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ اہلِ ہند کو حکومتِ برطانیہ کے تمام اعلیٰ اداروں کے شعبوں میں شمولیت کا حق ملنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں سرسیّد نے پہلی دفعہ دو قومی نظریہ پیش کیا۔

اس طرح سرسیّد ہی نظریۂ پاکستان کے اولین موجد اور سرگرم حامی تھے۔ انگریزوں اور ہندوؤں میں رہ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یہ قومیں آپس میں مل کر کسی صورت میں نہیں رہ سکتیں چونکہ یہ نظریہ ہندوؤں کے لیے بالخصوص اور انگریزوں کے لیے بالعموم تکلیف دہ تھا، اس لیے ان کی زندگی میں ہی ان کی مخالفت بھی شروع ہو گئی تھی، لیکن مخالفین اپنی آگ میں جل بھن کر رہ گئے اور سرسید منزل کو پا گئے۔ ان کی زندگی میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوئی ایک عظیم ترین کارنامہ تھا۔ اس یونیورسٹی میں سرسیّد نے مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں علم سے روشناس کرایا۔

یہ چیز ہندوؤں کی بالادستی ختم کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئی۔ دسمبر ۱۸۸۶ء میں سرسیّد احمد خاں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کانفرنس کا مقصد دراصل علی گڑھ تحریک (جس کا ذکر ابتدائی صفحات تفصیل سے آچکا ہے) کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانا تھا۔ اس کانفرنس کے مقاصد میں جو اہم باتیں قابل ذکر ہیں ان میں ایک مسلم پلیٹ فارم بنانا جس پر مسلمان رہنما آکر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات سے دوسرے مسلمانوں کو آگاہ کر سکیں اور وقت کی ضروریات کے پیش نظر اپنے مطالبات پیش کر سکیں۔ اگر ذرا عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دراصل مسلم لیگ ہی کی ابتدائی شکل تھی۔ اگرچہ سرسید خود کانگریس سے وابستہ رہے لیکن اس وابستگی کا مقصد اس جماعت کے ساتھ ہم آہنگی نہیں تھا بلکہ دشمنوں کو قریب تر ہو کر محتسبانہ انداز میں دیکھنا تھا۔

سرسیّد احمد خاں ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں علی گڑھ میں فوت ہو گئے اور انھیں وہیں دفن کیا گیا۔ ان کی زندگی کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل نکات مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ سماجی خدمات

۲۔ مذہبی کارنامے

۳۔ تعلیمی خدمات۔

۴۔ سیاسی خدمات۔

۵۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت۔

۶۔ انڈین نیشنل کانگریس سے وابستگی۔

۷۔ تحریکِ علی گڑھ۔

۸۔ ہندو سیاست پر تنقید۔

۹۔ اُردو کی ہندی پر برتری کا اظہار۔

۱۰۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

سیّد امیر علی (۱۸۴۹ تا ۱۹۲۸ء)

سیّد امیر علی ۶/ اپریل ۱۸۴۹ء میں چن سرا (بنگال) جو دریائے ہگلی کے کنارے پر واقع ہے، متولد ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام سیّد جعفر علی خاں تھا جو ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور "کٹک" میں مامور تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والدین سے حاصل کی۔ بعدازاں ہگلی کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں پر ان کو دو ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان دونوں شخصیتوں سے انھوں نے وافر فیض حاصل کیا۔ ان میں ایک عالم دین سید کرامت علی تھے اور دوسرے معروف عالم پروفیسر عبیداللہ عبیدی تھے۔ اپنے اوّل الذکر استاد کی تعلیمات سے اس قدر متاثر تھے کہ ابتدائی زندگی ہی میں ان کی مشہور کتاب "مرکز علوم" کو انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ یہی کتاب ان کی اولین ادبی کوشش تھی۔

سیدامیر علی ہندوستان بھر کے سب سے پہلے ایسے گریجوایٹ تھے جنہوں نے انگریز کے قائم کیے کسی کالج سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں ۱۸۶۸ء میں انھوں نے ایم۔ اے ہسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر اگلے سال قانون کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ان کی غیر معمولی قابلیت کے پیشِ نظر حکومت نے انھیں سرکاری خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ ۱۸۷۲ء میں انگلستان سے بار ایٹ لا کر کے واپس بنگال آئے اور کلکتہ میں قانون کی پریکٹس شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ کی شہرت کا چرچا عام ہوا۔ اور اس شہرت کی بناء پر انھیں کلکتہ یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا گیا، پریذیڈنسی کالج

کلکتہ میں ایک خاص عرصے تک محمڈن لا کے پروفیسر بھی رہے۔ قانون میں انھیں غیر معمولی دسترس حاصل ہو گئی تھی۔ اور اس غیر معمولی قابلیت کا اعتراف انگریز حکومت نے اس انداز سے کیا کہ ۱۸۹۰ء میں انھیں کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدے سے فائز ہونے والا یہ دوسرا مسلمان شخص تھا۔ قبل ازیں سر سید احمد خاں کے بیٹے سید محمود ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے تھے۔

سید امیر علی چودہ سال تک ہائی کورٹ کے جج رہے۔ اس دوران میں انھوں نے بعض تاریخی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ کیا۔ انگریزی قوانین کی تحصیل و تدریس کے دوران سید امیر علی اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ انگریزی معاشرے، تہذیب و تمدن اور اطوار کا مقابلہ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن اور اطوار سے کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی ہندو تہذیب و تمدن اور مسلم تہذیب و تمدن کا فرق محسوس کر سکیں۔

سید امیر علی ۱۹۰۴ء تک ہائی کورٹ کے جج رہے۔ اسی سال ریٹائر ہونے کے بعد عازم انگلستان ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں انھیں برطانوی حکومت نے انڈین پریوی کونسل کا رکن منتخب کر لیا۔ یہ اعزاز کسی ہندوستانی کے لیے اولیّن نہ تھا۔ کیونکہ قبل ازیں اس کونسل میں کوئی رکن ہندوستان کا باشندہ نہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چوبیس سال زندہ رہے اور یہ عرصہ انھوں نے انگلستان ہی میں گذارا۔ آپ کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ انگلستان میں قیام کے دوران سید امیر علی نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مسلم لیگ کی انگلستان برانچ کی تشکیل اور اس کے ذریعے مسلم مقاصد کی تقویت کے سلسلے میں انھوں نے کار ہائے نمایاں سر انجام دیئے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمان ابھی اتنے مضبوط نہ تھے کہ وہ غلامی کی سلاسل کو توڑ سکیں اور بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء کے غدر سے انگریز کو اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ منظم ہونے کی تلقین کی اور اس بات کا احساس دلایا کہ منظم ہونے کے لیے باقاعدہ ایک تنظیم کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اس احساس کے تحت انھوں نے ۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی لیکن اس کے مقابلے میں سر سید مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تشکیل کر چکے تھے اور وہ اس سلسلے میں خود شہر بہ شہر جا کر کوشاں رہے تھے۔ اس لیے اس کانفرنس کے مقابلے میں نیشنل محمڈن ایسوسی چنداں کامیاب نہ ہو سکی۔ تاہم ۱۸۸۲ء میں اس ایسوسی ایشن نے ہندوستان کے

مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کرنے کے لیے وائسرائے لارڈ رپن کو ایک یادداشت پیش کی جس سے انگریزوں میں مسلمانوں کی طرف التفات کرنے کے لیے تحریک پیدا ہوئی۔ سید امیر علی کی طرف سے اس ایسوسی ایشن کے قیام کا مقصد سر سید احمد خاں کی تحریک کو ناکام کرنا نہیں تھا بلکہ انھوں نے سیاسی و سماجی سطح پر سر سید احمد خاں سے پورا پورا تعاون کیا۔ چنانچہ اپنی ایسوسی ایشن ہونے کے باوجود سر سید کی بنائی ہوئی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔

سیّد امیر علی اور مسلم لیگ

انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں ہندوستان میں ایک نئی سیاسی جماعت مسلم لیگ کا قیام دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوا جس کی قرارداد ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں پاس کی گئی تھی اور یہ اجلاس بھی دسمبر ۱۹۰۴ء میں ڈھاکہ کے مقام پر زیرِ صدارت وقار الملک انعقاد پذیر ہوا سید امیر علی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اس نئی جماعت کا معرضِ وجود میں آنا نہایت خوش آئند اقدام ہے لیکن اس کی کارکردگی کا دائرہ عمل وسیع تر بن ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں سیّد امیر علی کی زیرِ صدارت لندن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخ کھول دی گئی۔ اس نئی جماعت کو لندن میں فعال بنانے میں سید امیر علی کا بہت زیادہ عمل دخل رہا اور انھوں نے اپنی کارکردگی سے ثابت کر کہ ہندوستان کی یہ سیاسی جماعت ایک دن منزلِ مراد کو ضرور پالے گی۔

۲۵ جنوری ۱۹۰۹ء کو مسلم لیگ لندن برانچ کی طرف سے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے امورِ ہند لارڈ مورلے کے پاس ایک وفد لے کر گئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے بالخصوص وزیرِ موصوف کی توجہ لوکل باڈیز اور لیجسلیٹو اسمبلیوں میں علیحدہ نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔

انھیں نہ صرف مسلمانانِ ہند سے ہمدردی تھی بلکہ ان کو مسلمانانِ عالم سے پورا پورا خلوص تھا۔ چنانچہ بلقان کی جنگوں اور ترکی اور اٹلی کی جنگوں کے دوران انھوں نے لندن سے برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی قائم کر کے ان لوگوں کی خاطر خواہ امداد کی۔ انھوں نے لندن میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جس کے لیے انھوں نے لندن میں مختلف مسلم مخیر حضرات سے چندے جمع کیے۔

جس طرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے سید امیر علی کو اسلامی قوانین پر پوری پوری مہارت حاصل تھی اور اس دعویٰ کی دلیل میں ہم ان کی وہ کتب پیش کر سکتے ہیں جو اپنی مثال آپ

ہیں اور اُن کے مقابلے میں شاید ہی کوئی قانون دان ویسی کتاب لکھ سکا ہو۔ وہ کتب حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ دی سپرٹ آف اسلام
۲۔ اسلام
۳۔ ویمن اِن اسلام
۴۔ دی پرسنل لاء آف محمڈنز
۵۔ دی لیگل پوزیشن آف ویمن ان اسلام
۶۔ محمڈن لاء
۷۔ دی رائٹس آف پرشیا۔
۸۔ اے کمنٹری آن دی بنگال ایکٹ وغیرہ

ان کتب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سید امیر علی کے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کس قدر نیک جذبات پائے جاتے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ہندو کے مقابلے میں اس برصغیر میں مسلمان بھی ہر لحاظ سے خود کفیل ہو جائے۔ ان کتب کی بناء پر انھوں نے مسلمانوں کو ایک خاص مرکز کی طرف آنے کی ترغیب دی اور مسلمانانِ ہند کو احساس دلایا کہ ان کے حقوق اور فرائض کیا ہیں۔

اسلام کا یہ مجاہد اور آزادی کا یہ پروانہ ۳۔ اگست ۱۹۲۸ء کو انگلستان میں بمقام سیکس ابدی نیند سو گیا۔

سیّد امیر علی کی سیاسی بصیرت

سید امیر علی اپنے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نازک ترین دور میں انھوں نے اپنی ملت کی خدمت و قیادت کا فرض انجام دیا۔ اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ اور تحریک آزادی کے معماروں اور رہنماؤں میں ان کو ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ دورِ جدید کے مسلمان مفکروں اور اسلامی قانون اور سیرت رسول پر ان کی انگریزی تصانیف کو نہ صرف اسلامیات بلکہ انگریزی ادب میں بھی گراں قدر اضافہ تصور کیا جاتا ہے اور ان کے علمی اور دل کش و دل پذیر اندازِ تحریر کے خود انگریز اہلِ علم و اہلِ قلم بھی مداح اور معترف ہیں۔

سید امیر علی ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے اور زندگی کی ہر منزل میں میز و ممتاز رہے۔ وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے انگلستان گئے مگر اس شان سے کہ وائسرائے اور گورنر نے ان کو تعارفی خطوط دیئے۔ انگلستان میں قیام کے دوران وہ لندن کی معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ خاندانی امراء و مشاہیر سے متعارف ہوئے اور اس کم عمری میں ایک ایسی کتاب لکھی جس کو علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے قانونی پیشہ اختیار کیا اور اس میں بڑی شہرت و ناموری حاصل کی۔ ہندوستانی اور اسلامی، پر کئی کتابیں لکھیں اور اسلامی شریعت کے سب سے بڑے ماہر تسلیم کیے گئے۔ پھر وہ بنگال ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ ہندوستان میں یہ اعلیٰ ترین عدالتی عہدہ تھا جو کسی مسلمان کو مل سکتا تھا اور امیر علی دوسرے مسلمان تھے جو اس عہدہ پر فائز ہوئے۔ جج کی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑا نام پیدا کیا اور اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کی اور زندگی کے اس دور میں بھی وہ ممتاز اور سر برآوردہ رہے۔ ان کو سلطنتِ برطانیہ کے جلیل القدر ادارہ پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ یہ اعزاز برطانوی شہنشاہت کے اعلیٰ ترین قانون دانوں ہی کو حاصل ہوتا تھا۔ اور امیر علی کے رفقاء مسلمہ قابلیت کے مالک تھے مگر وہ اپنے ان نامور رفقاء میں بھی ممیز و ممتاز رہے۔

نہ صرف قانون بلکہ علمی دنیا میں بھی امیر علی نے ایک امتیازی مرتبہ حاصل کیا اور ایک مفکر اور بلند پایہ مورخ و سیرت نگار کی حیثیت سے بھی وہ بہت مشہور ہوئے۔ ان کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئیں اور ان کی ''اسپرٹ آف اسلام'' کو جدید اسلامی ادب کا ایک شاہکار قرار دیا گیا۔ امیر علی نے سیاست میں بھی نمایاں حصہ لیا اسلامی ہند کے رہنماؤں میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل کیا اور مسلمانانِ ہند کے قومی اور سیاسی حقوق کے لیے آئینی جنگ اس کامیابی سے لڑے کہ ان کی جدوجہد ملی تحریک کا ایک اہم باب بن گئی۔

اُنیسویں صدی کے آخر ربع میں، امیر علی مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے سیاسی رہنما تھے۔ اس دور کے مسلمان رہنماؤں میں صرف امیر علی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے مغربی اقوام کے سیاسی افکار اور جمہوری تصورات کا غائر مطالعہ کیا تھا اور انگریزوں کی قومی روایات، سیاسی نظریات، رجحانات اور جمہوری اداروں سے بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں کے متعلق ان کی معلومات ذاتی واقفیت اور گہرے مشاہدے کا نتیجہ تھیں اور وہ انگریزی عہد حکومت میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا واضح

شعور رکھتے تھے۔ ان معلومات کی روشنی میں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں عنقریب سیاسی جدوجہد کا دور شروع ہو جائے گا۔ اور اس دور میں وہی قوم اپنے حقوق اور مفاد کا تحفظ کر سکے گی جو سیاسی اعتبار سے منظم و متحد ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کی ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور سرسیّد جیسے ممتاز رہنماء کی شدید مخالفت کے باوجود اپنی رائے پر قائم رہے اور سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں کی قومی سیاسی تنظیم قائم کر دی۔ یہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے بھی نو سال پہلے قائم ہوئی تھی۔ اور یہ سید امیر علی کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کا بھی ثبوت ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانانِ ہند سیاسی جدوجہد کے ایک نئے دور میں داخل ہوئے اور ان کے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے کل ہند مسلم لیگ قائم کی گئی۔ اس وقت امیر علی انگلستان میں سکونت پذیر تھے۔ اور ان کی سیاسی فراست سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہی کہ ہندوستان کو ملنے والی دستوری اصلاحات میں مسلمانوں کے قومی حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے جنگ دو محاذوں پر لڑنا ضروری ہے۔ ایک تو ہندوستان اور دوسرے انگلستان۔ چنانچہ انھوں نے اسی مقصد سے لندن مسلم لیگ قائم کی اور اپنی قابلیت، تدبر و فراست اور شدید جدوجہد سے یہ معرکہ بڑی کامیابی سے سر کر لیا۔ یہ امیر علی کی زندگی کا اہم ترین سیاسی کارنامہ تھا جس سے ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی مستقبل محفوظ کرنے میں بڑی مدد ملی اور ان کی جداگانہ قومی حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ مسلمانوں نے بھی ان کی ملی خدمات کا اعتراف کیا اور وہ کل ہند مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔

انقلابِ فرانس کے بعد قومی مملکت کا تصور مغربی ممالک میں بہت مقبول ہو گیا تھا اور اس کو جمہوریت کا ایک بنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا۔ ہر قوم کو قومی حقوق دے کر اکثریت کی حکومت قائم کرنا جمہوری نظامِ حکومت کا ایک لازمہ تھا اور انگریز بھی اپنے جمہوری تصورات کے مطابق ہندوستان کو سیاسی حقوق دینا چاہتے تھے۔ انگریز اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قومیت کے جدید تصور کے مطابق ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم نہیں ہیں اور نہ ہندوستان ایک متجانس ملک ہے۔ لیکن اپنی ہندو نواز پالیسی اور انتظامی سہولت کے پیشِ نظر وہ ہندوستان کو ایک متجانس ملک اور اس کے تمام باشندوں کو ایک متجانس قوم تسلیم کر لینے پر اصرار کر رہے تھے۔ امیر علی یہ جانتے تھے کہ متحدہ قومیت کا یہ مفروضہ ہندوستانی مسلمانوں کے

لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ قومی حیثیت سے وہ بالکل مٹ جائیں گے اور ان پر دائمی ہندو اکثریت کا اقتدار ہمیشہ قائم رہے گا۔ اپنی قوم کو اس تباہی سے محفوظ رکھنے اور اس کے قومی حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے امیر علی میدانِ سیاست میں سرگرم عمل ہوئے اور بڑے زور و شور سے اس حقیقت کا اعلان کیا کہ ہندوستان ایک متجانس ملک نہیں، وسیع برِعظیم ہے جہاں مختلف قومیں آباد ہیں، جن میں سب سے بڑی قومیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ مسلمان اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن ان کو تاریخی اور سیاسی اہمیت اور معاشرتی برتری حاصل ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔ ان کو مذہب، تاریخ، تہذیب، روایات، نظریات و احساسات کی یکسانی نے ایک الگ قوم بنا دیا ہے۔ اور ہندوستان میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں جن کو قومیت کو تسلیم مفہوم اور اور تعریف میں ایک قوم کہنا درست ہوگا۔ اسلامی ہند کے تمام رہنماؤں میں امیر علی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو تسلیم کرنے اور ان کو قومی حقوق دینے کا مطالبہ کیا۔ علامہ اقبال نے اس تصور میں نئی روح پھونک دی اور ہندوستانی مسلمانوں کی قومی مملکت کے قیام کو ملّی و سیاسی نصب العین قرار دیا اور قائدِ اعظم کی حیات آفرین قیادت میں یہ نصب العین عملی حقیقت بن گیا۔

امیر علی کی سیاسی سرگرمیاں صرف اسلامی ہند تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ انھوں نے تمام اسلامی دنیا کے حقوق و مفاد کی حمایت کی اور ان کے خلاف سامراجی منصوبوں کو بے نقاب کیا۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے زمانہ میں عربوں اور ترکوں کی امداد کے لیے انجمن ہلال احمر قائم کرکے قابلِ تعریف خدمات انجام دیں۔ ترکوں سے امیر علی کو والہانہ محبت تھی اور انھوں نے ہر نازک موقع پر اُن کی پر زور وکالت اور حمایت کی۔ امیر علی خلافت کے زبردست حامی تھے۔ اور اس کو تمام اسلامی دنیا کے اتحاد اور استحکام کی علامت اور مختلف ممالک کے مسلمانوں کو متحد کرنے والا دینی اور روحانی رشتہ قرار دیتے تھے۔ جب خلافت کا خاتمہ ہوا تو امیر علی کو شدید صدمہ پہنچا اور انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ خلافت کا خاتمہ اسلام اور تہذیب کا نقصان عظیم ہے۔ اس کی وجہ سے اسلام ایک زبردست اخلاقی قوت کی حیثیت سے کمزور پڑ جائے گا۔ اسلامی شریعت اور چودہ سو سال کی مسلمہ روایات کی بنا پر خلافت کو ایک بنیادی مذہبی ادارہ کی حیثیت حاصل ہو گئی اور یہ اسلامی دنیا کا روحانی مرکز بن گئی اور کسی ملک کی قومی مجلس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کو ختم کر دے۔

امیر علی کی زندگی کا ایک اہم ترین پہلو اُن کی دینی خدمات ہیں۔ وہ اسلامی تعلیمات اور اصول و احکام کی دائمی قدر و قیمت، ان کی عالمگیر اور پذیر نوعیت اور تمام نوع انسانی کے لیے ان کی ابدی افادیت سے بخوبی آگاہ تھے اور انھوں نے اپنی تصانیف میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا۔ کہ اسلامی تعلیمات عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق ایسے معقول، موثر، تشفی بخش اور دل پذیر انداز میں پیش کی جائیں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ ان کی خوبیوں کے قائل اور معترف ہو جائیں۔ اور تجسس پسند ذہنوں کو پوری طرح مطمئن کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ وہ اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق وہ غلط فہمیاں بھی رفع ہو جائیں جو تنگ نظر مستشرقین اور متعصب اہل کلیسا نے پیدا کر دی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرت کی زندگی پر ایک ایسے مکمل انسان کی حیثیت سے روشنی ڈالی جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام نوع انسانی کے لیے چشمۂ ہدایت ہے۔ اور اسلام کو ایک ایسے مکمل اور ترقی پذیر نظریہ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جو تمام انسانوں کے لیے قابلِ قبول و قابلِ عمل اور ہر دور کی ترقیات سے ہم آہنگ ہے۔ ایک مورخ کی حیثیت سے امیر علی نے یہ اہم خدمت انجام دی کہ اسلامی تاریخ کو سیاسی حالات و واقعات تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون میں مسلمانوں کے عظیم کارنامے اور دوسری قوموں پر اس کے اثرات بھی وضاحت سے بیان کیے۔ اور مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ اپنے عروج و زوال کے اسباب کا غائر نظر سے مطالعہ کر کے اپنے تابناک ماضی کی روشنی میں درخشاں مستقبل کی تعمیر کریں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے امیر علی کی یہی وہ گراں بہا خدمات ہیں جن کی بدولت اس دور کی ملّی اور فکری تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا۔

نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء)

سر سید احمد خاں کی وفات سے جہاں ملت اسلامیہ کو بہت بڑے نقصان کا صدمہ ہوا وہاں علی گڑھ کالج کے حالات پر بھی ان کی وفات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ خیال یہ تھا کہ ان بگڑتے ہوئے حالات کو جسٹس محمود سنبھال لیں گے۔ لیکن یہ ان کے بس کا کام نہ تھا۔ اس لیے کالج کی مجلس منتظمہ نے کالج کے سیکرٹری کے عہدے کے لیے نواب محسن الملک کا انتخاب کیا۔ سر سید کے بعد مسلم نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں جن رہنمایان قوم اور قائدینِ ملت نے کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں گراں مایہ شخصیت نواب محسن الدولہ محسن الملک سید مہدی علی [illegible] منیر نواز جنگ

کی ہے۔ جو عام طور پر تاریخ میں نواب محسن الملک کے نام سے مشہور رہیں۔ آپ ۱۸۳۷ء میں صوبجات متحدہ کے قصبہ اٹاوہ کے غریب مگر شریف سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا جید عالم تھے۔ ان سے فیضان علم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اسلام کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ مذہب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ابتدائی عمر میں ہی حدیث، تفسیر اور عربی ادب میں دسترس پیدا کر لی اور اسی مذہب کی بناء پر ہی سر سید سے ان کی ملاقات ہوئی اور سر سید کے اخلاص کو دیکھ کر ان کے جاں نثار اور شیدائی بن گئے اور مرتے دم تک ان کے معین و مددگار رہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اٹاوہ تحصیل دس روپے ماہوار پر محرر مقرر ہو گئے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے تحصیلدار پھر ڈپٹی کلکٹر تعین ہوئے۔ مسٹر اے او ہیوم جو اس وقت کلکٹر تھے بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانی بنے وہ آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"باوجود اس اعلیٰ درجے کی لیاقت اور کارگذاری کے ایسا شخص جو ایک ریاست اور صوبہ کا انتظام نہایت عمدہ طور پر کر سکتا ہے ابھی تک تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں پر رہا"

۱۸۷۴ء میں وہ مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے کہ سر سید کے مشورے سے ملازمت سے استعفٰی دے دیا اور ریاست حیدر آباد سر سالار جنگ کی خواہش پر وہاں چلے گئے اور وہاں محکمہ مال کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انھوں نے مال گذاری کے فرسودہ نظام میں انقلابی تبدیلیاں کیں جن سے نہ صرف ریاست کا خزانہ معمور ہو گیا بلکہ زراعت پیشہ طبقے کو بھی پورا پورا فائدہ ہوا ۱۸۸۳ء میں سالار جنگ کی وفات ہوئی تو ان کا بیٹا میر لائق علی خاں ریاست کا وزیر اعظم مقرر ہوا تو اس نے آپ کو وزارت سیاست و خزانہ کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر ہونے سے بیرون ریاست ان کے اثر و اقتدار میں اضافہ ہوا جس کی بدولت منیر نواز جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ اس کے تین سال بعد یعنی ۱۸۸۷ء میں "نواب محسن الدولہ محسن الملک" کے خطاب سے نوازے گئے۔ ان کا یہ خطاب اس قدر مشہور ہوا کہ اصلی نام کو دنیا بھول ہی گئی اور ۱۸۹۳ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر واپس لوٹے اور اس واقعہ کی روداد جناب مولوی عبدالحق صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"حیدر آباد میں بڑے بڑے آئے اور گئے لیکن اب تک کسی کو وہ عام مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہوئی جو نواب محسن الملک کو ہوئی۔ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وہ ہر بڑے اور صاحب اقتدار آدمی پر اس

طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں۔ لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔

نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدرآباد میں کہرام مچ گیا تھا۔ اور ہزار ہا آدمی کا ٹھٹھ سٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی شامل تھے، زارو قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا۔"

حیدرآباد سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ پہنچ گئے اور مرتے دم تک وہیں رہے۔ ۱۸۹۸ء میں جب سرسید احمد خاں نے وفات پائی تو کالج کی حالت بڑی نازک تھی۔ لاکھ سوا لاکھ کے غبن نے نہ صرف سرسید بلکہ کالج کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اب کالج تقریباً ساٹھ ہزار کا مقروض تھا۔ کئی عمارتیں نامکمل تھیں۔ طلباء بدظن ہو چکے تھے اور تعداد بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نازک موڑ پر نواب محسن الملک نے کالج کی باگ ڈور سنبھالی۔ انھوں نے سب سے پہلے سرسید میموریل فنڈ کا قیام کیا اور مختصر عرصے میں ہی کالج کے خزانہ میں تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ جمع ہو گیا اور ساتھ ہی طلباء کی تعداد ساڑھے آٹھ سو تک پہنچ گئی۔ مولانا شبلی آپ کے اس وقت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دے گا۔ لیکن خدا نے ان ہی کے ہم نشینوں میں سے ایسا شخص (نواب محسن الملک) پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہمسر نہ تھا لیکن کالج کی وسعت، ترقی اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے تھوڑی سی مدت میں سات لاکھ روپیہ جمع کر دیا۔ کالج کی ہر شاخ اس قدر ترقی کر گئی کہ کوئی شخص جس نے سرسید کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جا کر دیکھے تو پہچاننا مشکل ہو گا۔ کانفرنس (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ) جو روز بروز مردہ ہوتی جاتی تھی آپنے اسکو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے لے کر ڈھاکے تک اس کے ڈانڈے ملا دیئے۔"

اس زمانہ میں صوبجات متحدہ کا لیفٹیننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل تھا۔ یہ بڑا متعصب اور تنگ نظر انسان تھا۔ مسلم دشمنی تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس نے چند ہندوؤں کو ساتھ ملا

کرہ اُردو ہندی نزاع" کے بیج بوئے۔ آپ نے اس کے خلاف اُردو کے دفاع کے لیے اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور سارے ملک میں سیاسی زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اردو کی حمایت کے لیے ۱۸/ اگست ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ کے قیصر باغ میں ایک جلسہ ہوا۔ آپ نے اس کی صدارت کی ایک اور پُراثر اور پُر درد تقریر کی جس کا اختتامیہ شعر یہ تھا ؎

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے !
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ انگریز، ہندوؤں میں کچھ سیاسی حالات کرنا چاہتے ہیں۔ تو آپ نے ۱۹۰۶ء میں ایک مسلمانوں کا وفد ترتیب دیا اور اُسے لے کر سر آغا خاں کی قیادت میں گورنر جنرل لارڈ منٹو سے ملاقات کی۔ یہ اسی وفد کی کوششوں کا ثمر ہے کہ ۱۹۰۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں مسلمانوں کے مطالبات کا خاطر خواہ خیال رکھا گیا۔

آپ ہی کے زیرِ صدارت ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ یہی وہ جماعت ہے جس کی ساعی سے پاکستان وجود میں آیا۔

ابھی آپ شملہ ہی میں تھے کہ بیماری نے آگھیرا۔ لارڈ منٹو نے علاج کے لیے اپنے ذاتی معالج کو مامور کیا "لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" ۱۴/ اگست ۱۹۰۷ء کو حالت سخت خراب ہو گئی تو آپ نے دوست و احباب کو بلا لیا اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"مجھے اپنی زندگی کا اعتبار نہیں آپ سب گواہ رہیں کہ میں صدق دل سے کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ پڑھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ ملک و قوم کی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ کی ہیں اور اگر ان میں کوئی غلطی ہوئی ہو تو میں بے قصور ہوں کیوں کہ میری نیت ہر حال میں نیک تھی اور خدا میری نیک نیتی کا شاہد ہے۔"

۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو پیغام اجل آگیا اور یہ مرد مومن اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ان کی میت شملے سے علی گڑھ پہنچائی گئی۔ تدفین وہیں عمل میں آئی۔ اور سرسید اور سید محمود کے قریب جگہ ملی۔

آپ زبردست خطیب اور بڑے فصیح البیان مقرر تھے بلکہ سر سید رضا علی خاں کے الفاظ میں "اُن کا شمار دنیا میں سب سے بڑے مقرروں میں ہوتا تھا" تقریر کے دوران حاضرین پر

بے اختیار اور قابو ہوتا تھا جیسے برتن بناتے وقت کمہار کو مٹی پر ہوتا ہے۔ جب چاہتے رلاتے اور جب چاہتے ہنساتے۔ گفتگو کا انداز بڑا دلکش تھا۔ بذلہ سنج اور خوش مزاجی میں یکتا تھے۔ بقول شمس العلماء آزاد "جب بات کرتے تو یہ معلوم ہوتا کہ چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے"
آپ کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کا ایک کتب خانہ ہر وقت اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ آپ بڑے منکسر المزاج تھے۔ چھوٹے بڑے سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ اختلاف رائے کو برداشت کرتے اور درگذر کرتے۔ مخیر اور فیاض قسم کے انسان تھے۔ سید رضا علی کے مطابق "وہ بلا کے ذکی الطبع تھے۔ معاملے کی تہہ کو پہنچنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے تحریک علی گڑھ کو جو سرسید کے زمانے میں صوبہ جات متحدہ اور پنجاب تک محدود تھی نہ صرف سارے ملک میں پھیلایا بلکہ برما، افغانستان اور ایران جیسے دور دراز ممالک کو اس کے دائرہ اثر میں شامل کر لیا"

آپ اعلیٰ درجہ کے سیاس اور مدبر تھے۔ آپ کا دائرہ اثر بہت وسیع تھا۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں، سید علی امام، جسٹس شاہ دین، سر محمد شفیع، مہاراجہ محمود آباد اور سر عبدالرحیم جیسے عظیم بزرگ آپ کے جلیس اور دوست تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے ستارے کی روشنی محسن الملک تھے کہ انھی کے ذریعے وہ ملک میں روشناس ہوئے۔

کارہائے نمایاں

نواب محسن الملک کے تمام کارنامے گنانے کی یہاں گنجائش نہیں، لیکن ان کی ایک آدھ خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری ہے، جس نے ان کا کام بہت آسان کر دیا تھا۔

علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے مہتمم ہونے کے علاوہ نواب محسن الملک سرسید کے سیاسی جانشین تھے اور اس سلسلے میں انھیں دو تین بڑے معرکوں میں حصہ لینا پڑا۔ ان میں سے ایک کی نسبت مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو لکھتے ہیں:۔

> "سرسید کی وفات کے قریب زمانے ہی میں اُردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جوان ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھائی پڑھائی شروع کر دی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں اس مخالفت نے اور زور پکڑا۔ اردو کی حفاظت اور حمایت کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی۔ جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بڑی

زبردست اور پُرجوش تقریر کی۔ جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا۔ اور جوش کی ایک لہر پھیل گئی۔ سرانٹونی میکڈانل اس وقت لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ وہ ہندی کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ انھوں نے کچھ ایسی دھمکی دی کہ نواب صاحب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا اور انجمن ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئی۔ ان کی یہ کمزوری نہایت قابلِ افسوس ہے۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے اصرار کیا تو انھیں کالج کی سیکریٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ کالج کی حالت اس وقت بہت نازک تھی۔ اس لیے مصلحت اس میں سمجھی کہ اردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ تاہم ان کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی۔"

مولوی عبدالحق اردو کے محسنِ اعظم اور نواب محسن الملک کے دلی عقیدت مند تھے۔ اس کے علاوہ ان کی رائے عام طور پر اسی طرح جچی تلی اور جذبات سے مبّرا ہوتی کہ ان سے اختلاف آسان نہیں۔ لیکن مندرجہ بالا اندراج میں اصابت رائے سے قطع نظر، بیانِ واقعات کی اتنی غلطیاں ہیں کہ نواب محسن الملک کی سیرت پر اس اہم اعتراض کی صحت یا غلطی کے لیے تمام واقعات پر سرسری نظر ڈالنی پڑے گی۔

یو۔ پی میں اُردو کی مخالفت، جیسا کہ ہم سرسید کے ذکر میں بتا چکے ہیں ۱۸۶۷ء کے قریب شروع ہو گئی تھی اور رفتہ رفتہ زور پکڑ رہی تھی۔ جب ۱۸۹۵ء میں سرانٹونی میکڈانل صوبہ بہار میں کلکٹر تھے اور بقول سرسید ان کے تعاون کی وجہ سے۔ بہار میں اردو زبان کے بجائے بہاری زبان اور فارسی حروف کے بجائے کیتھی حروف رائج ہوئے۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں صوبے کے "بڑے بڑے معززاور سر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے پیش کیا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔" اور بالآخر ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء کو سرانٹونی کی حکومت نے وہ مشہور ریزولیشن صادر کیا جس کی رو سے اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کا استعمال جائز قرار دیا گیا۔

علی گڑھ میں اس ریزولیشن پر سب کو افسوس ہوا۔ نواب محسن الملک نے اپنی کوٹھی پر ایک مختصر جلسہ منعقد کیا، جس میں آئندہ پروگرام معین کیا گیا۔ اور اس کے مطابق ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ کے ٹاؤن ہال میں نواب لطف علی خاں صاحب رئیس چھتاری ضلع بلند شہر کی

زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک کو عرض داشت مرتب کرنے اور عام جلسہ کرنے کا کام سپرد ہوا۔

سر انٹونی میکڈانل کو یہ کارروائی بُری لگی اور انھوں نے اپنی تقریروں اور بعض خطوں میں اس پر سخت نکتہ چینی کی۔ چنانچہ نواب محسن الملک کے بہت سے شرکائے کار ان سے علیحدہ ہو گئے بلکہ جلسۂ علی گڑھ کے پریذیڈنٹ نواب لطف علی خاں نے صدارت سے استعفیٰ دے کر کمیٹی سے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے باوجود نواب صاحب نے لکھنؤ میں ۸۔ اگست کو وہ عظیم الشان جلسہ منعقد کرایا جس کا ذکر مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں کیا ہے:۔

"اس پر سر انٹونی میکڈانل اور بگڑے۔" "وہ بحیثیت پیٹرن علی گڑھ آئے اور ٹرسٹیوں کو جمع کر کے اس ایجی ٹیشن پر جو اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے ذریعے کی جاتی تھی، اپنی سخت ناراضی کا اظہار کیا اور یہ الزام لگایا کہ ایم۔ اے۔ او کالج کے طلبا اس تحریک کے مناد بنائے گئے۔ نیز اساتذہ اور بعض ٹرسٹیوں اور آنریری سیکرٹری نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو گورنمنٹ سے جو امداد کالج کو ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی۔"

"بعض ٹرسٹیوں نے سر انٹونی کی خوشامدانہ تائید کی۔ اور تمام تر الزام نواب محسن الملک پر لگایا اور اب اُن کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ یا تو سیکرٹری شپ سے مستعفی ہو جائیں یا اس تحریک سے۔"

اس زمانے میں کالج کی جو نازک حالت تھی، اس کی طرف مولوی عبدالحق نے اشارہ کیا ہے، لیکن اس سے اصل پیچیدگی کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کالج کی مالی پریشانیوں اور دوسری الجھنوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں، لیکن سب سے بڑی اُلجھن یہ تھی کہ اس وقت سر انٹونی میکڈانل صوبے کے گورنر تھے اور کالج پر اُن کی گرم نظریں پڑ رہی تھیں۔ اس سے پہلے ان کی نگہ گرم نے ندوہ کو نعش بے جان کر دیا تھا۔ اور اب ان کی توجہ علی گڑھ کی طرف تھی۔ انھوں نے اپنی عام تقریروں میں علی گڑھ کالج کی نسبت کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا۔

اس موقع پر اس بات کا پوشیدہ رکھنا محض بے سود ہو گا کہ ٹرسٹیوں میں اتفاق نہیں ہے اور میں اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ بعض لوگوں میں اعتدال بھی نہیں۔ جس کی وجہ سے ان بنیادوں پر جو اس کے بانی نے قائم کی تھیں کالج کا وجود ہی مخدوش ہو گیا ہے اور اسی حالت کی وجہ سے بے

پبلک کے دلوں میں قدرتی طور پر اس انسٹی ٹیوشن کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔
ہز آنر نے اپنی رائے کی تائید کے لیے مواد بھی اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ فرماتے ہیں:۔
"میں نے اپنا دورہ روہیلکھنڈ اور میرٹھ ڈویژن میں جہاں بہت سے قدیم مسلمان خاندانوں کے وطن ہیں، خاص کر اس غرض سے کیا کہ اس بارے میں مسلمانوں کے خیالات معلوم کروں۔ اور میں اپنی تحقیقات کے نتیجے سے مطمئن ہوں کہ لوگوں کو یقین ہے کہ موجودہ انتظام اور بندوبست کا طریقہ کافی اور قابل اطمینان نہیں۔
میں یقین کرتا ہوں کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بالاتفاق یہ رائے ہے کہ قبل اس کے کہ کالج کی طرف سے لوگوں کو پورا پورا اعتماد اور اطمینان ہو۔ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اس کے انتظام میں بعض ضروری تغیرات عمل میں آئیں۔"
یہ صورتِ حال تھی جب نواب محسن الملک کو اپنی زندگی کا ایک تلخ فیصلہ کرنا پڑا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ نواب صاحب نے اپنی رائے پر اس لیے اصرار نہ کیا کہ وہ سیکرٹری شپ سے سبکدوش نہ ہونا چاہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر نواب صاحب اپنی خواہش نہیں بلکہ خالص قومی مصلحتوں کی بناء پر اس نازک مرحلے کے وقت کالج کی نافدائی پسند کرتے اور اردو کی حمایت سے علیحدہ ہو جاتے تب بھی وہ حق بجانب تھے۔ اس وقت اردو یا ہندی کی عام حمایت کا سوال نہ تھا بلکہ گورنمنٹ کے ایک ایسے فیصلے کی تنسیخ مدِ نظر تھی جو برسوں کے غور و فکر کے بعد صادر ہوا تھا۔ اور جس کو صوبے کے "بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں" کی حمایت حاصل تھی۔ اس مقصد میں کامیابی پہلے دن سے مشتبہ تھی۔ اس کی خاطر کالج کے وجود کو خطرے میں ڈالنا اور سر انٹونی میکڈانل جیسے "مسلمانوں کے بہی خواہ" کو "ضروری تغیرات" عمل میں لانے کا موقع دینا قومی مصلحتوں کے خلاف تھا اور اگر محسن الملک اس مشکوک الحصول مقصد کی تکمیل پر کالج کی فلاح کو ترجیح دیتے تو ان پر "کمزوری" کا الزام وہی عائد کر سکتا تھا، جو جذبات کی تسکین کو قومی بہی خواہی پر مقدم رکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر (کم از کم عمر میں ایک دفعہ!) نواب محسن الملک نے مصلحت بینی پر جذبات کو مقدم رکھا اور اردو کی حمایت سے دست بردار ہونے کے بجائے سیکرٹری شپ سے سبکدوش ہونا چاہا۔
تذکرہ محسن میں لکھا ہے:۔
"چنانچہ انھوں نے ان حالات کی نزاکت پر غور کر کے ۲۶۔ اگست ۱۹۰۰ء کو ٹرسٹیوں کے جلسے

میں سیکرٹری شپ سے استعفیٰ پیش کر دیا۔"

ہزآنر کی تسلی کے لیے اس استعفیٰ کی نقل ان کے پاس بھیجی گئی۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ایک طویل خط مورخہ ۱۰۔ اکتوبر میں دوبارہ اس روش پر ناراضگی کا اظہار کیا جو ہندی کی مخالفت میں اختیار کی گئی تھی اور خواہش ظاہر کی کہ یہ چٹھی ٹرسٹیوں کی اس کمیٹی کے سامنے پیش کی جائے" جو استعفیٰ کے متعلق فیصلہ کرے، لیکن جب ملک میں اس استعفیٰ کی خبر عام ہوئی تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ لوگوں کو احساس تھا کہ اس نازک مرحلے پر نواب محسن الملک کے کالج سے علیٰحدہ ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ چنانچہ اسلامی انجمنوں نے اس مقصد سے جلسے منعقد کیے اور استعفیٰ واپس لینے کی درخواستیں کیں۔ سرسید کے جو رفقا زندہ تھے، انھوں نے خانگی اور ضابطہ کے خطوط میں سخت اصرار کیا اور ہر قسم کا ذاتی اثر ڈالا۔ نواب وقار الملک نے اس کی واپسی پر سخت اصرار کیا۔ حالی نے نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھا۔" نواب محسن الملک کو مجبور کرنا چاہیے کہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں ورنہ پبلک میں مدرسے کی جانب سے بہت بے چینی پیدا ہو جائے گی۔

سر مزمل اللہ خاں نے تو نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں صورتِ حالات کو صاف صاف واضح کر دیا:۔

"سیکرٹری شپ کالج سے اس وقت حضور کا علیٰحدہ ہونا کالج کی موت اور قومی مصیبت ہے اور اس کا مواخذہ حضور کے اوپر خدائے ذوالجلال کے حضور میں ہوگا۔ نیز میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس وقت از خود حضور نے کالج کی سیکرٹری شپ کو چھوڑ دیا اور ہمارے اصرار و الحاح پر توجہ نہ فرمائی تو میں بھی جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دوں گا۔"

اس کے بعد نواب محسن الملک مجبور ہو گئے اور انھوں نے بقیہ میعاد تک کے لیے استعفیٰ واپس لے لیا۔ اب ناظرین خود ہی انصاف کر لیں کہ انھوں نے کس مرحلے پر ایسی" کمزوری،، دکھائی جو مولوی عبدالحق صاحب کے خیال میں" نہایت قابلِ افسوس،، ہے اور کون سا ایسا کام کیا جو ایک خوددار، فرض شناس قومی خادم کی شان سے فروتر تھا؟

مولوی صاحب یہ بھی نہیں بتاتے کہ اگر محسن الملک نے اس موقع پر کمزوری دکھائی تو قوم کے دوسرے دلیر راہنماؤں نے کیا کیا؟ نواب وقار الملک اس موقع پر زندہ اور ہر طرح فارغ البال تھے۔ گورنمنٹ کے ریزولیشن سے وہ بھی متاثر ہوئے اور ایک لحاظ سے اس کی

بنا م پر انھوں نے گذشتہ عافیت سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ وہ نواب محسن الملک کی تحریک میں شامل تھے اور لکھنؤ کے جلسے میں انھوں نے ایک پُر زور تقریر کی، لیکن کام جاری رکھنے کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ محسن الملک تو سیکرٹری شپ سے استعفٰی واپس لینے کے بعد مجبور ہو گئے تھے کہ یا تو وہ کالج کو گورنمنٹ سے جو امداد ملتی تھی اس سے ہاتھ دھوئیں یا اردو کی تحریک سے کنارہ کش ہوں، لیکن نواب وقار الملک تو ان پابندیوں سے آزاد تھے!

نواب لطف علی خاں نے اس معاملے میں جو کچھ کیا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے کئی ٹرسٹی ایسے تھے جنھوں نے ہز آنر کی آنکھیں بدلتی دیکھ کر سب الزام محسن الملک پر ڈالا اور خود کنارہ کش ہو گئے، لیکن سب سے عبرت ناک فعل سید محمود کا تھا۔ انھوں نے ان ایام میں ہز آنر سر انٹونی میکڈانل کو ایک خط لکھا، جس میں دوسری باتوں کے علاوہ ذیل کا اندراج تھا:۔

"کالج کے اصلی بہی خواہوں کے لیے یہ امر ضرور رنج و افسوس کا باعث ہوگا کہ میرے والد سر سید مرحوم کی وفات کے بعد بہت جلد کالج کے معاملات کی نوبت، جس کو پولٹیکل ایجی ٹیشنوں سے محفوظ رکھنے کے واسطے انھوں نے تمام عمر کوشش کی تھی، کیونکہ وہ خالص خیراتی اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن تھا، ادنیٰ پارٹی پالیٹکس تک پہنچ گئی۔"

یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد جب محسن الملک نے استعفٰی دیا تو اس کی واپسی پر سب سے زیادہ زور سید محمود نے دیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عام تاریک منظر میں اگر کسی شخص کا چہرہ درخشندہ نظر آتا ہے تو وہ محسن الملک کا ہے۔ ان کی طبیعت میں کمزوریاں تھیں۔ وہ مروت اور دلجوئی اور مصلحت بینی کو بعض اوقات اس حد تک بڑھا لیتے کہ یہ چیزیں بزدلی کی سرحد میں داخل ہو جائیں۔ لیکن کم از کم اس موقع پر انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو قابل افسوس ہو اور جس سے نواب محسن الملک کو شرمسار ہونا پڑے۔ سر انٹونی میکڈانل کی نگہ گرم نے اردو کی تحریک کو دنوں میں بھسم کر دیا۔ لیکن اس کش مکش کا ہندوستان کی تاریخ پر گہرا اثر ہوا۔ نواب محسن الملک تو اپنے "ہمرہانِ سست عناصر" کی کمزوری سے ایسے بد دل ہوئے کہ اب وہ قومی معاملات میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئے۔ وہ کوئی تحریک شروع کرتے وقت بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ قوم پر اس تحریک کا اور جس طریقے سے یہ کچلی گئی، یہ اثر ہوا کہ حکومت

کی طرف سے ان کے دل کھٹے ہو گئے۔ اس واقعہ سے حکومت کی وفاداری کی وہ عمارت جو سرسید نے برسوں کے بعد قوم کے دلوں میں تعمیر کی تھی، گری تو نہیں، لیکن اس میں شگاف بہت سے پڑ گئے۔

نواب محسن الملک کا دوسرا معرکہ زیادہ اہم اور زیادہ کامیاب تھا۔ جب ۱۹۰۶ء کے وسط میں مسٹر مارلے کی وہ تقریر شائع ہوئی، جس میں ہندوستان کو اصلاحات دینے کا اعلان تھا تو نواب محسن الملک فوراً مستعد ہوئے اور اس وفد کا اہتمام کیا جو لارڈ منٹو کے پاس فرقہ وارانہ انتخابات کا مسلک منوانے کے لیے حاضر ہوا۔ اس کام کے لیے انھوں نے قوم کے سر بر آوردہ ستر اراکین کو چُنا اور نواب عماد الملک بلگرامی سے اپنے مطالبات عرض داشت کی صورت میں لکھوائے وہ چاہتے تو وفد کی قیادت خود کرتے، لیکن ان کی نگاہِ انتخاب ہز ہائینس آغا خاں پر پڑی۔ یہ وفد اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد محسن الملک ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام میں کوشاں ہوئے۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بمقام ڈھاکہ مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ ہوا، جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

محسن الملک کا زمانۂ قیادت ٹھوس قومی کاموں کے لیے ممتاز ہے، لیکن ان کے حالاتِ زندگی دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انتہائی ایثار، حزم و احتیاط، راست بینی اور ٹھوس قومی خدمت کے باوجود انھیں قومی زندگی میں سکون نصیب نہیں ہوا اور کالج کی معتمدی اُن کے لیے کانٹوں کی سیج بنی رہی۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ ایک تو سید محمود، نواب وقار الملک اور دیگر با اثر ٹرسٹیوں کی مخالفانہ کوششیں۔ دوسرے حالات کی تبدیلی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج اور قوم کو جن مسائل سے واسطہ پڑا تھا، ان کے حل کرنے کے لیے انتہائی مدبر اور فہم و فراست کی ضرورت تھی، لیکن کالج کے اندر ہی ایسے نوجوان پیدا ہو گئے تھے، جو ان خوبیوں کی اہمیت نہ سمجھتے تھے اور شخصی اور جزوی شکائتوں کی بنا پر جوش میں آجاتے تھے۔ نواب محسن الملک عملی آدمی تھے اور جانتے تھے کہ خیر کثیر کی خاطر اکثر شر قلیل گوارا کرنا پڑتا ہے، لیکن نوجوانوں کے نزدیک یہ طرز عمل کمزوری پر دال تھا۔ نواب محسن الملک کمزوری کے طعنوں سے نہ ڈرے اور انھوں نے ہمیشہ وہی کیا، جسے قوم کے صحیح مفاد کے لیے ضروری سمجھتے تھے، لیکن ایک بے غرض اور حساس دل پر ان طعنوں کا جو اثر ہونا ہوگا وہ ظاہر ہے!

نواب محسن الملک کے آخری ایام علی گڑھ کالج کی سٹرائک نے بہت مکدر کر دیئے اور یہی واقعہ ان کی موت کا باعث ہوا۔ ان کی وفات ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو بمقام شملہ ہوئی۔ اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

جس سال نواب صاحب فوت ہوئے۔ اس سال کانفرنس کا اجلاس کراچی میں تھا۔ محسن الملک کے آخری ایام کی بے لطفی کا رنج سب کو تھا، لیکن ان کے علمی کارنامے دیکھ کر طبیعت کو سہارا ہوتا تھا۔ حالی نے نظم پڑھی ؂

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار!
سر کرکے مہم، قوم کے کام آگیا آخر!!

وقار الملک (۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۷ء)

نواب مشتاق حسین وقار الملک ۲۴۔ مارچ ۱۸۴۱ء کو یو۔ پی کے ایک مشہور شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھ ماہ کے تھے کہ شفقت پدری کے سایہ عاطف سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ اپنی والدہ ماجدہ کے ہی زیرِ نگرانی ایک مقامی مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں امروہہ ہی میں کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ سکول مراد آباد میں بطور استاد ملازمت اختیار کی۔ آپ کا رابطہ سر سید احمد خاں سے ابتدائی دور میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ جب سر سید احمد خاں علی گڑھ میں سب جج تھے تو نواب مشتاق حسین ان کے ریڈر تھے۔ اسی مقام سے دوستی کا آغاز ہوا۔ اور یہ دوستی تادم آخر قائم رہی۔ ترقی کرتے ہوئے وہ ۱۸۷۲ء میں تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصے میں وہ جوڈیشنل ڈیپارٹمنٹ میں سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ اس منصب پر فائز رہنے کے بعد انھوں نے حیدر آباد جانا پسند کیا جہاں انھیں جوڈیشنل منسٹر کے سیکرٹری کا عہدہ مل گیا۔ آپ ذہانت محنت، خلوص اور قابلیت کے اعتراف میں ریاست حیدر آباد کی طرف سے "وقار الملک" کا خطاب ملا۔ اسی ملازمت سے وہ ۱۸۹۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ اگرچہ وہ حیدر آباد میں تھے لیکن سر سید احمد خاں سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھا۔ اسی طرح سر سید کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع کرنے کے لیے مضامین ارسال کرتے۔ سر سید کی تحریک کو پورے حیدر آباد میں پھیلا دیا۔

انھوں نے اپنی زندگی مسلم قوم کے لیے وقف کر دی وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انھیں تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کیا جائے۔ اور ان حقوق کے حصول کے لیے ایک سیاسی پلیٹ فارم بنایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم لیگ کے قیام کے لیے تگ ودو کی۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں اس سیاسی جماعت کی تشکیل کو خوش آئند قرار دیا اور گیارہ سال تک مسلسل اس کی خدمت کرنے میں معروف رہے۔

نواب محسن الملک کے بعد علی گڑھ مسلم کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ مسلمانوں سے اتنی محبت تھی کہ وہ ہر صورت میں ان کی مدد کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے اور غیروں بالخصوص انگریزوں سے اس قدر نفرت تھی کہ انھیں اپنے قریب پسند نہ کرتے تھے۔ اسی نفرت کی بناء پر انھوں نے نہایت جراٗت مندی سے اپنے کالج سے تمام یورپین عملے کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ایک مسلم درس گاہ کو انگریز کی پلیدگی سے پاک کر دیا۔ اگرچہ وقار الملک یہ اقدام اُس وقت کے تقاضوں کے منافی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس اقدام سے مسلمانوں پر یہ امر واضح ہو گیا کہ ان کے رہنماؤں میں اب اتنی جراٗت موجود ہے وہ جابر حاکم کے سامنے حق کی آواز بلند کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ شاید وہ یورپین سٹاف کو نہ نکالتے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ طلباء کو کسی خاص نصاب کے تحت تعلیم نہیں دے رہے اور اپنی مرضی کے مطابق مضامین کی تدریس کر رہے ہیں سا انھیں اس بات میں بے قاعدگی نظر آئی۔ اس بے قاعدگی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اس سٹاف سے ایک مخصوص نصاب کے مطابق تعلیم دینے کا مطالبہ کیا لیکن اس سٹاف نے اپنی حکومت کے نشے میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بحیثیت سیکرٹری انھوں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ ایک اور جراٗت مندی کا کام وقار الملک نے یہ کیا کہ پرنسپل کے اختیارات میں کمی کر دی جس کی بناء پر کالج میں اکثریت کے عنصر کو شروع سے ہی دبا دیا گیا۔

وقار الملک کا زیادہ تر وقت وسطی ہند اور جنوبی ہند میں گذرا تھا لیکن ان کی توجہ پورے ہندوستان پر لگی رہتی تھی۔ چنانچہ تقسیم بنگال کی تنسیخ پر انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارہ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں مسلمانوں کے مستقبل کی سیاسی پالیسی کے خدوخال وضع کیے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انھوں نے کسی خوف و خطر کے بغیر اعلان کیا کہ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ وہ حکومت پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ

حکومت کیسی ہوئی جو ایک وقت کچھ فیصلہ کرے اور دوسرے وقت میں اس فیصلے کو اُلٹ کر دے۔ اس لیے مسلمانانِ ہند کو آزادی کے حصول کے لیے اپنی راہیں خود متعین کرنا پڑیں گی۔

اسی طرح ۱۹۱۲ء میں ایک مسجد کی تعمیر کرتے والے مسلمانوں پر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹیلر نے پولیس کی وساطت سے گولی چلوادی جس سے پورے علاقے میں زبردست ہنگامہ ہوگیا۔ اس واقعہ پر وقار الملک نے نہ صرف اس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹیلر سے احتجاج کیا بلکہ اس کو خط لکھ بھیجا۔

"اگر تم عزتِ تکبر میں آج مسلمانوں پر گولی چلوا سکتے ہو تو کل پولیس کا ایک معمولی تھانیدار بھی ٹاملر بن کر ایسے مکروہ اقدام کر سکتا ہے۔"

وقار الملک سر سید احمد خاں کی طرح گرم مزاج اور کھرے آدمی تھے اور انھوں نے راست گوئی میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو منہدم کر دیا۔ اور انگریزوں کو اس مقام کی اطلاع دی جو مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے لیے تھا۔

وہ سر سید اور محسن الملک کے ذاتی دوست ہونے کی وجہ سے ایک ایسے ماحول کے روشن چراغ تھے جس میں ہر وقت نور ہی نور برستا تھا۔ وہ اس محفل کے رکن تھے جہاں ہر وقت ذکر آزادی ہوتا تھا وہ ایسے ملک کے باشندے تھے جہاں کے مسلمانوں کو ان کی ماہیت کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ ایسی سیاسی جماعت کے رکن تھے جو ان کی وفات کے تیس سال بعد ہی ایک عظیم مملکت تشکیل دیتے میں کامیاب ہوگئی اور اس مملکت کا نام پاکستان رکھا گیا۔

تحریک آزادی کا یہ مجاہد اور شمع آزادی کا یہ پروانہ بالآخر ۲۷/جنوری ۱۹۱۷ء کو راہی ملک عدم ہوگیا۔ نواب وقار الملک کو ان کے آبائی شہر "امروہہ" ہی میں دفن کیا گیا۔

محسن الملک اور وقار الملک کی طبیعتوں میں جو فرق تھا، اس کا اندازہ ان کی تصویریں دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ ایک کی تصویر سے ذہانت، ملائمت اور دور بینی ٹپکتی ہے۔ دوسرے کے چہرے پر ہیبت، رعب اور وقار برستا ہے۔ ایک میں شان جمالی جلوہ گر ہے۔ دوسرے میں شان جلالی ایک قوم کا محسن ہے۔ دوسرا سراپا وقار۔ ان دونوں بزرگوں کا اختلاف طبائع اور اختلاف مسلک اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ یہ امر ہی حیرت انگیز ہے کہ وہ دونوں مل کر کام کر سکے۔ ان

کے درمیان قیام حیدرآباد کے دوران میں جو چپقلش ہوئی اور جو خطوط دونوں طرف سے لکھے گئے، وہ دونوں کے لیے افسوس ناک تھے، لیکن ان دونوں پر آفرین کہنا چاہیے کہ اپنی پرانی مخالفت بھلا کر قومی کاموں میں دل و جان سے شریک ہوئے اور اگرچہ ان میں بعض اختلافات رہے لیکن اس سے قومی کاموں کی کوئی ضعف نہ پہنچا۔

نواب وقار الملک فقط ساڑھے چار سال کالج کے سیکرٹری رہے، لیکن ان کا زمانہ قیادت دو باتوں کے لیے یادگار ہے۔ ایک تو انھوں نے پرنسپل کے بڑھے ہوئے اختیارات کو محدود کیا اور دوسرے انھوں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے بعد، "ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ حالت"، پر وہ پرُ جوش مضمون لکھا، جو مسلمانوں کی آئندہ پالیسی کا سنگ بنیاد بنا۔ اس مضمون میں انھوں نے زور کے ساتھ کانگرس کے متعلق سرسیّد کی پالیسی کی تائید کی، لیکن ایک اور نئی بات بھی اسی طرح زور سے کہی:۔

> "یہ آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے، یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسا کرنا چاہیئے، لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیے وہ ہماری قوتِ بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابلِ احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے۔"

اس مضمون پر دو طرفوں سے نکتہ چینی ہوئی۔ اینگلو انڈین اخبارات نے تو اسے مسلمانوں کی قدیم وفاداری کی پالیسی سے انحراف سمجھ کر اس پر سختی سے نکتہ چینی کی اور مولانا شبلی نے چند مہینے بعد، ایک اہم سلسلۂ مضامین کی اس "غلط منطق"، پر اعتراض کیا کہ "ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائے گی، جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں"۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی علامہ شبلی کا ساتھ دیا۔ لیکن وقتی رجحانات اور چند بزرگوں کے اختلاف کے باوجود شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ قوم نے عام طور پر وہی راستہ اختیار کیا، جو نواب وقار الملک نے علی گڑھ گزٹ میں دکھایا تھا۔ اور نواب صاحب کی رائے غلط ہو یا صحیح، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے اس مضمون کو مسلمانوں کی ملکی تاریخ میں بڑی

اہمیت حاصل ہے۔

نواب محسن الملک کی گدی پر وقار الملک بیٹھے تھے، لیکن محسن الملک کے معتدلانہ مسلک کو جاری رکھنے والے دو شخص تھے۔ کالج کے اندر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور کالج کے باہر ہز ہائینس آغا خاں۔ آج اس اہمیت کا اندازہ لگانا دشوار ہے جو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک ہز ہائینس کو حاصل تھی۔ نہ صرف مسلم یونیورسٹی کی بنا میں سب سے زیادہ ٹھوس کام انھی کا تھا بلکہ بہت سی دوسری قومی تحریکیں مثلاً ندوہ، لیگ ان سے فیضیاب تھیں۔ مولانا شبلی ہز ہائینس سے اختلافات کے باوجود ۱۹۱۲ء کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"سر آغا خاں نے یونیورسٹی کے معاملہ میں وہ کام کیا، جو آج تک سات کروڑ مسلمانوں سے نہ ہو سکا۔ اور غالباً کبھی نہ ہو سکتا۔ انھوں نے قومی انسٹی ٹیوشن پر فیاضی کا مینہ برسا دیا۔ اسی بنا پر وہ ہمارے محسن ہیں۔ اور ہم کو ان کا احسان ماننا چاہیئے۔ قومی مجالس میں ان کی فیاضیوں اور کوششوں کا ترانہ گانا چاہیئے۔ قومی تاریخ میں ان کا نام سب سے اوپر لکھنا چاہیئے"۔ لیکن ......

ہز ہائینس مدت دراز تک خرابیٔ صحت کی بناء پر جنوبی فرانس میں مقیم رہے۔ قومی معاملات میں ان کا عمل دخل کم ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی کئی اہم مرحلوں (مثلاً آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی بنا اور گول میز کانفرنس کے انعقاد) پر قومی قیادت کا بار ان کے کندھے پر ڈالا گیا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اگست ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند کی کونسل کے رکن ہو کر لندن چلے گئے۔ ان کے بعد قابلِ ذکر نام ڈاکٹر ضیاء الدین کا ہے، جو ۱۹۱۹ء کے آغاز میں مشروط طور پر پرنسپل مقرر ہوئے۔ ان میں کئی ایک کمزوریاں تھیں، لیکن انھوں نے ایک نازک مرحلے پر بڑا کام کیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقا نے تحریک عدم تعاون کے دنوں میں علی گڑھ پر ہلّہ بولا تو ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بہت سے لوگ، جو اس زمانے میں انھیں غدارِ ملّت کہتے تھے، بعد میں خوش تھے کہ کامیابی مولانا محمد علی کو نہیں ہوئی بلکہ ان کے مخالفین کو۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کے دورِ تسلط میں علی گڑھ کالج کے طلباء نے تحریکِ پاکستان میں قابلِ ذکر حصہ لیا۔ ان کی وفات دسمبر ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔

نواب وقار الملک کی جگہ نواب محمد اسحٰق سیکرٹری منتخب ہوئے، لیکن ان کے اصل جانشین

مولانا محمد علی تھے۔ جب محسن الملک نے وفات پائی تو مولانا نے جن الفاظ میں وقار الملک کی جانشینی کی تائید کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں کی تھی۔ ان سے "رئیس الاحرار" کی عقیدت و ارادت کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"ہم سے جس وقت کہا جائے کہ فلاں کام کرو۔ ہم اس وقت جواب دیں۔ نواب وقار الملک سے پوچھو۔ ہم سے کہا جائے کہ نیشنل کانگریس میں شریک ہو جاؤ۔ ہم جواب دیں ان سے پوچھو۔ ہم سے کہا جائے کہ قومی حقوق اور فوائد کے لیے فلاں تدبیر مناسب ہے۔ ہم کہیں کہ ان سے دریافت کرو۔ صاحبو ہمارے کان یہ ہیں۔ ہمارا دل یہ ہیں۔ ہماری آواز یہ ہیں۔ غرض جو کچھ کرو، ان سے پوچھ کر کرو۔"

جب نواب وقار الملک نے وفات پائی تو مولانا نظر بند تھے۔ انھوں نے اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے چھندواڑہ سے تار دیا:۔

"ہندوستان اپنے فرزند بزرگ سے اور ہم اپنے باپ سے محروم ہو گئے۔ خدا ہماری مدد کرے۔"

مولانا محمد علی نے نواب وقار الملک کا طریق جاری رکھا۔ وہ نواب صاحب کی طرح بیرون ہند کے معاملات میں شبلی اور ابوالکلام کے رفیق کار تھے اور اندرون ہند کے مسائل میں سرسید کے پیرو، لیکن ان کے زمانے میں حالات کچھ ایسے تھے کہ اسلامی ہندوستان کی نظریں باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں اور مولانا کو سرسید کی پیروی کا بہت کم موقع ملا۔ علی برادران نہ صرف وقار الملک کے مسلک پر عامل تھے بلکہ اس مرد مومن کی سادگی، وقار اور قوت ایمانی نے ان کی زندگیوں اور طریق معاشرت میں بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ہم نواب وقار الملک کے متعلق اس تبصرہ کو مولانا شوکت علی کے ایک خط کے اقتباس سے ختم کرتے ہیں:۔

"ہم لوگوں کی مادہ پرست اور فوق البھڑک زندگیوں میں جو انقلاب نظر آتا ہے، اس کو پیدا کرنے والی نواب صاحب مرحوم کی سادہ اسلامی زندگی کی مثال تھی۔ جو احسانات نواب صاحب مرحوم نے ہم نوجوان مسلمانوں پر کیے، اس کا اجر تو خدا سے ان کو ضرور ملے گا۔ ان کی زندگی نے اسلامی عصمت کا سکہ ہمارے دلوں میں بٹھا دیا اور ہم کو دکھا دیا کہ اس بیسویں صدی میں بھی

مسلمان آسانی کے ساتھ دینی اور اسلامی زندگی بسر کر کے قوم اور ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی ہندوستان کے سیاستدانوں میں ایک مقتدر مقام رکھتے تھے۔ ان جیسا عظیم محب وطن شاید ہی کسی ماں نے جنا ہو۔ ۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں ایک آزاد انسان کی حیثیت سے اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اسے قبول نہیں کرتے تو تمہیں مجھے یہیں پر قبر کے لیے جگہ دینی ہوگی۔"

ان کے یہ الفاظ سچے ثابت ہوئے اور چند ہی ہفتے بعد ان کا لندن میں انتقال ہو گیا ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور ان میں انگریزوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا کرنے میں مولانا محمد علی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی فرنگی حکومت کے ساتھ تعاون کی پالیسی کے ردِ عمل کے طور پر مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نابغۂ روزگار لوگ میدان سیاست میں اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کا نعرہ لے کر میدان میں آئے اور مسلمانوں میں خلافت کے احیاء کے لیے جدوجہد کا جذبہ بیدار کیا۔

آپ ۱۸۷۸ء میں رام پور کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر ابھی دو سال تھی جب آپ کے والد عبدالعلی خاں فوت ہو گئے۔ ان کی والدہ عابدہ بانو نے جو ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں انھیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے پہلے بریلی اور پھر علی گڑھ بھیجا۔ وہاں پر مولانا محمد علی ادبی حلقوں میں جلد ہی بہت مقبول ہو گئے۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے اہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ اور جلد ہی ایک اچھے طالب علم، شاعر، مقرر اور ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

۱۸۹۶ء میں جب ان کی عمر ۱۸ سال کی ہوئی انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ سجاد حیدر یلدرم کے کہنے کے مطابق مولانا محمد علی کے

یونیورسٹی سے جانے کے بعد انگریزوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کالج کے مباحثوں اور مذاکروں میں ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر ان کی بیباکانہ رائے انگریز پروفیسروں کو خوفزدہ کردیتی تھی۔ انگلستان میں وہ ۴ سال تک لنکن کالج میں رہے اور تاریخ جدید میں بی۔ اے۔ آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ انھیں کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی مجلس کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا برطانیہ سے واپسی کے بعد مولانا محمد علی ریاست رام پور میں چیف ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن جلد ہی خاطر خواہ تعلیمی اصلاحات کے نفاذ پر ان کا افسران اعلیٰ سے اختلاف ہو گیا۔ اور انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر ریاست بڑودہ کی سول سروس میں ملازمت اختیار کرلی۔ وہاں وہ سات سال تک رہے۔ وہاں رہ کر انھوں نے "ٹائمز آف انڈیا" میں بہت سے مضامین لکھے۔ اور ان کا ایک مضمون " موجودہ بے چینی کے اسباب " بہت مقبول ہوا۔ ان کی متانت اور سیماب صفت شخصیت سول سروس کے قیود کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ قدرت نے انھیں کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا تھا۔ ہندوستانیوں کی غربت اور مسائل نے اُن کے دل و دماغ میں آگ لگادی۔ انھوں نے اپنی ملازمت چھوڑدی اور جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں آکر اپنا رسالہ ہفت روزہ "کامریڈ" نکالنا شروع کردیا۔ انھیں ہندوستان کی ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اس حکم نامے کو اس وقت تک نہ پڑھا جب تک کہ ان کے رسالے "کامریڈ" کا پہلا شمارہ منظر عام پر نہ آگیا۔

بطورِ صحافی

مولانا محمد علی ایک مثالی صحافی تھے۔ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ظالمانہ صحافتی قوانین کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے رسالے کامریڈ نے آزادی صحافت کی ایک عمدہ مثال پیش کی۔ اپنے بیباک رویے اور عمدہ زبان کی وجہ سے کامریڈ رسالہ چھوٹے بڑے تمام حلقوں میں جلد ہی بہت مقبول ہو گیا۔ یو۔ پی کا ایک سابق گورنر اس کی جلدیں اپنے ساتھ انگلینڈ بھی لے گیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے حکومت کے زیادہ سے زیادہ خلاف ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں جب ترکیہ کو پہلی جنگ عظیم میں ملوث کر لیا گیا تو مولانا نے ۴۰ گھنٹے کی مسلسل نشست کے بعد مشہور زمانہ اداریہ "THE CHOICE OF THE TURK" (ترکوں کا فیصلہ) لکھا جو کہ اسی عنوان کے تحت لندن ٹائمز میں لکھے گئے اداریے کے جواب میں تھا۔ حکومت نے اسے خطرناک قرار دے کر اس

کی ضمانت ضبط کر لی۔

۱۹۱۱ء میں جب دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو مولانا نے بھی ۱۹۱۲ء میں کامریڈ کو دہلی میں منتقل کر دیا۔ اس نے مولانا آزاد کے "الہلال" اور مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۱۲ء میں دہلی سے ایک اردو روزنامہ "ہمدرد" بھی جاری کیا۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے۔ یہ وہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے اپنے بارے میں چھوڑی ہے۔ اس میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر انھیں سیاست کی جانب مائل ہونا پڑا۔ بالعموم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کے لیے تیار کرنے میں مولانا نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ ان کی بے مثال قیادت میں مسلمان ایک عظیم قوم بن گئے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لیے بہت محبت تھی۔ ۱۹۰۶ء میں جب ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو محسن الملک اور وقارالملک کے ساتھ وہ بھی موجود تھے۔

سیاست میں مولانا محمد علی جوہر کا کردار

۱۹۱۲ء جنگ بلقان کا اعلان ہوا اور یورپی طاقتیں ترکیہ کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں تو انھوں نے ترکیہ کی امداد کے لیے چندے کی اپیلیں کیں اور طبی وفد ترکیہ بھیجا یہ خیر سگالی کا پہلا وفد تھا جو ملک سے باہر بھیجا گیا اس سے ترکوں پر اچھا اثر ہوا۔ ترکوں کے لیے چلائی جانے والی تحریک نے ہندوستان میں تحریک اتحاد عالم اسلام کے لیے راہ ہموار کی۔

۱۹۱۳ء میں جب مچھلی بازار کانپور میں فائرنگ ہوئی تو اس سے پورے ہندوستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ محمد علی جیسا حساس انسان اس سانحے کو برداشت نہ کر سکا۔ اور آپ نے مسلم لیگ کے سیکرٹری سید وزیر علی کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے کانپور کے مسئلے کے عزت مندانہ حل کے لیے بھرپور کوششیں کیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اس کے واپس آنے کے چند ہی مہینوں بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی ترکیہ جرمنوں کا حلیف تھا۔ اور محمد علی ترکیہ کے متعلق انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

جنگ کے دوران برطانوی حکمران محمد علی جیسے بہادر اور بااثر نقاد کو گوارا نہیں کر سکتے

تھے۔ لہٰذا انھیں پانچ سال کے لیے (۱۹۱۵ تا ۱۹۱۹ء) جیل بھیج دیا گیا جب ۱۹۱۹ء میں وہ رہا ہوئے تو بین الاقوامی افق پر بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور ترک معاہدہ ورسائی کے تلے دبے جا رہے تھے۔ اور ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج تو اسے دنیا کے نقشے سے مٹا دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا اس سے ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا گیا جس کے دوران جلیاں والا باغ کا خوف ناک واقعہ پیش آیا آپ نے ترکوں کے لیے امداد کی جو اپیل کی اس کا انقلابی ردعمل ہوا ہندوستان کے ہر مرد اور عورت نے اس میں اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لیا۔ اس نے کانگریس کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ ترکیہ کے معاملے میں مسلمانوں کا ساتھ دے اور مولانا کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جلیاں والے باغ کے حادثے اور خلافت کی عدم بحالی کے بعد ۱۹۲۱ء میں کانگرس نے ناگ پور میں عدم تعاون تحریک کی قرارداد پاس کی ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک انھوں نے ہندوستان کے طوفانی دورے کیے اور اپنے دن رات ریلوے کے ڈبوں میں گذارے ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس ہوئی جس میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ برطانوی حکومت میں نوکری کرنا مسلمانوں کے لیے حرام اور ناجائز ہے۔ اس پر ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور حسین احمد مدنی پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں دو دو سال کے لیے قید سخت کی سزا ہوئی اس سزا کے خلاف پورے ہندوستان میں مظاہرے ہوئے" وہ ابھی جیل ہی میں تھے کہ مصطفیٰ کمال نے ترکیہ میں خلافت ختم کردی جس سے ہندوستان میں بھی تحریک خلافت دب کر رہ گئی۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی جوہر جیل سے رہا ہوئے اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر نامزد ہوئے ۲۴-۱۹۲۳ء میں پنڈت مدن موہن مالدیہ وائسرائے کے ساتھ ساز باز کر کے جیل سے رہا ہو گئے اور انھوں نے سوامی شردھانند کے ساتھ مل کر شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دیں جس سے پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اس سے علی برادری کی شبانہ روز کوششوں کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کا محل مسمار ہو گیا۔ محمد علی جوہر نے ان فسادات کو روکنے کی از حد کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

وہ ایک سچے مسلمان تھے ۱۹۲۷ء میں انھوں نے موتمر عالم اسلامی شرکت کی۔ یہ کانفرنس سلطان ابن سعود نے مکہ میں بلائی تھی۔ وہاں جب سبھی پر جلال بادشاہ کے سامنے سہمے

بیٹھے تھے مولانا محمد علی نے بے باکانہ اظہار کیا تجاویز دہلی کی تیاری میں انھوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کی مدد کی جس میں دوسرے مطالبات کے علاوہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہندو مسلم اتحاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء کلکتہ میں جو آل پارٹیز کانفرنس ہوئی اس میں مولانا نے مصالحت کی از حد کوشش کی مگر انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۶ سال کی طویل جدوجہد کے بعد انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی راہ عمل کو تبدیل کر لیا۔ اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی ان کا دل ٹوٹ چکا تھا اور وہ مایوسیوں کا شکار ہو گئے تھے۔

وہ ۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوئے اور وہیں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وفات پائی اور بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے زیر سایہ دفن ہوئے۔

مولانا ظفر علی خاں

جذبۂ توحید سے سرشار، سردارِ دوجہاں کے جانثار، مسلمانانِ عالم کے غمگسار۔ دنیائے سیاست کے شہسوار، روزنامہ "زمیندار"، کے قلم کار، مولانا ظفر علی خاں ان مشاہیر اسلام میں سے تھے۔ جنہوں نے تن۔من۔دھن، دین کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال سے پانچ سال قبل ۱۸۷۳ء میں ان کے مولد سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ میرتھ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر سید محمود، مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر سید حسن بلگرامی، نواب عماد الملک، نواب وقار الملک، نواب مرزا خاں داغ دہلوی، مولوی محفوظ علی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صحبت پائی۔ ابتداً آپ نواب محسن الملک کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ وہاں سے حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ پہنچے اور ترقی کرتے کرتے اس کے اسسٹنٹ رجسٹرار ہوئے۔ وہاں سے میر عثمان علی خاں کے اتالیق بنے۔ پھر ہوم سیکرٹری کے منصب جلیلہ پر

فائز ہوئے۔ لیکن اس آزاد مرد کو یہ ملازمتیں اور یہ نوکریاں راس نہ آئیں اور آپ نے واپس وطن کی راہ لی۔

گھر پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد منشی سراج دین احمد نے وزیر آباد سے ہفت روزہ "زمیندار" نکال رکھا ہے۔ آپ نے اس کی ادارت کے فرائض سنبھال لیے اور اسے وزیر آباد سے لاہور لے آئے۔ جہاں جنگ طرابلس و بلقان کی خبروں نے اسے ہفت روزہ سے روزنامہ بنا دیا اور بہت جلد یہ اخبار میدان صحافت پر چھا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں کی منظومات، مقالات اور مکاتمات نے "زمیندار" کو اچھالا۔ اور "زمیندار" نے مولانا ظفر علی خاں کو بام شہرت پر پہنچایا۔

میدانِ سیاست و صحافت میں

مولانا ظفر علی خاں جس دور میں پیدا ہوئے وہ اس برصغیر میں ایک مہیب ذلت و ادبار کا دور تھا۔ فرنگی اپنی پوری قہرمانیوں کے ساتھ پورے عروج پر تھا۔ مشرق وسطیٰ میں اس کے پنجے آگے بڑھ رہے تھے اور اپنی گرفت مضبوط کر رہے تھے۔ برعظیم کا ہر تعلیم یافتہ فرد اِلّاماشاءاللہ غیر ملکی اقتدار سے لازوال وابستگی کو سرخروئی کا سامان سمجھتا تھا۔ مغربی تہذیب موج در موج اس خطۂ اراضی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سیاسی محکومیت کے ساتھ ساتھ ذہنی مرعوبیت بھی آ گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں ان ناموافق حالات اور ناموزوں فضا میں دندناتے ہوئے میدانِ عمل میں نکلے۔ انھوں نے ایک ایسے وقت میں جب کہ بقول اکرام قمر:۔

"ذہنوں پر غیر ملکی مرعوبیت بڑی سرعت سے طاری ہو رہی تھی اور اس کی پشت پر غیر ملکی اقتدار کی سب قوتیں اور انعامات کار فرما تھے۔ اس دور میں غیر ملکی تہذیب کو روکنا اور للکارنا بڑے دل گردے کا کام تھا ظفر علی خاں نے اسی تہذیب مغربی کے منہ پر تھپڑ بھی رسید کیا اور اسے حرام زادی بھی کہا۔ اگر ظفر علی خاں اور ان کے ہم عصر ہم نوا، عوام میں تہذیب مغربی سے نفرت پیدا نہ کرتے تو پاکستان کی تحریک کے لیے زمین ہی ہموار نہ ہو پاتی۔ ان راہنماؤں نے ایسا ذہن تیار کیا جس نے پاکستان کا تصور نہایت آسانی کے ساتھ قبول کر لیا"

تحریکِ خلافت کے آغاز سے لے کر مقامِ پاکستان تک کانگرس۔ احرار۔ نیشنلسٹ۔ نیلی پوش۔ خاکسار۔ اتحادِ ملت اور مسلم لیگ وغیرہ جتنی بھی جماعتیں میدانِ عمل میں آئیں۔ مولانا ان سب میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے اپنے سینہ اور سفینہ دونوں سے ہر ایک کی مدد کی۔ ان کے ہنگامی دور کی تحریروں اور تقریروں کا جائزہ لینے سے بآسانی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر تحریک کے روحِ رواں رہے۔ مگر کہیں استقلال کے ساتھ ٹھہر نہ سکے۔

اس مرحلے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے مولانا ظفر علی خاں ایسا مخلص رہنما اور نڈر سیاست دان ان معرکوں سے کنارہ کش ہو جاتا تھا۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ان سیاسی لکھاروں میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ جو توحید پرستی اور رسول دوستی کے منافی ہوتی ہیں، اور ان کی وجہ سے بعض حساس مسلمان ان سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں جسے حق پر پاتے۔ اس پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے اور اس کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ لیکن اگر کسی سے کوئی ناحق بات سرزد ہو جاتی تو ؎

چل مرے خانہ بسم اللہ

کہہ کر اس کے پیچھے رہوارِ قلم دوڑاتے۔ اسے دستارِ فضیلت سے پکڑ کر چاروں شانے چت گراتے اور یہ قطعاً نہ دیکھتے کہ وہ مسٹر گاندھی ہیں یا جواہر لال نہرو۔ ابو الکلام آزاد ہیں یا مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ اقبال ہیں یا قائدِ اعظم! ان کی شان میں مولانا کے کلام میں جہاں مدحیہ اشعار کی کمی نہیں۔ وہاں ہجویہ اشعار بھی موجود ہیں۔ ان کے حق کوش قلم نے اس معاملہ میں نہ عمر بھر کے دوستوں کو معاف کیا۔ نہ رفیقوں کو۔ نہ تخت نشینوں کو چھوڑا نہ گوشہ نشینوں کو۔ نہ کسی فرد کی رعایت کی۔ نہ کسی جماعت کی۔ نہ اپنوں کی کاسہ لیسی کو برداشت کیا نہ غیروں کی ڈپلومیسی کو۔ نہ مہاشوں کے بنیاپن کو بخشا۔ نہ قادیانیوں کی نبوت سازی کو۔ یہاں تک کہ اگر لالے (ہندو) زیرِ قلم آئے تو ل کو بھی نہ چھوڑا ؎

پوچھا جو میں نے لالہ لال ٹین کہاں گئی ۔۔۔ نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی پچو گئی!

قومی شاعر

جنگِ آزادی کے ساتھ ساتھ قومی شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ "قومی شاعری کے سو سال" میں ان کو چھ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے ۱۸۵۷ء سے

۱۹۱۴ء تک، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک، ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک، ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۱ء تک، ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک۔ یہ گویا جنگِ آزادی کی چھ منزلیں ہیں جن سے ہم گذر کر اس مقام تک پہنچے ہیں ان ادوار کے قومی شاعروں کی طویل فہرست پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اگرچہ مولانا ظفر علی خاں سے بعد میں آئے لیکن قومی شاعری میں انھوں نے ان سے پہلے قدم رکھا۔ ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت اور نیا شوالہ علامہ اقبال کی پہلے دور کی تخلیق ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں دوسرے دور میں یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء میں قومی شاعری کے میدان میں نمودار ہوئے۔ اس دور کی آپ کی چار نظمیں "مارشل لا" "فریادِ جرس"، "فانوسِ ہند کا شعلہ"، اور "ہندوستان"، مشہور ہیں۔ لیکن قومی شاعروں کی طویل فہرست میں مولانا ظفر علی خاں اس لحاظ سے سرِفہرست ہیں کہ:۔

(۱) انھوں نے حق گوئی اور حق کوشی کی پاداش میں سب سے زیادہ قید کاٹی جس کا مجموعہ بارہ سال ہوتا ہے۔

(۲) ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے زیادہ جرمانہ ادا کیا۔

(۳) ان کا موقر جریدہ "زمیندار"، قریباً پندرہ دفعہ بحکم سرکار ضبط ہوا۔

(۴) ان کی دو سو کے قریب نظمیں ضبط ہوئیں۔ جو ان کے مطبوعہ مجموعہ بہارستان۔ چمنستان۔ نگارستان۔ حبسیات اور ارمغان قادیان میں موجود ہیں۔

(۵) ان کے کئی پریس ضبط ہوئے۔ مگر دنیا کی کوئی طاقت انھیں حق گوئی سے باز نہ رکھ سکی۔

آپ جب بھی کوئی سیاسی نظم کہتے۔ ایوان حکومت میں زلزلہ آجاتا۔ دہلی کے وائسرائے اینگل لاج سے لے کر لندن کی ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ تک کے ارباب اختیار تھرا اُٹھتے۔ آپ کا ایک ایک شعر قصرِ افرنگ کے لیے ایٹم بم ثابت ہوتا۔ مولانا کے صرف اس شعر سے ؎

چار چیز است تحفۂ لندن
خمر و خنزیر و زر و زن

لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر دماغی توازن کھو بیٹھا اور اس نے "زمیندار"، کا دس ہزار روپیہ زرِ ضمانت بمعہ پریس ضبط کر لیا۔ یکے بعد دیگرے ضبطیوں۔ قرقیوں کی کچھ ایسی آندھی چلی کہ مولانا کو نومبر ۱۹۲۷ء میں فی البدیہہ کہنا پڑا ؎

دل ضبط، زبان ضبط، فغان ضبط، قلم ضبط
دنیا میں ہوئے ہوں گے۔ یہ سامان کہیں ضبط
برطانیہ کا شیوہ رہا گر یہی۔ کچھ روز
سن لوگے۔ عزیزو کہ ہوئے دیر و حرم ضبط

ضبطیوں کا یہ طوفان جب ۱۹۳۲ء تک نہ تھما تو آپ نے پھر یہ نظم لکھ ماری:۔

دل ضبط۔ جگر ضبط۔ زباں ضبط۔ فغاں ضبط
سب سازِ عیاں ضبط۔ سب سوزِ نہاں ضبط

مظلوم کو فریاد بھی کرنے نہیں دیتے !!
ڈر ہے کہ نہ ہو جائے یہ سب امن و اماں ضبط

اٹھتی ہے جو سینہ سے۔ تو ہو جاتی ہے ضبط آہ
آئے جو ذہن پر۔ وہیں ہوتا ہے گماں ضبط

روکیں کیوں وہ میرے مضمون کی روانی
تنکے سے بھی ہوتا ہے کہیں سیل رواں ضبط

وہ ضبط کریں میری دوات اور قلم کو
ہو جائیں گے تو دان کے تفنگ اور سناں ضبط

تم ضبط "زمیندار" کے نمبر نہیں کرتے
کرتے ہو حقیقت میں محمدؐ کا نشاں ضبط

بس اس کا چھپنا تھا کہ نظم بھی ضبط اور پریس بھی ضبط۔

کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ پنجاب کا خونخوار گورنر سر مائیکل اڈوائر جس نے جلیانوالہ باغ میں گولی چلوا کر سینکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ لیکن جو ضبطیوں، قرقیوں اور نظر بندیوں کے باوجود مولانا کی آوازِ حق کو نہ دبا سکا۔ آپ کے متعلق ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی (جوہر) ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لے کر نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی عام منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا لازمی ہے۔ سرکاری طور پر اپنے ماتحت حکام کے نام یہ ہدایت

جاری کرنے کے علاوہ سر مائیکل اڈوائر نے مولانا کا جو "ہسٹری شیٹ،، تیار کیا اس میں آپ لکھتے ہیں:۔

" اسلام ازم پر اعتقاد رکھنے والے طبقے کا ترجمان، ایک آتش بار اخبار زمیندار ہے۔ جس کا ایڈیٹر ایک آتش مزاج رسوائے عالم ظفر علی خان تھا۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں ترکوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا یہ رقم پیش کرنے کے لیے خود ترکی گیا۔ ترکی سے واپسی کے بعد اس کا اندازِ بیاں اور سخت ہو گیا۔ کئی بار پریس ایکٹ کے تحت اس کی ضمانت ضبط کی گئی۔ متعدد بار تنبیہہ سے کام لیا گیا۔ مگر "زمیندار،، پھر نکلا۔ اندازِ بیاں پہلے سے زیادہ شوخ اور باغیانہ تھا۔ اسی لیے اس بناء پر اس کی ضمانت کے ساتھ پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ اس نے اسلامی اتحاد کے علمبردار طبقہ سے عرب۔ ترکی۔ جرمنی اور افغانستان کے ساتھ سازشیں جاری رکھیں اور مسلمانوں میں بغاوت پھیلانے اور فوجوں میں غدر کرانے کی کوشش کی۔ جب تمام منصوبے ناکام ہو گئے۔ تو ہندوؤں کے ساتھ مل کر برطانوی اقتدار کو زک پہنچانے کی سر توڑ کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں پنجاب اور ۱۹۲۱ء میں موپلوں کی بغاوت اس کی کوششوں کے منظاہرے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ظفر علی خاں کو اس کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ مگر نظر بندی سے رہائی پاتے ہی اس نے پھر پرانی روش اختیار کر لی۔ ۱۹۲۰ء میں اسے بغاوت کے الزام میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی"

ملک میں جن دنوں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا اور بڑے بڑے علماء فضلا۔ سخندان و سخنور کانگرسی سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے تھے۔ اور اسلام سے دور ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم کانگریس کے عشق میں یہ نعرے لگا رہے تھے:۔

" ہم پہلے کانگریسی ہیں اور پھر مسلمان "

تو مولانا ظفر علی خاں نے فوراً یہ نعرہ بلند کیا کہ:۔

" میں سب سے پہلے مسلمان اور پھر کچھ اور!"

یہ تھی قوتِ ایمانی کہ جوش کے عالم میں بھی ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ مولانا کی اسلام دوستی اور انگریز دشمنی کا آغاز اسی دن سے ہو گیا تھا۔ جس دن آپ نے میدان صحافت وسیاست میں قدم رکھا تھا۔ چونکہ آپ انگریز کو اسلام کا ازلی دشمن سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ اس کے ناپاک قدم سے اپنے وطن کی سرزمین کو پاک کرنے کے لیے روز اول سے اس کے خلاف صف آرا تھے۔ ان کے دم قدم نے ان کے لوح وقلم نے پاکستان کی تعمیر کے لیے جتنا کام کیا۔ اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے۔ سرسید احمد خاں نے اپنی فکر وبصیرت سے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ ہونے کا جو مشورہ دیا تھا۔ وہ علی گڑھ کے اس فرزند نے بھی قبول کیا۔ قائدِ اعظم اور مولانا محمد علی جوہر کی طرح آپ نے بھی کانگرس سے علیحدگی اختیار کی۔ مگر جتنا عرصہ کانگریس کے ساتھ رہے۔ اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ کیونکہ یہ آپ کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جس تحریک میں شامل ہوتے! اس کا پورا پورا ساتھ دیتے۔ مسلم لیگ کے بھی آپ بہت کام آئے۔ طبعاً چونکہ انتہا پسند تھے اس لیے کئی بار ان سے قائدِ اعظم اور مولانا حسرت موہانی کا اختلاف پیدا ہوا۔ مگر اس کے باوجود قائدِ اعظم آپ کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کی وطن دوستی اور انگریز دشمنی شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ اور آپ راہِ حق میں گھر بار لٹانے اور سر کٹانے کے لیے سب سے پیش پیش رہتے تھے اور ہر وقت یہ دہائی دیتے رہتے تھے ؎

تجھے کیا بتاؤں ہم نشین مرے غم کا قصہ طویل ہے
میرے گھر کی لٹ گئی آبرو ہوا جب سے غیر دخیل ہے

پیشین گوئیاں

مولانا ظفر علی خاں کی نظر بڑی دور رس تھی۔ آپ کو حکومت برطانیہ کا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ کہ جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اب خود اس کے اقتدار کا سورج ڈوبنے والا ہے اور متحدہ ہندوستان کی سونے کی چڑیا اب اسکے پنجے سے چھٹکارا حاصل کرنے والی ہے جسکا آپنے اپنے متعدد اشعار میں برملا اظہار کیا مثلاً۔

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالنے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہے جن کو ٹکرانا
مکافاتِ عمل سے گر یہ غافل ہیں تو بے شک ہوں
ہمارا کام ہے نیک اور بد کا ان کو سمجھانا

جب گوجرانوالہ ستیہ گرہ کانفرنس میں تقریر کرنے کی پاداش میں آپ کو دو سال کی قید بامشقت دی گئی تو آپ نے برطانوی حکومت کے متعلق یوں پیشین گوئی کی:۔

قسم ہے جذبۂ حب وطن کی بے پناہی کی — ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ نہیں سکتا

ہمیں زندان میں بھجواؤ یا ہم پھانسی پہ لٹکاؤ — مگر قائم تمہارا یہ نظام اب رہ نہیں سکتا

ہم اپنے عزم کے سانچے میں تقدیروں کو ڈھال لیتے — مسلط گردنِ مشرق پہ شام اب رہ نہیں سکتا

پشاور کی شہادت گاہ سے پیغام آیا ہے — کہ بن جھکے مسلمانوں کا نام اب رہ نہیں سکتا

چنانچہ اب خدا کے فضل سے مسلمانوں کا ستارہ پھر بام عروج پر پہنچا جاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مغربی دنیا لرزہ براندام ہو رہی ہے۔ اور وسیع برطانوی سلطنت سمٹ کر اب صرف جزیرہ برطانیہ تک محدود رہ گئی ہے۔ اہل نظر نے تو اس انجام کا اسی دن اندازہ لگا لیا تھا جب ۱۹۱۲ء میں جارج پنجم شہنشاہ ہند کی آمد کے موقع پر دربار منعقد ہوا۔ جس میں بحیثیت ایک صحافی مولانا ظفر علی خاں بھی مدعو تھے تو عین نماز عصر کے قریب جب شہنشاہ معظم کی سواری کے آنے کا وقت تھا۔ آپ نے وہاں اذان دیکر اس کے انتظار کرنے والوں سے فرمایا:۔

"بادشاہ مجازی کے ماننے والو۔ شہنشاہ حقیقی کے دربار میں بھی سر جھکاؤ"

جسے سرکاری درباری لوگوں نے اچھا شگون نہ سمجھا۔ اس کے بعد جب شہنشاہ ہفتم کی موت پر سب علماء لاہور کی شاہی مسجد میں اس کی دعائے مغفرت کے لیے جمع ہوئے تو مولانا ظفر علی خاں بھی عین وقت دعا مسجد میں پہنچ گئے اور اعلان کر دیا کہ عیسائی کے لیے اسلام میں دعائے مغفرت جائز نہیں۔ اس کا بھی بادہ لوگوں نے بُرا شگون لیا جو بالآخر سچ نکلا اور عظیم سلطنت سکڑ کر ایک گوشہ میں محدود ہو گئی۔

جُداگانہ تنظیم

مولانا ظفر علی خاں ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ بایں ہمہ ہندو پریس جس نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا تھا اور خواہی نخواہی مسلم زعماء پر تعصب کا بہتان تراشنے سے باز نہ آتا تھا۔ مولانا کو متعصب قرار دیتا رہا۔ اس معاملہ میں ہندو اخبارات پرتاب۔ ملاپ۔ تیج۔ وبر بھارت مولانا کے خلاف زہر اُگلنے میں پیش پیش تھے۔ اور انھوں نے ہی پنجاب کی فضاء کو مکدر کیا اور اس کے امن میں آگ لگائی اور جب پورا ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہا تھا تو اس وقت مولانا ظفر علی خاں نے امرتسر میں خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ہندوؤں کی

اس سازش کا یوں پول کھولا۔

"یہ اشتعال انگیزیاں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم کے لیے شروع کی گئی ہیں۔ جداگانہ تنظیم ہی مسلمانوں پر بے اعتمادی کا قطعی ثبوت ہے۔ لوگوں کے جذبات قومی تحریک نے خاصے مشتعل کر رکھے تھے۔ سول نافرمانی کے التواء اور گاندھی جی کی قید کے باعث قومی تحریک کا کام رک گیا ہے۔ برانگیختہ جذبات کسی نئے راستے کے لیے مضطرب تھے۔ جون میں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم کا غلغلہ بلند ہوا۔ ہندو نہایت آسانی سے اس کی رو میں بہہ نکلے اور ہندوؤں کے تفرد و تجرد اور انقطاع و علیحدگی کی یہ تحریک خاص تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ چونکہ اس کی بنیاد ہی مسلمانوں کے خلاف تعصب و عناد کے جذبات پر موقوف تھی۔ اس لیے اس کی ترقی کے ساتھ ہی ہندو مسلم تصادم کے اسباب بڑھنے لگے۔ آج ہم ایک ملتان کا نہیں بیسیوں ملتانوں کا ماتم کر رہے ہیں"

ہندوؤں کی یہی جداگانہ تنظیم تقسیم کا باعث بنی۔ ہندو کی ہر ٹھوکر مسلمان کو خواب غفلت سے جگاتی رہی اور جب اس نے ایک انگڑائی لی۔ تو سردار پٹیل نے پاکستان قائد اعظم کی جھولی میں ڈال کر اطمینان کا سانس لیا۔

اسلامی بازار

اس جداگانہ تنظیم کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا ظفر علی خاں نے اس بنیا ذہنیت سے تنگ آکر اسلامی بازار کی تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت مضبوط کرنے کے لیے انھیں تجارت کی طرف راغب کرنے لگے۔ اور تحریر و تقریر میں مسلمانوں کو اس امر کی تلقین اور ترغیب دینے لگے کہ مسلمان مسلمان سے سودا خریدیں اور ہندو سے نہ خریدیں۔ اس غرض کے لیے آپ نے لاہور میں دہلی دروازہ کے پاس اسلامی بازار بھی لگوایا۔ جس سے مسلمانوں میں تجارت کا شوق بڑھا۔ اور وہ ہندوؤں کی اقتصادی گرفت سے نجات پانے لگے۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندو آپ کے جانی دشمن بن گئے۔ مگر آپ کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ البتہ ہندوؤں کی روز افزوں اسلام دشمنی کی بدولت "زمیندار" کی اشاعت بیس ہزار سے تجاوز کر گئی۔ اسلامی بازار تحریک کی وجہ سے اب اُسے ہر مسلمان دکاندار خریدتا۔ ہر بازار میں زمیندار ہی زمیندار نظر آتا

اور اگلی صبح کے "زمیندار" کا بڑی بے تابی سے انتظار کیا جاتا۔ علاوہ ازیں سستا ہونے کی وجہ سے اسے ہر وہ شخص خریدتا۔ جو ذرا پڑھ لکھ لیتا۔ اس طرح یہ اخبار مسلم لیگ کا پیغام عوام و خواص تک پہنچانے میں بڑا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

مولانا ظفر علی خاں کے دیرینہ رفیق کار اور نامور اہلِ قلم مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا ظفر علی خاں اپنے رفیقوں کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی میں فرد فرید تھے۔ اس بارے میں سوائے مولانا شوکت علی مرحوم کے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا مولانا اپنے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ رفیق کی سبکی گوارا نہ کرتے تھے۔ سب سے محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے رہے۔ ان کی اپنی زندگی نہایت سادہ اور بے تکلف تھی۔ کھانا پینا بھی سادہ، لباس بھی سادہ، بودوباش بھی سادہ۔ ابتداء ہی سے تڑکے اُٹھنے کے عادی تھے۔ جب تک جسم مساعد رہا سیر نہ چھوڑی۔ بہت تیز چلتے اور لمبی سیر کرتے۔ تنہا ہوتے تو قرآن مجید پڑھتے۔ اپنی ذات پر کبھی خرچ نہ کیا۔ روپے پیسے ہوتے تو دوسروں پر خرچ کر دیتے۔"

علامہ ڈاکٹر اقبال نے فرمایا:۔

"ظفر علی خاں غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ ان کی ہمت بہت بلند ہے۔ ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں۔ مذہبی ادبی سیاسی لحاظ سے انھوں نے بہت خدمت کی ہے۔ نثر میں مولانا نے جس سلاست نگاری کی پیروی کی۔ اس کی بنیاد اردو ادب میں سرسید نے رکھی۔ سرسید کا اصلاحی رنگ و روپ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں میں ملتا ہے۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں نے جب قدم رکھا تو یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ظفر علی خاں۔ آزاد اور جوہر کے انداز میں یہ فرق ہے کہ ظفر علی خاں نے قدیم و جدید ادبی وجاہت اور مذہب و سیاست کی وحدت سے براہِ راست عام مسلمانوں کو خطاب کیا۔ (مولانا) آزاد ایک داعی کے لہجہ میں اُٹھے اور محمد علی جوہر ایک انگریزی جریدہ نگار کی طرح دل میں اُتر گئے۔ اسی لیے مولانا ظفر علی خاں ہیرو بنے رہے۔"

قائدِ اعظم محمد علی جناح

اگر قیادت کی زبان ہوتی تو وہ بول اٹھتی، میں محمد علی جناح ہوں۔ جناح مرحوم اپنی ذات میں ایسے اعلیٰ قائدانہ اوصاف رکھتے تھے کہ آپ اور قیادت بالکل ہم نام ہو کر رہ گئے بلکہ آپ تو قائد سے بڑھ کر قائدِ اعظم بن گئے اور دوست دشمن سبھی آپ کی پُرجوش اور نہایت کامیاب قیادت کے معترف ہوئے۔ خود قائدِ اعظم کو بھی اپنی ان ذاتی اوصاف کا احساس تھا۔ جب گاندھی جی نے آپ سے خط میں پوچھا کہ آپ کو کس نام سے پکارا جائے "گلاب کا پھول گلاب ہی کا پھول ہے چاہے اسے کسی نام سے پکارا جائے" ہمارے قائد کا جواب تھا۔

قائدِ اعظم ظاہری اور باطنی اوصاف کا حسین مرقع تھے۔ منشی عبدالرحمٰن کا پیش کردہ خاکہ اس قدر جامع ہے کہ قائدِ اعظم کی کامل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ دبلا پتلا سرو قد، گورا رنگ، چھریرا بدن، مردِ آہن، کم آمیز، اعتدال پسند، متوازن مزاج، عزم کا پختہ، بات کا دھنی، تاریخ ساز، بے پناہ قوت، آزادی کا مالک، خدا پر بھروسہ کرنے والا ناخدا، مفلوج قوم میں روح پھونکنے والا رہبر، لوہا منوانے والا اور دنیا کی عظیم ترین طاقت کو جھکانے والا سیاستدان۔ یہ ہیں قائدِ اعظم محمد علی جناح۔

نواب صادق علی کی روایت کے مطابق قائدِ اعظم کے آباؤ اجداد لوہانہ راجپوت تھے جو پنجاب کے بعض حصوں بالخصوص ملتان میں آباد ہو گئے تھے آپ کے مورث اعلیٰ حضرت غوث اعظم کے خاندان کے ایک معزز فرد سید عبدالرزاق کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ پہلے خواجہ کہلاتے تھے جو بعد میں بگڑ کر خوجہ بن گیا۔ پھر آپ کا خاندان ملتان سے کاٹھیاواڑ منتقل ہو گیا۔ اسی خاندان کا ایک معزز فرد پونجا جناح تھا۔ جس کا شمار بڑے بڑے سوداگران چرم میں ہوتا تھا اور انھوں نے کاروباری نقطہ نظر سے کراچی میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ انھی کے ہاں ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو وہ تاریخ ساز بچہ پیدا ہوا جو قائدِ اعظم کے نام سے آج ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ۱۸۸۱ء میں گھر پر گجراتی تعلیم دینے کے لیے ایک اُستاد کا انتظام کر دیا گیا۔ چھ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم کے لیے گوکل داس تیج پرائمری سکول بمبئی میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ جولائی ۱۸۹۶ء مدرسۃ الاسلام

کے انگریزی شعبے میں داخل ہوئے۔ یہیں آپ نے قرآن مجید پڑھا۔ سولہ برس کی عمر مشن ہائی سکول کراچی سے میٹرک پاس کیا جس کے بعد آپ کی شادی ایمی بائی سے کر دی گئی۔ جنوری ۱۸۹۲ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے بحری جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں آپ نے بیس سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ قیام لندن کے دوران آپ نے قانون کا گہرا مطالعہ کیا اور دادا بھائی نوروجی کی انڈین سوسائٹی کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لینے لگے۔ اس طرح آپ کو سیاسی معاملات میں تربیت کے اچھے مواقع ہاتھ آگئے جن سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

لندن سے واپسی پر پہلے کراچی اور بعد میں بمبئی میں وکالت کرتے رہے۔ شروع شروع میں مالی لحاظ سے خاصے پریشان رہے۔ مگر سخت محنتی تھے بہت جلد قانونی مہارت کی دھاک بٹھا دی۔ چنانچہ ۱۵۰۰ روپے ملازمت کی پیش کش کی گئی، جسے ٹھکرا دیا کہ اتنے تو میں روزانہ کما لیتا ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں مسٹر دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے اور اس حیثیت سے کانگرس میں شرکت کی اور سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۶ء ”وقف علی الاولاد“ کے موضوع پر کلکتہ کانگرس کے اجلاس میں اپنی پہلی پبلک تقریر کی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت میں کانگرس کے ہنگامہ خیز اجلاس میں شرکت کی۔ ۱۹۰۹ء میں آپ سپریم کونسل کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہو گئے۔ آپ مدتوں مرکزی اسمبلی کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوتے رہے۔ یہ بات آپ کے خلوص، دیانت، عملی فراست اور ہر دلعزیزی کا بین ثبوت ہے۔

قائدِ اعظم زبردست شخصیت و کردار کے حامل تھے۔ آپ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور سب حسین اور دلنواز۔ آپ عظیم سیاست دان اور بے مثل خطیب تھے۔ شہرہ آفاق بیرسٹر اور اعلیٰ ترین مدبر تھے۔ اپنی قوم کے محبوب قائد تھے۔ اولوالعزمی، بے باکی۔ اور فراست میں اپنی مثال آپ تھے۔ قوت ارادی اتنی قوی اور محیر العقول تھی کہ بڑے بڑے ”لارڈ“ آپ کے سامنے موم ہو جاتے تھے۔

قائدِ اعظم کا سیاسی کردار کانگرس میں شمولیت سے شروع ہوتا ہے۔ جب ۱۹۰۴ء میں پارسی لیڈر، دادا بھائی نوروجی کانگرس کے صدر تھے تو اس نے آپ کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ چنانچہ آپ کانگرس کے باقاعدہ ممبر بن گئے اور اپنی مخلصانہ کوششوں کے ذریعے اسے عوامی تحریک میں بدل دیا۔ آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔ آپ کو ہندو مسلم

اتحاد کا سفیر قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں امپیریل کونسل میں اوقاف بل پیش کیا۔ یہ ایک غیر سرکاری ممبر کا پہلا بل تھا جس نے باقاعدہ ایک قانون کی شکل اختیار کی۔ اپریل ۱۹۱۳ء میں انگلستان میں مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن کی فرمائش پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بیک وقت کانگرس مسلم لیگ اور شاہی مجلس قانون ساز کے ممبر رہے۔ ۱۹۱۴ء میں کونسل آف انڈیا کی اصلاح کے سلسلے میں کانگرس کے وفد کے لیڈر کی حیثیت سے انگلستان گئے۔ آپ کانگرس کی سست روی کے شاکی تھے۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی۔
۱۱ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ٹاؤن ہال میں گورنر بمبئی لارڈ ولنگٹن کے اعزاز میں جو رخصتی جلسہ ہونے والا تھا اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ نتیجتاً جلسہ ہال میں منعقد نہ ہو سکا۔ قائد اعظم کو پولیس کے لاٹھی چارج کی وجہ سے چوٹیں بھی آئیں۔ اس احتجاج میں رتی جناح بھی موجود تھیں جو ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں پر بڑی پامردی اور استقامت سے ڈٹی رہیں۔ اس واقعہ نے قائد اعظم کو عوامی ہیرو بنا دیا۔ آپ کے مداحوں نے تیس ہزار روپے جمع کر کے بمبئی میں جناح ہال تعمیر کرایا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مستقل صدر مقرر ہوئے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت کی اور پھر مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے اجلاس میں مشہور چودہ نکات پیش کیے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ "اس وقت سارے ہندوستان میں صرف ایک ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جس سے قوم یہ توقع رکھ سکتی ہے کہ وہ اسے طوفان میں سے جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید سارے ہند پر ٹوٹنے والا ہے، صحیح سلامت گذرنے میں اس کی رہنمائی کرے گا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائد اعظم نے وکالت ترک کر کے مسلمانوں کی خدمت و آزادی کا نصب العین اپنایا اور منٹو پارک میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے مطالبے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کرائی جسے ہندو پریس نے "قرارداد پاکستان" کا نام دیا۔ یہی نام اب تک معروف ہے۔ اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت خداداد پاکستان قائم ہوئی تو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

دن رات کی انتھک محنت اور کوششوں کے سبب آپ کی صحت خراب رہنے لگی۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے زیارت (بلوچستان) تشریف لے گئے مگر صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بیماری کی حالت میں کراچی پہنچے اور اسی ہفتہ کی شب روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء پانچ بجے سہ پہر مولانا شبیر احمد عثمانی نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں پانچ لاکھ سے زائد فرزندان توحید نے شرکت کی۔ لیاقت علی خان اور دوسرے وزراء نے میت قبر میں اتاری۔ جہاں آپ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ وہاں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔

"آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"

قائدِ اعظم اگرچہ اس عالمِ فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی خدمات اور کارناموں کی وجہ سے وہ ہمیشہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں موجود رہیں گے۔

۱۔ برطانوی ہندوستان میں مسلمان منتشر، مایوس اور کمزور تھے۔ آپ نے اپنی بے لوث اور کوششوں سے ایک عشرے میں مسلمانوں کو ایک متحد اور طاقت ور قوم بنا دیا اور ہندوؤں سے الگ مسلمان قوم کے وجود کو انگریزوں سے تسلیم کروایا۔

۲۔ برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم وطن "پاکستان" حاصل کیا جس میں ہم ہندوؤں کے غلبہ اور ظلم و ستم سے محفوظ وقار، امن، آزادی اور خوش حالی سے زندگی گذار رہے ہیں۔

۳۔ عصرِ حاضر میں لادین ریاستوں کے دور دورہ اور بالادستی کے باوجود اسلام کے نام پر پاکستان کی ریاست حاصل کی۔ جس میں اب ہم اسلامی نظام حیات نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان نے اس جانب ابتدا کی ہے۔ ایران اسی راہ پر چل نکلا ہے۔ افغانستان میں اس مقصد کے لیے جہاد جاری ہے۔ انشاء اللہ اس کی انتہاء یہ ہوگی کہ ایک دن سارا عالم اسلام تحریک احیائے نظام اسلام سے فیض یاب ہو جائے گا۔

۴۔ قائدِ اعظم کی تخلیق "پاکستان" دنیا بھر کے محکوم مسلمانوں کی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتا رہا ہے۔ ضرورت مند اسلامی ممالک کی مختلف طریقوں سے حتی المقدور امداد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور سامراجی اقوام کی دسترس سے بچے رہیں۔

۵۔ قائدِ اعظم کا قائم کردہ پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوشاں ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ کو ایک بار پھر قوت اور عروج نصیب ہو۔ انشاء اللہ ایک دن ہم یہ منزل بھی سر کر لیں گے۔

جناح شروع سے ہی آئینی و قانونی ذرائع اختیار کرنے والے تھے جب وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر عام دوسرے حالات اور تقاضوں سے بے نیاز

ہو کر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے یکسوئی اور تندہی سے سرگرم عمل ہو جاتے تھے۔ سچی اور صحیح بات کے لیے ثابت قدمی عمر بھر ان کا شعار رہا۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت

۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات اس لحاظ سے مسلمانوں کے لیے مفید تھیں کہ ان میں آخرت مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کیا گیا تھا بلکہ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریتی صوبوں میں آبادی کے تناسب سے قدرے زیادہ نمائندگی بھی دی گئی تھی۔ گو اس کے بدلے مسلمانوں کو اکثریتی صوبوں میں آبادی کے تناسب سے کچھ کم نمائندگی ملی۔

اس کے ساتھ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل بنا دیا گیا جس میں ارکان کی تعداد سولہ سے بڑھا کر ساٹھ کر دی۔ ان میں سے ۳۵ کو وائسرائے نے نامزد کرنا تھا اور باقی ۲۵ کا انتخاب ہونا تھا۔

اس طرح اس کونسل کے انتخاب کے لیے بمبئی کے مسلمانوں نے محمد علی جناح کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔ کونسل میں زیر بحث آنے والے کے بارے میں جناح منطقی اور معقول موقف اختیار کرتے تھے۔ جو بات ان کے نزدیک عوام کے مفاد اور انصاف کے منافی ہوتی وہ اس پر شدید نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور ہر اچھے کام کی تعریف کرتے تھے۔ کونسل میں زیر غور ایک مسودۂ قانون پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

> "میں حکومت پر آزادانہ اور صاف اور برملا نکتہ چینی کا قائل ہوں لیکن اس کے ساتھ میں اس بات کو ہر تعلیم یافتہ آدمی کا فرض سمجھتا ہوں کہ جب حکومت کوئی درست قدم اٹھائے تو اس کی حمایت اور امداد بھی کرنی چاہیئے جو لوگ اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور جو لوگ اوہام کا شکار ہیں انھیں اچھی طرح محسوس کر لینا چاہیئے کہ لاقانونیت، انارکی اور بہیمانہ جرائم سے وہ کبھی اچھی حکومت کا قیام عمل میں نہیں لا سکتے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طور طریقے کسی بھی ملک میں کامیاب نہیں ہوئے اور ہند میں بھی ان کے کامیاب نہیں ہوئے کوئی امکان نہیں۔"

جناح کسی بھی مسئلہ کی حمایت یا مخالفت میں جذباتی رویہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ ان کا موقف ہمیشہ دلائل پر مبنی ہوتا تھا۔ جب نازک نوعیت کے مذہبی مسائل درپیش ہوتے تھے، تو بھی وہ تعصب سے بے نیاز رہتے تھے، اپنی اس منفرد حکمت کا مظاہرہ انھوں نے قانون وقف

کی منظوری کے وقت کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وقف کے ارکان میں سے کسی کی غلطی سے ان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے جن کے مفاد میں وقف قائم کیا گیا ہو۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں اس قانون پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:۔

"اس قانون کے خلاف بنیادی اعتراض عام پالیسی کی بنیاد پر کیا گیا ہے حالانکہ معاملہ بہت سیدھا اور سادہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون پر عمل ہونا چاہیے اس سلسلے میں عام پالیسی کا ذکر مناسب اور غیر متعلق بات ہے"۔

یہ قانون بالآخر کونسل نے منظور کر لیا اور وائسرائے نے بھی اس کی توثیق کر دی۔ اس طرح پہلا مسودۂ قانون تھا جو کسی غیر سرکاری رکن نے نجی طور پر پیش کیا ہو اور کونسل نے اسے منظور کر کے باقاعدہ قانون کی شکل دی ہو۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں کامیاب کارکردگی نے جناح میں خود اعتمادی بڑھادی۔ اس زمانے میں ان کی یہ رائے تھی کہ برصغیر کی آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے اس جوش کی بنا پر انھیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لانے کے لیے ۱۹۱۳ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بھی رکن بن گئے۔ اس وقت وہ امپیریل کونسل کے علاوہ کانگرس کے بھی رکن تھے، کانگرس کا اجلاس ۱۹۱۵ء میں ہونے والا تھا۔ جناح نے مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں پر زور دیا کہ وہ بھی اسی جگہ اور انھی ایام میں مسلم لیگ کا اجلاس بلائیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ایک ہی مقام پر مسلم لیگ اور کانگرس کے ساتھ ساتھ اجلاسوں سے دونوں سیاسی جماعتوں کے لیڈروں میں قریبی ربط و تعلق پیدا کرنے میں مدد ملے گی چنانچہ ان کی یہ کوشش بار آور ہوئی اور اپریل ۱۹۱۶ء میں ان کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں کانگرس اور مسلم لیگ نے اس مقصد کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی قائم کر دی کہ معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں اہل ہند کی حالت بہتر بنانے کے لیے حکومت سے کیا مطالبات کیے جائیں۔ جناح کا دونوں جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی سلسلے میں یہ ایک اہم قدم تھا۔ اس کے بعد جناح کی مساعی سے کانگرس اور مسلم لیگ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ایک ساتھ اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت جناح نے کی اور اپنے خطبے میں فرمایا:۔

"ہم کوئی انعام و رعایت نہیں چاہتے اور نہ کسی امتیازی سیاسی سلوک کے

آرزومند ہیں۔"

میثاقِ لکھنؤ دسمبر ۱۹۱۶ء

کانگرس اور مسلم لیگ کے ان ایک ساتھ اجلاسوں کی وجہ سے دونوں جماعتوں میں ایک تاریخی معاہدہ ہوا جو میثاقِ لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کے معمار اعلیٰ محمد علی جناح جنہوں نے اپنی انتھک اور مخلصانہ مساعی سے کام لینے پر آمادہ کر لیا تھا اس کے علاوہ اشتراک سے کام لینے پر آمادہ کر لیا تھا اس کے علاوہ کانگرس کا رویہ بھی فراخ دلانہ تھا۔ اس میثاق کی وجہ سے جو کہ قائد اعظم کا عظیم کارنامہ تھا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک بنیادی مطالبے جداگانہ انتخاب کے حق کو تسلیم کر لیا۔

آزادی کی جدوجہد میں میثاقِ لکھنؤ پہلا اور واحد سمجھوتہ تھا جس پر ہندو اور مسلم متفق ہوئے تھے لیکن حکومتِ برطانیہ نے اس ہندو مسلم اتحاد کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اور اس طرح دونوں فرقوں کے لیے قابلِ قبول آئینی اصلاحات حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ضائع ہو گیا۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں حکومت برطانیہ نے رولٹ ایکٹ منظور کیا اس کے تحت حکومت کو وارنٹ اور مقدمہ چلائے بغیر گرفتاری کا اختیار دے دیا گیا تھا اس قانون کی ایک دفعہ کے تحت ملزم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر خفیہ مقدمہ بھی چلایا جا سکتا تھا۔ جب یہ مسودہ قانون پیش کیا گیا تو محمد علی جناح نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن حکومت نے کونسل کے سرکاری ارکان کی اکثریت سے یہ قانون منظور کرا لیا۔ چنانچہ جناح نے بطور احتجاج کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ اور کہا کہ کیوں کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو حکومت زمانہ امن میں ایسے قانون کو منظور کراتی ہے وہ مہذب حکومت کہلانے کا کوئی حق نہیں رکھتی تاہم مجھے اُمید ہے کہ وزیر امور ہند مسٹر مانٹیگ تاجدار برطانیہ کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اس کالے قانون کو مسترد کر دیں۔

قائداعظم کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ جناح کس قدر آئین پسندانہ مزاج اور حق گوئی کے جذبے کے آئینہ دار تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان کا کوئی دوسرا شخص اس کھلے اور برملا انداز میں وائسرائے کو خط لکھنا تو درکنار خط لکھنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اینی بسنت نے "ہوم رول لیگ،، کے نام سے تحریک شروع کی۔ جناح بھی اس کے رکن بن گئے اور بعد میں اس کی بمبئی شاخ کے صدر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں اپنی کے مستعفی ہونے کے بعد گاندھی کو اس کی جگہ صدر منتخب کیا گیا۔ گاندھی نے سب سے پہلے ہوم رول لیگ کی جگہ اس کا ہندی نام "سوراج سبھا،، رکھ دیا تاکہ ہندوستان کے عام لوگ بھی اس میں

کشش محسوس کرنے لگیں۔ اس کے علاوہ گاندھی نے جماعت کے اغراض و مقاصد میں بھی تبدیلی کر دی۔ ڈاکٹر اینی بسنت کے دور میں ہوم رول لیگ کا نعرہ "سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری" تھا لیکن اس کی جگہ گاندھی مکمل آزادی کا خواہاں تھا۔ جناح کے آئین پسند ذہن نے ان تبدیلیوں کو من مانی کارروائی قرار دیا اور ان تبدیلیوں کے قانونی جواز پر اعتراض کیا۔ گاندھی نے سرد مہری سے جواب دیا کہ اگر کسی رکن کو تبدیل شدہ آئین پسند نہیں تو وہ لیگ کی رکنیت سے مستعفی ہو سکتا ہے اس پر جناح اور مزید ۱۹ ارکان مستعفی ہو گئے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جناح بہت جرأت مند اور آئین نواز تھے۔ وہ کسی بھی دوسری بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ جو شخص بھی بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتا تھا اس کو جناح کی ضرب بے اماں کا ہدف بننا پڑتا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی اتحادی صلح نامہ سیورے کر رہے تھے جس میں ترکوں سے سخت ناروا سلوک کے علاوہ خلافت کے نظام کا خاتمہ بھی شامل تھا۔ اس کے خلاف مسلمانانِ ہند نے مولانا محمد علی جوہر کی رہنمائی میں ملک کے طول و عرض میں پُرجوش مظاہرے کیے۔ ابتدا میں یہ تحریک صرف مسلمانوں تک محدود تھی بعد میں کانگرس بھی اس میں شامل ہو گئی۔ جناح سمجھتے تھے کہ گاندھی کے ہاتھ تحریک آجانے سے تشدد کا راستہ اپنا لیا جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اس تحریک میں حصہ نہ لیا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ آئینی ذرائع اختیار کر کے مقاصد حاصل کیے جائیں۔ قائدِ اعظم کے اس معقول رویہ کی برطانوی لیبر پارٹی کے ایک مندوب کرنل ویج ووڈ نے ان الفاظ میں تعریف کی:-

> "ہند میں صرف ایک فردِ واحد اپنی مضبوطی کردار کے ساتھ اپنے اس موقف پر قائم رہا جسے وہ درست سمجھتا تھا۔ نہ وہ بھرپور مخالفت سے مرعوب اور نہ حمایت و تائید کے فقدان سے اس کے حوصلے کا پرچم سرنگوں ہوا۔"

قائدِ اعظم کو یہ صورت حال اچھی نہیں لگتی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں لیکن ایک موقع پر آکر یہ کوششیں ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہو گئیں۔

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ ۱۹۲۷ء میں دسمبر کے مہینے میں حکومت برطانیہ نے آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے ایک وفد

لارڈ سائمن کی قیادت میں ہندوستان بھیجا جس میں کسی ہندوستانی نمائندے کو شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ کانگرس اور مسلم لیگ نے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اسی اثناء میں نہرو کی سربراہی میں ہندوستان کا آئین بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی نے ۱۹۲۸ء میں اپنی رپورٹ جو کہ " نہرو رپورٹ "، کے نام سے مشہور ہے پیش کی۔ اس رپورٹ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے حق کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ ۱۹۱۶ء کے معاہدۂ لکھنؤ میں انھوں نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کا جائزہ لینے کے لیے کل جماعتی کانفرنس ہوئی جس میں اس رپورٹ پر سخت تنقید کی گئی۔ جناح بھی ان میں شامل تھے انھوں نے کہا:۔

" میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ کہتا ہوں کہ آزادی کی جدوجہد میں سات کروڑ مسلمانوں کو ہمارے شانہ بشانہ چلنا چاہیئے "۔

لیکن کانگرس نے قائدِ اعظم کے اخلاص کی کوئی قدر کی نہ ان کے جائز مطالبات کو کوئی اہمیت دی۔ اس طرح کانگرس نے ہندو مسلم اتحاد کا سنہری موقع گنوا دیا۔

قائدِ اعظم کے چودہ نکات

اگرچہ جناح کانگرس کے رویہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے لیکن انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک اور کوشش کی چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے چودہ نکات پر مشتمل ایک فارمولا پیش کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہند کے لیے مجوزہ آئینی اصلاحات میں ان نکات کو پیشِ نظر رکھا جائے اور صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ جس آئین میں ان نکات کو شامل نہیں کیا جائے گا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگا۔ قائدِ اعظم ان نکات میں مسلمانوں کے جائز مطالبات پیش کیے گئے تھے۔ لیکن ہندوؤں نے اسے تسلیم نہ کیا جس سے دونوں قوموں میں نفرت کی دیوار اور بڑھ گئی۔

گول میز کانفرنسیں

۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں آنے والے کمیشن یعنی سائمن کمیشن نے وزیر اعظم کو مشورہ دیا کہ ہندوستان کے تمام اہم رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں سب کے لیے قابل قبول آئینی ڈھانچہ مرتب کیا جائے۔

چنانچہ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس بلائی جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک جاری رہیں۔ کانفرنس میں وائسرائے نے منتخب لیڈروں کو بلوایا جن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی تھے یہ کانفرنسیں ناکام ہوئیں کیونکہ کانگرس مسلمانوں کے جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ دونوں جماعتوں کے درمیان کسی تصفیہ کے نہ ہونے کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ نے اپنی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور کر لیا۔ اگرچہ دونوں جماعتوں نے اس ایکٹ کو ناپسند کیا البتہ ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات میں دونوں سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔

گول میز کانفرنس میں کانگرس کے رویہ سے دل برداشتہ ہو کر قائدِ اعظم نے لندن میں ہی مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی اس طرح ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں لیاقت علی خاں اور دوسرے کئی لیڈروں کے اصرار پر ۱۹۳۴ء میں جناح واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اس دوران کانگرس نہ صرف ایک وسیع اور مضبوط تنظیم بن چکی تھی بلکہ اس نے بعض مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی اپنے قدم جما لیے تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کا احیاء اور اسے کل ہند بنیادوں پر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن جناح نے انتھک محنت سے مسلم لیگ کو ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے قابل بنا دیا۔ لیکن وقت بہت کم تھا اس لیے کوئی حوصلہ افزا نتائج برآمد نہ ہوئے۔

کانگرسی وزارتیں

انتخابات میں کامیابی نے کانگرس کو مغرور بنا دیا تھا انھوں نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں بنا لیں۔ اس غرور میں نہرو نے کہا کہ:۔

"ہند میں اس وقت صرف دو طاقتیں ہیں۔ برطانوی سامراج اور ہندی قوم پرست مؤخر الذکر کی نمائندگی کانگرس کرتی ہے۔"

قائدِ اعظم نے اس دعویٰ کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"تیسری طاقت مسلم لیگ ہے جو مسلمانانِ ہندوستان کی واحد ترجمان ہے۔"

اس پر کانگرس نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف غیر جمہوری تحریک شروع کی اور انھیں بے انتہا مظالم کا شکار بنایا۔ کانگرسی وزارتوں کے دوران ہندوؤں کا رویہ دیکھ کر

قائدِ اعظم کو یقین ہو گیا کہ ہندو اکثریت مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس دوران ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے قائدِ اعظم کو لکھا کہ:-

"آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو اس طرح کی قومیں کیوں نہیں تصور کیا جاسکتا جس طرح ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر دوسری اقوام ہیں"

علامہ اقبال کے یہ الفاظ قائدِ اعظم کے دل میں گھر کر گئے۔ وہ کانگرس کے رد یے سے تو پہلے ہی دل برداشتہ ہو چکے تھے چنانچہ انھیں یقین ہونے لگا کہ ہند کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے غالباً اسی احساس کے تحت انھوں نے سندھ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۸ء میں یہ سفارش کی کہ:-

"آل انڈیا مسلم لیگ ایسی آئینی سکیم وضع کرے کہ جن صوبوں اور ریاستوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ بالآخر خود اپنے وفاق کے تحت مکمل آزادی حاصل کر سکیں"

چنانچہ دو سال مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کے بعد کانگرسی وزارتوں سے مسلمانوں کو نجات ملی اور قائدِ اعظم کے کہنے پر مسلمانوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ملک بھر میں "یومِ نجات" منایا کانگرس اس پر حیرت زدہ رہ گئی کیونکہ یوم نجات منانے میں مسلمانوں کے علاوہ پارسی۔ عیسائی۔ اچھوت اور ہزاروں ہندو بھی شامل ہوئے تھے۔

اس دوران قائدِ اعظم مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کے مسئلہ پر مسلسل سوچ بچار کرتے رہے انھیں مکمل یقین تھا کہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد ہندو مسلمان کو برداشت نہیں کریں گے اور کانگرسی وزارتوں میں وہ اس کا تجربہ دیکھ چکے تھے چنانچہ ۹۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو برطانیہ کے جریدہ "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" میں ایک مضمون میں لکھا کہ:-

"انگریز چونکہ مسیحی ہیں اس لیے وہ اپنے ملک کی مذہبی جنگوں پر بھولنے لگتے ہیں اب وہ مذہب کو انسان اور خدا کے مابین ایک انفرادی اور نجی معاملہ سمجھتے ہیں لیکن ہندو ازم اور اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ دونوں مذاہب اپنی اپنی جگہ معاشرتی نظام بھی ہیں۔ اور ان میں انسان کے ساتھ کے مابین تعلق کے بجائے انسان کے اپنے ہمسائے کے ساتھ تعلقات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

یہ مذاہب نہ صرف ان کے قانون اور ثقافت بلکہ ان کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں"۔

برطانوی جریدے میں اس مضمون کی اشاعت کے صرف دو ہفتے بعد

قرارداد لاہور

مسلم لیگ نے تاریخی قرارداد منظور کی جسے بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس عظیم جلسۂ عام میں خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے کانگرس کی حکومت کے دور میں مسلمانوں پر کیے گئے مظالم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ ہمیں کانگرسی وزارتوں کے دوران کئی تجربے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے تجربے سیکھے ہم ہندوؤں سے خوف زدہ ہیں اور ان پر اعتبار نہیں کر سکتے اس بات کو غلط طور پر حقیقت سمجھ لیا گیا ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہ خود بھی عرصے سے اس اصطلاح کے عادی ہو چکے ہیں لیکن مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ وہ تعریف کی رو سے ایک قوم ہیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ:۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کا دو مختلف مذہبی فلسفوں، علیٰحدہ رسم و رواج اور جداگانہ مذہبیات سے تعلق ہے وہ نہ ایک دوسرے میں شادی کرتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں درحقیقت ان کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے جن کی بنیاد باہم تصادم نظریات اور تصورات پر ہے زندگی کے بارے میں ان کے تصورات یکسر مختلف ہیں ان کی داستان ہائے شجاعت علیٰحدہ ہیں ایک قوم کے ہیرو کو دوسری قوم دشمن قرار دیتی ہے ان کی فتوحات شکستیں بھی ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ ایسی دو قوموں کو ایک ہی مملکت میں اکٹھے جوت دینا جب کہ ان میں ایک اقلیت میں ہو اور دوسری اکثریت میں بے اطمینانی میں ہی اضافہ ہوگا۔ مسلمان ہر اعتبار سے ایک قوم ہیں اور ان کا اپنا وطن، اپنا ملک ہونا چاہیے"۔

قرارداد لاہور میں مسلمانوں کے نصب العین اور منزل کا تعین کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا چنانچہ مسلمان جنہوں نے محمد علی جناح کو اس وقت قائدِ اعظم کا خطاب دیا متحد ہوتے گئے۔

قراردادِ لاہور کی منظوری کے دو سال بعد حکومتِ برطانیہ کی طرف سے سر سٹیفرڈ کرپس ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ آئینی مسائل پر تبادلہ خیالات کے لیے

بھیجا گیا۔ کرپس نے جنگ کے بعد ہندوستان کے لیے نو آبادیاتی درجہ اور ایک آئین ساز ادارہ قائم کرنے کی پیشکش کی لیکن کانگریس نے کرپس کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ نے بھی تجاویز مسترد کر دیں کیوں کہ اس میں قیام پاکستان کا کھل کر وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ دوسری طرف قائدِ اعظم تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ کانگرسی اس سے فکر مند تھے۔ چنانچہ انھوں نے حکومتِ برطانیہ پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالنے کا راستہ اختیار کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر کے اقتدار کانگرس کو منتقل کر دے تاکہ برطانیہ کے اخراج کے بعد قائدِ اعظم سے اور مسلم لیگ سے اپنی من مانی شرائط منوا سکیں اسی منصوبے کے تحت کانگرس نے ۸ ۔ اگست ۱۹۴۲ء کو "ہندوستان چھوڑ دو" قرارداد منظور کی۔ مسلم لیگ نے اور قائدِ اعظم نے مسلمانوں کو اس تحریک سے الگ رہنے کا مشورہ دیا۔

مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کو سختی سے دبانے کے لیے سختی سے کام لیتے ہوئے تمام سرکردہ لیڈروں کو جیلوں میں ڈال دیا۔ قائدِ اعظم نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ کو از سر نو منظم کیا اور مطالبہ پاکستان کو ہندوستان کے طول و عرض کے تمام مسلمانوں کی آواز بنا دیا۔ یہ سب قائدِ اعظم کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔ مطالبہ پاکستان کا مطلب تھا کہ نہ صرف ہندوؤں سے آزادی بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ پاکستان ایک آزاد اسلامی مملکت ہو گی جس میں وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر سکیں گے۔ مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی کو رہا کر دیا گیا لیکن اس دوران مسلم لیگ "پاکستان" کو تمام مسلمانانِ ہند کا مطالبہ بنا چکی تھی۔ گاندھی اب اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے قائدِ اعظم سے ملنے کی خواہش کی قائدِ اعظم ان دنوں کشمیر کا دورہ کر رہے تھے۔ انھوں نے گاندھی کو جواب میں لکھا کہ وہ وسط اگست تک بمبئی پہنچ جائیں گے اور گاندھی ان کے ہاں تشریف لائیں تو انھیں خوشی ہو گی۔

جناح گاندھی مذاکرات

قائدِ اعظم اور گاندھی کے درمیان ۹۔ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ملاقات ہوئی اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور تین ہفتے تک جاری رہا لیکن دونوں رہنماؤں کے نقطۂ نظر میں بہت زیادہ فرق کی وجہ سے مذاکرات ناکام ہوئے البتہ ان مذاکرات سے قائدِ اعظم کو ہندو ذہنیت کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع مل گیا۔

ان مذاکرات کے چند دن بعد قائدِ اعظم نے لندن کے "نیوز کرانیکل" کو ایک انٹرویو دیا

بجو ۴۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں قائدِ اعظم نے کہا کہ ہندو مسلم اختلافات کو دور کرنے کا صرف ایک ہی عملی طریقہ ہے۔ یعنی ہندوستان کو دو آزاد اور خود مختار حصوں یعنی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر دو پر اعتماد کیا جائے کہ پاکستان میں ہندو اقلیت سے اور ہندوستان میں مسلم اقلیت سے منصفانہ سلوک کیا جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندو ہماری مکمل آزادی کو ذہنی طور پر تسلیم نہیں کریں گے۔

شملہ کانفرنس دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے قریب حکومتِ برطانیہ نے اعلان کیا کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل بنائی جائے گی تاکہ بعد میں مرکزی عبوری حکومت کا قیام عمل میں آسکے چنانچہ جون ۱۹۴۵ء میں گورنر جنرل نے تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس شملہ میں بلائی جس میں گاندھی، ابو الکلام آزاد اور قائدِ اعظم بھی شامل ہوئے۔ کانفرنس کے نتیجے کے طور پر سیاسی جماعتوں نے ایگزیکٹو کونسل کے ممبران کے نام تجویز کرتے تھے لیکن کانفرنس کے دوران کانگرس نے دعویٰ کیا کہ وہ ہی ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس لیے مسلمان ممبران کے نام بھی کانگریس ہی تجویز کرے گی جب کہ قائدِ اعظم کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ چنانچہ اس اختلاف کی بنا پر کانفرنس ناکام ہوگئی۔

قائدِ اعظم نے اس موقع پر ایک واضح موقف اختیار کر کے پاکستان کے قیام کے لیے راہ ہموار کر دی اس لیے کہ اگر اس وقت کانگریس کامیاب ہو جاتی تو انکی بنیادوں پر عبوری حکومت کا قیام عمل میں آتا اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان کی تقسیم کی تجویز کا ہندوؤں کی اکثریت کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جاتی۔ کانگریس کی ناکامی کے نتیجے میں انتخابات ہوئے جس میں قائدِ اعظم کا فرمان بہ سچ ثابت ہوا مسلم لیگ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ان انتخابات میں واضح کامیابی نے مسلم لیگ کے اس دعویٰ کو درست ثابت کر دیا کہ:۔

i۔ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

ii۔ ہندوستان کے مسلمان مطالبہ پاکستان پر متفق ہیں۔

مسلم لیگ کی بھرپور کامیابی دراصل قائدِ اعظم کی رہنمائی اور قابلیت کو کھلا خراجِ عقیدت تھا۔ یہ ان کی قیادت کا کارنامہ تھا کہ جس مسلم لیگ کو ۱۹۳۷ء میں ۴۸۲ مسلم حلقوں میں سے صرف ۱۰۲ حلقوں میں کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن صرف آٹھ سال بعد وہ برِ صغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔

کابینہ مشن مارچ ۱۹۴۶ء

مارچ ۱۹۴۶ء میں حکومتِ برطانیہ نے ایک "کابینہ مشن" کے قیام کا اعلان کیا جس کا مقصد ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ صلاح و مشورہ سے انتقالِ اقتدار کی سکیم مرتب کرنا تھا۔ اس مشن کے ارکان ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچے۔ انھوں نے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ کے متضاد نقطۂ نظر میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور پھر ۱۶ مئی کو اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ اس منصوبے میں جداگانہ نیابت کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا قیام بھی شامل تھا اور ہر دس لاکھ افراد کے لیے ایک رکن منتخب کیا جاتا تھا۔ اس اسمبلی نے اتحادِ ہند کے لیے آئین تیار کرنا تھا۔ منصوبے میں صوبوں کے تین گروپ بھی بنائے گئے تھے۔

اپنے اس منصوبے کی وضاحت کے سلسلے میں کابینہ مشن نے ۲۵ مئی کو ایک بیان جاری کیا "صوبوں کی گروپ بندی ہماری سکیم کا بنیادی اور لازمی حصہ ہے۔ اور اس میں فریقین باہمی رضامندی سے ہی ردوبدل کر سکتے ہیں جب آئین بن جائے گا تو پھر کوئی صوبہ عوام کی رائے سے ہی کسی گروپ سے علیحدہ ہو سکے گا۔"

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۶، جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں ہوا کونسل نے اگرچہ مسلمانوں کی علیحدہ خود مختار مملکت قائم نہ ہونے پر احتجاج کیا تاہم اس نے کابینہ مشن کے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد منصوبے کو قبول کر لیا کیوں کہ اس سکیم میں چھ مسلم صوبوں کی لازمی گروپ بندی کر دی گئی تھی اور اس طرح پاکستان کے تصور کو قبول کر لیا گیا تھا مسلم لیگ کی طرف سے اس فیصلے سے دو دن قبل ۴ جون کو وائسرائے نے قائدِ اعظم کو ایک خط میں بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ:۔

> "آپ نے کل اس یقین دہانی کے لیے کہا تھا کہ اگر ایک فریق نے منصوبہ قبول کر لیا اور دوسرے نے مسترد کر دیا تو پھر کیا صورت ہو گی میں آپ کو ذاتی طور پر یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلے میں کسی فریق سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا اور کسی ایک پارٹی نے بھی منصوبہ تسلیم کر لیا تو حتی الوسع حالات کی اجازت کے تحت ہم منصوبے پر عمل درآمد کریں گے تاہم ہمیں یقین ہے کہ دونوں فریق اس منصوبے کو تسلیم کر لیں گے۔"

کانگرس اگرچہ اس منصوبے سے مطمئن اور خوش نہیں تھی۔ لیکن اس نے بھی یہ منصوبہ قبول کر لیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی طرف سے منصوبہ قبول کر لینے کے بعد وائسرائے نے دونوں

جماعتوں کے لیڈروں کے ساتھ عبوری حکومت کے قیام کے لیے مذاکرات شروع کر دیئے۔ وائسرائے کے مطابق عبوری حکومت میں کل ۱۲ وزیر ہوں گے جن کا تناسب یوں ہوگا۔ پانچ کانگریس پانچ مسلم لیگ ایک سکھ اور ایک عیسائی لیکن نہرو نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا چنانچہ وائسرائے نے ایک اچھوت وزیر سے لیا تاکہ کانگریس کی ۶ نشستیں ہو جائیں۔ اس پر قائدِ اعظم نے تنقید کی چنانچہ ان حالات میں وائسرائے نے وزرا کی تعداد چودہ کر دی جن میں مسلم لیگ کے ۶ کانگریس کے چھ ایک عیسائی ایک پارسی۔ وائسرائے کے اندازِ فکر میں تبدیلی و انحراف کے سلسلے میں قائدِ اعظم نے اسے ایک خط لکھا کہ:۔

> "اپنی عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں آپ نے یہ چوتھی تجویز پیش کی ہے کانگرس نے اس سے پہلے تین مرتبہ انکار کیا ہے اور آپ نے انھیں رضامند کرنے کے لیے ہر بار اپنی اصل تجویز سے اس طرح انحراف کیا ہے کہ نئی صورت کانگرس کے لیے مفید اور مسلم لیگ کے لیے نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ آپ کی تازہ ترین تجویز نے مساوی نیابت کے اصول کو مکمل طور پر پامال کر دیا ہے اور مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرس کو واضح اکثریت عطا کر دی ہے۔"

نئی ترتیب بھی کانگرس کو قبول نہ تھی چنانچہ اس نے عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اس پر قائدِ اعظم کو اُمید تھی کہ وائسرائے کی یقین دہانی کے مطابق مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ مستقل افسران پر مشتمل نگران حکومت قائم کر دی گئی۔ قائدِ اعظم اس پر بہت ناراض ہوئے اور انھوں نے کہا:۔

> "میں پورے زور اور وثوق سے کہتا ہوں کہ کابینہ مشن اور وائسرائے اپنے قول سے منحرف ہو گئے ہیں اور انھوں نے ۱۶ جون کے بیان پر عمل درآمد نہیں کیا۔"

کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت نہ ہونے کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اس کے علاوہ مسلم لیگ کو بھی اپنا کوئی تحفظ نظر نہ آیا اس پر مسلم لیگ نے کابینہ مشن کے منصوبے کی جو قبل ازیں، توثیق کی تھی اسے منسوخ کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں "حصول پاکستان کے لیے راست اقدام" کا فیصلہ کیا گیا تاکہ "برطانیہ کی موجودہ غلامی اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے آئندہ غلبہ سے نجات حاصل کی جا سکے۔" قائدِ اعظم نے اپنے طویل

سیاسی کردار میں پہلی مرتبہ " راست اقدام " کا راستہ اختیار کیا تھا کیوں کہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کے لیے بات چیت بے سود ہو کر رہ گئی ہے۔

قائدِ اعظم کے اس جرأت مندانہ موقف سے کانگریس بہت مضطرب ہو گئی اور اس نے ۱۰ اگست ۱۹۴۶ء کو ایک قرار داد منظور کی کہ وہ کابینہ مشن کا منصوبہ قبول کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اب پانی سر سے گذر چکا تھا کانگرس کے منصوبے میں داخلی عزائم بے نقاب ہو چکے تھے اور قائدِ اعظم نے کانگریس کی یہ یقین دہانی قبول کرنے سے انکار کر دیا انھوں نے کہا:

"کانگریس نے اس طرح صرف اپنے موقف کا اعادہ کیا ہے البتہ انھوں نے کہا الفاظ بدل دیے ہیں ابھی انگریز ملک میں موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں کانگریس اپنے موقف میں اس قدر کثرت سے ردو بدل کر سکتی ہے تو برطانیہ کے رخصت ہو جانے کے بعد اقلیتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں کہ کانگریس ایک مرتبہ پھر وہی موقف اختیار نہیں کرے گی جس کا اظہار نہرو کے بیان میں کیا گیا تھا"

چنانچہ وائسرائے نے کانگریس کو حکومت بنانے کی دعوت دی مسلم لیگ کو وقتی طور پر نظر انداز کیا گیا البتہ کچھ مدت بعد مسلم لیگ کو شامل کر لیا گیا اور اس کے پانچ نمائندے لیے گئے جن کے قائد لیاقت علی خاں تھے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو انھوں نے حلف اٹھایا۔

وزیر اعظم اٹلی کا بیان

۲۷ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ اٹلی نے اپنی حکومت کے اس "قطعی اور حتمی عزم" کا اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اہل ہند کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا وہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان پہنچا وہاں پر بے چینی کا عالم تھا کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ برطانیہ اقتدار چھوڑنے والا ہے۔ چنانچہ سرکاری ملازمتوں میں ہندو اور مسلم افسر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے عام زندگی میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات ہو رہے تھے مسلم ہر جگہ "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگا رہے تھے جب کہ ہندو اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر ماؤنٹ بیٹن نے جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اقتدار منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

چنانچہ مونٹ بیٹن نے کانگرسی راہنماؤں سے تبادلہ خیال کیا اور ایک منصوبہ بنایا جو کہ ۳ جون کے منصوبے کے نام سے مشہور ہے۔

۳ جون کا منصوبہ

مونٹ بیٹن نے اپنے منصوبے کا ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اعلان کیا قائدِ اعظم نہرو۔ بلدیو سنگھ نے ریڈیو سے تقریریں کر کے اس منصوبے کو قبول کرنے کا اعلان کیا۔ قائدِ اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بتایا کہ پاکستان معرض وجود میں آنے والا ہے۔ تقریر کرتے ہوئے وہ کچھ جذباتی ہو گئے۔ یہ غالباً ان کی زندگی کا پہلا اور اپنی نوعیت کا آخری موقع تھا کہ انھوں نے بلند آواز اور پُر جوش لہجہ میں "پاکستان زندہ باد" کہہ کر اپنی تقریر ختم کی۔

۳ جون کے منصوبے کے تحت پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدوں کا تعین ایک حد بندی کمیشن نے کرنا تھا مسلم لیگ اور کانگرس اس کمیشن کے سربراہ کے طور پر ریڈ کلف کے تقرر پر آمادہ ہو گئیں بعد میں قائدِ اعظم کو اس شخص کے فیصلوں پر صدمہ ہوا اور انھوں نے صرف اس تبصرے پر اکتفا کیا۔

"ہندوستان کی حتمی اور قطعی اور ناقابلِ تنسیخ تقسیم ہو چکی ہے بلاشبہ اس عظیم اور آزاد مسلم مملکت کے قیام میں ہم نے ناانصافی ہوئی ہے۔ ہمیں حتی الوسع زیادہ سے زیادہ مختصر اور محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخری وار حد بندی کمیشن نے کیا ہے اس کا فیصلہ غیر منصفانہ اور ناقابلِ فہم ہے۔ یہ عدالتی فیصلہ نہیں بلکہ سیاسی فیصلہ بھی نہیں۔ لیکن ہم اسے قبول کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور ہم اس کے پابند ہیں باعزت قوم کو اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے لیکن اس نئی اور مزید ضرب کو بھی ثابت قدمی جرأت اور امید کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے"۔

قیام پاکستان اور قائدِ اعظم کی رہنمائی

قیام پاکستان بلاشبہ قائدِ اعظم کی بہترین رہنمائی کا نتیجہ ہے جس انداز میں انھوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کا مقابلہ کیا خاص طور پر کابینہ مشن کے منصوبے کے بعد۔ وہ ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہے وہ ہمیشہ معقول اور عملی رویہ اختیار کرتے تھے وہ دونوں فریقوں میں مفاہمت

کے لیے مصالحت پر آمادہ ہو جاتے تھے لیکن انھیں ڈرا دھمکا کر یا دباؤ کے تحت اپنی مرضی کیخلاف کوئی بات یا منصوبہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء سے ایک ملاقات کے دوران انھوں نے کہا تھا کہ:۔

"فیصلہ کرنے سے پہلے ایک سو مرتبہ سوچو لیکن جب فیصلہ کرلو تو پھر اس پر ڈٹ جاؤ"

..یہی سبق اور رہنما اصول انھوں نے مسلم لیگ کے سامنے رکھا اور اسے ملحوظ رکھنے سے انھیں پاکستان حاصل کرنے کے مقصد میں شاندار کامیابی ہوئی۔

پاکستان اور بھارت کی تحریک آزادی کے سیاسی لیڈروں کے کردار کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تو قائدِ اعظم منصف مزاجی اور بے لوثی کے اعتبار سے سرفہرست نظر آتے ہیں وہ نہرو، گاندھی اور دوسرے سرکردہ لیڈروں میں سب سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے سیاست میں ناجائز ذرائع اور گھٹیا ہتھکنڈوں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سیاسی زندگی کے ابتدائی دور میں جب وہ ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے تو وہ اس خیال سے سرشار تھے کہ ہندوؤں سے تعاون کرنے سے مسلمانوں کا مفاد محفوظ ہو سکتا ہے لیکن بعد کے تجربات بالخصوص نہرو رپورٹ کی اشاعت اور گول میز کانفرنسوں میں ان پر ہندو ذہنیت پوری طرح عیاں ہو گئی اور انھیں معلوم ہو گیا کہ کانگرس کا مقصد ہندو راج ہے اور ان کے اس تاثر کو ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات کے بعد کانگریس کے اڑھائی سالہ دورِ حکومت نے تقویت پہنچا دی تو پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا قیام ضروری ہے۔ اس کے بعد دن رات قیام پاکستان کے لیے کام کرنے لگے اور اپنے خلوص بے لوثی محنت اور تدبر سے اس مہم میں بھی انھیں عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔

زندگی کے کسی بھی دور میں قائدِ اعظم اقتدار برائے اقتدار کے خواہاں نہیں ہوئے تھے۔ پاکستان کی جدوجہد میں انھوں نے اس یقین کے ساتھ کام کیا کہ انگریزوں کے رخصت کے بعد ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکیں گے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں مذاکرت کی ناکامی کے بعد انھوں نے گاندھی سے جو خط و کتابت کی اس کے سرسری مطالعے سے قائدِ اعظم کا خلوص ظاہر ہوتا ہے گاندھی کا خیال تھا کہ چند مراعات سے قائدِ اعظم کو مطمئن کیا جا سکے گا۔ لیکن قائدِ اعظم نے اس کے جال میں پھنسنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کابینہ مشن کے منصوبے کے سلسلے میں کانگرس نے جس ہیر پھیر سے کام لیا اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قائدِ اعظم نے اپنی خداداد بصیرت

۱۹۴۴ء میں گاندھی کے ساتھ مذاکرات میں ہی بھانپ لیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور ۱۹۴۲ء میں کانگرس کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے جواب میں انھوں نے "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" کا جو نعرہ لگایا تھا وہ کس قدر درست اور حق پر مبنی تھا۔

کانگریسی راہنماؤں کے مقابلے میں قائدِ اعظم بدرجہا زیادہ راست باز اور باوقار مدبر تھے۔ انھوں نے کبھی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے عوام کے جذبات سے نہیں کھیلا وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں قدم اُٹھاتے تھے۔ ان کا استدلال ایمان و یقین پر مبنی ہوتا تھا اس لیے کوئی شخص ان کی دلیل کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ ان کے اقدامات بالکل واضح اور ہر قسم کے ہیر پھیر سے پاک ہوتے تھے وہ واحد مسلمان رہنما تھے جو صاف ذہن اور غیر معمولی بصیرت کے مالک ہونے کے باعث گاندھی اور نہرو کے عزائم کو بھانپ لیتے تھے۔ انھی اوصاف کی بناء پر وہ سب سے بڑی اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں کامیاب ہوئے۔ قائدِ اعظم کو انسانی محنت پر پورا پورا اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ مسلمان پوری لگن سے سرشار ہو کر پاکستان کو برقرار رکھ سکیں گے اور وہ اس سلسلے میں غیر ملکی امداد پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

باب ۲۶

تحریک پاکستان میں طلبہ کا کردار

قائد تحریک پاکستان محمد علی جناح نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا۔ کہ جب قوم کے بالائی طبقوں نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اس وقت طلبہ میری مدد کے لیے آگے بڑھے۔ قائد اعظم نے جب مسلمانوں کو منظم کرنے کا ارادہ کیا۔ تو ۱۹۳۷ء میں طلبہ اور نوجوانوں نے ہی ان کی آواز پر لبیک کہا۔ راجہ صاحب محمود آباد امیر احمد خاں تحریک پاکستان کے عظیم رہنما کی حیثیت سے میدان میں آئے۔ راجہ صاحب محمود آباد آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے۔ اس طرح انھوں نے تمام ہندوستان میں مسلمان طلباء کو تحریک پاکستان کے لیے منظم کیا۔ قائد اعظم کو ان پر بے حد اعتماد تھا۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں نوجوان طلباء نے عزم کیا۔ کہ وہ ملک کے تحفظ اور سربلندی کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

تحریکِ پاکستان۔ علی گڑھ کالج

علی گڑھ کالج کے توسط سے سر سیّد احمد خاں نے مسلمان طلبہ کی ایسی نسل تیار کر لی تھی۔ جس نے بہت جلد ان کے نظریات و مقاصد پر عمل شروع کر دیا۔ اور تحریک آزادی میں سرگرمی سے شمولیت اختیار کی۔ سیّد احمد خاں کی تعلیمی تحریک اور اس کے تحت علی گڑھ کالج کا قیام اپنے نتائج کے لحاظ سے بڑا دور رس اور موثر ثابت ہوا۔ اپنے مقاصد کے اعتبار سے سیّد احمد خان انگریزوں کے بہت بڑے باغی ثابت ہوئے۔ اگر وہ علی گڑھ کالج قائم نہ کرتے تو برّ عظیم میں اس قدر ہلچل پیدا نہ ہوتی۔ نہ وہ کالج قائم کرتے۔ نہ نوجوانوں کی ایک پُرجوش نسل نکلتی۔ نہ تحریک آزادی اس قدر شدت اختیار کرتی۔ اور نہ برطانوی حکومت کا عرصہ کم ہوتا۔

سیّد احمد خان نے نوجوانوں میں جن نظریات اور مقاصد کی آبیاری کی، انھوں نے بعد کے عرصے میں اُبھرنے والی تمام تحریکوں میں اپنا شدید اظہار کیا ہے۔ مسلم لیگ کے قیام اور مسلم یونیورسٹی کی تشکیل کے بعد جدوجہد میں طلبہ ہراوّل دستے کے طور پر شریک رہے

اس وقت یہ سمجھا جا رہا تھا کہ جو تعلیم حکومت کے زیر اثر ہوگی وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے لیے فائدہ مند اور ان کے قومی ثقافتوں کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل طلباء کا ایک پُر جوش طبقہ اس خیال کے تحت چاہتا تھا۔ کہ مسلمانوں کی تعلیم میں حکومت کا عمل دخل کسی طرح نہ رہے۔ چنانچہ تحریکِ خلافت کے دوران جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ اور تمام سرکاری اداروں، ملازمتوں اور امداد کو ترک کیا جانے لگا۔ تو تعلیمی ادارے بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ جس قرارداد کے تحت حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس میں یہ سفارش بھی کی گئی تھی۔ کہ جن تعلیمی اداروں کو حکومت خود چلاتی ہے۔ یا جن کو امداد دیتی ہے۔ ان سے طلبہ کو اٹھا لیا جائے۔ اس تحریک کے دوران سرکاری مدارس سے طلبہ کی علیحدگی کی صورتِ حال نے طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو تحریک میں رضاکارانہ حیثیت سے کام کرنے کے لیے آزاد کر دیا تھا۔ اس سے طلبہ کے سیاست میں حصہ لینے کی روایت عام ہوئی۔ اس تحریک کے دوران طلبہ کے ایک طبقہ کو جب علی گڑھ کالج کی سرکاری امداد کو جاری رکھنے کے فیصلے پر اعتراض ہوا۔ تو انھوں نے ایک جداگانہ درس گاہ جامعہ ملیّہ قائم کر لی۔ اور اسے خود اپنے وسائل سے باقی رکھا۔ اس وقت عام مسلمانوں اور بالخصوص نوجوانوں پر علامہ اقبال، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کے خیالات اور ان کی تحریروں کا بہت نمایاں اور واضح اثر قائم ہو رہا تھا خصوصًا علامہ اقبال کے اتحاد اسلامی، آزادی اور علیحدہ مسلم مملکت کے خیالات نے انھیں بہت زیادہ مشتعل اور مضطرب کر دیا تھا۔ اب نوجوانوں اور طلبہ میں بھی ایسے تصورات اور خیالات جگہ پا رہے تھے۔ جو قوم کے مستقبل کی تعمیر میں ان کے عزائم اور نصب العین کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اس صورتِ حال میں اپنے مسلم رہنماؤں کے نقشِ قدم پر بھی چلتے رہے۔ اور ان میں سے بعض نے اپنے لیے علیحدہ لیکن مثبت راہوں کا انتخاب بھی کیا۔ مولانا محمود الحسن کی تحریک "ریشمی رومال"، کا بیشتر دارو مدار طلبہ پر ہی تھا۔ جس کے تحت طلبہ نے بیرونِ ملک جا کر بھی آزادی کی جدوجہد کو موثر اور عام کیا۔

ایسے طلباء جنھوں نے بذاتِ خود اپنے تصورات اور مقاصد کو ایک عملی صورت دینے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے لیے آزادی اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد کی۔ ان میں چوہدری رحمت علی کا نام زیادہ ممتاز اور مسلمانوں میں منفرد ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں اس وقت جب کہ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ اور مسلمانوں میں آزاد اسلامی مملکت کے تصورات

ابھی تک اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ آزاد اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا۔ بعد میں جب وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے۔ تو مسلم طلبہ کو اپنا ہم خیال بنانے اور ان کو یکجا کرنے کے لیے "پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ" نامی جماعت تشکیل دی۔ جو طلبہ اور نوجوانوں کے لیے ہی مخصوص رہی۔ اس تنظیم کے تحت انھوں نے متعدد اہم کتابچے شائع کیے۔ اور پاکستان کے حصول کے لیے ایک منظم اور طویل جدوجہد جاری رکھی۔ بہت جلد انھوں نے اپنی تحریک کو انگلستان سے برِ عظیم تک پھیلا دیا۔ اور طلبہ اور نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی۔ جو تحریک پاکستان کی جدوجہد میں بہت سرگرم اور فعال ثابت ہوئی۔

اس دوران برِعظیم کی دیگر تنظیمیں بھی اپنے اپنے دائرہ اثر میں کام کرتی رہیں۔ لیکن ایک بہت سرگرم اور مستعد تنظیم "مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی اس کے محرک علی گڑھ کالج کے ایک ممتاز طالب علم محمد نعمان تھے۔ اس تنظیم نے بہت جلد اپنی شاخیں ملک کے کئی صوبوں میں قائم کر دیں۔ نوجوانوں میں تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں اس تنظیم نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے مسلمان طلباء کو منظم کرنے اور ان میں اتحاد و اتفاق کی خصوصیات پیدا کرنے اور انھیں حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں سرگرم ہونے کی ترغیب دی۔ اس کے مقاصد اور اس کے دائرہ کار کے سبب اسے بہت جلد قائد اعظم اور دیگر مسلم زعماء اور مسلم لیگ کی ستائش حاصل ہوگئی۔ خود اس تنظیم نے قائد اعظم اور مسلم لیگ کی جدوجہد میں ہر مرحلے پر اپنے آپ کو شامل رکھا۔ اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں طلبہ کے کردار کی نمائندگی کی۔

قائدِ اعظم اور نوجوان

نومبر ۱۹۴۲ء میں جب پنجاب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت قائد اعظم نے فرمائی۔ یہ اجلاس مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا مظہر تھا۔ پنجاب کے طول و عرض سے ہزاروں مخلص اور ایثار پیشہ مسلمان شریک ہوئے قائدِ اعظم اس کیفیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا تھے۔ کہ پنجاب میں یہ بیداری نوجوانوں کی مرہونِ منت ہے۔ جب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن فیصل آباد کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ تو قائد اعظم نے فرطِ جذبات سے فرمایا "آپ سب نوجوان میرے ہیں اور میں آپ کا ہوں۔ پس آپ کے اس اور آپ ہم قدم ہو کر بڑھیں ہم ضرور فتح پائیں گے"

جنوری ۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظم لاہور میں تشریف فرما تھے۔ بعض ملت دشمن عناصر نے قائدِ اعظم کو گزند پہنچانے کی کوشش کی۔ قائدِ اعظم ممدوٹ ولا میں مقیم تھے۔ سینکڑوں نوجوان رات بھر اپنے محبوب قائد کی حفاظت کے لیے پہرہ دیتے رہے کچھ عرصے بعد قائدِ اعظم شملہ تشریف لے گئے۔ بعض مسلم دشمن حلقوں کی جانب سے قائدِ اعظم کو خطرہ در پیش تھا۔ نیاز مندوں کے اصرار پر قائدِ اعظم سے فرمایا۔ کہ اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کو بلائیے۔ جنھوں نے لاہور میں میری حفاظت کا سامان کیا تھا۔

تحریک میں طلبہ کا کردار — پس منظر

تحریکِ پاکستان میں مسلم طلبا کے کردار کے تجزیہ کے طور پر چند ایک حقائق پیش کرنا بے ضروری ہے۔ معاشرے کے اور طبقوں کی طرح طلباء کے ماحول اور تاریخی عوامل نے ان کی شخصیت اور کردار پر اثر ڈالا تھا۔ جدید تعلیم کی ضرورت، سیاسی اور سماجی حالات مسلمان معاشرے کی مشکلات، برطانوی راج کی پالیسی، ہندو اکثریت کا طرزِ عمل۔ دو قومی نظریے کی حقیقت و اہمیت ان تمام عناصر نے مل جل کر مسلم عوام و خواص کی طرح مسلم طلباء کے کردار و ذہن کی تخلیق میں بھی حصہ لیا تھا۔ آپ کے! ان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید دور کا "مسلمان طالب علم"، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کی پیداوار اور سر سید احمد خان کی تعلیمی و سماجی تحریک کا نتیجہ ہے۔ طالب علم تو پہلے بھی ہوتے تھے۔ اور مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تو درس و تدریس کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مثلاً صرف روہیل کھنڈ میں پانچ ہزار تنخواہ دار مدرس تعلیم دینے پر مقرر تھے۔ سلطنت کے ہر علاقے میں مدرسے موجود تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوا۔ تو تعلیم ہی کیا۔ زندگی کی پوری بساط ہی اُلٹ گئی۔ ادھر عیسائی مشنریوں نے اسکول کھولنے شروع کیے۔ جس سے بعض لوگوں کو یہ خدشہ ہوا کہ وہ شاید بچوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ اسی خطرے سے نپٹنے کے لیے حاجی محمد حسین نے ہگلی میں اسلامیہ درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ سر سید احمد خان ہی تھے۔ جنھوں نے اس صورتِ حال کو پوری طرح سمجھا۔ اور یہ جان لیا۔ کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ پرانی وضع کے زوال پذیر معاشرے کی ٹکر یورپ کے سائنسی اور صنعتی دور کے پروردہ ترقی یافتہ اُبھرتے ہوئے معاشرے سے ہو رہی ہے۔ جس کا

مقابلہ صرف جدید تعلیم سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہتھیاروں ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ مدرسہ قائم کیا ۱۸۷۷ء میں وہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج بنا۔ اور دسمبر ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے اثرات بڑے دُور رس نکلے۔ ہر صوبے میں جگہ جگہ مسلمانوں کے مدرسے اور کالج کھلنے شروع ہو گئے اور مسلم طلباء کی نئی پود اُبھرنی شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی تعلیمِ نسواں کا چرچا ہوا۔ یہ نئی پود پرانی وضع کے مدرسوں اور مکتبوں کے تعلیم یافتہ طلباء سے مختلف ثابت ہوئی۔ یہی نئی وضع کے طلباء تھے۔ جنھوں نے جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو کر طلبا کی حیثیت سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ اور کامیابی حاصل کی۔

تاریخ کی ایک ناقابلِ انکار حقیقت یہ ہے۔ کہ سر سیّد نے اپنے زمانے میں مسلمانوں کو اور ظاہر ہے۔ کہ مسلم طلباء بھی ان مسلمانوں کا ہی ایک اہم جزو تھے۔ کانگریس سے الگ رہنے کی تلقین کی تھی۔ ان کی دُور بین نگاہ نے صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کر لیا تھا۔ سیّد رضا علی کے مطابق:-

"سر سیّد احمد خاں نے کانگریس کی مخالفت اس وجہ سے کی تھی۔ کہ مسلمان تعداد میں غیر مسلموں سے بہت کم ہیں۔ اگر اہلِ ملک کو حقوق دینے میں نمائندگی کے وہ اصول ہندوستان میں رائج کیے گئے۔ جن کا تجزیہ انگلستان میں کیا گیا ہے تو مسلمان کہیں کے نہ رہیں گے۔"

نئے سیاسی اور سماجی حالات کی روشنی میں سر سیّد کی تعلیم و تربیت نے مسلمانوں پر یہ نکتہ واضح کر دیا تھا۔ کہ ان کا علیٰحدہ قومی تشخص اور الگ ضروریات ہیں۔ سر سیّد کی تحریک صرف کالج کھولنے تک محدود نہ تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے، لیکچروں کی وساطت سے اور مسلسل عمل سے مسلمانوں کی تعلیم، ذہنی تربیت، معاشرے کی اصلاح، عقائد و زبان سب کی طرف توجہ دی۔ تقریباً ہر موضوع پر ان کے مضامین موجود ہیں۔ اردو کو انھوں نے ایک کاروباری زبان بنایا۔ اور نثر کی آبیاری کی۔ اور زبان پر جو حملے ہو رہے تھے۔ اس سے بچایا۔ اس لیے کہ دراصل ان کے خیال میں ان حملوں کا مقصد سیاسی تھا۔ سر سید بورڈنگ سسٹم کو پسند کرتے تھے۔ ان کے کالج میں پنجاب، بنگال، سندھ، سرحد، یو پی، مدارس، بمبئی غرضیکہ برّصغیر کے کونے کونے سے لڑکے آتے تھے۔ ایک جگہ رہتے تھے۔ اور کھانا کھاتے تھے۔ ساتھ پڑھتے تھے۔ اور کھیلتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان میں قومی یگانگت اور میل جول

پروان چڑھا۔ اس طرح پڑھے لکھے طبقے میں قومی تشخص کا احساس اور بھی زیادہ مضبوط ہونے لگا اور رفتہ رفتہ منتشر افراد جن کا تعلق نئی نسلوں سے تھا۔ ایک لڑی میں پروئے جانے لگے۔

یہ حقیقت نہیں ہے۔ کہ سرسید تنگ نظر یا فرقہ پرست تھے۔ ان کے بہت سے دوست ہندو اور سکھ بھی تھے۔ انھوں نے لائق ہندو استادوں کو ایک الگ اکائی تصور کرتے تھے۔ اور مشترکہ قومیت کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے مشہور کانگریسی لیڈر بدرالدین طیب جی کو ۱۸۸۸ء میں ایک خط لکھا تھا۔ جس میں مشترکہ قومیت کے بارے میں اپنے خیالات واضح کیے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی سمجھ میں "نیشنل کانگریس" کی اصطلاح نہیں آئی۔

"کیا وہ تمام فرقے اور ذاتیں جو ہندوستان میں بستی ہیں ایک قوم ہیں؟ کیا ان کے جذبات و احساسات ایک ہیں؟ میری رائے میں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے "نیشنل کانگریس" قسم کی کوئی چیز نہیں ہے"

متحدہ قومیت سے سرسید کو اس وقت سے مایوسی شروع ہو چکی تھی۔ جب بنارس کے چند سربرآوردہ ہندوؤں نے اردو کی مخالفت شروع کی تھی۔ مولانا حالی نے بنارس کے کمشنر شیکسپیر کے ساتھ ان کی گفتگو کی جو نقل پیش کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ گو اس وقت تک "پاکستان" کے لفظ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لیکن دو قومی نظریہ صاف نظر آنے لگا تھا۔ جس کی بنا پر آئندہ چل کر قائدِ اعظم نے الگ ملک کا مطالبہ کیا۔ شیکسپیر نے سرسید سے کہا تھا۔ کہ آج پہلا موقع ہے۔ کہ میں نے تم سے "خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے" سرسید نے جواب دیا۔ کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا۔ دیکھے گا۔ اس کا مجھے رنج ہے مگر مجھے اپنی پیشین گوئی پر پورا یقین ہے۔"

سرسید نے ایجوکیشن کمیشن پر بھی ظاہر کر دیا تھا۔ کہ اردو ہندی کا مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے۔ ان کے زمانے کے ایک اور نہایت ذہین اور طباع مصنف مولوی نذیر احمد کہتے ہیں "سرسید کے میگزین "تہذیب الاخلاق" کے تصرفات تھے۔ کہ مسلمانوں میں قوت اجتماعی کی تحریک پیدا ہوتی۔ یہ اسی کے تصرفات تھے۔ کہ الفاظ "قوم" قومی ہمدردی، قومی خیر خواہی ہمارے روزمرہ میں داخل ہو گئے۔"

سرسیّد کی وفات (۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی تعلیمی اور اصلاحی کوششوں کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اور اس قوم کے خدوخال اُبھرنے لگے۔ جو پاکستان بنانے والی تھی۔ مسلمانوں کا ایک ایسا خاصا اہم گروہ پیدا ہو گیا۔ جس نے تعلیم سے فائدہ اُٹھایا اور حالات کے نئے تقاضوں کو سمجھا۔ اس کے قومی تشخص کی حس بیدار ہو گئی۔ جدید تعلیمی اداروں سے تعلیم پاکر جو کھیپ نکلی۔ وہ برّصغیر کی اہم تحریکوں میں حصہ لینے کی قابلیت و استعداد رکھتی تھی۔ خلافت کی تحریک ہو یا جنگِ بلقان کا مسئلہ ہو یا سول نافرمانی کا معاملہ ہو۔ یہ نئے تعلیم یافتہ مسلمان ان سب میں موثر کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طبقے نے مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان جیسے لوگ پیدا کیے۔ جو آزادی کے پروانے بھی تھے۔ اسلامی اقدار کے رکھوالے بھی۔

اگرچہ اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں مسلمانوں کا تعلیم یافتہ فعّال اور سمجھ دار طبقہ وجود میں آچکا تھا۔ مگر سیاسی اعتبار سے ابھی مسلمانوں کی کوئی پائیدار اور منظم مرکزی قیادت موجود نہ تھی۔ خلافت کی سامراج دشمن تحریک آندھی کی طرح اُبھری اور ختم ہو گئی۔ عام آدمیوں کی طرح مسلم طلبا بھی گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ کچھ کانگریس سے اُمیدیں باندھے ہوئے تھے۔ کچھ ملازمتوں کے چکر میں گرفتار تھے۔ بعض الگ کھڑے حالات کو دور سے دیکھتے تھے۔ اس لیے کہ نہ کوئی واضح مقصد ان کے سامنے تھا۔ اور نہ کوئی ملک گیر موثر قیادت انھیں راستہ دکھانے کے لیے موجود تھی۔ ہاں! کانگریس ایک مضبوط موثر اور اہم ادارہ بن چکی تھی۔ لیکن جتنی وہ مضبوط ہوتی گئی۔ مسلمانوں میں اس کی نیّت کے بارے میں اسی قدر شبہات پیدا ہوتے گئے۔

تاریخ گواہ ہے۔ کہ جب تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ تو اقلیت میں ہونے کے باوجود نفسیاتی طور پر انھیں تحفظ کا احساس تھا۔ مگر انگریز آئے تو انھوں نے ہندوؤں کو آگے بڑھایا۔ اور مسلمان پیچھے رہ گئے۔ اور دشمنی اور مذہبی تعصب نے ان میں خطرے کا احساس پیدا کیا۔ سرسیّد کی جدید تعلیم و تربیت کی تحریک نے انھیں سیاسی و معاشی سوجھ بوجھ اور نئے زمانے کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی استطاعت عطا کی۔ اور اس طرح الگ قومی تشخص کا خوابیدہ احساس جاگ اُٹھا۔ یہ پس منظر تھا۔ جب قائدِ اعظم نے نیم جان آل انڈیا مسلم لیگ میں نئی روح پھونکی اس احساس نے استحکام حاصل کیا۔ اور مسلمان پھر فعّال اور متحرک ہونے شروع

ہو گئے۔ قائدِ اعظم نوجوان مسلمان طلباء کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے طلباء کو منظم کرنے میں مدد دی۔ انھیں روشنی دکھائی اور پھر مسلمان طلباء کی خوج ظفر موج حصولِ پاکستان کی جدوجہد کرنے کے لیے میدانِ عمل میں آ گئی۔ غالباً برِّصغیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ طلباء منظم ہو کر باقاعدہ طور پر ایک معیّنہ مقصد کے لیے جماعتی حیثیت سے آگے بڑھے۔

آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن

جولائی ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اجلاس کی صدارت کے لیے مسٹر جناح کو مدعو کیا گیا۔ اس اجلاس میں شرکت کے بعد مسٹر جناح نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ کانگریس ایک دفعہ پھر یہ کوشش کر رہی ہے۔ کہ طلباء کو ترقی پسندی کے نعروں میں پھنسا کر اپنے قبضے میں لے آئے

سٹوڈنٹس فیڈریشن کا یہ اجلاس تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہی مسلم طلباء کی تحریک کا نقطہ آغاز اور ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

اجلاس کے پہلے دن جب پنڈت نہرو افتتاحی تقریر کر رہے تھے۔ تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم راحت سعید چھتاری کھڑے ہو گئے۔ اور پنڈت نہرو سے درخواست کی۔ کہ براہِ کرم کچھ دیر کے لیے تقریر ملتوی کر دیں تاکہ مسلمان مندوبین مغرب کی نماز ادا کر سکیں۔ راحت چھتاری کی یہ بات سنتے ہی ہندو لڑکوں نے شور مچانا شروع کر دیا لیکن مسلمان طلباء کے مسلسل اصرار پر پنڈت نہرو کو اعلان کرنا پڑا کہ اگر اجلاس کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ تو انھیں اعتراض نہ ہو گا۔ چنانچہ اجلاس ملتوی ہوا۔ مسلمان طلباء اور چند اور مسلمان جو وہاں موجود تھے ہال سے باہر آ گئے اور لان میں با جماعت نماز ادا کی۔

قائد کا خطاب اگلے روز قائدِ اعظم نے اپنی صدارتی تقریر کی۔ جب انھوں نے کہا "کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اور مسلمانوں کی الگ انفرادیت ہے۔ تو ہال میں شور مچ گیا۔ ہندو لڑکوں نے شوٹنگ شروع کر دی اور قائدِ اعظم کے خلاف نعرے لگائے۔ چنانچہ ہندوؤں کی طرف سے شدید ردِّ عمل ہوا۔ جب شور زیادہ بڑھا۔ تو

قائدِ اعظم خاموش ہو گئے۔ اور ساکت و صامت کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ شور قدرے کم ہوا اس کے بعد انھوں نے اپنے خاص انداز سے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اور صاف واضح الفاظ اور گرجتی ہوئی آواز میں پھر دہرایا۔

"میں کہتا ہوں کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اور مسلمانوں کی نمائندگی مسلم لیگ کرتی ہے۔" ہندو طلباء کو غالباً اُمید تھی کہ یا تو قائدِ اعظم معافی مانگیں گے۔ یا اپنا بیان واپس لے لیں گے یا اس کی کوئی قابلِ قبول تشریح کر کے بات کو ٹال دیں گے۔ لیکن دوبارہ جب قائدِ اعظم نے وہی بات اور بھی بلند آواز سے دہرائی تو کچھ ایسا اثر ہوا۔ کہ لڑکے ہکا بکا ہو گئے۔ اور کسی نے چوں تک نہ کی۔ اور پھر قائدِ اعظم نے اپنی تمام خطیبانہ قوتوں کو بروئے کار لا کر ایسی مدّلل اور زبردست تقریر کی۔ نہ کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور پوری تقریر خاموشی سے سُنی گئی۔

قائد کی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آئے۔ جب انھیں مخالفین کے جلسوں میں خطاب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے مضبوط اعصاب مدّلل اندازِ بیان اور اعلیٰ فصاحت و بلاغت سے سامعین کو مسحور کر لیتے۔ اور ان سے اپنی بات منوا کر چھوڑتے۔

سٹوڈنٹس فیڈریشن کا یہ جلسہ بھی ایسا ہی ایک موقع تھا۔ قائد جلسہ کے اختتام پر جب ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ تو چند مسلمان طلباء نے ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم نعمان اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ ان کے ذہن میں خیال آیا۔ کہ مسلم طلباء کی ایک الگ تنظیم بنائی جائے۔ اگلے دن صبح جب وہ قائدِ اعظم سے ملنے گئے۔ تو انھوں نے یہ تجویز ان کے سامنے رکھی۔ انھوں نے فوری طور پر اسے تسلیم کیا۔ اور اپنی امداد کا یقین دلایا۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کی تجویز

جب مسلم طلباء کو فیڈریشن کے قیام کے سلسلے میں قائدِ اعظم کی حمایت حاصل ہو گئی۔ تو انھوں نے بلا تاخیر اخبارات میں اس تجویز کا اعلان شائع کرا دیا۔ ہندو لیڈروں نے اس پر کڑی نکتہ چینی کی اور بہت سختی سے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ مسلم یونیورسٹی کے سامنے جو قرارداد پیش کی گئی۔ اس میں منجملہ اور باتوں کے یہ کہا گیا تھا کہ :۔

"علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء کی رائے ہے۔ کہ اب وقت آ گیا ہے۔ اور اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ کہ کل ہند سطح پر مسلمان طلباء کی ایک مرکزی تنظیم قائم کی جائے۔ جسے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن یا اسی قسم کا کوئی نام دیا جائے۔ تاکہ ملک کے تمام صوبوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلمان طلباء کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم معرض وجود میں آئے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ان میں سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی روابط اور مذہب کو سمجھنے کی بہتر صلاحیت پیدا کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔"

علاوہ ازیں قرارداد میں اس رائے کا بھی اظہار کیا گیا۔ کہ مجوزہ تنظیم کے قیام کے سلسلے میں اقدامات کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے۔ کہ دوسرے صوبوں کی یونیورسٹیوں کے مسلمان طلباء کی رائے بھی معلوم کی جائے۔ اور اگر وہ اس تجویز کی تائید کریں۔ تو پھر مجوزہ تنظیم کے قیام کے لیے جلد از جلد ضروری اقدامات کیے جائیں۔

ہر چند کہ یہ قرارداد معقول تھی۔ بلکہ اس میں کانگریس نواز آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف کوئی معاندانہ اشارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن حقیقتاً اس وقت تک علی گڑھ کی فضا مسلم طلباء کی علیحدہ تنظیم کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن چند ہی ماہ بعد حالات میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور مسلم یونیورسٹی یونین نے خود آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام اور اس کے مقاصد کی تائید کا فیصلہ کر لیا۔

اسی دوران دو اہم ترین مسلم اکثریتی صوبوں یعنی پنجاب اور بنگال میں بھی مسلم طلباء کی الگ تنظیم کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ سیاسی فضا بڑی تیزی سے تبدیلی ہو رہی تھی قائدِ اعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ اپنے مقصد اور اپنی منزل کا تعین کر چکی تھی۔ اور اب وہ ایک پرجوش عوامی جماعت بنتی جا رہی تھی۔ اور مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے آثار ہر جانب صاف نظر آنے لگے تھے۔ انہی دنوں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت تمام انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ یہ انتخابات نہایت اہم ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ ایک سال کے اندر اندر لیگ کی کایا پلٹ گئی۔ اور مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی زندگی کا اہم ترین سفر تیزی سے شروع ہو گیا۔

مسلم طلباء کی کانفرنس ــــ لکھنؤ

ان دنوں لکھنؤ کے مسلمان طلباء نے ایک کانفرنس کرانے کا فیصلہ کیا۔ کانفرنس ۲۸/ اور ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۵ء کو ہونا قرار پائی۔ ممتاز ماہر تعلیم اور مترجم قرآن علامہ عبداللہ یوسف علی سے درخواست کی گئی۔ کہ وہ کانفرنس کی صدارت کریں۔ انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ صرف چھ ماہ قبل جس

شہر میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کا وہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس نے مسلم طلباء کو نا امید و ناراض کر دیا تھا۔ اب اسی لکھنؤ میں ان کی الگ تنظیم قائم کرنے کے لیے کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ داعیان جلسہ نے ایک "اپیل" شائع کی جس کا حسبِ ذیل اقتباس قابلِ غور ہے:۔

"ہم مسلمانوں کی جو اس وقت جو حالت ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ کہ اتحاد و استحکام اور روشن خیالی کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ اور جو لمحہ گزرتا ہے۔ وہ اس ضرورت کی شدت کو اور بھی واضح کرتا ہے۔ ہم اجتماعی زندگی میں اپنا صحیح مقام اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک تمام مسلمان اسلامی اخوت کی بنیاد پر اپنے مقاصد و افکار میں ارتباط پیدا نہ کریں۔ مسلمان نوجوانوں کو ملّت کے ذہنی جمود اور تساہل کا پورا شعور ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سُستی اور کاہلی کو جھٹک کر الگ پھینک دیں۔ اور ملّت میں ایک نئی رُوح پھونکیں۔ یہ کام مسلمان طالب علم کو کرنا ہے۔ اسے اپنی پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنا ہے۔ اسے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ جہاں وہ اپنی مشترکہ قوتوں کو جمع کر سکے۔ اور ایک واضح مقصد کا تعیّن کر سکے۔ ان اہم ضروریات کے لیے ایک کُل ہند مسلم طلباء کی کانفرنس کا قیام ضروری ہے۔"

اس اپیل میں طلباء کی مجوزہ تنظیم کے اغراض و مقاصد واضح کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔ کہ:۔

"ہمارے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ عناصر جو ہم سے بہتر وسائل رکھتے ہیں۔ اور ہم سے زیادہ منظم ہیں۔ جب ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں تو ہم اپنا دفاع کر سکیں۔ قوم کی بے حسی دور کرنے کے ایک مؤثر مہم چلانا۔ غیر متحرک اور جمود کے مارے ہوئے عوام میں نئی روح پھونکنا، اُمید اور خود اعتمادی پیدا کرنا۔ اپنی تاریخی انفرادیت کے احساس کو اپنے جوشِ عمل سے از سرِ نو جنم دینا اور بین الاقوامی سٹیج پر ایک اہم کردار ادا کرنا۔ یہ ہیں وہ عظیم الشان مقاصد جس کی طرف مسلمان نوجوانوں کو توجہ دینی ہے۔ اگر یہ مقاصد نظروں کے سامنے رہے۔ تو بے شک ملک کی ترقی میں نمایاں حصہ لینا مسلمانوں کا مقدّر ہو گا۔"

اس اپیل کے شائع ہوتے ہی اس کا خوش گوار ردِّ عمل ظاہر ہونا شروع ہوا۔ علی گڑھ کی صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ وہاں اکثریت مسلم طلباء کی علیحدہ تنظیم کے حق میں ہو گئی۔ وہی یونین جہاں چند دن پہلے تک کانگریس کے موقف کی تائید میں آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اب قائدِ اعظم کے موقف کی طرف جھک رہی تھی۔ فضا میں اتنی تیزی سے تبدیلی آئی کہ کانگریس

کی قیادت بھی انگشت بدنداں رہ گئی۔ اور آخر کار علی گڑھ یونیورسٹی یونین نے یہ قرارداد منظور کرلی۔ کہ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ایک دفعہ پھر علی گڑھ نے قوم کی آواز پر لبیک کہا۔

لکھنؤ کانفرنس کے منتظمین یہ چاہتے تھے۔ کہ علی گڑھ کی پوری پوری حمایت ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علی گڑھ مسلمانانِ برصغیر کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ اور وہاں ہر صوبے کے طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ لکھنؤ کانفرنس کو چند دن کے لیے ملتوی کیا جائے۔ تاکہ انتظامات کے لیے کچھ اور وقت مل جائے۔ اور اس دوران یہ کوشش کی جائے۔ کہ کانفرنس بہت بڑے پیمانے پر منعقد کی جا سکے۔ چنانچہ طے کیا گیا۔ کہ اب کانفرنس ۱۷/ جنوری ۱۹۳۶ء کو منعقد ہو گی۔ اس تاریخ کو علامہ عبداللہ یوسف علی کہیں اور مصروف تھے اس لیے انھوں نے شرکت سے معذوری ظاہر کی سید وزیر حسن الیکشن میں مشغول تھے۔ لہٰذا وہ بھی صدارت کے لیے تیار نہ ہوئے۔ لیکن مشیر حسین قدوائی نے صدارت کی پیش کش قبول کر لی۔ جب یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی کہ مسلمان طالب علم اپنی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کرنے والے ہیں۔ تو کانگریسی حلقوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ ہندو طلباء نے طے کیا۔ کہ کسی نہ کسی طرح کانفرنس کو ناکام بنایا جائے۔ اور اس کام کے لیے چند مسلمان کاسہ لیسوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ہندوؤں کے اس ارادے کو دستاویزی ثبوت اس طرح حاصل ہوا۔ کہ لکھنؤ کے ایک ہندو طالب علم نے اپنے ایک دوست کو جو الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ ایک خط لکھا جو پکڑا گیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"الہ آباد سے اپنے چند مسلمان دوستوں کو ساتھ لے کر آؤ۔ وہ اس کانفرنس میں شریک ہو کر اندر سے اس کا تختہ الٹ دیں گے۔ وہ ناممکن العمل تجاویز پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً کمیونل ایوارڈ کو مسترد کر دیا جائے۔ اور آزادی کامل کا ریزولیشن پیش کیا جائے۔ اس طرح رجعت پسند عناصر کو مشکل کا سامنا ہو گا۔"

کانفرنس شروع ہوئی۔ تو صاف ظاہر ہو گیا۔ کہ اسے ناکام بنانے کی کوششیں کس کس طرح کی گئی تھیں۔ اجلاس سے ایک دن پہلے ندوۃ العلماء اور مدرسہ فرنگی محل کے چند طالب علموں نے منتظمین سے درخواست کی۔ کہ چونکہ ہم مقررہ فیس ادا کرنے سے معذور ہیں۔ اس لیے انھیں فیس کے کانفرنس میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ منتظمین یہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ کانفرنس

میں گروہ بندی کے مواقع پیدا ہوں۔ اس لیے انھوں نے دس طلباء کو بلا فیس کانفرنس میں شریک ہونے اور ووٹ دینے کی اجازت دے دی۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ دراصل اس گروہ کا مقصد گڑبڑ اور انتشار پیدا کرنا تھا۔

۱۷/جنوری کو کانفرنس منعقد ہوئی۔ تو ندوہ اور فرنگی محل کے طلباء کثیر تعداد میں ہال کے دروازے پر جمع ہو گئے۔ اور بہت سے اندر آگئے۔ ان کا مطالبہ تھا۔ کہ ان سب کو کانفرنس میں شریک کیا جائے۔ اس صورتِ حال سے صدر جلسہ مشیر حسین قدوائی کو آگاہ کیا گیا۔ انھوں نے فیصلہ دیا۔ کہ ان میں صرف ان دس طلباء کو فیس دینے والے ملازمین کی طرح ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گا۔ جس کے بارے میں سیکرٹری کانفرنس نے پیشگی مطلع کر دیا تھا۔ صدر کے اس فیصلے سے گڑبڑ کرنے والے گروہ کی سازش ناکام ہو گئی۔

پہلا اجلاس ڈیڑھ بجے ختم ہو گیا۔ دوسرا چار بجے شام کو شروع ہونے والا تھا۔ درمیانی وقفے میں کمیٹی کا جلسہ ڈھائی بجے منعقد ہونا تھا۔ لیکن اس دوران مشیر حسین قدوائی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کانگریس نواز گروہ نے جس کی پہلی چال صبح کے اجلاس میں ناکام ہو چکی تھی۔ دوسری چال چلی۔ انتشار پھیلانے والے ان تمام لوگوں نے جو زبردستی ہال میں ناجائز طور پر داخل ہو چکے تھے۔ یا داخل ہونا چاہتے تھے۔ دونوں کے درمیانی وقفے میں اپنا ایک الگ جلسہ کر ڈالا۔ اور کئی قراردادیں منظور کر ڈالیں۔ جو کانفرنس کے صریح مقاصد کے منافی تھیں۔ مگر کانگریس نواز حلقوں نے یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کی۔ کہ جن خیالات کا اظہار ان قراردادوں میں کیا گیا ہے۔ دراصل وہی خیالات مسلمان طلباء کی اکثریت کے تھے۔

ان حالات کے پیشِ نظر اگلے دن مشیر حسین قدوائی نے ایک بیان جاری کیا۔ جس میں کانگریس نواز اور انتہا پسند گروہ کی تمام قراردادوں کو کالعدم قرار دیا۔ انھوں نے کہا۔ کہ چونکہ جلسہ ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر منعقد کیا گیا۔ اس لیے وہ غیر قانونی ہے۔ اور اس میں جو قراردادیں منظور کی گئی ہیں وہ کانفرنس کی قراردادیں نہیں ہیں۔ اور نہ ہی کانفرنس سے ان کا کوئی تعلق ہے اس لیے اس فتنہ کا خاتمہ کیا جائے۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام

۱۰/جنوری کو ساڑھے چار بجے کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ جس میں یہ فیصلہ کیا

گیا۔ کہ کُل ہند سطح پر مسلمان طلباء کی ایک مستحکم تنظیم ہو۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہو۔ مسلمانوں کے قومی تشخص کی مکمل عکاسی کرے۔ چنانچہ اس طرح آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد پڑی۔ جس نے آگے چل کر تحریکِ پاکستان میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ بنگال میں مسلم طلباء نے اپنی صوبائی تنظیم آل بنگال مسلم سٹوڈنٹس لیگ پہلے ہی قائم کر لی تھی۔ جس کے روحِ رواں محمد عبدالواثق تھے۔ انھیں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا پہلا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا جب کہ محمد نعمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آرگنائزنگ سیکرٹری منتخب کیے گئے۔

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے وجود میں آنے پر جن اہم شخصیات نے خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال بھی تھے۔ علامہ نے ایک خصوصی پیغام فیڈریشن کے نام بھیجا۔ ان کے علاوہ نواب بہادر یار جنگ، علامہ عبداللہ یوسف علی، پروفیسر ابو بکر احمد حلیم، میاں بشیر احمد اور مسٹر عبدالعزیز بیرسٹر پٹنہ کی طرف سے بھی مسرت و مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے۔ لکھنؤ کے ایڈووکیٹ چوہدری اختر حسین نے کانفرنس میں کافی دلچسپی لی تھی۔ بعد میں انھوں نے ایک رپورٹ شائع کی۔ جس میں انھوں نے مسلم طلباء کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

فیڈریشن کا پہلا اجلاس

مسلمان طالب علم اب تاریخ کے نئے باب میں داخل ہو رہے تھے۔ آئندہ لائحہ عمل کی تیاریاں شروع ہو گئیں اگلے سال کلکتے میں فیڈریشن کا پہلا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس دور میں لندن کے بعد کلکتہ سلطنتِ برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا شہر سمجھا جاتا تھا۔ کلکتے کی رونق کرسمس کے موقع پر اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ موسم کے لحاظ سے یہ شہر سال کے بیشتر مہینوں میں گرم اور مرطوب رہتا ہے۔ مگر دسمبر میں یہاں موسم نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ کرسمس انگریزی دور میں بڑے زور و شور سے منایا جاتا تھا۔ دوکانوں اور سڑکوں کی رونق قابلِ دید ہوتی تھی۔ اور کرسمس کا وائسرائے ہند کلکتہ میں گذارا کرتا تھا۔ کشتی رانی، رقص و سرور کی محفلیں اور عشائیے اپنے شباب پر ہوتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۷ء کے دسمبر میں مسلم طلباء کے لیے ان میں سے کوئی شئے دلکشی نہیں رکھتی تھی۔ ان کے لیے یہ دسمبر اس لیے اہمیت کا حامل تھا۔ کہ قائدِ اعظم بہ نفسِ نفیس اس سال کلکتے میں ان کے درمیان موجود تھے۔ وہ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پہلے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے۔ آل بنگال مسلم سٹوڈنٹس لیگ کا الحاق آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس

فیڈریشن سے ہو چکا تھا اور سٹوڈنٹس لیگ ہی پہلے سالانہ اجلاس کی میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اجلاس سے چند دن پہلے فیڈریشن کے آرگنائزنگ سیکرٹری مسٹر محمد نعمان نے پٹنہ اور چند شہروں کا دورہ کیا۔ تقریباً تمام صوبوں میں فیڈریشن کی شاخیں قائم کر دی گئیں۔ ان تنظیمی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسلم طلباء میں اپنے حقوق کا شعور اور بیدار ہو گیا۔ اور تمام تعلیمی اداروں میں مسلمان طالب علموں نے اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور منظم ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کلکتہ کا اجلاس اسی خوشگوار پس منظر میں ہوا۔

ایک شام کو شہر کے مسلمان لیڈروں اور طالب علموں کا اجتماع اسلامیہ کالج کے احاطے میں ہوا۔ تاکہ آنے والے اجتماع کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا جا سکے۔ آخر کار فیصلہ کیا گیا۔ کہ فضل حق مسلم بنگال کے لیڈر کی حیثیت سے اور محمد واثق اور محمد نعمان فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری اور آرگنائزنگ سیکرٹری کی حیثیت سے قائدِ اعظم سے درخواست کریں۔ کہ وہ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پہلے سالانہ اجلاس کی صدارت قبول فرمائیں۔ اس کے بعد محمد نعمان بمبئی گئے۔ اور قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے قائد کے سامنے مسلمان طلباء کی کارکردگی کی روداد پیش کرنے کے بعد اُن سے درخواست کی۔ کہ وہ مسلمان طلباء کی دلی خواہش کے مطابق اجلاس کلکتہ کی صدارت قبول فرمائیں۔ اور طلباء کی رہنمائی کریں۔ قائدِ اعظم نے ایک لمحہ بھی توقف کیے بغیر رضامندی کا اظہار کیا۔ جب انھیں کہا گیا کہ آیا یہ خبر شائع کرا دی جائے۔ تو قائدِ اعظم نے کہا "ابھی اور اسی وقت شائع کرا دو"۔ اجلاس کلکتہ کے بعد سے طلباء قائدِ اعظم کی رہنمائی میں ہمیشہ آگے بڑھتے رہے۔ قائد نے آئندہ کبھی بھی آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاسوں کی صدارت سے انکار نہیں کیا۔ وہ جہاں جاتے تھے۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود طلباء سے ملنے کا وقت ضرور نکال لیتے تھے۔

جب یہ خبر شائع ہوئی۔ کہ قائدِ اعظم نے طلباء کے اجلاس کی صدارت قبول کر لی ہے۔ تو کلکتہ میں خوشی اور جوش کی لہر دوڑ گئی۔ یہ خبر نہ صرف طلباء کے لیے بلکہ کلکتہ کے سیاسی حلقوں اور خصوصاً مسلم لیگ والوں کے لیے بھی بے حد اہم تھی۔ مسٹر حسین شہید سہروردی نہایت پُرجوش اور انتھک کام کرنے والے آدمی تھے۔ انھوں نے فوری طور پر محمد علی پارک میں ایک شاندار پنڈال قائم کرا دیا۔ کلکتے کے مسلم لیڈروں نے طلباء کی بھرپور اعانت کی۔ اور قائدِ اعظم کے پُرتپاک استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جس دن قائدِ اعظم ریل سے کلکتہ آئے تو ہوڑہ اسٹیشن

پر ہجوم کا یہ عالم تھا۔ کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ قائدِ اعظم کا ایسا شاندار استقبال ہوا۔ کہ مخالفین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیئں۔ اگرچہ کانگریس نواز حلقوں نے صورتِ حال کو خراب کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

قائدِ اعظم اصفہانی خاندان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی بنگال کی سیاست میں قائد کے معتمدین میں تھے۔ طلباء کا ایک وفد اصفہانی ہاؤس میں قائدِ اعظم سے ملاقات کرنے گیا۔ تاکہ فیڈریشن کے آئین کے بارے میں ان سے مشورہ کر سکے۔ آئین کے مسودے میں ایک جگہ یہ لکھا گیا تھا۔ کہ فیڈریشن (MASSES) سماجی اور اقتصادی ترقی کی کوشش کرے گی۔ قائد نے مشورہ دیا کہ اس کی بجائے (PEOPLE) یعنی عوام الناس کا لفظ زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ سیاسی بول چال میں (MASSES) کے لفظ سے ذہن کسانوں وغیرہ کی طرف جاتا ہے۔ جب کہ (PEOPLE) میں شہروں اور دیہات کے تمام عوام شامل ہیں۔ بعد میں فیڈریشن کے آئین میں اس کی جگہ "مسلمانان" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

محمد علی پارک کے وسیع اور خوب صورت پنڈال میں پیر کے دن ۲۷/دسمبر/ ۱۹۴۳ء سات بجے شام مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ مسٹر ایم۔ اے جناح کی صدارت میں شروع ہوا۔ مسٹر فضل حق، خواجہ ناظم الدین اور سید عبدالعزیز پنڈال میں داخل ہوئے۔ تو فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ ان کے علاوہ آسام کے وزیرِ اعلیٰ سر سعد اللہ، مسٹر حسین شہید سہروردی، نواب بہادر ڈھاکہ، مولانا اکرم خان، مولوی تمیز الدین خان وغیرہ بھی جلسے میں موجود تھے۔

مولوی فضل حق کا خطاب

جلسے کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مولوی فضل حق نے جلسے سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا "میں حال ہی میں بنگال کے مشرقی علاقوں کا طویل دورہ کر کے آیا ہوں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے۔ کہ کانگریس کے کارکنوں اور ہمدردوں نے نہ صرف میری وزارت کے خلاف بلکہ عام مسلمانوں کے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے"۔ یہ سن کر حاضرین نے "شرم شرم" کے نعرے لگائے تو فضل حق نے کہا شرم شرم کے نعرے نہ لگایئے۔ میں نے پہلے بھی اس قسم کے نعرے بہت سُنے ہیں۔ ایسے نعروں سے کوئی فائدہ نہیں ہے "شرم" کے نعرے لگانے کی بجائے سخت اقدام کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو بعض حقائق سے آگاہ کروں گا۔ جن سے صورتِ حال خود واضح

ہو جائے گی۔ جن صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہیں۔ وہاں یونائیٹڈ پریس آف انڈیا اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے نمائندے وزراء کے ساتھ جگہ جگہ جاتے ہیں۔ اور ان کی تقریروں کی بڑے پیمانے پر تشہیر کرتے ہیں۔ میں نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نہایت تفصیلی دورہ کیا۔ لیکن یونائٹڈ پریس اور ایسوسی ایٹڈ پریس نے میرے دورے کا بائیکاٹ کیا۔ میں نے کئی مرتبہ پریس کے نمائندوں سے کہا۔ کہ وہ میرے ساتھ جلسوں میں چلیں اور سُنیں کہ میں لوگوں سے کیا کہتا ہوں۔ لیکن وہ جان بوجھ کر جلسوں میں نہیں جانا چاہتے۔ اور جب جلسے ختم ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اپنے تخیّل کی مدد سے میری تقریر چھاپ دیتے ہیں۔ اور جو باتیں میں کہتا ہوں۔ انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور جو نہیں کہتا وہ میرے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح وہ جھوٹ اور سچ کا ایک عجیب و غریب ملغوبہ پیش کر دیتے ہیں۔ جھوٹ کی بنیاد پر بنی ہوئی یہ عمارت اخباروں میں نظر آتی ہے۔ اگر پریس اور خبر رساں ایجنسیاں اس طرح بائیکاٹ کریں گی۔ تو جو میں کہتا ہوں۔ وہ لوگوں تک پہنچ سکے گا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کہ کیا آپ کے لیے ان حقائق سے غافل رہنا مناسب ہوگا۔ اور کیا آپ ایجی ٹیشن کے اس ریلے میں بہہ جانا پسند کریں گے۔ جو ایک تباہ کن امر ہے یہ ایجی ٹیشن میرے اور میری کابینہ کے خلاف محض اس لیے کیا جاتا ہے۔ کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر میں ایک ہندو وزیر ہوتا تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی۔ شرم شرم کے نعرے نہ لگاتے۔ اس سے نہ آپ کا فائدہ ہوگا۔ نہ میرا وقت آ چکا ہے۔ کہ بنگال کے مسلمان راست اقدام کریں اور اگر ان کی رگوں میں مسلمان خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔ تو حق بات کہنے سے ہرگز گریز نہ کریں۔ اس لیے کہ صورتِ حال کو بدلنے کی یہی ایک صورت ہے۔"

جو لوگ انصاف اور ایمان داری کے تمام اصول بھلا چکے ہوں۔ اور وہ آپ کے خلاف باضابطہ معاندانہ پروپیگنڈہ کریں۔ تو آپ کیا کریں گے۔ یہ بدترین قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت ہے۔ لیکن جو لوگ اس قسم کے وحشیانہ پروپیگنڈہ میں مصروف ہیں۔ اچھا ہوگا۔ اگر وہ یہ جان لیں کہ میرے پاس ان سب کے لیے مضبوط ڈنڈا موجود ہے۔ میں سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ کہ اس صوبے سے اس قسم کی فرقہ داریت کا خاتمہ کر دوں گا۔ فرقہ پرستوں کو خبردار ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ جب وقت آئے گا تو وہ مجھے سخت اقدام کے لیے مضبوط و مستحکم پائیں گے۔" مسٹر فضل حق نے مسلمان نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر

جمع ہو جائیں۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے آجائیں۔ ہندوستان کے مسلمان چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک سیلاب کرتا ہے۔ آپ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے منظم ہو جائیں آپ اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کر دیں۔ کہ آپ کی تنظیم نہ صرف آپ کے اور آپ کی جماعت کے لیے بلکہ پورے ملک اور اہل ملک کے لیے فائدہ مند ہو گی۔" اس موقع پر مسٹر ایم۔ اے جناح نے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "گذشتہ سال میں نے آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ جو لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اور جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ لیکن اب میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کی صدارت کر رہا ہوں۔ اس کی کیا وجہ ہے!

مسٹر جناح نے ان حالات کی تشریح کی۔ جن کی بناء پر ان کے خیالات میں تبدیلی آئی تھی اور انھوں نے اپنی رائے بدل دی تھی۔ انھوں نے کہا۔ کہ میں سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور کوئی قابلِ عزت راستہ نہیں ہے۔ کہ وہ علیحدہ خطوط پر اپنی تنظیم قائم کریں۔ اور سب سے پہلے خود اپنے گھر کو ٹھیک کریں۔ ان کی فلاح و بہبود کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ لہٰذا انھیں اپنے بچاؤ" اور اپنی امداد کے لیے خود کو منظم کرنا چاہیئے۔ یہ کام کوئی اور نہیں کرے گا۔ اور نہ ماضی میں کسی نے کیا ہے۔ اس لیے میں دانستہ طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ جب تک مسلمان اپنے آپ کو منظم نہ کریں گے۔ اور مستحکم نہ ہو جائیں گے اور صلاحیت حاصل نہ کریں گے۔ اس وقت تک نہ کوئی ان کی پرواہ کرے گا۔ اور نہ کوئی ان کی عزت کرے گا۔"

مسٹر جناح نے کہا کہ "پچھلے سال میں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی ترقی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے کہ مجھے اُمید تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کا کام جس میں بزرگ ناکام ہو چکے ہیں۔ شاید ہندوستان کے نوجوان انجام دے سکیں گے۔ لیکن بہت جلد میں نا اُمید ہو گیا۔ میری صدارت کے دوران آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن نے کئی قرار دادیں منظور کر لیں۔ اور تمام کارروائیاں مکمل کر لیں۔ لیکن انھوں نے عہدیداروں کا انتخاب اس وقت کیا۔ جب میں کانفرنس سے چلا آیا۔ اگلے دن مسلمان طلباء نے مجھے بتایا کہ ہندو طلباء نے مسلمانوں کو تمام عہدوں سے بلکہ مجلس عاملہ کی

رکنیت تک سے الگ رکھا۔ ان حالات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تمام امور پر اشتراک و تعاون مشکل ہو گیا۔ مجھے زندگی بھر کا تجربہ ہے۔ اور میرے اندر اتنا صبر کا مادہ ہے اور میں نے دوسرے فرقوں کے ساتھ برابری کی سطح پر باعزت طور سے تعاون کرنے کے لیے ہمیشہ سخت جدوجہد کی ہے۔ لیکن مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں اب تک ان کوششوں میں ناکام رہا ہوں۔ بالکل یہی صورتِ حال مسلم نوجوانوں اور طلباء کو بھی درپیش ہے اب مسلمان نوجوانوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا آغاز کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ برابر اپنے کو منظم کرتے رہیں۔ گو یہ ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے ہمسایہ فرقوں کے ساتھ مساویانہ سطح پر تعاون و اشتراک میں خواہ وہ بوڑھوں سے ہو یا نوجوانوں سے کبھی کوتاہی نہ کریں۔ اگرچہ ہم اعلیٰ ترین طریق پر اپنی تنظیم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اپنے اور اپنے ملک کی بھلائی کی خاطر برابری کی سطح سے ہم اپنا دستِ تعاون ہمیشہ بڑھائیں گے۔ لیکن ہم دبنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نہ ہم کانگریس کے حاشیہ بردار ہیں۔ اور نہ ہم ہندو راج کے غلام ہیں (نعرۂ تکبیر)

مسٹر جناح نے ان کلمات کے بعد سید عبدالعزیز بار ایٹ لا اور سابق وزیر صوبہ بہار کو دعوت دی کہ وہ اپنا افتتاحیہ خطبہ پیش کریں۔ انھوں نے مسٹر عزیز کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ مسٹر عزیز ایک نیشنلسٹ (قوم پرست) ہیں اور میں بھی نیشنلسٹ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ اور ہم دونوں پُرخلوص نیشنلسٹ ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ خود ہندوؤں نے مسٹر عزیز کو نیشنلسٹ تسلیم کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ حالات بدل چکے ہیں۔ اور آج ہم جیسے لوگ مسلم طلباء کے اس فرقہ وارانہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ اب میں سید عبدالعزیز کا ایک فرقہ پرست کی حیثیت سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اگر مسلمانوں کے حقوق دلانے کے لیے اور حکومت میں اور ایک میں اور دوسرے شعبوں میں مسلمانوں کو ان کا صحیح مقام دلانے کے باعث مجھے فرقہ پرست ہونے کا طعنہ دیا جا رہا ہے۔ تو میں اس جرم کو تسلیم کرتا ہوں۔ اگر میں اس لیے فرقہ پرست کہلاتا ہوں۔ کہ میں اپنی قوم کے لوگوں کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لیے اقدامات کر رہا ہوں۔ تو میں فرقہ پرست ہونے کا خطاب بخوشی قبول کرتا ہوں۔ دراصل موجودہ حالات میں دونوں فرقوں کا اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی قسم کے علیحدہ ادارے بنانے کے علاوہ ہمارے سامنے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اگرچہ ہم نے یہ راستہ اختیار کر لیا ہے۔ پھر بھی ہم اپنے پڑوسی فرقوں کے

ساتھ باعزت اور مساویانہ بنیاد پر تعاون کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے مگر اہم حاشیہ برداری اور ہندو راج کی غلامی کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوں گے۔"

افتتاحی خطاب

مسٹر عبدالعزیز نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا "یہ اجلاس مسلم طلباء کی تاریخ میں ایک بے مثال واقعہ ہے۔ بعض حضرات طلباء کی الگ تنظیم کے قیام کا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن بعض اس کی مخالفت بھی کریں گے۔ مگر ہم اپنے ملّی مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا عقل، انصاف اور حب الوطنی کے خلاف ہو گا۔" سید عبدالعزیز نے تسلیم کیا۔ کہ شروع میں وہ کانفرنس میں شریک ہونے سے کسی قدر ہچکچا رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کے مسلم طلباء کی اتنی بڑی تعداد کی خواہش کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔"

پھر انھوں نے اس بات پر زور دیا۔ کہ "جب مسلمانوں کی اکثریت اور کانگریس میں بعد پیدا ہو گیا۔ تو مسلمان طلباء کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا۔ کہ وہ خوب صورت نعروں سے متاثر ہونے کے باوجود آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں زیادہ عرصے تک شریک رہ سکیں گے۔ اس لیے کہ فیڈریشن کانگریس ہی کی ایک شاخ یا اس کے زیرِ اثر ایک ادارہ ہے۔" ان کے خطاب کا ایک جملہ یہ تھا۔ کہ اگر مسلمان طلباء ایک الگ اور منفرد گروہ کی حیثیت سے اپنی پوزیشن کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اور غیر مسلموں کے ساتھ اپنے کالجوں کی سرگرمیوں میں برابر کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے ہیں۔ تو انھیں اپنی الگ تنظیم بنانے کی تجویز کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔" سیّد عبدالعزیز نے ایک اور مشورہ یہ دیا۔ کہ وہ کم از کم دو برس پبلک کاموں کے لیے وقف کریں۔ اور ہر مسلم طالب علم کم از کم ایک ہندو دوست بنائے۔ اس کا آئندہ پبلک زندگی میں بہت فائدہ ہو گا۔ ان کے اس جملہ سے صرف ایک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگرچہ کانگریس پر ہندوؤں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کی طرف کانگریس کا رویہ اچھا نہ تھا۔ لیکن مسلم لیڈروں نے ابھی تک ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے منہ نہیں موڑا تھا۔ خود مسٹر جناح نے ۱۹۳۷ء میں کہا تھا۔ کہ ہندو مسلم اتحاد ان کی بڑی خواہش ہے لیکن مسلمان قائدین یہ اتحاد برابری، اشتراک و تعاون کے اصول پر چاہتے ہیں۔ وہ دباؤ اور دھمکیاں سہتے اور غیروں کا غلبہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ البتہ فراخ دلی اور برابری کے جذبے سے ہندوؤں کے ساتھ تعاون شروع سے مسلمانوں کی پالیسی رہی ہے۔ اس موقع پر یہ یاد دلانا بھی ضروری ہے۔ کہ علی گڑھ سٹوڈنٹس

یونین میں قرارداد کا جو مسودہ چند دن پہلے پیش کیا گیا تھا۔ اس میں یہ فقرہ بھی تھا۔ کہ مسلم طلباء ایسا کوئی ادارہ نہیں بنانا چاہیئے جس کا مقصد "بالواسطہ یا بلاواسطہ" طلباء کے خلاف معاندانہ کارروائی ہو۔ ظاہر ہے۔ کہ اس میں اشارہ صاف طور سے آل انڈیا فیڈریشن کی طرف ہے۔

قائدِ اعظم کا خطبۂ صدارت

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا دوسرا اجلاس منگل ۲۸/دسمبر ۱۹۳۷ء کو محمد علی پارک میں منعقد ہوا۔ اس یادگار تقریب کے موقع پر قائدِ اعظم نے طلباء کے مندوبین اور حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اب مسلمانوں کی خواہش ہے اور جائز خواہش ہے۔ کہ اگر وہ اپنے تمدن، اپنے قوانین دین اور اپنی ہر اس شئے کو بچانا چاہتے ہیں۔ جو بطور اقلیت ان کے لیے بیش قیمت ہے۔ تو ضروری ہے کہ مستقبل کے قانون میں ان کی مکمل حفاظت کا بندوبست کیا جائے مسلمان اس امر سے پورا اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان کو مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہونی چاہیے"
(تالیاں)

"میں ہندوستان کے مسلمانوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ انھیں امریکہ کے حبشیوں کی حیثیت میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہم بھی ایسی ہی حکومت چاہتے ہیں۔ جیسی ابراہیم لنکن چاہتا تھا۔ جو عوام کے لیے عوام کے ذریعے عوام کی حکومت تھی۔ لیکن جب لنکن حکومت نے اس اعلےٰ اصول کو اپنایا تو امریکی حبشیوں کو مستثنیٰ کر دیا۔ اس طرح میرے بہت سے ہندو دوست جب "نیشنلزم" اور آزادی و مختاری کی بات کرتے ہیں۔ تو مسلمانوں کو اس میں سے خارج کر دیتے ہیں۔ کانگریس ہائی کمان اور مسلم لیگ کے درمیان یہی بنیادی اور اہم فرق ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ بہت سے ہندو مجھ سے پوری طرح اور دل سے اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت یا تو ان کی آواز کو خاموش کر دیا گیا ہے یا گم ہو گئی ہے۔ اور یا صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔ ضروری یہ ہے۔ کہ کانگریس کی ہائی کمان کو عقل کا راستہ دکھایا جائے۔ ہمارا موقف انصاف پر مبنی ہے۔ اور اگر ہم متحد رہے۔ تو پھر ہمیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم میں اتحاد رہا اور ہم نے اپنے کو منظم کر لیا۔ تو مجھے یقین ہے۔ کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ ہمارے ساتھ اس بات پر متفق ہو جائے گا۔ کہ کانگریس کو عقل سکھانے کی ضرورت ہے"

مسٹر جناح نے کہا۔ کہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد، کانگریس یا ملک کی کسی اور سیاسی جماعت کے اغراض و مقاصد کے معاملے میں کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن مشترک سیاسی

مفاسد کے باوجود مسلمان ان حقائق اور واقعات کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جن سے وہ آج دوچار ہیں۔ میں نے ۱۹۱۳ء میں جو کچھ کہا تھا۔ اس میں اب تک تبدیلی نہیں ہوئی۔ یعنی یہ کہ ملک کے لیے جو بھی قانون بنایا جائے۔ اور خواہ کوئی بھی اسے بنائے اس میں مسلمان اقلیت کے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے کافی تحفظات ہونے چاہیئں۔ اسی بنیاد پر ۱۹۱۶ء کا میثاق لکھنؤ ہوا تھا۔ یہ سمجھوتہ کانگریس اور لیگ کی ترقی کا ضامن تھا۔ اسی اصول کے مطابق اتحاد کے لیے کئی کانفرنسیں طلب کی گیئں۔ اور متعدد کوششیں کی گیئں۔ اور ہندوستان کی تمام اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کے لیے متفقہ فارمولے کی تلاش جاری رہی۔

یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تقریباً پانچ یا چھ برس قبل کانگریس ہائی کمان نے اپنی پالیسی اور پروگرام سے اس بنیادی اصول کو خارج کر دیا۔ اور یہ موقف اختیار کیا۔ کہ اقلیت کے مسائل کے نام کی کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ کانگریس اور لیگ کے درمیان اہم اور بنیادی فرق یہ ہے۔ کہ کانگریس کی رائے میں اقلیتوں کے مسائل کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور اور مسلمانوں کے لیے یہ موت وحیات کا سوال ہے۔ ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت کے تحت اقلیتوں کے لیے خصوصی تحفظات پر زور دیتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا۔ کہ ہندوستان میں ایک ایسی پارلیمانی۔ جمہوری حکومت قائم ہو رہی ہے۔ جیسی کہ برطانوی حکمرانوں کے ملک میں قائم ہے۔ خواہ یہ کامیاب ہو یا نہ ہو۔ اگر یہ حکومت نافذ ہوتی ہے۔ تو یقیناً یہ اکثریت کی حکومت ہوگی۔ دراصل ہندوؤں کو معلوم ہے۔ کہ اکثریت کے معنی ہیں "ہندو"، میرے خیال میں ہندو بھی دوسرے انسانوں سے مختلف نہیں ہیں۔ اور انسانی جبلت جیسی ہے۔ اس کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثریت مغرور اور ظالم ہو سکتی ہے۔ اور اقلیتوں کے حقوق کو بے دردی سے پامال کر سکتی ہے۔ پارلیمانی حکومت کی کامیابی کے لیے ایک طاقتور اور فعال حزب مخالف کی موجودگی ضروری ہے۔۔ یعنی ایک ایسی اکثریت کے مقابلے میں جہاں ووٹروں کی بیشتر تعداد یعنی تقریباً ۸۰، ۹۰ فیصد لوگ بطور ہندو، مسلمان یا پارسی کے ووٹ نہ دیں۔ بلکہ ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے ووٹ دیں۔ مگر ہندوستان میں صورتِ حال یہ ہے۔ کہ عوام ہندو اور مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ہم محض تعلیم یافتہ، ترقی یافتہ اور تربیت یافتہ ووٹروں ہی کے مسئلے سے دوچار نہیں اور اگر محض اسی قسم کے ووٹروں ہی سے دوچار ہوتے۔ تب بھی یہ صورتِ حال تو موجود ہی ہے۔ کہ وہ سب بھی کسی نہ کسی مذہب کے ماننے

والے ہیں۔ اور مذہب ایک بہت اہم معاملہ ہے۔ اور لوگ اپنے مخصوص تمدن، فلسفۂ حیات اور سماجی زندگی کی پیداوار ہیں۔ اس لیے اگر ایک خاص مذہب کے ماننے والے حکومت کی تشکیل کریں گے۔ تو قدرتی امر ہے۔ کہ وہ حکومت پر اثر انداز ہوں گے۔ اور حکومت میں اگر ان کے اختیارات محدود ہوں گے۔ تب بھی وہ اپنے کلچر اور اپنے فلسفے کو سب پر مسلّط کرنے کی کوشش کریں گے۔ واضح ثبوت بندے ماترم کے گانے اور ہندی یا ہندوستانی کو زبردستی پڑھانے کے احکامات کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اپنی کامیابی کے نشے میں وہ ان باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ باتیں بعض لوگوں کے لیے انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔"

قائدِ اعظم نے فرمایا "ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن کو دیکھئے اور یہ بات دھیان میں رکھیئے کہ ووٹر صرف خالص شہری ہونے کی حیثیت سے ووٹ نہیں دیتے۔ اس حالت میں مسلمانوں کے ہونے کی حیثیت سے ووٹ نہیں دیتے۔ اس حالت میں مسلمانوں کے ذہن میں جو پہلا سوال آتا ہے۔ وہ یہی ہے۔ کہ اگر وہ ملک کی آزادی کی خاطر لڑتے ہیں۔ تو آئندہ حکومت اور انتظامیہ ان کی حیثیت کیا ہو گی۔

مسٹر جناح نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو مبارک باد دی اور کہا کہ مسلمان نوجوانوں کا استحصال کیا گیا۔ اور اگر فیڈریشن ان کی مدد کو نہ آتی تو ان کا استحصال جاری رہتا۔ اور وہ ختم کر دیئے جاتے۔ آپ نے نوجوانوں کو خبردار کیا۔ کہ وہ محض نعروں سے گمراہ نہ ہوں۔ ایک طرف "نیشنلزم" اور "آزادی"، کے نام پر اور دوسری طرف راجاؤں، مہاراجاؤں، زمینداروں اور سرمایہ داروں وغیرہ کا خاتمہ کرنے کا نعرہ دے کر نوجوانوں کے جذبات کو اُبھارا جا رہا ہے اور ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر کہ راجاؤں نواب لوگوں کا خون چوستے ہیں۔ نوجوانوں سے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ انھیں نکال باہر کریں۔ انھیں باور کرایا جاتا ہے کہ صرف کانگریس ہی ایسی جماعت ہے۔ جو بھوک اور مفلسی کو دور کر سکتی ہے۔ لیکن یہ کب اور کس طرح ہو گا۔ کسی نے پنڈت نہرو سے یہ سوال کیا۔ تو انھوں نے جواب دیا۔ "یہ میری زندگی میں ہو جائے گا۔" میں چاہتا ہوں کہ پنڈت جی ڈیل عمر پائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ کانگریس تمام قابلِ ذکر آدمیوں کو تباہ و برباد کر کے اور ملک کو ایک ریگستان میں تبدیل کر کے ملک کا دستور بنائے گی۔ لیکن سائے بعد میں پوچھتا ہوں۔ کہ کانگریس نے الیکشن کرتے اور وزارتیں قبول کرنے کے

بعد کون سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ دفعہ نمبر ۱۴۴ اب بھی لگی ہوئی ہے۔ ان حالات میں آپ کسی کے کہنے میں نہ آئیں۔ سوچیں؟

مسٹر جناح نے کہا کہ اس وقت جو جد و جہد ہو رہی ہے۔ وہ اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک سب سے پہلے اقلیتوں کے مسئلے کا حل تلاش نہ کر لیا جائے۔ اس حل کی غیر موجودگی میں تمام گفتگو لایعنی ہے۔ اگر میں کسی طرح کانگریس ہائی کمان اور ہندو پبلک کو اقلیتوں کے مسئلے کو حل کرنے پر راضی کر سکوں تو میں سمجھ سکوں گا کہ میں نے اصل نیشنلزم کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے بعد ہم آگے بڑھ سکیں گے۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو گیا تو آزادی کی منزل تک جانے کا راستہ بالکل صاف اور ہموار ہو جائے گا لیکن ہندوؤں کو مسلمانوں کی صحیح پوزیشن کس طرح سمجھائی جائے۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں کا پہلا فرض یہ ہے، کہ وہ اپنے عوام کی اقتصادی سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے بنیادی کام کر کے اپنے لیے عزت کا مقام پیدا کریں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ چھوٹے قصبات، بلکہ دیہات تک میں ہزارہا ہندو کارکن کا نہایت بے نفسی کیساتھ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔ تو مجھے کوئی بغض یا حسد پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس کے لیے ان کی تعریف کرنی چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں کا کیا حال ہے وہ کیا کر رہے ہیں۔ دیہاتوں میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر دل پھٹتا ہے۔ مگر ان کی امداد کرنے والا کوئی نہیں۔ کانگریس جو اپنے کو نیشنل کہتی ہے اور قوم پرست ہونے کا دم بھرتی ہے وہ بھی مسلمان عوام سے اب تک لاپرواہی کرتی رہی۔ جب تک مسلم لیگ میدان میں نہیں آئی تھی۔ دیہات کے مسلمانوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اب کانگرس نے مسلم عوام سے رابطے کی مہم شروع کر دی ہے دراصل یہ مسلم عوام کے قتل کی مہم ہے۔

قائداعظم نے فرمایا ہمیں تعمیری کام کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے۔ جو ظاہری چمک دمک اور نام آوری پر جان نہ دیتے ہوں بلکہ لگن اور بے غرضی کے ساتھ ایک عظیم معاشرے کی بنیاد ڈالنے کے خواہشمند ہوں۔ اس کام میں نہ تو استاد آپ کے راستے میں حائل ہو سکتے ہیں۔ اور نہ کانگریس حکومتیں اس وقت مسلمانوں کا کوئی مقام نہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کانگریس پچاس سال پرانا ادارہ ہے۔ ابھی چند دن قبل جب میں کلکتہ آ رہا تھا تو ایک ہندو جنٹلمین نے مجھے بتایا۔ کہ ایک شریف ہندو نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ کانگریس کے کام کے لیے پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے۔

مسلم اور ہندو تشہیر

قائد نے فرمایا کہ مسلمانوں کے پاس ایک کمزور اور بے چارہ پریس ہے۔ جب کہ کانگریس کے پاس ایک نہایت طاقت ور پریس ہے۔ جس کا کام ہی یہ ہے۔ کہ وہ دوسروں کی پگڑی اُچھال کر گمراہ کرتا رہے۔ اگر مسلمان ان باتوں کا جواب دینا چاہیں تو وہ کہیں شائع نہیں ہوتا۔

مسٹر جناح نے اعلان فرمایا کہ میں نے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ گھنٹی ابھی تک بج رہی ہے لیکن فائر بریگیڈ ابھی نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ فائر بریگیڈ مہیا کریں اور انشاء اللہ ہم اس سے آگ بجھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مسٹر جناح نے یہ آخری فقرہ بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا اور جلسے میں تالیاں اور نعروں کا شور بلند ہوا۔ اسٹار آف انڈیا نے ان قرار دادوں کی رپورٹ بھی شائع کی ... جو آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کھلے اجلاس میں منظور کی گئیں تھیں۔ یہ قراردادیں حسب ذیل تھیں۔

۔ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا یہ اجلاس ہندوستان کی مکمل آزادی کی حمایت کرتا ہے جو ایک ایسی وفاقی حکومت کی صورت میں ہونی چاہیئے جس میں صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو گی اور مسلمانوں اور دوسرے اقلیتی فرقوں کے حقوق کی حفاظت کی پوری ذمہ دار ہو گی۔

۔ یہ اجلاس آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اس معاندانہ پروپیگنڈا کی مذمت کرتا ہے۔ جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خلاف اس طرح کیا جا رہا ہے کہ یونیورسٹی کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیشن بلا جواز نامزد کیا گیا ہے۔ یہ اجلاس سر وزیر حسن اور دوسرے اصحاب کے اقدامات کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے جو اس سلسلے میں پیش قدمیاں کر رہے ہیں۔

۔ یہ اجلاس ان مٹھی بھر مسلم طلباء کی ریشہ دوانیوں کی مذمت کرتا ہے جو مختلف صوبوں میں نیشنلزم کے پردے میں مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے اور پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ صرف یہ کانفرنس جو مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہو رہی ہے۔ واحد ادارہ ہے جو ہندوستان کے مسلم طلباء کی حقیقی معنوں میں حمایت کرتا ہے۔

۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو ان تمام اداروں کے ذریعے جن کا اس سے الحاق ہو چکا ہے مسلمانوں میں عموماً اور مسلم طلباء میں خصوصاً اسلامی خیالات اور اسلامی تعلیمات و ثقافت کی تبلیغ کا کام کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے ضروری

ہے کہ ان موضوعات پر نامور ماہرین کے لیکچرز کا اہتمام کیا جائے اور تبادلہ خیالات کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

۔ مولانا محمد علی اور سر سید مرحوم نے ملک و قوم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے مسلم طلباء ہر سال ۴ا جنوری کو یوم محمد علی اور ۲۸ مارچ کو یوم سر سید منائیں گے۔

۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین ہندو پریس کے اس رویے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں کہ اس کی رو سے مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے بارے میں غلط خبریں شائع کی جا رہی ہیں۔ اس قسم کے رویے سے قومی تحریک کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے

۔ فیڈریشن کے اراکین نہایت ادب کے ساتھ مسٹر جناح سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی نگرانی میں مسلمانوں کے اخبارات جاری کروائیں تاکہ مسلمانوں کے بارے میں مسلم عوام کو صحیح اطلاعات بہم پہنچائی جا سکیں۔

۔ یہ کانفرنس راجہ صاحب محمود آباد سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مسلم طلباء کا ایک وفد لے کر مسلم ممالک کا دورہ کریں گے تاکہ ان ممالک سے اسلامی اخوت اور ثقافتی تعاون و اشتراک اور دوستی کے رشتوں کو مضبوط کیا جائے۔

کلکتہ اجلاس میں پنجاب، بنگال، یو پی، بہار، صوبہ سرحد اور آسام وغیرہ سے تقریباً تین سو مندوبین نے شرکت کی اور یہی اجلاس تقسیم ہند سے پہلے طلباء کی تاریخ کی سب سے بڑی تحریک کا نقطہ آغاز اور سنگ میل ثابت ہوا۔ قائداعظم نے بذات خود طلباء کو آگے بڑھنے کے لیے سبز جھنڈی دکھائی۔

فیڈریشن کا دستور

فیڈریشن کے لحاظ سے فیڈریشن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے۔

۱۔ ہندوستان کے مسلمان طلباء کو صوبائی خود مختار شاخوں کے ذریعے ایک اجتماعی ادارے میں منسلک کرنا تاکہ وہ مسلم طلباء کے حقوق کی حفاظت کر سکے۔

۲۔ مسلم طلباء میں سیاسی شعور پیدا کرنا اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں جائز طور پر حصہ لینے کے لیے تیار کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لیے کام کرنا۔

۴۔ اسلام دشمن قوتوں کا مقابلہ کر کے اسلامی ثقافت اور اسلام کے مطالعے کو عام کرنا۔ اور سماجی ترقی کے لیے کام کرنا

۵۔ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان خیرسگالی اور دوستی کی فضاء پیدا کرنا۔

۶۔ ہندوستان اور باقی دنیا کے مسلمان طلباء کے درمیان اشتراک و تعاون کی کوشش کرنا۔

مسلم طالبات کی فیڈریشن

راجہ صاحب محمود آباد نے بذریعہ تار بیگم اکرام اللہ کو اختیار دیا کہ وہ فوراً ایک کمیٹی تشکیل کریں اور خواتین سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ڈالیں چنانچہ چند لڑکیوں کی ایک تنظیم بنائی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ تنظیم تمام ملک کی طالبات کے ملازمین کی ایک کانفرنس منعقد کرے اس فیصلے کے بعد لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، کلکتہ، میرٹھ، بمبئی اور دوسرے شہروں کو جہاں لڑکیوں کے کالج موجود تھے یا جہاں مسلمان لڑکیاں خاصی تعداد میں دوسرے کالجوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ دعوت نامے بھیجے گئے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں مسلمان لڑکیوں کی کانفرنس عریبک کالج دہلی کے ہال میں منعقد ہوئی۔ مس جناح نے صدارت قبول کر لی تھی لیکن وہ اس زمانے میں علیل تھیں اس لیے بیگم اعزاز رسول نے کانفرنس کی صدارت کی۔ بیگم کشور رحمٰن نے اس کا افتتاح کیا یہ دونوں خواتین آل انڈیا مسلم لیگ کی خواتین سب کمیٹی کی ممبر تھیں۔ طالبات کی کانفرنس میں لکھنؤ، دہلی، میرٹھ اور دوسرے کئی شہروں سے مندوبین نے شرکت کی۔ لاہور سے فاطمہ بیگم پانچ لڑکیوں کا وفد لے کر آئیں۔ بیگم اکرام اللہ نے بتایا ''دہلی سے باہر کی لڑکیوں کی تعداد کانفرنس میں زیادہ نہیں تھیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے لڑکیوں کے لیے مشکل تھا کہ وہ دور دراز مقامات سے اتنا بڑا سفر کر کے دہلی آئیں۔ لڑکیوں کی فیڈریشن آگے چل کر بڑا ادارہ بننے والا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ لڑکیوں کے ادارے کا معرض وجود میں آنا بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ خصوصاً مسلم لیگ کی خواتین سب کمیٹی کے لیے تو یہ بہت مددگار ثابت ہوا۔ لڑکیوں نے خواتین کے حلقے میں بہت اچھا کام کیا۔ عورتوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ اور پاکستان کی راہ ہموار کرنے میں قابل قدر خدمات انجام دیں

طالبات کانفرنس علی گڑھ

سنہ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ میں لڑکیوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ علی گڑھ گرلز کالج لڑکیوں کا بہت بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ اس لیے کانفرنس کی کامیابی یقینی تھی، کانفرنس میں جن خواتین

مندوبین نے موثر اور جوشیلی تقریریں کیں ان میں زری سرفراز، ممتاز جہاں شاہ نواز کے نام اہم ہیں۔
علی گڑھ میں طالبات کی کانفرنس کے دو اجلاس ہوئے۔ بحث و مباحثہ کے دوران ایک دلچسپ سوال یہ بھی تھا۔ کہ آیا طالبات کی الگ فیڈریشن قائم کی جائے یا انھیں براہِ راست آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ممبر بنایا جائے۔ بالآخر یہ طے کیا گیا۔ کہ چونکہ بہت سی لڑکیاں پردے میں رہتی ہیں۔ مناسب یہ ہے۔ کہ انھیں مخلوط فیڈریشن کا ممبر بننے پر مجبور نہ کیا جائے۔ وہ اپنی تنظیم الگ بنائیں۔ لیکن اس کا ہر یونٹ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مقامی شاخ سے الحاق کر سکتا ہے۔ اس طرح لڑکیوں کے سکولوں اور کالجوں میں جہاں مسلمان لڑکیوں کی معقول تعداد موجود ہے۔ مسلم طالبات کی فیڈریشن کا اپنا یونٹ کام کر سکے گا۔ لیکن اگر طالبات براہِ راست آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ممبر بن کر کام کرنا چاہیں۔ تو انھیں آئین کی رو سے اس کی بھی اجازت ہوگی۔ اس کے بعد بعض لڑکیاں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں داخل ہوئیں اور اہم عہدوں پر بھی فائز رہیں۔ اور بعض خواتین کی تنظیم سے منسلک رہیں علی گڑھ میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے دونوں اداروں یعنی خواتین اور مردوں کی تنظیم کا ایک مخلوط اجلاس بھی ہوا۔ جس میں ہر دو درخواستیں پردے کے پیچھے بیٹھیں۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلمان لڑکیوں نے پاکستان کی خاطر نہایت جوش و خروش کے ساتھ ان تھک کام کیا۔ وہ تمام عورتوں کے پاس ان کے گھروں میں جاتی تھیں اور انتخابات کی اہمیت اور پاکستان کے مطالبہ کی قدر و قیمت سے خواتین ووٹروں کو آگاہ کرتی تھیں۔

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجاب کے مسلمان طالب علموں نے تحریک پاکستان میں ہراول دستہ کا کام کیا۔ مخالفین طاقتور تھے۔ اور مقابلہ سخت تھا۔ لیکن طلبہ نے جان کی بازی لگا کر ان سے ٹکر لی۔ اور ان کی طاقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہ بالکل بجا ہے۔ کہ پنجاب مسلم لیگ کی پشت پر طلباء کی منظم قوت ہی تھی جس کی مدد سے اس نے یونینسٹ پارٹی کے اقتدار کے بت کو پاش پاش کر دیا۔ چند پُر جوش لیڈروں کو چھوڑ کر پنجاب کے اکثر مسلم لیگی رہنما مصلحتوں کا شکار تھے۔ حالانکہ اس سیاسی جنگ میں بجلی کی تیزی شمشیر کی دلبری اور ذاتی مفاد سے بلند

ہو کر کام کرنے کی لگن کی اشد ضرورت تھی۔ یہ مسلمان طلباء ہی تھے جنہوں نے مسلم لیگ کی سست رفتار گاڑی کو زور سے دھکیلا اور سہارا دیا۔ یہاں تک کہ اُس نے ایسی رفتار پکڑی کہ مخالفین کو چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ کلکتہ میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پہلے اجلاس سے بیشتر ہی بنگال اور پنجاب میں مسلم طلبہ کی تنظیم کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن یکم ستمبر ۱۹۳۷ء کو قائم ہوئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو اس دور میں مسلمانانِ برصغیر کے حقوق کے لیے سینہ سپر ہو چکی تھی۔ اس لیے مسلم طلبہ کی نگاہیں لیگ کے لیڈروں کی طرف اُٹھتی تھیں۔ وہ اپنے لیڈروں سے رہنمائی لیتے تھے اور لیگ کو اپنی کارگزاریوں سے مطلع رکھتے تھے۔ ۱۴/فروری ۱۹۳۹ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے اس کے بانی سیکرٹری عبدالسلام خورشید نے طلباء کے کام کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ مسلم لیگ کے آنریری سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں کو بھیجی۔ چند اور بعد طلباء کے ایک اور لیڈر عبدالستار خاں نیازی نے ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۹ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں کو مطلع کیا۔ کہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے خلافت ربانی کا منصوبہ مرتب کیا ہے۔

پاکستان کانفرنس

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے معرضِ وجود میں آنے کے چند دن کے اندر اندر ہزاروں لڑکوں کو ممبر بنا لیا۔ بہت سی کانفرنسیں منعقد کیں۔ اور قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے۔ کہ فیڈریشن نے بقول عبدالسلام خورشید قرارداد لاہور سے تقریباً تین برس پہلے ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کی الگ ریاست قائم کرنے کے خیال کی تائید کی۔ پھر پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے مارچ ۱۹۴۱ء میں یعنی قرارداد پاکستان کی منظوری کے تقریباً ایک سال بعد طلباء کی طرف سے کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ کانفرنس استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین عبدالحمید مرزا نے ۱۵/جنوری ۱۹۴۱ء کو قائدِ اعظم کو لکھا کہ پنجاب کے طلباء کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ کہ آنجناب اس کانفرنس کی صدارت کریں۔ قائدِ اعظم نے جواب میں لکھا۔ کہ پاکستان کانفرنس کی جو تاریخیں مقرر کی گئی ہیں اس زمانے میں وہ بے حد معروف ہوں گے۔ لیکن اس خط میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کام اور پنجاب کی سیاسی صورت حال میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اسلامیہ کالج لاہور میں جلسہ

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک اہم اجلاس ۱۸/۱۹/مارچ ۱۹۴۲ء کو اسلامیہ کالج لاہور

میں ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر میاں ممتاز احمد خاں دولتانہ تھے۔ جو بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔ اپنے خطبۂ استقبالیہ میں جناب دولتانہ صاحب نے کئی ایک اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا۔ کہ تعلیم، اقتصادیات اور فوجی ملازمتوں کے میدان میں پنجاب کے لوگ ہمارے ان بھائیوں سے آگے ہیں۔ جو دوسرے مقامات پر رہتے ہیں۔ اور جن کے حالات ہمارے مقابلے میں اچھے نہیں ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر پنجاب کا یہ مقدر ہے۔ کہ وہ پاکستان کی تحریک میں پیش پیش رہے۔ اور۔۔ یہی امر پاکستان کے حق میں سب سے بڑی دلیل اور اس کے حصول کے لیے سب سے بڑا ہتھیار بھی ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے اس بات پر رنج کا اظہار کیا۔ کہ سیاسی بیداری اور سیاسی تنظیم کے لحاظ سے پنجاب پچھلی صف میں ہے اور اہلِ پنجاب گروہ بندیوں اُلجھے ہوئے ہیں۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے عقلی و ذہنی نشاۃ ثانیہ کی جو تحریک چلائی تھی۔ اس نے جزوی طور پر پنجاب کے عوام کے ذہنی جمود کو دور کیا۔ اور پھر اقبال کی صدائے عام ہمارے کانوں میں آئی۔ جو گویا خدا کی طرف سے ہمارے لیے پیغام بھی تھا۔ اور تنبیہہ بھی۔ اقبال نے مسلم نوجوانوں کی روح کو بدل دیا۔ اقبال کے بعد اس کے صلاح مشورے کی تشکیل اور اس کے خواب کی تعبیر کے لیے محمد علی جناح کی حیات بخش اور بے باک شخصیت ظہور پذیر ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا باری تعالےٰ نے اقبال کے جذب و عشق سے بھرے ہوئے شکوے کو سُن لیا ہے۔ دریائے رحمت جوش میں آیا۔ اور اللہ نے رہنمائی کے لیے ہمارے پاس قائدِ اعظم کو بھیج دیا۔

قائدِ اعظم نے ۱۸/ مارچ کو اجلاس سے خطاب کیا۔ اور ۸۰ منٹ تک خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ آپ نے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا۔ کہ تعلیم سے طلباء میں غور و فکر کی صلاحیت بڑھ رہی ہے۔ طلباء کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیئے، کہ وہ لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ دیں۔ اور تعلیم کے ذریعے اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھیں۔ تو ان میں ایسے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ جن سے انھیں دوچار ہونا ہے۔

حصولِ پاکستان کی اس جنگ میں پنجاب کی طالبات بھی شریک تھیں۔ وہ خواتین میں پاکستان کے مطالبے کا شعور پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ جب میں جب مسلم لیگ پارٹی اور یونینسٹ حکومت میں ٹھن گئی۔ اور سرکاری مشینری لیگ کے خلاف حرکت میں آئی تو ان خواتین نے پولیس کی لاٹھیاں کھائیں۔ اور سزائیں برداشت کیں۔ اور یہ واقعہ اب تحریک آزادی کی تاریخ کا سنہری باب بن چکا ہے کہ پہلی دفعہ پنجاب سیکرٹریٹ کی عمارت پر جس شخصیت

نے مسلم لیگ کا پرچم لہرایا وہ الگ لڑکی تھی۔

۲/اگست ۱۹۴۴ء کو جناح کالج برائے خواتین لاہور نے موسم گرما کی تعطیل میں "سیاسی درس و تدریس"، کا انتظام کیا۔ بہت سی طالبات نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور ملکی و ملّی سیاست کے بارے میں اپنی معلومات بڑھائیں۔ منتظمین نے نواب زادہ لیاقت علی خان بلوچستان کے لیڈر محمد عیسیٰ اور دوسرے اصحاب کو مدعو کیا۔ کہ وہ طالبات کو سیاسی حالات سے مطلع کریں۔

جالندھر اجلاس

نومبر ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جالندھر میں ایک عظیم الشان اور یادگار جلسہ منعقد کیا۔ قائدِاعظم نے اس جلسے کی صدارت کی۔ اور ملک بھر سے طلباء کے مندوبین نے اس جلسے میں شرکت کی۔ کانفرنس کے موقع پر جالندھر شہر کی رونق دوبالا ہوگئی۔ ایک بڑے میدان میں مندوبین کے لیے خیمے لگائے گئے۔ طبی امداد کے لیے خیمے الگ تھے متعدد سماجی انجمنوں نے بھی اس موقع پر اپنے دفاتر کھول لیے تھے۔ تاکہ وہ طلباء کا ہاتھ بٹائیں۔ اپنے خطاب میں قائدِاعظم نے فیڈریشن کے اغراض و مقاصد کے لیے کام کریں۔ انھوں نے خاص طور پر آئین کی دفعہ اول کا ذکر کیا۔ جس میں کہا گیا تھا۔ کہ فیڈریشن مسلمان طلباء میں سیاسی شعور بیدار کرے گی۔ اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مناسب حصہ لینے کے لیے انھیں تیار کرے گی۔ طلباء نے بھی قائدِاعظم کے فرمان کو ذہن میں بٹھالیا۔ اور جب تک پاکستان نہ بن گیا۔ وہ برابر اس کے حصول میں کوشاں رہے۔ تحریک پاکستان اور قائدِ پاکستان کی پُرجوش تائید کے باعث پنجاب کے مسلمان طلباء کو بہت سی مشکلات اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ انھوں نے شاید پہلی دفعہ اجتماعی طور پر سر خضر حیات ٹوانہ اور سر چھوٹو رام کی سیاسی اجارہ داری پر کاری ضرب لگائی۔ جس کا سکّہ پنجاب میں برسوں سے چل رہا تھا۔ سر خضر حیات ٹوانہ پاکستان کی مخالفت کا عزم کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ہندوؤں اور سکھوں سے گٹھ جوڑ کر رکھی تھی۔

طلباء کی سرگرمیاں سندھ میں

قائدِاعظم نے ۱۹۳۶ء میں جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کی۔ تو سندھ کے اکثر بااثر سیاست دان مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ سندھ کے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان علی گڑھ تحریک سے متاثر تھے۔ اس طرح وہ مسلم قومیت کے احیاء میں شریک کار تھے۔ اب یہ لوگ قائدِاعظم کے ساتھ تھے

اور یہ سمجھ چکے تھے۔ کہ سندھی مسلمانوں کی آئندہ فلاح و بہبود کے لیے پاکستان کا قیام بہت اہم ثابت ہوگا۔ اگرچہ سندھ مسلم اکثریت کا صوبہ تھا۔ مگر یہاں کے عام مسلمان اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی حیثیت سے بڑی حد تک ہندوؤں کے زیر اثر تھے۔ ہندو تعلیم، تجارت اور پیسے کے لحاظ سے اکثر مسلمانوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ جب سیاسی بیداری کا دور آیا تو یہاں بھی مسلم عوام کی تعلیمی ترقی کے لیے کوششیں شروع کی گئیں اس سلسلے میں سندھ مدرسہ کالج کا قیام ایک سنگ میل تھا۔ ۲۱/جون ۱۹۴۳ء کو خود قائدِ اعظم نے اس کی افتتاح میں شرکت کی۔

مسلمانوں میں تعلیم نے ترقی کی۔ تو تعلیم یافتہ مسلم طلباء نے بھی قومی تحریک میں اہم کردار ادا کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل قاضی عبدالمنان نے قائدِ اعظم کو لکھا۔ "میں پوری طرح کوشش کروں گا کہ حیدر آباد کے مسلم طلباء میں خصوصاً اور سندھ کے طلباء میں عموماً سیاسی شعور بیدار کروں۔ اللہ کا شکر ہے۔ کہ سندھ کے مسلمان طلباء اب بیدار ہو چکے ہیں۔ اور آپ جب بھی انھیں حکم فرمائیں گے۔ وہ پاکستان کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہیں گے۔" قائدِ اعظم ہمیشہ طلباء کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۲۲/جون ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم نے قاضی عبدالمنان کو ان کے خط کے جواب میں لکھا۔ "میں جب دسمبر میں سندھ میں آؤں گا۔ تو امید ہے۔ کہ آپ سے ملاقات ہوگی۔" ٹھٹھہ کے مسلمان طلباء نے بھی ایک مسلم سٹوڈنٹس یونین قائم کی۔ یونین کے جنرل سیکرٹری عبدالکبیر نے لیگ کے دفتر میں ایک قرارداد کی نقل بھیجی۔ جسے یونین کے ایک جلسے میں منظور کیا گیا تھا۔ جس کی صدارت ایم۔ اے عباسی نے کی تھی۔ قرارداد میں قائدِ اعظم کی قیادت پر پورے اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور شملہ کانفرنس کے مسئلہ پر مسلم لیگ کی پالیسی کی تائید کی گئی تھی۔ یونین نے قائدِ اعظم کو یقین دلایا۔ کہ پاکستان کے حصول کے لیے مسلمان ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔"

۱۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ٹھٹھہ مسلم سٹوڈنٹس یونین کے صدر نے نواب زادہ لیاقت علیخاں کو لکھا۔ کہ مسلم طلباء آئندہ الیکشن کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کی تائید کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا "جیسا کہ مسلم لیگ کی قیادت نے اعلان کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ کہ یہ مسلمانوں کا آخری امتحان ہے۔ جس میں انھوں نے ثابت کرنا ہے۔ کہ وہ ایک الگ اور منظم قوم ہیں۔ مسلم

ہوسٹل شکار پور کے ایک طالب علم عبدالغفور بھر گری نے اپنے لیے خادم السلام کا لقب اختیار کیا۔ اور ۱۲/ فروری ۱۹۴۳ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں کہا گیا ''سندھ کے طلباء نے مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کو منظور کر لیا ہے۔ ۲/ فروری ۱۹۴۳ء کو شکار پور کے مسلم طلباء کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں کانگریس کے اس غلط اور گمراہ کن اقدام پر تنقید کی گئی۔ کہ اس نے ہندو مسلم سوال کو طے کیے بغیر اور پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیے بغیر ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کر دی۔ کالج بند کر دیا گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر مسلمان طلباء کے لیے موقع ہے۔ کہ وہ اپنے پسند کردہ نصب العین پاکستان کے حصول کے لیے کوشش کریں۔ ہم اپنی قوم کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے بے چین ہیں۔ اور اگر کوئی بات یا فرد ہمیں اپنی قومی فرائض کی بجاآوری سے روکتا ہے۔ تو یہ بڑا المیہ ہوگا۔''

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سرحد

سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ۱۹۴۰ء کے آغاز میں رکھی گئی۔ اس نے مسلم پبلک کی عموماً اور مسلم طلباء کی خصوصاً بہت خدمات انجام دیں۔ فیڈریشن کا تعمیری کام کچھ دنوں کے لیے التوا میں پڑ گیا۔ اس کی وجہ سیاسی خلفشار اور مسلم لیگ کی وزارت کا خاتمہ تھا۔ ۱۹۴۵ء میں فیڈریشن کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی۔ پنجاب کے مسلم طلباء نے بھی سرحد کے طلباء کی تنظیمی معاملات میں مدد کی۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سربرآوردہ ممبر جن میں یحییٰ بختیار، راجہ افتخار اللہ اور امین ترین شامل تھے۔ ۱۹۴۲ء میں پشاور گئے۔ وہاں ایک جلسے کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ طلباء ابھی تک زیادہ فعال نہیں تھے۔ جلسے میں حاضرین کی تعداد کم رہی۔

قائدِ اعظم کا دورہ

۱۹۴۵ء کے بعد سرحد کے مسلم طلباء تحریکِ پاکستان کے حق میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس کے لیے بھرپور کام کیا۔ ۱۹۴۵ء میں قائدِ اعظم نے سرحد کا تاریخی دورہ کیا۔ مسلم طلباء نے آنے والے انتخابات کے لیے جو مسلمانانِ برصغیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ قائدِ اعظم کو آٹھ ہزار روپے کی تھیلی پیش کی۔ طلباء نے ۵ ہزار روپے کی مزید رقم بہار ریلیف فنڈ کو دی۔ ۲۰/ نومبر ۱۹۴۵ء کو قائدِ اعظم نے پشاور میں ایک جلسہ سے خطاب کیا۔ جس کا سارا انتظام سرحد کے مسلم طلباء

نے کیا تھا۔ قائدِ اعظم نے اپنی تقریر میں لوگوں کو سمجھایا کہ کانگریس انگریزوں سے سمجھوتہ کر کے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس کے تحت مسلمان ہمیشہ کے لیے ایک مستقل اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے۔ تالیوں کی گونج میں قائدِ اعظم نے اعلان کیا۔

" ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ نہ انگریز نہ ہندو۔ میں مسلمانوں کو ہرگز ہندوؤں کا غلام نہیں بننے دوں گا۔ یہ نہ بھولیے کہ آپ کا جرنیل یہ جانتا ہے۔ کہ قربانی کے لیے کون سا وقت مناسب ہو گا۔ جب وقت آئے گا۔ تو نہ میں ہچکچاؤں گا۔ اور نہ ایک قدم پیچھے ہٹوں گا۔"

قائدِ اعظم کے دورے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پورے صوبے میں گویا بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ جب پنجاب میں مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ تو سرحد کے مسلمان طالب علموں کے گروہ مسلم عوام کا ساتھ دینے کے لیے پنجاب پہنچ گئے۔ اس کے بعد ۳ جون کی اسکیم کے مطابق صوبہ سرحد میں ریفرنڈم یا عام رائے شماری کرائی گئی۔ تو مسلم طلباء نے سر کے موریچوں پر ہلہ بول دیا۔

تفصیلات کے مطابق مسلم طلباء نے دن رات کام کر کے جو تیار کی تھی۔ بڑی حد تک اس کا نتیجہ تھا۔ کہ صوبہ سرحد نے ریفرنڈم میں پاکستان کے الحاق کے حق میں رائے دی۔ ۱۹۴۳ء میں سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری عنایت کبریا نے قائدِ اعظم کو لکھا "ہم نے سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تنظیم کر لی ہے۔ اور اس میں بڑی حد تک ہمیں کامیابی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے سامنے بعض بنیادی مشکلات ہیں۔ جن پر قابو پانا باقی ہے۔ خط میں اشارہ کیا گیا ہے کہ "عوام کی تائید ہمیں حاصل ہو رہی ہے"، لیکن اس کی ہمیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جنرل سیکرٹری نے پُرزور الفاظ میں یقین دلایا کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن پاکستان کے مطالبے پر یقین رکھتی ہے اور اس کی تائید کرتی ہے۔ قائدِ اعظم سے ہدایت حاصل کرتی ہے۔ مگر مقامی لیڈروں سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ دوسرے صوبوں کی طرح صوبہ سرحد میں بھی طلباء مسلم لیگ اور اس کے مخالفوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اس خط میں بھی واضح طور پر کہا گیا ہے۔ کہ صوبائی وزارت نامقبول ہوتی جا رہی ہے"۔ لیکن طلباء کی طرف سے قائدِ اعظم کو یقین دلایا گیا۔ کہ اگر صوبائی مسلم لیگ مسلم عوام کی امیدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی تب بھی سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کوتاہی نہیں کرے گا۔ ہمارے سامنے بہت مشکل کام لیکن ہمیں بھروسہ ہے کہ مسلسل کوشش سے ہم مشکلات پر قابو پا لیں گے۔ اور بالآخر

ہم ایک خوبصورت رشتے کی تخلیق کریں گے "۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خط قائدِ اعظم کے کسی خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ گو قائدِ اعظم کا خط کسی فائل میں سے دستیاب نہیں ہو سکا۔ جنرل سیکرٹری جواباً لکھتا ہے۔ کہ "آپ نے جس پروانہ شفقت کا اظہار کیا ہے۔ طلباء اس کے لیے آپ کے بے حد ممنون ہیں" قائدِ اعظم غالباً صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کا بھی ارادہ کر رہے تھے۔ اس لیے خط میں لکھا ہے۔ "کہ آپ کی آمد کی خبر نے ہماری تنہائی کے احساس کو ختم کر دیا ہے۔ ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے کہ ہماری پشت پر تخلیقی تحریک کا سرچشمہ ہے"۔

جنرل سیکرٹری کو قائدِ اعظم نے دوبارہ لکھا۔ کہ وہ مستقبل قریب میں صوبہ سرحد کا دورہ کریں گے۔ اور جنرل سیکرٹری نے جو تجاویز پیش کی ہیں۔ ان پر یقیناً غور کریں گے۔

فیڈریشن کا اجلاس

سرحد سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ۱۴/ جون سے ۱۸/ جون ۱۹۴۵ء تک اپنا ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس کا مقصد اس پُر فریب پروپیگنڈہ کا دندان شکن جواب دینا تھا۔ جو کانگریس اور ہندوؤں کی سرمایہ دارانہ وزارت کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ اجلاس کے منتظمین نے اعلان کیا۔ کہ اس اجلاس سے صوبہ سرحد کے "پاکستان دوست" عناصر کو تقویت پہنچے گی۔ اور طلباء براہِ راست عوام سے رابطہ قائم کریں گے اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا نام بلند کریں گے۔

فیڈریشن کی طرف سے قائدِ اعظم کو ایک مکتوب لکھا گیا۔ جس میں ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اس موقع پر سرحد کے طلباء کے نام خصوصی پیغام ارسال فرمائیں۔ ۱۲/ جون ۱۹۴۵ء کو قائدِ اعظم نے اس خط کے جواب میں ایک پیغام بھیجا۔ جس میں انھوں نے سرحد مسلم فیڈریشن کو خصوصی اجلاس منعقد کرنے پر مبارک باد دی۔ قائدِ اعظم نے فرمایا۔ جو اطلاعات مجھ تک پہنچی ہیں۔ اور جن کی آپ کے خط سے بھی تائید ہوتی ہے۔ ان کی بناء پر میں سمجھتا ہوں۔ کہ عام طور پر عوام آل انڈیا مسلم لیگ کے ہم نوا ہیں۔ یہ بہت روشن نشانی ہے۔ جو ہمارے سامنے آئی ہے۔ اب آپ کا اور صوبے کے مسلمان لیڈروں کا جو لائق اور پُر خلوص اصحاب ہیں۔ اور جو اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ذاتی مفاد کی بجائے قومی مفاد کے لیے اتحاد و اتفاق سے کام کریں گے۔ یہ فرض ہے۔ کہ وہ عزم بالجزم کے ساتھ آگے بڑھیں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اور اس کے مطابق صوبہ سرحد کے عوام کی رہنمائی کریں۔ اس میں نہ صرف سرحد کے مسلمانوں کی بلکہ پورے مسلم ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات ہے۔

۲۸/اکتوبر کو ڈیرہ اسماعیل خاں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر محمد عمران نے نہایت دلسوزی اور رنج کے ساتھ قائدِ اعظم کو لکھا۔ کہ "ڈی بی کالج کے مسلم طلباء ہندو پروفیسروں کے ہاتھوں پریشان ہیں" انھوں نے قائدِ اعظم سے شکایت کی۔ کہ ہندو پروفیسر ہمارے لیڈروں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اب انھوں نے ہمارے مذہب پر بھی حملے کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ نہرو کے دورۂ سرحد کے بعد سے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے اذان پر پابندی لگادی ہے" خط میں قائدِ اعظم سے درخواست کی گئی۔ کہ عبوری حکومت کے مسلمان ممبروں کو ہدایت کی جائے۔ کہ وہ معاملے میں ضروری کاروائی کریں" اپریل ۱۹۴۷ء میں سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری نے لیاقت علی خاں کو لکھا۔ "ہمارے پاس دو نعرے ہیں۔ قائدِ اعظم اور پاکستان! انھیں کے ذریعے ہم اپنی حالت سدھاریں گے" مردان کے طالب علم شہزاد گل نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کو لکھا۔ "ڈاکٹر خاں صاحب اور ان کا گروہ کانگریس کے حق میں برابر پروپیگنڈ کرنے میں مصروف ہے اس سلسلے میں کیا اقدامات ضروری ہیں"

۲۸/اپریل ۱۹۴۷ء کو اسلامیہ کالج کے ایک طالب علم نے اپنے خط میں لیاقت علی خاں کو لکھا "مسلم طلباء نے قسم کھائی ہے۔ کہ وہ مسلم قوم کے مطالبہ پاکستان کی خاطر اپنا خون بہا دینے کو تیار ہیں۔ لیکن یہاں ان کے جوش وخروش کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ طلباء اور نوجوانوں پروفیسروں کو نکالا جارہا ہے۔ ان کے خلاف کاروائیاں کی جارہی ہیں۔ اور ان کے نام خارج کیے جارہے ہیں۔ فوری اقدام نہایت ضروری ہے۔ قائدِ اعظم زندہ باد

بلوچستان میں طلباء کی سرگرمیاں

قائدِ اعظم بلوچستان میں اصلاحات کے لیے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو بھی ترقی کے لحاظ سے دوسرے صوبوں کے برابر لا کھڑا کیا جائے۔ تاکہ پاکستان کے تمام صوبے سیاسی اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے قائدِ اعظم کی ہدایت کے مطابق بلوچستان میں مسلم لیگ نے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ قائدِ اعظم نے خود مسلم لیگ کی کارکردگی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ہماری کوششوں کے چار فائدے ہوئے۔ اولاً بلوچستان کے ایک نمائندے کو مرکزی اسمبلی میں چُناگیا۔

دوم کوئٹہ کے لیے ایک منتخب شدہ میونسپل کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ سوم تعلیم کے لیے ۹ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا۔ چہارم حکومت نے وعدہ کیا کہ بلوچستان میں اصلاحات کے لیے سفارشات پیش کی جائیں گی۔ یہ تمام کام ایک سال کے اندر اندر ہوا۔ جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ان اصلاحات کا سبب صرف اور صرف یہی تھا۔ کہ مسلم لیگ ایک ایسی طاقتور جماعت بن گئی تھی جسے حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ جس شخصیت نے بلوچستان میں مسلم لیگ کی تنظیم کو مؤثر بنایا وہ قاضی محمد عیسٰی تھے۔ قاضی صاحب نے مسلم طلباء کی اچھی طرح ہمت افزائی کی۔ اور بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی رہے۔ بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قاضی عیسٰی کی صدارت میں ۱۹۴۳ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت اس کی چار شاخیں تھیں۔ دو کوئٹہ میں، ایک بچّی میں اور ایک نوشکی میں۔ اس زمانے میں بلوچستان میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی صرف سکولوں اور کالجوں کے طلباء مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر تھے۔ مگر جوش و خروش میں کسی سے کم نہ تھے۔ ۱۹۴۴ء میں جب قائدِ اعظم نے بلوچستان کا دورہ کیا۔ تو فیڈریشن کی شاخوں کی تعداد دس تک جا پہنچ گئی۔ طلباء نے قائدِ اعظم سے درخواست کی کہ وہ کوئٹہ میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی لائبریری کا افتتاح کریں۔ فیڈریشن نے بارہ بارہ روپے کے چھ وظیفے بھی ضرورت مند طلباء کو دیئے۔

دورۂ قائدِ اعظم

۱۸ / اکتوبر ۱۹۴۵ء کو جب قائدِ اعظم بلوچستان کے دورے پر تھے۔ تو بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ قائدِ اعظم نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے اس بات پر مسرّت کا اظہار کیا۔ کہ بلوچستان کے مسلم طلباء میں زبردست بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم طلباء کو چاہیئے کہ وہ اپنے مطالبات کے لیے برابر جدوجہد کرتے رہیں۔"

بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے یومِ شہداء منایا اور اس جوش و خروش سے منایا کہ انتظامیہ کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ حکومت نے طلباء کے جلسوں پر پابندی لگانے کا فیصلہ کر لیا

انتخابی مہم اور مسلم طلباء

فروری ۱۹۴۶ء میں صوبائی انتخابات منعقد ہوئے۔ جن میں مسلم لیگ کے نامزد امیدواروں نے زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ ان انتخابات میں بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبران پر مشتمل دس جماعتیں ترتیب دی گئیں ہر جماعت کے بارہ بارہ ممبر تھے۔ پانچ جماعتیں سندھ اور پانچ صوبہ سرحد میں بھیجی گئیں تاکہ ان صوبوں کا دورہ کر کے پاکستان کا پیغام گھر گھر پہنچائیں۔ کوئٹہ میونسپل کمیٹی کا الیکشن ہوا۔ تو اس

میں بھی طلباء نے لیگ کے امیدواروں کے حق میں کام کیا۔ اور مسلم لیگ نے ساری نشستیں جیت لیں۔

بلوچستان کے مسلم طلباء نے پنجاب کی سول نافرمانی کی تحریک میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ حکومتِ پنجاب نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ پر پابندی لگادی۔ لیگ کے تقریباً تمام قابلِ ذکر لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ سینکڑوں طلباء مرد اور عورتیں جیل بھیج دی گئیں۔

۲۲/فروری ۱۹۴۷ء کو بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نائب صدر فضل احمد نے قائدِاعظم کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں بلوچستان مسلم طلباء کے حالات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تحریک پاکستان کے لیے نوجوان بلوچی مسلمان کس انداز سے تنظیم کر رہے تھے۔

رپورٹ کے الفاظ اس طرح تھے۔

"ہماری تحریک کا آغاز بہت چھوٹے پیمانے پر ہوا۔ لیکن جنابِ عالی! ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں۔ کہ گو ہماری تعداد کم ہے۔ ہمارا نصب العین بہت بلند ہے۔ ہمیں آپ کی یہ نصیحت اچھی طرح یاد ہے۔ کہ تعلیم کے دوران طلباء کو سیاست میں عملی حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی موجودہ سیاسی مسائل اور تحریکوں سے خصوصاً اپنے ملک کی سیاست سے نابلد کبھی نہیں رہنا چاہیئے۔ ہم منتشر بھیڑ بکریوں کی مانند تھے۔ نہ کوئی ہماری تنظیم تھی نہ کوئی پلیٹ فارم تھا۔ نہ کوئی پرچم تھا۔ اور نہ کوئی ہمارا نصب العین۔ آپ نے ہمیں ایک جھنڈے کے نیچے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ اور اب ہمارے سامنے پاکستان کا اعلیٰ وارفع نصب العین ہے۔

باب ۲۷

جدوجہد پاکستان اور خواتین

۱۹۳۸ء میں قائداعظم کے حکم سے پورے ہندوستان میں خواتین مسلم لیگ کیٹیاں قائم ہوگئیں اور ہر صوبے میں خواتین آزادی کی جدوجہد میں مردوں کے دوش بدوش حصّہ لے رہی تھیں۔ پردے کی انتہائی قیود کے باوجود خواتین مسلم لیگ سب کیٹی کی اراکین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور یہ خواتین خود بخود آکر مسلم لیگ کام کے لیے خود کو پیش کر رہی تھیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں قرار داد پاکستان منظور کی گئی۔ قائداعظم اسی اجلاس کے اپنے تاریخی خطبے میں خواتین کی خدمات کو ان الفاظ میں سراہا:۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ اجلاس پٹنہ میں خواتین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی، یہ بات ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ کیوں کہ میں زندگی اور عمل کی جدوجہد میں خواتین کو شریک ہونے کا ہر موقع فراہم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خواتین اپنے گھروں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے اور باپردہ رہ کر بہت زیادہ کام کر سکتی ہیں۔ ہم نے یہ کمیٹی اس غرض سے بنائی تھی کہ وہ لیگ کے کاموں میں حصّہ لے سکیں۔ اس مرکزی کمیٹی کے حسب ذیل مقاصد تھے:

(۱) صوبائی اور ضلع وار مسلم لیگیوں کی تنظیم۔

(۲) مسلم لیگ میں زیادہ سے زیادہ خواتین کی ممبر سازی۔

(۳) پورے ہندوستان میں پروپیگنڈہ کرنا تھا کہ ان میں اور زیادہ سیاسی شعور پیدا ہو۔ یاد رکھیے کہ اگر خواتین میں سیاسی شعور پیدا ہو گیا تو آپ کے بچوں کو فکر و تردد سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔

(۴) مسلم معاشرے کی ترقی کے لیے ایسے تمام معاملات میں ان کی رہنمائی کرنا اور مشورہ دینا جن کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت ہے کہ اس مرکزی کمیٹی نے سنجیدگی اور جوش و خروش کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ اب تک

زیادہ مفید کام انجام دے چکی ہے۔ مجھے اس بات میں قطعی کوئی شبہ نہیں کہ جب ہم ان کی کارگذاریوں کی رپورٹ پر غور کریں گے تو واقعی ہم ان کی خدمات پر ممنون ہوں گے جو انھوں نے مسلم لیگ کے لیے انجام دی ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو بیگم مولانا محمد علی نے اس قرارداد کی تائید کل ہند خواتین مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے ہوئے کی تھی۔ مسلم خواتین نے قیام پاکستان اور آزادی کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا وہ ہماری تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کرتا ہے۔ تحریک خلافت میں محترمہ بی اماں (والدہ مولانا محمد علی جوہر) نے اپنے دونوں بیٹوں کی گرفتاری کے بعد بھی تحریک کو اس زوروشور سے جاری رکھا تھا۔ اسی طرح بیگم مولانا محمد علی جوہر نے اسی زمانے سے ملک کی سیاست میں حصہ لیا۔ پردہ کی پابندی ان کے کاموں میں مانع نہیں اس کی وہ مسلم لیگ کی کمیٹیوں اور اجلاسوں میں زیر شرکت ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب قائداعظم نے دوبارہ مسلم لیگ کی تنظیم کی تو خواتین پیش پیش تھیں۔ انھوں نے ملک میں دورے کر کے خواتین کو مسلم لیگ سے روشناس کرایا اور کثیر تعداد میں خواتین مسلم لیگ میں شامل ہوگئیں۔

جب قیام پاکستان سے پہلے یونینسٹ وزارت کے خلاف پنجاب میں تحریک شروع ہوئی تو اس تحریک میں خواتین نے برابر کا حصہ لیا اور مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی ایک بڑی تعداد جیلوں میں بند کردی گئی خواتین نے بڑے بڑے جلوس لاہور کی سڑکوں پر نکالے پولیس کی لاٹھیاں کھائیں اور اشک آور گیس کا مقابلہ کیا آخیر میں سیکرٹریٹ کی بلڈنگ پر مسلم لیگ کا جھنڈا بھی چند خواتین ہی نے لہرایا اس تحریک میں صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ ملک کے گوشے گوشے سے خواتین آکر شامل ہوگئیں اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ خواتین کی ان سرگرمیوں سے خضر حیات وزارت اتنی گھبرائی کہ آخر اس کو استعفیٰ دینا پڑا۔

حصول پاکستان کی تحریک جنوری ۱۹۴۷ء میں بہت شدومد سے ابھی جس میں مردوں اور عورتوں نے برابر کا حصہ لیا برطانوی حکومت اس تحریک سے بے حد متاثر ہوئی اس کی سمجھ میں آگیا کہ اب مسلمانان ہند کے مطالبہ پاکستان کو زیادہ عرصے کے لیے ٹالا نہیں جا سکتا۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں دہلی میں لیڈی کرپس کی جانب سے تجویز پیش ہوئی کہ چند مسلم لیگی اور چند کانگریسی خواتین لیڈی کرپس سے مل کر اپنے اپنے نظریے کی وضاحت کریں یہ

ملاقات لیڈی کرپس کی کوٹھی پر ایک ہی وقت میں مقرر ہوئی اور ان کے سیکرٹری نے دونوں جانب کی خواتین کو مقررہ وقت کی اطلاع دے دی۔

مسلم لیگ کی جانب سے اس وفد میں بیگم حسین ملک نورالصباح بیگم، بیگم شائستہ اکرام اللہ، انجمن آرا بیگم۔ بیگم سید احمد شاہ بخاری اور بیگم حمیدہ عارف شریک ہوئی تھیں۔ پہلی چار خواتین صوبہ دہلی خواتین مسلم لیگ کی عہدیدار ہونے کے علاوہ آل انڈیا خواتین مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی بھی ممبر تھیں۔ باقی دونوں خواتین صوبہ دہلی مسلم لیگ خواتین سب کمیٹی کی ممبر تھیں مسلم لیگی خواتین نے مدلل طریقے سے نظریہ پاکستان کی وضاحت کی یہ سب گفتگو کانگریسی خواتین کی موجودگی میں ہوئی جن میں مسز سروجنی نائیڈو، مسز وجے لکشمی پنڈت۔ راج کماری امرت کور وغیرہ شامل تھیں۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن جب دہلی آئے تو لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ایما پر بیگم رعنا لیاقت علی خان کی کوٹھی پر لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے ملنے کے لیے ساٹھ ستر مسلم لیگی خواتین کو مدعو کیا گیا۔ اس اجتماع میں مسلم لیگی خواتین نے موصوفہ کو بتایا کہ ہمارا مذہب ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیب و تمدن، ہمارے رسم و رواج، ہمارے رہن سہن کے آداب اور ہماری طرز گفتگو حتیٰ کہ ہمارے کھانے بھی ہندو قوم سے قطعی مختلف ہیں۔ اور کسی طرح بھی مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو اخیر میں لاجواب ہو کر کہنا پڑا کہ حصول پاکستان کا جو جذبہ مسلم لیگی خواتین کے دل میں ہے وہ دبانا اب مشکل ہے۔

عرض کہ برطانیہ نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہندوستان یعنی بھارت اور پاکستان کی آزادی کے متعلق اپنا نیا منصوبہ شائع کر دیا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کی آزادی کا بل منظور ہو گیا۔ اور پندرہ اگست ۱۹۴۷ء تاریخ نفاذ طے پائی جس کے تحت دو آزاد اور خود مختار ریاستیں بھارت اور پاکستان قائم ہوئیں۔ اس اثنا میں سارے ملک میں خصوصاً بہار۔ بنگال۔ دہلی۔ بمبئی اور پنجاب میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس میں سکھ مسلم دشمنی میں پیش پیش تھے۔ پرامن شہریوں کا خون مذہب کے نام پر بری طرح بہایا گیا۔ حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے دہلی مسلم لیگ خواتین سب کمیٹی نے طے کیا کہ کارکن لڑکیاں اور عورتیں فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ لیں تاکہ ان کیمپوں میں جاکر کام کر سکیں۔ جن میں قرب و جوار کے آئے ہوئے زخمی مرد اور عورت پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ بیگم رعنا لیاقت علی خان کی کوٹھی پر فرسٹ ایڈ کے لیکچر دیے گئے۔ اور اسناد حاصل کر کے خواتین نے فرسٹ ایڈ کے بکس سنبھال لیے اور زخمیوں کی مرہم پٹی

کا کام اپنے ذمے لے لیا۔

ایک بار جب گڑھ مکتیشر میں ہندو مسلم فساد ہوا تو اس علاقے میں مردوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ جاکر دیکھیں مگر عورتوں کا وفد گڑھ مکتیشر گیا۔ وہاں کے حالات کا جائزہ لیا اور واپسی پر مسلم لیگ آفس سے انتظام کرایا کہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو نکال کر لایا جائے۔ اس وفد میں بیگم اقبال حسین ملک، نورالصباح بیگم، بیگم احمد شاہ بخاری اور بیگم نسیم حسین پیش پیش تھیں۔

فرسٹ ایڈ کا کام کرنے کے لیے خواتین مسلمان ڈاکٹروں سے دوائیں حاصل کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان مصیبت زدہ لوگوں کے لیے غذا فراہم کرنا بھی دہلی کی مسلم لیگی خواتین ہی کے ذمے تھا۔ جو وہ کسی نہ کسی طرح حاصل کر کے کیمپوں میں تقسیم کرتی تھیں۔

خواتین اور بچے زیادہ تر اس مصیبت کا شکار ہوئے۔ بے خانماں لوگوں کے قافلے لیے، جوان لڑکیاں اور عورتیں چھن رہی تھیں۔ خون، تباہی، بربادی اور بہیمیت کا دور دورہ تھا۔ لاکھوں افراد پریشان حال لیے پٹے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر جا رہے تھے۔ اسی لیے اگر غور کیا جائے تو تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں نے پاکستان کا رخ کیا تو سب سے زیادہ نقصان خواتین کو ہی برداشت کرنا پڑا۔ مگر باوجود ان بے شمار تباہیوں اور پریشانیوں کے جن میں وہ گھری ہوئی تھیں انھوں نے ہمت سے کام سے کر اس دوران میں بھی زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور دیکھ بھال کی۔ دہلی کے کیمپ ان زخمیوں سے بھرے پڑے تھے جو لوگ گورداس پور، جالندھر، گڑھ مکتیشر اور الور وغیرہ سے لٹ کر آ رہے تھے۔ اسی طرح دوسری فساد کی جگہوں کا حال تھا۔

اس کے بعد جیسے ہی وہ پاکستان پہنچیں یہاں کی خواتین کے ساتھ مل کر مختلف انجمنوں کے ذریعے وہ اپنے ملک کی تعمیر اور فلاح کے لیے اصلاحی کاموں میں لگ گئیں۔

تحریک پاکستان میں خواتین کا حصہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کا رہا سہا اقتدار بھی ختم کر دیا۔ یہ سب کچھ بڑی حد تک اپنوں نے ہی کیے دھرے کا منطقی نتیجہ تھا۔ لہٰذا نظام قدرت کے مطابق دوسروں کو اقتدار مل گیا۔ نیز وہ ہندو قوم بھی جس کے ساتھ مسلمانوں نے اقتدار کے باوجود صدیوں تک انتہائی رواداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہماری بدترین حریف بن گئی اور وہ سیاسی اقتدار کے خواب دیکھنے لگی۔ آخر کار حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ آقا غلام اور غلام آقا بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں مسلم قوم

کے مرد ہی نہیں بلکہ خواتین بھی متاثر ہوئیں۔ عورتیں اپنی پردہ نشینی کے سبب پردوں کا منہ تکتی رہیں کہ وہ کب کروٹ لیں اور نیا انقلاب رونما ہو۔ پھر قوم کی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کا ثبت لائحہ عمل بنائیں اور خواتین کو بھی قدم بہ قدم، منزل بہ منزل اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ یوں تو مسلم خواتین میں رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور زیب النساء جیسی خواتین پیدا ہوئیں لیکن ہماری تحریک آزادی میں جو اولین قابل فخر خاتون مثالی حیثیت میں ہمارے سامنے آئی وہ (علی برادران کی والدہ) بی اماں کی شخصیت تھی۔ بی اماں نے قوم کو آزادی کا سبق پڑھایا اور میدان عمل میں نکلنے کا پیغام دیا۔ وہ خود اپنے بیٹوں کے ساتھ تحریک خلافت میں باہر نکلیں اور ہزاروں خواتین کو بھی اپنا ہم سفر بنا لیا۔ گو مسز سروجنی نائیڈو، مسز رشید، نائر، مسز پنڈت، ارونا آصف علی اور مس امتہ السلام بھی میدان عمل میں رہیں مگر ہمارا سفر مختلف منزل کی نشاندہی کرتا تھا۔ جب کوئی نصب العین سامنے ہوں گے بلند اور سخن دل نواز بن جائے۔ جذبۂ صداقت ہم سفر ہو تو سفر خوشگوار اور منزل نزدیک آجاتی ہے۔

مسلمانوں میں یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب افق سیاست ہند پر ایک جگمگاتا ستارہ نمودار ہوا۔ اس نے قوم کو پکار پکار کر کہا اگر تم اپنا تشخص قائم نہ رکھ سکے تو ہمیشہ کے لیے وادیٔ فنا میں پہنچ جاؤ گے۔ تمہاری زندگی کا حق بھی تم سے چھین لیا جائے گا۔ دشمن تمہاری دنیا ہی نہیں تمہارے دین کے بھی درپے ہے۔ یہ قائداعظم کی شخصیت تھی۔ مسلمان، مسلم لیگ کا آغاز تو کر چکے تھے مگر ذہنی طور پر مکمل تیاری کا فقدان تھا۔ قائد کی آواز پر قوم جاگی۔ قائد کا عمل اور علامہ اقبال کا سخن دلنواز قوم کے لیے رہبر ثابت اور گنتی کے چند سالوں کے اندر دنیا کے جغرافیہ پر ایک مضبوط و مستحکم مسلم ریاست ابھر کر اقوام عالم کی صف میں شامل ہو گئی۔

اس نئی مسلم ریاست کی تعمیر میں خواتین ہند نے زبردست اور تاریخ ساز کردار ادا کیا اور قائداعظم کی قیادت میں یہ قافلہ دہلی سے روانہ ہو کر درۂ خیبر اور راس کماری تک جا پہنچا۔ پہلے بی اماں کی بہو، بیگم محمد علی جوہر نے پیش قدمی کی پھر ہندوستان کے صوبے صوبے سے مسلم خواتین میدان عمل میں اتر آئیں۔ اور پاکستان کا تصور ان کا جزو ایمان بن گیا۔ بعد ازاں جب باشعور مسلم لیگی خواتین نے قیادت سنبھالی، ان میں بہت سے نام آتے ہیں۔ یہ وہ خواتین تھیں جنھوں نے دن رات کا آرام و سکون تج دیا اور خود کو اپنے ارمانوں کے مرکز پاکستان کے لیے وقف کر دیا۔ وہ قائداعظم کے اس قافلے میں قدم قدم پر ساتھ رہیں۔

ان خواتین میں پنجاب کی خواتین کی کارکردگی زیادہ تر انتظامی امور، وسیع سیاسی و تبلیغی جلسوں کے انعقاد جلوسوں اور بین الصوبائی رابطے تک محدود تھی۔ علاوہ ازیں پنجاب کی مسلم خواتین کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کا جو شرف حاصل ہوا وہ کسی دوسرے صوبے کی خواتین کے لیے مقدر نہ تھا۔ پنجاب کی خواتین نے اس صوبے کی تمام ریاستوں میں بھی مسلم لیگ کے لیے زبردست خدمات انجام دیں۔

سرحد کی خواتین کو سول نافرمانی جاری رکھنے اور سیاسی جوش و ولولہ کو زندگی دینے کا شرف حاصل ہے۔ خواتین سرحد نے شدید سیاسی پابندیوں کی دھجیاں اُڑا دیں۔ انھوں نے حکومت سرحد کی مزاحمت کا مقابلہ کیا اور وائسرائے ہند کے انکار کے باوجود اسے ملاقات پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اسی صوبے کی غیور اور بہادر خواتین نے کانگرسی وزارت کا غرور پارہ پارہ کر کے کانگرس کو عبرت ناک سبق دیا۔

یو پی میں مسلم لیگ کو بام عروج تک پہنچانے میں دلی کی خواتین کا کردار قابل فخر رہا۔ مرکزی حکومت کے دارالحکومت میں مسلمانوں کے خلاف ہندو اور انگریز کی مزاحمت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ دلی کی خواتین نے صوبے کے گھر گھر میں مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دلی اور دیگر اجتماعات کا انتظام و انصرام بحسن و خوبی کیا۔ حکومت برطانوی ہند کے گرمائی دارالحکومت شملہ میں پنجاب مُسلم لیگ کے علاوہ دلی کی زنانہ مسلم لیگ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اسی صوبے کی خواتین نے کانگرس حکومت کے خلاف اتنا زبردست پراپیگنڈہ کیا کہ ہندو رہنما بوکھلا اُٹھے۔

صوبہ بنگال کے مشرقی اور مغربی دونوں حصّوں میں خواتین نے بھرپور کردار ادا کیا۔ مشرقی حصے کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ مسلم لیگ کا اولین اجلاس ہی صدر مقام ڈھاکہ میں ہوا۔ جس کی صدارت بزرگ رہنما نواب وقارالملک نے فرمائی۔ بیگم شمس النساء محمود، بیگم مرشد اور حسین شہید سہروردی کے خاندان کی مستورات نے مسلم لیگ کے شعبہ خواتین کو نہایت جانفشانی سے چلایا۔

زنانہ مسلم لیگ کے قیام کا اعزاز بیگم حفیظ الدین کو حاصل ہوا۔ بیگم محمد علی جوہر تو پہلے ہی سب سے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں۔ علاوہ ازیں منشی محبوب عالم مالک پیسہ اخبار کی دختر فاطمہ بیگم نے ۱۹۰۱ء میں تکمیل تعلیم کے بعد بمبئی جاکر انسپکٹریس آف سکولز کا عہدہ سنبھالا اور بعد ازاں وہیں سے مجلہ "شریف بی بی" کا اجراء کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ پنجاب کے

مقابلے میں بنگال کی خواتین میں زیادہ بیداری پیدا کی جا سکتی ہے۔ بنگالی خواتین نے اس دور میں انگلستان جا کر تعلیم حاصل کی۔ عطیہ بیگم فیضی، ان کی ہمشیرہ زہرہ بیگم فیضی اور نواب منجیرہ کی اہلیہ نالی بیگم لندن پہنچیں اور مختلف کانفرنسوں میں شریک ہوئیں۔ کچھ سیاسی شعور کی بیداری اور کچھ ایسی عالم فاضل خواتین کی دیکھا دیکھی برصغیر کے مسلمانوں نے بھی کافی حد تک بچیوں کی تعلیم کی مخالفت سے دست کشی اختیار کر لی۔ ادھر پنجاب کے با اثر لوگوں میں سب سے پہلے سر محمد شفیع کے خاندان کی کچھ خواتین سماجی اور سیاسی میدان میں آئیں۔ جہاں آرا شاہنواز اپنے والد محترم کی سیکریٹری کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئیں اور پہلی عالمی کانفرنس میں مسلمان عورتوں کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے۔ سر محمد شفیع کی دوسری صاحبزادی گیتی آرا بیگم تھیں جو جسٹس شاہ دین کی بہو اور میاں بشیر احمد کی اہلیہ تھیں۔ جنھوں نے نہایت معیاری ماہنامہ "ہمایوں" جاری کیا۔ کچھ پہلے بنگال میں سہروردی خاندان میدان علم و عمل میں آچکا تھا۔ حسین شہید سہروردی کی پھوپھی خجستہ اختر بانو (المعروف سہروردیہ بیگم) نے پہلی بار عورتوں میں ایم۔ اے کیا۔ پھر خواتین کی تعلیم کا بیڑا اٹھاتے ہوئے بنگال کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور مسلمان بچیوں کے لیے مدارس کھولے۔ ایک اور مسلمان خاتون مسز شوکت حسین نے شوکت میموریل سکول کھول کر مسلمان لڑکیوں کے لیے تعلیمی مواقع فراہم کیے۔ محترمہ فاطمہ بیگم بھی ان مدارس کے معیار تعلیم سے بہت مطمئن اور متاثر تھیں۔ جب محترمہ فاطمہ بیگم کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی تو انھوں نے کہا:

"مسلمانوں کو اس وقت باعمل خواتین کی شدید ضرورت ہے۔ آپ ملازمت کے دائرے سے نکلیں اور لاہور جا کر ملک و قوم کے لیے مفید کام سرانجام دیں۔"

محترمہ فاطمہ بیگم نے بلا تامل اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ملازمت کو خیرباد کہا اور لاہور چلی آئیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی مسلم لیگ اور قوم کے لیے وقف کر دی۔ لاہور لوٹتے ہی انھوں نے متعدد زنانہ مدارس کھولے اور خواتین کو گھر گھر جا کر دعوت عمل دی۔ ۱۹۳۵ء میں جناح کالج کھولا جس کی عمارت نواں کوٹ میں اب بھی موجود ہے۔ ان کے شدت احساس کا یہ عالم تھا کہ اپنی تمام املاک قوم کے لیے وقف کر دیں۔

برطانوی ہند کی حکومت نے ۱۹۳۶ء میں برصغیر کے عوام کو صوبائی خود مختاری دینے کا اعلان کیا تو ہر شخص کو حق رائے دہی کا موقع مل گیا۔ یوں ۱۹۳۷ء میں پہلی بار برصغیر میں صوبائی سطح پر انتخابات کا آغاز ہوا اور یہی پہلا موقع تھا جب مسلمان خواتین اپنے گھروں سے باہر نکلیں

اور انھوں نے اپنے امیدواروں کو ووٹ دے کر کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ ہر صوبے سے مسلمان عورتوں کے لیے مخصوص نشستوں کا اعلان بھی ہوا تھا۔ لاہور میں خاتون اُمیدواروں مُسلم لیگ سول لائن حلقہ سے بیگم شاہنواز، شہر کے حلقے سے یونینسٹ اُمیدوار باقی رشیدہ لطیف اور ان کے علاوہ بیگم قلندر علی، بیگم مظفر حسین جن کے شوہر ریلوے بورڈ کے رکن تھے۔ باغبانپورہ سے ایک خاتون معراج بیگم شامل تھیں۔ بیگم شاہنواز کو کامیابی حاصل ہوئی۔

پنجاب سے بیگم شاہنواز، بنگال سے بیگم حکم، لکھنؤ سے بیگم اعزاز رسول اور بیگم حبیب اللہ، بہار سے بیگم کلیم اور دیگر خواتین کامیاب ہوئیں تو نہ صرف جوش و ولولہ پیدا ہوا بلکہ مسلمان بچیوں کو بھی شوق پیدا ہوا کہ وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں۔ گو مُسلم خواتین کی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۱۵ء میں ہو گیا تھا۔ مگر یہ کسی حد تک عام گھرانوں کی بچیوں اور ان کے والدین کو تعلیم کی طرف رغبت دلانے تک محدود تھیں۔ بلاشبہ اس وقت بہت سے زنانہ مشن سکول کھل گئے تھے مگر مسلمان اپنی بچیوں کو مشنری مدارس میں داخل کرانا بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ لہٰذا ان سکولوں میں ہندو، سکھ، پارسی اور عیسائی لڑکیوں کی بھرمار تھی۔ ۱۹۱۵ء ہی میں پہلی مسلمان لڑکی کوئین میری سے میٹرک پاس کر کے نکلی۔ بعدازاں زنانہ مسلم لیگ کی پہلی جنرل سیکرٹری قدسیہ اعزاز رسول نے میٹرک کا امتحان دیا اور یوں دوسری مسلمان بچیوں میں حصول تعلیم کا شوق فزوں تر ہو گیا۔ گو ابھی مسلمان مدارس کی کمی تھی لیکن جب بامر مجبوری مسلمان بچیوں نے مشنری سکولوں ہی کو غنیمت جانا تو وہاں انھیں داخلہ ملنا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ غیر مسلم لڑکیاں پہلے سے کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ کچھ ایسی ہی حالت مردانہ سکولوں اور کالجوں کی تھی۔ جہاں مسلمان بچوں کو داخلہ کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔ میڈیکل کالج تو خیر اُن کے لیے شجر ممنوعہ تھے۔ یہی حالات تھے جن کے تحت سر فضل حسین سے جو پہلی بار صوبائی انتخابات میں کامیابی کے بعد وزیر تعلیم پنجاب بنے تھے، حکومت برطانیہ سے بڑی تگ و دو کے بعد ہر کالج میں ۴۲ فیصد نشستیں مسلمان بچیوں کے لیے مختص کروائیں۔ اس وقت تک مسلمان شدید احساس کمتری میں مبتلا تھے اور وہ غیر مسلم لڑکوں اور بالخصوص لڑکیوں کو قابلیت اور ذہانت میں اپنی اولاد کے مقابلے میں برتر سمجھتے تھے۔ یہ احساس اپنی جگہ کسی حد تک بجا تھا۔ اکثر نوجوان لڑکے تو مختلف صوبوں سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچ جاتے مگر لڑکیوں کا مسئلہ پھر بھی موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان علی گڑھ یونیورسٹی ہی سے تعلق رکھتے ہیں مسلمان خواتین میں ایک اور خاتون مس خدیجہ فیروز الدین نے ۱۹۱۹ء میں

ایم۔اے کیا اور بعدازاں محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹرس کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ انھوں نے دم آخر تک سختی سے پردے کی پابندی کی۔ بڑی بڑی تقریبات سے خطاب کرتے یا ان کی صدارت کے دوران بھی وہ برقعہ میں ہوتیں۔ حتیٰ کہ ہاتھوں پر بھی ہمیشہ دستانے چڑھائے ہوتے۔ ان کا تعلق ایک معزز زمیندار گھرانے سے تھا اور ان کی بہن ڈاکٹر تھیں۔ علی گڑھ کی چند خواتین بھی علی گڑھ کالج سے تعلیم حاصل کرکے نکلیں اور بعدازاں انھوں نے خاصا نام پیدا کیا۔ ان میں خود مس عبداللہ بھی تھیں جن کے والد اس کالج کے بانی تھے۔ ایک اور لڑکی سعیدزادہ تھی جس نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ ایک مس رشیدہ جہاں تھیں انھوں نے بھی ایم۔اے کیا اور انگلستان چلی گئیں جہاں انھوں نے آئی۔سی۔ایس کا امتحان دینے کے بعد پروگریسو رائٹرز گروپ میں شرکت کرلی۔ وہ روس چلی گئی تھیں اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل دیگر لڑکیوں میں ممتاز جہاں و خاتون جہاں، رشید جہاں کی بہنیں تھیں جو ایم۔اے کرکے نکلیں اور مختلف اوقات میں اپنے والد کے تعلیمی ادارے سے منسلک رہیں۔ اس تعلیمی شوق کے بعد بہت سے اسلامی مدارس بھی وجود میں آئے۔ اس سلسلہ میں بی اماں نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ بی اماں (والدہ محمد علی جوہر) نے ملک کے طول وعرض میں دورے اور لڑکیوں کے دلوں میں ملی خدمت کے نقوش راسخ کیے۔

اسی دور میں عورتوں نے سماجی خدمت کا فن بھی سیکھا اور ڈگریاں حاصل کیں۔ خواتین نے ایک مجلس "مجمع البنات" کے نام سے بھی قائم کی۔ ہرہائی نس بیگم آف بھوپال نے آل انڈیا مسلم وغیرہ کانفرنس کی بنیاد ۱۹۱۵ء میں ڈالی اور ۱۹۱۸ء میں پہلی کانفرنس لاہور میں منعقد کی۔ جس کی صدارت آبرو بیگم نے کی۔ پہلی بار اسی کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ جو شخص پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرے اور خواہ ایسا شخص کانفرنس کی کسی رکن کا قریب ترین عزیز کیوں نہ ہو، اس سے میل جول ترک کر دیا جائے۔ یہ قرارداد بیگم شاہنواز نے پیش کی تھی۔ جب عوام اور اخبارات نے اس قرارداد پر لے دے کی تو تنقید کا تمام تر ہدف بیگم شاہنواز ہی بنیں کیوں کہ قرارداد انھوں نے پیش کی تھی۔ ۱۹۲۰ء تک خواتین میں سماجی اصلاحات کا چرچہ ہو چکا تھا۔ اور جابجا انجمنوں کی تشکیل شروع ہو چکی تھی۔ نیز اسلامی مدارس کی بنیادیں بھی پڑنا شروع ہو چکی تھیں۔

اس موقع پر آل انڈیا ویمینز کانفرنس کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس کانفرنس میں

گنتی کی مسلمان عورتیں تھیں۔ آل انڈیا ویمنیز کانفرنس دراصل کانگرس کی ایک ذیلی سی تنظیم بن چکی تھی۔ گو اس پر یہ لیبل نہ تھا تاہم وہ کانگرس ہی کے احساسات اور جذبات کی آئینہ دار تھی۔ ہندو خواتین مسلمان خواتین کو اپنے سے کم تر، کم عقل، غریب جاہل اور ملیچھ (ناپاک) سمجھتی تھیں۔ لیکن زبان میں اتنا رس کہ انسان ان کا گرویدہ ہو کر رہ جائے۔ وہ مسلمان خواتین کے ساتھ ایک میز پر کھانا بھی پسند نہ کرتیں۔ انھیں کوئی مشکل پیش آتی تو تمسخر کا انداز اختیار کرتیں۔ مذہبی رسومات پر طنز کرتیں اور پردے کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتیں۔ بسا اوقات تو اسلامی روایات اور اسلام کا تمسخر اڑاتیں۔ ہندو عورتیں آل انڈیا ویمنیز کانفرنس میں اپنی اکثریت کے بل پر بالعموم ہندو خواتین کو صدر یا دیگر عہدیدار منتخب کرتیں۔ ہندو عورتوں میں اکثریت متمول مگر نہایت کفایت شعار تھی۔ ہندو خواتین نے اپنی اجارہ داری اس اعتبار سے بھی قائم کر رکھی تھی کہ کسی تقریب میں تمام اراکین کو مدعو کرنے کی بجائے اپنی مرضی سے محدود تعداد کو دعوت نامے ارسال کرتیں۔ ایک سالانہ اجلاس کی صدارت لیڈی عبدالقادر کر رہی تھیں۔ جس طرح آج بھی دکھاوے کے لیے بھارت کا صدر اکثر کوئی مسلمان چنا جاتا ہے۔ بعینہٖ ویمنیز کانفرنس کے کسی بڑے اجلاس کی صدارت کسی مسلمان خاتون سے کرائی جاتی۔ اسی اجلاس میں بظاہر مسلمان عورتوں کی ترقی کے نام پر پردے کی مخالفت کی گئی۔ جس پر اجلاس میں اور اس کے بعد سخت لے دے ہوئی۔ آخر وہ وقت آگیا جب قائداعظم نے مسلمان خواتین کو حکماً اس انجمن سے الگ ہو جانے کو کہا کیوں کہ اس کے ذریعہ اسلامی نظریات کو مسخ کرنے اور مسلمان عورتوں کو گمراہ کرنے کی مسلسل کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کے بعد ہی مسلمان خواتین نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا اور اسی سطح پر اپنی تنظیموں کا قیام شروع کر دیا۔

لاہور کے خوبصورت باغ جناح (لارنس گارڈ) میں ایک لیڈیز کلب تھی۔ انگریز اور ہندو خواتین کی اکثریت اس کلب کی رکن تھی۔ اندازہ کیجیے کہ ۲۴۰ اراکین میں صرف ۲۰ مسلمان خواتین تھیں۔ مگر انگریز عورتیں یہاں صرف تبلیغی روح لے کر آتیں تاکہ مسلمان اور ہندو خواتین کے ساتھ گھل مل کر انھیں دائرہ عیسائیت میں شامل کر سکیں ورنہ کم از کم ذہنی طور پر فرنگی حکومت کا ہم نوا بنا سکیں۔ گورنر کی بیوی باقاعدگی سے آتی اور باتوں باتوں میں عیسائیت کی تبلیغ بھی کرتی۔ دراصل لیڈیز کلبیں ہر ضلعی صدر مقام پر قائم کی گئی تھیں۔ ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر (جو عموماً انگریز ہوتے تھے) کی بیوی اس کی سربراہ ہوتی اور بنیادی مقصد ہی تبلیغ ہوتا۔ ورنہ وہ انگریز جو ہندوستانیوں

اور کمتوں کو شیشن، باغات اور ریفرشمنٹ رولز میں ایک درجہ دیتا تھا وہ اپنی عورتوں کو ہندوستانی عورتوں کے ساتھ گھل مل جانے کا سبق دینا کیوں کر گوارا کر سکتا تھا؟ بہر حال لاہور کی لیڈیز کلب کی رکن متمول ہندو سکھ خواتین اور راجوں مہاراجوں کی بیویاں تھیں۔ جب ۱۹۲۹ء میں عدم تعاون کی تحریک چلی تو انگریز گورنر کی بیوی کی کلب میں آمد کے ساتھ ہی ہندو رکن خواتین باہر چلی جاتیں۔ مسلمان خواتین میں بیگم قلندر، لیڈی عبدالقادر، بیگم محمد علی، ان کی صاحبزادیاں، لیڈی مراتب علی، لیڈی ذوالفقار وغیرہ اور دیگر چند مسلمان خواتین نمایاں تھیں۔

ہندو رکن خواتین میں بڑے بڑے سیٹھوں اور بیرسٹروں کی بیویاں تھیں۔ گو اس زمانے میں کاریں بہت کم تھیں مگر یہ خواتین کاریں ہونے کے باوجود پیدل آتیں۔ کروڑ پتی مسز مہاجن بھی ڈیوس روڈ سے پیدل آتیں اور دیگر سماجی امور بھی پیدل ہی جا کر انجام دیتیں۔ انھوں نے نسبت روڈ پر ایک ودھوا آشرم کھول رکھا تھا۔ جہاں بیوہ عورتوں کو سلائی کڑھائی سکھائی جاتی۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان عورتوں کا کوئی ادارہ موجود نہ تھا۔ لہٰذا بیگم تصدق حسین نے مسلم لیگ کی تنظیم کے تحت سوشل سروس کا بیڑا اٹھایا اور یہاں مختلف علاقوں میں خواتین کے لیے دس سکول قائم کیے۔ ایک ایک دو دو کمرے لے کر سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا۔

مسلمان خواتین کی بیداری میں متعدد رسائل و اخبارات نے بھی اہم کردار ادا کیا، اور انھیں اپنی مذہبی، معاشی و معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ ان میں فاطمہ بیگم کا "شریف بی بی بمبئی" لاہور سے محمدی بیگم کا "تہذیب نسواں" اور دلّی سے علامہ راشد الخیری کا "عصمت" قابل ذکر ہیں۔ یہ رسائل مسلمانوں کے گھروں میں پہنچے اور انھوں نے خواتین کو تمام وقتی مسائل سے آگاہ کیا۔ ان تینوں کی زبان نہایت سادہ ہوتی۔ لہٰذا خواتین ہر مضمون کو بآسانی سمجھ لیتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رسائل نے مسلمان خواتین کے فکر و احساس کو وسعت و تقویت بخشی۔ لاہور سے حمید نظامی (مرحوم) نے "نوائے وقت" کا اجراء بیڈن روڈ سے کیا۔ اس وقت یہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا اور وسائل محدود تھے۔ لیکن مرحوم حمید نظامی کی سنجیدہ قلمی و ذہنی قیادت نے طلباء کو نہایت وقار اور تحمل کے ساتھ سیاسی تربیت کے حصول کی پرعزم صلاحیت عطا کی۔ بلا شبہ یہ نوائے وقت کی تحریروں کا معجزہ تھا کہ مسلم لیگ میں طلباء کا مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اور طالبات کی تنظیم بھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس وقت مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے اراکین میں ضیاء الاسلام انصاری، شباب مفتی اور آفتاب قریشی سرگرم عمل تھے۔

پنجاب میں مسلم لیگ صوبائی سطح پر ۱۹۰۷ء میں قائم ہوئی جس کے پہلے جنرل سیکرٹری سر محمد شفیع اور صدر خان بہادر جسٹس شاہ دین تھے۔ دیگر عہدیداروں میں نائب صدر نواب محمد علی قزلباش، جائنٹ سیکرٹری مولوی محبوب عالم پیسہ اخبار، خازن شیخ گلاب دین، نائب خازن مرزا جلال الدین تھے۔ اور مجلس عاملہ میں چوہدری شہاب الدین، خواجہ کمال الدین، شیخ تاج الدین، خواجہ ضیاء الدین، مولوی احمد دین، مولوی انشاء اللہ، منشی عبدالعزیز (پیسہ اخبار) میر ناظم حسین ناظم، مدیر ناظم الہند غلام نبی، حکیم محمد شریف، شمس الاطباء حکیم غلام جیلانی امرتسری اور شیخ محمد بخش شامل تھے۔ لاہور کے علاوہ دیگر اضلاع سے خواجہ غلام محمد (فیروز پور) مرزا اعجاز حسین وکیل (انبالہ) خواجہ احمد شاہ (لدھیانہ) شیخ عبدالقادر (دلی) جو اس وقت پنجاب میں تھے۔ شیخ عبدالحق وکیل، شیخ محمد نصیب (گورداسپور) محمد حسین چیمہ وکیل (گجرات) چوہدری محمد احسن (گجرات) اور محمد اکبر وغیرہ تھے۔ بعدازاں انھی گھرانوں کی مستورات نے بھی مسلم لیگ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

گو زنانہ مسلم لیگ کا باقاعدہ اجرا تو دسمبر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ سیشن کے بعد ہوا یعنی اس اجلاس کے بعد جس میں ہمارے رہنما محمد علی جناح کو ایک سرگرم کارکن فیروز الدین نے قائداعظم کے نام سے پکارا اور پھر سارے ہندوستان میں انھیں قائداعظم ہی کہا جانے لگا، مگر پنجاب بالخصوص لاہور میں زنانہ مسلم لیگ کا وجود تقریباً ۲ سال قبل قائم ہو چکا تھا۔ امرتسر، گوجرانوالہ، گوجرخان، گجرات، جالندھر، لدھیانہ، فیروز پور، ملتان، فیصل آباد اور راولپنڈی وغیرہ کے اضلاع میں زنانہ مسلم لیگ کی شاخوں کا قیام ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا۔ ۱۹۳۸ء میں محترمہ فاطمہ جناح اپنے برادر عزیز قائداعظم کے ساتھ خواتین کو دعوت عمل دینے کے لیے خود میدان عمل میں اُتریں۔ ان کے میدان عمل میں آتے ہی مسلمان خواتین کو خود اعتمادی کی دولت نصیب ہوئی۔ اور مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم ترین باب کا اضافہ ہو گیا۔ قائداعظم نے چند خواتین کے ایما پر سالانہ اجلاس مسلم لیگ منعقدہ پٹنہ میں مُسلم لیگ خواتین سب کمیٹی کا اعلان فرما دیا۔ دراصل اس کمیٹی کے قیام سے متعلق نواب سورت کی بیگم (مسز حفیظ الدین) نے قائداعظم سے تحریری درخواست کی تھی کہ خواتین کو قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ قائداعظم نے اس تجویز کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بیگم حفیظ الدین کو جواب دیا کہ صرف چند مستورات نہیں بلکہ پوری مسلمان قوم کی خواتین کو دعوت عمل دی جائے گی۔ لہٰذا ۱۹۳۸ء نہایت مُبارک سال ثابت ہوا کہ خواتین کو میدان عمل میں اترنے اور پھر ہر صوبہ میں زنانہ مُسلم لیگ کے اجرا کی اجازت مل گئی۔

زنانہ مسلم لیگیں پہلے صوبائی پھر ضلعی اور اس کے بعد تحصیل و دیہی سطح پر قائم کی گئیں۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پھر خواتین نے مسلم لیگ کو گودوں میں لے کر پالا اور اس کی پرورش کی۔ ابتدائی دور میں جو خواتین آگے بڑھیں ان میں ضلعی سطح پر بیگم بیضا خاں (امرتسر) بیگم شیخ صادق حسن (امرتسر) بیگم شیخ (فیروز پور) بیگم قلندر علی خاں، بیگم خان اسداللہ خاں (پشاور) بیگم ضیاؕالدین (پشاور) بیگم محمد شریف (انبالہ) بیگم محمد اکبر (گجرات) بیگم محمد حسن چیمہ (گجرات) بیگم رشیدہ احسن (گجرات) بیگم مہدی علی خاں (گجرات) بیگم عطا محمد (گوجرانوالہ) بیگم سعیدہ ریاض الحسن (راولپنڈی) بیگم محمود حسین سنٹو اور بیگم حیات بخش (پشاور) بیگم فاطمہ (لاہور) بیگم زبیدہ شاہ، بیگم احسان علی شاہ اور لیڈی شفیع شامل تھیں۔ علاوہ ازیں پٹنہ سیشن میں جو خواتین کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں درج ذیل خواتین شامل کی گئیں۔

صدر شعبہ خواتین:۔ بیگم حفیظ الدین (نواب آف سورت)

جنرل سیکرٹری:۔ بیگم اعزاز رسول (لکھنؤ)

اراکین:۔ لیڈی ہدایت اللہ (کراچی) بیگم نواب صدیق علی خاں (سی پی) بیگم سبحان (بمبئی) بیگم رحمان (شملہ) لیڈی امام (بہار) بیگم اختر (بہار) بیگم عطاء الرحمٰن (آسام) بیگم حاتم طیب جی (کراچی) مسز حسین ملک (دلی) بیگم حاجی اسداللہ خاں (پشاور) بیگم قریشی (مدارس) بیگم حاجی (کلیمامور) بیگم جہاں آرا شاہنواز (لاہور) بیگم شہاب الدین (ڈھاکہ) بیگم اصفہانی (کلکتہ) بیگم حبیب اللہ (لکھنؤ) مس فاطمہ جناح (کراچی) مسز طیب جی (کراچی) بیگم وسیم (کلکتہ) بیگم اسماعیل خان (میرٹھ) بیگم محمد علی جوہر (احمد آباد) لیڈی ہارون (کراچی) اور مسز خواجہ اللہ بخش، مس جے خاں، مس راحیلہ خاتون اور مس نادر خاں یہ تمام خواتین تادم زیست مسلم لیگ سے وابستہ رہیں۔

زنانہ مسلم لیگ کے لیے جو قرارداد پیش کی گئی اس کا متن یہ ہے۔

"چونکہ خواتین کی ترقی کے لیے انھیں کافی مواقع مہیا کرنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ ہندوستان میں مسلمان قوم کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے سکیں۔ اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس فیصلہ کرتا ہے کہ مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل آل انڈیا مسلم لیگ کی ویمن سب کمیٹی قائم کر دی جائے۔ سب کمیٹی کے اغراض و مقاصد یہ ہوں گے:۔

(ا) صوبائی اور اضلاعی مسلم لیگوں کے تحت صوبائی اور ضلاعی سب کمیٹیوں کو منظم کرنا۔

(ب) ہندوستان بھر میں مسلم خواتین میں وسیع پروپیگنڈا کرنا تاکہ ان میں زبردست سیاسی شعور پیدا ہو سکے۔

(ج) خواتین کو بھاری تعداد میں مسلم لیگ کا رکن بنانا۔

(د) انھیں ایسے تمام معاملات میں مشورہ دینا اور ان کی راہنمائی کرنا جن پر مسلم معاشرہ کی ترقی کا دارومدار ہے۔''

یہ قرارداد لکھنؤ سے قانون ساز اسمبلی کی رکن بیگم حبیب اللہ نے پیش کی۔ اور چوہدری خلیق الزماں کی ہمشیرہ بیگم وسیم نے اس کی تائید کی تھی۔ مردوں کی طرف سے اس قرارداد کے مؤید محمد فاروق رکن قانون ساز اسمبلی یو پی تھے۔ اس کے تحت کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی اور خواتین نے ہدایات حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں لوٹ کر نہایت تندہی کے ساتھ کام کا آغاز کر دیا۔

پنجاب میں زنانہ مسلم لیگ ۱۹۳۵ء ہی سے موجود تھی۔ لیکن ۱۹۳۷ء سے زنانہ شعبہ زیادہ سرگرم عمل ہو گیا۔ پٹنہ قرارداد کے بعد تو پنجاب کے شعبہ میں بھی ایک نئی روح پھونک دی گئی۔ یہاں بیگم سید مراتب علی کو صدر اور بیگم قلندر علی کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ قلندر علی وکیل سرکار تھے۔ ۱۸ شارع حمید نظامی (ٹمپل روڈ) پر بہت بڑی حویلی ان کی ذاتی ملکیت تھی اور یہیں پر سب سے پہلے زنانہ مسلم لیگ کے دفتر کا قیام عمل میں آیا وہ گھر، جس میں مسلم لیگ کا دفتر تھا اب ایک ٹیلر ماسٹر کی ملکیت ہے۔ اس کے بعد زنانہ مسلم لیگ کا دفتر ایمپریس روڈ پر منتقل ہو گیا۔ اس کی پہلی خزانچی بیگم عبدالعزیز فلک پیما تھیں اور بیگم جہاں آرا شاہنواز، بیگم بشیر احمد، لیڈی شفیع، بیگم نعمت اللہ، بیگم ذوالقرنین، بیگم جسٹس شاہ دین، بیگم رحمت اللہ شیخ، لیڈی نواب ذوالفقار علی خان، بیگم اصغر علی اور بیگم تصدق حسین مجلس عاملہ میں شامل تھیں۔ دو سال بعد شعبہ خواتین کے نئے انتخابات ہوئے تو بیگم گیتی آرا بشیر احمد صدر اور فاطمہ بیگم جنرل سیکرٹری منتخب کی گئیں۔

خواتین نے جس تندہی سے بین الصوبائی رابطہ کو دوروں کی صورت میں قائم وہ بلا مبالغہ کسی بھی فعال و منظم اور مربوط جماعت کے شایان شان تھا۔ مختلف صوبوں سے خواتین کے جو وفود لاہور آتے رہتے ان میں یو پی سے بیگم نواب محمد اسماعیل، بیگم وسیم، بیگم اسماعیل (بیگم وسیم کی ہمشیرہ) ان کی صاحبزادیاں بنگال سے مسز مرشد اور مسز شمس النا محمود، بیگم حکم اور بیگم وہاب، کراچی سے بیگم کھرو، بیگم ہدایت اللہ، بیگم ہارون اور ان کے خاندان کی بہت سی لڑکیاں شامل تھیں۔

بیگم ہدایت اللہ کی صاحبزادی دولت ہدایت اللہ اور شرکت میر مقبول اور اب ان کی صاحبزادی لیلیٰ بشاور میں ہیں جن کی شادی میر افضل صاحب کے چھوٹے بھائی سے ہوئی۔

بیگم حسین ملک نے ملکھنؤ سیکشن (مسلم لیگ) میں شرکت سے قبل مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ بعدازاں وہ کمیٹی کی رکن منتخب ہوئیں جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ بیگم حسین ملک نے بیگم رضا اللہ انجمن آرا بیگم اور بیگم محمد حسین کے ساتھ مل کر مرکزی خواتین کمیٹی کی تنظیم کے لیے بہت کام کیا اور انھیں محترمہ فاطمہ جناح کی سرپرستی حاصل رہی نور الصباح بیگم دلی میں زنانہ شعبہ مسلم لیگ کی جنرل سیکرٹری رہیں۔ انھوں نے محلہ، موضع، تحصیل اور ضلع کی سطح پر نہ صرف مسلم لیگ کی تنظیم کی بلکہ مدارس اور انڈسٹریل ہوم بھی کھولے۔ کانگرس کی مخالفت کے باوجود انھوں نے خواتین کی کثیر تعداد کو رکن بنایا۔ بہت سے صوبوں میں تو مسلمان سرکاری افسروں کی بیگمات بھی بے دھڑک میدان عمل میں اتر آئیں لیکن دلی میں ایسی عورتوں کی تعداد بہت کم تھی۔ زنانہ شعبہ کی تنظیم میں بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم، لیس بخاری اور بیگم نسیم حسین (سر فضل حسین کی بہو) کی رہنمائی اور رعانت کو بڑا دخل رہا۔ بیگم عبداللہ ہارون تو شب و روز سرگرم رہتیں۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے دلی میں خواتین کا ایک تاریخی اجتماع کیا اور قائداعظم نے اس اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس اجتماع میں پنجاب اور یو پی کے وفود نے بھی شرکت کی دلی کے خواتین سول نافرمانی کے سلسلہ میں بھی پیش پیش رہیں۔ بیگم نور الصباح اور بیگم حسین ملک نے گرفتاریاں دیں۔ کہاں وہ وقت کہ دلی کی عورت کو مسلم لیگ کا رکن بنانا محال تھا اور کہاں ۱۹۴۷ء کہ ہزاروں کا اجتماع تشکیل پاکستان کے بعد انھی خواتین نے پاکستان کا انڈسٹریز اور کل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (اپوا) کی تشکیل کی یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہر صوبہ کی زنانہ مسلم لیگ کی نگرانی میں یہی سطح تک جو کام ہوا وہ قابل فخر تھا۔ بلا شعبہ کسی بھی صوبے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی دوسرے صوبے سے پیچھے تھا البتہ ہر علاقے کے مسائل مختلف تھے اور مقامی خواتین کو ہی ان کا بہتر علم تھا۔

مسلم لیگ کی زنانہ مرکزی کمیٹی نے بعدازاں زنانہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تشکیل بھی کی پنجاب میں ۱۹۴۰ء کے بعد تو اسے بہت مضبوط کر دیا گیا۔ اس کی صدر رفعت بشیر تھیں علاوہ ازیں ایک ویمن نیشنل گارڈ بھی بنائی گئی۔

سندھ میں بیگم صغریٰ ہدایت اللہ، لیڈی ہارون، مسز شعبان طیب جی اور دیگر خواتین نے مسلم لیگ کی خدمت اس انداز میں کی کہ اسے فراموش کرنا شدید ناانصافی ہوگا سندھ میں بھی

ابتداً صوبہ دلی کی طرح خواتین میں شعور کا فقدان تھا۔ اور وہاں شاخوں کے اجزاء کا نام محال تھا۔ اگرچہ سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی کے سبب ملک میں بہت سیاسی ردوبدل ہوا۔ مگر قدامت پرستی کی وجہ سے خواتین کی فکر میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ وہ حسب معمول گھروں کی چار دیواریوں میں محبوس رہیں لیڈی ہارون اگرچہ ایران نژاد تھیں لیکن کراچی میں رہنے والے سندھی میمن خاندانوں پر ان کا بہت اثر تھا۔ سیٹھ عبداللہ ہارون خود میمن اور اپنی برادری میں بے حد مقبول تھے ادھر غلام حسین ہدایت اللہ خالص سندھی ہونے کے باعث بہت اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ لہذا سندھ کی سیاست میں ان دو خاندانوں کے مردوں اور خواتین نے تاریخی اور اہم کردار ادا کیا۔ ہارون خاندان کے نوجوان یوسف ہارون محمود ہارون اور سعید ہارون اور چند لڑکیاں خصوصاً بیگم دولت ہدایت اللہ بھی مسلم لیگ کے لیے بے پناہ جدوجہد میں مصروف رہے۔ مسز یوسف ہارون گرلز نیشنل گارڈ کی انچارج تھیں۔

سرحد میں بیگم الہ بخش، بیگم حکیم جان، بیگم شریف حسین، بیگم فتح محمد، بیگم نشتر اور بیگم اورنگ زیب کے علاوہ بیگم ممتاز جمال، بیگم شیریں وہاب، بیگم نذیر حیدر، اور بیگم زری سرفراز سرگرم عمل رہیں۔ سردار عبدالرب نشتر (مرحوم) کی بھی زبردست خواہش تھی کہ زنانہ شعبہ مضبوط تر ہو جائے اتنے قدامت پسند صوبے کی خواتین کو جب ان راہنماؤں نے بیدار کیا تو انھوں نے کانگرسی وزارت کی دھجیاں اُڑا دیں۔ وائسرائے کو ملاقات پر مجبور کر دیا۔ اور ریل کی پٹریوں پر لیٹ گئیں۔ یہ مسلم لیگ کی پہلی صدر بیگم میر احمد فنانشل کمشنر کی اہلیہ تھیں۔

مسلم لیگ کے زنانہ شعبہ کے قیام اور اس کے بعد خواتین کی مسلسل تگ و دو نے ہندوستان کی مسلم خواتین میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور اپنی قومی تنظیم سے خواتین کی شیفتگی انتہا کو پہنچ گئی۔

ہر سال کسی ایک صوبے میں کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوتا۔ جیسا کہ ۱۹۴۰ء میں شہر لاہور کو یہ شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۴۱ء ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں علی ترتیب مدراس، الہ آباد اور کراچی کو یہ اعزاز ملا۔ اس کے بعد اس قدر گہما گہمی پیدا ہو گئی کہ اجلاس منعقد کرنے کی بجائے ہر صوبہ خود ہی مرکز عمل بن گیا۔ ہر ضلع میں شاخیں قائم ہو گئیں۔ اور ہر تحصیل میں مسلم لیگ ہی مسلم لیگ نظر آنے لگی۔

مارچ ۱۹۴۰ء سے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور بڑا ہنگامہ خیز تھا اس دوران مسلم خواتین ہند کی کارکردگی اور اس کے مثبت نتائج کسی معجزہ سے ہرگز کم نہیں۔ یعنی قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ۱۹۴۷ء تک کا ساڑھے چھ سالہ دور مردوں کے دوش بدوش [illegible]وں کی مسلسل قربانیوں کا دور تھا۔ اگر اسے مبالغہ آمیزی نہ کہا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ

فسادات بہار سے ۱۹۴۷ء تک تشکیل پاکستان کے لیے خواتین کی قربانیاں مردوں سے کہیں زیادہ ہیں صرف ۹۰ ہزار مسلم خواتین نے نومبر ۱۹۴۷ء میں اپنی عصمتوں کی قربانیاں دیں۔ شہادت پانے والی خواتین کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اسی طرح فسادات بہار کے دوران ہزاروں عورتوں نے جان کی قربانیاں دے کر اس پودے کو پہنچا۔ بلا شبہ قائد اعظم کے ساتھ بی اماں، محترمہ فاطمہ جناح اور بعض دیگر رہنماؤں کی قیادت نے برصغیر کی مسلم خواتین میں نہ صرف جوش اور ولولہ پیدا کیا بلکہ انھیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لڑی میں بھی پرو دیا۔ اگر ہندوستان کی خواتین تحریک آزادی میں دل و جان سے شریک نہ ہوتیں تو جدوجہد پاکستان میں ہماری کامیابی بہت حد تک مشکل تھی خواتین کی جدوجہد نے بعض مراحل کو آسان بنا دیا اور حکومت وقت کے ساتھ ہندوؤں کے سامنے بھی ایک سیسہ پلائی دیوار بن گئیں۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات سول نافرمانی مہاجرین کی آمد، فسادات بہار مغویہ خواتین کی بازیابی لاوارث عورتوں اور بچوں کی آبادکاری وغیرہ ایسے اہم مسائل تھے جو قبل از تشکیل پاکستان تنہا مردوں کے بس کا روگ نہیں تھے نہ بعد از قیام پاکستان تنہا حکومت کے۔

تحریک پاکستان اور خواتین

الفت وطن کا صحیفہ اُس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا جب تک پُرجوش اور اولالعزم مسلمان خواتین کے قلوب میں ملی جذبوں کے سلگتے ہوئے الاؤ اور موجزن و بیکراں اخوت قومی کے سمندر کا تذکرہ شامل نہ کیا جائے۔ ہماری تاریخ حریت شاہد ہے کہ ہماری سرفروش خواتین نے زمانہ جنگ اور حالت امن میں مردوں کے دوش بدوش قابل فخر کارنامے انجام دیئے۔ حضرت خولہ فاطمہ بنت عبداللہ (طرابلس)، رضیہ سلطانہ۔ چاند بی بی گلبدن بیگم۔ جہاں آرا۔ روشن آرا بی اماں (علی برادران کی والدہ) بیگم محمد علی۔ مادر ملت۔ بیگم رعنا لیاقت، بیگم گیتی آرا ہمایوں۔ بیگم شاہنواز۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین لیلیٰ خالد، زہرقا وغیرہ ہماری ملی تاریخ کی آبرو ہیں۔

تحریک پاکستان کی عظیم جدوجہد سے قبل بی اماں وہ پہلی باہمت خاتون تھیں جنہیں ملکی سیاست میں سب سے پہلے قدم انداز ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔

ایک شمع کیا جلی ہر سو چراغاں ہو گیا۔

دوسرے اساطیر اولین بھی اس کا محرک بنیں۔ قومی سیاست میں عزم و حوصلوں کے کنول کھلنے لگے۔ دوسری اہم خاتون جو میدان سیاست میں آئیں۔ وہ بیگم محمد علی تھیں۔ جن کی خدمات

قومی ہماری تحریک کا عظیم سرمایہ ہیں۔

مسلم خواتین نے ہمیشہ ایک باشعور اور حساس طبقہ ہونے کے ناطے عصری تقاضوں کا ادراک کیا۔ تعلیمی استعداد اور تہذیبی نشیب و فراز سے بہرہ مند ہونیکی وجہ سے فکری انقلاب برپا کیا بیگم محمد علی صدر کل ہند خواتین مسلم لیگ کسی تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل نہ تھیں۔ لیکن آپ کے قلب حساس میں ملی حمیت قومی جذبوں کی صداقت بے پناہ تھی آپ باپردہ خاتون تھیں اور کل ہند مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں بھی برقعہ پہن کر شرکت کرتی تھیں۔ آپ کی تقریر یہ عام فہم اور روز مرہ کی عکاس ہوتی تھی۔ آپ نے برصغیر میں مسلم خواتین کو منظم کرنے کی باوصف خدمات انجام دیں خواتین کے شانہ بشانہ طالبات کی تنظیم مسلم گرلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو بھی ترتیب دیا۔

حضرت قائداعظم نے ۱۹۳۸ء میں کل ہند خواتین مسلم لیگ اور مسلم طالبات فیڈریشن کی طرح ڈال کر دیرینہ قومی ضرورت کو پورا کیا حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "طلب علم علی کل مسلمون مسلماً" کے تحت مسلم خواتین اور طالبات کو علوم دینی و دنیوی سے آراستہ ہونے کا شعور بیدار کیا۔ ایک خاتون کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ایک معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانے کے مترادف ہے۔

تحریک پاکستان جب ۱۹۴۰ء میں فیصلہ کن دور میں داخل ہوئی۔ بیگم محمد علی اور مادر ملت نے اس وقت اتحاد اور تنظیم سے متعلق گراں مایہ خدمات انجام دیں انھیں مسلمانان برصغیر کی محبوب جماعت مسلم لیگ کے سبز ہلالی پرچم تلے متحد کیا۔ قرار داد لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پہلی بار بیگم محمد علی نے اپنی تائیدی تقریر میں "قرار داد پاکستان" کا تاریخی نام دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس ہی نام سے موسوم ہو گئی۔ ویسے بھی اگر ہم اپنی معاشرتی زندگی کا منصفانہ جائزہ لیں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ مستورات میں اسلامی اقدار کی فراوانی اور سرشاری کے جذبات متجاوز ہیں۔

کل ہند مسلم لیگ کونسل کے اجلاس ۹ جون ۱۹۴۷ء کو جب خاکساروں نے امپیریل ہوٹل نئی دہلی پر یلغار کی اس وقت مادر ملت شمشیر برہنہ لیے حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے تحفظ کے لیے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔

گورنر سیکرٹریٹ پر ہلالی پرچم باحوصلہ جرأت ہند مسلم خواتین نے برستی گولیوں اور سخت پہرے میں گورنر کے دفتر پر یونین لیگ کے بجائے مسلم لیگ کا ہلالی پرچم لہرا کر عظیم کارنامہ انجام دیا۔

قید تنہائی اور مشقت تحریک حریت ۱۹۴۷ء کی پاداش میں مسلمان خواتین اور طالبات کو نصر گم کردہ راہ کی انتظامیہ نے ایذائیں پہنچائیں مشقت لی اور قید تنہائی کی اذیت ناک سزائیں دیں۔

مہاجرین کی خدمت قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کے بہیمانہ اور سفاکانہ مظالم کے نتیجے میں آنے والے زخم خوردہ اور ستم رسیدہ مہاجرین کی تیمار داری اور خدمت کے اہم ملی فرائض ہماری پرجوش بہنوں نے رضاکارانہ طور پر انجام دیئے۔ بعد ازاں خواتین نے اپنی فلاحی سماجی اور معاشرتی انجمنیں قائم کر لیں قائداعظم نے خواتین کو پیغام دیا۔

کہ خواتین بھی مسلمان ثابت ہوں اپنا نسوانی وقار قائم رکھیں۔ غیر قوموں کی تقلید نہ کریں۔ مشرقی روایات کو ہر صورت میں زندہ رکھیں کبھی اپنا تہذیبی توازن زائل نہ ہونے دیں۔ یہی تہذیبی توازن ہے جسے اسلام اعتدال کی راہ قرار دیتا ہے۔

پاکستان کا پہلا نقشہ بابائے قوم کو مجوزہ پاکستان کا قیام پاکستان سے قبل سوزن کاری سے کپڑے پر تیار کردہ رنگین نقشہ روہیل کھنڈ یو پی ایک گیارہ سالہ باپردہ لڑکی نے تیار کیا تھا جسے لینے کے لیے لڑکی کی خواہش پر قائداعظم دور اُفتادہ دیہات میں اس کے گھر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں وائسرائے لنلتھگو یہ نقشہ دیکھ کر پاکستان کے تصور سے بڑا متحیر ہوا۔

ممبران سب کمیٹی کل ہند خواتین مسلم لیگ

آسام۔ بیگم عبدالتین چوہدری۔ بہار۔ بیگم اختر۔ بلوچستان۔ بیگم قاضی عیسیٰ۔
پنجاب۔ بیگم بشیر احمد۔ بیگم عبدالعزیز۔ فاطمہ بیگم۔ بیگم تصدق حسین۔ بیگم رحمن
بمبئی۔ فاطمہ جناح۔ بیگم حفیظ الدین۔ بیگم جیراز بھائی۔ بیگم محمد حسین۔ بیگم سومجی۔
بنگال۔ بیگم شہاب الدین۔ بیگم اصفہانی۔ بیگم حکم۔
یو پی۔ بیگم حبیب اللہ بیگم محمد علی۔ بیگم محمد وسیم۔ بیگم اختر خاں راسیہ خاتون
سی پی۔ بیگم صدیق علی خاں۔ بیگم افتخار علی۔ سیم الزہرہ بیگم
سندھ۔ بیگم ہارون۔ بیگم النور ہدایت اللہ۔ بیگم الانا

دہلی ۔ بیگم حسین ملک ۔انجمن آرا بیگم ۔ بیگم محمد حسین بیگم اکرام اللہ بیگم زاہد حسین ۔ بیگم بخاری
صوبہ سرحد ۔ بیگم وہاب ۔ بیگم کمال الدین ۔
مدراس ۔ بیگم کریم اصفہانی ۔ بیگم ملنگ احمد پاشا ۔ بیگم حمید خان اور بیگم شاہنواز بیگم رضا اللہ بیگ
یو پی ۔ بیگم رعنا لیاقت ۔ بیگم اعزاز رسول اور بہت سی خواتین ۔
آئیے اب مذکورہ خواتین میں سے چند کے بارے میں کچھ تفصیل مطالعہ کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے حوالے سے تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار مزید واضح ہو جائے ۔

۱۔ بی اماں

جدوجہد پاکستان میں جو پہلی خاتون منظر عام پر آئیں وہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ ماجدہ تھیں ۔ برصغیر کے مسلمان اس خاتون کو ۔ بی اماں کے لقب سے جانتے ہیں ۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی میں جو بے باکی ۔ نڈر پن اور جرأت پائی جاتی تھی وہ بی اماں کی تربیت ہی کا ثمر تھا ۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت اس نہج پر کی تھی کہ وہ بلا خوف وخطر برصغیر کی آزادی کے لیے انگریز حکومت سے ٹکرا گئے ۔ یہ بی اماں ہی کی ذات گرامی تھی جنھوں نے نہ صرف اپنے بیٹوں بلکہ پوری ملت کے بیٹوں کے سینوں میں آزادی اور اسلام کی بقا کے لیے نہ ختم ہونے والا جذبہ پیدا کر دیا ۔ بی اماں نے قدم بہ قدم علی برادران کی رہنمائی و مشاورت کی خصوصاً تحریک خلافت کے دوران نہ صرف انھوں نے حوصلہ مندی کا درس دیا بلکہ خود بھی میدان عمل میں بھرپور حصہ لیا ۔ بی اماں کے اس عمل قدم نے مسلمان نوجوانوں کو تحریک خلافت میں حصہ لینے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے آمادہ کیا ۔ یہاں تک کہ ہر مسلمان نوجوان اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے پیش پیش تھا ۔ ہر نوجوان کی زبان پر ایک ہی شعر تھا ۔

بولی اماں یہ محمد علی کی
جان خلافت پہ دے دو

بی اماں نے اپنے کردار جرأت اور مستحکم ارادے سے مسلمان خواتین کے لیے ایک روشن مثال قائم کی ۔ انھوں نے مسلم عوام کے دلوں سے انگریز حکومت کا خوف ختم کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی ۔ یہ ان ہی کی پکار تھی کہ مسلمان جوق در جوق خلافت کانفرنس کے جلسوں جلوسوں اور دیگر پروگراموں میں شرکت کرنے لگے ۔

بی اماں نے اپنی بہو بیگم محمد علی جوہر کے ساتھ برصغیر کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے مسلم خواتین میں آزادی کی تڑپ، جوش اور روح پیدا کر دی۔ انھوں نے اُس وقت آزادی کا علم بلند کیا جب اُن کے دونوں بیٹے جیل کی چار دیواری میں بند تھے۔ ان حالات میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف تحریک کو برقرار رکھ کر مسلم خواتین کے لیے ایک مثال قائم کی۔ یہ اُن ہی کا بتایا ہوا رستہ تھا جس پر مسلم خواتین نے چل کر آزادی کی منزل کو پانے کے لیے، مسلم عوام کا بھرپور ساتھ دیا۔

۲۔ بیگم نصرت عبداللہ ہارون

جدوجہد پاکستان میں بیگم نصرت عبداللہ ہارون نے مسلمان خواتین کو سیاسی طور پر منظم کرنے کے لیے ایک یادگار کردار ادا کیا سندھ میں جن خواتین نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کے ہاتھ مضبوط کیے۔ اُن میں بیگم عبداللہ ہارون بھی شامل ہیں۔ بیگم عبداللہ ہارون آل انڈیا مسلم لیگ (شعبہ خواتین) کی صدر بھی رہی۔ انھوں نے عملی اور مالی دونوں طرح سے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ آپ کی قائم کردہ "نصرت کلب دہلی" برصغیر کی مسلمان خواتین کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ آپ نے برصغیر کے مختلف علاقوں کے دورے کر کے خواتین کو اُن کے ملی حقوق و فرائض سے آگاہ کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

آپ نے بیگم محمد علی جوہر کی ہم رکابی میں "مسلم گرلز سٹوڈنٹس فیڈریشن" اور "مسلم ویمن نیشنل گارڈ" کی تشکیل میں نمایاں خدمات سرانجام دی۔ سندھ میں قائم ہونے والی "مسلم ویمن کمیٹی" کی سربراہ بھی آپ ہی تھی۔ اس کمیٹی نے تعبیر پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں ہوا۔ اس دوران کراچی کی خواتین نے بیگم ہارون کی قیادت میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔

۳۔ بیگم اقبال حسین ملک

بیگم اقبال کے والد پاکستان کے نامور ماہر مالیات غلام محمد تھے جو پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ مقرر ہوئے اور بعد ازاں گورنر جنرل کے منصب پر بھی فائز رہے۔ بیگم اقبال ملک دسمبر ۱۹۱۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے لاہور کالج فار ویمن سے بی۔ اے کیا۔ کالج میں وہ کھیلوں اور خدمت خلق کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں ان کی شادی

حسین ملک سے ہوئی جو دہلی میں مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ شادی کے فوری بعد وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئیں اور قیام پاکستان تک مسلم لیگ میں بڑے جذبہ و جوش سے کام کرتی رہیں۔ انھوں نے تحریک پاکستان کے لیے مسلسل کام کیا ان کے شب و روز مسلم لیگ کے لیے وقف تھے۔ ان کا شمار تحریک پاکستان کے ممتاز کارکنوں میں ہوتا ہے۔ ایسے کارکن جن کے کارنامے غیر فانی ہیں۔ دہلی ہندوستان کا صدر مقام اور سیاسی مرکز تھا۔ مسلمان اقلیت میں تھے۔ ان میں بھی مسلمانوں کی خاص تعداد مسلم لیگ سے اختلاف رکھتی تھی۔ مسلم خواتین تو سیاسیات کے نام سے گھبراتی تھیں۔ زیادہ تر تعلیم یافتہ مسلمان خواتین سرکاری افسروں کی بیویاں تھیں۔ ان کے لیے سیاست شجر ممنوعہ تھیں۔ افسران کی بیگمات میں سے صرف بیگم اکرام اللہ، بیگم قیصرہ انور علی اور بیگم احمد شاہ بخاری نے تحریک پاکستان کے لیے کام کیا۔ دہلی میں مسلم لیگ کا کام بڑا دشوار تھا۔ بیگم حسین ملک نے اپنی شبانہ روز مساعی سے اس منزل ہفت خواں کو سر کیا اور دہلی کی خواتین نے ان کی قیادت میں تحریک پاکستان میں بیش بہا کارنامے سرانجام دیے۔ بیگم حسین ملک نے ۱۹۳۷ء میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ وہ پہلی بار مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لکھنؤ ۱۹۳۷ء میں شریک ہوئیں۔ بعد ازاں آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۳۸ء میں مرکزی خواتین کمیٹی کی تشکیل کی تو انھیں مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ وہ اس کمیٹی کی سب سے کم عمر رکن تھیں مگر انھوں نے اپنے خلوص و جذبہ سے اراکین کمیٹی کو متاثر کیا۔ خواتین سب کمیٹی کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو بیگم مولانا محمد علی جوہر کو صدر، بیگم اعزاز رسول کو سیکرٹری اور بیگم اقبال حسین کو جائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ دہلی میں خواتین مسلم لیگ کی تشکیل کی گئی۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر صدر اور بیگم اقبال سیکرٹری چنی گئیں۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں مسلم لیگ کا تعارف خواتین سے ہو گیا تو انھوں نے اپنی جگہ خالی کر دی۔ کچھ عرصہ بیگم رضا اللہ صدر رہیں۔ پھر یہ ذمہ داری بیگم اقبال کے سپرد ہوئی۔ وہ دہلی خواتین مسلم لیگ کی صدر منتخب ہوئیں تو ان کی عمر اکیس سال تھی۔ قدرت نے انھیں قیادت کی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے نو عمری کے باوجود حسن و خوبی سے قیادت کے فرائض سرانجام دیے اور دہلی خواتین مسلم لیگ کو ایک ناقابل تسخیر قوت بنا دیا۔ بیگم اقبال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ کارکن بھی ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کو اپنے ہاتھ سے کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ انھوں نے خواتین مسلم لیگ کی تنظیم میں جو اہم کردار ادا کیا اس کے اعتراف میں انھیں ۱۹۴۱ء میں دوبارہ اور ۱۹۴۳ء میں تیسری بار مرکزی خواتین مسلم لیگ کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔

بیگم اقبال، ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے یادگار اجلاس لاہور میں شریک ہوئیں۔ اس اجلاس میں

مسلم لیگ نے پاکستان کی انقلاب آفرین قرارداد منظور کی تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی منزل متعین ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ انھوں نے دہلی کے مختلف محلوں میں خواتین مسلم لیگ کی تنظیم کا آغاز کیا۔ پاکستان کا پیغام دہلی میں ایک ایک محلہ تک پہنچایا۔ وہ جلسوں کا انتظام کرتیں اور خاتون پاکستان محترمہ فاطمہ جناح سے صدارت کی درخواست کرتیں۔ اس طرح مسلم لیگ کا پیام عورتوں میں پھیلتا چلا گیا۔ دہلی شہر میں مسلم لیگ کی کمیٹیاں قائم ہو گئیں تو بیگم اقبال حسین ملک نے دہلی کے ارد گرد دیہات میں کام کرنے کا عزم کیا۔ بیگم حسین ملک اور ان کی ساتھی خواتین دوائیں اور صابن لے جاتیں۔ نادار خواتین کو دوائیں اور سامان تقسیم کرتیں اور ان کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتیں ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے اینگلو عربک کالج میں دہلی خواتین مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان اجلاس سے خطاب کیا۔ قائد نے اردو میں تقریر کی۔ بیگم اقبال نے قائداعظم کا شکریہ ادا کیا۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں گڑھ مکتیشر (یو۔ پی) میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ سینکڑوں مسلمان شہید ہوئے ہزاروں عورتیں اور مرد زخمی تھے۔ گڑھ مکتیشر میں بڑی خوف و ہراس کی فضا تھی۔ دہلی کی مسلم لیگی خواتین نے بیگم اقبال حسین ملک کی قیادت میں زخمیوں کی امداد کے لیے اس فساد زدہ علاقہ کا رخ کیا۔ اس وفد میں بیگم احمد شاہ بخاری، بیگم نسیم حسین اور نور الصباح بیگم تھیں۔ گاڑی پر مسلم لیگ کا سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ ہندو پولیس نے گاڑی کی تلاشی بھی لی۔ اس وفد نے علاقہ بھر کا دورہ کیا اور لرزہ خیز واقعات کا مشاہدہ کیا۔ ہندوؤں نے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی تھی۔ وفد نے رپورٹ مرتب کر کے مسلم لیگ کو پیش کی۔ اس رپورٹ کے مطابق اردو پارک دہلی میں کیمپ قائم کیا گیا۔ کیمپ میں گڑھ مکتیشر کے زخمی مرد اور خواتین تھیں۔ بھرت پور میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر ستم توڑے تو انھوں نے بھی دہلی کا رخ کیا اور اس کیمپ میں پناہ لی۔ بیگم حسین ملک اور دہلی کو مسلم لیگی خواتین نے کیمپ میں مظلوم عورتوں کی بڑی مدد کی۔ وہ زخمی عورتوں کی مرہم پٹی کرتیں۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتیں۔ ان کے دکھوں کا درمیان کرتیں۔

دہلی میں خواتین مسلم لیگ نے تعمیری پروگرام مرتب کر کے اس پر بھی عمل درآمد کیا خواتین کے لیے انڈسٹریل ہوم قائم کیا گیا تاکہ لڑکیاں فنی تربیت حاصل کر سکیں۔ بیگم حسین ملک اس مرکز میں لڑکیوں کو سویٹر بننا سکھایا کرتی تھیں۔

جون ۱۹۴۷ء میں اعلان ہوا کہ برصغیر ہندوستان میں دو آزاد ریاستیں پاکستان اور بھارت معرض وجود میں آئیں گی۔ کاروان ملت عروس کامرانی سے ہمکنار ہوا۔ دہلی کی خواتین نے

قائداعظم کو ہدیہ تبرک پیش کرنے کے لیے جلوس کی صورت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ خون کی انگارں بھری دو بہر میں بیس ہزار خواتین قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس جلوس کی قیادت بیگم اقبال حسین ملک کر رہی تھیں۔ قائداعظم خواتین کے جوش و خروش سے بے حد متأثر ہوئے۔

بیگم اقبال ملک کو قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت بارہا حاصل ہوئی۔ قائداعظم ان کے خلوص، ایثار اور مسلسل جدوجہد سے بے حد خوش ہوئے۔ شملہ اور دہلی میں انھیں قائداعظم کے افکار سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۶ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا تاریخ ساز کنونشن ہوا۔ انھی دنوں بیگم اقبال ملک نے قائداعظم کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ اس عصرانہ میں مسلم لیگ کے جلیل القدر اکابر مدعو تھے۔ پاکستان قائم ہوا تو بیگم اقبال ملک کی کوٹھی پر حملہ ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں انھوں نے کراچی کا رخ کیا۔ کراچی میں انھوں نے سماجی سرگرمیوں کی جانب توجہ دی۔ اپوا کی تشکیل ہوئی تو وہ جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئیں۔ انھوں نے اپوا کی شاخیں قائم کرنے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا کراچی میں ہوم اکنامکس کالج کے اجرا میں ان کا بڑا دخل تھا اور اس کالج کی صدر بھی رہیں۔ وہ ٹی۔ بی ایسوسی ایشن کی صدر بھی رہیں۔ انھوں نے مختلف اجتماعات میں پاکستان کی مؤثر نمائندگی بیگم اقبال ملک کا شمار تحریک پاکستان کے ان کارکنوں میں ہوتا ہے جنھوں نے کسی ستائش و صلہ کے لیے کام نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محض خلوص و ایثار سے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا اور ان کے کارنامے ملک کی متاع فخر و ناز ہیں۔ بیگم اقبال حسین آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

۴۔ بیگم جہاں آرا شاہنواز

بیگم شاہنواز کا تعلق لاہور کے ایک مقتدر الرائی خاندان سے ہے۔ اس خاندان نے قومی اور ملی دائرہ میں کئی چراغ فروزاں کیے جن کی روشنی میں کاروان ملت سرگرم سفر ہوا۔ جہاں آرا کے والد میاں سر محمد شفیع مسلمانوں کے مقتدر رہنما تھے۔ حکومت کے حامی ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔

بیگم شاہنواز اور ان کا خاندان ابتدا سے مسلم لیگ سے وابستہ تھا۔ مسلم لیگ کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور سر سکندر حیات مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو وہ بھی مسلم لیگ میں سرگرم عمل ہوئیں ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی خواتین کمیٹی کی رکن مقرر ہوئیں۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا تو وہ بھی اجلاس میں شریک تھیں۔ مسلم لیگ کونسل کا رکن ہونے کی حیثیت سے

انھوں نے قرارداد پاکستان کی پرزور حمایت کی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں خواتین مسلم لیگ کا اجلاس بیگم مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بیگم شاہنواز نے اس اجلاس سے خطاب کیا۔ ۱۹۴۱ء میں خواتین مسلم لیگ کی کمیٹی کی دوبارہ تشکیل کی گئی تو انھیں مسلم لیگ کی خواتین کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت ہند نے انھیں نیشنل ڈیفنس کونسل کا رکن نامزد کیا۔ مسلم لیگ نے نیشنل ڈیفنس کونسل کے تمام اراکین پر زور دیا کہ وہ نیشنل ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ سر سکندر حیات نے استعفیٰ دے دیا۔ بیگم شاہنواز نے مسلم لیگ کی اس ہدایت کی تعمیل نہ کی جس پر انھیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ اس اثنا میں انھیں مرکزی محکمہ اطلاعات کا جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ سیاسی حالات تیزی سے بدلتے رہے۔ ہندوستان آزادی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ نئے آئینی نقشے میں مسلمانوں کے حقوق کا سوال تھا۔ قائداعظم کی قیادت میں کاروان ملت سرگرم عمل تھا۔ بیگم شاہنواز نے محسوس کیا کہ فرض انھیں پکار رہا ہے انھیں احساس ہوا کہ ان کا مقام یونینسٹ پارٹی میں نہیں بلکہ مسلم لیگ میں ہے۔ انھوں نے قائد کو خط لکھا اور انھیں مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہوئیں اور اب ان کے شب و روز مسلم لیگ کے لیے وقف تھے۔ انھوں نے مختلف اضلاع کا دورہ کیا خواتین کو خطاب کیا اور اپنی آتش بیانی سے خواتین کے دلوں کو گرمایا۔ ۱۹۴۶ء میں صوبائی انتخابات میں انھوں نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں دہلی میں قائداعظم نے ہندوستان کی اسمبلیوں کے مسلم لیگی اراکین کا شاندار کنونشن منعقد کیا۔ یہ کنونشن تاریخ پاکستان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑا ہی شاندار اجتماع تھا۔ جذبہ و جوش کا سیل رواں تھا۔ اس کنونشن میں خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے بیگم شاہنواز نے بڑی پرجوش تقریر کی اور اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا کہ خواتین تحریک پاکستان میں بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی۔ انھوں نے لدھیانہ میں محمد صدیق شہید کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مائیں تحریک پاکستان کے لیے اپنے جگر گوشوں کو پیش کر رہی ہیں۔ بیگم شاہنواز کی اس دلآویز تقریر کا خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے ایک اہم مشن آپ کے سپرد کیا قائداعظم نے امریکہ میں تحریک پاکستان کی نشر و اشاعت کے لیے ایک وفد کا انتخاب کیا امریکہ میں کانگرس کا پروپیگنڈہ جاری تھا۔ امریکہ کو عالمی سیاسیات میں اہم مقام حاصل تھا۔ امریکی عوام کو تحریک پاکستان سے آگاہ کرنے کی ضرورت تھی۔ قائداعظم نے اس وفد کے لیے بیگم شاہنواز اور مرزا ابوالحسن اصفہانی کو منتخب کیا۔ اس وفد نے امریکہ کا دورہ کیا۔ مختلف شہروں میں اجتماعات سے خطاب کیا۔ اخبارات میں مضامین لکھے۔ امریکی حکومت کے نمائندوں سے ملاقات کی مجلس

اقوام متحدہ میں مختلف ممالک کے نمائندوں کو مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ وفد کا دورہ بڑا کامیاب رہا اور امریکی عوام پہلی بار مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے واقف ہوئے۔ اس دورہ میں بیگم شاہنواز کی تحریر و تقریر نے امریکی دانشوروں کو بڑا متأثر کیا۔ وہ دورہ مکمل کر کے ۲۴ دسمبر کو لاہور پہنچیں اور ملی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئیں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو سول نافرمانی کے سلسلہ میں قید ہوئیں۔ تین دن بعد حکومت پنجاب نے مسلم لیگی لیڈروں کو رہا کیا۔ رہائی کے بعد ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔ آپ نے تحریک سول نافرمانی کو کامیاب کرنے کے لیے جلوسوں کی قیادت کی خواتین ان جلوسوں میں جذبہ و جوش سے شامل ہوئیں۔ بیگم شاہنواز نے تحریک پاکستان کے گہوارہ اسلامیہ کالج لاہور میں طلبہ سے خطاب کیا۔ جلسہ کے بعد جلوس نکالا گیا۔ جلوس موچی گیٹ سے ہوتا ہوا سول سیکرٹریٹ پہنچا۔ مردوں اور خواتین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ پولیس نے لاٹھیوں سے تواضع کی مگر انھوں نے بڑی پرجوش تقریر کی۔ جلوس کے شرکاء کے نعرے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے اور برطانوی حکمرانوں پر لرزہ طاری تھا کہ جس قوم کی خواتین اس قدر شیر دل ہیں اب انھیں غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ جلسہ کے بعد بیگم شاہنواز اور کئی دیگر خواتین رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ نے قید و بند کے دن بڑی جرأت و ہمت سے گزارے۔ سول نافرمانی کے اختتام پر رہا ہوئیں تو ایک نیا میدان ان کا منتظر تھا۔ سرحد میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرحد کے بہادر عوام کانگرسی وزارت کے خلاف سرگرم عمل ہوئے۔ بیگم شاہنواز نے اپنی دختر ممتاز شاہنواز کے ساتھ سرحد کا دورہ کیا اور ولولہ انگیز تقاریر سے سرحد کی خواتین میں بیداری کی نئی روح پھونک دی۔ ۱۹۴۷ء میں انھیں پاکستان کی مجلس دستور ساز کا رکن منتخب کیا گیا انھوں نے مجلس دستور ساز کا رکن ہونے کی حیثیت سے بڑی مفید خدمات سرانجام دیں آزادی کے بعد وہ پنجاب اور مغربی پاکستان کی مجالس قانون ساز میں خواتین کی نمائندگی کرتی رہیں۔

صدر ایوب خان کے عہد میں وہ سماجی برائیوں کے انسداد کے کمیشن کی رکن رہیں۔ بیگم شاہنواز نے سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور کئی لاکھ کی رقم رفاہی اداروں کے لیے وقف کی۔ اس ممتاز خاتون نے ۲۷ نومبر ۱۹۷۹ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

۵ ۔ بیگم رعنا لیاقت علی

قائداعظم نے ۱۹۳۵ء میں مسلمانوں کے تحفظ و بقا کے لیے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی تو

نواب زادہ لیاقت علی خان کو مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ دور بڑا نازک تھا۔ برطانوی سامراج اور کانگرس مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے۔ مسلمان منتشر اور پریشان تھے۔ ان کی کوئی مضبوط تنظیم نہ تھی۔ مسلمان سیاست دان اپنا سیاسی مستقبل برطانوی حکومت یا کانگرس سے وابستہ سمجھتے تھے اس تیرہ و تاریک دور میں مسلم لیگ کو سنبھالنا بڑی ہمت کی بات تھی اور یہ کارنامہ ایسا شخص ہی سرانجام دے سکتا تھا جو انتہائی مخلص، ایثار پیشہ اور جاں نثار ہو۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے فرائض کو سنبھالا اور پاکستان کے قیام تک حسن و خوبی سے کام کرتے رہے۔ قائداعظم نے بھی ان کی کارکردگی کو سراہا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کو اپنی قابل اور فاضل بیوی بیگم رعنا لیاقت سے بڑی اعانت ملی۔ نواب زادہ لیاقت علی خان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہوئے تو مسلم لیگ کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ دفتری عملہ متعین کیا جاتا۔ بیگم لیاقت علی نے دفتری کام کو سنبھالا۔ وہ مسلم لیگ کے خط لکھتیں، انھیں ٹائپ کرتیں اور دفتری کام کرتیں۔ وہ کئی سال تک خاموشی سے یہ کام کرتی رہیں۔ دفتری کام باقاعدہ ہونے سے مسلم لیگ کی تنظیم نو میں بڑی مدد ملی بیگم لیاقت علی کی تعمیری زندگی کی یہ ایک جھلک ہے۔ قیام پاکستان سے قبل وہ تشہیر سے بے نیاز ہو کر قومی کام کرتی رہیں۔ ایک بلند مرتبہ خاتون ہونے کے باوجود وہ ایک کارکن کی حیثیت سے سرگرم عمل رہیں۔ لگن، جفاکشی اور مسلسل محنت ان کی سیرت کے درخشاں جوہر ہیں۔ انھی اصاف کی بنا پر انھوں نے زندگی میں بلند مقام حاصل کیا۔ ان کا شمار پاکستان کی ممتاز ترین خواتین میں ہوتا ہے وہ سفارت اور گورنری کے مناصب پر بھی سرفراز رہیں۔

بیگم لیاقت علی خان نے خواتین میں مسلم لیگ کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے بھی بڑا کام کیا وہ خواتین مسلم لیگ کے اجتماعات میں شریک ہوتیں اور انھیں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتیں۔ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل انھوں نے مسلمان خواتین کے لیے ابتدائی طبی امداد کی تربیت کا انتظام اپنی کوٹھی پر کیا۔ فسادات کے زمانے میں ان کی تربیت یافتہ خواتین نے زخمی مسلمانوں کی بڑی خدمت کی بیگم لیاقت علی خان نے سیاسی میدان میں بھی بعض کارنامے سرانجام دیے ہندوستان کے آخری وائسرائے کی بیوی لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو انھوں نے اپنے گھر پر مدعو کیا اور پچاس ساٹھ مسلم لیگی خواتین سے ملاقات کرائی۔ ہر خاتون نے اپنے انداز سے لیڈی ماؤنٹ بیٹن پر یہ ظاہر کر دیا کہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کے دل کی آواز ہے اور ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس مطالبے کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن اس ملاقات سے بے حد

متاثر ہوئیں اور ان کے دل پر یہ نقش قائم ہوگیا کہ مطالبہ پاکستان مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ بیگم لیاقت علی دہلی میں سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی رہیں، اور انھوں نے مختلف سماجی ادارے قائم کیے۔

نواب زادہ لیاقت علی خان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے ان کا دولت کدہ تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کا مرکز تھا۔ مسلم لیگ کے اجتماعات ان کے دولت کدہ پر ہوتے اور بیگم لیاقت علی خان بڑے سلیقے سے انتظامات کرتیں۔

قیام پاکستان کے موقع پر مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی اور لاکھوں مہاجر پاکستان آئے تو قائداعظم کے حکم کے مطابق نواب زادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان نے لاہور میں اپنا صدر دفتر منتقل کر لیا اور مہاجروں کے مسائل حل کرنے میں مصروف ہوگئے۔ یہ وقت پاکستان کے لیے بڑا نازک تھا۔ سرکاری نظام کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا پنجاب میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے جو ترک وطن کر چکے تھے۔ کاروبار میں بھی ہندو دخیل تھے۔ ان کے جانے سے کاروبار بند تھے۔ بارشوں نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی تھی اور ہر روز لاکھوں زخمی لٹے پٹے اور پریشان حال مہاجر پاکستان کا رخ کرتے تھے۔ ہندو کیمپوں میں زہریلی اشیا کے استعمال اور فاقوں سے ان کی صحتیں تباہ ہو چکی تھیں اور وہ آلام وامراض کا شکار تھے۔ پنجاب میں زیادہ تر ڈاکٹر ہندو تھے۔ وہ بھی رخصت ہو چکے تھے۔ اس تیرہ وتاریک دور میں امیدوں کا سہارا صرف جذبہ تھا۔ قوم جذبے سے سرشار تھی۔ اس نازک مرحلے پر طلبہ اور خواتین نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہزاروں طلبہ کیمپوں میں پھیل گئے۔ وہ مہاجروں کی مرہم پٹی کرتے ان کی خدمت کرتے۔ میٹھی باتوں سے ان کے دکھوں کا درمیان کرتے۔ پاکستان کی سرحد پر مہاجروں کا استقبال کرتے غرضیکہ ان طلبہ نے مہاجر کیمپوں کا انتظام حسن وخوبی سے کیا اور یہ خدمات وہ اعزازی طور پر کئی ماہ سرانجام دیتے رہے۔ خواتین نے بھی بیگم لیاقت علی خان کی قیادت میں مہاجرین کی بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ اس نازک مرحلے پر خواتین کارکنوں کی ضرورت تھی جو مہاجر خواتین کی دیکھ بھال کر سکیں۔ عورت کے دکھ درد کو ایک عورت ہی بہتر جان سکتی ہے مشرقی خاتون شرم وحیا کا پیکر ہوتی ہے اس کے عوارض کا مداوا ایک عورت ہی کر سکتی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت مسلمان نرسیں نہ تھیں جو مسلمان خواتین کی خدمت کرتیں۔ اس منزل ہفت خواں کو سر کرنے کے لیے بیگم لیاقت نے عزم کیا۔ وزیراعظم کے ہمراہ وہ لاہور میں مقیم تھیں۔ ان کے دو پیارے اور لاڈلے بچے اکبر لیاقت اور اشرف لیاقت کراچی میں بیمار تھے۔ مگر بیگم لیاقت نے فرض کو محبت پر ترجیح دی مہاجر خواتین کی خدمت ان کا قومی فرض تھا اور بچوں کی جانب توجہ ان کی محبت کا تقاضا تھا۔

بیگم لیاقت علی نے مہاجر خواتین کی خدمت کے لیے جو انتظامات کیے وہ ان کی تنظیمی قابلیت خلوص اور ایثار کا ثبوت تھے۔ بیگم لیاقت علی خان نے مہاجر خواتین کی خدمت کے لیے بڑا جامع پروگرام مرتب کیا۔ ایک جانب تو انھوں نے رضا کار خواتین کی مدد سے مہاجروں کی امداد کے لیے چندہ اور اشیا جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ رضا کار خواتین نے ایک ایک گھر کے دروازے پر دستک دی اور مہاجروں کے لیے سامان اور چندہ فراہم کیا۔

بیگم لیاقت علی نے خواتین کی نگرانی میں ضرورت مند عورتوں کے لیے روزگار دفتر، شادی دفتر اور برآمد شدہ مغویہ عورتوں کے لیے دفتر قائم کیا۔ ان مراکز نے عورتوں کی بیش بہا خدمات سرانجام دیں ایک بڑا مسئلہ ہندوستان میں اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کا تھا۔ پچاس ہزار سے زیادہ عورتوں کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ ان کی بازیابی کے لیے محترمہ فاطمہ بیگم شیخ صادق حسن، سید این۔ اے رضوی اور صوفی عبدالحمید نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ بیگم رعنا لیاقت علی کو بھی اس معاملہ میں بڑی دلچسپی تھی انھوں نے اغوا شدہ عورتوں کے لیے مرکز قائم کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ خواتین کی فوجی تربیت کے لیے انھوں نے پاکستان وومن نیشنل گارڈز کی بنیاد رکھی۔ اس میں کئی ہزار لڑکیوں نے فوجی تربیت حاصل کی۔

مشرقی خواتین کو گھریلو دستکاری میں بڑی مہارت ہے۔ گھریلو دستکاریاں خواتین کی آمدنی کا ذریعہ تھیں۔ ہندوستان میں بہت سے ایسے مراکز تھے جہاں عورتیں کام کرتیں۔ یہ مراکز اجڑ گئے تھے اور یہ عورتیں پاکستان میں پریشان حال تھیں۔ بیگم لیاقت علی خان نے پاکستان کاٹیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور گھریلو دستکاریوں کی تنظیم کی۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے کراچی میں رعنا لیاقت کرافٹس کالونی بھی قائم کی۔ بیگم لیاقت علی نے گھریلو مصنوعات کے نمائشی مراکز بھی قائم کیے۔ انھوں نے غیر ممالک کو بھی پاکستانی مصنوعات سے روشناس کرایا اور اس طرح گھریلو مصنوعات کی غیر ملکوں میں مانگ شروع ہو گئی۔

بیگم لیاقت علی خان نے اس بات کا شدت سے احساس کیا کہ پاکستانی خواتین کی کوئی نمائندہ جماعت ہونی چاہیے جو ملک میں خواتین کے اجتماعی مسائل پر غور کرے اور ان کو حل کرنے کی تدبیر کرے اور بیرونی ممالک میں پاکستانی خواتین کی نمائندگی کرے۔ انھوں نے ۲۲ فروری ۱۹۴۹ء کو کراچی میں اجلاس منعقد کیا جس میں پاکستان بھر سے خواتین نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں آل پاکستان وومن ایسوسی ایشن قائم کی گئی جسے "اپوا" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جلد ہی اپوا کا مختلف بین الاقوامی اداروں سے الحاق ہو گیا مختلف بین الاقوامی اجتماعات میں اپوا نے پاکستان کی

موثر نمائندگی کی اور اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔ بیگم لیاقت علی خود ماہر تعلیم تھی۔ انھوں نے اپوا کا ایک اہم مقصد تعلیم نسواں بھی قرار دیا۔ اپوا نے ملک بھر میں اپوا کے زیر اہتمام سکول اور کالج جاری کیے۔ اسی طرح تعلیم بالغاں کے مراکز اور گھریلو مصنوعات کے ادارے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی طبی امداد کی جانب بھی توجہ دی اور اس کے تحت عورتوں اور بچوں کے لیے مختلف ہسپتال اور سماجی بہبود کے ادارے بھی قائم کیے۔ دیہات میں بھی اپوا نے مراکز جاری کیے۔ غرض کہ بیگم لیاقت علی کی قیادت میں اپوا نے ہر شعبۂ زندگی میں خواتین کی خدمت کے لیے بھرپور خدمات سرانجام دی ہیں۔

بیگم لیاقت علی کو تعمیری کاموں کا بڑا ذوق و شوق تھا۔ وہ اہل نظر کی طرح نئی بستیاں آباد کرتی انھوں نے بیسیوں تعلیمی درس گاہیں قائم کیں ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا اجرا کیا۔ دستکاروں کی بستی بنائی۔ زچہ و بچہ کے مراکز کھولے۔ ان تعمیری سرگرمیوں سے بیگم لیاقت علی نے ملک میں ایک نئی روایت قائم کی۔

۷۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین

بیگم تصدق ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئیں۔ ان کا شمار چند ممتاز خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کی عمر اب ستر سال سے اوپر ہے اور وہ اب بھی خواتین کی خدمت کے لیے شب و روز سرگرم عمل ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں خواتین مسلم لیگ کی تشکیل کی گئی تو بیگم سلمیٰ بھی اس میں ایک کارکن کی حیثیت سے شامل ہو گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں پنجاب خواتین مسلم لیگ کی جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئیں اور انھوں نے محنت لگن اور کارکردگی کی بنا پر مسلم لیگ کے حلقوں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں الہ آباد میں انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا رکن چنا گیا جو ایک بڑا اعزاز تھا۔ انھوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کی جانب توجہ دی فاطمہ بیگم اور بیگم گیتی آرا کے ہمراہ پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کیا جس سے مسلمان عورتوں نے بھی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع کر دیا۔ خواتین ان کی تقاریر سے بے حد متاثر ہوئیں اور اس سے مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں ہوا جس میں مسلم لیگ کی زنانہ شاخ کی رکن خواتین بھی شامل تھیں۔ ہندوستان بھر سے خواتین نے اس میں شرکت کی۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر، بیگم نصرت عبداللہ ہارون جیسی بلند پایہ خاتون رہنما بھی اس اجلاس میں شریک تھیں۔ کراچی کے اجلاس میں بیگم سلمیٰ نے بیش از بیش حصہ لیا۔ ۱۹۴۳ء میں برطانوی حکومت کی سازش سے بنگال خوفناک قحط کا

شکار ہوا۔ ہزاروں انسان لقمۂ اجل ہو گئے۔ وہاں کے مسلمانوں کو شدید مشکلات کا سامنا ہوا پنجاب میں زنانہ مسلم لیگ کی اراکین بھی قحط زدہ عوام کے لیے سرگرم عمل ہوئیں اور ان کے لیے بے شمار چندہ اور اشیا جمع کیں اور بنگال بھجوایا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو منظم کرنے کے لیے ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کے انقلابی دور کا آغاز ہوا۔ خضر حیات اور ان کے رجعت پسند رفقاء کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ نوجوانوں اور خواتین نے بڑے جوش و خروش سے کام شروع کیا۔ ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی اور ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ان انتخابات کو پاکستان کی انتخابی جنگ کی حیثیت حاصل تھی۔ قائد اعظم نے خواتین پر زور دیا کہ وہ اس انتخابی جنگ میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیں اور تمام مسلمان خواتین اپنا ووٹ ضرور ڈالیں۔ اس سے مسلم لیگ کی خواتین اراکین کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا۔ بیگم سلمیٰ تصدق اور ان کی ساتھی خواتین نے پنجاب کے مختلف اضلاع کے دورے کیے جس سے خواتین میں جوش و خروش پیدا ہوا۔ مسلم لیگ کی جانب سے خواتین کی امیدوار بیگم سلمیٰ تصدق کا مقابلہ باجی رشیدہ لطیف سے ہوا جو یونینسٹ حکومت کی نامزد امیدوار تھی۔ الیکشن میں یونینسٹ امیدوار ہار گئیں۔ بیگم سلمیٰ نے خواتین کی تعلیمی پسماندگی پر پہلی ٹھوس تقریر اسمبلی ہال میں کی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں بھی بیگم سلمیٰ نے اس دور میں ریلیف کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بڑا کام کیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک پنجاب مسلم لیگ خواتین کی سیکرٹری رہیں۔ اس دوران میں صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی ممبر بھی رہیں۔ لاہور میونسپل کارپوریشن کی ممبر بھی رہیں۔

بیگم سلمیٰ تصدق ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں شریک ہوئیں۔ ۱۹۵۴ء میں پھر پاکستان کی نمائندگی کی۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں مختلف ممالک کا دورہ کیا جن میں برطانیہ، مغربی جرمنی، اٹلی، فرانس لبنان اور مصر وغیرہ شامل ہیں۔ بیگم سلمیٰ نے قابل ذکر قومی خدمات سرانجام دیں۔ انھوں نے شریعت بل مغربی پاکستان کی اسمبلی میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عورتوں کو رضاکارانہ کام کرنے کی ٹریننگ دی۔ وہ سینما سنسر بورڈ پنجاب کی ممبر اور اپوا کی نائب صدر رہیں۔ وہ مغربی پاکستان کی ری پبلکن کابینہ میں بھی شامل رہیں۔

بیگم سلمیٰ تصدق کو بچپن ہی سے علم و ادب سے دلچسپی رہی ہے اور انھوں نے متعدد مضامین قلم بند کیے۔ ان کی تحریروں کا انداز بیان بڑا سلیس ہے۔ سلمیٰ تصدق نے انقلاب، تعمیر، اخلاق کے نام سے کتابیں لکھیں۔ اشعار کا ایک مجموعہ ''قومی نغمہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ بیگم سلمیٰ نے انسانی ہمدردی کے جذبہ کے تحت متعدد رفاہی کام کیے۔ انھوں نے کئی مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی اور سماجی

انجمنوں میں کام کیا۔ آخر میں بیگم سلمیٰ نے ایک دینی ادارے کو اپنا مقصد بنایا جس کام آغاز وہ کر چکی ہیں یہ ادارہ خواتین پر مشتمل ہے اللہ انھیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔

۷۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ

بنگال میں سہروردی خاندان علم وفضل اور قومی خدمت کا گلستان تھا۔ سہروردی خاندان کی شہرت کا آغاز عبید اللہ نقشبندی سہروردی سے ہوا جو بنگال کے معروف عالم تھے۔ وہ مشہور تعلیمی درس گاہ "مدرسہ عالیہ" کے بانی اور پہلے پرنسپل تھے۔ سر حسان سہروردی اور عبداللہ المامون ان کے لائق فرزند تھے۔ حسان سہروردی مختلف مناصب پر فائز رہے مگر انھوں نے ہمیشہ قومی مفاد کو پیش نظر رکھا۔ وہ قائداعظم کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ عبداللہ المامون سہروردی تحریک اتحاد اسلامی کے علمبردار تھے۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ ان کا دائرہ علم وفضل بڑا وسیع تھا۔ حسین شہید سہروردی بھی اسی معدن جواہر کے گوہر شب چراغ تھے۔ شائستہ اختر سہروردی بھی اس گلشن علم کا پھول ہیں وہ سر حسان سہروردی کی صاحب زادی ہیں۔ ان کی والدہ بنگال کے مشہور ادیب نواب سید محمد آزاد کی صاحب زادی تھیں۔

بیگم اکرام اللہ بڑی جرأت مند خاتون تھیں۔ وہ کسی خطرہ کی پروا نہ کرتیں۔ انھوں نے قائداعظم اور مسلم لیگ کے مسلک کو حق پر سمجھا اور خطرات کو دعوت دیتے ہوئے مسلم لیگ کے لیے سرگرم عمل ہوئیں مس فاطمہ جناح کے ارشاد کے مطابق انھوں نے دہلی میں خواتین مسلم لیگ میں کام شروع کیا۔ دہلی کی خواتین ان کے نام سے خوب واقف تھیں۔ وہ دہلی کے مشہور رسالہ "عصمت" کی مضمون نگار تھیں۔ ان کے مضامین، افسانے اور کہانیاں ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ انھوں نے دہلی کی خواتین کے جلسے میں پہلی تقریر کی تو جلسے کو لوٹ لیا خطیبانہ انداز بیان، پُرشکوہ لہجہ، جذبات میں مدوجزر اور ٹکسالی زبان، سب خواتین داد دیتی رہیں۔ خواتین نے محسوس کیا کہ انھیں زبان مل گئی ہے۔ بیگم شائستہ کی پہلی تقریر کا دہلی میں بڑا چرچا ہوا خواتین نے انھیں دہلی میں مختلف جلسوں میں مدعو کیا اور انھوں نے اپنی تقریروں سے عورتوں میں جذبہ اور جوش پیدا کیا۔ گو ان کے خاوند سرکاری افسر تھے مگر وہ اپنی تقریر میں برطانوی حکومت کے مسلم دشمن رویہ پر تنقید کرتیں۔ بیگم اکرام اللہ کے شب و روز تحریک پاکستان کے لیے وقف تھے۔ خود بڑی جانفشانی سے مسلم لیگ کا کام کرتیں۔ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ تقریروں تک محدود نہ تھا بلکہ وہ جلسوں اور جلوسوں کا انتظام کرتیں۔ وہ خود چندہ دیتیں، چندہ فراہم کرتیں۔

غرض کہ وہ مقرر اور لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ کارکن بھی تھیں۔ لیڈر یا خطیب ہونا تو آسان ہے مگر کارکن ہونا بڑا مشکل ہے کارکن تو کسی تحریک کی بنیاد ہوتے ہیں اور اپنے خون دل سے قوم کے گلستان کی آبیاری کرتے ہیں۔ بیگم شائستہ نے ایک کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ انھوں نے اپنے ایثار کا اظہار عجیب انداز میں کیا۔ وہ دہلی میں مسلم لیگ کی سب سے ممتاز لیڈر تھیں۔ مسلم لیگ کی روح رواں تھیں مگر انھوں نے کوئی عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور محض ایک کارکن کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔

بیگم شائستہ کا یہ کارنامہ ان کے اخلاص کا آئینہ دار ہے قائداعظم اور مس فاطمہ جناح بیگم شائستہ کی مخلصانہ کارکردگی سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے بیگم شائستہ کے سپرد بہت اہم کام کیا۔ قائد کی یہ عادت تھی کہ وہ اہم قومی فرائض معتمد اور اہل کارکنوں کے سپرد کیا کرتے تھے۔ کسی تعلق یا مروت کی بنا پر کسی کو ذمہ داری نہیں دیتے تھے۔ قائداعظم کے مشورے سے راجہ محمود آباد صدر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے انھیں آل انڈیا مسلم گرلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ناظم مقرر کیا۔ اس مقصد کے لیے کمیٹی بھی تشکیل دی گئی مگر تمام ذمہ داری بیگم اکرام کی تھی۔ تحریک پاکستان میں طلبہ پیش پیش تھے۔ اب طالبات کو منظم کرنا ضروری تھا تاکہ خواتین میں پورے طور پر بیداری ہو۔ حالات ناسازگار تھے۔ مسلمان طالبات کی تعداد بہت تھی اور ان کا کسی جماعت میں کام کرنا ناقابل تصور تھا۔ بیگم اکرام خطیب، ادیب اور کارکن تو تھیں مگر اس موقع پر ان کی قائدانہ صلاحیتیں ابھریں۔ انھوں نے میر کارواں کی حیثیت سے طالبات کی تنظیم کی۔ فروری ۱۹۴۲ء میں مسلم گرلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کی پہلی کانفرنس اینگلو عربک کالج دہلی میں منعقد ہوئی تو ایک درجن مندوبین تھے، مگر وہ بددل نہ ہوئیں۔ دوسرے سال علی گڑھ میں بڑی عظیم الشان کانفرنس ہوئی اور چند سال میں ہندوستان میں مسلم طالبات کی بڑی مؤثر تنظیم وجود میں آچکی تھی اور طالبات نے تحریک پاکستان میں بڑا اہم حصہ لیا۔ پنجاب اور سرحد میں ان طالبات نے سول نافرمانی کی تحریک میں تاریخی خدمات سرانجام دیں۔

بیگم اکرام اللہ کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے قائداعظم کے دل میں ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ وہ دہلی اور شملہ میں قائد اور فاطمہ جناح کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔ اپنی گزارشات پیش کرتیں قائد ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے اور انھیں جوابات سے سرفراز کرتے۔ وہ جیسے جیسے قائد کے قریب ہوتی گئیں انھیں قائد کی عظمت کا زیادہ احساس ہوتا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں صوبائی انتخابات ہوئے تو بیگم اکرام کو بنگال لیجسلیٹو اسمبلی میں مسلمان عورتوں کی مخصوص نشست سے مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا گیا۔ وہ انتخابات میں کامیاب ہوئیں۔ اس دوران بیگم اکرام اللہ ایک آزمائش سے گزریں۔ انھیں

حکومت ہند نے پیسفک ریلیشنز کانفرنس میں اپنا مندوب نامزد کیا۔ وہ قائد سے اجازت لینے کے لیے حاضر ہوئیں یہ نامزدگی پنڈت نہرو نے کی تھی تاکہ مسلمانوں میں انتشار پیدا کر سکیں۔ قائداعظم پنڈت نہرو کی اس چال کو سمجھ چکے تھے۔ انھوں نے بیگم شائستہ کو صورت حال سے روشناس کرایا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ اس کانفرنس میں شرکت نہ کریں۔ بیگم اکرام کے خاوند بڑے سرکاری افسر تھے۔ بیگم اکرام کے انکار سے ان کی پوزیشن خراب ہونے کا اندیشہ تھا مگر انھوں نے قائد کے حکم کی تعمیل کی اور کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ پاکستان کی مجلس دستور ساز کی تشکیل ہوئی تو قائد نے بیگم اکرام کو مجلس دستور ساز کے لیے مشرقی پاکستان سے نامزد کیا وہ مجلس دستور ساز پاکستان کی رکن منتخب ہوئیں۔ پاکستان قائم ہوا تو بیگم اکرام اللہ اپنے خاوند کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئیں۔ مجلس اقوام متحدہ کے لیے اولین پاکستانی وفد میں قائداعظم نے انھیں شامل کیا مگر وہ کسی معذوری کی بنا پر شرکت نہ کر سکیں۔ پاکستان پارلیمان میں انھوں نے مختلف مسائل پر بصیرت افروز تقاریر کیں۔

بیگم اکرام اللہ نے مہاجرین کی آبادکاری میں بہت کام کیا۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ دست کاروں کی آبادکاری تھی۔ ہجرت کے بعد بنارس، دہلی، لکھنؤ، کان پور اور آگرہ کے دست کار پاکستان میں پریشان حال تھے۔ یہ دست کار اپنے فن کے ماہر تھے مگر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بیگم شائستہ نے پاکستان کے اولین بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے وزیر مالیات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی حکومت نے مہاجر دست کاروں کی آبادکاری کے لیے کمیٹی مقرر کر دی اس کمیٹی نے دست کاروں کو مالی امداد دی۔ اس طرح یہ دست کار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور اب یہ دست کاریاں پاکستان کی مفید صنعت ہیں۔ بیگم اکرام اللہ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔ لیاقت علی خان کی حکومت کے بعد سیاسی حالات پراگندہ ہو گئے تو انھوں نے پاکستان پارلیمان سے استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان میں انھوں نے تعلیمی مشاورتی بورڈ اور پاکستان ہلال احمر میں بڑا مفید کام کیا۔ ۱۹۶۴ء بیگم اکرام اللہ خان کے لیے سال غم ثابت ہوا۔ اس سال ان کے شوہر اکرام اللہ لندن میں انتقال کر گئے۔ اکرام اللہ بڑے شفیق شوہر تھے۔ جرأت و ہمت کا پیکر تھے۔ بیگم اکرام اللہ مسلم لیگ کی کارکن تھیں اور اکثر برطانوی حکومت پر تنقید کرتیں۔ اکرام اللہ مرحوم نے سرکاری افسر ہونے کے باوجود شائستہ کے کام میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ وہ اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈال کر بیگم کو قومی خدمت کا موقع دیتے رہے۔ شائستہ اور اکرام اللہ مثالی میاں بیوی تھے۔ ایسے شوہر اور رفیق حیات کا جدا ہونا کتنا بڑا صدمہ تھا۔ وہ ابھی اس صدمے سے سنبھلنے نہ پائی تھیں کہ ان کے عظیم

بھائی حسین شہید سہروردی کا بیروت میں انتقال ہو گیا حسین شہید سہروردی بیگم اکرام اللہ کے پھوپھی زاد بھائی اور سیاسی رفیق تھے۔ وہ مشرقی پاکستان میں اپنے بھائی کے سیاسی اثر سے خوب واقف تھیں اور یہ جانتی تھیں کہ شہید سہروردی کے بعد کوئی شخصیت ایسی نہیں جو مشرقی پاکستان میں تخریبی عناصر کا عوامی سطح پر جرأت سے مقابلہ کر سکے۔ بیگم اکرام اللہ پر خاوند اور بھائی کی موت کا بڑا اثر ہوا۔

۱۹۶۴ء میں حکومت پاکستان نے انھیں مراکش میں سفیر مقرر کر دیا۔ مراکش میں پاکستان کے لیے خیر سگالی کے جذبات پہلے ہی موجود تھے۔ بیگم اکرام اللہ مراکش کے صدر مقام رباط پہنچیں تو انھوں نے اپنے سفارتی کام سے مراکش کے ارباب اقتدار کو بے حد متأثر کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مراکش نے پاکستان کی بھرپور حمایت کی رباط میں عرب سربراہی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو بیگم اکرام اللہ نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں وہ تمام عرب سربراہوں اور ان کے وزراء خارجہ سے ملیں۔ ان کی مساعی سے عرب سربراہی کانفرنس میں دو قرار دادیں پاکستان کی جنگ اور کشمیر کے بارے میں منظور ہو گئیں۔ یہ بیگم اکرام اللہ کی بہت بڑی سفارتی فتح اور پاکستان کے لیے ان کا عظیم کارنامہ تھا عرب سربراہوں نے پہلی بار پاکستان کی واضح اور پرجوش حمایت کی تھی۔ اس کا سہرا بیگم اکرام کے سر ہے۔

۸ - بیگم کمال الدین

بیگم کمال الدین آل انڈیا وومن کانفرنس کی سرکردہ رہنما تھیں۔ جماعت کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھیں۔ مختلف بین الاقوامی اجتماعات میں وہ آل انڈیا وومن کانفرنس کی نمائندگی کرتیں۔ ۱۹۳۵ء میں ترکی میں عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس کا افتتاح ہوا تو بیگم کمال الدین ہندوستان کے وفد کی ایک رکن تھیں انھوں نے کانفرنس کے اجتماعات میں سرگرم حصہ لیا عورتوں کے حقوق اور آلام و مصائب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ترکی سے واپسی کے بعد بیگم کمال الدین نے اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا۔ آل انڈیا وومن کانفرنس کانگرس کے زیر اثر جماعت تھی اور کانگرس کی سرگرمیوں کی حمایت کرتی تھی۔

قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کی تجدید ہوئی اور قرار داد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد مسلمانوں نے اپنی منزل کا تعین کر لیا تو بیگم کمال الدین نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی اپنی تنظیم ضروری ہے۔ وہ وومن کانفرنس سے بلا تأمل الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئیں۔ بیگم کمال الدین کا یہ فیصلہ ان کے عزم، حوصلہ اور بلند نگاہی کا شاہد ہے۔ ان کی ذات اخلاص و ایثار سے

عبارت تھی۔ انھوں نے جس بات کو حق سمجھا، اس کو ادا کیا۔ انھوں نے ودمن کانفرنس اور کانگرس کو ملی مفاد کے خلاف سمجھا اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔ انھوں نے ودمن کانفرنس میں اپنی بلند حیثیت اور قیادت کا خیال نہ کیا اور یہ فیصلہ اس وقت کیا جب سرحد میں کانگرس کا بڑا اثر تھا اور سرحد میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی حمایت کرنا کارے دارد تھا۔ بیگم کمال الدین نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تو مسلم لیگ کے حلقوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ ایشیا کی ایک نامور اور پرجوش خاتون مسلم لیگ میں شامل ہو گئی ہیں۔ ایسی خاتون جس کے علم و فضل کا شہرہ تھا، جس کے سیاسی کارناموں سے سرحد کی فضا معمور تھی۔ جس کے اخلاص و ایثار کا ہندوستان بھر میں چرچا تھا۔ ایسی بلند پایہ خاتون کا مسلم لیگ میں شامل ہونا مسلم لیگ کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھا۔ بیگم کمال الدین نے مسلم لیگ میں رکنیت قبول کرنے کے بعد سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ شہروں اور قصبوں کا دورہ کیا۔ عورتوں کے جلسے کیے۔ انھیں نظریۂ پاکستان کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ بیگم کمال الدین کی سرگرمیوں سے پہلی بار سرحد کی غیرت مند خواتین مسلم لیگ کے پیغام سے آشنا ہوئیں سرحد کی سرزمین کا گوشہ گوشہ ان کی تگ و تاز کی جولان گاہ تھا۔ وہ اجتماعات میں تقاریر کرتیں۔ عورتوں کو گھروں پر جاکر قائداعظم کا پیغام سناتیں۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے اکابر نے بیگم کمال الدین کی سرگرمیوں کو سراہا۔ ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کی مرکزی خواتین کمیٹی کی نئی تشکیل ہوئی تو صوبہ سرحد سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے بیگم کمال الدین کو رکن چنا۔ دوسری خاتون بیگم شیریں عبدالوہاب تھیں۔

بیگم کمال الدین نے زندگی میں بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ مگر ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ تحریک پاکستان میں ان کا اہم حصہ ہے۔ قدرت اس اہم کردار کے لیے ان کی تربیت کر رہی تھی مسلسل ریاضت، جفاکشی، جانفشانی، لگن، تنظیمی قابلیت اور خطابت جیسے کمالات ان کی شخصیت میں پیدا ہو چکے تھے۔ ان کمالات اور اوصاف کے ساتھ بیگم کمال نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تحریک پاکستان کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مارچ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ٹائمز نے لکھا:

> "صوبہ سرحد میں عورتوں کو بیدار کرنے کا سہرا بیگم کمال الدین کے سر ہے جن کے داخلہ پر حکومت نے پابندی عائد کر رکھی تھی مگر وہ باوجود ان پابندیوں کے تحریک آزادی میں مصروف رہیں۔"

بیگم کمال الدین کی ان قومی خدمات کا اعتراف قائداعظم اور مسلم لیگ کے دیگر اکابر نے بھی کیا۔ قائداعظم تو ان کی قومی خدمات کے خاص سرگرمیاں نیز تر ہوئیں۔ دہلی میں بیگم کمال الدین قائداعظم

کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ قائد صوبہ سرحد کے بارے میں پریشان تھے سرحد میں کانگرس کا اثر تھا۔ قائد کا صوبہ سرحد سے تعلق اور وابستگی تھی کہ جب سرحد کے آئینی اور سیاسی حقوق کا مسئلہ آیا تو کانگرس نے لگاتار مخالفت کی کہ سرحد کو الگ صوبہ نہ بنایا جائے نہ ہی سرحد کے باشندوں کو حقوق دیے جائیں قائد نے سرحد کے باشندوں کے حقوق کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ قائد کے لیے یہ امر تعجب انگیز تھا کہ پٹھان کانگرس کے فریب کا شکار تھے اور سرحد میں کانگرس وزارت تھی۔ قائداعظم نے دہلی میں ایک ملاقات کے دوران بیگم کمال الدین سے فرمایا:

"مجھے تسلیم کہ پٹھان بہادر اور غیور ہیں مگر تعجب ہے کہ اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی کانگرس وزارت میں کیوں شامل ہیں۔ جب کہ کانگرس کے متعصبانہ رویے کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ تو پھر کانگرس وزارت میں ان کا شامل رہنا باعث حیرت ہے۔"

قائد نے جس درد و سوز سے یہ گفتگو کی تھی اس کا بیگم کمال الدین پر بے حد اثر ہوا۔ وہ قائد کی فہم و فراست کی قائل تھیں مگر قائد کی اس گفتگو سے انھیں معلوم ہوا کہ قائد میں کس قدر دردمندی ہے اور ان کے مضطرب دل میں سرحد کے مسلمانوں کے لیے خلوص و محبت کے کتنے جذبات ہیں۔ بیگم کمال الدین نے قائد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کا پیغام سرحد کے ایک ایک گھر تک پہنچاتے میں کے اشارہ پر اپنی جان تک دے دوں گی۔ وقت آپ کو بتائے گا کہ پٹھان عورتیں اور پٹھان مرد کس طرح کانگرسی وزارت کے ایوان کو ڈھاتے ہیں۔"

بیگم کمال الدین تو اہل وفا میں سے تھیں۔ ان کی زندگی وفا کی حسین اور دل کش تصویر ہے۔ خاوند سے وفا، خاندان سے وفا، قوم سے وفا اور سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفا۔ اب انھوں نے قائد سے وعدہ کیا تھا۔ اہل وفا جب کوئی عہد کرتے ہیں تو اس کی تکمیل کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ بیگم کمال الدین قائد سے وعدہ کرکے سرحد واپس آئیں تو ان کی زندگی کا رخ ہی بدل چکا تھا۔ پاکستان کے سوا کوئی اور بات ان کے دل میں نہ تھی۔

ان کے دل میں ایک نیا ولولہ اور جذبہ تھا۔ انھوں نے واپس آتے ہی سرحد میں تحریک پاکستان کے کارکنوں کو خطوط لکھے۔ یہ خط کیا تھے ان کے زخمی دل کی پکار تھی۔ ان کے کرب ناک جذبات کا اظہار تھا۔ انھوں نے ان خطوط میں تحریک پاکستان کے کارکنوں پر زور دیا کہ اب خاموش

بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ یہ نازک مرحلہ تقاضا کرتا ہے کہ پٹھان میدان عمل میں نکلیں۔ قائد اعظم کے دست و بازو بنیں تاکہ انگریز اور ہندو دونوں سے نجات حاصل کر کے آزادی جیسی بیش بہا نعمت حاصل کی جائے۔ بیگم کمال الدین کے اس مکتوب نے مضراب کے تاروں کو چھیڑ دیا اور اس سے نغمے نکلنے لگے۔ سرحد کے ان غیور اور بہادر پٹھانوں نے انھیں تحریر کیا کہ جب ایک بہن ہمیں غیرت دلا رہی ہے تو ہم پوری قوت سے کانگرس کے خلاف سرگرم عمل ہوں گے اور اس وزارت کو ختم کر کے دم لیں گے۔ ان جوابات سے بیگم کمال الدین کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا اور انھوں نے سرحد کے مختلف مقامات کا دورہ شروع کیا۔ وہ خواتین کے اجتماعات سے خطاب کرتیں۔ انھیں حقائق سے آشنا کرتیں۔ ان کے دلوں میں جذبہ و جوش پیدا کرتیں۔ کانگرس کے مسلم دشمن عزائم کو بے نقاب کرتیں۔ سرحد میں دیگر مسلم لیگی اکابرین نے بھی کام شروع کر دیا تھا اور اس طرح سرحد میں تحریک پاکستان کے لیے دور کا آغاز ہوا۔ بیگم کمال الدین کی سرگرمیوں کا دائرہ سرحد تک محدود نہ تھا۔ وہ ہزارہ مسلم لیگ کی صدر اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رکن تھیں۔ اس طرح وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہوتیں اور اپنے خیالات کا اظہار کرتیں۔ پنجاب میں ان دنوں یونینسٹ کانگرس وزارت تھی۔ پنجاب کے طلبہ، خواتین اور مرد اس قوم دشمن وزارت کے خلاف برسرپیکار تھے۔ بیگم کمال الدین نے پنجاب میں اپنی بھرپور سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ وہ بڑی بہادر خاتون تھیں۔ انھیں خطرات سے کھیلنے میں لطف آتا تھا۔ پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف انقلاب آفریں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو لاہور میں ہوا تو بیگم کمال الدین نے تحریک سول نافرمانی میں پنجاب کی خواتین کی قیادت کی اور پنجاب میں وہ اولین خاتون تھیں جو سول نافرمانی میں گرفتار ہوئیں۔ ان کی گرفتاری ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء یعنی سول نافرمانی کے پہلے روز ہوئی۔ ان کی گرفتاری کا پنجاب کی خواتین پر عجیب اثر ہوا۔ خواتین نے محسوس کیا کہ ایک خاتون سرحد سے آکر اسیر ہو رہی ہیں۔ انھیں بھی پورے طور پر میدان عمل میں نکلنا چاہیے اور اس بہادر خاتون کی تقلید کرنی چاہیے۔ پنجاب کی بہادر خواتین اور طالبات میدان میں نکلیں اور ایسی بھرپور تحریک چلائی کہ اپنے اور بیگانے ششدر رہ گئے۔ بیگم کمال الدین کی مثال سے دیگر صوبوں کی خواتین کو بھی تحریک ہوئی کہ وہ پنجاب میں اپنی بہنوں کے شانہ بشانہ اس عظیم تحریک میں حصہ لیں۔ سندھ اور دہلی جیسے خواتین کے وفود نے لاہور کا عزم کیا اور تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا۔ سول نافرمانی کی تحریک سے حکومت اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ ۲۶ جنوری ۱۹۴۷ء کو بیگم کمال الدین اور تمام دیگر لیڈروں کو رہا کر دیا۔ بیگم کمال الدین رہا ہونے کی خواہش مند نہ تھیں۔ انھوں نے رہا ہونے

سے انکار کیا مگر پولیس نے انھیں زبردستی جیل سے نکال دیا۔ رہا ہونے کے بعد بیگم کمال الدین کے جوش وخروش میں اور اضافہ ہوا۔ انھوں نے ۲۸ جنوری کو عورتوں کے ایک اجلاس سے خطاب کیا اور بڑی پرجوش تقریر کی۔ ان کی آتش نوائی سے جلسے کی فضا ہی بدل گئی۔ ہزاروں خواتین نے نعرے لگاتے ہوئے دار و رسن کی آزمائش سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔ بیگم کمال الدین محض غازی گفتار نہ تھیں وہ صاحب کردار بھی تھیں۔ عورتوں کا جلوس نکلا تو بیگم کمال پیش پیش تھیں۔ انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ چند دنوں کے بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ مگر ہر سزا کے بعد ان کے جذبہ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انھوں نے ۲۴ فروری ۱۹۴۷ء کو لاہور میں بہادر خواتین کا ایک جلوس ترتیب دیا۔ وہ خود جلوس کی قیادت کر رہی تھیں۔ جلوس کا رخ گورنمنٹ ہاؤس کی جانب تھا۔ اسمبلی کے سامنے پولیس نے جلوس کو روکنے کی کوشش کی مگر اس سیل رواں کو کون تھام سکتا تھا۔ اسمبلی کے سامنے ملکہ وکٹوریہ کا بت ہوا کرتا تھا۔ چند پرجوش خواتین نے ملکہ وکٹوریہ کے بت پر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا قدرت کی جانب سے یہ اشارہ غیبی تھا کہ اب ملکہ وکٹوریہ کے یونین جیک کے دن پورے ہو گئے اور اب ان فضاؤں میں سبز ہلالی پرچم ہی لہرائے گا۔ پولیس کی مزاحمت کے باوجود خواتین کا یہ جلوس شاہراہ قائداعظم سے ہوتا ہوا گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ جہاں مظاہرہ کرنے کے بعد جلوس نے ریڈیو سٹیشن کا رخ کیا۔ ریڈیو سٹیشن کے باہر پولیس نے بڑا تشدد کیا۔ ان سپاہیوں نے اپنی بہنوں کی تواضع لاٹھیوں سے کی اور ان پر آنسو گیس کے گولے پھینکے۔ ایک گولہ بیگم کمال الدین کے قریب گرا اور بیگم کمال الدین بے ہوش ہو گئیں بے ہوشی کے اس عالم میں بھی بیگم کمال الدین کی زبان پر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے جاری تھے۔ آنسو گیس کے بادلوں میں "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعروں سے فضا مرتعش تھی۔

۲۶ فروری ۱۹۴۷ء کو پنجاب کی سول نافرمانی کی تحریک کامران ہوئی۔ کانگرس یونینسٹ وزارت نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ جمہوری تحریک تھی۔ حکومت پنجاب نے شہری آزادیوں کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا۔ ہندوستان بھر مسلمانوں میں مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ بیگم کمال الدین بھی اس مسرت میں شریک تھیں۔ پنجاب مسلم لیگ نے انھیں سول نافرمانی کی تحریک پر ہدیہ تبریک پیش کیا اور ان کی سرگرمیوں کو سراہا۔ بیگم کمال الدین ایک ماہ شب و روز کام کرنے کے بعد تھک چکی تھیں مگر ان کا فرض انھیں بیکار رہا تھا۔ سرحد میں حالات نئی کروٹ لے رہے تھے۔ پنجاب کی نافرمانی کی تحریک نے صوبہ سرحد پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ سرحد کے جیالے بھی انھی خطوط پر سوچ رہے تھے۔ سرحد میں ایک سکھ لڑکی نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ اس کا اسلام بی بی

رکھا گیا۔ سرحد کی کانگرس وزارت نے اسلام بی بی کو سکھوں کے سپرد کر دیا۔ اس کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا پشاور میں سٹی مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں کانگرسی وزارت کے رویہ کی مذمت کی گئی۔ جلسے کے بعد جلوس نکالا گیا جس نے وزیر اعظم کی قیام گاہ کا رخ کیا پولیس نے مداخلت کی۔ آنسو گیس پھینکی مگر جلوس وزیر اعظم کے مکان تک جا پہنچا۔ بعض مسلم لیگی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ سرحد مسلم لیگ کے سامنے پنجاب کی مثال تھی۔ سرحد مسلم لیگ نے بھی کانگرسی وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس تحریک کی اطلاع بیگم کمال الدین کو ملی تو انھوں نے پہلی فرصت میں سرحد کا رخ کیا۔

بیگم کمال الدین میجر خورشید انور اور اپنے بھتیجے سردار ظہور احمد کے ہمراہ پشاور روانہ ہوئیں راولپنڈی میں مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کیا۔ رات کو اطلاع ملی کہ میجر خورشید انور کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ میجر خورشید انور تو ان خطرات کے عادی تھے اور اہل ایمان کی طرح ادھر ڈوبے ادھر نکلے کے مصداق تھے۔ پولیس اس شاہین کو گرفتار نہ کر سکی بیگم کمال پشاور کے لیے روانہ ہوئیں تو اٹک کے پل کے پار میجر خورشید انور موجود تھے۔ وہ بیگم کمال کی کار میں روانہ ہوئے تو سرحد پولیس نے تعاقب شروع کر دیا میجر خورشید انور سے سرحد کی پولیس بھی خائف اور لرزہ بر اندام تھی اور اس پنجابی لیڈر کی گرفتاری کے وارنٹ جاری تھے۔ اب آگے آگے بیگم کمال کی کار تھی اور پیچھے پیچھے سرحد پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ پہلے موٹر کا رخ مانکی شریف کی جانب تھا، پھر مردان کا رخ کیا۔ مردان پہنچتے ہی پولیس کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ بیگم کمال الدین نے سرحد کی مشہور خاتون لیڈر بیگم زری سرفراز کے مکان کا رخ کیا۔ انھوں نے میجر خورشید انور کو اپنے گھر میں چھپا لیا۔ اب پولیس نے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا اور میجر خورشید انور کی گرفتاری کے خواہش مند تھے۔ پٹھانوں کی روایت ہے کہ کوئی شخص ان کی پناہ میں آجاتا ہے تو اسے پورا تحفظ دیتے ہیں اور جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔ بیگم زری سرفراز کا گھرانا تو پٹھانوں کی عظیم روایات کا علمبردار ہے۔ پولیس نے گھر میں داخل ہونا چاہا تو بیگم زری سرفراز نے بڑی جرأت و ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا کہ مردوں کو مکان کی تلاشی کی اجازت نہیں ہے پہلے عورتوں کو گرفتار کیا جائے اور پھر تلاشی ہو گی۔ بیگم کمال الدین اور بیگم زری سرفراز کی جرأت مندی سے خائف ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے اپنی انگریز بیوی کو میجر خورشید انور کو تلاش کرنے کے لیے [illegible] زری سرفراز کے وسیع اور شاندار مکان میں میجر خورشید انور کی تلاشی ناممکن تھی۔ یہ تلاش ناکام ہوئی اور وہ شاہین زیر دام نہ آیا۔ ڈپٹی کمشنر نے برافروختہ ہو کر بیگم کمال الدین

انتقام لیا اور انھیں دو ماہ کے لیے سرحد بدر ہونے کا نوٹس دیا۔ بیگم کمال الدین نے اس حکم کی تعمیل کرنے
سے انکار کر دیا۔ انھیں پولیس نے ایبٹ آباد پہنچا دیا۔ حکومت سرحد نے ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو ہدایات
جاری کر رکھی تھیں کہ بیگم کمال کو ضلع بدر کر دیا جائے مگر بیگم کمال نے ایبٹ آباد پہنچ کر مسجد میں
پناہ لی۔ نماز کے بعد انھوں نے ہزاروں مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کیا اور پرجوش تقریر سے ان
کے سینوں میں آگ لگا دی۔ دوسرے روز بیگم کمال نے ایک بڑے جلوس کی قیادت کی اور
خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ مگر حکومت کو ہمت نہ ہوئی۔ وہ ایبٹ آباد دوسرے شہروں میں
کئی روز تک اجتماعات سے خطاب کرتی رہیں۔ ضلع ہزارہ میں تحریک سول نافرمانی اپنے شباب
پر تھی۔ حکام ضلع کو یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ بیگم کمال کو گرفتار کریں۔ انھیں علم تھا کہ اس سے ایسی
آگ بھڑک اٹھے گی جس کو بجھانا ان کے بس کی بات نہیں۔ اب انھوں نے پشاور کا رخ کیا۔ وہ
دیہاتی عورتوں کا بھیس بدل کر گئی تھیں، مگر پولیس نے گرفتار کر لیا اور انھیں پنجاب کی حدود میں پہنچا دیا
بیگم کمال الدین کا خمیر کسی اور مٹی کا تھا وہ ان باتوں سے پریشان ہونے والی نہ تھیں۔ انھوں نے پھر
پشاور میں خواتین پہلے ہی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لے رہی تھیں۔ بیگم کمال کے پہنچنے سے تحریک
نے شدت اختیار کر لی۔ پشاور میں عورتوں کے جلوس نکلے اور انھوں نے کانگرسی وزارت کو تس نہس
کر دیا۔ وہ پشاور ہی میں تھیں کہ انھیں گورنر صوبہ سرحد کے ایبٹ آباد پہنچنے کی اطلاع ملی۔ وہ ایبٹ آباد
پہنچیں۔ ۲۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو ایبٹ آباد میں جلوس نکالا اب انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ
ضلع ہزارہ کے دیہات تک وسیع کر دیا۔ انھوں نے مختلف دیہات میں اجتماعات سے خطاب کیا۔
۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو انھوں نے ہری پور میں عورتوں کا جلوس نکالا۔ وہ خود قیادت کر رہی تھیں
جلوس نے سنٹرل جیل ہری پور کا رخ کیا۔ جیل میں تحریک پاکستان کے نامور رہنما تھے۔ جلوس میں
شامل خواتین جیل کی پچھلی جانب سے چھت پر چڑھنے لگیں تو پولیس اور فوج نے روکا مگر عورتوں
میں ایسا جذبہ تھا کہ انھوں نے پولیس اور فوج کے تشدد کی پروا نہ کی اور جیل کی چھت پر چڑھ
کر یونین جیک اتارا اور مسلم لیگ کا پرچم لہرایا۔ مسلم لیگ کا پرچم لہرا رہا تھا تو فضا "پاکستان
زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ بیگم کمال الدین نے ضلع ہزارہ کے گاؤں گاؤں میں تحریک
پھیلا دی اور ہزارہ کی غیرت مند خواتین میدان عمل میں نکل آئیں۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء کو آپ کوہاٹ پہنچیں
حکومت نے کوہاٹ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ کوہاٹ کے عوام شدید احتجاج کیا اور عظیم الشان
جلوس نکالا۔ پولیس نے بیگم کمال الدین کو گرفتار کر کے صوبہ بدر کر دیا اٹک سے آپ پشاور

روانہ ہوگئیں۔ پشاور سے گرفتار کرکے آپ کو ایبٹ آباد پہنچا دیا گیا۔ ایبٹ آباد میں آپ نے اپنی سرگرمیوں میں کو جاری رکھا اور جلوسوں کی قیادت کرتی رہیں۔ آپ کے زیر قیادت ایک جلوس میں راجہ افتخار احمد نے ضلع کچہری پر یونین جیک اتار کر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا۔ اب آپ نے مردان کا رخ کیا۔ مردان کی وار کونسل نے آپ کی سرگرمیوں کو سراہا۔ آپ نے مردان میں جلسے اور جلوس منظم کیے۔

سرحد کی سول نافرمانی کی تحریک کامران ہوئی۔ اب سرحد میں استصواب کا اعلان ہوا۔ سرحد کے عوام کو ووٹوں سے فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں استصواب کی بڑی اہمیت تھی۔ بیگم کمال نے استصواب میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ہزارہ سرحد کا سب سے بڑا ضلع تھا۔ ووٹروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ بیگم کمال نے ضلع بھر کا دورہ کیا اور بالخصوص عورتوں پر زور دیا کہ وہ استصواب میں حصہ لیں۔ عورتوں نے بڑے جذبہ و جوش سے حصہ لیا۔ استصواب کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو ضلع ہزارہ استصواب میں سرفہرست تھا استصواب سے فیصلہ ہو گیا کہ سرحد پاکستان میں شامل ہو گا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا جہان جمال جلوہ گر ہوا۔ بیگم کمال بارگاہ حق میں سجدہ ریز ہوئیں کہ انھوں نے قائد اعظم سے جو وعدہ کیا تھا اسے ایفا کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انھیں کامرانی ہوئی۔

۹۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر

بیگم مولانا محمد علی جوہر نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں بڑا اہم آفریں کردار ادا کیا قائد اعظم نے مسلمانوں کی تنظیم و اتحاد کا عزم کیا۔ ان کی صدا پر لبیک کہنے والوں میں بیگم محمد علی پیش پیش تھیں۔ وہ قائد اعظم کی عظیم شخصیت اور ان کے کارناموں سے خوب واقف تھیں۔ وہ قائد کے بارے میں اپنے عظیم خاوند محمد علی کے جذبات و احساسات سے بھی آشنا تھیں۔ مولانا محمد علی کی زندگی کا آفتاب لب بام تھا کسی نے مولانا سے کہا کہ آپ کے بعد مسلمانوں کی قیادت کون کرے گا؟ مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ اس فریضہ کو مسٹر محمد علی جناح سرانجام دیں گے۔ قائد نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی تو بیگم محمد علی نے قائد سے بھرپور تعاون کیا وہ مسلم لیگ میں دل و جان سے شریک ہوئیں۔ قائد نے انھیں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن مقرر کیا۔ زندگی کے آخری لمحات تک وہ اس عظیم منصب پر سرفراز رہیں۔ بیگم مولانا محمد علی کی مسلم لیگ میں شرکت قائد اعظم

کے لیے بڑی تقویت کا باعث ہوئی۔ بیگم محمد علی نے تحریک خلافت میں بڑا کام کیا تھا مسلمانوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ مولانا محمد علی اپنے دور میں مسلمانوں کے عظیم ترین رہنما تھے۔ بیگم مولانا محمد علی ان کی عظیم روایت سے کر مسلم لیگ میں شامل ہوئیں۔ مسلم لیگ میں ان کی شمولیت کے بعد وہ ہزاروں کارکن بھی مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہوئے جو مولانا محمد علی کے نیاز مند اور پرستار تھے۔

بیگم محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمان خواتین کو مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت پر آمادہ کرنا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے یادگار اجلاس لکھنؤ میں دوسری خواتین بھی شامل تھیں انھوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ خواتین میں مسلم لیگ کے مقاصد کی اشاعت کی جائے۔ ان کی صدارت میں لکھنؤ میں خواتین کا جلسہ ہوا۔ اور مسلم لیگ زنانہ شعبہ کا اجرا کیا گیا۔ اس سلسلے میں بیگم محمد علی نے جدوجہد کا آغاز کیا۔ انھوں نے مختلف مقامات کے دورے کیے۔ عورتوں سے خطاب کیا اور انھیں دعوت دی کہ وہ اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی تحریک میں سرگرم عمل ہوں۔ ان کی سرگرمیوں سے مسلمان خواتین بیدار ہوئیں۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس پٹنہ منعقدہ ۱۹۳۸ء میں خواتین کی کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی میں خاتون پاکستان محترمہ فاطمہ جناح اور دیگر نامور خواتین بھی تھیں۔ اس کمیٹی کی صدر اتفاق رائے سے بیگم مولانا محمد علی کو چنا گیا بیگم مولانا محمد علی نے خواتین کو زیادہ توجہ اور سرگرمی سے منظم کرنا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف صوبوں میں زنانہ مسلم لیگیں قائم کیں۔ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں مسلم لیگ خواتین کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کی صدارت کے لیے ایسی خاتون کا انتخاب ضروری تھا جس پر قوم کو اعتماد ہو۔ بیگم مولانا محمد علی ہی ایسی خاتون تھیں۔ انھوں نے صدارت قبول کی۔ دہلی میں کام شروع ہوا اور خواتین مسلم لیگ منظم ہو گئی تو بیگم محمد علی صدارت سے دست بردار ہو گئیں اور یہ ذمہ داری بیگم اقبال حسین کے سپرد کر دی گئی۔ بیگم محمد علی نے ہندوستان بھر میں خواتین کو ایسے عمدہ انداز میں منظم کیا کہ خود قائد اعظم اس پر بڑے مسرور و شادمان ہوئے۔ عورتوں میں ملی اور سیاسی کام کرنا بڑا مشکل تھا اس منزل ہفت خواں کو بیگم محمد علی نے سر کیا۔

۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس میں قائد اعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں مسلمان خواتین کی سرگرمیوں پر مسرت کا اظہار کیا۔ قائد اعظم نے فرمایا ”آپ کو یاد ہو گا کہ اجلاس پٹنہ میں خواتین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ یہ بات ہمارے لیے بہت زیادہ اہم ہے میں زندگی اور کل

کی جدوجہد میں خواتین کو شریک کرنے کا ہر موقع فراہم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ خواتین اپنے گھروں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے اور باپردہ رہ کر بہت زیادہ کام کر سکتی ہیں۔ ہم نے یہ کمیٹی اس غرض سے بنائی تھی کہ خواتین لیگ کے کاموں میں حصہ لے سکیں۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اس مرکزی کمیٹی نے سنجیدگی اور جوش و خروش کے ساتھ کام شروع کر دیا ہے اور اب تک زیادہ مفید کام انجام دے چکی ہیں۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ہم اس کی کارگزاریوں کی رپورٹ پر غور کریں گے تو ہم واقعی ان کی خدمات پر ممنون ہوں گے جو انھوں نے مسلم لیگ کے لیے سرانجام دیں،، قائداعظم کا یہ خراج تحسین بیگم محمد علی کی عظیم خدمات کا اعتراف تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کے موقع پر آل انڈیا خواتین مسلم لیگ کمیٹی کا سالانہ اجلاس ۲۲ مارچ کو حبیبیہ ہال، اسلامیہ کالج لاہور میں منعقد ہوا۔ ہندوستان بھر کی ممتاز مسلمان خواتین شریک اجلاس تھیں۔ ان میں مس فاطمہ جناح، بیگم لیاقت علی خان، لیڈی عبداللہ ہارون (سندھ)، بیگم نواب حفیظ (سورت)، بیگم نواب محمد اسماعیل خان (میرٹھ)، بیگم حبیب اللہ (لکھنؤ)، بیگم رضاء اللہ بیگ (دہلی)، بیگم عبدالحفیظ (لکھنؤ)، بیگم نواب بہادر یار جنگ (حیدرآباد)، بیگم ہمایوں مرزا (حیدرآباد)، بیگم مومن (کلکتہ)، بیگم کمال الدین (سرحد)، لیڈی سر عبدالقادر، بیگم شاہنواز، بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور بیگم بشیر احمد قابل ذکر تھیں۔ ان سب ممتاز خواتین کی موجودگی میں خواتین نے اپنی صدر اور رہنما بیگم محمد علی کو تسلیم کیا اور انھوں نے اجلاس کی صدارت کی۔ یہ جلسہ مسلمان خواتین کی سیاسی جدوجہد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیگم محمد علی کی زیر صدارت اس جلسہ میں ممتاز خواتین نے خطاب کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اس جلسے میں اردو میں تقریر کرتے ہوئے مسلمان خواتین کی بیداری پر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ آج سے چند سال قبل مسلمان خواتین سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے گریز کرتی تھیں۔ یہ حقیقت میرے لیے خوش گوار حیرت کا باعث ہے کہ اب وہ آزمائش کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اس حقیقت کی نشان دہی کی تھی کہ خواتین کا خواتین کا یہ انقلاب بیگم مولانا محمد علی کی مساعی جمیلہ کا رہین منت ہے۔

مسلم لیگ نے اپنا نصب العین ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست یعنی پاکستان کا قیام قرار دیا۔ اب ملت کی منزل مقصود متعین ہو چکی تھی۔ بیگم محمد علی نے قرارداد پاکستان کو منظور کرانے میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ انھوں نے قرارداد پاکستان کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کو

دی۔ انھوں نے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور عورتوں کو خطاب کیا۔ بیگم محمد علی کے نام کا برصغیر پاک و ہند میں سکہ رواں تھا۔ ان کی شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی۔ بیگم محمد علی کسی بھی شہر پہنچتیں تو ان کی تقریر سننے کے لیے ہزاروں خواتین جمع ہو جاتیں اور تحریک خلافت کے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ بیگم محمد علی سلیس اور آسان زبان میں تقریر کرتیں اور روزمرہ کی زبان کے دل نشین فقروں سے تقریر کو آراستہ کرتیں۔ ان کی تقریر میں روانی ہوتی۔ خواتین ان کی تقریر سے سیر نہیں ہوتی تھیں۔ ان کا جی چاہتا کہ بیگم محمد علی تقریر کرتی جائیں اور وہ سنتی جائیں۔ ان کی تقریر کے دوران جلسہ گاہ مسلم لیگ زندہ باد اور قائد اعظم زندہ باد نعروں سے گونج اٹھتا۔ بیگم محمد علی کی تقریر سراپا درد ہوتی اور سننے والی خواتین عہد کرتیں کہ وہ پاکستان کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی۔ بیگم محمد علی کا ایک بڑا کارنامہ خواتین میں متبادل قیادت پیدا کرنا تھا۔ وہ مسلمان خواتین کی قائد تھیں۔ ان کا طوطی ہندوستان بھر میں بولتا تھا۔ انھوں نے اپنی رفیق خواتین کی حوصلہ افزائی کی۔ انھیں آگے بڑھایا اور چند سال میں مسلمان خواتین میں متبادل قیادت نے ذمے داری سنبھال لی۔ وہ جب خواتین مسلم لیگ کی صدارت سے دست بردار ہوئیں تو اس ذمہ داری کو اپنی ایک وفادار نائب لیڈی نصرت عبداللہ ہارون کے سپرد کر دیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلمان خواتین کی تمام نشستوں پر مسلم لیگ نے فتح حاصل کی۔ خود بیگم مولانا محمد علی نے یو۔ پی سے انتخاب لڑا اور بلا مقابلہ منتخب ہوئیں۔ بیگم محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں۔ انھیں طویل سیاسی تجربہ تھا۔ انھوں نے تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اولین گول میز کانفرنس میں وہ اپنے خاوند کے ہمراہ تھیں۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے جلسوں میں بیگم محمد علی باقاعدگی سے شریک ہوتیں اور مختلف مسائل پر جرأت و بیباکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔ ان کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی۔ پاکستان منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کو تھا کہ بیگم مولانا محمد علی کا ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو انتقال ہو گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا، ”میں بیگم مولانا محمد علی کی وفات پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہوں۔ وہ ہندوستان کے مسلمان زعماء میں بلند مقام کی حامل تھیں۔ گذشتہ دنوں میں جب مسلم لیگ اور مسلمانان ہند کی سیاست انتہائی نازک دور سے گزر رہی تو دو مواقع ایسے آئے کہ تمام ارکان مجلس عاملہ نے مسلمانوں کے شایان شان فیصلہ کرنے کے بارے میں ہمت ہار دی تھی لیکن اس موقع پر صرف بیگم محمد علی کی اولوالعزمی، اصابت رائے اور عزم و استقلال نے فیصلے کا رخ بدل دیا اور ان کی جرأت نے مجلس عاملہ کے باقی ارکان

کی ہمتوں کو سہارا دے کر مسلم لیگ کو کمزور فیصلے کے طعن سے بچایا۔ محمد یران کی قوت فیصلہ، صائب رائے، عزم و استقلال، ہمت و عمل اور خلوص و دردمندی کا اتنا گہرا اثر ہے کہ میں ان تاثرات کا صحیح اور پورا پورا اظہار نہیں کر سکتا۔ بیگم محمد علی کی موت مسلمانوں کے لیے عظیم صدمہ ہے۔ قائداعظم نے حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کی ہے کہ بیگم محمد علی نے تحریک پاکستان کے انتہائی نازک ادوار میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ مسلم لیگ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتیں۔ تحریک پاکستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تحریک پاکستان میں ہندوستان کی مسلمان خواتین میں سب سے اہم حصہ بیگم مولانا محمد علی نے لیا۔ وہ مسلم لیگ میں ممتاز ترین خاتون تھیں۔ ان کی قیادت میں مسلمان خواتین نے عہد آفریں کارنامے سرانجام دیے۔ یہ کارنامے تاریخ پاکستان کا درخشاں باب ہیں۔

۱۰۔ فاطمہ بیگم

فاطمہ بیگم نے مسلمان خواتین اور مسلم لیگ کی جو قابل قدر خدمت انجام دیں۔ قائداعظم اس کے معترف تھے۔ قائداعظم نے جو توقعات فاطمہ بیگم سے وابستہ کی تھیں، فاطمہ بیگم نے ان توقعات کو پورا کیا۔ انھوں نے نہ صرف تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا بلکہ تحفظ و تعمیر پاکستان میں بھی وہ پیش پیش رہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قومی خدمات میں گزرا۔ انھوں نے ہزاروں لاکھوں روپے قومی خدمت میں صرف کیے۔ وہ پنجاب اور سرحد میں مسلم لیگ کی سب سے ممتاز خاتون رہنما تھیں۔ قائداعظم اور دیگر اکابر ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ مگر انھوں نے یہ تمام قومی خدمات ایثار اور اخلاص کے جذبے کے پیش نظر سرانجام دی تھیں انھوں نے نہ کبھی اسمبلی کی رکنیت کی خواہش کی اور نہ کبھی انھوں نے منصب کی آرزو کی۔ انھوں نے ہر کام ستائش اور صلے سے بے نیاز ہو کر کیا۔ ۱۹۴۶ء میں انھیں اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا مگر وہ اس ٹکٹ سے دست بردار ہو گئیں اور تالیف قلب کے لیے یہ ٹکٹ ایک ایسی خاتون کو دلوا دیا جو اسمبلی کی رکنیت کی زبردست خواہش مند تھیں۔ فاطمہ بیگم بڑی جلیل القدر خاتون تھیں۔ ان کا تعلق پنجاب کے ایک نامور خاندان سے تھا۔ ان کے والد مولوی محبوب عالم مشہور صحافی، ادیب اور قومی رہنما تھے۔ والد کی نگرانی میں فاطمہ بیگم نے مضمون نگاری شروع کی۔ انھیں کہانیاں اور اصلاحی مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ اپنے والد کے رسائل ماہچوں کے اخبار اور شریف بی بی میں ان کے مضامین

شائع ہونے لگے۔

مولوی محبوب عالم نے شریف بی بی کی ادارت فاطمہ بیگم کے سپرد کر دی۔ فاطمہ بیگم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں میں پہلی خاتون صحافی تھیں۔ فاطمہ بیگم کو زندگی بھر صحافت سے دلچسپی رہی صحافت کے علاوہ انھیں ادب سے بھی تعلق تھا۔ کئی کتابیں ان کے خامہ بہا کی مرہون منت ہیں۔ فاطمہ بیگم کا انداز بیان بڑا دلآویز اور شگفتہ تھا۔ وہ نغز گو شاعرہ بھی تھیں مگر انھوں نے اپنی شاعری کو بھی قوم کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری قومی شاعری تھی۔ فاطمہ بیگم کی قابلیت اور خلوص سے اس دور کی خواتین متاثر تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں لاہور میں انجمن خواتین اسلام قائم کی گئی تو بیگم شفیع کو صدر اور فاطمہ بیگم کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ انجمن خواتین اسلام نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں بڑی مفید خدمات سرانجام دیں۔

فاطمہ بیگم نے پنجاب میں طالبات کو منظم کیا اور پنجاب مسلم گرلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی۔ فاطمہ بیگم کے ادارہ جناح کالج میں پانچ سو سے زیادہ طالبات فیڈریشن کی رکن تھیں۔ فاطمہ بیگم کی فعال قیادت نے اس جماعت کو سرگرم تحریک کی صورت دی۔ ۱۹۴۱ء میں انھیں مسلم لیگ کی جانب سے خواتین مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ یہ گویا ان کی خدمات کا اعتراف تھا۔ ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کی جانب سے خواتین کمیٹی کی دوبارہ تشکیل ہوئی تو بھی فاطمہ بیگم اس کی رکن تھیں مرکزی خواتین کمیٹی کی رکن کی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ وہ خواتین کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوتیں۔ پروگرام مرتب کرنے میں اہم حصہ لیتیں۔ کوئی نازک یا دشوار گزار معاملہ درپیش ہوتا تو اسے ناخن تدبیر سے سلجھاتیں۔ مسلم لیگ خواتین کی تمام ارکان ان کا بے حد احترام کرتیں اور ان کے خلوص و ایثار، سادگی اور بے نفسی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتیں فاطمہ بیگم اور دیگر خواتین کی مسلسل جدوجہد سے پنجاب میں فضا سازگار ہو چکی تھی۔ خواتین میں مسلم لیگ کا چرچا تھا۔ مسلمان طالبات بھی تحریک پاکستان سے وابستہ تھیں۔ فاطمہ بیگم کی نگاہ سرحد کی جانب اٹھی۔ سرحد کانگرس کا بہت بڑا مرکز تھا۔ سرخ پوش تحریک کا جال صوبہ سرحد کے گوشہ گوشہ میں بچھا ہوا تھا۔ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا اثر کم تھا اور خواتین میں مسلم لیگ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا فاطمہ بیگم سرحد کے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ بڑی دور اندیش خاتون تھیں۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں کالج قائم کیا تو سرحد کی طالبات کو کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی۔ ان کے کالج میں نذیر نیازہ اور کئی دوسری طالبات نے تعلیم حاصل کی۔ ان

طالبات کے دلوں کو انھوں نے قومی ولولہ سے بھر دیا۔ جب یہ طالبات فارغ التحصیل ہو کر پشاور لوٹ گئیں تو فاطمہ بیگم نے سرحد میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اب سرحد میں ان کی متعدد طالبات موجود تھیں۔ فاطمہ بیگم ۱۹۴۳ء میں پشاور آئیں اور خواتین کو منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس راہ میں بڑی دشواریاں اور رکاوٹیں حائل تھیں۔ فاطمہ بیگم نے ان دشواریوں اور رکاوٹوں کو دور کیا۔ وہ پشاور میں خواتین سے ملیں۔ عورتوں کے اجتماعات سے خطاب کیا اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ تحریک پاکستان کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ وہ سرحد کے مسلم لیگی وزیر اعظم سردار اورنگ زیب سے ملیں تاکہ زنانہ مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں ان کی تائید و حمایت حاصل کریں۔ فاطمہ بیگم کی مساعی سے سرحد میں بیگم اورنگزیب کی قیادت میں زنانہ مسلم لیگ قائم کر دی گئی۔ فاطمہ بیگم مسرور و شادمان ہو کر لاہور واپس آئیں کہ انھوں نے سرحد کے اندھیروں میں پاکستان کا نام روشن کر دیا ہے۔ سرحد میں زنانہ مسلم لیگ کی بانی فاطمہ بیگم تھیں۔ سرحد کی خواتین ان کی ولولہ انگیز اور پرجوش شخصیت سے متأثر ہوئیں۔ فاطمہ بیگم نے سرحد کی زنانہ مسلم لیگ سے مسلسل تعلق رکھا۔ وہ انھیں خط لکھتیں۔ پیام بھجواتیں۔ سرحد کی خواتین لاہور آتیں تو ان کی خاطر مدارات کرتیں۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں فاطمہ بیگم نے بیگم عبدالصمد کی قیادت میں سرحد کا دورہ کیا۔ اب کہ فضا زیادہ سازگار تھی۔ ان کے خلوص و ایثار سے متأثر ہو کر کئی اور خواتین میدان عمل میں آ گئی تھیں۔ زنانہ مسلم لیگ کی تجدید کی گئی۔ ممتاز جہاں کو سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ انھوں نے اس دورہ میں سرحد کی خواتین میں اپنی انقلابی روح پھونک دی۔ ۱۹۴۶ء میں بھی فاطمہ بیگم نے سرحد کا دورہ کیا اور مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔ ۱۹۴۷ء میں سرحد میں مسلم لیگ نے کانگرس وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا تو خواتین نے تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ فاطمہ بیگم زیر گرفتاری نہ تھیں۔ وہ تو صاحب کردار بھی تھیں۔ انھوں نے پشاور میں سول نافرمانی کے سلسلے میں کئی جلوسوں کی قیادت کی۔ انھوں نے سرحد کے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ان پر زور دیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ فاطمہ بیگم نے کئی ہفتے سرحد میں قیام کیا اور خواتین کو نیا جذبہ، نیا ولولہ اور نیا جوش و خروش دیا۔ سرحد کی خواتین نے ایسی بھرپور تحریک چلائی کہ سرحد کی کانگرسی وزارت اس کے سیل رواں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ فاطمہ بیگم نے تحریک پاکستان کے ہر مرحلہ پر سرحد کی خواتین کی رہنمائی کی۔ اس بنا پر ان کی یاد آج بھی سرحد کی غیور خواتین کے دلوں میں تازہ ہے۔ بنگال میں قحط پڑا تو فاطمہ بیگم مضطرب اور بے قرار ہو گئیں۔ وہ پنجاب میں زنانہ مسلم لیگ کی قائد تھیں۔ انھوں نے دیگر خواتین کے اشتراک سے بنگال کے مصیبت زدگان کے لیے

پروگرام مرتب کیا۔ خود چندہ دیا اور تقاریب کا اہتمام کیا۔ خواتین سے کپڑے، خوراک وغیرہ فراہم کیں اور بنگال بھجوائیں۔ فاطمہ بیگم کی قیادت میں ایک وفد نے اسمبلی چیمبر کا رخ کیا اور ممبران اسمبلی سے بھی چندہ لیا۔ ۱۹۴۴ء میں خضر حیات نے مسلم لیگ سے غداری کی اور برطانوی سامراج کا آلۂ کار بن کر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کیا تو اس کے خلاف پنجاب کے طلبہ سرگرم عمل ہوئے۔ محترمہ فاطمہ بیگم ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھیں۔ انھوں نے خواتین میں قوم دشمن عناصر کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات پیدا کیے۔ اس نازک دور میں انھوں نے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ یونینسٹ پارٹی کے عزائم کو بے نقاب کیا اور خواتین سے اپیل کی کہ وہ تحریک پاکستان کے لیے پورے جوش وخروش سے کام کریں۔ لاہور میں تو خود جلسوں کا اہتمام کرتیں اور جلسوں کے تمام اخراجات خود برداشت کرتیں۔ خواتین کی تواضع کا سامان بھی کرتیں۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جلسوں میں شریک ہوتیں اور پرجوش تقاریر کرتیں۔ ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ ان انتخابات میں تمام مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں صوبائی انتخابات کا مرحلہ آیا تو خواتین کی مخصوص نشستیں بھی تھیں۔ شہرت، خدمت، علم وفضل اور تجربہ کی بنا پر سب سے فائق حق فاطمہ بیگم کا تھا۔ وہ پنجاب کی خواتین کی قائد تھیں۔ مگر اس موقع پر انھوں نے ایثار وقربانی کی نادر مثال قائم کی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اسمبلی کے ٹکٹ کے لیے درخواست نہیں دیں گی اور کسی منصب کی طالب نہیں ہوں گی۔ ان کے لیے قوم کی خدمت ہی سب سے بڑا اعزاز اور منصب ہے۔ فاطمہ بیگم کا یہ فیصلہ ان کے خلوص وایثار کا درخشاں ثبوت ہے۔ ایسا ایثار جو کسی عظیم روح کا کارنامہ ہے۔ فاطمہ بیگم نے خود انتخاب میں حصہ نہ لیا۔ مگر مسلم لیگ کے لیے پورے جوش وخروش سے کام کیا۔ انھوں نے خواتین پر زور دیا کہ وہ پورے صوبہ میں مسلم لیگ کی حمایت کریں۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو بھرپور کامیابی ہوئی۔ مگر اپنوں اور بیگانوں کی سازشوں کے باعث مسلم لیگ کی وزارت نہ بن سکی۔ خضر کانگرس وزارت کے خلاف فاطمہ بیگم نے مختلف اجتماعات کیے اور اس ناپاک وزارت پر شدید نکتہ چینی کی ۱۹۴۶ء میں بہار میں مسلمانوں کا قتل عام کانگرس وزارت کے اشارہ پر ہوا تھا۔ فاطمہ بیگم بے قرار ہو گئیں۔ ایک وفد لے کر بہار گئیں۔ فساد زدہ علاقوں کا بلاخوف وخطر دورہ کیا۔ مصیبت زدگان کو امداد بہم پہنچائی۔ کئی یتیموں اور بیوگان کو لے کر لاہور آئیں اور اپنی زمین پر مکانات بنا کر آباد کیا جسے بہار کالونی سے موسوم کیا گیا۔ بہار کالونی فاطمہ بیگم کی فیاضی اور دردمندی کی یادگار ہے۔ قیام

پاکستان کے بعد یہ مہاجر متروکہ مکانوں میں منتقل ہو گئے۔ پنجاب میں حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ خضر وزارت نے مسلم لیگ کو کچلنے کی ناکام کوشش کی۔ مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا۔ فاطمہ بیگم اس تحریک میں پیش پیش تھیں۔ انھوں نے عورتوں کے کئی جلوس نکالے۔ عورتوں کے اجتماعات کو خطاب کیا۔ بالآخر حکومت نے انھیں قید کر دیا۔ یونینسٹ حکومت کو شکست ہوئی اور کانگرس کی شہ پر ہندوؤں اور سکھوں نے پنجاب میں فسادات شروع کر دیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ مسلمان نہتے تھے اور ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم کا شکار تھے۔ فاطمہ بیگم نے اس دور میں حیرت انگیز جرأت کا ثبوت دیا۔ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر خطرناک مقامات تک پہنچیں۔ وہ مسلمانوں بالخصوص عورتوں کو نکال کر لاتیں بہت سی عورتوں کو اپنے وسیع و عریض مکان میں پناہ دی۔ وہ مصیبت زدگان کے لیے کھانے کا انتظام کرتیں۔ وہ جہاں بھی گئیں خطرات کو دعوت مبارزت دی۔ انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو بچایا۔ فسادات کا سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔ اس دوران فاطمہ بیگم نے بارہا اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ انھوں نے لاہور کے علاوہ دیگر شہروں کے بھی دورے کیے۔ ان کی ذات مسلمانوں، بالخصوص خواتین کے لیے رحمت کے فرشتہ کی تھی۔ جہاں ضرورت ہوتی وہ موجود ہوتیں۔ فسادات کے زمانے میں انھوں نے ہزاروں روپے اپنی جیب سے خرچ کیے۔ فاطمہ بیگم کی جرأت ہمت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ۹ اگست ۱۹۴۷ء کو امرتسر گئیں۔ پاکستان قائم ہوا تو وہ مسرور اور شاداں تھیں کہ مسلمانوں کو قومی وطن مل گیا ہے اور قائد اعظم کی قیادت میں مسلمانوں کی مساعی عروس کامرانی سے ہمکنار ہوئیں۔ لیکن ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا اور لاکھوں مسلمانوں نے قافلہ در قافلہ پاکستان کا رخ کیا۔ شہری زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ابتلاء کا دور تھا۔ فاطمہ بیگم نے کئی سال مسلسل کام کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کچھ عرصہ آرام کریں گی مگر انھوں نے مہاجرین کی حالت دیکھی تو تڑپ گئیں انھوں نے زنانہ مسلم لیگ کے ذریعے مہاجرین کی خدمت کا انتظام کیا۔ عوام سے کپڑے اور کھانے فراہم کرکے کیمپوں میں پہنچاتیں اور خود بچوں کو کھلاتیں۔ کیمپوں میں رضاکار خواتین مقرر کیں تاکہ عورتوں کے کام آسکیں انھوں نے مہاجر عورتوں کے دکھ کا درماں کیا۔ ان کے زخمی دلوں کی چارہ سازی کی۔ ان کو ماں کی شفقت اور محبت دی۔ وہ کیمپوں میں زمین پر بیٹھ جاتیں، مہاجر عورتوں سے ظلم و ستم کے واقعات سنتیں اور ان آنکھوں سے اشک رواں ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ماں اپنے پریشان

بچوں کے درمیان بیٹھی ہے۔ فاطمہ بیگم اس دوران سب کچھ بھول جاتیں۔ انھیں صرف مہاجروں کی فکر ہوتی پاکستان بننے کے بعد وہ صوبائی خواتین مسلم لیگ کی صدر رہیں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اس آخری اجلاس میں بھی وہ شریک ہوئیں جو کراچی میں قائد اعظم کی صدارت میں ہوا۔

۱۱۔ مادرِ ملت فاطمہ جناح

مادرِ ملت کی عظمت حق گوئی و بیباکی میں پنہاں تھی۔ انھوں نے ہمیشہ حق گوئی کو اپنا شعار بنایا پاکستان بننے کے بعد انھوں نے حکمرانوں کی کوتاہیوں پر ہمیشہ تنقید کی۔ اس زمانہ میں جب قلم شل اور زبانیں گنگ تھیں، ان کی تنہا صدا فضا کو مرتعش کرتی رہی۔

خاتون پاکستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف ایک نئے ملک کی تخلیق میں اہم حصہ لیا بلکہ اس ملک کے تحفظ و استحکام میں بھی پیش پیش رہیں۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد تو انھیں ہر لحہ پاکستان کا خیال رہتا تھا۔ وہ شب و روز ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے غور و فکر کیا کرتی تھیں ملت کی دردمندی، حب الوطنی، اصول پسندی اور خلاق و ایثار قائد اعظم کی تربیت کا فیض تھا۔

قائد اعظم نے خود مادرِ ملت کی تربیت کی تھی۔ وہ بمبئی میں قائد اعظم کے پاس رہتی تھیں یہ قائد اعظم کی زندگی کا وہ دور تھا جب انھوں نے تمام تر توجہ تحریک آزادی کی جانب مبذول کر دی تھی محترمہ فاطمہ جناح نے قائد اعظم اور لارڈ ولنگڈن کی معرکہ آرائی کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ اس میں شریک بھی ہوئیں۔ لارڈ ولنگڈن سے قائد اعظم کی آویزش کو برصغیر کی تحریک آزادی میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

قائد اعظم ان دنوں بمبئی کے نوجوانوں کے ہیرو تھے۔ فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی کی عظمت و حق گوئی و بیباکی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے قائد اعظم کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے دلنواز بھائی کے ہر انداز اور ہر عمل کو انھوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ قائد اعظم کی تصویر بن کر رہ گئیں۔ گفتار و کردار میں وہ قائد اعظم کا عکس تھیں۔ شکل و صورت میں ویسے بھی مشابہت تھی۔ انداز گفتگو، لب و لہجہ، حرکات و سکنات تمکنت اور جاہ و جلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ جب کوئی شخص خاتون پاکستان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی دلسوز اور شیریں گفتگو اس کے فردوس گوش ہوتی تو وہ یہی احساس کرتا کہ اسے قائد اعظم سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

مشرق میں بہن بھائی کا رشتہ بڑا مقدس اور عزیز ہے۔ بھائی بھی اپنی بہن سے محبت کرتے ہیں

مگر بہن تو بھائی کے لیے اپنی جان بھی نثار کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ سسرال میں ہو تو بھی بھائی کی یاد اسے تڑپاتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو چاند سے تشبیہ دیتی ہے۔ خاتون پاکستان ایک عظیم مشرقی خاتون تھیں جو نسائی خصوصیات اور روایات کی علمبردار تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی بھائی پر نثار کر دی۔ مادرِ ملت کا یہ اقدام ان کی خواہرانہ محبت کا آئینہ دار ہے۔ ۱۹۳۰ء قائداعظم کی زندگی کا مایوسی کا سال تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی بیگم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا۔ قائداعظم اپنی بیوی کی لاش قبر میں اتار رہے۔ تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو موتی بن کر ٹپک رہے تھے۔ قائداعظم کو اپنی بیوی سے بڑی محبت وابستگی تھی۔ ان کی اہلیہ بمبئی کے مشہور پارسی سر ڈنشا پٹیٹ کی صاحبزادی تھیں۔ قائداعظم سے شادی کرنے کے لیے انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ملک بھر میں ہنگامہ اور انتشار تھا۔ ہندو مسلم فسادات کا زور تھا۔ مسلمان ناامیدی اور قنوطیت کا شکار تھے۔ قائداعظم کی ہندو مسلم اتحاد کی سعی ناکام ہو چکی تھی۔ کانگرسی رہنما مسلمانوں کے وجود کو تسلیم کرنے پر کسی صورت میں آمادہ نہ تھے کانگرس کسی مجھوتے کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ قائداعظم کے خواب آزادی کے شرمندہ تعبیر ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ان حالات میں قائداعظم نے خود جلاوطنی پسند کی۔ انھوں نے انگلستان میں قیام کا ارادہ کیا۔ خاتون پاکستان قائداعظم کی قلبی کیفیت سے خوب آشنا تھیں۔ جس ذہنی کشمکش میں ان کے شب و روز گزرتے تھے، فاطمہ ان سے واقف تھی۔ وہ قائداعظم کے ہمراہ چار سال تک انگلستان میں مقیم رہیں۔ وہ تنہائی اور مایوسی میں قائداعظم کی دمساز اور رفیق تھیں۔ مایوسی کی تاریکی میں قائداعظم کے لیے وہ امید کی کرن تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں مسلم رہنماؤں کے اصرار پر قائداعظم نے ہندوستان واپس آکر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ قائداعظم کے اس فیصلے پر فاطمہ جناح بھی اثر انداز ہوئیں۔ انھیں مسرت تھی کہ وہ اپنے وطن واپس جا رہی ہیں جہاں وہ اعزہ و اقارب اور احباب سے دوبارہ مل سکیں گی۔ مگر انھیں اس امر کا بھی احساس تھا کہ قائداعظم نے ایک عظیم ذمہ داری قبول کی ہے۔ بڑھاپے میں منتشر مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی تحریک کی قیادت کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ انگریز اور کانگرس جیسی قوتیں مدمقابل تھیں۔ قائداعظم نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک تن تنہا مسلمانوں کے حقوق کی جو جنگ لڑی اور جس طرح مسلمانوں کو منظم و متحد کر کے اسلامی اصولوں پر ایک نئی مملکت پاکستان قائم کرنے میں کامران ہوئے، اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ نازک اور مشکل دور میں قائداعظم کی رفیق، معتمد اور معاون مادرِ ملت تھیں۔ قائداعظم اپنی ذات میں انجمن تھے۔ اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تو ہر چیز کو فراموش کر دیتے۔ ان کی صحت بھی ایسی اچھی نہ تھی۔ مادرِ ملت کو اس

منزل ہفت خواں سے گزرنا پڑا۔ انھیں ہر وقت قائداعظم کی صحت کا خیال رہتا تھا۔ گاہے گاہے قائداعظم رات دیر تک بیٹھتے تو وہ بھائی سے روٹھ جاتیں۔ قائداعظم انھیں خوش کرنے کے لیے کام ترک کر دیتے۔ محترمہ فاطمہ جناح کی سعی و کاوش کا نتیجہ تھا کہ کمزور صحت کے باوجود قائد لگن اور جذبے کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کرتے رہے، اور بالآخر پاکستان قائم ہو گیا۔ مادرِ ملت نے قائداعظم کی رفاقت کے علاوہ قومی سیاسیات میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ مسلمان خواتین کی سیاسی بیداری میں ان کا اہم حصہ تھا۔ وہ مسلم لیگی خواتین کے جلسوں میں شریک ہوتیں اور انھیں خطاب کرتیں۔ ان کی شخصیت مسلم خواتین کے لیے سرچشمہ فیض تھی۔ انھوں نے لاکھوں خواتین میں روحِ عمل بیدار کی۔ یہ خواتین جنگ آزادی میں پیش پیش رہیں۔ قائداعظم کی وفات کے بعد مادرِ ملت کے حقیقی جوہر کھلے اور عام و خاص سب پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ مادرِ ملت محض بابائے قوم کی واجب الاحترام ہمشیرہ ہی نہیں بلکہ خود بھی بلند پایہ شخصیت ہیں جو دردمندی، ایثار و خلوص اور سیاسی بصیرت میں قائداعظم کی جانشین ہیں۔ مادرِ ملت کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ انھوں نے قائداعظم کے بعد اپنی عظمت کو قائم رکھا۔ وہ غیر سرکاری سطح پر پاکستان میں بلند ترین شخصیت تھیں۔ ملک میں مختلف سیاسی نشیب و فراز آئے لیکن مادرِ ملت کے احترام میں کوئی فرق نہ آیا۔ خاتونِ پاکستان کی عظمت کا راز ان کی اصول پسندی میں مضمر ہے۔ انھوں نے قائداعظم کے اصولوں کو سربلند رکھا۔ نظریۂ پاکستان، جمہوریت اور عوامی فلاح و بہبود تین بنیادی اصول تھے، جن پر وہ بار بار زور دیتی رہیں۔ ان کی شخصیت ملک کے لاکھوں نوجوانوں میں جذبۂ عمل پیدا کرتی تھی۔ قائداعظم کی طرح انھیں مسئلہ کشمیر سے گہری دلچسپی تھیں۔ خاتونِ پاکستان نے کشمیر فنڈ جاری کیا اور آزاد کشمیر کا دورہ کیا۔ آزاد کشمیر میں مختلف اداروں کی لاکھوں روپے سے امداد کی۔

خاتونِ پاکستان گوناگوں اوصاف کی حامل تھیں۔ ان کی شخصیت بڑی دلآویز تھی۔ سخن دلنواز اور جان پرسوز سے ان کی شخصیت عبارت تھی۔ بڑھاپے میں اس قدر جفاکش اور باہمت تھیں کہ تعجب ہوتا تھا۔ آخری عمر میں انھوں نے انتخابی مہم میں جو دورے کیے وہ ان کی جانفشانی پر شاہد ہیں۔ قائداعظم کی طرح وہ کارکنوں اور طلبہ سے شفقت سے پیش آتیں۔ قائداعظم کی طرح ان میں قدرتی جاہ و جلال تھا۔ بڑے سے بڑے جغادری لیڈر اور خود ساختہ شیران کی خدمت میں حاضر ہونے سے گھبراتے۔ وہ ان لیڈروں پر شدید تنقید کرتیں۔ خاتونِ پاکستان بڑی سادہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ سادہ لباس زیبِ تن کرتیں۔ بچوں سے بڑی محبت سے پیش آتیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے آتے تو ان کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی۔ انھیں مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر روز باقاعدگی

سے مطالعہ کرتیں۔

خاتون پاکستان اسلامی اتحاد کی سرگرم حامی تھیں۔ ان کی رائے میں پاکستان اسلامی اتحاد میں اولین منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ منزل مقصود اسلامی دنیا کا اتحاد ہے۔ وہ اسلامی ممالک کی تحریکات آزادی سے گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ جب بھی کوئی اسلامی ملک آزادی حاصل کرتا تو وہ بے حد مسرور ہوتیں۔ انڈونیشیا کی آزادی پر کراچی میں جو عظیم الشان اجتماع مؤتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہوا، خاتون پاکستان نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

مؤتمر عالم اسلامی کے دیگر اجتماعات میں بھی وہ شریک ہوتیں۔ قائد اعظم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد کراچی میں اسلامی ملکوں کا اجلاس ہوا۔ انھوں نے سیاہ لباس میں اجلاس میں شرکت کی خاتون پاکستان کو قومی زبان اردو سے بڑی وابستگی تھی۔ انھوں نے بڑی کاوش سے اردو کی تحصیل کی تھی۔ وہ اکثر اجتماعات سے اردو میں خطاب کرتیں۔ انھیں مشرقی علوم سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی رائے میں مشرقی علوم وفنون مسلمانوں کا ورثہ ہیں۔ اس بنا پر خاتون پاکستان طب یونانی کی سرگرم حامی اور سرپرست تھیں۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں آل پاکستان آیورویدک و یونانی طبی کانفرنس کے اولین سالانہ اجلاس کا افتتاح کیا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی تقاریر کا مجموعہ اردو اور انگریزی میں چھپ چکا ہے ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے مقابلے میں پانچ سیاسی جماعتوں کی وہ مشترکہ امیدوار تھیں۔ ۹ جولائی ۱۹۶۷ء کو کراچی میں انتقال کیا اور انھیں قائد اعظم کے مقبرہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ مادرِ ملت کی وفات سے ہماری تحریک کا وہ شاندار دور اختتام پذیر ہوا جس کا آغاز قائد اعظم کی قیادت میں ہوا تھا۔

باب ۲۸

تحریک پاکستان میں دانش وروں کا حصہ

مجدد الف ثانیؒ سے قیام پاکستان تک جس قدر اسلامی تحریکات رونما ہوئیں، ان تحریکات کے حلقۂ اثر میں سارا جنوبی ایشیا اور ان کے مقاصد کے اعتبار سے بالخصوص تمام مسلمان تھے۔ ہر تحریک کا اظہار و بیان زبان ہی کے سہارے ممکن ہے۔ جنوبی ایشیا کی تمام تحریکیں، جو سیاسی اور قومی اہمیت کی حامل ہیں، اردو زبان کے عام استعمال اور اس کے عروج و ترقی کے دور میں رونما ہوئیں۔ چونکہ اردو اٹھارویں صدی تک اپنے وسیع اور عریض ماحول میں عام استعمال کی واحد زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس لیے ان تحریکات کے لیے اردو زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔ تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں اس زبان کا استعمال سارے برعظیم کے لیے بڑی حد تک کافی تھا۔ اس صورت میں اسلامی تحریکوں کے علاوہ دیگر قوتوں کی تحریکیں بھی اسی زبان کو استعمال کرنے پر مجبور ہوئیں۔ کیونکہ غیر مسلموں کو بھی اپنی سیاسی تحریکوں کی کامیابی کے لیے مسلمانوں کا تعاون درکار ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے بحیثیت قوم اس زبان کو پروان چڑھایا اور اسے اظہار کا بھرپور اور موثر ذریعہ بنایا۔ مسلمانوں نے اس زبان کو چونکہ اپنی کل متاع اور ساری روایات دے دی تھیں، اس لیے ان کے لیے اردو کو ہر موقع پر استعمال کرنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ان کی ہر تحریک بالخصوص اسی زبان کے ذریعے مقبول اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

مجدد الف ثانیؒ کے پیروؤں اور خلفا نے اسی زبان میں شاعری کی اور اصلاحی کتابیں تصنیف کیں جن کا موضوع یہ تھا کہ اسلامی اصولوں اور قدروں کو ان کی خالص پاکیزگی کے ساتھ قائم رکھا جائے اور انھیں خارجی اثرات سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے پیروؤں نے اس زبان کے ذریعہ بہت موثر کام کیا۔ انھوں نے شاہ صاحب کے افکار کے مطابق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی زبان ایسی تھی کہ کم پڑھے لکھے افراد بھی آسانی

سے سمجھ سکتے تھے۔ شاہ صاحب کے فرزندوں نے متعدد اصلاحی کتابیں تصنیف کیں اور قرآن حکیم کے ترجمے کیے۔ یہ خود اردو میں مقصدی اور قومی ادب کی ابتداء کا دور تھا۔ اب اردو اس قابل ہو رہی تھی کہ تمام موضوعات کو سمیٹ سکے اور دوسرے اس زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس امر کا تقاضا کر رہی تھی کہ یہ اب فارسی کی جگہ لے لے جو ایک طویل عرصہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ ان دو ابتدائی تحریکوں کے بعد کا دور اردو زبان کے عروج اور ترقی کا زمانہ ہے۔ ہر تحریک کے لیے اب اس زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنانا ضروری تھا بلکہ سید احمد شہید کی تحریک اور اس کے بعد رونما ہونے والی ایسی تمام تحریکیں، جو عام مسلمانوں کو مخاطب کرتی تھیں، اسی زبان میں اپنی سرگرمیاں انجام دیتی رہیں۔

برعظیم میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کے لیے اسلام کے بعد بلاشبہ اردو ہی اہم عنصر ہے۔ اگر بیسویں صدی میں برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کا جائزہ لیا جائے تو یہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے کہ یہی زبان تھی جس نے انھیں سیاست میں سرگرم رکھا۔ اس عرصے میں اردو ہندی تنازعہ زبان کے مسئلے سے ہٹ کر مذہبی اور تہذیبی مسئلہ بن گیا تھا۔ مختلف تہذیبی اور مذہبی اقدار کے علاوہ اردو زبان نے بھی مسلمانوں کی توجہ ان کی علیٰحدہ اور منفرد قومیت کی حفاظت اور اس کے استحکام کی طرف پھیر دی تھی۔ ہندوؤں کی اردو دشمنی کے سبب مسلمانوں کی قومی زندگی میں اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کے تحفظ کا جذبہ بیدار ہوا۔ ان میں دو قومی نظریہ کا احساس، جو ابتدا ہی سے ان میں موجود تھا، اب زیادہ قوی اور شدید ہو گیا۔ اردو ہی کے طفیل مسلمانوں کی قومی زندگی میں وحدتِ خیال و عمل پیدا ہوئی اور مشترک مقاصد کے لیے مل کر کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس زبان کے ذریعے اس کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، عالموں اور جماعتوں نے اور بالخصوص تحریکِ پاکستان نے اس کے طفیل ہی قبولیتِ عام حاصل کی۔

یہ زبان برعظیم کے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی مظہر اور ایک ایسا مجلّیٰ اور مصفّیٰ آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی اور تہذیب کے خط و خال پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اسی لحاظ سے اس کا ادب تمام قومی تحریکات اور اجتماعی کوششوں کا بھی مظہر ہے، جو اس کی حیاتِ اجتماعی کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ متعدد عوامل کے نتیجے میں جب قومی تحریکوں کا رخ تحریکِ پاکستان کی صورت اختیار کر گیا تو اردو نہ صرف ان تحریکات کی جدوجہد کو پیش کرتی ہے بلکہ عملاً خود بھی ان میں شریک نظر آتی ہے۔

تحریک پاکستان میں صحافیوں کا حصّہ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصے تک صحافت کا لب ولہجہ قدرے نرم اور مصلحت آمیز تھا اور زیادہ تر اخبارات کی توجہ سیاست کے بجائے مغربی علوم وفنون کی اشاعت پر مرکوز رہی لیکن اس وقت بھی اخبارات ملکی مسائل کے تعلق سے دبی زبان میں حکومت پر نکتہ چینی کر لیتے تھے اس قسم کے اخبارات میں ،شعلہ طور،، خیر خواہ خلق،، اخبار العالم،اس اعتبار سے نمایاں تھے کہ ان میں سیاسی اور قومی خبریں عام طور پر شائع ہوتی تھیں اور ان میں انتظامی امور کے سلسلے میں حکومت کو مشورہ دیا جاتا اور بعض اوقات نکتہ چینی بھی کی جاتی۔ بعض اخبارات بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی کی مختلف صورتوں میں تصویر کشی کرتے اور ان میں قومی وملی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے۔ سید احمد خان نے اپنی تحریک آلہ کار اپنے رسالہ ،تہذیب الاخلاق،، اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی،، کو بھی بنایا۔ ان اخبارات کا عمومی مقصد سید احمد خان کے پیش نظر یہ تھا کہ ایک طرف حکومت اور انگریز قوم کو ہندوستانیوں کے خیالات اور احساسات سے آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ہندوستانیوں میں سیاسی ذوق پیدا کیا جائے اور انھیں انگریزی طرز حکومت سے آشنا کیا جائے۔ مجھ وہ ان اخبارات کے ذریعے سے قوم کے انداز فکر کو نئے سانچے میں ڈھالنا چاہیے تھے۔ چنانچہ ان میں جو خیالات اور نظریات پیش کیے جاتے تھے وہ پہلے پہل عام مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں ان کا اثر پھیلتا گیا۔ لوگ متوجہ ہوئے اور کچھ افراد نے ان کے زیر اثر اپنے طور پر بھی کام شروع کیا۔ مدارس اسلامیہ قائم ہوئے مسلمانوں میں ترقی کا جذبہ بیدار ہوا جدید علوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اعتماد اور اپنی مدد آپ کا احساس رونما ہوا۔ قومی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں سید احمد خان کی صحافیانہ کا خاص حصہ ہے۔ ان کے زیر اثر معاصر اخبارات نے بھی اس روش کو اختیار کیا۔ آگرہ اخبار،، اس اعتبار سے بہت نڈر اور جری ثابت ہوا کہ اس نے اخبار نویسی کو محض بہانہ قرار دیا اور اس کا اصل مقصد ہندوستان میں آزادی کا پھیلانا تھا۔ اس عہد کے دیگر اخبارات میں ،نیر المواعظ،، دبدبہ سکندری ،منشور محمدی،، ردعیسائیت میں پیش پیش تھے اور عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ بعض اخبارات عالم اسلام کے احوال وکوائف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں اور ملی احساسات کی پرورش کرتے تھے۔ ایسے اخبارات میں شمس الاخبار، ناصر الاخبار، انجمن الاخبار، خاص اہمیت کے حامل تھے سید احمد خان کے بعد جن افراد نے صحافت کو اپنے سیاسی نظریات کی ترویج کا ذریعہ

ان میں عبدالحلیم شرر کو بڑی انفرادیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے جرائد "دلگداز" اور "اتحاد" کو مسلمانوں
کی قومی و سیاسی بیداری کا بھی ایک ذریعہ بنایا لیکن صحافت میں ان کا زیادہ منفرد کارنامہ ان کا رسالہ
"مہذب" ہے۔ سیاسی اعتبار سے شرر مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے قائل تھے اور وہ چاہتے
کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ "مہذب" میں انھوں نے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں اپنے
زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور علیحدگی کا نظریہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے
کہا تھا کہ ہندو مسلم مسئلے کا یہی واحد حل ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادیاں علیحدہ کر لیں۔ صحافت
میں بعد میں اس قسم کے مزید خیالات سامنے آئے۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی مثال تھی۔ ان کے
عہد میں پیسہ اخبار اور وکیل جدید رجحانات اور تقاضوں کے حامل تھے حسرت موہانی کا "اردوئے
معلی" پرجوش اور ہنگامی سیاست کا علمبردار تھا اس کے مضامین میں حسرت نے ہمیشہ غیر ملکی حکومت
کے خلاف اپنے مجاہدانہ خیالات پیش کیے اپنے کامل آزادی کے خیالات کو انھوں نے بڑی
شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی الجھنوں کا حل وہ اس میں متعدد مرتبہ بیان کرتے
رہے اپنے لب و لہجہ کی بنا پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

بیسویں صدی کی صحافت کا لازمی مزاج سیاست تھا اخبارات نے متعدد سیاسی تحریکوں
اور ہنگاموں میں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور اکثر ان کی رہنمائی اور قیادت بھی کی ہے
ابتدائی دور میں "زمیندار"، "الہلال" اور "ہمدرد" نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں کے
جذبات کو جو پہلے ہی اشتعال کی حالت میں تھے، اور زیادہ مضطرب اور مشتعل کر دیا۔ مولانا
ظفر علی خاں کا "زمیندار" ہمیشہ مسلمانوں میں بہت مقبول اور مؤثر رہا۔ مولانا ابوالکلام نے "الہلال" کے
ذریعے ابتدائی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی سیاست سے وابستہ کرنے میں نمایاں
کام کیا ہے۔ مولانا محمد علی کے "ہمدرد" اور "کامریڈ" قومی مسائل میں مسلمانوں کے جذبات کی پرجوش
ترجمانی کرتے تھے۔ خصوصاً مولانا ظفر علی خاں نے ہندو سیاست کے داؤ پیچ کا مؤثر جواب
دیا ہے اور کانگریس کے اثر کو زائل کرنے میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے زیر اثر
"انقلاب" نے بھی ہنگامی اور قومی سیاست میں مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کے جذبات کی
ہر موقع پر مؤثر ترجمانی کی۔ متعدد تحریکوں میں یہ ہمیشہ دوش بدوش رہا۔ اس کا ایک بہت نمایاں
کارنامہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کا نعرہ تھا۔ اس کی پیشانی پر یہ نعرہ ایک
عرصہ تک تحریر ہوتا رہا۔ تحریک خلافت کے دوران اخبار "خلافت" نے بھی قومی جذبات کی

ترجمانی کی اور یہ بعد میں دو قومی نظریہ کا ترجمان بنا۔ تحریک پاکستان کے دوران اس کی کامیابی کے لیے جو اخبار کوشاں رہے ان میں "ایمان، احسان، منشور، تنویر، لوائے وقت، سرحد، ملت الاسلام، جمہور اور تنظیم" بہت پرجوش اور سرگرم رہے۔ یہ اخبارات ان لاتعداد اخبارات میں سے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تحریکوں کو وسعت اور کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ان میں قومی اور ملی شعور عام کیا اور حصول پاکستان کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت کی۔

تحریک پاکستان میں شاعروں کا حصہ

برعظیم کے مسلمانوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے، ان کے ملی اور قومی شعور کو بیدار کرنے، اسے تقویت دینے اور سیاسی انتشارات کی مختلف تباہیوں اور بربادیوں کے بعد ان کے مردہ دلوں کو حرارت سے آشنا کرنے میں اردو زبان وادب نے جو اہم کردار ادا کیا، وہ بہت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ اردو ادب کے نمایاں خط وخال کے ابھرنے سے قبل برعظیم کے سیاسی جذبات کے اظہار کی تمام خصوصیات، اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، فارسی ادب میں نظر آتی ہیں۔ اس عرصے میں دکن میں اردو ادب اور بالخصوص شاعری ابتدائی تشکیل کے مراحل طے کر رہے تھے اور وہاں قومی شاعری کی روایات مستحکم ہو رہی تھیں۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا مستقل رواج اورنگ زیب اور اس کے بعد طوائف الملوکی اور سیاسی انتشار کے دور میں فارسی کے پہلو بہ پہلو بڑھنے لگا تھا جب ایہام گوئی یا فضول گوئی کے خلاف مجدد الف ثانی کے پیروؤں اور ان کے حلقے سے تعلق رکھنے والے شاعروں نے تحریک شروع کی تو اردو شاعری کے فروغ اور مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔ اب شاعروں کے کلام میں حب وطن کے جذبات یا سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور گریز کے احساسات عام طور پر نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں شاعروں کا حساس ذہن نہ صرف اپنے ہی دکھ درد کے احساس سے معمور تھا۔ بلکہ اپنے ماحول اور معاشرے کے اجتماعی انتشار اور اس کی بدحالی سے پوری طرح آگاہ اور متاثر تھا۔ لہٰذا بعض شاعروں نے اس ماحول اور صورت حال کے ذمہ داروں پر تنقید اور نکتہ چینی بھی کی اور انھیں معاشرے کی خرابیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ بھی کیا۔ اس دور میں میر، سودا، نظیر اور دیگر چھوٹے بڑے بے شمار شاعر اپنے طور پر یہ کام انجام دیتے رہے۔ ان شاعروں نے سلطنت کے زوال کو محض دیکھا ہی نہیں۔ اس کے نتائج سے وہ متاثر بھی ہوئے۔ سکھوں، مرہٹوں اور پھر انگریزوں کے حملوں میں انھوں نے دکھ اٹھائے اور صدمے برداشت کیے

تھے۔چنانچہ ان کی شاعری میں اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کی ترجمانی ہی نہیں، صورت حال کو بہتر بنانے کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ آتش، ناسخ، مصحفی، جرأت اور دیگر متعدد شاعروں کے کلام میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ ذوق، مومن، غالب اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں بھی ماحول کا اضطراب، سیاسی زوال اور محکومی کا احساس تلخ حقائق کی صورت میں نمایاں ہے۔ اکثر شاعروں نے لکھنو اور دہلی کے سقوط پر المناک مرثیے بھی لکھے۔ منیر شکوہ آبادی، ظہیر دہلوی، داغ اور حالی نے لکھنو اور دہلی کو موضوع بنا کر قوم کے زوال کا مرثیہ کہا۔ اس دور میں جو اسلامی تحریکیں سرگرم رہیں ان میں سے تحریک شاہ ولی اللہ، تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں میں شاعروں کی بھی ایک خاصی تعداد عملی طور پر شریک تھی یا یہ اپنے پرجوش اور ولولہ انگیز کلام سے تحریک کے مقاصد کو عام کرتے رہے۔ معروف شاعروں میں مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، شاہ حاتم، خان آرزو اور مصطفےٰ خاں شیفتہ، مجدد الف ثانی کی تحریک سے متاثر ہو کر شعر کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے قمر الدین منت، نظام الدین ممنون، قادر بخش صابر، ذوق، مومن، صدر الدین آزردہ اور شمس الدین فقیر وغیرہ وابستہ تھے۔ تحریک مجاہدین سے مومن بہت قریبی وابستگی رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ خرم علی بلہوری، حاجی امداد اللہ، یعقوب نانوتوی، قاسم نانوتوی وغیرہ بھی تحریک مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے اور شاعر تھے۔ جنگ آزادی کے مجاہدین شعراء میں امام بخش صہبائی، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، منیر شکوہ آبادی، کفایت علی کافی کے علاوہ متعدد دیگر نام تاریخ کا حصہ ہیں۔

جنگ آزادی کے بعد علیگڑھ تحریک کے مقاصد کو پورا کرنے میں جن شاعروں نے شہرت حاصل کی اُن میں حالی، شبلی اور اسماعیل میرٹھی کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس عہد میں جدید تقاضوں کے پیش نظر شاعری میں حقیقت پسندانہ موضوعات پر بکثرت طبع آزمائی کی گئی۔ مولانا شبلی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال نے قومی اور ملی احساسات کو بڑے موثر انداز میں اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان شاعروں اور بالخصوص علامہ اقبال نے مسلمانوں میں ملی اور قومی شعور پیدا کرنے اور ان میں آزادی اور اتحاد اسلامی کے جذبات بیدار کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان شاعروں نے عام مسلمانوں میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے تصور کو مقبول بنانے میں بھی خاص حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ سیماب اکبر آبادی، مولانا ظفر علی خاں، میاں بشیر احمد، محمود اسرائیلی، نعیم صدیقی، ملتانی وغیرہ، قوم کے سیاسی نصب العین کو اپنی نظموں

کے ذریعے عام کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ لاتعداد معروف اور غیر معروف شاعروں نے پاکستان کے حق میں اپنے جذبات و تصورات کو نظموں میں پیش کیا، عوامی نعرے نظم کیے اور پاکستان کے ترانے لکھے۔ بعض شاعروں نے کانگریس اور ہندوستاست پر نکتہ چینی کی اور ان کے رد میں پرجوش نظمیں لکھیں۔

حصول پاکستان کی جدوجہد میں اسی پرجوش اور ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے شاعروں نے اپنے حلقۂ اثر کو بہت متاثر کیا۔ ان کی شاعری کے موضوعات اور مقاصد تحریک پاکستان کی عملی جدوجہد کے مطابق اور حصولِ پاکستان میں معاون اور مؤثر رہے۔

تحریک پاکستان میں ادیبوں وافسانہ نگاروں کا حصہ

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء قدیم وجدید کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ناکامی کے اثرات اور پھر برعظیم میں رونما ہونے والے بیشمار سیاسی اور معاشرتی عوامل نے بالخصوص مسلمانوں کی زندگی پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اس کے نتیجے میں ادب اور شاعری بھی متاثر ہوئے اور اپنے عہد کی تحریکات اور رجحانات کی ترجمانی کر کے معاشرے کو بھی متاثر کرتے رہے علیگڑھ تحریک نے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ سید احمد خاں نے پہلی مرتبہ ہر قسم کے موضوعات پر صاف اور سادہ زبان میں ادبی تخلیق کی روایت قائم کی۔ اس کوشش کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اسی طرز پر لکھنے والوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، جس نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو اپنی تحریروں کے ذریعے مزید وسعت دی ادب میں مضمون نگاری، ناول، افسانہ اور تنقید کا بھی آغاز ہوا اور قومی مسائل اور مو ضوعات بھی ادیبوں کے غور و فکر کا ایک حصہ بنے۔ ادب کا یہ دور اپنے مقصد اور موضوع کے لحاظ سے اصلاحی تھا۔ علیگڑھ تحریک کے زیر اثر ادیبوں نے ادب اور اس کی مختلف اصناف کے ذریعے پوری قوم کی اصلاح کی تدابیر اختیار کیں۔ سید احمد خان اس گروہ کے رہنما اور قائد تھے، ان کے علاوہ حالی، شبلی، نذیر احمد شرر اور محسن الملک اس کے اہم اور ممتاز ادیب تھے۔ انھوں نے ادب میں مقصدیت پیدا کی اور اسے اصلاح احوال اور تہذیب اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ ان کا دل دردِ قومی سے لبریز تھا اور وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا نہایت دردمندی اور خلوص کے ساتھ قوم کی بھلائی اور ترقی کے لیے لکھا۔ ان کی تحریروں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، انھیں اپنی پستی اور محکومی کا احساس دلایا اور پھر اس

پستی اور ذلت سے نکلنے اور فلاح و ترقی کے راستے پر گامزن ہوتے کا حوصلہ ملا۔ ان کی تخلیق کے لیے ہوئے ادب نے مسلمانوں میں قومی اور سیاسی شعور پیدا کیا اور انھیں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لینے یا حصول آزادی کی طرف مسائل کیا۔ ان کے زیر اثر بہت جلد ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے عہد کی قومی تحریکوں کو بھی تقویت پہنچائی اور نہ صرف برطانوی حکومت پر مناسب موقعوں پر کھلی اور بے باک تنقید کی بلکہ اپنے آزادی کے رجحانات بھی پیش کے لیے۔ ان میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اپنے ابتدائی عہد میں اس طبقے میں شامل رہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں تاریخی اور قومی اہمیت کا حامل ادب تخلیق کیا۔ دیگر ادیبوں میں مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بکثرت تحریروں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ بعض رسائل خاص طور پر قومی و سیاسی موضوعات پر مختلف ادیبوں کی تحریریں شائع کرتے تھے۔ تہذیب اخلاق،، الندوہ، مخزن،، الہلال، البلاغ،، دکن ریویو،، دلگداز، علیگڑھ منتھلی،، الناظر، ہمایوں، اور نیرنگ خیال، وغیرہ قومی و سیاسی مضامین کے اعتبار سے اس لیے ممتاز تھے کہ ان میں جذبات کا پرجوش اور بیباک اظہار ہوتا تھا۔

اردو کے ڈرامہ نگاروں اور افسانہ نگاروں نے بھی مسلمانوں میں ملی اور سیاسی شعور پیدا کرنے اور پھر تحریک پاکستان کو مقبول بنانے میں حصہ لیا۔ اسلامی سلطنت کا دورِ زوال افسانوی ادب میں خصوصاً داستانوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ یہ صنف ادب دورِ انتشار میں گریز پائی کی نمایاں مظہر ہے، لیکن۔ اس وقت بھی بعض داستانوں میں سیاسی محکومی اور سلطنت کے چھن جانے کا احساس نظر آتا ہے۔ چنانچہ اردو کی معروف داستان باغ و بہار میں یہ احساس بہت نمایاں ہے۔

حکومت برطانیہ کے عہد میں ناول نگاری ماحول کا فطری تقاضا تھی۔ اور یہ ایسے دور میں شروع ہوئی تھی جب مسلمان پورے طور پر محکوم ہو چکے تھے۔ اور ان میں اصلاحی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ مولوی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر ابتدائی ناول نگاروں میں بہت ممتاز ہیں۔ نذیر احمد نے اصلاحی ناولیں لکھیں اور شرر نے تاریخی ناولیں لکھیں۔ اور مسلمانوں کو

ماضی کی تصویریں دکھا کر انھیں مستقبل اور حال کی تعمیر کا احساس دلایا۔ تاریخی ناول نگاروں نے مسلمانوں میں ملی، قومی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں بہت موثر کردار ادا کیا۔ محمد علی طیب مرزا محمد سعید سلطان حیدر جوش، راشد الخیری اور دیگر متعدد ناول نگاروں نے تاریخی اور اصلاحی ناولیں لکھ کر قوم کے مزاج اور رجحانات کی تعمیر میں مناسب حصہ لیا یہی کام آخری دور میں ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، قیسی رامپوری اور اشتیاق حسین قریشی نے انجام دیا۔ مختصر افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوش اور راشد الخیری نے بالخصوص اصلاحی افسانے لکھے۔ جدید افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور ابراہیم جلیس نے اپنے دور کی سیاسی تحریکوں اور آزادی کے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کئی افسانے تخلیق کے لیے۔ ڈراموں میں جو موضوع سب سے زیادہ مقبول ہُوا وہ تاریخی اور اصلاحی تھا۔ اسلامی تاریخ کے موضوع پر لاتعداد ڈرامے لکھے گئے ایسے تمام ڈرامے پرجوش اور ولولہ انگیز جذبات کے حامل نظر آتے ہیں۔ سیاسی موضوعات کو بھی عام طور پر جگہ دی گئی۔ ڈراموں میں عوام کی بیداری اور ملک کی آزادی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مطالبۂ پاکستان کے حق میں بھی بعض ڈرامے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سید بادشاہ حسین، فضل حق قریشی کے ڈرامے اور خاص طور پر ضیا سرحدی کا ڈرامہ پاکستان،، تحریک پاکستان اور مطالبۂ پاکستان کی تائید وحمایت میں اہم اور مؤثر ہے۔

بھارت کے حکمران

مغل خاندان کی سلطنت

بھارت پر طویل عرصہ تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ انھوں نے اقلیتوں کا ہر لحاظ سے خیال اور انھیں اعلیٰ مناصب دیے۔ برصغیر پر مسلمان حکمرانوں کی ترتیب اس طرح ہے۔

۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء ـــــ ظہیر الدین بابر

۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۰ء ـــــ نصیر الدین ہمایوں

۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۵ء ـــــ دہلی کے سوری خاندان کی سلطنت ـــــ جن میں شیر شاہ سوری (۱۵۴۵ء تک) اسلام شاہ (۱۵۴۵ء/۱۵۵۴ء) تک اور محمد شاہ عادل ۱۵۵۴ء تا ۱۵۵۵ء شامل ہیں۔

۱۵۵۵ء تا ۱۵۵۶ء ـــــ نصیر الدین ہمایوں (دوسری مرتبہ)

۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء ـــــ جلال الدین اکبر

۱۶۰۷ء تا ۱۶۲۷ء ـــــ نور الدین جہانگیر

۱۶۲۷ء تا ۱۶۲۸ء ـــــ داؤد بخش

۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۷ء ـــــ شاہ جہاں

۱۶۵۷ء ـــــ مراد بخش

۱۶۵۷ء تا ۱۶۶۰ء ـــــ شاہ شجاع (بنگال میں)

بنگال کے سلطان

۱۵۱۹ء تا ۱۵۳۲ء ـــــ نصیر الدین نصرت شاہ

۱۵۳۲ء تا ۱۵۳۳ء ـــــ علاؤ الدین فیروز شاہ

۱۵۴۹ء تا ۱۵۵۵ء ـــــ محمد خان

۱۵۵۵ء تا ۱۵۶۱ء ـــــ خضر خان بہادر شاہ

۱۵۶۱ء تا ۱۵۶۴ء ـــــ غیاث الدین جلال شاہ

۱۵۳۹ء تا ۱۵۴۰ء ـــ شیر شاہ سوری

۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء ـــ خضر خان

۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۵ء ـــ محمد خان سوری

۱۵۵۵ء تا ۱۵۶۱ء ـــ خضر خان بہادر شاہ

۱۵۶۱ء تا ۱۵۶۴ء ـــ غیاث الدین جلال شاہ

۱۵۶۴ء تا ۱۵۷۲ء ـــ سلیمان کرانی

۱۵۷۲ء ـــ بایزید کرانی

۱۵۷۲ء تا ۱۵۷۶ء ـــ داؤد شاہ کرانی

۱۷۰۷ء ـــ اعظم شاہ

۱۷۰۷ء ـــ قام بخش

۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء ـــ شاہ عالم اوّل

۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء ـــ معزالدین

۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء ـــ فرخ سیار

۱۷۱۹ء ـــ شمس الدین رفیع الدین

۱۷۱۹ء ـــ رفیع الدولہ شاہ جہان دام

۱۷۱۹ء ـــ نکو سیار

۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء ـــ نصیرالدین محمد

۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء ـــ احمد شاہ بہادر

۱۷۵۴ء تا ۱۷۶۰ء ـــ عزیز الدین عالم گیر دوم

۱۷۶۰ء ـــ شاہ جہاں دوم

۱۷۶۰ء تا ۱۷۸۸ء ـــ جلال الدین علی جوہر شاہ عالم دوم

۱۷۸۸ء ـــ بیدار بخت

۱۷۸۸ء تا ۱۸۰۶ء ـــ شاہ عالم دوم

۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء ـــ معین الدین اکبر

۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۸ء ـــ سراج الدین بہادر شاہ دوم

بنگال کے نواب

۱۷۰۳ء تا ۱۷۲۹ء ــــ مرشد قلی جعفر خان

۱۷۲۹ء تا ۱۷۳۹ء ــــ شجاع الدین

۱۷۳۹ء تا ۱۷۴۰ء ــــ سرفراز خان

۱۷۴۰ء تا ۱۷۵۶ء ــــ علی وردی خان

۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۰ء ــــ سراج الدولہ

۱۷۶۰ء تا ۱۷۶۳ء ــــ میر قاسم

۱۷۶۳ء تا ۱۷۶۵ء ــــ میر جعفر

۱۷۶۵ء تا ۱۷۶۶ء ــــ نجم الدولہ

۱۷۶۶ء تا ۱۷۷۰ء ــــ سیف الدولہ

اودھ کے نواب

۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۹ء ــــ سعادت خان

۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء ــــ صفدر جنگ

۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء ــــ شجاع الدولہ

۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء ــــ آصف الدولہ

۱۷۹۷ء تا ۱۷۹۸ء ــــ وزیر علی

۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء ــــ سعادت علی

۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء ــــ غازی الدین حیدر

۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء ــــ نصیر الدین حیدر

۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء ــــ علی شاہ

۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء ــــ امجد علی شاہ

۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء ــــ واجد علی شاہ

آرکوٹ کے نواب

۱۷۰۳ء تا ۱۷۱۰ء — داؤ شاہ

۱۷۱۰ء تا ۱۷۳۲ء — محمد سید سعادت اللہ خان

۱۷۳۲ء تا ۱۷۴۰ء — دوست علی خان

۱۷۴۰ء تا ۱۷۴۲ء — صفدر علی خان

۱۷۴۴ء تا ۱۷۴۹ء — انور الدین محمد

۱۷۴۹ء تا ۱۷۹۵ء — والہ جاہ محمد علی

۱۷۹۵ء تا ۱۸۰۱ء — ام دت عمدہ

۱۸۰۱ء تا ۱۸۱۹ء — عظیم الدولہ

۱۸۱۹ء تا ۱۸۶۷ء — اعظم جاہ

حیدر آباد کے نظام

۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء — میر قمر الدین آصف جاہ

۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۰ء — میر محمد نصیر جنگ

۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۲ء — میر آصف الدولہ صلابت جنگ

۱۷۶۲ء تا ۱۸۰۲ء — نظام علی

۱۸۰۲ء تا ۱۸۱۹ء — میر اکبر علی خان سکندر جان

۱۸۱۹ء تا ۱۸۵۷ء — ناصر الدولہ

۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء — افضل الدولہ

میسور کا حیدر علی خاندان

۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۲ء — حیدر علی

۱۷۸۲ء تا ۱۷۹۹ء — ٹیپو سلطان

پنجاب کے حکمران

۱۷۹۲ء تا ۱۸۳۹ء — رنجیت سنگھ

۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۰ء — کھڑک سنگھ

۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۱ء — نونہال سنگھ

۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۳ء — شیر سنگھ

۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۹ء — دلیپ سنگھ

برطانوی وائسرائے اور گورنر جنرل

۱۷۷۴ء تا ۱۷۸۵ء — وارن ہسٹنگز

۱۷۸۵ء تا ۱۷۸۶ء — جان میکفرسن

۱۷۸۶ء تا ۱۷۹۳ء — لارڈ کارن والس

۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۸ء — لیفٹیننٹ جنرل کلارک

۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء — لارڈ مارنگٹن

۱۸۰۵ء — لارڈ کارن والس (دوسری بار)

۱۸۰۵ء تا ۱۸۰۷ء — جارج بارلو

۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء — لارڈ منٹو

۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء — لارڈ موئیرا

۱۸۲۳ء — جان ایڈم

۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۸ء — لارڈ امرسٹ

۱۸۲۸ء — بٹر ورتھ

۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۴ء — لارڈ

۱۸۳۴ء تا ۱۸۳۵ء — لارڈ بینٹنگ

۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۶ء — سر چارلس

۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء — لارڈ آک لینڈ

۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء ــــ لارڈ ایلن برو

۱۸۴۴ء ــــ ولیم ولبرفورس

۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۸ء ــــ ہنری ہارڈنگ

۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء ــــ لارڈ ڈل ہاوزی

۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۸ء ــــ لارڈ

۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۲ء ــــ لارڈ کیننگ

۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۳ء ــــ لارڈ ایلجن

۱۸۶۳ء ــــ میجر جنرل نیپیئر

۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۴ء ــــ کرنل ولیم ڈینین

۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء ــــ سر جان لارنس

۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۲ء ــــ جان سٹریچی

۱۸۷۲ء ــــ لارڈ نیپیئر

۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء ــــ نارتھ بروک

۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۰ء ــــ لارڈ

۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۴ء ــــ لارڈ رپن

۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۸ء ــــ لارڈ ڈفرن

۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۴ء ــــ لارڈ لینڈز ڈون

۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۹ء ــــ لارڈ ایلجن

۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۴ء ــــ لارڈ کرزن

۱۹۰۴ء ــــ لارڈ امپٹہل

۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء ــــ لارڈ کرزن

۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء ــــ لارڈ منٹو

۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۶ء ــــ لارڈ ہارڈنگ

۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۱ء ــــ لارڈ چلمسفورڈ

۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۵ء ــــ لارڈ ریڈنگ

۱۹۲۵ء ــــ لارڈ لٹن
۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء ــــ لارڈ ریڈنگ
۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۹ء ــــ لارڈ اِرْوِنگ
۱۹۲۹ء ــــ لارڈ کرسٹن
۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء ــــ لارڈ اِرْوِنگ
۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۴ء ــــ لارڈ ولنگڈن
۱۹۳۴ء ــــ جارج سٹنلے
۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۶ء ــــ لارڈ ولنگڈن
۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۳ء ــــ لارڈ لسن لتھ گو
۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء ــــ لارڈ ویول
۱۹۴۷ء ــــ لارڈ ماؤنٹ بیٹن

قائداعظمؒ کا سوانحی خاکہ

۱۸۷۶ء ــــ کراچی میں ولادت
۱۸۸۲ء ــــ ابتدائی تعلیم کا آغاز
۱۸۹۲ء ــــ انگلستان روانگی
۱۸۹۶ء ــــ بیرسٹری میں کامیابی
۱۸۹۶ء ــــ وطن واپسی
۱۸۹۷ء ــــ وکالت کا آغاز
۱۹۰۰ء ــــ بحیثیت پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے تقرر
۱۹۰۵ء ــــ دادابھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔
۱۹۰۵ء ــــ کانگرس میں شرکت
۱۹۰۶ء ــــ بمبئی ہائی کورٹ میں بحیثیت ایڈووکیٹ
۱۹۰۹ء ــــ سپریم امپیریل کونسل میں بلامقابلہ منتخب ہوئے۔

۱۹۱۰ء ـــــ قانون ساز کونسل کے رکن بنے

۱۹۱۱ء ـــــ وقف علی الاولاد کے ضمن میں مسودۂ قانون کونسل میں پیش کیا۔

۱۹۱۲ء ـــــ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں شرکت

۱۹۱۳ء ـــــ مسٹر گوکھلے کے ساتھ برطانیہ روانگی

۱۹۱۳ء ـــــ وطن واپسی

۱۹۱۳ء ـــــ مسلم لیگ میں شرکت

۱۹۱۴ء ـــــ کانگرس کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے برطانیہ روانہ ہوئے

۱۹۱۶ء ـــــ مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لکھنؤ کے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۱۷ء ـــــ ہوم رول تحریک میں شرکت کی

۱۹۱۸ء ـــــ شادی کی

۱۹۱۸ء ـــــ لارڈ ولنگڈن کے خلاف مظاہرے کی رہنمائی کی

۱۹۱۹ء ـــــ رولٹ ایکٹ کے خلاف بطور احتجاج امپیریل کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۲۰ء ـــــ کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی

۱۹۲۱ء ـــــ گاندھی جی کی حکمت عملی سے اختلاف

۱۹۲۷ء ـــــ آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت

۱۹۲۸ء ـــــ نہرو رپورٹ کی ابتدا

۱۹۲۹ء ـــــ چودہ نکات کا اعلان

۱۹۳۰ء ـــــ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت اور انگلستان میں مستقل سکونت۔

۱۹۳۱ء ـــــ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت اور ہندوستانی سیاست سے عارضی کنارہ کشی۔

۱۹۳۴ء ـــــ بمبئی کے شہری حلقے سے مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی۔

۱۹۳۷ء ـــــ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پہلے سالانہ اجلاس کلکتہ کی صدارت کی۔

۱۹۳۸ء ـــــ کراچی مسلم لیگ کی صدارت

۱۹۳۹ء ـــــ یکم نومبر، وائس رائے کی خواہش پر ان سے ملاقات کی۔

۱۹۴۰ء ـــــ ۲۴ مارچ لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں "قرارداد لاہور" کی منظوری

...رک کرمسلمانوں کی خدمت کو نصب العین بنایا حکومت برطانیہ کو انتباہ۔

۱۹۴۲ء — ہندوستان میں کرپس مشن کی آمد قائداعظم سے ملاقاتیں اور پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لینا۔

۱۹۴۳ء — ۲۶، جولائی ایک خاکسار کا ان پر قاتلانہ حملہ

۱۹۴۴ء — ۱۸، مارچ لاہور مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس کا افتتاح ۹ ستمبر ۴۴ء کو گاندھی سے ملاقات۔

۱۹۴۵ء — ۲۸، جون لارڈ ویول کی شملہ کانفرنس میں شرکت۔

۱۹۴۵ء — اکتوبر میں بلوچستان کا دورہ

۱۹۴۶ء — ۲۹، جولائی وزارتی مشن کو مسترد کرتے ہوئے راست اقدام کا اعلان کیا جس پر تمام خطاب یافتہ محرکوں نے خطابات واپس کر دیے۔

۱۹۴۶ء — ۱۴، اگست لارڈ ویول کی طرف سے عبوری حکومت کے قیام کا اعلان۔ قائداعظم کا وائس رائے کی اس عیاری پر احتجاج اور عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت۔

۱۹۴۶ء — دسمبر میں برطانوی حکومت کی دعوت پر لندن کو روانگی واپسی پر مفتی اعظم فلسطین امین حسینی، نحاس پاشا اور عزام پاشا سے ملاقاتیں۔

۱۹۴۷ء — مارچ میں ماؤنٹ بیٹن کی بطور وائس رائے اور گورنر جنرل ہندوستان میں آمد، وائس رائے سے ملاقاتیں اور پاکستان کا مطالبہ۔

۱۹۴۷ء — ۱۲، اپریل کو کانگرس کی طرف سے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ۔

۱۹۴۷ء — ۲، جون مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس

۱۹۴۷ء — ۴، جولائی کو دارالعوام میں قانون آزادی ہند کی منظوری۔

۱۹۴۷ء — ۱۱، اگست پاکستان کی مجلس دستور ساز میں خطبہ استقبالیہ۔

۱۹۴۷ء — ۱۳، اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعزاز میں کراچی میں دعوت

۱۹۴۷ء — ۱۴، اگست قیام پاکستان

۱۹۴۷ء — ۱۸، اگست بحیثیت گورنر جنرل قوم کے نام عید کا پیغام۔

۱۹۴۷ء —— ۲۴، اکتوبر عید الاضحیٰ کے موقع پر قوم کے نام پیغام۔

۱۹۴۷ء —— ۳۰، اکتوبر کو پنجاب یونیورسٹی کے کھلے میدان میں قوم سے خطاب اور مہاجرین کو صبر و ضبط کی تلقین۔

۱۹۴۸ء —— ۲۳، جنوری کو بحری ادارہ "دلاور" کی رسم افتتاح

۱۹۴۸ء —— ۱۴، فروری کو سبی کے دربار میں شرکت

۱۹۴۸ء —— ۲۱، مارچ کو ڈھاکہ میں تین لاکھ کے مجمع سے خطاب۔

۱۹۴۸ء —— یکم جولائی کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی رسم افتتاح۔

۱۹۴۸ء —— ۱۴، جولائی کو بغرض صحت زیارت (بلوچستان) کو روانگی۔

۱۹۴۸ء —— ۱۱ستمبر ۹ بجے رات کو کراچی میں بذریعہ ہوائی جہاز آمد، شب کو دس بج کر پینتالیس منٹ پر انتقال۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اہم واقعات کا سلسلۂ تاریخ

۵۷۱ —— پیغمبرؐ اسلام کی ولادت

۶۱۰ —— پیغمبرؐ اسلام کی نبوت کا آغاز

۶۲۲ —— سن ہجری کی ابتداء

۷۱۱ —— سندھ پر عربوں کا حملہ

۹۹۸ـ۱۰۳۰ —— محمود غزنوی

۱۱۷۵ —— محمد بن قاسم کا حملہ

۱۱۹۲ـ۹۳ —— دہلی پر قبضہ

تقریباً ۱۲۰۰ —— فتح بنگالہ

۱۲۱۰ـ۱۲۳۶ —— ایلتمش

۱۲۶۶ـ۱۲۸۷ —— بلبن

۱۲۹۴ —— فتح دیوگری (مستقبل کا دولت آباد، دکن میں)

علاؤالدین خلجی	۱۲۹۶ — ۱۳۱۶
فتح گجرات	۱۲۹۷
فتح مالوہ	۱۳۰۵
دکن میں ملک کافور کی فتوحات کا انتہائی نقطہ	۱۳۱۰
محمد بن تغلق	۱۳۲۵ — ۱۳۵۱
ابن بطوطہ برعظیم میں	۱۳۳۳ — ۱۳۴۵
شاہ میر شاہ کشمیر ہوگیا	۱۳۳۹
فیروز شاہ	۱۳۵۱ — ۱۳۸۸
ظفر خان والئی گجرات مقرر کیا گیا	۱۳۹۱
گجرات کی آزادی	۱۳۹۶
بنگال کے تخت پر گنیش کا غاصبانہ قبضہ	۱۴۰۳
برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ	[illegible]
لودیوں کا عہد حکومت	۱۴۵۱ — ۱۵۲۶
سکندر لودی	۱۴۹۸ — ۱۵۱۷
پہلی مغل سلطنت	۱۵۲۶ — ۱۵۴۸
شیر شاہ سوری	۱۵۴۸ — ۱۵۴۵
اسلام شاہ سوری	۱۵۴۵ — ۱۵۵۲
مغلوں کی بحالی	۱۵۵۵
اکبر	۱۵۵۶ — ۱۶۰۵
جہانگیر	۱۶۰۵ — ۱۶۲۷
شاہ جہاں	۱۶۲۸ — ۱۶۵۸
عالمگیر اوّل	۱۶۵۸ — ۱۷۰۷
شاہ ولی اللہ	۱۷۰۳ — ۱۷۶۲
پانی پت میں مرہٹوں کی شکست	۱۷۶۱
برطانیہ کو بنگال کی دیوانی عطا کی گئی	۱۷۶۵

۱۷۸۶ — ۱۸۳۱	سیّد احمد شہید
۱۸۱۷ — ۱۸۹۸	سیّد احمد خان
۱۸۵۷ — ۱۸۵۸	سپاہیوں کی سرکشی اور عام بغاوت
۱۸۵۸	ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ
۱۸۷۳ — ۱۹۳۸	محمد اقبال
۱۸۷۶ — ۱۹۴۸	قائداعظم محمد علی جناح
۱۸۷۸ — ۱۹۳۰	محمد علی
۱۸۸۵	انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس
۱۹۰۵	تقسیم بنگال
۱۹۰۶	مسلم لیگ کا قیام
۱۹۱۱	تقسیم بنگال کی جزوی تنسیخ
۱۹۱۴ — ۱۹۱۸	پہلی عالمی جنگ
۱۹۱۶	میثاق لکھنؤ
۱۹۱۹	مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات
۱۹۲۰	تحریک خلافت
۱۹۲۷	سائمن کمیشن
۱۹۲۸	نہرو رپورٹ
۱۹۳۰ — ۱۹۳۲	گول میز کانفرنس
۱۹۳۰	اقبال کا خطبۂ صدارت جس میں جداگانہ مسلم ریاست پر زور دیا گیا۔
۱۹۳۵	آئین حکومت ہند
۱۹۳۷	ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریسی وزارتیں
۱۹۳۹	دوسری عالمی جنگ کا آغاز۔ مسلمانوں نے یوم نجات و تشکر منایا۔

۱۹۴۰ قرارداد پاکستان

۱۹۴۲ تجاویز کرپس

۱۹۴۶ کابینہ مشن

۱۹۴۷ قیام پاکستان